مجموعہ القاسم

Jamiatul Qasim Darul Uloom-il- Islamia, Supaul Bihar (INDIA)

جلد پنجم ۵ مسلم مسائل اور اس کا حل

ترتیب

ناموس رسالت کے علمبردار، امین ملت

مفتی محفوظ الرحمن عثمانی

جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ سپول بہار کا علمی، دینی، دعوتی، فکری اور اصلاحی ترجمان

ماہنامہ معارف قاسم جدید، دہلی

کی

تحقیقی، تاریخی اور دستاویزی پیش کش

مجموعہ القاسم

مسلم مسائل اور اس کا حل- ۵

ترتیب

ناموس رسالت کے علمبردار امین ملت

بندہ مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی

تقدیم

ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب قاسمی

ناشر

جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ، سپول، بہار

© جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب : مجموعہ القاسم (مسلم مسائل اور اس کا حل-۵)

ترتیب : ناموس رسالت کے علمبردار امین ملت بندہ مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی

تقدیم : ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب قاسمی

صفحات : ۸۸۰

اشاعت : ۲۰۱۸ء

تعداد : ۲۵۰۰

ناشر : جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ، سپول، بہار، الہند

﴿ملنے کے پتے﴾

- امام قاسم اسلامک ایجوکیشنل ویلفیئر ٹرسٹ انڈیا
  K-79, 2nd Floor, Street No.5, Abul Fazal Enclave, Part-I
  Jamia Nagar, New Delhi-110025 (India)
  Ph: +91-11-26981876, 26982907, **Mob.:** +91-9811125434
  9899766786, 9931906068, 9931515312, 9708056420
- حرا انٹرنیشنل اکیڈمی، فاربس گنج، ارریہ بہار، الہند
- خدمت خلق ٹرسٹ انڈیا، ہرپور بیشی، اورائی، مظفر پور بہار، الہند۔ موبائل:9891763977

انتساب

استاذ الکل مولانا مملوک علی النانوتوی، حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند، مجاہد فی سبیل مولانا محمد مظہر النانوتوی بانی مظاہر علوم سہارنپور، امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہی، شیخ الحدیث اوّل مولانا محمد یعقوب نانوتوی، امیر لشکر میدان شاملی مولانا محمد منیر نانوتوی، کتب فقہ اسلامی کے مصنف مولانا محمد احسن نانوتوی اور مصلح قوم سرسید احمد خان بانی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام منسوب کرتا ہوں۔ جن کے جلائے ہوئے چراغ کی لو سے آج پوری دنیا ڈیڑھ صدی سے روشن ہے، اور جن کے اخلاص کا تاج محل، کتاب وسنت، فقہ اسلامی کی ترویج کے علاوہ اسلامی تحریک، ناموس تحفظ ختم نبوت، مدارس ومساجد اور انسانی خدمات کا وہ روشن باب جن کا شمار ہمیشہ قدر ومنزلت کی نگاہ سے تاریخ داں لکھے گا انشاء اللہ۔ یقیناً یہ کارہائے نمایاں ہمیشہ انجام پاتے رہیں گے اور آئندہ بھی مورخ اِن کارناموں کو سنہری حروف میں لکھتا رہے گا۔

بندہ مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی

رونق بزم

نمبرشمار	عناوین	اہل قلم	صفحہ
۱	عالمی سازش کے نرغے میں مسلمان!	مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی	۱۱
۲	قصہ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں	ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب قاسمی	۱۴
۳	پیغامات		۲۱
	باب اوّل: مسلم مسائل اسباب و حل		۴۹
۴	مسلمانان ہند سے مولانا آزادؒ کا ایک تاریخی خطاب		۵۱
۵	مسلم پرسنل لاء اور ہندستان	مولانا منت اللہ رحمانیؒ	۵۷
۶	مسلم پرسنل لاء اور ہماری ذمہ داریاں	قاضی مجاہد الاسلام قاسمی	۶۲
۷	حکومت کو مسلم پرسنل لا میں مداخلت کا کوئی حق نہیں	مولانا محمد یوسف اصلاحی	۷۸
۸	مسلم پرسنل لاء خطرات کے سائے میں	سید احمد قادری	۹۱
۹	عالم اسلام میں نافذ مسلم پرسنل لاء کی صورت حال	ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	۹۶
۱۰	ملک بھر میں وقف املاک کی لوٹ کھسوٹ	ادارہ	۱۰۰
۱۱	وقف کے قانون کا اثر دار ہونا ضروری!	مولانا سید محمد ولی رحمانی	۱۱۴
۱۲	وقف بورڈ اور حکومت کا نظریہ	ادارہ	۱۲۰
۱۳	بینک میں مسلمانوں کی مشکلات		۱۲۴
۱۴	وقف املاک پر قبضہ میں، پنجاب پہلے تو دہلی دوسرے نمبر پر	ادارہ	۱۲۷
۱۵	ملک بھر میں تقریباً دس ہزار وقف جائیدادوں پر ریاستی حکومتوں اور پرائیویٹ لوگوں کا قبضہ		۱۲۹

نمبرشمار	عناوین	اہل قلم	صفحہ
۱۶	نئے نئے ’’وقف‘‘ قائم کیے جا سکتے ہیں، اگر...	مولانا سید محمد ولی رحمانی	۱۳۲
۱۷	مسلم شناخت وسکونت تعلیم وروزگار کے مسائل	ڈاکٹر اوصاف احمد	۱۴۰
۱۸	امت مسلمہ کے مسائل اور ان کا حل	فائزہ صدیقی	۱۵۰
۱۹	ہندوستانی مسلمانوں کے حالات (ایک جائزہ)	رحمت اللہ کلیم اللہ امواوی	۱۵۹
۲۰	ہندستانی مسلمان اور پسماندگی، ذمہ دار کون؟	ادارہ	۱۶۷
۲۱	اخوت، اجتماعیت، اتحاد و یکجہتی امت مسلمہ کا امتیاز	پروفیسر دلاور خان رحمانی	۱۷۲
۲۲	ہندوستانی مسلمانوں کا دشمن کون؟	ڈاکٹر میم ضاد فضلی	۱۷۶
۲۳	تمام مسائل کا صرف ایک حل	محمد الیاس ندوی بھٹکلی	۱۸۲
۲۴	مسلمانوں میں اتحاد کا فقدان، اسباب وعلاج	محمد ساجد رضا مصباحی	۱۸۷
۲۵	مسلم نوجوانوں کی بے روزگاری کے اسباب:	رضی احمد	۱۹۰
۲۶	بابری مسجد مقدمہ: عدالت اور مسلم پرسنل لا بورڈ	محمد وقار الدین لطیفی ندوی	۱۹۷
۲۷	بابری مسجد: تاریخ کے آئینے میں	محمد عماد الدین قاسمی	۲۰۲
۲۸	لبراہن کمیشن: دل کے بہلانے کو....	ادارہ	۲۰۵
۲۹	بابری مسجد، رام جنم بھومی: فیصلہ یا سمجھوتہ؟	عامر صابری	۲۰۹
۳۰	بابری مسجد کی جگہ پر کسی مندر کا ثبوت نہیں	ادارہ	۲۱۲
۳۱	بابری مسجد کی شہادت، واجپئی بھی مجرم	ادارہ	۲۱۷
۳۲	خواتین کی ملازمت کا مسئلہ	مولانا سید جلال الدین عمری	۲۲۱
۳۳	خواتین کی عصمت و ناموس کے تحفظ کا مسئلہ...	مفتی احمد نادر القاسمی	۲۲۹
۳۴	مسلم طالبات کی اعلیٰ تعلیم کا مسئلہ	نور جہاں شکیل	۲۳۷
۳۵	جدید ہندوستان میں اردو تعلیم...	پروفیسر ریاض عمر	۲۴۱
۳۶	ہندوستان میں مسلم خواتین...	غلام محمود بنات والا	۲۴۸
۳۷	مسلم خواتین مسائل اور حل	اے۔ امیر النساء	۲۶۱

۳۸	کشمیر میں مسلم خواتین: مشکلات و مسائل	پروفیسر ڈاکٹر حسینہ حاشیہ	۲۶۵
۳۹	کیرالہ میں مسلم خواتین کے مسائل...	کے اے صدیق حسن	۲۷۵
۴۰	پولیس اور مسلمانوں میں خلاء پر کرنے کی کوشش	عاصم جلال	۲۸۳
۴۱	پولیس اور فوج میں مسلمانوں کی نمائندگی	مولانا احسان جامی	۲۸۷
۴۲	مسلمانوں کی پارلیمان میں کم ہوتی نمائندگی	صلاح الدین	۲۸۹
۴۳	مسلم قیدیوں کی تعداد میں اضافہ: ایک لمحہ فکریہ!	ادارہ	۲۹۲
۴۴	عدلیہ سے غائب ہوتے مسلمان	ڈاکٹر قمر تبریز	۲۹۹
۴۵	ہندستانی فوج میں، مسلمانوں کی گنتی کیوں ضروری ہے؟	عزیز اے مبارکی	۳۰۶
۴۶	دیش میں کم، جیل میں زیادہ	رضوان الحق قاسمی	۳۱۶
۴۷	میڈیا مسلمانوں کی شبیہ خراب کرنے میں مصروف	جسٹس مارکنڈے کاٹجو	۳۲۶
۴۸	میڈیا کے رجحان پر قومی اقلیتی کمیشن کو تشویش	عبدالحئی خان	۳۲۸
۴۹	خاص طبقے کو نشانہ بنانے کیلئے میڈیا کا استعمال	ڈاکٹر افضل مصباحی	۳۳۲
۵۰	الیکٹرانک میڈیا اور مسلمانوں کی ذمہ داری	محمد جاوید	۳۴۳
۵۱	میڈیا میں حقائق سے چشم پوشی کا رجحان!	ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب	۳۵۷
۵۲	میڈیا اور مسلمانوں کو درپیش چیلنج	محمد علم اللہ اصلاحی	۳۶۳
۵۳	حکومت بھگوا دہشت گردوں کو گرفتار کرے	مولانا سید ارشد مدنی	۳۷۶
۵۴	اقلیتوں کے حقوق: (دستور ہند کی روشنی میں)	محمد عبدالرحیم قریشی	۳۸۰
۵۵	اقلیتوں کے حقوق اور مسلمانوں کی صورتحال	مولانا انیس الرحمٰن قاسمی	۳۹۴
۵۶	مسلم مسائل-غور وفکر کے چند گوشے	مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی	۴۰۷
۵۷	2012 میں مضطرب رہے مسلمان	عبدالقادر شمس	۴۱۱
۵۸	ہندوستانی مسلمانوں کو درپیش چیلنج اور مسائل	ابو محمد مفتی احمد نادر القاسمی	۴۱۸
۵۹	حکومت بے قصور نوجوانوں کو جلد انصاف	کے۔ رحمٰن خان	۴۳۲

۶۰	مسلمانوں پر زیادتی کرنے میں کانگریس سب سے آگے	مولانا محمود اسعد مدنی	۴۳۵
۶۱	گرفتاری کیلئے حالات پیدا کئے جاتے ہیں!	ظفر عدیم	۴۳۸
۶۲	حق کیلئے آواز اٹھانے والوں کے ساتھ بے اعتنائی	ذکاء سید	۴۴۳
۶۳	مسلمانوں کی معاشی تنگدستی اور اس کے ازالہ کے طریقے	پروفیسر ریاض عمر	۴۴۷
۶۴	مسلم مسائل کے حل کیلئے علماء کی جدوجہد	یوگیندر سکند	۴۵۱
۶۵	کیا مسلم تنظیمیں قصوروار نہیں؟	ایم ودود ساجد	۴۵۹
۶۶	مسلمانوں سے سوتیلا برتاؤ	ڈاکٹر منیش کمار	۴۶۷
	باب دوم: مسلمان اور دہشت گردی		۴۷۵
۶۷	ملک میں ہندوتوا کے نفرت آمیز نظریہ پر	ادارہ	۴۷۷
۶۸	دہشت گردی کا یہ کھیل آخر کب تک	شاہد الاسلام	۴۸۲
۶۹	سنگھ کھود رہا ہے سیکولر ہندوستان کی جڑیں	سیتارام یچوری	۴۹۱
۷۰	ایک پراسرار تنظیم بجرنگ دل؟	غوث سیوانی	۴۹۶
۷۱	بابری مسجد: پھر زخم ہرا ہوگیا دل کا	محمد عبدالرحیم قریشی	۵۰۴
۷۲	بم دھماکے اور بھگوا دہشت گردی	ڈاکٹر ابوحمنہ شہاب	۵۰۸
۷۳	گریش کرناڈ کی حق گوئی	ادارہ	۵۱۲
۷۴	سنگھ پریوار کا ماسٹر پلان: ہندوستان کو	ادارہ	۵۱۶
۷۵	ایک اور دہشت گرد شکنجے میں	ادارہ	۵۲۱
۷۶	پھندے میں پھنسے چدمبرم	ادارہ	۵۲۶
۷۷	دہشت گردی کی آڑ میں بہاری مسلمانوں پر نشانہ	ادارہ	۵۳۰
۷۸	ہندوستانی ریاستیں، مسلمان اور شکوک وشبہات	شکیل اختر	۵۳۵
۷۹	فسادات کی روک تھام: انسداد فرقہ وارانہ	ادارہ	۵۳۸
۸۰	انسداد فرقہ وارانہ تشدد بل بے سود؟	وصی احمد نعمانی	۵۴۱

۸۱	انسدادفرقہ وارانہ بل: نظرثانی مسودہ بھی	عبدالباری مسعود	۵۴۹
۸۲	انسدادفرقہ وارانہ تشدد قانون	انورعلی ایڈوکیٹ	۵۵۷
۸۳	راشٹریہ سیوک سنگھ کی دہشت گردی	محسن فارانی	۵۶۰
۸۴	مغویہ نوجوان اچانک دہشت گرد کیسے بن گیا؟	افروز عالم ساحل	۵۶۴
۸۵	مسلم نوجوانوں کی گرفتاری کا سلسلہ آخر کب تک؟	وسیم راشد	۵۷۳
۸۶	مسلم نوجوان کی گرفتاری یہ سلسلہ کب تک	ادارہ	۵۷۸
۸۷	بے قصور مسلم نوجوانوں کی گرفتاری کا سچ!	مولانا اسرارالحق قاسمی	۵۸۳
	باب سوم: بے گناہوں کی کہانی خود انھی کی زبانی		۵۸۹
۸۸	داستان بم دھماکوں کے بے گناہوں کی!	مختار عدیل	۵۹۱
۸۹	محمد عامر خان: بے گناہی کی سزا، 14 سال جیل	اے این شبلی	۶۰۴
۹۰	'پورا گاؤں میرے بیٹے کی گواہی دے گا'	فیروز احمد (والد انجینئر فصیح محمود)	۶۱۲
۹۱	آفرڈی اسٹارم: سات 'بے گناہ مسلم	اے این شبلی	۶۱۵
۹۲	اعجاز مرزا: تفتیش کاروں نے میرے بیان پر		۶۱۹
۹۳	انجینئر انصار احمد: تفتیش کے دوران عضوخاص پر		۶۲۱
۹۴	سرکاری فرقہ وارانہ بید بھاؤ:	ادارہ	۶۲۴
۹۵	خالد بے گناہ، طارق بے قصور:	سہیل انجم	۶۲۷
	باب چھارم: فرقه وارانه فسادات		۶۳۳
۹۶	فرقہ وارانہ فساد کے خلاف جنگ	عبدالحمید یوسف	۶۳۵
۹۷	ہاشم پورہ-ملیانہ فسادات کیا انصاف ملے گا؟	سدھارتھ رائے	۶۳۹
۹۸	بھاگلپور فساد کے نام پر سیاست	ادارہ	۶۴۵
۹۹	پردیس کے سہارے بہاری مسلمان	عتیق مظفر پوری	۶۴۹
۱۰۰	بہار میں روزگار کے مسائل سے مسلمان پریشان	سید شمیم انور	۶۵۲

مجموعه القاسم: جلد پنجم
مسلم مسائل اور اس کا حل

۱۰۱	بنکر صنعت مسائل اور امکانات	انیس الرحمٰن قاسمی	۶۵۷
۱۰۲	بھاگلپور فساد متاثرین دو دہائی بعد بھی انصاف	اشرف استھانوی	۶۶۰
۱۰۳	نتیش حکومت، مسلمان اور انصاف	ادارہ	۶۶۶
۱۰۴	بابری مسجد- تعمیر سے شہادت تک	رشید انصاری	۶۷۴
۱۰۵	بابری مسجد کی شہادت کے بعد ملک میں فرقہ	ادارہ	۶۸۳
۱۰۶	ممبئی فرقہ وارانہ فسادات	ادارہ	۶۸۸
۱۰۷	... اور جب ممبئی جل رہا تھا	دانش ریاض	۶۹۲
۱۰۸	ممبئی فرقہ وارانہ وارانہ فسادات متاثرین کو	زبیر احمد	۶۹۵
۱۰۹	ممبئی فسادات کے مجرم ابھی تک آزاد کیوں ہیں؟	مظفر سلطان لونگی	۶۹۸
۱۱۰	گجرات فسادات پر سیاست	ابوشامل	۷۰۱
۱۱۱	گجرات میں مسلمانوں کا قتل عام	عابد انور	۷۰۵
۱۱۲	گجرات فسادات مجرموں کو بچانے کیلئے خطرناک کھیل	سہیل انجم	۷۱۶
۱۱۳	گجرات میں نفرت اور ناانصافی کے 10 سال	ادارہ	۷۲۱
۱۱۴	گودھرا عدالتی فیصلہ: چند ابھرتے ہوئے سوالات	ڈاکٹر محمد منظور عالم	۷۲۴
۱۱۵	مودی کے دامن پر جو داغ ہیں، دھوئے نہیں جا سکتے!	جسٹس مرکنڈے کاٹجو	۷۲۹
۱۱۶	گجرات کا لہو: مودی کے تعاقب میں	ادارہ	۷۳۴
۱۱۷	گجرات مسلم کش فسادات: بے گناہ کون ہے	ڈاکٹر مشتاق احمد	۷۳۹
۱۱۸	گودھرا کو بم سے اڑانا چاہتے تھے ہندو دہشت گرد	ادارہ	۷۴۲
۱۱۹	سپریم کورٹ کی تصدیق: مودی کے خلاف	ادارہ	۷۴۷
۱۲۰	صادق جمال اور سہراب الدین انکاؤنٹر:	ادارہ	۷۵۲
۱۲۱	آسام میں فرقہ وارانہ فسادات	دلال مشرا	۷۵۶
۱۲۲	آسام میں مسلمانوں کا قتل عام اور سوشل میڈیا	عابد انور	۷۶۰

۱۲۳	آسام کے مسلمانوں کے لئے زمین تنگ	سید ماجد علی	۷۶۸
۱۲۴	فاربس گنج کی مسلم کشی نے گجرات کی یاد تازہ کردی	اشرف استھانوی	۷۷۲
۱۲۵	وزیراعظم کے 15 نکاتی پروگرام کی حقیقت	ادارہ	۷۷۸
	باب پنجم: متفرقات		۷۸۱
۱۲۶	تبلیغی جماعت تاریخ کے آئینے میں	مولانا سید محمد شاہد سہارنپوری	۷۸۳
۱۲۷	مادی تعلیم بلا تربیت، اسلامی معاشرہ کی صحت وترقی ناممکن	مولانا انور جمال قاسمی	۷۸۹
۱۲۸	عورتوں کے حقوق اور ہماری ذمہ داریاں	انیس الرحمٰن القاسمی	۸۰۳
۱۲۹	اسلام میں تعلیم اور عورت	ڈاکٹر رخسانہ نکہت لاری	۸۱۳
۱۳۰	مسلم معاشرے میں بے پردگی کا بڑھتا رجحان	ندیم اشرف	۸۲۰
۱۳۱	کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	۸۲۶
۱۳۲	یہود ونصاریٰ کی اسلام دشمنی اور قصۂ ملالہ	ابو محمد مفتی احمد نادر القاسمی	۸۳۳
۱۳۳	قرآن کی حکایت، قرآن کی شکایت	یاور رحمٰن	۸۳۹
۱۳۴	ایڈز کا شکار جنین: طب وشریعت کے آئینے میں	مفتی محمد ارشد فاروقی	۸۵۰
۱۳۵	دارالعلوم دیوبند کا قضیۂ اہتمام اور	مولانا نسیم احمد غازی مظاہری	۸۶۰

☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عالمی سازش کے نرغے میں مسلمان!

● ناموس رسالت کے علمبردار امین ملت بندہ مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی

پیغمبر اسلام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے:

”وہ وقت قریب آتا ہے، جب تمام کافر قومیں تمہیں مٹانے کے لئے مل کر سازشیں کریں گی اور ایک دوسرے کو اس طرح بلائیں گی جیسے دسترخوان پر کھانا کھانے والے لذیذ کھانے کی طرف ایک دوسرے کو بلاتے ہیں۔ کسی نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا ہماری قلت تعداد کی وجہ سے ہمارا یہ حال ہوگا؟ فرمایا: نہیں! بلکہ تم اس وقت تعداد میں بہت ہوگے، البتہ تم سیلاب کی جھاگ کی طرح ناکارہ ہوگے، یقیناً اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دل سے تمہارا رعب اور دبدبہ نکال دیں گے، اور تمہارے دلوں میں بزدلی ڈال دیں گے۔ کسی نے عرض کیا: یا رسول اللہ! بزدلی سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: دنیا کی محبت اور موت سے نفرت۔“

اس وقت دنیا بھر میں مسلمان قابل رحم حالت

میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں، وطن عزیز ہندوستان سمیت جہاں بھی مسلمان موجود ہیں چاہے وہ اکثریت میں ہو یا اقلیت میں کسی نہ کسی بہانے سے ان پر مظالم کے پہاڑ توڑے جارہے ہیں۔ اب حالت یہ ہے کہ مسلمان جس قدر ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں، شاید ہی کسی دوسری قوم پر کبھی ایسا وقت آیا ہو؟

اسلام کے دشمن ومخالفین یہود ونصاریٰ اور کفار ومشرکین متحد ہوکر مسلمانوں کے خلاف سازشیں رچ رہے ہیں۔ حیرت واستعجاب کی بات یہ ہے کہ ہم سب کچھ جانتے ہوئے بھی ان کی سازشوں کے شکار بنتے جارہے ہیں۔ اگر ہم آج بھی متحد ہوجائیں، مذہب کو مسلک پر فوقیت دیں اور کلمہ طیبہ کی بنیاد پر ایک پرچم تلے جمع ہوجائیں تو کوئی بھی سازش اور اسلام مخالف منصوبہ ہرگز ہرگز کامیاب نہیں ہوگا۔ یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مدد بھی اسی صورت میں حاصل ہوگی جب ہماری زندگی دین اور شریعت کے مطابق گزر رہی ہو۔ مذہب اور دین سے دور اور بیزار رہتے ہوئے نصرت الٰہی کی توقع رکھنا کارعبث ہے۔

مسلمانوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی مدد کا وعدہ ضرور ہے، لیکن ساتھ ہی اللہ کی مدد آنے کے لئے یہ شرط بھی ہے کہ: ''یاایھا الذین آمنوا ان تنصروا اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم'' (محمد:۷) (اگر تم اللہ کے دین کی مدد کروگے تو اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کریں گے، اور تمہارے قدموں کو ثابت کریں گے)۔

جب سے مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کے دین کی مدد چھوڑ دی ہے، اللہ تعالیٰ نے بھی مسلمانوں سے اپنی رحمت وعنایت اور مدد کا ہاتھ اٹھالیا ہے، چنانچہ آج ہر طرف مسلمانوں پر یہود ونصاریٰ کی یلغار ہے اور ہم ان کے آلہ کار بن کر بعض جگہوں پر اپنے ہاتھوں اپنے بھائی کا خون بہارہے ہیں۔ اس وقت کئی مسلم ممالک صیہونی سازش کے نرغے میں ہیں اور امریکہ کے اشارے پر ناچ رہے ہیں۔ نتیجتاً ان ممالک میں قتل وغارت گری کا بازار گرم ہے۔ خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں، کفار ومشرکین ہماری حالت پر ہنس رہے ہیں۔ اسلام کو دہشت گردوں کا مذہب قرار دے رہے ہیں، ایسے میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں اور اتحاد واتفاق کے زریں اصول کے ساتھ اپنی زندگی پرامن بسر کریں۔

''حضرت مرداس اسلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: نیک لوگ یکے بعد دیگرے رخصت ہوتے جائیں گے، جیسے چھٹائی کے بعد ردی جو یا کھجوریں باقی

رہ جاتی ہیں، ایسے ناکارہ لوگ رہ جائیں گے کہ اللہ تعالیٰ ان کی کوئی پروا نہیں کرے گا۔''

اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کو شدید اضطراب کا سامنا ہے۔ ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ عہدوں پر فائز حکومت اور انتظامیہ کے لوگوں میں سنگھی سوچ تیزی سے پروان چڑھ رہی ہے، یہی وجہ ہے کہ 'مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی'۔

مسلم قائدین وتنظیمیں اس موقع پر سر جوڑ کر بیٹھیں اور دانشمندی، اتفاق ودوراندیشی کا ملی ثبوت فراہم کرتے ہوئے مسلمانوں کے مسائل پر سنجیدہ غور وفکر ہی نہیں بلکہ، باعزت قوم جو آج ذلت وپستی اور ظلم وجبر، انحطاط کی شکار ہے ان کو کارِ مذلت سے نکال کر امن وعفت کی شاہراہ پر گامزن کرنے کیلئے مضبوط لائحہ عمل تیار کریں۔ بلاتفریق مسلک کلمہ واحدہ کی بنیاد پر مسلمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوں اور قوم وملت کے جملہ مسائل وپریشانیوں کا حل تلاش کرکے اسلام کے پیغام امن وآشتی کو عام کریں اور اس کی روشنی میں ہندوستان کی تہذیبی وثقافتی روایت کی آبیاری کریں۔

سب سے پہلے رب کائنات کا شکرگزار ہوں جس کی توفیق سے کم وقت میں بڑا کام ممکن ہوسکا۔ تنکا تنکا جمع کرکے تعمیر کیا گیا یہ عالی شان محل ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنے اور حکمراں لیڈروں کی توجہ اس جانب مبذول کرانے میں اہم کردار ادا کرے گا۔ اس موقع پر میں اپنے ان بزرگ کرم فرما علماء ودانشوروں کا بھی تہہ دل سے ممنون ومشکور ہوں جنہوں نے اپنی نیک خواہشات اور پیغامات کے ذریعہ ہماری حوصلہ افزائی فرمائی۔ مجھے پوری امید ہے کہ علماء، اہل علم، دانشوران اور عامۃ المسلمین کے لئے مجموعہ القاسم کی یہ جلد بیحد کارآمد ثابت ہوگی۔

کتنی بربادی مقدر میں تھی آبادی کے بعد
کیا بتائیں ہم پہ کیا گزری ہے آزادی کے بعد

☆☆

قصہ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں...

● ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب قاسمی

امام الہند مولانا آزادؒ نے کہا تھا:

''لوگ ہمیشہ اس کھوج میں لگے رہتے ہیں کہ زندگی کو بڑے بڑے کاموں کے لئے کام میں لائیں، لیکن نہیں جانتے کہ یہاں ایک سب سے بڑا کام خود زندگی ہوئی ، یعنی زندگی کو ہنسی خوشی کاٹ دینا ہے۔ یہاں اس سے زیادہ سہل کام کوئی نہ ہوا کہ مرجایئے اور اس سے زیادہ مشکل کام کوئی نہ ہوا کہ زندہ رہیے۔ جس نے یہ مشکل حل کرلی ،اس نے زندگی کا سب سے بڑا کام انجام دے دیا۔''

ہندوستانی مسلمان اس وقت ایسے ہی دوراہے پر کھڑا ہے جس کے' آگے کنواں پیچھے کھائی' ہے۔ ایسے میں ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے کا تصور بھی ان کے لئے آسان نہیں ہے، ایسے مشکل ترین وقت میں مسلمانوں کے لئے راحت اور نجات کی راہ فی الحال دور کی کوڑی ہے۔ اپنے ہی ملک میں مختلف مسائل اور مشکلات سے دوچار تقریباً ۲۵ رکروڑ مسلمان آخر بھروسہ کریں تو کس پر؟ یہ سب سے اہم سوال ہے۔ ایک طرف ملک کی فرقہ پرست طاقتیں ہیں جو بالکل منظّم اور متحد ہوکر اس پر حملہ آور ہیں تو دوسری طرف آزاد ہندوستان پر سب سے زیادہ حکومت کرنے والی کانگریس پارٹی۔

غور کرنے کی بات ہے کہ کانگریس واحد ایسی سیاسی جماعت ہے جس پر مسلمانوں نے آنکھ بند کرکے بھروسہ کیا اور یہ بھی سچ ہے کہ اسی پارٹی نے مسلمانوں کو بیشمار ناسور زخم بھی

دیے۔ کون نہیں جانتا ہے کہ ملک کی آزادی کے بعد سے اب تک ہندوستانی مسلمانوں پر جس قدر مظالم کے پہاڑ ڈھائے گئے ہیں اور جتنے بھی فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ہیں، مسلمانوں کی جن عبادت گاہوں کو مسمار اور شہید کیا گیا وہ سب کانگریس کی ہی مرہون منت ہیں، یہ اور بات ہے کہ اس جماعت سے وابستہ رہنما جو' پارٹی میں دماغ' کی حیثیت رکھتے ہیں، نے ہمیشہ اپنی مکاری اور عیاری کے ذریعہ اس مظلوم قوم کو بے وقوف بنایا۔ وعدوں کے نام پر لالی پوپ، انصاف کے نام پر یقین دہانی اور پسماندگی دور کرنے کے نام پر کمیشنوں کے قیام کے سوا اقلیت کو کیا ملا؟ اس سے سبھی بخوبی واقف ہیں۔ یہ باتیں ہم وثوق کے ساتھ ہم اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ کانگریس کی نیت میں خیر اور فلاح کا پہلو ذرہ برابر بھی جھلکتا تو ان کمیشنوں کی رپورٹوں پر عمل درآمد ہوتا اور ان رپورٹوں کے قیمتی دستاویز اور فائلیں وزارات یا محکموں کے تاریک کمروں کے کسی کونے میں پڑی دھول نہیں چاٹ رہی ہوتیں۔ حکومت کے مقرر کردہ کمیشنوں کے مشوروں پر عمل ہوتا تو مسلمان کی حالت دلتوں سے بدتر نہیں بتائی جاتی۔ دوسری طرف ان رپورٹوں سے ہوا کچھ نہیں مگر اس کو لے کر بی جے پی اور آر ایس ایس کے لوگ ہمیشہ طعنہ کستے رہتے ہیں۔

کانگریس حکومت میں سال 2014 میں 'قومی اقلیتی کمیشن' کے چیئرمین نے جس طرح سے اپنی عاجزی ، لاچاری اور مجبوری کا اظہار کیا ہے اس سے یہ اندازہ لگانا بہت آسان ہے کہ اس طرح کے کمیشنوں کی ملک میں کیا 'اوقات' ہے۔ کمیشن نے مسلمانوں کے دو اہم مسائل کی طرف حکومت اور اس سے متعلق اداروں کی توجہ مبذول کرائی ہے جس سے ان کی سنجیدگی اور اس تعلق سے کچھ نہیں کرپانے پر ان کی بے بسی صاف جھلکتی ہے۔ ایک طرف انہوں نے کمیشن کو ملنے والی قلیل رقم پر احتجاج کیا ہے تو دوسری طرف مسلم نوجوانوں کو بلاوجہ دہشت گرد بتائے جانے پر میڈیا کی شکایت پریس کونسل آف انڈیا کے چیئرمین جسٹس مرکنڈے کاٹجو سے کی ہے۔ یہاں پر ان کے دونوں اہم مطالبات کا سرسری جائزہ

لینا بہت ضروری ہے چونکہ اس سے ہمارے اس دعوے کو تقویت ملتی ہے کہ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور...

قومی اقلیتی کمیشن کے سابق چیئرمین جناب وجاہت حبیب اللہ نے مرکزی حکومت سے شدید احتجاج کرتے ہوئے روپے کی قلت کی شکایت کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ پیسے کی کمی کے باعث اقلیتی امور کی نگرانی کرنے والا یہ ادارہ اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے سے قاصر ہے، عملہ کی تنخواہیں اور الاؤنس ادا کرنے کے بعد اتنی رقم نہیں بچتی کہ کمیشن کوئی کام کرے، جو اس کی ذمہ داری میں شامل ہے۔ اپنی ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے انہوں نے کہا ہم نہ تو کوئی کانفرنس کا انعقاد کر سکتے ہیں اور نہ بین مذاہب اجلاس اور نہ ہی اقلیتوں کے حقوق کی پامالی سے متعلق مقدمات کو آگے بڑھا سکتے ہیں۔ ان کے بقول کمیشن کو مسلسل ایسی شکایات موصول ہوتی رہتی ہیں جن پر قانونی چارہ جوئی کی اشد ضرورت ہے، مگر اس کیلئے کوئی قانونی بنیاد موجود نہیں ہے۔ لاء آفیسر تو ہے، مگر مقدمات کیلئے کوئی مناسب قانونی سیل نہیں ہے۔

جبکہ قانون کے مطابق کمیشن کے اخراجات مرکزی حکومت کی براہ راست گرانٹس کے ذریعہ پورے ہونے چاہئیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقلیتی حقوق کا ادارہ اقلیتی امور کی وزارت کو بجٹ سے ملنے والی رقم پر کسی طرح چل رہا ہے۔ اقلیتی کمیشن کا سیکشن ۱۰؍ کہتا ہے کہ مرکزی حکومت گرانٹس کے ذریعہ کمیشن کو پیسہ دے گی، تاکہ اس مقصد کیلئے اس کا استعمال کیا جاسکے۔ اس واضح نظم کے باوجود کمیشن کو جو بھی پیسہ ملتا ہے وہ اقلیتی امور کی وزارت سے ہی ملتا ہے اور یہ رقم اتنی قلیل ہوتی ہے کہ اس کے لازمی اخراجات بھی اس سے پورے نہیں ہو پاتے۔ 2014 میں وزارت نے کمیشن کو محض ۳ء۵ کروڑ روپے دیے ہیں۔ اس قلیل رقم پر سابق چیئرمین وجاہت حبیب اللہ نے عدم اطمینان کا اظہار کیا اور اس تعلق سے اقلیتی امور کی وزارت کو خط بھیجا۔ کمیشن کے فرائض میں مرکز اور ریاستوں کے بنائے

ہوئے قوانین کے ذریعہ فراہم کردہ اقلیتوں کو دیئے گئے حقوق کی نگرانی، اقلیتوں کی حفاظت نہ ہونے اور حقوق سے محرومی کی شکایات پر نظر رکھنا، ان معاملات کو متعلقہ حکام کے ساتھ اٹھانا اور سرکار کو سفارشات پیش کرنا ہے، لیکن وجاہت حبیب اللہ نے افسوس کے ساتھ کہا تھا کہ مناسب فنڈ نہ ہونے کی وجہ سے یہ تمام کام بہتر طریقے سے نہیں کئے جاسکتے۔ انہوں نے کہا کہ سال 1992 میں پارلیمنٹ کے قانون کے ذریعہ تشکیل دیئے گئے کمیشن کا کام پانچوں تسلیم شدہ اقلیتوں کے مفادات کا خیال رکھنا ہے مگر وہ اپنا یہ فرض ادا کرنے سے قاصر ہے۔

قومی اقلیتی کمیشن نے اس بات پر بھی تشویش کا اظہار کیا ہے کہ دہشت گردی کی کسی بھی واردات کے بعد فوراً اسے ایک خاص فرقہ سے جوڑ دیا جاتا ہے اور میڈیا اسی کو نشانہ بنانے میں مصروف ہوجاتی ہے، اس سلسلہ میں انہوں نے ۲۱؍ فروری ۲۰۱۳ء کی شام حیدرآباد کے دلسکھ نگر میں دہشت گرانہ واقعہ کا حوالہ دیتے ہوئے پریس کونسل آف انڈیا کے چیئرمین جسٹس مرکنڈے کاٹجو کو ایک مکتوب لکھ کر کہا تھا کہ میڈیا کی منفی رپورٹوں کو ذمہ دار افراد نے مختلف انداز سے لیا ہے۔ مثلاً چنئی کے انسٹی ٹیوٹ فار ٹوپیکل اسٹڈیز کے جی رمن کا آؤٹ لک میں شائع ایک مقالہ کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا:

’’اب یہ رجحان بن گیا ہے کہ اگر کہیں دہشت گرد ہے تو وہ مسلمان ہے اور اگر وہ مسلمان ہے تو اس کا تعلق انڈین مجاہدین سے ہے اور اگر وہ انڈین مجاہدین سے وابستہ ہے تو اسے پاکستانی آئی ایس آئی کی پشت پناہی حاصل ہے۔ ان سے ایسا لگتا ہے کہ پولیس اور سیکورٹی ایجنسیاں اس کی عادی ہوچکی ہیں‘‘۔

وجاہت حبیب اللہ نے مکتوب میں لکھا ہے کہ اس طرح کے رجحان کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے اور اس کی حوصلہ شکنی کی جانی چاہئے، یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ایسے ماحول میں بھی کچھ آوازیں اٹھتی ہیں، لیکن وہ بکھری ہوئی ہیں اور یہ آوازیں بھی میڈیا کے ذریعہ

اٹھائی جاتی ہیں۔

اقلیتی کمیشن نے پریس کونسل کے چیئر مین سے اپیل کی ہے کہ میڈیا کے ذمہ داروں کو مشورہ دیا جائے کہ وہ خبروں کو جاری کرنے میں احتیاط سے کام لیں اور اس طرح کی حساس خبروں کی نگرانی کی جائے جو ملک کے ایک بڑے طبقہ کیلئے غم وغصہ کا باعث بنتی ہیں۔ پریس کونسل کے چیئر مین جسٹس کاٹجو نے اقلیتی کمیشن کے چیئر مین کو مذکورہ بالا مکتوب کا جواب دیتے ہوئے تحریر کیا کہ ہمارے ملک میں بم دھماکے اور دہشت گردانہ کارروائیاں ہوتی رہتی ہیں اس بارے میں جب تک قصوروار کی شناخت نہ کرلی جائے، اس وقت تک اس کو مجرم قرار نہ دیا جائے، کیونکہ ان کے نظریہ میں اکثر بےقصور مسلم نوجوانوں کو گرفتار کرلیا جاتا ہے اور پھر وہ برسوں جیلوں میں قید رہتے ہیں، یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ ہمارے ملک میں تحقیقات کا کوئی سائنٹفک طریقہ نہیں ہے اور نہ ہی ہمارا پولیس عملہ تربیت یافتہ ہے، جبکہ مغربی ملکوں میں کوئی واردات ہوتی ہے تو پولیس سب سے پہلے وہاں سے ثبوت جمع کرتی ہے۔ انگلیوں کے نشانات لئے جاتے ہیں، خون میں سنی ہوئی چیزیں جمع کی جاتی ہیں اور انہیں تجربہ گاہ میں بھیجا جاتا ہے۔ اس کے بعد ڈی این اے ٹسٹ ہوتا ہے۔ ان ثبوتوں کی روشنی میں مجرم کی شناخت کی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں گرین ریور سیریل کلر کیس کی مثال پیش کرتے ہوئے بتایا کہ اس کیس میں مجرم کی شناخت میں ۲۰؍سال لگ گئے تھے۔ انہوں نے مزید کہا کہ بعض حلقوں کا یہ شبہ ہے کہ مسلمان ہی دہشت گرد ہوتے ہیں۔ پولیس مسلمانوں کو گرفتار کرلیتی ہے اور پھر انہیں ضمانت نہیں مل پاتی اور سرکاری وکیل ان کی ضمانت کی مخالفت کرتا رہتا ہے۔ اس کی حالیہ مثال دہلی کے عامر خاں ہیں، جنہوں نے ۱۷؍سال کی عمر میں گرفتار کیا گیا تھا اور ۱۴؍سال قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ آخر کار عدالت نے انہیں بے گناہ ثابت کیا۔ ہندوستان میں دوسرے مسلمانوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ بڑی تعداد میں بم دھماکوں کے ایسے معاملے ہیں جن میں مسلمانوں کو غلط طریقہ سے پھنسایا جاتا ہے۔

جسٹس کاٹجو نے واضح کیا کہ وہ میڈیا سے بات چیت اور ٹی وی انٹرویو میں کہتے رہے ہیں کہ ہندوستان مختلف مذاہب کا گہوارہ ہے اور اس کو صرف سیکولرزم کے راستے پر چل کر ہی متحد رکھا جاسکتا ہے۔

ملک کے سیکولر مزاج کی حامل شخصیات کے جذبات و خیالات اپنی جگہ، ان کی اقلیتوں کے حقوق کی بازیابی اور جمہوریت کی بقا کیلئے تشویش کے باوجود حکومت، وزارت، خفیہ ایجنسیاں، پولیس اور اعلی عہدوں پر فائز افسر شاہوں کے نظریہ میں کوئی تبدیلی نہیں آرہی ہے، یہی وجہ ہے کہ فرقہ وارنہ فسادات اور دہشت گردی کے نام پر مسلم نوجوانوں کو گرفتار اور ہراساں کیے جانے کا سلسلہ دراز ہوتا جارہا ہے۔

اس حقیقت سے انکار کی قطعی گنجائش نہیں کہ جب سے ہندوستان کے روابط اسرائیل سے بڑھے ہیں اور یہاں کے وزراء اور خفیہ ایجنسیوں کا دورۂ اسرائیل تواتر سے ہونے لگا ہے ملک کے مسلمانوں کی پریشانیاں بڑھ گئیں ہیں۔ انکی آواز اور مطالبات پر کوئی کان دھرنے کو تیار نہیں ہے، جس کا نتیجہ ہے کہ واردات کوئی انجام دے شک کی سوئی مسلمانوں ہی پر اٹھتی ہے۔ یہ سب ملک کی خفیہ ایجنسی آئی بی کی منصوبہ بندی ہے جو اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد کے نقش قدم پر گامزن ہے۔ موساد دنیا کی سب سے خطرناک ایجنسی ہے، اس کے بارے میں یہ بات کافی مشہور ہے کہ ایک بار اس نے کوئی ارادہ کرلیا ہے تو اس کو دیر یا سویر انجام دے کر ہی دم لیتی ہے، چاہے اس کا دشمن سات سمندر پار جا کر کیوں نہ چھپ جائے۔ یہ اسلام اور مسلمانوں کی عظیم دشمن ایجنسی ہے، مسلمانوں کے بڑے بڑے رہنما اور عالم دین کو قتل کرانے میں اس کا ہاتھ رہا ہے، اس لئے وطن عزیز کا اس سے بڑھتا رشتہ ملک کی سب سے بڑی اقلیت کیلئے تشویش کا باعث ہے۔

مجموعہ القاسم کی اس جلد میں پوری کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو درپیش سبھی مسائل کا احاطہ کیا جائے۔ سیاست، عدلیہ، پارلیمنٹ، اسمبلیز تعلیم، جیل،

سرکاری نوکری، پولیس اور فوج میں مسلمانوں کی نمائندگی کے ساتھ مسلم مسائل پر مختلف تنظیمیں، این جی اوز اور اخبارات ورسائل کی رپورٹیں اور موجود شواہد کی بنیاد پر مکمل بحث کی گئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اوقاف کی اراضی پر غیر قانونی اور حکومتی قبضہ، ملک بھر کے فرقہ وارانہ فسادات، دہشت گردانہ واقعات، مسلم نوجوانوں کی گرفتاری کے پیچھے ہندو دہشت گردوں کی منصوبہ بند سازش اور بے گناہی کی سزا کاٹ کر جیل سے رہا ہونے والے مسلم نوجوانوں کی کہانی ان کی زبانی، خواتین کے حقوق ومسائل کے علاوہ علماء، قائدین، دانشور اور صحافیوں کے مضامین وخیالات اس شمارہ کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ مضامین اور رپورٹیں ماضی قریب کی ہیں، اس درمیان حکومت بدل گئی اور وزارت کے قلم دان میں ہیر پھیر ہوتی رہتی ہے، ایسے مضامین کی شمولیت کا مقصد ان مسائل کی طرف توجہ مبذول کرانا ہے جو حل طلب ہیں، حکومت چاہے جس پارٹی کی ہو اور وزارت چاہے جس کو بھی ملی ہو۔ اس لئے قارئین مضامین کے مطالعہ کے وقت اس بات کو ذہن میں رکھیں۔ ان مضامین کو اپ ٹو ڈیٹ کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے پھر بھی کمی کا امکان ہے، لیکن اس کی افادیت سے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ دعویٰ تو نہیں کرتے، لیکن کم وقت میں بہت کچھ مواد فراہم کرنے کا ہمیں قطعی یقین ہے۔ مواد کی جامعیت پر شک وشبہ کی گنجائش اس لئے نہیں ہے کہ یہ سب ملک کے معتبر اخبارات ورسائل اور انٹرنیٹ سے لئے گئے ہیں۔ ہفت روزہ نئی دنیا، روزنامہ انقلاب، روزنامہ راشٹریہ سہارا، روزنامہ ہندوستان ایکسپریس، ہفت روزہ چوتھی دنیا، انڈیا ٹوڈے، نوبھارت ٹائمز اور ٹائمز آف انڈیا کے ہم بیحد ممنون ومشکور ہیں کہ ان مضامین کی وجہ سے ہی مجموعہ القاسم ایک تاریخی دستاویز بن سکا ہے۔

☆☆

حقیقت کائنات سے بعید اس دوری کا واحد علاج اس کے سوا دوسرا نہیں ہے کہ قدیم و جدید علوم کے حاملین مل بیٹھ کر قدیم وجدید کی اس دوری کو قرب میں لانے پر اپنی تمام تر فکری قوتوں کو استعمال کر کے مراد نبوت کی تکمیل کریں۔

دو لفظوں میں خلاصہ ہے یہ تعلیم نبوت کا
تمدن سے تدیّن کی جدائی موت ملت ہے

پاسبان انسانیت عزت مآب عالی جناب محمد حامد انصاری صاحب

نائب صدر جمہوریہ ہند

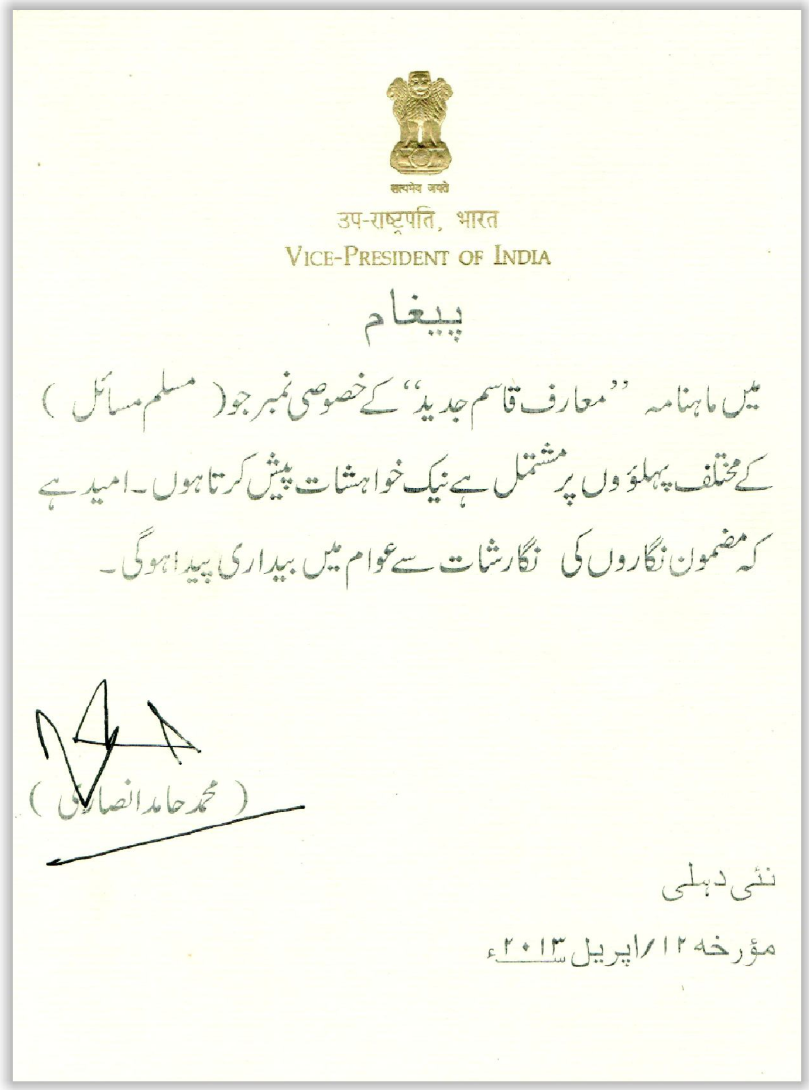

सत्यमेव जयते

उप-राष्ट्रपति, भारत

VICE-PRESIDENT OF INDIA

پیغام

میں ماہنامہ ''معارف قاسم جدید'' کے خصوصی نمبر جو (مسلم مسائل) کے مختلف پہلوؤں پر مشتمل ہے نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔ امید ہے کہ مضمون نگاروں کی نگارشات سے عوام میں بیداری پیدا ہوگی۔

(محمد حامد انصاری)

نئی دہلی

مؤرخہ ۱۲/اپریل ۲۰۱۳ء

خطیب الاسلام حضرت اقدس مولانا محمد سالم قاسمی

مہتمم دارالعلوم دیوبند (وقف)، صدر کل ہند مجلس مشاورت ورئیس جامعہ دینیات دیوبند

الجامعۃ الاسلامیۃ دار العلوم دیوبند "وقف" الہند

AL-JAMIATUL-ISLAMIA

DARUL - ULOOM, DEOBAND (WAQF) -247554 (U.P.) INDIA

التاریخ ________ الرقم ________

اخی فی اللہ مولانا مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی صاحب

بانی ومہتمم جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ سپول بہار ومدیر اعلیٰ ماہنامہ معارف قاسم جدید دہلی

وفقکم اللّٰہ لما فیہ خیر الاولیٰ والآخرۃ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دور حاضر کا فوری حل طلب مسئلہ!!!

ملت اسلامیہ ہندیہ کو آزادئ وطن کے بعد جن صبر آزما فکری آزمائشوں اور جان و مال، عزت وآبرو کی بے مثال بربادیوں سے دوچار ہونا پڑا، تاریخ کے اس بدترین عہد میں بھی ملت اسلامیہ کو سب کچھ جھیلنے کے باوجود ملک ووطن سے محبت ووفاداری پر اور دین وایمان کی استقامت کے ساتھ اپنے قومی وجود اور ملی خصوصیات اسلامی کے تحفظ کی راہ میں زبردست طوفان سے گذرنا پڑا، لیکن بحمد اللہ ومتوکلاً علی اللہ نہ صرف کامیاب ہوئی بلکہ شدت احوال کے پیش نظر اگر یہ کہا جائے کہ ملت اسلامیہ ہند، نے وہی تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا ہے کہ جو ماضی کی صلیبی جنگوں سے نبرد آزائی کے دور میں ملت نے اپنے اسلامی اور دینی وجود کی برقراری کیلئے انجام دے کر صفحات تاریخ کو کبھی نہ ختم ہونے والی روشنی عطا کی تھی۔

اس روشن وتابناک ماضی میں ملت کی رہنما ان عظیم المرتبت شخصیات کا اور اجتماعی اداروں میں بطور خاص عالمی مرکز علم وعرفان دارالعلوم دیوبند (وقف) کا وہ ہمت افزا کردار بھی ناقابل فراموش رہا ہے، کہ جس میں اس نے نزاکت حالات میں محسن انسانیت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کے شدائد کو اسوۂ صبر وتحمل بنا کر ملت اسلامیہ کے قدموں کو اکھڑنا تو در کنار ڈگمگانے تک سے محفوظ رکھا۔

ان تمام آلام اور صبر آزما حالات میں صرف علم صحیح ہی ملت کیلئے وہ مینارۂ نور ثابت ہوا کہ جس کے فاران کی چوٹیوں سے بلند ہوکر شدائد ومصائب کی بے شمار وادیوں سے گذرنے والی امت کے کردار پر رب کریم نے اولاً ابدی گواہ، سرزمین مدینہ منورہ کو بنایا، پھر علم کی نقل مکانی سے بغداد کو عزت بخشی، پھر اسی علم کی نقل مکانی نے دہلی کی عزت کو بلندی عطا کیا، اسکے بعد بتقاضائے حالات مشیت ربانی نے تحفظ علم کا مرکز "دارالعلوم دیوبند (وقف)" کو قرار دیا۔ جو آج بھی اسی اسوہ پر ثابت قدم ہے۔

علم کی دیوبند کی جانب نقل مکانی کے فوراً بعد غاصب فرنگی اقتدار نے از راہ عناد علم کو قدیم وجدید کی غیر واقعی بنیادوں پر تقسیم کر دیا، علوم اسلامیہ کو قدیم بنا کر سیاستاً اسکو بے اتفاقی کا موقف دینا تھا، اور عصری تمدنی علوم کو بعنوان جدت دلکش وجذاب بنانا تھا۔

یہ غیر سنجیدہ نفسیاتی تجزیہ طبعاً مؤثر ثابت ہوا اور علم کے ساتھ حقیقت ناشناسی کی بنیاد پر ملت اسلامیہ کی نئی نسل اس سے غیر معمولی طور

DIAL! +91-1336-222452 - EMAIL: sufyanqasmi@yahoo.com - sufyanqasmi@gmail.com.
Mobile : +91-9897064190, Phone + Fax : 91=1336-222452

الجامعۃ الاسلامیۃ دار العلوم دیوبند "وقف" الہند

AL-JAMIATUL-ISLAMIA

DARUL - ULOOM, DEOBAND (WAQF) -247554 (U.P.) INDIA

التاریخ ________ الرقم ________

پر متاثر ہوئی۔

آج ملت کے ارباب بست وکشاد کے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ وہ جدید صالح کے قائل نہیں ہیں۔ بلکہ قدیم نافع کی نافعیت کا مسلم نسل میں یقین کامل پیدا کرنا ایک غیر معمولی اہم مسئلہ بن گیا ہے، کیوں کہ اس تمدنی علم کے قطرے کو دریا سمجھنا اور تدیّن علم کے سمندر کو بدفہمی سے قطرہ باور کرنا دونوں فاسد فکر ہیں، بس اس معکوس فکر کی تبدیلی درحقیقت آج اولین حل طلب مسئلہ ملتا ہے۔ گویا آج کے تمدنی علوم وہ تاریک ترین شب پرستی ہے کہ جس نے نور آفتاب سے استفادہ کا باب بینا نگاہوں کے لئے بند کر دیا ہے، لیکن یہ اپنی تقصیر لائق اعتراف ہونی چاہئے کہ آج تدیّن علوم کا تمدن علوم سے ارتباط تقریباً مکمل طور پر منقطع ہے، جبکہ ارشاد نبوت۔

("اِنّ الدنیا خُلِقت لکم" یہ دنیا تمہارے لئے ہی پیدا کی گئی ہے،) واضح رہنما ہے، کہ اس مادی کائنات میں بسنے والوں کی تخلیقی تکمیل نہ صرف تدینی ارتقا سے ممکن ہے اور نہ صرف تمدنی ارتقا سے۔

لہٰذا حقیقت کائنات سے بعید اس دوری کا واحد علاج اس کے سوا دوسرا نہیں ہے کہ قدیم وجدید علوم کے حاملین مل بیٹھ کر قدیم وجدید کی اس دوری کو قرب میں لانے پر اپنی تمام تر فکری قوتوں کو استعمال کر کے مراد نبوت کی تکمیل کریں۔

دو لفظوں میں خلاصہ ہے یہ تعلیم نبوت کا
تمدن سے تدیُّن کی جدائی موتِ ملت ہے

(حضرت مولانا) محمد سالم قاسمی (صاحب)
مہتمم دارالعلوم دیوبند (وقف)
۲۹ / جمادی الاولی ۱۴۳۴ھ مطابق ۱۱/ اپریل ۲۰۱۳ء
نزیل دہلی

محمد سالم القاسمی — رئیس الجامعۃ — دارالعلوم دیوبند (وقف) الہند

DIAL! +91-1336-222452 - EMAIL: sufyanqasmi@yahoo.com - sufyanqasmi@gmail.com.
Mobile : +91-9897064190, Phone + Fax : 91=1336-222452

مدبر اسلام حضرت اقدس مولانا سید محمد رابع حسنی الندوی

ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، صدر عالمی رابطہ ادب اسلامی

إدارة شؤون التعريف والتصديق
ندوة العلماء
ص ب – ٩٣ – لكناؤ (الهند)

بسم الله الرحمن الرحيم

Nadwatul Ulama
P.O. Box: 93, Lucknow -226007, (INDIA)
Ph: 2740151, Fax: 2741231

التاريخ Date:

مسلم مسائل امکانات اور حل

الحمد لله رب العالمين، و الصلاة و السلام على سيد المرسلين خاتم النبيين سيدنا محمد، و علىٰ آله و صحبه الغر الميامين، و من تبعهم بإحسان إلى يوم الدين، و دعا بدعوتهم إلىٰ يوم الدين، أما بعد:

دعوت کا کام مسلمانوں کا خصوصی فریضہ قرار دیا گیا ہے، اور اس کو اسلامی زندگی کے قیام اور اس کی اثر پذیری کا ذریعہ بنایا گیا ہے، چنانچہ دعوت اسلامی کے عمل کو جتنی حکمت اور مخلصانہ جذبہ سے انجام دیا گیا اسی قدر اسلامی زندگی کو مقبولیت اور کامیابی حاصل ہوئی، ہم کو مسلمانوں کی تاریخ میں اس کی واضح مثالیں ملتی ہیں۔ آغاز اسلام کے مکی دور میں جس عزیمت اور اخلاص سے یہ کام کیا گیا اسی کے لحاظ سے مسلمانوں کو آگے کے لئے طاقت وعزت حاصل ہوئی۔

اسلام میں دعوت کے کام میں جبر اور زور دستی سے پرہیز کی تلقین کی گئی ہے، اور نصیحت وترغیب کے طریقوں کو اپنانے پر زور دیا گیا ہے، اور اس کے ساتھ خود داعی کی حسن سیرت واخلاق کی اہمیت بتائی گئی ہے، اور تاریخ بتاتی ہے کہ اسلام کی مقبولیت اور اثر انگیزی میں داعی کی سیرت اور حسن اخلاق کا عملی اظہار اور مخاطب کی نفسیات کا لحاظ مؤثر عامل رہا ہے۔ بعض وقت کسی ایک واقعہ سے پوری پوری جماعت راہ ہدایت پا گئی ہے۔ تاریخ میں اس کے متعدد واقعات ہیں، صلح حدیبیہ کے وقت سے دو سال تک جو آپس میں ملاقات اور میل جول کا موقع حاصل ہوا، اس میں غیر معمولی طریقہ سے دعوت کے کام کو کامیابی ملی۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ غیروں کو مسلمانوں اور ان کے درمیان ملاقات ومعاملات کے ذریعہ مسلمانوں کے اخلاق وحسن سیرت اور انسانیت نوازی سے واقف ہونے کا موقع ملا، اور ان کو اسلام اور مسلمانوں کے سلسلہ میں جو غلط فہمیاں تھیں وہ دور ہوئیں۔

ہمارے ملک ہندوستان کی صورت حال بھی کچھ ایسی ہی ہے، یہاں مسلمان بڑی تعداد میں ضرور ہیں، لیکن ان کے ہموطن ان کے صحیح اسلامی کردار واخلاق سے واقف نہیں ہو پاتے، جس کی بڑی وجہیں دو ہیں: ایک تو یہ کہ مسلمانوں کا بڑا طبقہ خود اسلامی اخلاق وکردار کو اختیار کرنے میں کوتاہ نظر آتا ہے، وہ اپنی اسلامی سیرت وکردار کا پوری طرح حامل نہیں دیکھا جاتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ غیروں کے ساتھ میل جول میں مسلمان عموماً اس کی کوشش بھی نہیں کرتے کہ غیروں کو اسلامی اخلاق ومعاملات سے واقف کرائیں اور ان کے ذہنوں میں جو غلط فہمیاں یا بدگمانیاں ہیں وہ دور کریں۔ ان کی یہ کوتاہی غالباً اس لئے بھی ہے کہ اکثر مسلمان امت دعوت ہونے کے باوجود امت

دعوت ہونے کا احساس نہیں رکھتے، اگر ان کو یہ احساس ہو اور وہ اس کے تقاضے کو پورا کریں تو اس کے بہت اچھے نتائج سامنے آئیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس امت کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ ﴿و كذلك جعلناكم أمة وسطاً لتكونوا شهداء على الناس، و يكون الرسول عليكم شهيداً﴾ (سورہ بقرہ:۱۴۳) (ترجمہ) اور ہم نے تم کو ایسی ایک جماعت بنادی ہے جو اعتدال والی (اور معیاری سطح) پر ہے، تاکہ تم لوگوں پر گواہ (اور ان پر نظر رکھنے والے) ہو، اور تمہارے لئے رسول (ﷺ) گواہ ہوں)۔ اور فرمایا کہ ﴿كنتم خير أمة أخرجت للناس، تأمرون بالمعروف و تنهون عن المنكر، و تؤمنون بالله﴾ (سورہ آل عمران:۱۱۰) (ترجمہ) تم لوگ اچھی جماعت ہو کہ جو لوگوں کے لئے ظاہر کی گئی، تم نیک کاموں کو بتلاتے ہو، اور بری باتوں سے روکتے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہو)۔

چنانچہ یہ امت معتدل ومعیاری امت اور قوموں کی گواہ اور ان پر نظر رکھنے والی امت ہے، اپنے سامنے کی قوموں پر نظر رکھنے اور ان کی غلط کاریوں اور گمراہیوں کی نشان دہی کرنے والی امت ہے، اور جب اس کو یہ منصب دیا گیا ہے تو اب اس کا فرض بنتا ہے کہ اس منصب کا حق ادا کرے۔

دنیا کے وہ ممالک جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں، اور وہاں اقتدار ان کے ہاتھوں میں ہے، وہاں اصلاح حال واصلاح فکر کا یہ کام زیادہ تر حکومتی ذرائع سے کیا جاتا ہے، اور اس طرح ملک وقوم کے افراد کو غلط اور مضر کاموں سے روکا اور ان سے بچایا جاتا ہے، اور اصلاح ودعوت کا کام عوامی پیمانہ پر بھی عوامی ذرائع سے کیا جاتا ہے، اور یہ ذمہ داری دانشوروں پر آتی ہے، اس سے ﴿تأمرون بالمعروف و تنهون عن المنكر﴾ کی تعمیل ہوتی ہے، لیکن وہ ملک جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں، وہاں حکومتی پیمانہ پر تو یہ کام انجام نہیں دیا جاسکتا، لیکن أمر بالمعروف و نهي عن المنكر کا عمل بہرحال ملک کے اہل شعور طبقہ کے ذمہ آتا ہے، اور اس طرح ﴿شهداء على الناس﴾ یعنی دوسروں کے نگراں اور رہنما ہونے کا جو منصب ہے اس کے تقاضوں کی تعمیل کی جاسکتی ہے۔

ہندوستان میں ہمارے سامنے یہی صورت حال ہے، ہم بحیثیت مسلمان کے یہاں کے اپنے ہم وطنوں کو ان سب باتوں سے آگاہ کرسکتے ہیں جن سے یہ آگاہ نہیں ہیں کہ یہ عالم رنگ وبو تنہا اللہ رب العالمین کا بنایا ہوا ہے، اور وہی تنہا اس کو چلا رہا ہے، اور اسی نے اس میں بسنے والوں کی ضرورت اور حاجت کے لحاظ سے ہر طرح کا سامان مہیا کیا ہے، لیکن اس بات کی تاکید کی ہے کہ زندگی کو انسانیت کی صالح قدروں کو اختیار کرتے ہوئے گزارا جائے، اور اپنے مالک ومحسن کے احسان کو مانا اور اس کا شکر گذار ہوا جائے، اور وہ اس ذات وحدہ لاشریک کی عبادت اور اس کے حکموں کی تابعداری کے ذریعہ ہی ہوسکتا ہے جو وحی کے ذریعہ نبی (ﷺ) کے واسطہ سے معلوم ہوتے ہیں۔ امت اسلامیہ کا یہ فریضہ رکھا گیا ہے کہ وہ ان باتوں سے واقف کرائے اور خراب اور برے کاموں سے بچنے کی تلقین کرے، اور نیک باتوں پر عمل نہ کرنے والوں پر نظر رکھے کہ قیامت کے روز جب رب العالمین کے سامنے پیشی ہوگی تو کہہ سکے کہ رب العالمین! ہم نے کوشش کی اور ہم نے قوموں کا عمل دیکھا، اور اس طرح وہ اپنے اردگرد کی قوموں کے بارے میں گواہی دے سکیں گے۔

اور جواب دہی کے اسی عمل کے لئے اللہ تعالیٰ نے قیامت کا دن رکھا ہے، اور حساب وکتاب کے انجام پا جانے پر دوبارہ راحت وتکلیف کی طویل ترین بلکہ نہ ختم ہونے والی زندگی رکھی ہے، وہ حساب کتاب سے حاصل ہونے والے نتیجہ کے مطابق ہوگی۔ غلط کاروں کو سزا اور نیکو کاروں کو جزا ملے گی۔

دعوتی عمل کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ انسانی زندگیوں میں استواری پیدا ہوتی ہے، اور نیکی وبدی کے فرق کا سمجھنا اور اس کے تحت اپنی زندگیوں کو انسان کے اعلیٰ منصب کے مطابق گذارنا آسان ہو جاتا ہے۔ اسلام نے زندگی کو اپنے پروردگار کے حکم کے مطابق گذارنے کی اہمیت وضرورت کو بتانے کے لئے بار بار نبی بھیجے اور ان کو وحی کے ذریعہ اپنے احکام بتائے۔ اور آخر میں ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ (ﷺ) مبعوث کئے گئے۔ انہوں نے جو تعلیمات ہم کو پہونچائیں وہ انسانی زندگی کے لئے نہایت موزوں اور کارآمد تعلیمات ہیں، ان میں زندگی کی سہولتوں کی رعایت بھی رکھی گئی ہے اور امن وآشتی، آپسی بھائی چارے اور خیر خواہی و ہمدردی کا پیغام بھی ہے، ان میں انسانوں کی سلامتی اور حسن کردار کو اہم جگہ دی گئی ہے۔ یہ اسلام کی ایسی صفت ہے کہ اس پر اس کا نام بھی ''سلم'' سے مشتق ہوا، جس کے معنی امن وآشتی کے ہیں، لہذا مسلمانوں کا فرض بنتا ہے کہ وہ اس پیغام امن وخیر پسندی سے دوسروں کو واقف کرائیں، اور بغیر کسی زور دستی کے لوگوں کو اس کو سمجھنے پر آمادہ کریں، اس کے لئے جیسے ماحول اور جیسے حالات سے واسطہ اور تعلق ہو ان کا لحاظ کرتے ہوئے دعوت کا کام انجام دیں، اس میں انسانوں کی خیر خواہی بھی ہے اور عالمی سطح پر بھائی چارہ اور خیر پسندی بھی ہے۔

دعوت کے اس عظیم کام کے لئے ہم کو جن وسائل کی ضرورت ہے، ان میں اخلاقی وسائل بھی ہیں اور تدبیری وسائل بھی۔ ''تدبیری وسائل'' میں مخاطب کی زبان سے واقفیت اور ان کا استعمال بڑی اہمیت رکھتا ہے، دعوت کا کام جس ماحول میں کرنا ہو اس ماحول کی مروجہ زبان کو اس کے دلنشیں اسلوب کے ساتھ اختیار کرتے ہوئے استعمال کرنا مؤثر ذریعہ ثابت ہوا ہے۔ اس کے لئے اس زبان میں مہارت پیدا کرنی ہوتی ہے، قرآن مجید میں اس کی طرف اس طرح اشارہ ملتا ہے، فرمایا گیا: ﴿ و ما أرسلنا من رسول إلا بلسان قومه ليبين لهم ﴾ (سورہ ابراہیم:۴) (ترجمہ) اور ہم نے تمام (پہلے) پیغمبروں کو (بھی) ان ہی کی قوم کی زبان میں پیغمبر بنا کر بھیجا ہے تاکہ ان سے (وضاحت کے ساتھ) بیان کریں۔

اور ہم جب ہندوستان میں ہیں تو یہاں کے اعتبار سے ہم کو کام کرنا ہوگا، اور ہمارا یہ ملک مختلف تہذیبوں، مختلف زبانوں اور مختلف مذہبوں کا ملک ہے، اور یہ اپنے رقبے کے اعتبار سے بھی بہت وسیع ہے، اور طبعی حالات کے لحاظ سے بھی تنوع رکھتا ہے، اسی تنوع کی وجہ سے یہاں کا دستور بنانے والوں نے اس کو جمہوری اور سیکولر دستور کا ملک طے کیا، جمہوری اس لئے کہ سب کو یکساں حقوق حاصل ہوں، اور سیکولر اس لئے کہ کسی ایک مذہب یا تہذیب والے کو دوسرے کے مذہب اور تہذیب کے ساتھ زبردستی اور زیادتی کرنے کا حق نہ ہو۔ اسی کی بنیاد پر یہاں پر مختلف مذاہب اور مختلف ثقافتوں والے آپس میں مل جل کر رہتے ہیں، اور ملک کی سلامتی اور وحدت کے لئے یہی بات ذریعہ بنی ہوئی ہے، یہاں رواداری کی صفت ہر فرقہ اور ہر گروہ کو اختیار کرنا ملک کے بنیادی مفاد میں ہے،

اس بات کو ملک کے ہر طبقے کو خواہ وہ حکومتی ہو یا عوامی ہو، اور ہر فرقے، ہر تہذیب اور ہر مذہب، ہر زبان کے لوگوں کو سمجھنا ہے، اور رواداری کو نہ اختیار کرنے کی صورت میں ملک کے مختلف طبقات کی نوعیت شیشے کے ایسے گلاسوں کی مانند ہو سکتی ہے جو آپس میں ٹکرائیں، ظاہر ہے سب گلاس ٹوٹیں گے اور بیکار ہو جائیں گے۔

ملک کے ذمہ داروں اور دانشوروں کو اس بات کو اچھی طرح سمجھنا ہوگا کہ کسی طبقہ کا، خواہ کتنا با اثر ہو، دوسرے طبقہ پر جبر، کسی تہذیب کا دوسروں کی تہذیب پر جبر، کسی زبان کا دوسری زبان پر جبر، سوائے آپسی کشمکش اور ٹکراؤ پیدا کرنے اور ملک کو نقصان پہونچانے کے کوئی اچھا نتیجہ نہیں پیدا کر سکتا۔ انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو دانائی اور حکمت کی جو صلاحیت ملی ہے، اس کو صحیح استعمال کرنے سے آپس میں قربت اور ایک دوسرے کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہوتی ہے، اور آپس کے میل جول اختیار کرنے سے ایک دوسرے سے فائدہ اٹھانے اور پھر اپنے تجربات سے فائدہ پہونچانے کا موقع ملتا ہے۔

اور اس کے نتیجہ میں خواہ تہذیبیں ہوں یا زبانیں، یا مذاہب، ان کے درمیان ایک دوسرے سے فائدہ اٹھانے کا معاملہ چلتا ہے، ایک تہذیب دوسری تہذیب سے، ایک زبان دوسری زبان سے، حتی کہ مذہب کے معاملہ میں بھی بہتر اور مفید تر کو معلوم کرنے اور استفادہ واخذ فیض کرنے کا فائدہ ہوتا ہے، اس غرض سے دنیا میں ڈائیلاگ (Dialogue) کا بھی تجربہ کیا گیا، یہ ڈائیلاگ یعنی آپس میں تبادلۂ خیال اپنی افادیت رکھتا ہے، اس کے ذریعہ انسان جمود سے نکل کر وسیع تر دائرہ میں آتا ہے، اور نیچے سے ابھر کر اوپر آتا ہے۔

اس کی سب سے اعلیٰ مثال ہمارے حضور حضرت محمد (ﷺ) کا طریقۂ کار تھا۔ ان کی رہنمائی وحی الٰہی کے ذریعہ ہوتی تھی، آپ نے جب وحی الٰہی سے ملی ہوئی ہدایات کو اپنی قوم کے سامنے رکھا، اور آپ کی قوم آپ کے خاندان ہی کی تھی، ان کے سامنے بڑے اور چھوٹے کا فرق ولحاظ رکھتے ہوئے جب آپ نے آسمانی رہنمائی والی بات رکھی تو یہ ان لوگوں کے لئے ایک طرح سے نئی بات تھی، لہذا انہوں نے سننے سے انکار کیا اور کہا کہ بس ہم جو کرتے آئے ہیں ہم ان کے علاوہ کچھ سننے کے لئے تیار نہیں، اور جب ان کو مخاطب کیا گیا تو کان میں انگلی دے لیتے اور کہتے کہ ہم نہیں سنیں گے، نئ بات نہیں سنیں گے، لیکن آپ کی بات ایسی تھی کہ جس میں قوم کا فائدہ اور حالات کی بہتری اور ملک وقوم کی ترقی تھی، جب ان میں سے کسی کے کان میں ٹھیک سے پڑ جاتی تو اس کا ذہن بدل جاتا، حضور (ﷺ) اخلاق ومحبت اور خیر خواہانہ انداز سے وحی الٰہی سے حاصل کردہ بات ان کے سامنے رکھتے رہے، آپ ان کے نہ سننے پر ناراض نہیں ہوتے تھے، بلکہ ہمدردانہ رویہ کے ساتھ اپنے خیر خواہانہ جذبہ کا اظہار کرتے، اور قوم کے لوگوں کے غصہ وگرمی تک کو برداشت کر لیتے تھے، آپ کو اللہ تعالیٰ کا حکم بھی یہی تھا کہ تم ان پر یہ خیر خواہانہ بات جبراً مسلط نہ کرو، مانیں تو مانیں، اور نہ مانیں تو یہ اپنا ہی نقصان کرتے ہیں، تم پر اس کی ذمہ داری نہیں ہے کہ تم زبردستی منواؤ، آپ نے اس پر عمل کیا، اور اسی کو اسلام کا اصول بتایا کہ خیر خواہانہ انداز میں اچھی باتوں کی طرف بلایا جائے، اور منوانے کے لئے مجبور نہ کیا جائے۔ مگر اس میں اصل اصول یہ ہے کہ خیر خواہانہ جذبہ ہو کہ غلط رخ اختیار کرنے والوں اور مضر طور وطریق اپنانے والوں کے غلط راہوں پر چلنے سے دل دکھے کہ اپنے بھائی بند ہیں، یہ اپنا نقصان کر رہے

ہیں، اور یہ جذبہ پیدا ہو کہ ہم کس طرح ان کو صحیح راہ پر لے آئیں، خود بھی اچھے طور وطریق پر کار بند ہوں، اور دوسروں کو بھی بہتر راہ اختیار کرنے کے لئے دل میں تڑپ پیدا ہو، یہی وہ تڑپ ہے جو خیر خواہانہ جذبہ کے ساتھ دوسروں کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور اس کے بہتر نتائج سامنے آتے ہیں۔

مسلمانوں کو امت دعوت کا وصف عطا کیا گیا ہے کہ وہ خیر کی طرف بلائے، اور شر اختیار کرنے سے منع کرے، اس وصف کا تقاضہ ہے کہ ہم دوسروں کو صحیح بات بتائیں، اور ایسا انداز اختیار کریں کہ محبت اور خیر خواہانہ جذبہ کے ساتھ ہماری ہمدردی سامنے آئے، اس طرح ہماری بات اپنائیت کے ساتھ سنی جاسکتی ہے، اور جب ہم اچھی باتوں کی طرف دعوت دیتے ہیں تو یہ بھی ہماری بات کو وزن دیتی ہے، اور اس کے ذریعہ ہم خیر کو عام کرنے والے اور انسانیت کو صلاح وفلاح کی طرف لیجانے والے بنتے ہیں، یہ اس ملک میں ہمارا فرض بنتا ہے، کیونکہ یہاں مختلف مذاہب، مختلف تہذیبوں اور زبانوں کے درمیان ہم رہتے ہیں، اور ہم امت وحدت ہیں، تو دعوت کے اسلامی اصولوں کو اپناتے ہوئے ہم لوگوں کو شر کے راستہ سے ہٹنے اور خیر کا راستہ اختیار کرنے کی طرف توجہ دلا سکتے ہیں، اور یہ ہم کو کرنا چاہئے۔ یہ اس ملک کے لئے بھی مفید ہے اور ہمارے وزن کو محسوس کرانے والی بات بھی ہے، اور انسانیت کی صلاح وفلاح کا بھی کام ہے جس کی ذمہ داری بحیثیت ایک نیک سیرت اور انسانیت کے خیر خواہ کے ہم پر عائد ہوتی ہے کہ ہم خود بھی اچھے انسان بنیں اور اپنے مالک رب العالمین کے حکموں پر چلیں، اور دوسروں کو بھی اس کی طرف متوجہ کریں، اور یہ بات ہمارے دانشوروں کی طرف سے دانشوروں کے ساتھ، اور ہمارے عوام کی طرف سے یہاں کے عوام کے ساتھ خیر خواہی اور داعیانہ رویہ اختیار کرنے سے انجام پاسکتی ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ ہمارے مولانا مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی صاحب بانی ومہتمم جامعۃ القاسم دار العلوم الاسلامیہ ومدیر ماہنامہ ''معارف قاسم'' سپول بہار اس سلسلہ میں فکرمندی اور حوصلہ مندی سے کام لیتے ہوئے مختلف جہتوں سے خدمت انجام دے رہے ہیں، جس کے لئے مجلّہ معارف قاسم بھی مفید ذریعہ ہے، ہم ان کو مبارکباد دیتے ہیں کہ اس کا خصوصی شمارہ مسلم مسائل سے متعلق شائع کرنے جارہے ہیں، اللہ تعالیٰ اسے نافع بنائے اور قبول فرمائے۔

(محمد رابع حسنی ندوی)
ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۱۴۳۴/۰۶/۰۴ھ
۲۰۱۳/۰۴/۱۶ء

محمد الرابع الحسني الندوي
ندوة العلماء – لكهنؤ – الهند

तारिक़ अनवर
طارق انور
TARIQ ANWAR

राज्य मंत्री
कृषि एवं खाद्य प्रसंस्करण उद्योग
भारत सरकार
وزیر مملکت
ایگریکلچر، فوڈ پروسیسنگ انڈسٹریز
بھارت سرکار
MINISTER OF STATE
Agriculture & Food Processing Industries
Government of India

सत्यमेव जयते

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرمی ومحترمی جناب حضرت مولانا مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی صاحب / حفظہ اللہ وتولاہ،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

امید کی آپ بفضل اللہ فرحت وشادمانی کیساتھ زندگی کے منازل طے کررہے ہوں گے۔

آپ کا خط موصول ہوا۔ ارسال کرنے کیلئے شکریہ اور جواب میں تاخیر کیلئے معذرت۔

حضرت والا! خط میں مجھ سے درخوست کی گئی ہے کہ میں ''**معارف قاسم جدید**'' کا نیا شمارہ ''**مسلم مسائل نمبر**'' کیلئے کچھ تحریر کروں۔
سب سے پہلے میں آپ حضرات کی خدمت میں ہدیہ تشکر وامتنان پیش کرتا ہوں کہ آپ حضرات اردو زبان وادب کی خدمت کررہے ہیں جو ہماری گنگا جمنی تہذیب کی جان ہے۔ اردو وہ زبان ہے جس کو سمجھنے کیلئے شاعر کا یہ شعر کافی ہے ''اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ- سارے جہاں میں دھوم ہمارے زباں کی ہے''۔
حضرت والا! اس میں کوئی شک نہیں کہ امت مسلمہ آج آزمائشوں کے دور سے گذر رہی ہے۔ آج اسلام باطل کے نشانہ پر ہے اور اسلام کو طرح طرح سے بدنام کرنے کی سازش کی جارہی ہے۔ اس کے باوجود اللہ رب العالمین کا فرمان '**جاء الحق**...**الخ** کہ حق کی ہمیشہ جیت ہوگی، باطل کبھی بھی سر نہیں اٹھا سکتا ہے۔
میری ادنیٰ سی رائے میں آج کے اس دور میں امت مسلمہ کو لاحق تمام پریشانیوں کی واحد وجہ امت کا انتشار ہے۔ امت کے اندر اختلاف کو ختم کرنے میں علماء کرام سب سے بڑا کردار ادا کرسکتے ہیں۔ ہمیں سنجیدگی سے یہ سوچنا ہوگا کہ جب ہمارا اللہ ایک، ہمارا نبی ایک، ہمارا کعبہ ایک، ہمارا قبلہ ایک اور ہمارا قرآن ایک تو پھر ہم مسلمان ایک کیوں نہیں ہیں۔ کیا ہمارے لئے یہ ایک لمحہ فکریہ نہیں ہے؟ ہمیں باطل پرستوں کے بانٹو اور راج کرو کے فارمولہ کو سمجھنا ہوگا۔ اور آپسی وفروعی اختلاف کو بالائے طاق رکھتے ہوئے قرآن وسنت کو اپنا مرجع ومصدر مان کر ایک میز پر آنا ہی ہوگا۔ ہمیں اقبال کے اس شعر سے سبق لینا چاہئے کہ ''جمہوریت وہ شئی ہے جس میں بندوں کو گنا جاتا ہے تولا نہیں جاتا'۔ آج ہمیں ان قوموں سے سبق لینا چاہئے جن کے اتحاد نے انہیں راتوں رات فرش سے عرش تک پہونچا دیا ہے۔ آپ نے خط میں جن عناوین کی طرف توجہ دلائی ہے بلاشبہ وہ اس وقت کے سلگتے مسائل ہیں۔ ان حساس مسائل پر میں ہمیشہ اخبارات میں لکھتا اور ایوان میں بولتا رہا ہوں ہوں۔
اور میں آپ کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ جب بھی قوم کو میری ضرورت ہوگی میں ہر طرح سے قومی وملی مسائل کے حل کیلئے قوم کیساتھ کھڑا ہوں۔
میری دعا ہے کہ **معارف قاسم جدید** دن بہ دن ترقی اور کامیابی کے نئے منازل طے کرے۔

دعاؤں کا طالب
آپ کا
طارق انور
26 اپریل 2013

ROOM NO. 321, KRISHI BHAWAN, NEW DELHI-110 001
TEL : (011) 23381341, 23071149 TELE/FAX : (011) 2338 6631
Email : t.anwar@sansad.nic.in

2012 International Year of Cooperatives

محدث جلیل حضرت اقدس مولانا سید محمد سلمان مظاہری

ختن جگر شیخ محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنیؒ و ناظم جامعہ مظاہر علوم سہارنپور (یوپی)

MADRASA
MAZAHIR ULOOM
SAHARANPUR-247001
(U.P.) INDIA
Ph. : (0132) 2655542 Fax : 2659912

مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور

Ref. No. .... Dated ....

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم اما بعد

ماہنامہ ’’معارف قاسم جدید‘‘ اپنی مختلف اشاعتوں میں ملت اسلامیہ کے متعدد اہم مسائل پر اپنے خصوصی شمارے شائع کرتا رہا ہے، مجھے یہ معلوم ہو کر خوشی ہوئی کہ عنقریب ماہنامہ کی جانب سے ’’مسلم مسائل نمبر‘‘ شائع کرنے کا ارادہ ہے، اس کے مدیر اعلیٰ عزیز محترم مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی کی اطلاع کے مطابق اس خصوصی نمبر میں خاص طور سے مسلم پرسنل لا میں مداخلت، مسلم نوجوانوں کی بے قصور گرفتاری، اوقاف کی اراضی پر ناجائز قبضہ، ہندو دہشت گردی، انسداد فرقہ وارانہ فسادات بل، سرکاری ملازمتوں میں کم ہوتی مسلمانوں کی نمائندگی جیسے اہم اور انتہائی ضروری مسائل پر سرکردہ قلمکاروں اور مضمون نگاروں کی نگارشات، اکابر علماء اور دانشوران ملک وملت کے قیمتی خیالات کے ذریعہ روشنی ڈالی جائے گی۔

خدا کرے کہ ملک وملت کے مسائل کو سمجھنے اور ان کا صحیح اور مثبت حل پیش کرنے میں یہ خصوصی اشاعت امت مسلمہ کے کام آئے، مسلم دشمن عناصر کی ذہنیت آشکارا ہو اور اس کے جملہ مشمولات سے ’’کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر‘‘ پیدا ہو۔

نوا پیرا ہو اے بلبل! کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تن نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

ناظم مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور

عالم ربانی حضرت اقدس مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی الندوی

ایڈیٹر البعث الاسلامی، مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء وچانسلر اینٹیگرل یونیورسٹی لکھنؤ

Dr. Saeed el Azami al Nadwi
Chief Editor : "Albaas-el-Islami"
P.O. Box 93, Nadwatul Ulama,
Lucknow-226007-04 U.P. (India)

د/ سعید الأعظمي الندوي
رئیس تحریر : مجلة "البعث الإسلامي"
ص.ب.۹۳، ندوة العلماء، لکناؤ
أترابراديش (الهند) ۲۲٦۰۰۷-۰٤

محترم و معظم حضرت مولانا مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی صاحب
بانی و مہتمم جامعة القاسم دار العلوم الاسلامیة، مدھوبنی، سپول، بہار۔
و مدیر اعلیٰ ماہنامہ معارف قاسم، دہلی۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہونگے۔

یہ معلوم کرکے بے حد خوشی ہوئی کہ ماہنامہ معارف قاسم جدید کا خصوصی شمارہ ’’**مسلم مسائل نمبر**‘‘ شائع ہونے والا ہے، اور وہ تقریباً ۵۰۰ رصفحات پر مشتمل ہوگا، اس خاص نمبر میں مسلمانوں کے درپیش مسائل کو تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے، اور بطور خاص مسلم پرسنل لاء میں کسی نوع کی کوئی مداخلت، بے قصور مسلم جوانوں کی گرفتاری، اور مسلم اوقاف کی آراضی پر سرکاری یا غیر سرکاری قبضہ، فرقہ وارانہ تشدد اور فسادات، سرکاری اداروں میں مسلمانوں کی مسلسل کم ہوتی نمائندگی، اور اس طرح کے دیگر اہم مسائل پر خاص طور سے اس خاص نمبر میں بحث کی گئی ہے، اور اس کی حیثیت صرف تاریخی نہیں، بلکہ دستاویزی ہے۔

یہ خاص نمبر جو ’’مسلم مسائل نمبر‘‘ کے نام سے شائع ہو رہا ہے، ہر اعتبار سے بہت اہم اور وقت کی ضرورت کے مطابق ہے بالخصوص ۲۰۱۴ء میں پارلیمانی انتخابات کے موقع سے اس اہم نمبر کا نکلنا ایک معنوی حیثیت بھی رکھتا ہے، اور مستقبل میں قائم ہونے والی حکومتوں کے لئے ایک تنبیہ ہے، اس لئے کہ اس عظیم الشان ملک کی ترقی اور اس کے روشن مستقبل کا دارومدار ہر طرح کی تفریق سے باز رہنے اور مسلمانوں کو آئین ہند کے مطابق جملہ حقوق دیئے جانے میں مضمر ہے۔

امید ہے کہ یہ خاص نمبر سب کے لئے چشم کشا اور انصاف کی راہ ہموار کرنے والا ثابت ہوگا۔

امید ہے کہ مزاج عالی بخیر ہونگے۔

والسلام
آپ کا مخلص
سعید الرحمٰن الاعظمی ندوی
مدیر البعث الاسلامی
ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۲۲/۵/۱۴۳۴ھ
۴/۴/۲۰۱۳ء

عنوان المنزل: مكتبة الفردوس، مكارم ناغر (بروليا) لكناؤ (الهند) موبايل: ۰۰۹۱-۹۸۳۹۹۱۱٤۷۰
Telefax : 0091-522-2741272 Mobile : 0091-9839911470 e-mail : saeedurrahman@nadwatululama.org

شیخ زکریا کے علوم ومعارف کے ترجمان حضرت اقدس مولانا سید محمد شاہد سہارنپوری

(نواسہ شیخ محمد زکریا کاندھلویؒ، مہاجر مدنی) وامین عام جامعہ مظاہر علوم سہارنپور (یوپی)

(مولانا) سید محمد شاہد سہارن پوری
نواسہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی
امین عام (سکریٹری) جامعہ مظاہر علوم سہارن پور
بانی: شیخ محمد زکریا ٹرسٹ سہارن پور (یوپی)
ناظم: مدرسۃ الشیخ محمد زکریا لتحفیظ القرآن الکریم سہارن پور (یوپی)

(Maulana)
MOHAMMAD SHAHID
(Secretary)
Jamia Mazahir Uloom
SAHARANPUR 247001 (U.P.)India
Ph. (R) 0132-2655712 (O) 0132-2650389

تاریخ .... حوالہ ....

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت مولانا مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی کے مکتوب سے یہ معلوم ہوکر مسرت اور خوشی ہوئی کہ موصوف جامعۃ القاسم سپول بہار کے ترجمان ماہنامہ ''معارف قاسم'' کا ضخیم اور متنوع مضامین پر مشتمل ایک خصوصی شمارہ مسلم مسائل اسباب وحل کے نام سے شائع کررہے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس جیسے اہم موضوع اور عنوان پر بڑی بالغ نظری کے ساتھ قوم وملت کے علم ومطالعہ میں آنے کے لئے تحقیقی ومعلوماتی مضامین اور مستند ومعتبر مجلات کے خصوصی نمبرات مسلسل شائع ہوتے رہنے چاہئیں، اس لئے کہ جو قوم اور ملت اپنی پیش آمدہ مشکلات کے اسباب کی کھوج لگانے اور اُن کا حل تلاش کرنے میں غفلت اور لاپرواہی کا مظاہرہ کرتی ہے وہ آہستہ آہستہ نہ صرف اپنی افادیت ونافعیت کھودیتی ہے بلکہ اس مقام سے بھی گرجاتی ہے جس پر اس کا قائم اور موجود رہنا ضروری ہوتا ہے۔

آج کا ہندوستان اسلام اور مسلمانوں کے حوالہ سے جس کربناک اور خطرناک ماحول سے گذر رہا ہے اور اسلام دشمن طاقتیں اس ملک کو جس طرح سے خدانخواستہ دوسرا اسپین بنانے کی فکروتدبیر میں لگی ہوئی ہیں ان تمام مکروہ تدابیر کا توڑ اسی میں ہے کہ اس ملک کا مسلمان دینی شعائر اور اسلامی احکامات پر مضبوطی کے ساتھ عمل کرے اور اپنی معاشرت اور ماحول کو زیادہ سے زیادہ اسلام اور اسلامیات میں رنگنے کی کوشش کرے اور قوم وملت کے مخلص، بے غرض راہنما اور دینی قائدین اس کے سامنے قرآن وسنت کی روشنی میں جو حل پیش کریں اس پر سو دل وجان سے عمل کرے اور محنت وکوشش کے ذریعہ اپنے دیگر احباب اور اہل تعارف سے بھی اس پر عمل کرائے اس لئے کہ حکم ربانی ہے:

ان اللہ لایغیر مابقوم حتیٰ یغیروا مابانفسهم

دلی دعا ہے کہ اللہ جل شانہ اس خصوصی شمارہ کو بے حد مفید ونافع بنائے اور قوم وملت کے نوجوانوں اور نونہالوں کو اس سے بھرپور استفادہ کی توفیق مرحمت فرمائے اس لئے کہ مستقبل انہی کے ہاتھ میں ہے۔ واللہ ولی التوفیق

محمد شاہد مسئول

سید محمد شاہد غفرلہ
امین عام جامعہ مظاہر علوم سہارنپور
یکم جمادی الثانی ۱۴۳۴ھ/۱۳/اپریل ۲۰۱۳ء

خادم القرآن والمساجد حضرت اقدس مولانا غلام محمد وستانوی

بانی ورئیس جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا، نندوربار (مہاراشٹر)

بسم اللہ تعالیٰ

Reg. No. B-139, Dhule
Web : www.jamiyaakkalkuwa.com
E-mail : jamiaakkalkuwa@gmail.com
Jamia Islamia Ishaatul Uloom

Phone : 91-2567-252256, Fax. 252306
الجامعة الإسلامية إشاعة العلوم

Akkalkuwa - 425415, Dist. Nandurbar (M.S.) India
الواقعة باكل كوا، بمديرية نندربار، بولاية مهاراشترا، بالهند

Ref. No. ____________   الرقم: ____________
Date : ____________   التاريخ: ____________

''جہالت، غفلت اور غربت سے خلاصی امت مسلمہ کے تمام مصائب کا حل''

قال النبی صلی اللہ علیه وسلم: الراحمون یرحمهم الرحمن، ارحموا من في الأرض یرحمكم من في السماء (ابوداؤد شریف:4941)

حق جل مجدہ نے اشیاء کائنات میں اشرف کائنات حضرت انسان کو بنایا ہے اور اسے معدن اوصاف وکمالات بھی بنایا ہے، جیسا کہ ارشاد نبوی ہے: ''الناس معادن کمعادن الذهب والفضة'' رواہ البیہقی (شعب الایمان، حدیث:۱۰۹۷۴ دارالکتب العلمیہ بیروت: ۷/۴۵۵) اور یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان کہے جانے کے قابل بھی وہی شخص ہے جو اللہ کی عنایت فرمودہ صلاحیت کو رضاء الٰہی کے جذبہ سے حدودِ شریعت میں رہ کر مخلوق خدا کے حالات کے بہتر سے بہتر بنانے میں مصروف ہو۔ اچھے انسان کی ہر وقت یہ فکر رہتی ہے کہ میری زبان سے نکلنے والا لفظ لفظ، میری تحریر سے نمودار ہونے والا حرف حرف تعمیر ملت کے لیے وقف ہو۔

اسی جذبہ کو لیکر مدارس دینیہ، مراکز علمیہ، تحریکات وجماعتیں، افراد وشخصیات، جامعات مختلف النوع اور مختلف الجہات خدمات موقع بموقع حسب تقاضہ کرتے رہتے ہیں۔

منجملہ ان موقر اداروں کے ایک کثیر الخدمات، وسیع الفکر ادارہ ''جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ مدھوبنی سپول بہار'' سے نکلنے والا ماہنامہ ''معارف قاسم جدید'' دہلی بھی ہے۔ جس نے اپنی کم عمری میں باوجود قلتِ وسائل کے وہ قلمی خدمات انجام دی ہیں جو قابل تحسین ہی نہیں، بلکہ قابل تقلید بھی ہے۔

جو پابندیٔ وقت کے ساتھ ساتھ کرنٹ موضوع پر امت کی رہبری کے لیے اپنی مثال آپ ہے۔ اس مؤقر ماہنامہ نے کئی خصوصی شمارے بھی شائع کئے ہیں۔ جیسے قرآن کریم نمبر، سیرۃ النبی نمبر، مسلم پرسنل لا نمبر، پیام انسانیت نمبر، رمضان کریم نمبر، قاضی مجاہد الاسلام قاسمی نمبر۔ یہ سارے خصوصی شمارے باذوق افراد کے لیے عموماً اور علمی حلقہ کے لیے خصوصاً دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اور ابھی ابھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ملاقات کے دوران یہ مژدہ بھی معارف قاسم کے مدیر وسرپرست اور ''جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ'' کے بانی ومہتمم نے سنایا کہ ''مسلم مسائل نمبر'' کے عنوان سے ایک خصوصی شمارہ منظر عام پر آرہا ہے جس میں ملی مسائل پر دانشوران ملت کے وقیع مضامین ہوں گے۔ سماجی مسائل، سرکاری ملازمتوں میں مسلم نمائندگی کی قلت، اوقاف کے مسائل، سیاسی، اور اخلاقی دشواریاں جس سے ملت دوچار ہے، وغیرہ وغیرہ۔

بسم اللہ تعالیٰ

Reg. No. B-139, Dhule
Web : www.jamiyaakkalkuwa.com
E-mail : jamiaakkalkuwa@gmail.com
Jamia Islamia Ishaatul Uloom

Phone : 91-2567-252256, Fax. 252306
الجامعۃ الاسلامیۃ اشاعۃ العلوم

Akkalkuwa - 425415, Dist. Nandurbar (M.S.) India
الواقعۃ باکل کوا، بمدیریۃ نندربار، بولایۃ مہاراشتر، بالہند

Ref. No. ______ الرقم : ______
Date : ______ التاریخ : ______

مجھے خوشی ہے کہ اس حساس موضوع پر ملت میں بیدار مغزی پیدا کرنے اور امت کو ایک لڑی میں پرونے کی مساعی جمیلہ میں یہ خصوصی شمارہ سنگ میل ثابت ہوگا۔

نیز رحمت خداوندی کے نزول کا ذریعہ بھی۔ جیسا کہ الطاف حسین حالی مرحوم نے کہا کہ

خدا رحم کرتا نہیں اس بشر پر … نہ ہو درد کی چوٹ جس کے جگر پر

ناچیز پوری ملت کی طرف سے عموماً اور اپنی طرف سے خصوصاً حضرت مولانا مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی مدظلہ العالی کو مبارکبادی پیش کرتا ہے کہ اللہ نے آپ کو اپنی ذات سے انجمن بنایا ہے۔ جس کی توفیق ایسے ایسے کارنامے انجام دے رہے ہیں جو ایک اکیڈمی مل کر نہیں دے سکتی، ساتھ ہی ساتھ میرا یہ پیغام بھی امت تک پہنچے کہ جب تک ملت کو جہالت کی دلدل سے علم کی وادی میں اور غربت کی گلی سے خوشحالی کی دہلیز پر اور غفلت کے کیچڑ سے مصروفیت و مشغولیت کی شاہراہ پر نہ لایا جائے تب تک ہمارے مسائل حل نہیں ہو سکتے، امید ہے کہ آپ کا یہ خصوصی شمارہ اپنی افادیت میں کمال تک پہنچے اور ہم سب ملکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اُس ارشاد کے مصداق بن جائیں جسے کسی نے یوں تعبیر کیا کہ

کرو مہربانی تم اہل زمین پر … خدا مہربان ہوگا عرش بریں پر
یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں … کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

آپ کی خدمات و مساعی کا قدرداں

غلام محمد وستانوی
رئیس جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا
۶؍جمادی الثانی ۱۴۳۴ھ بمطابق ۱۸؍اپریل ۲۰۱۳ء

شیخ طریقت حضرت اقدس مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی

مہتمم دارالعلوم دیوبند

(Mufti) Abul Qasim Nomani
Mohtamim (VC) Darul Uloom Deoband

مفتی ابو القاسم نعمانی
مہتمم دار العلوم دیوبند، الہند

PIN- 247554 (U.P.) INDIA Tel: 01336-222429, Fax: 01336-222768 E-mail: info@darululoom-deoband.com

Ref. No. 252 Date:..................

باسمہٖ سبحانہ وتعالیٰ

جناب مولانا مفتی محفوظ الرحمٰن صاحب عثمانی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ سے معلوم ہوا کہ ماہنامہ ''معارف قاسم جدید'' دہلی کا نیا خصوصی شمارہ ''مسلم مسائل نمبر'' شایع ہونے جارہا ہے، جس میں مسلمانوں کو درپیش مختلف مسائل پر مضامین شایع ہوں گے۔

دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس اشاعت کو قبول فرمائے اور ملت اسلامیہ ہند کے حق میں مفید بنائے۔

والسلام

(مولانا مفتی) ابوالقاسم نعمانی
مہتمم دارالعلوم دیوبند
۲۷؍۵؍۱۴۳۴ھ مطابق ۹؍۴؍۲۰۱۳ء

ہندوستان کے معروف اسلامک اسکالر پدم شری پروفیسر اختر الواسع

صدر ڈاکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی و وائس چیئرمین اردو اکیڈمی نئی دہلی

Prof. Akhtarul Wasey
Professor: Department of Islamic Studies
Hony. Director: Zakir Husain Institute of Islamic Studies
Jamia Millia Islamia, New Delhi

پروفیسر اختر الواسع
Vice Chairman:
Delhi Urdu Academy (Govt. of NCT of Delhi

प्रो. अख़्तरूल वासे
President:
India Interfaith Coalition on HIV/AIDS

مکرمی حضرت مولانا مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی صاحب دام اقبالہ

سلام وتحیات

یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ معارف قاسم جدید، دہلی کا تازہ شمارہ مسلم مسائل کے خصوصی حوالے سے شائع کرنے جارہے ہیں۔ دنیا کے کسی بھی انسانی سماج کی طرح ہندوستان میں بھی مسلمان مسائل سے بھی دوچار ہیں اور ان کے لیے بہتر امکانات بھی موجود ہیں۔ ہندوستانی مسلمان اپنی تاریخ کے ایک نئے مرحلے سے گزر رہے ہیں جب نہ وہ حاکم ہیں نہ محکوم بلکہ اقتدار میں برابر کے شریک ہیں۔

جہاں تک مسائل کا تعلق ہے مجالس قانون ساز میں ان کی کم ہوتی ہوئی تعداد، دہشت گردی کے نام پر مسلمان نوجوانوں کی اندھادھند گرفتاریاں، اوقاف کی اپنوں کے ہاتھ پامالی اور سرکاری ایجنسیوں کے ذریعے غیر قانونی قبضے اور ان سب سے بڑھ کر تعلیمی ومعاشی پس ماندگی، وہ مسائل ہیں جن کے لیے مشترکہ، منصوبہ بند، منظم اور مسلسل کوششوں کی ضرورت ہے۔ یہاں یہ بھی واضح رہے کہ جو صورت حال شمالی ہندوستان اور مشرقی اور شمال مشرقی ہندوستان کی ہے مغربی اور جنوبی ہندوستان کا منظرنامہ اس سے قدرے مختلف ہے۔ ان تمام مسائل کے حل کے لیے ہمیں قومی تناظر میں قومی سطح پر ملک کے تمام انصاف پسندوں کو ایک جٹ کرکے آگے آنا ہوگا۔ کیا ہم اس کے لیے تیار ہیں؟ سب سے اہم سوال یہی ہے۔ امید ہے آپ کے اس خصوصی شمارے سے شاید اس سوال کا جواب مل سکے۔ میں ایک بار پھر آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے یاد فرمایا اور مجھے اس قابل سمجھا کہ اس اشاعت میں آپ کے ساتھ شریک ہوسکوں۔

نیک خواہشات کے ساتھ۔

آپ کا نیاز آگیں
مخلص
اختر
(پروفیسر اختر الواسع)

بخدمت جناب
حضرت مولانا مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی صاحب دام اقبالہ
بانی ومہتمم جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ، مدھوبنی، سپول بہار
ومدیر اعلیٰ ماہنامہ معارف قاسم جدید، دہلی

Residence: A-110, Khan Abdul Ghaffar Khan Enclave (Jamia Enclave), Jamia Nagar New Delhi 110025, Email: wasey27@gmail.com, Mobile: +91-9810541045
Phone (Res) +91-11-26836077, (Off) +91-11-26841202, +91 11-26981717 Extn: 2853

دعوت وتبلیغ کے نقیب حضرت اقدس مولانا محمد عیسیٰ منصوری

چیئرمین ورلڈ اسلامک فورم لندن (یو۔کے)

World Islamic Forum - UK
Website: www.wifuk.org E-mail : wiflondon@yahoo.co.uk
Tel :+44 (0) 207 265 1990
Fax :+44 (0) 207 265 1990
Cell :+44 (0) 79 477 90 232

Maulana
M. Essa Mansuri
Chairman

Ref #:
Date:

بھارتی مسلمان اوران کے مسائل

گرامی قدر مولانا مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی صاحب
بانی ومہتمم جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ سپول بہار ومدیر اعلیٰ ’ماہنامہ‘ معارف قاسم جدید دہلی
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

خدا کرے کہ آپ کی یہ کاوش بارآور ثابت ہو۔ موجودہ وقت میں ملت کے درپیش مسائل وحالات پر جس طرح سے کوشش کرکے ایک قیمتی دستاویز تیار کردیا ہے اس کے لئے یقیناً آپ کی پوری ٹیم مبارکباد کی مستحق ہے۔

یوں تو بھارت ایک غیر مسلم ملک سمجھا جاتا ہے، اور اگر چہ مختلف عوامل کے تحت مسلمانوں کی آبادی بہت ہی گھٹا کر بتائی جاتی ہے مگر جو لوگ صحیح صورت حال سے واقف ہیں ان کا کہنا ہے آج بھارت میں کم وبیش 30-25 کروڑ مسلمان آباد ہیں برصغیر کا پورا خطہ اس اعتبار سے بڑا ہی بدقسمت ہے کہ یہاں ہزار ہا سال سے مذہب اور حکومت کے تمام اختیارات ووسائل پر ایک نہایت ہی مختصر نسل پرست طبقہ جسے منووادی یا برہمن کہا جاتا ہے اور تعداد کے اعتبار سے 8-7 فیصد سے بھی کم ہے، قابض رہا ہے۔ مؤرخین کے مطابق یہ طبقہ نسلاً اسرائیل (بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑ) ہیں جو حضرت عیسیٰ سے تقریباً سات سو سال پہلے وسط ایشیاء سے یہاں آکر قابض ہوگئے اور یہاں کی اصل آبادی کو جنوب کی طرف ڈھکیل دیا یا پہاڑوں اور جنگلوں میں بھگا دیا اور باقی کو غلام بناکر شودر کا نام دیا اور انہیں نہایت ذلیل غلامی کی زندگی پر مجبور کردیا۔ آج بھی بھارت کے تمام وسائل واختیارات اور اعزازات پر اس انسانیت دشمن نسل پرست منووادیوں کا قبضہ ہے جس نے تقریباً تین ہزار سال سے یہاں کی تمام آبادی کو غلام اور ذلیل کر رکھا ہے۔ بھارت میں تقریباً 8-7 سو سال قبل جب مسلم فاتح حکمراں آئے تو یہی طبقہ ان کا دست راست بن کر حکمرانی میں شامل ہوگیا اور صدیوں تک مسلمانوں کے جوتے چاٹتا رہا اور تمام تر فوائد ومراعات پر قابض رہا، جب انگریز آئے تو یہ انگریز کا ایجنٹ بن گیا، پھر جنگ آزادی جو ہندو، مسلم، سکھ سب نے مل کر شروع کی تھی اس جنگ آزادی میں منووادیوں کا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے، بلکہ یہ انگریز کا مخبر بنا رہا۔ اس نے جب دیکھا کہ جنگ آزادی کے طفیل ملک آزاد ہو رہا ہے تو دوبارہ برصغیر کے عوام پر خونی پنجے گاڑنے کے لئے دوسری بڑی اکثریت (مسلمانوں) کے خلاف نفرت کا پہاڑ کھڑا کردیا اور اپنی ذلیل حرکتوں سے مسلمانوں کی بڑی تعداد کو تقسیم ملک کی طرف ڈھکیل دیا، تاکہ آزادی کے بعد مسلمان اس کے ذات پات کی ذلیل تقسیم اور ہندوتوا کے پروگرام میں رکاوٹ نہ بن سکیں اور منو کے ذلیل انسانیت دشمن تقسیم کے مطابق بلا شرکت غیر ملک کے وسائل پر قابض ہوکر لوٹ مار کرسکے، چنانچہ آج بھی بظاہر سیکولرزم، جمہوریت، مساوات، انسانی حقوق سب کچھ ہیں، مگر عملاً مقننہ، عدلیہ، انتظامیہ اور میڈیا پر پوری طرح انہی نسل پرست منووادیوں کا قبضہ ہے۔

1952ء میں آر ایس ایس کے ایک بڑے لیڈر نے دہلی میں کہا تھا 50 سال کے بعد حکومت کسی کی بھی ہو، راج ہم کریں گے جو آج حقیقت بن چکا ہے، اس نے کروڑوں معصوم بچوں کو تعلیمی نصاب میں زہریلا مواد شامل کرکے ان کے دلوں کو مسلمانوں اور کرسچنوں کے متعلق نفرت سے بھر دیا ہے، آج پولیس، فوج، انٹلی جنس سمیت تمام شعبوں میں اس کے تیار کردہ نسل پرست منو کے ذلیل فلسفہ پر یقین رکھنے والے لوگ چھاگئے ہیں جن کا مقصد بھارتی مسلمان اور عیسائیوں کو معاشی، تعلیمی طور پر ختم کرکے دانہ دانہ کا محتاج بنانا ہے، تاکہ مسلمان مجبور ہوکر ہندو (شودر) بن کر ان کا غلام اور دوسرے درجہ کا شہری بن کر رہے۔ تعلیم، میڈیا، انٹلی جنس کے ذریعہ ان کے خلاف اتنی نفرت بھر دی ہے کہ ملک کے عوام ان کی نسل کشی پر آنکھیں بند کرکے آر ایس ایس کا ذلیل مقصد پورا کرنے میں معاون ہوجائیں۔ منووادیوں کا یہ پروگرام بڑی رازداری سے تدریجاً آگے بڑھ رہا ہے۔ بھارت کی دونوں بڑی پارٹیوں (کانگریس اور بی جے پی) کی باگ ڈور عملاً برہمن کے ہاتھوں میں ہے اور دیگر سیکولر کہلانے والی پارٹیوں میں بھی منووادی برہمن کے گھس پیٹھ بڑی تعداد میں قابض ہیں۔ غرض ان کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ مسلمان دوسرے درجہ کا شہری عملاً غلامی کی زندگی قبول کرلے یا میڈیا انٹلی جنس اور پولیس کے ذریعہ ان

71, Delafield House, Christian Street, London E1 1QD.

World Islamic Forum - UK

Website: www.wifuk.org E-mail : wiflondon@yahoo.co.uk

Tel :+44 (0) 207 265 1990
Fax :+44 (0) 207 265 1990
Cell :+44 (0) 79 477 90 232

Maulana
M. Essa Mansuri
Chairman

Ref # :
Date:

کے خلاف اتنی نفرت پیدا کردی جائے کہ ملک کے عوام کے ذہنوں کو مسلمانوں کی نسل کشی پر تیار کیا جائے۔ آج کل ان کے نعروں، مثلاً: پورے ملک کو گجرات بنائے، یا ہندوتوا کے نفاذ کے یہی معنی ہیں۔

آزادی کے بعد تیس ہزار سے زیادہ فسادات کے ذریعہ مسلمانوں کو سنگین قتل عام سے گزرنا پڑا ہے اس کا بنیادی مقصد دہشت زدہ کرنے کے ساتھ ساتھ معاشی طور پر تباہ کرنا بھی تھا، مسلمانوں پر ملازمتوں کے دروازے بھی بڑی حد تک بند کئے جا چکے ہیں۔ ان فسادات کی آج تک جتنی سرکاری وغیر سرکاری انکوائری ہوئی ہے تمام رپورٹوں کے مطابق فسادات منوادیوں کی سب سے بڑی اور بنیادی تنظیم آر ایس ایس یا اس کی ذیلی تنظیموں نے کئے تھے۔ دوسری طرف ٹاڈا، پوٹا جیسے ظالمانہ قوانین کا نفاذ 98 فیصد مسلمانوں پر ہی ہوا جس کے ذریعہ پولیس کو مکمل اختیار دیا گیا کہ جس مسلم نوجوان کو چاہیں محض الزامات لگا کر جیلوں میں ٹھونس کر ان کی زندگی تباہ کردی جائے۔ حال ہی میں اسکولوں میں سوریہ نمسکار کے ذریعہ معصوم بچوں کو سورج دیوتا کی پوجا شروع کروانے کی کوشش کی گئی، تاکہ بچپن ہی سے مسلمان بچے بھی مشرکانہ عمل شروع کردیں۔ بظاہر سیکولر حکومتوں مثلاً دہلی، بہار، یوپی تک میں اسکولوں میں پہلے پوجا کروائی جارہی ہے۔ پوجا کے منتر آر ایس ایس کے لوگ پڑھاتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر سیکولرزم کا لبادہ اوڑھے لیڈران پر بھی آر ایس ایس کا کتنا اثر ہے، آج ملک یا وطن سے محبت کا یہ معیار بن رہا ہے کہ جو ہندو دیوی دیوتاؤں کی پوجا کے لئے تیار نہیں وہ ملک و وطن کا دشمن اور غدار ہے۔ اب یہ بات پوری طرح ثابت ہو چکی ہے کہ برسہا برس سے متعدد شہروں میں بم دھماکے آر ایس ایس کے ہندوتوا کے دہشت گرد کر رہے تھے اور حکومت کے تمام تر ذمہ دار افراد مسلمانوں کے سر منڈھ کر مسلم نوجوان کی زندگی تباہ کر رہے تھے۔ ان دھماکوں میں بھارتی فوج کے حاضر سروس کرنل سمیت ہندوتوا کے مذہبی سادھو تک شریک ہیں۔ پولیس کا کام ہندوتوا دہشت گردوں پر پردہ ڈال کر بے قصور مسلمانوں کو مجرم ثابت کرنا رہ گیا تھا، جب ایک ایماندار پولیس آفیسر (ہیمنت کرکرے) نے ہندوتوا دہشت گردوں کے وسیع نیٹ ورک سے پردہ اٹھانا شروع کیا اور قریب تھا کہ موجودہ آر ایس ایس اور بی جے پی کے چوٹی کے لیڈروں تک بات پہنچے گی کہ ممبئی دھماکوں کی آڑ لے کر اس ایماندار پولیس آفیسر کو قتل کر کے انسداد دہشت گردی کی کمان پھر آر ایس ایس کا ذہن رکھنے والے مسلم دشمن آفیسر کے حوالے کردی گئی۔

یہ سنگین صورت حال مسلمانوں کے سیاسی رہنماؤں، علماء کرام اور تعلیم یافتہ طبقہ کی بصیرت کے لئے بہت بڑا چیلنج ہے۔ بدقسمتی ہے کہ ہمارے سیاسی رہنما، تعلیم یافتہ طبقہ اور اہل ثروت کے سامنے اپنے ذاتی مفادات اور عیش وعشرت واحد مقصد ہے۔ رہ گیا مذہبی طبقہ بدقسمتی سے ان کی بڑی تعداد آج کے فکری اور تہذیبی چیلنجز سے ناواقف، عجمی تصوف اور پیر پرستی کا شکار ہوتی جارہی ہے اور دینی مدارس میں عصری شعور دینے کے بجائے قرون وسطی کے دور میں لے جایا جارہا ہے، لیکن ان حالات میں ضرورت ہے کہ علماء کرام تمام طبقات کو ساتھ لے کر سر جوڑ کر بیٹھیں اور ملت کے لئے آبرومندانہ طریقہ پر بقاء و ترقی کی راہیں تلاش کریں۔

والسلام

دعاگو

محمد عیسیٰ منصوری

چیئرمین ورلڈ اسلامک فورم لندن

۱۰ر جمادی الثانی ۱۴۳۴ھ مطابق ۲۲ر اپریل ۲۰۱۳

71, Delafield House, Christian Street, London E1 1QD.

جامع المنقول والمعقول حضرت اقدس مولانا مفتی عبداللہ پٹیل مظاہری

بانی ورئیس وشیخ الحدیث جامعہ مظہر سعادت دارالعلوم، ہانسوٹ، بھروچ (گجرات)

Estd. 1405 A.H. / 1985 A.D. Regd. No. B-914 — التأسیس: ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵م - رقم التسجیل: B/۹۱۴

جامعۃ مظہر السعادۃ ہانسوٹ

JAMIAH MAZHAR-E-SA'ADAT
HANSOT-GUJARAT

DARUL ULOOM
HANSOT

محترمی ومکرمی جناب مفتی محفوظ الرحمٰن صاحب عثمانی / زید مجدہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد تسلیمات! امید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوں گے۔

عرض اینکہ آں محترم کا گرامی نامہ بذریعہ ای میل موصول ہوا۔ جزاکم اللہ خیر الجزاء۔

ماہنامہ ''معارف قاسم جدید'' کے نئے خصوصی شمارہ ''مسلم مسائل نمبر'' کی اشاعت پر دلی مبارک باد، تہنیت، نیک تمنا اور آرزو قبول فرمائیں۔ تقبل اللہ مساعیکم الجمیلۃ۔ اللہ تعالیٰ حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی جرأت وہمت، حکمت وموعظت، تبحر علمی ومجاہدہ کا اس مجلّہ کو پرتو بنائے۔ آمین۔ ؎ بنا کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن۔

صحافت کی دنیا کا یہ ایسا مجلّہ ثابت ہو کہ جس میں ماضی پر کف افسوس نہ ملا جائے اور نہ مستقبل کے اندیشوں میں کھویا جائے، اس میں مسلم نئی نسل کے لیے ٹھوس منصوبے ہوں، عملی اقدامات ہوں، دور جدید میں دنیا کے ہر ملک کے ساتھ قدم بقدم اور کاندھے سے کاندھا ملا کر چلنے کا حوصلہ نوجوانوں کے اندر پیدا ہو، حکومت کی اسکیموں سے پورے فائدے اٹھانے کی رہبری ہو، مسلمانوں کی غربت وزبوں حالی دور کرنے کی فکریں ہوں، تعلیمی میدان میں آگے بڑھنے کیلئے امکانات کی رہبری کے ساتھ ان کا تعاون بھی شامل ہو، پرنٹ میڈیا کے ذریعہ اپنی صحیح بات اور مطالبے ہم ذمہ داران اقتدار تک پہونچا سکتے ہیں، آج کے دور میں پوری دنیا کا منظر نامہ بدل رہا ہے، آئے دن اتھل پتھل اور تبدیلیاں عمل میں آرہی ہیں، ایسے وقت میں امت مسلمہ کو دانشمندی اور حوصلہ کے ساتھ، حکمت ودانائی کے ساتھ خیر امت کا کردار نبھانا ہے، دنیا کی امامت اور رہبری کا کام انجام دینا ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ...... ؎ سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا ۞ لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اللہ کرے کہ آپ کے اس ماہنامہ کے ذریعہ مسلمانوں میں بیداری اور احساس ذمہ داری پیدا ہو، انہیں حوصلہ اور توانائی ملے۔ صحافت ایک ایسا آئینہ ہے، جو دنیا کے حالات، واقعات، حادثات، کارنامے، حسنات وسیئات سب کا پرتو ہوتا ہے، سچائی ودیانت، وفاداری، عدل وانصاف صحافی کا مذہب ہوتا ہے، اس کا یہ شعار ہوتا ہے کہ ؎ ہم پرورش لوح وقلم کرتے رہیں گے ۞ جو بات دل پہ گذرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

اللہ تعالیٰ آپ کو ان سب صفات کا جامع بنائے اور آپ کے مجلّہ کو ترقیات کے منازل نصیب فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

دعوات صالحہ میں یاد فرمائیں۔

والسلام مع الاحترام

مفتی عبداللہ مظاہری

بانی وناظم جامعہ مظہر سعادت، ہانسوٹ

۲۴ر جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ مطابق ۶ر اپریل ۲۰۱۳ء

At & Po Hansot, Dist. Bharuch, PIN : 393 030 Gujarat (India) Tel : +91-2646-262 050 / 262 031
Fax : +91-2646-262927 E-mail : muftipatel@yahoo.com Website : saadathansot.com

علوم اسلامی کے داعی حضرت اقدس مولانا ڈاکٹر مفتی زاہد علی خاں

ناظم دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

Department of Sunni Theology
Aligarh Muslim University, Aligarh
Dr. Mufti Zahid A. Khan
Chairman
بسم اللہ الرحمن الرحیم
د. مفتی زاھد علي خان
رئیس قسم الدیانة السُّنّیة
صدر شعبۂ دینیات سنّی
الجامعة الإسلامیة، علي گڑھ (الھند)
Ph: 91-571-2700049 (O), 2703786 (R)
Int: 1780, FAX: 91-571-2700528
M: 09359940609, 9410691015
E-mail: Teologysunni.amu@gmail.com, muftizahid@yahoo.com : البرید الالکتروني

الرقم/Ref. No ....Su.Th.................. Dated .... :التاریخ

پیغام

محترمی مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی صاحب　　　　سلام مسنون و نیاز مقرون

مزاجِ گرامی!

''ماہنامہ معارفِ قاسم جدید'' دہلی کا خصوصی شمارہ ''مسلم مسائل نمبر'' امید ہے کہ مستقبل کے لیے سنگِ میل ثابت ہوگا، ہم ہندوستانی مسلمان متضاد، متصادم طبقوں میں تقسیم ہیں:

ایک طرف انگریز زیرِ سایہ پروان چڑھنے والا طبقہ تھا جس نے اپنی قوم کی دشمنی اور انگریز کی چاکری کے صلے میں خطابات، جاگیریں، اقتدار اور مالداری کے مزے لوٹے، اس کی پہلی و دوسری نسل برہمن، بنیوں اور کائستھوں کی طرح آج بھی خوشحال ہے۔ دوسری طرف خانقاہی، سجادہ نشیں، خلافت، جماعت یا مدرسہ اور سیاسی جانشینی کے زیرِ سایہ پروان چڑھنے والا گروہ ہے، اس پر بھی زمانہ کے نشیب و فراز نے کوئی اثر نہیں ڈالا۔ تیسری طرف یونیورسٹی، کالج اور سرکاری افسران نیز ٹیکنو کریٹ حضرات کا طبقہ یہ صرف اپنی، خاندانی یا برادری کے قریبی افراد کی ترقی کو ہی مسلم قوم کی ترقی قرار دیتا ہے۔

چوتھی طرف مسلکی اور جماعتی حد بندیوں میں قید خصوصی رعایت یافتہ طبقہ ہے۔ ان تمام طبقوں کو عام مسلمان کی مصیبت، بے روزگاری اور جہالت سے کوئی مطلب نہیں۔ ان کے علاوہ دیگر مسلمانوں کو محروم برادران وطن (تمام شیڈولڈ ٹرائب دو تہائی شیڈولڈ کاسٹ اور تین چوتھائی پسماندہ) (O.B.C) طبقوں سے مل کر اپنی حکمت عملی بنانی چاہیے (جن کی تعداد 50% سے زائد ہے)، میرے نزدیک مسلمانوں کے لیے اس راستے کے علاوہ باقی تمام راستے بند ہیں۔ ظالم، قاتل امریکہ و اسرائیل کے ایجنٹوں سے بھیک مانگ کر 60 سال میں کچھ نہیں ملا تو پھر آگے توقع کیسے قائم کی جاسکتی ہے۔

جد و جہد، مقابلہ، اتحاد اور مظلوموں کو ساتھ لے کر آگے بڑھنے کے علاوہ دوسرے کسی اور راستے میں صرف ذاتی ترقی کا امکان ہے نہ کہ قومی و ملّی ترقی کا، ہندوستانی سرزمین مدد کے لیے بے چین دوستوں سے بھری ہے، لیکن ہم صرف دشمن سے فریاد یا امید میں اپنا وقت برباد کر رہے ہیں۔

والسلام

ڈاکٹر مفتی زاہد علی خاں

۸؍جمادی الاخری ۱۴۳۴ھ مطابق ۲۰؍اپریل ۲۰۱۳ء

بخدمت مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی

چیف ایڈیٹر معارف قاسم جدید، نئی دہلی

jamiatulqasim@yahoo.com

رہائش: مریم باغ (بی-8) ذکاء اللہ روڈ، ذاکر باغ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ　Res: "Mary's Garden -(B-08)", Zakaullah Road, Tar Bungalow, AMU, Aligarh (INDIA)

پاسبان تحفظ ناموس مدارس حضرت اقدس مولانا مفتی احمد دیولوی

بانی و مہتمم جامعہ علوم القرآن جمبوسر، بھروچ (گجرات)

MUFTI AHMED DEVLAVI　مفتی احمد دیولوی
JAMIAH ULOOMUL QURAAN, BYPASS ROAD, AT & PO. JAMBUSAR, DIST. BHARUCH (GUJARAT-INDIA)

محترم مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی صاحب　　　　زید مجدہ

(بانی و مہتمم جامعۃ القاسم دار العلوم الاسلامیہ سپول بہار و مدیر اعلیٰ ماہنامہ معارف قاسم جدید دہلی)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یہ جان کر بے انتہا مسرت ہوئی کہ آپ کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہنامہ ''معارف قاسم جدید'' دہلی کا ملک میں مسلمانوں کے سلگتے ہوئے ان مسائل پر جن سے مسلمان دوچار ہیں کا خصوصی شمارہ ''مسلم مسائل نمبر'' شائع ہونے جا رہا ہے۔ اس اہم دستاویز کی بروقت پیش کش کیلئے میں آپ کو اور معارف قاسم کی پوری ٹیم کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ خدا کرے یہ شمارہ وطن عزیز کے پریشان حال مسلمانوں کیلئے راحت بخش ثابت ہو اور اس کے توسط سے عوام و خواص میں بیداری آئے اور ان کے اندر ملت کے مسائل کو سنجیدگی سے حل کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔

اس حقیقت سے کسی کو انکار کی گنجائش نہیں ہے کہ ہندوستان میں حکومت چاہے جس پارٹی کی بھی رہی ہو ملک کی سب سے بڑی اقلیت ہمیشہ حاشیہ پر رہی ہے اور اسے عمداً نظر انداز کیا گیا ہے۔ اور جان بوجھ کر انہیں بکھیروں میں الجھا کر ہر اعتبار سے کمزور کرنے کی سازش کی گئی ہے۔ اللہ پاک سے دعاء ہے کہ معارف کا یہ شمارہ اس سمت میں ایک قابل قدر خدمت انجام دے۔

والسلام

مفتی احمد یعقوب دیولوی

مہتمم، جامعہ علوم القرآن جمبوسر

TEL : (02644) 220286 / 220786 ------------------------ FAX (02644) 222677
Web: Jamiahjambusar.com Email: jamiahjambusar@gmail.com , jamia@sify.com

امارت کے روح رواں حضرت اقدس مولانا انیس الرحمٰن قاسمی

ناظم امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ وچیئر مین حج کمیٹی بہار

Ph. : 2555351, 2555014, 2555668 — Fax : 2555280

امارت شرعیہ بہار اڑیسہ و جھارکھنڈ پھلواری شریف پٹنہ

IMARAT SHARIAH
BIHAR ORISSA & JHARKHAND
Phulwari Sharif, Patna 801 505 (INDIA)

حوالہ ________ مورخہ ________

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الأمی وعلی آلہ وصحبہ اجمعین!

ہندوستانی مسلمانوں کا ابتدائی عہد علم وفضل ،تدبر وحکمت اور دانشمندی وشجاعت کا ہے،انسانیت نوازی اورانصاف پسندی ان کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ان کی وجہ سے یہاں کی قدیم تہذیب ومذہبی رواداری والی شاندار گنگا جمنی تہذیب بن گئی۔ یہاں ہزار سال تک تخت وتاج کے وارث بھی رہے اوراس ملک کومعاشی اور علمی طور پر مضبوط کر کے دنیا کے دیگر ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں کھڑا کیا۔مگر یہ بھی ایک المیہ ہے کہ وہی مسلم قوم آج اپنے ہی ملک میں ظلم وجبر اور استحصال کی شکار ہو کر حاشیہ پر کھڑی ہے،اگر عددی اعتبار سے اس قوم کا موازنہ کریں گے تو دیکھیں گے کہ اس ملک میں ابتدائی دور سے لے کر آج تک کبھی بھی وہ اس ملک کے کسی بھی ریاست میں اکثریت میں نہیں رہے،مگر اس کے باوجود ہزار سال تک وہی علم وتمدن اور تخت وتاج والے رہے،مگر گذشتہ ڈیڑھ سو سال کی تاریخ نے انہیں علمی، دینی ،تہذیبی ،معاشی اور سماجی اعتبار سے کنارے پر لا کھڑا کیا ہے۔

آزادی کے بعد ہندوستان کا ایک ایسا دستور مرتب کیا گیا جس میں بنیادی طور پر اس ملک کو سیکولر ملک قرار دیا گیا اور یہ سیکولرزم اس دستور کا ایک ایسا اصولی اور اساسی حصہ قرار دیا گیا جسکے ذریعہ تمام افراد کو انصاف تک پہونچنا ممکن ہوا ہے لیکن اس انصاف کے حصول میں مسلمانوں کو پینسٹھ سالوں تک کسی نہ کسی طرح دور رکھنے کی کوشش کی گئی،جس کے نتیجہ میں نہ صرف وہ تعلیمی ،معاشی اور سیاسی طور پر اپنے دیگر ہم وطنوں سے پیچھے رہ گئے بلکہ زوال پذیر ہونے کی وجہ سے وہ اخلاقی طور پر بھی پسماندہ ہونے لگے۔ اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ ان کے ملی ، دینی ، سیاسی وسماجی اور معاشی حالات ومشکلات کا جائزہ لے کر ان کو آگے بڑھانے کی کوشش کی جائے ، ہمارے لیے خوش آئند ہے کہ حضرت مولانا مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی بانی ومہتمم جامعۃ القاسم دار العلوم الاسلامیہ مدھوبنی سپول ، بہار نے اپنے معروف ماہنامہ ’’معارف قاسم جدید‘‘ دہلی کا خصوصی شمارہ ’’مسلم مسائل نمبر‘‘ جس میں خاص طور پر ہندوستانی مسلمانوں کی قدیم اور موجودہ صورت حال پر شائع کرنے جا رہے ہیں۔ یہ یقیناً قابل قدر ہے ،ہمیں امید ہے کہ امت مسلمہ اس سے فائدہ اٹھائے گی ۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ جل شانہ مفتی صاحب کی اس کوشش کو مسلم قوم کی اصلاح وترقی کو مہمیز دینے کے لیے قبول فرمائے ۔ (آمین)

والسلام

آپ کے مساعی جمیلہ کا قدرداں

(انیس الرحمٰن قاسمی)

ناظم امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ

۷؍جمادی الثانی ۱۴۳۴ھ بمطابق ۱۹؍اپریل ۲۰۱۳ء

General Secretary
IMARAT SHARIAH
BIHAR ORISSA & JHARKHAND
Phulwari Sharif, Patna-801 505 (India)

فقیہ العصر حضرت اقدس مولانا مفتی عباس داؤد بسم اللہ

مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل وشیخ الحدیث جامعۃ القرأت کفلیتہ، سورت، گجرات

قرآن کریم کے عظیم داعی حضرت مولانا قاری اسماعیل بسم اللہ

بانی ومہتمم جامعۃ القرأت، کفلیتہ، سورت (گجرات)

Trust Regd. No. : (Waqf) 039 Surat. — Ph. : (O) 0261-2393340, 2395118, 6556342

JAMEATUL - QIRAAT — جامعۃ القراءات

M. A. Hai Nagar, At. & Po. KAPLETHA,
Via : Lajpore, Dist. Surat-Pin. : 394 235,
Gujarat. (INDIA).

ESTD. : 1417 Hijri / 1996 A.D.

Ref. No. — Date :

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلماً:

منقسم ہندوستان کی تاریخ شاہد ہے کہ جب جب بھی برادران وطن نے ’’مسلم مسائل‘‘ میں مداخلت کی کوشش کی،ان کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔وجہ یہ ہے کہ ’’مسلم مسائل‘‘ دیگر شرعی قوانین کی طرح کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ (ﷺ) سے ماٴخوذ ہے۔ اس لیے درحقیقت ’’مسلم مسائل‘‘ میں مداخلت کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ (ﷺ) میں مداخلت ہے۔تاریخ اسلام ہر دور میں ایسی مداخلت کی مثالیں اور پھر اس پر عتاب الٰہی سے بھری پڑی ہے۔ضرورت تھی کہ ’’مسلم مسائل‘‘ کی نشر واشاعت کی جائے تاکہ ملک کا ہر باشندہ جانے کہ ہمارے حقوق کیا ہیں اور ہم پر کس طرح سے حملے کیے جا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ حضرت مولانا مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی صاحب مدظلہ بانی ومہتمم جامعۃ القاسم دار العلوم الاسلامیہ، سپول بہار اور مدیر اعلیٰ ماہنامہ ’’معارف قاسم جدید‘‘ دہلی کو جزاء خیر عطا فرماوے کہ موصوف زمانہ شناس اور حساس وفکرمند طبیعت کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔ وقتاً فوقتاً اپنی نگارشات کے ذریعہ سوئی ہوئی قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرتے رہتے ہیں، زیرنظر ’’مسلم مسائل نمبر‘‘ اسی سلسلہ کی ایک زریں کڑی ہے۔ اپنے مسائل پڑھئے، سمجھئے اور مسلم کش عناصر سے نمٹئے۔

اللہ تعالیٰ مفتی صاحب موصوف کو مسلم قوم کی طرف سے جزاء خیر عطا فرمائے اور اس مجموعہ کے نفع کو عام وتام فرمائے۔

ایں دعا از من واز جملہ مسلمانانِ ہند۔ آمین

فقط والسلام

شیخ الحدیث جامعۃ القراءات کفلیتہ ونائب مفتی جامعہ ڈابھیل

بانی ومہتمم جامعۃ القراءات کفلیتہ

مؤرخہ: ۸؍جمادی الاخریٰ ۱۴۳۴ھ مطابق ۲۰؍اپریل ۲۰۱۳ء

ڈاکٹر محمد خالد اعظمی

سکریٹری شیخ عبدالحمید البلالی، رئیس بشائرالخیر سوسائٹی کویت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترمی ومکرمی حضرت مولانا مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی   حفظہ اللہ ورعاہ

بانی ومہتمم جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ، مدھوبنی، سپول بہار، مدیراعلی ماہنامہ ''معارف قاسم جدید'' دہلی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمدللہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی رسولہ الکریم امابعد:

آپ کا ارسال کردہ خط ملا، حالات سے واقفیت ہوئی، اللہ تعالی آپ لوگوں کے عزائم وحوصلوں میں دن دونی رات چوگنی ترقی عطافرمائے، آمین ثم آمین۔

آپ کی سرپرستی میں قائم ہندونیپال کی سرحد پر رشدوہدایت اور تعلیم وتعلم کی عظیم دینی درس گاہ جامعۃ القاسم دار العلوم الاسلامیہ کومخلوق خدا کے لئے منارہ نور بنائے، جہاں کے سرچشمہ صافی سے فیض یاب ہونے والے قرآن وسنت کے متوالے میدان عمل میں آئیں، خدمت خلق اوردعوت وتبلیغ کے عظیم الشان فریضہ انجام دینے میں لگ جائیں۔ ''الدال علی الخیر کفاعلہ''.

جامعۃ القاسم سے نکلنے والے میگزین ماہنامہ معارف قاسم جدید دہلی کا خصوصی شمارہ مسلم مسائل نمبر منظر عام پرآرہاہے، اس کے لئے آپ نے مجھ ناچیز سے بھی چندسطریں لکھنے کی درخواست کی ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ میں اس قابل نہیں ہوں لیکن یہ آپ لوگوں کا حسن ظن میرے متعلق اور آپ لوگوں کا بڑکپن ہے کہ مجھکو یاد کیا ہے تو میں اپنے احساسات کو صفحہ قرطاس پرلارہاہوں اگر مناسب سمجھیں تو شائع کریں گے ورنہ رہنے دیں گے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا(من لم یھتم بأمر المسلمین فلیس منا)یعنی جو مسلمانوں کے معاملات کو اہمیت نہ دے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ کے اس حدیث کے ٹکڑے کو اگر ہم اپنی زندگی میں اپنالیں تو بہت سارے مسائل ومصائب سے نجات مل سکتی ہے۔

یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ قوم کا درد رکھنے والے چندافراد امت کے مسائل کے حل لئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں

اوراپنی بساط بھر پوری کوشش کرتے ہیں، انھیں میں سے ہمارے نوجوان باہمت اورملت کا درد رکھنے والے مفتی مولانا محفوظ الرحمٰن عثمانی، بانی ومہتمم جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ، مدھوبنی، سپول بہار بھی ہیں۔ مستقبل کا مؤرخ جب سیمانچل علاقہ کی تاریخ لکھے گا تو مفتی مولانا محفوظ الرحمٰن عثمانی کی خدمات کو سنہرے حروف میں لکھے گا۔

اس وقت میگزین واخبارات ورسائل کی بہوتات ہے جس کا شمار کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں بالخصوص اردو زبان میں لیکن وہیں بعض اخبارات ورسائل ایسے بھی ہیں جن کوملت کا درد ہے، اللہ کا شکر ہے، مفتی مولانا عثمانی صاحب کی ادارت میں شائع ہونے والا ماہنامہ معارف قاسم جدید دہلی کا خصوصی شمارہ ''مسلم مسائل نمبر'' عنقریب منظر عام پرآرہاہے، جس میں مسلمانوں کو درپیش مسائل پر تفصیلی گفتگو ہوگی۔ یہ ایک اچھا شگون ہے کہ کم ازکم ہمارے جو مسائل ہیں وہ سامنے آجائیں اس کے بعد قائدین ملت، مسلم جماعتوں اور قوم وملت کا درد رکھنے والے افراد آگے بڑھیں اور اس کا حل ایسا نکالیں جس سے مسلمانوں کا بھی بھلا ہو اور ساتھ ہی ساتھ ملک کا بھی۔ ساتھ میری قائدین ملت اور صاحب ثروت افراد سے مؤدبانہ التجاء ہے کہ اس نمبر کو زیادہ سے زیادہ عام کریں۔

ایک دوسری جگہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: المؤمن مرآۃ المؤمن اذا اشتکی عضو تداعی لہ سائر الجسد بالسھر والحمی.

اللہ تعالی سے دعا ہے کہ مولانا مفتی محفوظ الرحمان عثمانی بانی ومہتمم جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیۃ کے عزائم وحوصلوں کو بلند وبالا رکھے اور قوم کے قائدین کو اس کی توفیق دے کہ ہر ہر وقت ان کی رہنمائی کرتے رہیں۔ کیونکہ نہ ہی ادارہ بغیر کسی رہنمائی کے ترقی پذیر ہوسکتا ہے اور نہ ہی قوم وملت کے مسائل ہی ایک جگہ بیٹھے حل ہوسکتے ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام قائدین ایک ٹیبل پر بیٹھیں اور خالص یکسو ہوکر صرف اور صرف اللہ کی رضا کے لئے مسائل کو حل کریں تاکہ دنیا وآخرت دونوں جگہ کامیابی وکامرانی حاصل ہوسکے۔ آمین

محتاج دعا

ڈاکٹر محمد خالد اعظمی

سکریٹری شیخ عبدالحمید البلالی

رئیس بشائرالخیر سوسائٹی کویت

۸/جمادی الاخری ۱۴۳۴ھ مطابق ۲۰/اپریل ۲۰۱۳ء

فقہ اسلامی کے رمز شناس حضرت مولانا مفتی احمد نادر القاسمی

مفتی اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا، نئی دہلی

گرامی قدر حضرت مولانا مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی زید مجدہ

بانی و مہتمم جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ، سپول بہار و مدیر اعلیٰ ماہنامہ ''معارف قاسم جدید'' دہلی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ کرے مزاج گرامی بعافیت ہو!

میں سب سے پہلے آپ کو بحیثیت مدیر اعلیٰ اور ''معارف قاسم جدید'' دہلی کے مدیر جناب ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب قاسمی کو مبارکباد پیش کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے ملک میں پیدا شدہ سیاسی، معاشرتی اور مسلمانوں کی موجودہ سماجی صورت حال پر مسائل اور چیلنج کا مجموعہ تیار کر کے بہی خواہان ملت اور ارباب سیاست کے لئے ایک قیمتی اور فکر انگیز دستاویز مہیا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس فکر انگیز اور مؤقر خصوصی شماہ اور مجموعہ کی اہمیت اس لحاظ سے بھی دوبالا ہو جاتی ہے کہ سیاسی اور ملی حلقہ میں بسا اوقات بہت سے افراد کے پاس ایشوز اور مواد کی کمی ہوتی ہے اور وہ مکمل طور پر اس موضوع پر اپنی بات ارباب حل وعقد کے سامنے نہیں رکھ پاتے، ایسے سماجی وملی کارکنان کے لئے یہ شمارہ کافی مفید ثاب ہوگا۔ اس دستاویز کا ایک تاریخی فائدہ یہ ہے کہ آنے والے وقت میں اکیسویں صدی کے ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی، سماجی اور معاشی صورت حال کا جائزہ پیش کرنے والے اور ماضی کے اقوام سے دلچسپی رکھنے والے تاریخ کے طالب علموں کے لئے بھی یہ قیمتی اور حقیقت پر مبنی مجموعہ مواد کی فراہمی میں معاون ہوگا۔ بہر حال اس رسالہ سے آپ کی ملی مسائل سے دلچسپی اور قومی خدمت کے جذبہ کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ رسالہ ملت کے جرأت مندوں کو ایوان اقتدار تک اپنی بات پہنچانے کا حوصلہ دے گا اور ملت کی بے چارگی، بدحالی، پسماندگی اور داستانِ زوال کو دنیا کے سامنے اجاگر کرنے میں اہم رول ادا کرے گا، یہ بات بہت خوش آئند ہے کہ یہ ماہنامہ پوری کامیابی کے ساتھ گذشتہ دس سالوں سے پابندی کے ساتھ تشنہ گان علوم ومعارف کی علمی پیاس بجھا رہا ہے، اور دعوت دین کی ذمہ داری نبھا رہا ہے، اس رسالہ کی گرانقدر علمی خدمات کی شہادت کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اس نے نہایت قیمتی خصوصی نمبرات اس سے پہلے شائع کئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ گذشتہ نمبرات کی طرح اس شمارہ کو بھی حق کے متلاشی کیلئے مفید اور ایران دلوں کی آبیاری کا سامان بنائے اور موجودہ وآنے والی نسل کیلئے مشعل راہ بنائے۔ آمین

والسلام

(مفتی) احمد نادر القاسمی

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

باب اوّل

مسلم مسائل اسباب وحل

مسلمانان ہند سے

مولانا آزادؒ کا ایک تاریخی خطاب

میرے عزیزو! آپ جانتے ہیں کہ وہ کون سی چیز ہے، جو مجھے یہاں لے آئی ہے۔ میرے لئے شاہ جہاں کی اس یادگار مسجد میں یہ اجتماع کوئی نئی بات نہیں ہے۔ میں نے اس زمانہ جس پر لیل ونہار کی بہت سی گردشیں بیت چکی ہیں، تمہیں یہیں سے خطاب کیا تھا۔ جب تمہارے چہروں پر اضمحلال کی بجائے اطمینان تھا اور تمہارے دلوں میں شک کی بجائے اعتماد- آج تمہارے چہروں کا اضطراب اور دلوں کی ویرانی دیکھتا ہوں تو مجھے بے اختیار پچھلے چند برسوں کی بھولی بسری کہانیاں یاد آجاتی ہیں۔ تمہیں یاد ہے، میں نے تمہیں پکارا، تم نے میری زبان کاٹ لی، میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کردئے۔ میں نے چلنا چاہا تم نے میرے پاؤں کاٹ دئے۔ میں نے کروٹ لینی چاہی تم نے میری کمر توڑ دی۔ حتیٰ کہ پچھلے سات برس کی تلخ نوا سیاست جو تمہیں آج داغ جدائی دے گئی ہے، اس کے عہد شباب میں بھی میں نے تمہیں خطرے کی شاہراہ پر جھنجھوڑا لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف احتراز کیا، بلکہ غفلت وانکار کی ساری سنتیں تازہ کردیں۔ نتیجہ معلوم کہ آج ان ہی خطروں نے تمہیں گھیر لیا ہے، جن کا اندیشہ تمہیں صراط مستقیم سے دور لے گیا تھا۔

سچ پوچھو تو میں ایک جمود ہوں یا ایک دور افتادہ صدا، جس نے وطن میں رہ کر بھی غریب الوطنی کی زندگی گزاری ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو مقام میں نے پہلے دن اپنے

لئے چن لیا تھا، وہاں میرے بال وپر کاٹ لئے گئے ہیں، یا میرے آشیانے کے لئے جگہ نہیں رہی، بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے دامن کو تمہاری دست درازیوں سے گلہ ہے۔ میرا احساس زخمی اور میرے دل کو صدمہ ہے۔ سوچو تو سہی تم نے کون سی راہ اختیار کی؟ کہاں پہنچے اور اب کہاں کھڑے ہو؟ کیا یہ خوف کی زندگی نہیں؟ کیا تمہارے حواس میں اختلال نہیں آگیا ہے؟ یہ خوف تم نے خود ہی فراہم کیا ہے۔ یہ تمہارے اپنے اعمال کے پھل ہیں۔

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا، جب میں نے تم سے کہا تھا کہ دوقوموں کا نظریہ حیات معنوی کے لئے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے، اس کو چھوڑ دو۔ یہ ستون جن پر تم نے بھروسہ کیا ہے۔ نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں، لیکن تم نے سنی ان سنی برابر کر دی اور یہ نہ سوچا کہ وقت اور اس کی تیز رفتار تمہارے لئے اپنا ضابطہ تبدیل نہیں کر سکتے۔ وقت کی رفتار تھمی نہیں، تم دیکھ رہے ہو کہ جن سہاروں پر تمہیں بھروسہ تھا وہ تمہیں لاوارث سمجھ کر، تقدیر کے حوالے کر گئے، وہ تقدیر جو تمہارے دماغی لغت کی منشاء سے مختلف مفہوم رکھتی ہے یعنی ان کے نزدیک فقدان ہمت کا نام تقدیر ہے۔

انگریز کی بساط تمہاری خواہش کے برخلاف الٹ دی گئی اور راہ نمائی کے وہ بت جو تم نے وضع کئے تھے وہ بھی دغا دے گئے، حالانکہ تم نے یہی سمجھا تھا کہ یہ بساط ہمیشہ کے لئے بچھائی گئی ہے اور ان ہی بتوں کی پوجا میں تمہاری زندگی ہے۔ میں تمہارے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتا اور تمہارے اضطراب میں مزید اضافہ میری خواہش نہیں، لیکن اگر کچھ دور ماضی کی طرف پلٹ جاؤ تو تمہارے لئے بہت سی گرہیں کھل سکتی ہیں۔ ایک وقت تھا، میں نے ہندوستان کی آزادی کے حصول کا احساس دلاتے ہوئے تمہیں پکارا تھا اور کہا تا۔

''جو ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے روک نہیں سکتی۔'' ہندوستان کی تقدیر میں سیاسی انقلاب لکھا جا چکا ہے اور اس کی غلامانہ زنجیریں بیسویں صدی کی ہوائے حریت سے کٹ کر گرنے والی ہیں۔ اگر تم نے وقت کے پہلو بہ پہلو قدم اٹھانے سے

پہلوتہی کی اور تعطل کی موجودہ زندگی کو اپنا شعار بنائے رکھا تو مستقبل کا مؤرخ لکھے گا کہ تمہارے گروہ نے جو سات کروڑ انسانوں کا ایک غول تھا، ملک کی آزادی کے بارے میں وہ رویہ اختیار کیا جو 'صفحۂ ہستی' سے محو ہو جانے والی قوموں کا شیوہ ہوا کرتا ہے۔ آج ہندوستان کا جھنڈا اپنے پورے شکوہ سے لہرا رہا ہے۔ یہ وہی جھنڈا ہے جس کی اڑانوں سے حاکمانہ غرور کے دل آزار قہقہے تمسخر کیا کرتے تھے۔''

یہ ٹھیک ہے کہ وقت نے تمہاری خواہشوں کے مطابق انگڑائی نہیں لی، بلکہ اس نے ایک قوم کے پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی اور یہی وہ انقلاب ہے، جس کی ایک کروٹ نے تمہیں بہت حد تک خوفزدہ کر دیا ہے۔ تم خیال کرتے ہو کہ تم سے کوئی اچھی شے چھن گئی ہے اور اس کی جگہ بری شئی آگئی ہے۔ ہاں، تمہاری بے قراری اسی لئے ہے کہ تم نے اپنے تئیں اچھی شئی کے لئے تیار نہیں کیا تھا اور بری شئی کو ملجا وماویٰ سمجھ رکھا تھا۔ میری مراد غیر ملکی غلامی سے ہے۔ جس کے ہاتھوں تم نے مدتوں حاکمانہ طمع کا کھلونا بن کر زندگی بسر کی ہے۔ ایک دن تھا جب ہماری قوم کے قدم کسی جنگ کے آغاز کی طرف تھے، اور آج تم اس جنگ کے انجام سے مضطرب ہو۔ آخر تمہاری اس عجلت پر کیا کہوں؟ کہ ادھر سفر کی جستجو ختم نہیں ہوئی اور ادھر گمرہی کا خطرہ بھی پیش آگیا۔

میرے بھائی! میں نے ہمیشہ سیاست کو ذاتیات سے الگ رکھنے کی کوشش کی ہے، میں نے اس پرخار وادی میں قدم نہیں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ میری بہت سی باتیں کنایوں کا پہلو لئے ہوتی ہیں، لیکن مجھے آج جو کہنا ہے، اسے بے روک ہو کر کہنا چاہتا ہوں، متحدہ ہندوستان کا بٹوارہ بنیادی طور پر غلط تھا۔ مذہبی اختلاف کو جس ڈھنگ سے ہوا دی گئی اور اس کا لازمی نتیجہ یہی آثار ومظاہر تھے، جو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور بدقسمتی سے بعض مقامات میں آج بھی دیکھ رہے ہیں۔

پچھلے سات برس کی روداد دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں اور نہ اس سے کوئی اچھا نتیجہ نکل

سکتا ہے۔البتہ ہندوستان کے مسلمانوں پر جو ریلا آیا ہے وہ یقیناً مسلم لیگ کی غلط قیادت کی فاش غلطیوں کا ہی نتیجہ ہے لیکن میرے لئے اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ میں پچھلے دنوں ہی سے ان نتائج پر نظر رکھتا تھا۔

اب ہندوستان کی سیاست کا رخ بدل چکا ہے۔ مسلم لیگ کے لئے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔اب یہ ہمارے اپنے دماغوں پر منحصر ہے کہ ہم کسی اچھے انداز فکر میں بھی سوچ سکتے ہیں یا نہیں۔ اسی لئے میں نے نومبر کے دوسرے ہفتہ میں ہندوستان کے مسلمان رہنماؤں کو دہلی بلانے کا قصد کیا ہے......دعوت نامے بھیج دئے گئے ہیں۔ ہراس کا موسم عارضی ہے، میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم کو ہمارے سوا کوئی زیر نہیں کرسکتا۔ میں نے ہمیشہ کہا اور آج پھر کہتا ہوں کہ تذبذب کا راستہ چھوڑ دو، شک سے ہاتھ اٹھالو اور بدعملی کو ترک کردو یہ تین دھار کا انوکھا خنجر لوہے کی اس دودھاری تلوار سے زیادہ کاری ہے، جس کے گھاؤ کی کہانیاں میں نے تمہارے نوجوانوں کی زبانی سنی ہیں۔

یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے اس پر غور کرو، اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ اور اپنے دماغوں کو سوچنے کی عادت ڈالو اور پھر دیکھو تمہارے یہ فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں، آخر کہاں جارہے ہو اور کیوں جارہے ہو؟

یہ دیکھو، مسجد کے بلند مینار تم سے اچک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کردیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے کہ جمنا کے کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج تم ہو کہ تمہیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ دہلی تمہارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔

عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو۔ جس طرح آج سے کچھ عرصے پہلے تمہارا جوش وخروش بیجا تھا، اسی طرح آج تمہارا یہ خوف وہراس بھی بیجا ہے۔ مسلمان اور بزدلی، یا مسلمان اور اشتعال، ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتے۔ سچے مسلمانوں کو نہ تو کوئی طمع ہلا

سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔ چند انسانی چہروں کے غائب از نظر ہوجانے سے ڈر نہیں۔ انہوں نے تمہیں جانے کے لئے اکٹھا کیا تھا۔ آج انہوں نے تمہارے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہے، تو یہ عیب کی بات نہیں۔ یہ دیکھو، تمہارے دل تو ان کے ساتھ ہی رخصت نہیں ہوگئے۔ اگر دل ابھی تک تمہارے پاس ہیں، تو اسے خدا کی جلوہ گاہ بناؤ جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک امی کی معرفت فرمایا تھا ''جو خدا پر ایمان لائے اور اس پر جم گئے تو پھر ان کے لئے نہ تو کسی طرح کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم'' ہوائیں آتی ہیں اور گزر جاتی ہیں۔ یہ صرصر سہی، لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں۔ ابھی دیکھتی آنکھوں ابتلا کا موسم گزرنے والا ہے، یوں بدل جاؤ، جیسے تم پہلے کبھی حالت ہی میں نہ تھے۔

میں کلام میں تکرار کا عادی نہیں ہوں، لیکن مجھے تمہاری تغافل کیشی کے پیش نظر بار بار یہ کہنا پڑتا ہے کہ تیسری طاقت اپنی گھمنڈ کا پشتارہ اٹھا کر رخصت ہوچکی ہے۔ جو ہونا تھا، وہ ہوکر رہا۔ سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچہ توڑ چکی ہے اور اب نیا سانچہ ڈھل رہا ہے۔ اگر اب بھی تمہارے دلوں کا معاملہ بدلا نہیں اور دماغوں کی چبھن ختم نہیں ہوئی، تو پھر حالت دوسری ہے، لیکن اگر واقعی تمہارے اندر سچی تبدیلی کی خواہش پیدا ہوگئی ہے تو پھر اس طرح بدلو، جس طرح تاریخ نے اپنے تئیں بدل لیا ہے آج بھی ہم ایک دور انقلاب کو پورا کرچکے ہیں، ہمارے ملک کی تاریخ میں کچھ صفحے خالی ہیں اور ہم ان صفحوں میں زیب عنوان بن سکتے ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ ہم اس کے لئے تیار بھی ہوں۔

عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لئے تیار نہ تھے۔ بلکہ اب تیار ہوجاؤ، ستارے ٹوٹ گئے لیکن سورج تو چمک رہا ہے۔ اس سے کرنیں مانگ لو اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو جہاں اجالے کی سخت ضرورت ہے۔ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرو اور کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو، جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمہارا شعار رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جو اجلے نقش

ونگار تمہیں اس ہندوستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آرہے ہیں، وہ تمہارا ہی قافلہ تھا انہیں بھلاؤ نہیں، انہیں چھوڑو نہیں۔ ان کے وارث بن کر رہو اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لئے تیار نہیں تو پھر تمہیں کوئی طاقت بھگا نہیں سکتی۔ آؤ، عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے اور ہم اس کے لئے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے۔

آج زلزلوں سے ڈرتے ہو، کبھی تم خود ایک زلزلہ تھے۔ آج اندھیرے سے کانپتے ہو، کیا یاد نہیں کہ تمہارا وجود ایک اجالا تھا۔ یہ بادلوں نے میلا پانی برسایا ہے تم نے بھیگ جانے کے خدشے سے اپنے پائینچے چڑھا لئے ہیں، وہ تمہارے ہی اسلاف تھے جو سمندروں میں اتر گئے، پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا، بجلیاں آئیں، تو ان پر مسکرادئے، بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب دیا، صرصر اٹھی، تو اس کا رخ پھیر دیا، آندھیاں آئیں تو ان سے کہا کہ تمہارا راستہ یہ نہیں ہے۔ یہ ایمان کی جان کنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے گریبانوں سے کھیلنے لگے اور خدا سے اس درجہ غافل ہوگئے کہ جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہیں تھا۔

عزیزو! میرے پاس تمہارے لئے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے۔ وہی پرانا نسخہ ہے جو برسوں پہلے کا ہے۔ وہ نسخہ جس کو کائنات انسانی کا سب سے بڑا محسن لایا تھا۔ وہ نسخہ ہے قرآن کا، یہ اعلان کہ ’’لا تهنوا و لا تحزنو او انتم الاعلون ان كنتم مومنين. آج کی صحبت ختم ہوگئی مجھے جو کچھ کہنا تھا، وہ اختصار کے ساتھ کہہ چکا ہوں پھر کہتا ہوں اور بار بار کہتا ہوں: اپنے حواس پر قابو رکھو، اپنے گردو پیش اپنی زندگی خود فراہم کرو۔ یہ منڈی کی چیز نہیں کہ تمہیں خرید کرلادوں۔ یہ تو دل کی دکان ہی میں اعمال صالحہ کی نقدی سے دستیاب ہوسکتی ہے۔

☆☆

مسلم پرسنل لاء اور ہندوستان

● مولانا منت اللہ رحمانیؒ

مسلم پرسنل لا کیا ہے؟:

انسانی زندگی کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، ایک تو اس کی شخصی اور خاندانی زندگی ہے، جس کا دائرہ محدود ہے، اس میں انسان کے ذاتی معاملات آتے ہیں، یا پھر وہ چیزیں جو اس کے اور اس کے خاندان کے درمیان معاملات اور حقوق وفرائض سے متعلق ہوتی ہیں۔ مثلاً ازدواجی تعلق، ماں باپ اور اولاد کا تعلق، وراثت، ایک دوسرے پر نفقہ اور حق پرورش وغیرہ، دوسری زندگی شہری اور اجتماعی زندگی ہے جس کا دائرہ خاندانی تعلقات کی حدود سے آگے بڑھ کر شہر، ملک اور بین الاقوامی امور تک کو اپنے احاطہ میں لے لیتا ہے۔ اسلام نے زندگی کے ہر گوشہ کے لئے خواہ اس کا تعلق اجتماعی زندگی سے ہو یا انفرادی زندگی سے، اصول بتائے ہیں جن پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے عہد میں اور اس کے بعد بھی عمل ہوتا رہا ہے۔ لیکن جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا اجتماعی قوانین، جن کی روشنی میں حکومت چلائی جاتی تھی عملاً ختم ہوتے رہے اور کتابوں میں محفوظ ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ ہندوستان میں جب انگریزوں کا غلبہ ہوا تو صرف ’’انفرادی زندگی‘‘ کے قوانین عملاً باقی رہے، جسے بعد میں عام سرکاری عدالتوں کے حوالے کردیا گیا، انفرادی زندگی کے یہ اسلامی قوانین ’’مسلم پرسنل لا‘‘ کہلائے، گویا مسلم پرسنل لا کی اصطلاح انگریزوں کا عطیہ ہے، جو قوانین اسلامی کا ہی ایک حصہ ہے جن کی تفصیلات فقہاء اسلام کے ہاتھوں مرتب

ہوئی تھیں اور جن کی بنیاد قرآن وحدیث ہے۔

آزاد ہندوستان میں مسلم پرسنل لا:

جب ہندوستان آزاد ہوا تو اس ملک کو ایک ''جمہوری ملک'' بنانے کا فیصلہ کیا گیا، جس میں فرد کے ذاتی رجحانات، افکار وعقائد اور تہذیب وتمدن کے تحفظ کی ضمانت دی گئی اور دستور کے بنیادی حقوق کی دفعات کے ذریعہ مسلم پرسنل لا کو محفوظ کر دیا گیا، مگر کچھ مریض ذہنیت مسلم پرسنل لا کی جگہ یکساں شہری قانون نافذ کرانا چاہتی رہی ہے، حکومت بھی بعض عمومی قوانین کے ذریعہ ''مسلم پرسنل لا'' میں تبدیلی کی کوشش کرتی رہی ہے اور کچھ اس قسم کے احکام وہدایات دیتی آئی ہے، مثلاً یہ حکم جاری کیا گیا کہ حکومت کا کوئی ملازم اجازت حاصل کئے بغیر دوسری شادی نہیں کرسکتا جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تعدد ازدواج جو مسلم پرسنل لا کا اہم مسئلہ ہے، کو حکومت نے مسلمانوں کے ایک حلقہ کے لئے ممنوع قرار دے دیا، اسی سلسلہ کا ایک اہم قدم متبنیٰ بل کی شکل میں اٹھایا گیا تھا۔ جو اسلام کے مختلف صریح قوانین وضوابط سے ٹکراتا اور مسلم پرسنل لا کے ایک اہم حصہ کو پورے طور پر مجروح کرتا ہے اور یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی راہ ہموار کرتا ہے۔ یکساں سول کوڈ سراسر غیر اسلامی چیز ہے اور یہ موجودہ ہندو کوڈ سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ مسلم پرسنل لا کی جگہ یکساں سول کوڈ کے نفاذ سے مسلمانوں کی عائلی زندگی کی پوری عمارت ڈھ جائے گی۔

مسلم پرسنل لا اور مسلم ممالک:

مسلم پرسنل لا میں تبدیلی وتنسیخ کے لئے بطور دلیل چند مسلم ممالک کو پیش کیا جاتا ہے۔ خاص کر وہ لوگ جو ہر معاملے میں پاکستان کے نام سے بدکتے ہیں، اس معاملے میں پاکستان کی دہائی دے کر ہندوستانی مسلمانوں کو پاکستانی مسلمانوں کی پیروی کا مشورہ دیتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ کسی مسلم اسٹیٹ کی غلط کارروائی ''اسلامی قانون'' نہیں کہلا سکتی

اور نہ اس بنیاد پر اسلامی قوانین میں تبدیلی لائی جاسکتی ہے، جو چیز قرآن وسنت کی روشنی میں صحیح ہے اسے ہی صحیح اور اسلام کے مطابق کہا جائے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ مسلم ممالک میں ''پرسنل لا'' کی تبدیلی کا پروپیگنڈہ حقیقت سے دور ہے۔ عام طور پر مسلم ممالک میں ''مسلم پرسنل لا'' نافذ ہے، صرف چند ممالک ایسے ہیں جہاں تبدیلی ہوئی ہے، ماضی بعید میں ترکی اور پاکستان اس کی اہم مثال ہے۔ اگر ہندوستان کی حکومت پاکستان کو سامنے رکھ کر یا ترکی کو مثال بناتے ہوئے ''مسلم پرسنل لا'' کو بدلنے کی کوشش کرتی ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ ہندوستان میں بھی ان دونوں ملکوں کی طرح آمرانہ اور فوجی نظام اپنایا جارہا ہے۔ ایک چیز اور بھی لائق توجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان مذہبی اقلیت ہیں، اس لئے مذہبی امور میں اگر مسلم ممالک کی کوئی مثال سامنے رکھی جاسکتی ہے تو اس کے لئے سب سے بہتر ان ممالک کی اقلیتی صورتحال ہوسکتی ہے۔ میرے علم کے مطابق کسی بھی مسلم ملک نے اپنے یہاں کی مذہبی اقلیت کے دینی امور میں کسی طرح کی مداخلت نہیں کی ہے نہ پرسنل لا کو ہاتھ لگایا ہے، ایسے بھی مسلم ممالک ہیں جن کے پڑوس میں دوسرے مذہب کے ماننے والوں کی حکومت ہے اور دونوں میں ایسے شدید ترین اختلافات موجود ہیں جن کی تہ میں کسی نہ کسی درجہ میں مذہبی جذبہ بھی کارفرما ہے، لیکن اس ملک میں پڑوسی ملک کے ہم مذہب کی شکل میں آباد ہیں اور اپنی دینی زندگی اور پرسنل لا کو محفوظ سمجھتے ہیں اور اس پر آزادی کے ساتھ عمل کرتے ہیں۔ مصر میں یہودیوں کی مذہبی آزادی اس کی واضح مثال ہے۔

معاشرتی دشواریاں:

کہا جاتا ہے کہ ''مسلم پرسنل لا'' پر عمل کرنے سے معاشرتی دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ خاص کر طلاق اور تعدد ازدواج ایسی چیزیں ہیں جن کی وجہ سے عورتوں کی زندگی ہر وقت خطرات میں گھری رہتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مسلم پرسنل لا کی رو سے مرد کو طلاق کا اختیار

دیا گیا ہے اور اسے ایک سے زیادہ شادی کی اجازت دی گئی ہے لیکن یہ قانون کی خامی نہیں ہے۔شریعت نے شوہر اور بیوی میں علیحدگی کی مختلف شکلیں بتائی ہیں۔مرد کو طلاق کا اختیار دیا گیا ہے اور عورتوں کے لئے خلع اور فسخ نکاح کی راہ بتائی گئی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مرد اپنے اس حق کا براہ راست استعمال کرسکتا ہے اور عورتیں اپنا حق بالواسطہ استعمال کرسکتی ہیں۔مرد اور عورت کے حقوق میں اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کی ذمہ داریوں کی نوعیت جدا جدا ہے،نکاح کے بعد مرد پر جتنی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں،عورتوں پر اتنی ذمہ داری نہیں رکھی گئی ہے۔مرد پر بیوی اور بچوں کے اخراجات کے علاوہ مہر کی شکل میں ایک رقم بھی واجب ہوتی ہے۔علیحدگی کا فیصلہ اگر بلاواسطہ عورتوں کے بھی حوالہ کیا جاتا تو عورتیں اپنے اس حق کو استعمال کرتیں جس کے نتیجہ میں عورتوں پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی مگر مہر کی رقم کی فوری ادائیگی اور بچوں کی کفالت اور تربیت کا نظم مرد کو کرنا پڑتا اور مرد بلاوجہ دشواریوں میں مبتلا ہوتا۔طلاق کو شریعت نے گرچہ جائز قرار دیا ہے مگر اسے ابغض المباحات (جائز چیزوں میں سب سے زیادہ کریہہ) قرار دیا ہے اور یہ ہدایت دی ہے کہ جب نباہ ہونے کی کوئی شکل باقی نہ رہے تو بہت سوچ سمجھ کر طلاق دی جائے۔شریعت نے تفصیل کے ساتھ طلاق کا طریقہ بتایا ہے،اس طریقہ پر عمل کرنے کے بعد اس کی گنجائش ہی نہیں رہتی کہ مرد اشتعال کے نتیجہ میں یا جذبات کی رو میں طلاق دے دے،شریعت کی ہدایت کے مطابق دی ہوئی طلاق ایک عاقلانہ اور ٹھنڈا فیصلہ ہی ہوسکتا ہے،شریعت نے عدل وانصاف کی شرط کے ساتھ تعدد ازدواج کی اجازت بھی دی ہے۔اسلامی قانون عفت وعصمت کے پیش نظر مرد کے ایسے حالات ہوسکتے ہیں کہ وہ صاف ستھری زندگی گذارنے کے لئے دوسرے نکاح کی ضرورت محسوس کرے۔

مسلمانوں کا مضبوط موقف:

مسلم پرسنل لا مسلمانوں کی مستقل تہذیب اور عائلی نظام کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی

حیثیت رکھتا ہے کیوں کہ مسلمانوں کی انفرادی سماجی زندگی سے مسلم پرسنل لا کا بہت گہرا تعلق ہے انہیں قوانین کی بنیاد پر ان کی انفرادی اور سماجی زندگی کی تشکیل ہوتی ہے۔ مسلمانوں کا ایمانی جذبہ اسے برداشت نہیں کرتا کہ اسلامی احکام میں تبدیلی کی جائے۔ اسلام کے عائلی قوانین کے مقابلہ میں اگر دوسرے قوانین بنائے جائیں گے اور انہیں نافذ کرنے کی کوشش کی جائے گی تو مسلمانوں کی زندگی بڑی مشکلات سے دوچار ہوجائے گی۔ ایک طرف امن پسند شہری کی حیثیت سے مسلمان ان قوانین کا احترام کرنا چاہیں گے تو دوسری طرف اسلامی احکام انہیں پابند بنائیں گے کہ وہ مخصوص طریقہ کار اپنایا جائے جسے اسلام نے متعین کیا ہے۔اس طرح مسلمانوں کی داخلی زندگی ہر مرحلہ میں ملکی عائلی قوانین اور اسلامی قوانین کے درمیان ٹکراتی رہے گی اور وہ مجبور ہوں گے کہ ملکی عائلی قوانین کو نظر انداز کر کے اسلامی قوانین کی پابندی کریں۔مسلم پرسنل لا کے تحفظ پر ملک کے تمام طبقے ایک ہیں اور ان میں کوئی بھی جماعت ایسی نہیں ہے جو مسلم پرسنل لا میں تبدیلی برداشت کرسکتی ہے۔ مسلم پرسنل لا بورڈ میں ہر طبقے کی نمائندگی اور اس کی خدمات اس کی روشن دلیل ہے۔

☆☆

مسلم پرسنل لاءاور ہماری ذمہ داریاں

● قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ

منظّم قانون:

اس سلسلے میں بہت مختصر الفاظ میں واضح کرنا چاہتا ہوں کہ کوئی بھی سوسائٹی اور کوئی بھی سماج قانون کے بغیر منظّم نہیں رہ سکتا۔ قانون لوگوں کے حقوق وفرائض متعین کرتا ہے۔ سڑک پر ہر شخص کو چلنے کی اجازت ہے، لیکن اگر ٹریفک کا کوئی قانون متعین نہ ہو، ہر شخص کو ہر سمت سے چلنے کی اجازت ہو اور سگنل کا نظام نہ ہو تو یقیناً روزانہ سینکڑوں حادثات ہوں گے اور نہ جانے کتنی جانیں اس بدنظمی کی نذر ہوجائیں گی، اسی کے سدباب کے لئے قانون ایک محافظ کا رول ادا کرتا ہے اور زندگی کی تنظیم اور لوگوں کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے۔

قانون کون بنائے گا؟:

اب سوال یہ ہے کہ انسان کے لئے قانون بنانا کس کا حق ہے؟ اس سلسلے میں یہ بات ظاہر ہے کہ دنیا میں کوئی شخص کسی مشین کو بناتا ہے، یا کسی نئی چیز کو وجود میں لاتا ہے تو وہی اس کے استعمال کا طریقہ بھی بتاتا ہے اور اس کی رہنمائی کے مطابق اس مشین کا استعمال کیا جاتا ہے، انسان ظاہر ہے کہ خود اپنا خالق نہیں، انسان نے خود اپنے آپ کو پیدا نہیں کیا بلکہ وہ پیدا کیا گیا ہے اور یہ پیدا کرنے والی ذات اللہ کی ہے۔ (انتم تخلقونه ام نحن الخالقون. الواقعة 59) ''کیا تم اس کو پیدا کرتے ہو یا ہم پیدا کرنے والے ہیں۔''

اس لئے ظاہر ہے کہ انسان پر اللہ تعالیٰ ہی کا حکم چلے گا، اسی کا بنایا ہوا قانون انسان کے لئے موزوں اور مناسب ہوسکتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بار بار اس کی صراحت فرمائی ہے کہ حلال وحرام کے فیصلے کرنا اللہ ہی کا حق ہے (ان الحكم الا لله. الانعام 57) ''حکم صرف اللہ کا'' کیوں کہ جو خالق ہو وہی صاحب امر بھی ہوگا۔ (الا له الخلق والامر. الاعراف 54) ''سن لو اسی کو پیدا کرنے اور حکم دینے کا حق ہے۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ قانون بنانے والی شخصیت کے لئے ضروری ہے کہ اس میں دو باتیں پائیں: علم اور عدل۔ علم اس لئے ضروری ہے کہ جو انسان کی ضروریات، انسان کے مفادات وجذبات اور انسان پر پیش آنے والے حالات سے آگاہ نہ ہو، وہ اس کی زندگی کے بارے میں کیسے رہنمائی کرسکتا ہے؟ اور عدل اس لئے ضروری ہے کہ قانون کا مقصد ظلم کو روکنا اور تقاضائے انصاف کو پورا کرنا ہے، کہ جو خود عادل نہ ہو اور انصاف کرنے کی صلاحیت یا اس کا مزاج نہ رکھتا ہو، اس سے اس بات کی امید کیوں کر رکھی جاسکتی ہے کہ وہ تمام انسانی طبقات کے بارے میں عدل سے کام لے گا؟

غور کیا جائے تو انسانوں کا کوئی طبقہ، ایک فرد یا مجموعہ قانون وضع کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اس لئے کہ انسان اپنے جیسے دوسرے انسانوں کی ضروریات سے واقف نہیں بلکہ وہ خود اپنے مفادات سے بھی آگاہ نہیں، اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کسی کام کو مفید سمجھ کر شروع کرتا ہے لیکن وہ آخر میں اس کے لئے مضر ثابت ہوتا ہے، نفع بخش سمجھ کر ایک قاعدہ وضع کرتا ہے لیکن کچھ ہی دنوں کے تجربہ کے بعد ٹھوکر کھاتا ہے اور اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے۔

اللہ کا قانون ہی انسانیت کے لئے باعث رحمت ہے:

اللہ ہی وہ ذات ہے جو ساری کائنات کا خالق ہے، انسان مرد ہو یا عورت، باپ بیٹے

ہوں، یا بھائی بہنیں، گورے ہوں یا کالے، کوئی سا بھی خاندان ہو یا قبیلہ، بلکہ انسان ہو یا جانور، بہائم ومویشی ہوں یا کیرے مکوڑے سب کا پیدا کرنیوالا وہی ہے، وہ جانتا ہے کہ کس شئ کو اس نے کس لئے پیدا کیا ہے اور کس شئ کے اندر کس بوجھ کو اٹھانے کی صلاحیت ہے، غرض یہ کہ ہر شئ کی بناوٹ، اس کی تخلیق کے مقصد اور اندرونی صلاحیت کو پوری طرح جاننے والا وہی خالق ہے، وہ کسی چیز کا محتاج وضرورت مند نہیں، اس لئے مخلوقات سے خالق کا کہیں ٹکراؤ نہیں ہوسکتا، اسی لئے وہ پوری انسانیت کے ساتھ عدل اور انصاف کا برتاؤ کرسکتا ہے، پس چونکہ اللہ تعالیٰ علیم ہیں خبیر ہیں، سمیع ہیں، بصیر ہیں، اور علم وعدل ان کی ذاتی صفت ہے جو کبھی ان سے جدا نہیں ہوسکتی، اس لئے قانون بنانے کا اختیار بھی انہیں کو ہے اور انہیں کا بنایا ہوا نظام بہتر اور خیر ہے۔

چنانچہ ارشاد خداوندی ہے "**ان الدین عنداللہ الاسلام**". آل عمران 19)

"بیشک دین جو ہے اللہ کے یہاں سو یہی اسلام ہے"۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسانوں کے لئے جو قانون مفید اور جو نظام زندگی معتبر ہے، وہ صرف "اسلام" ہے۔

مسلم پرسنل لا کیا ہے؟:

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن مجید اور اپنے رسول محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو قانون ہمیں عطا فرمایا ہے، اس کے مختلف شعبے ہیں، ان میں سے ایک شعبہ اس قانون کا ہے جو انسانی سماج اور معاشرہ سے متعلق ہے، جس پر خاندانی نظام کی بنیاد واساس ہے، جو سماجی تعلقات کے اصول بتاتا ہے، جس میں خاندان کے مختلف افراد کے حقوق اور ان کی ذمہ داریوں کو متعین کیا گیا ہے، انہی قوانین کو آج عرب علماء "قوانین احوال شخصیہ" یا اردو میں "عائلی قوانین" اور انگریزی میں پرسنل لا یا فیملی لا (Family Law) کہتے ہیں۔

مسلم پرسنل لا برطانوی عہد میں:

آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان میں صدیوں مسلمانوں کی حکومت رہی ہے، گو عام طور پر ان حکمرانوں کو اسلام سے وہ تعلق نہیں تھا جو ہونا چاہئے تھا اور جو ایک مسلمان سے اس کے دین کا مطالبہ ہے، لیکن اس کے باوجود زندگی کے بہت سے شعبوں میں اسلامی قانون نافذ تھا، جب انگریز اس ملک پر مسلط ہوئے تو آہستہ آہستہ قانون اسلامی کے مختلف شعبوں کو ختم کردیا تھا، سب سے پہلے 1866 میں حکومت برطانیہ نے فوجداری قانون کو ختم کردیا تھا، پھر قانون شہادت اور قانون معاہدات منسوخ کئے گئے، بالآخر نوبت "معاشرتی قوانین" جن میں نکاح وطلاق، خلع، میراث وغیرہ داخل ہیں، کے بارے میں غور کرنے کی آئی کہ کیا ان قوانین میں بھی تبدیلی کی جاسکتی ہے؟ اس مقصد کے لئے حکومت برطانیہ نے" رائل کمیشن" (Royal Commission) مقرر کیا، اور غالباً چار بار یہ کمیشن بیٹھا، لیکن ہر بار وہ اسی نتیجہ پر پہنچا کہ ان قوانین کا مذہب سے گہرا تعلق ہے، اس لئے ان قوانین میں کوئی تبدیلی براہ راست مذہبی امور میں مداخلت اور مذہبی آزادی کو مجروح کرنے کے مترادف ہے، چنانچہ انگریز ایسا کوئی قدم اٹھانے سے باز رہے اور انہوں نے طے کیا کہ ان مسائل میں مسلمان "قانون شریعت" پر اور ہندو "دھرم شاستر" پر عمل کریں گے۔

شریعت اپلی کیشن ایکٹ:

لیکن ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ عدالت میں ایک مسلمان لڑکی نے اپنے والد کے ترکہ میں میراث کے لئے مقدمہ دائر کیا، ظاہر ہے کہ شریعت اسلامی کے نقطہ نظر سے بیٹی لازمی طور پر اپنے باپ کے متروکہ میں وارث ہوتی ہے، بھائی نے اس مقدمے میں جواب دیا کہ چونکہ میں نسلی طور پر فلاں ہندو قوم سے تعلق رکھتا ہوں اور ہندوؤں کے یہاں لڑکیوں کو باپ کے ترکے میں حصہ نہیں ملتا، یہی رواج ہمارے خاندان میں چلا آرہا ہے اس لئے مجھ پر

قانون شریعت کا نفاذ نہیں ہونا چاہئے، برطانوی قانون میں رواج کی بڑی اہمیت ہے، کیوں کہ یورپ کے اکثر ملکوں کے قوانین رومن لا (Roman Law) سے ماخوذ ہیں اور Roman Law میں رواج کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اسے قانون کا اہم ترین سر چشمہ تسلیم کیا گیا ہے، چنانچہ عدالت نے رواج کو اصل مانتے ہوئے بھائی کے حق میں فیصلہ دیا اور لڑکی کو اپنے باپ کے ترکہ سے محروم رکھا جو قطعاً قرآنی طریقے کے خلاف تھا۔

ظاہر ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے یہ عورتوں کے ساتھ نہایت ظلم کی بات ہے کہ محض عورت ہونے کی بنا پر اسے میراث سے محروم کردیا جائے، یہ وہ وقت تھا کہ تمام علماء چیخ پڑے اور پورے ہندوستان میں آواز اٹھائی گئی، ہمارے اکابر علماء نے بڑی زبردست جدوجہد کے بعد شریعت اپلیکیشن ایکٹ پاس کرایا اور ہمارے اکابر مفکر اسلام مولانا ابوالمحاسن سجادؒ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اور حضرت مولانا مفتی کفایت اللہؒ صدر جمعیۃ علماء ہند اور دیگر مشائخ کی مسلسل اور متحدہ کوششوں سے 1937 میں ''شریعت اپلیکیشن ایکٹ'' بنا اس قانون کے مطابق ''نکاح، طلاق، خلع، ظہار، مبارأۃ، فسخ نکاح، حق پرورش، ولایت، حق میراث، وصیت، ہبہ اور شفعہ'' سے متعلق معاملات میں اگر دونوں فریق مسلمان ہوں تو شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ان کا فیصلہ ہوگا، خواہ ان کا عرف اور رواج کچھ بھی ہو اور قانون شریعت کو عرف ورواج پر بالا دستی حاصل ہوگی۔

مسلم پرسنل لا دستور ہند میں:

یہ شریعت اپلی کیشن ایکٹ ایک اہم اور دوررس نتائج کا حامل قانون تھا، جو ہندوستان میں مسلمانوں کو پرسنل لا کا تحفظ فراہم کرتا تھا، ملک کے آزاد ہونے کے بعد بنیادی حقوق میں ''عقیدہ وضمیر کی آزادی'' ہر مذہب والوں کے لئے اپنے مذہب پر عمل کی آزادی کی

دفعات رکھی گئیں، یہ دفعات مسلم پرسنل لا کے تحفظ کی ضمانت دیتی ہیں، کیوں کہ مسلم پرسنل لا سے متعلق قوانین کتاب وسنت پر مبنی ہیں، اگر ان میں مداخلت کی گئی تو یہ مذہب پر عمل کرنے میں رکاوٹ ڈالنے کے مترادف ہوگا، نیز بحیثیت مسلمان جو احکام قرآن وحدیث میں موجود ہیں، ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم ان پر یقین رکھیں اور اس کے مخالف قانون کو قبول نہ کریں، اللہ تعالیٰ نے نکاح وطلاق کے جو قوانین مقرر فرمائے ہیں اگر ہم اپنی زندگی کے لئے ان کے مقابلے میں کسی اور قانون کو بہتر اور قابل عمل سمجھتے ہیں، تو یہ بھی کفر ہے، پس گویا مسلمانوں کو ان قوانین میں تبدیلی قبول کرنے پر مجبور کرنا ان کو عقیدہ اور ضمیر کی آزادی سے بھی محروم کرنا ہے، حالانکہ آئین ہند میں بنیادی حقوق کے ذیل میں مذہبی آزادی کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے جس کا لازمی مطلب مسلم پرسنل لا کے تحفظ کی گارنٹی ہے۔

لیکن بدقسمتی سے دستور کے رہنما اصولوں میں ایک دفعہ (دفعہ 44) یکساں سول کوڈ سے متعلق رکھ دی گئی ہے، دستور ساز اسمبلی کے مسلم نمائندوں نے دستور بننے کے وقت بھی اس پر اعتراض کیا تھا، لیکن بہرحال یہ شق دستور میں باقی رہی، یہ بات قابل توجہ ہے کہ رہنما اصول میں بہت سی ایسی مفید ہدایات بھی موجود ہیں جن کے بارے میں حکومت نے کبھی غور کرنے کی بابت سوچا بھی نہیں، حالانکہ عوامی نقطہ نظر سے ان پر توجہ دینا نہایت ضروری ہے، اور جو لوگ اپنے آپ کو روشن خیال اور دانشور کہتے ہیں ان کی بھی اس جانب توجہ نہیں ہوئی۔

حکومت کے بدلتے تیور:

لیکن دستور کے نفاذ کے کچھ ہی سالوں بعد سے یکساں سول کوڈ کی آواز اٹھنے لگی اور ایسے گمراہ فکر لوگوں کو اس مقصد کے لئے استعمال کیا جانے لگا جن کو نہ اپنی قوم میں کوئی اعتماد حاصل ہے اور نہ قانون شریعت سے وہ صحیح طور پر آگاہ ہیں، بالآخر 1972 میں متبنی بل پیش ہوا جس کا مقصد بلاتفریق مذہب ملک کی تمام قوموں کے لئے متبنی کو اپنی اولاد کا درجہ

دینا قرار پایا اوران کو لے پالک لینے والے مردوعورت کے ترکہ میں وارث قرار دیا گیا، ظاہر ہے کہ یہ قانون نہ صرف اسلام کے خلاف ہے، بلکہ عقل اورخرد کے بھی خلاف ہے، کیوں کہ والدین اور اولاد کا رشتہ ایسا نہیں ہے کہ صرف زبان سے وجود میں آجاتا ہو، یہ ایک فطری رشتہ ہے اور ایک فطری محبت جو والدین اور اولاد میں ہوا کرتی ہے اس مصنوعی رشتے کی وجہ سے پیدا نہیں ہوسکتی۔

چنانچہ پورے ہندوستان میں مسلمانوں کے تمام ہی مکاتب فکر نے اس قانون کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، ان حالات کے نتیجے میں حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ نے دارالعلوم دیوبند میں ایک اجلاس بلایا، حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی صاحبؒ نے بڑے خطرے اور اس کی نزاکتوں کو محسوس فرمایا اور اس وقت کے اکابر علماء دیوبند اور دانشور اور قانون داں بھی اکٹھا ہوئے، انہوں نے بعض بہت اہم فیصلے کئے، انہی میں سے ایک اہم فیصلہ ممبئی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے کنونشن کے انعقاد کا تھا جسے وہاں کے علماء دانشوروں، مسلم سماجی کارکنوں اور مختلف جماعتوں کے ذمہ داروں نے حسن وخوبی کے ساتھ 28-27 دسمبر 1972 میں مہاراشٹرا کالج میں منعقد کیا، اس کنونشن کے نتیجے میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں آیا۔

دوسرا مسئلہ پرسنل لاء کی شرعی اہمیت:

یاد رکھنا چاہئے کہ مسلم پرسنل لا میں جن شعبہائے زندگی کے قوانین شامل ہیں، وہ نہایت اہم ہیں اور ان کی جڑیں کتاب وسنت میں پیوست ہیں، بلکہ زیادہ تر احکام وہ ہیں جن کے بارے میں قرآن وحدیث میں واضح تصریحات وہدایات موجود ہیں۔

جو احکام قرآن وحدیث میں موجود ہیں ان کو ماننا مسلمان اور صاحب ایمان ہونے کے لئے بنیادی شرط ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(ماكان لمؤمن ولا مؤمنة إذا قضى الله ورسوله أمرا أن يكون لهم الخيرة من أمرهم۔ الا حزاب 36) ''کسی مسلمان مرد اور عورت کو اللہ اور اس کے رسول کے فیصلے کے بعد اپنے معاملے میں کوئی اختیار باقی نہیں رہتا''۔

گویا جب قرآن وحدیث کے ذریعہ کوئی حکم سامنے آجائے تو اب کوئی اختیار نہیں، ان احکام کے واضح ہونے کے باوجود جو اللہ اور رسول کے بجائے ان لوگوں کا طریقہ اختیار کرے جو ایمان کی دولت سے محروم ہیں۔

(ومن يشاقق الرسول من بعد ماتبين له الهدىٰ ويتبع غير سبيل المؤمنين نوله ما تولىٰ ونصله جهنم وسائت مصيرا۔ النساء 115) ''اور جو کوئی مخالفت کرے رسول کی جب کہ کھل چکی اس پر سیدھی راہ اور چلے سب مسلمانوں کے راستہ کے خلاف تو موڑ دیں گے اس کو اسی طرف جدھر وہ مڑ گیا ہے اور ڈالیں گے ہم اس کو دوزخ میں اور بہت برا ٹھکانہ ہے''۔

آج مسلمانوں سے جس یونیفارم سول کوڈ کو قبول کرنے کا مطالبہ کیا جارہا ہے، یہ قانون کس طرح کا ہوگا؟ اسپیشل میرج ایکٹ، اور انڈین سکیشن ایکٹ میں اس کی تصویر دیکھی جاسکتی ہے، جس کے تحت بین المذاہب شادیاں ہوسکتی ہیں، اسپیشل میرج ایکٹ کے تحت نکاح کرنے والوں پر شریعت کا قانون میراث لاگو نہیں ہوگا، اسی طرح انڈین سکیشن ایکٹ کی پہلی دفعہ میں یہ بات کہی گئی ہے کہ ہر شخص کو وصیت کرنے کا حق ہے، چاہے جس کے لئے وصیت کرے اور جتنی مقدار کے لئے کردے، لے پالک کے قانون سے مسلمانوں کو استثناء کردیا گیا ہے، لیکن دوسری قوموں کے لئے یہی قانون نافذ ہے کہ متبنیٰ کی حیثیت اصل اولاد کی ہوگی، تو ظاہر ہے کہ یکساں سول کوڈ میں بھی اس طرح کی بات آئے گی، ظاہر ہے کہ یہ تمام احکام قرآن کے صریح احکام کے خلاف ہیں، اس لئے یکساں سول کوڈ ایک مسلمان کے لئے قطعاً ناقابل قبول ہے۔

اوراس سے قوانین کوقبول کرنے کا مطالبہ کرنا نہ صرف مذہب پر عمل کرنے کی آزادی کے حق میں مداخلت ہے بلکہ ان کوعقیدہ وضمیر کی آزادی سے بھی محروم کرنے کے مترادف ہےاور درحقیقت جمہوریت کا قتل اور ملک کے سیکولر کردار کو مسخ کردینے کی نہایت مذموم اور ناپسندیدہ کوشش ہے۔

ان سطور سے یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے مسلم پرسنل لا کی کیا اہمیت ہے اور قانون شریعت کس قدر انسانی فطرت اور انسان کی سماجی ضروریات سے ہم آہنگ ہے۔

خطرات اور اندیشے:

اب ایک نظر ان خطرات پر بھی ڈالئے جو مسلم پرسنل لا کے گرد منڈلا رہے ہیں، یہ بات پہلے آچکی ہے کہ دستور کے بنیادی حقوق میں مسلم پرسنل لا کو تحفظ دیا گیا ہے، دوسری طرف رہنما اصول کی دفعہ 44 یکساں سول کوڈ کی حوصلہ افزائی کرتی ہے، بظاہر دستور کی ان دونوں دفعات میں تعارض سا محسوس ہوتا ہے کیوں کہ معاشرتی قوانین کے سوا زندگی کے تمام شعبوں میں پہلے ہی سے یکساں سول کوڈ موجود ہے اور اس پر عمل بھی ہو رہا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ اس دفعہ کا اصل نشانہ یہی عائلی قوانین ہیں چنانچہ جس وقت دستور بن رہا تھا اس وقت بھی ہمارے زعماء نے یہ مسئلہ اٹھایا تھا، مولانا حسرت موہانی اور جناب محمد اسماعیل مرحوم نیز دستور ساز اسمبلی کے بعض مسلم ارکان نے اس دفعہ میں ترمیم پیش کی تھی کہ جن قوموں کا پرسنل لا ہے، ان کو ہاتھ لگائے بغیر یونیفارم سول کوڈ بنایا جائے گا۔

لیکن ملک ابھی آزاد ہی ہوا تھا اس وقت مسلمان جن حالات سے گزر رہے تھے اس سے ہر شخص واقف ہے، مسلمان اس وقت اس موقف میں نہیں تھے کہ اس کے خلاف کوئی تحریک چلاسکیں، چنانچہ یہ ترمیمات رد کردی گئیں اور ڈاکٹر امبیڈکر کی اس وضاحت پر

لوگوں کو مجبوراً خاموش ہونا پڑا کہ ''کوئی پاگل ہی سرکار ہوگی جو مسلمانوں کے پرسنل لا کو ختم کرے گی، کیا وہ پسند کریں گے کہ مسلمان بغاوت کرجائیں؟''

لیکن جوں جوں حالات بدلتے گئے حکومت کی بدنیتی سامنے آنے لگی، اور انہی حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے 1972 میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں آیا، اب حالات پہلے سے زیادہ خراب ہیں، پہلے جو سیاسی پارٹیاں اقتدار میں تھیں وہ کم از کم زبان سے قانون شریعت میں تبدیلی کی بات نہیں کہتی تھیں، بلکہ چور دروازے سے اس کام کو کرنا چاہتی تھیں لیکن اب فسطائی طاقتیں بام اقتدار پر چڑھ چکی ہیں اور انہوں نے اپنے ایجنڈے میں ''یکساں سول کوڈ'' کی بات رکھی ہے، اس لئے اب ہمیں زیادہ قوت، حوصلہ، تدبر اور سمجھداری کے ساتھ یہ لڑائی لڑنی ہے اور ان کا مقابلہ کرنا ہے۔

کیا یکساں سول کوڈ سے قومی یکجہتی پیدا ہوگی؟:

جو لوگ یکساں سول کوڈ کی بات کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ یکساں معاشرتی قوانین سے قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا ہوگی اور تمام قومیں ایک دوسرے سے قریب آئیں گی، لیکن یہ محض ایک غلط فہمی ہے، ہمارے ہی ملک کے صوبہ پنجاب میں ایک عرصے تک سکھ اور ہندو ایک دوسرے سے دست وگریباں رہے ہیں، آسام میں آسامیوں اور بنگالیوں بلکہ خود آسام کے مختلف قبائل میں جس درجہ آویزشیں پائی جاتی ہیں، ان سے کون ناواقف ہوگا؟ حالانکہ ان کے پرسنل لا ایک ہی ہیں، برطانیہ اور جرمنی میں کیسی خونریز جنگیں ہوچکی ہیں جنہیں تاریخ میں ''جنگ عظیم'' کہا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ ان سب کا مذہب ایک ہی اور ان کے پرسنل لا بھی ایک ہی تھے، لیکن پرسنل لا کی وحدت نے ان بھیانک جنگوں کو نہیں روکا، ماضی قریب میں عراق اور کویت کی جنگ کل کی بات ہے، حالانکہ دونوں ملکوں کے رہنے والے مسلمان تھے اور ان کے پرسنل لا بھی ایک تھے، تو

اگر پرسنل لا کی وحدت قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کرنے میں مؤثر ہوتی تو یقیناً ایسی بھیانک جنگیں نہ ہوتیں۔

اور پھر سوال یہ ہے کہ قومی یکجہتی کے لئے کہاں تک وحدت پیدا کی جاسکتی ہے؟ اگر معاشرتی قوانین یکساں کر بھی دیئے جائیں تو تہذیب وتمدن اور ثقافت کا اختلاف ضرور باقی رہے گا، زندگی میں انسان قدم قدم پر جس چیز سے دوچار ہوتا ہے اور جس سے تعصب اور گروہ بندی پیدا ہوتی ہے وہ ''زبان'' ہے۔ ملک میں کتنی ہی زبانیں بولی جاتی ہیں، بلکہ آج تک جنوبی ہند کی ریاستوں نے رابطہ کی زبان کی حیثیت سے ہندی کو قبول نہیں کیا ہے، تو کیا قومی یکجہتی کے نام پر تمام قوموں پر ایک ہی زبان مسلط کردی جائے گی؟ اور اگر ایسا سوچا گیا تو کیا اس ملک کی وحدت اور سلامتی باقی رہے گی!؟

اس لئے حقیقت یہ ہے پرسنل لا کی وحدت کی وجہ سے قومی یکجہتی پیدا ہونے کا خیال محض ایک وہم ہے، نہ اس کا کوئی فائدہ ہے اور نہ ہی اس کی کوئی ضرورت ہے، بلکہ یہ ملک کے لئے سخت نقصاندہ ہے اس ملک کی اساس ہی کثیر مذہبی جمہوریت کے تصور پر ہے، اسی ہمہ رنگی میں اس ملک کی بقاء اس کی سلامتی اور اس کی خوبصورتی ہے اور یہی اس دستور کی روح ہے جسے قوم کے معماروں نے خوب سوچ سمجھ کر بنایا ہے۔

ہماری ذمہ داریاں:

ان حالات میں سوال یہ ہے کہ ہم کس طرح مسلم پرسنل لا کا تحفظ اور جو خطرات ہمارے سامنے ہیں ان کا مقابلہ کریں؟

اس سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ اسلام کے عادلانہ قانون کے نفاذ کے لئے ہم امت کو مشینری اور سسٹم فراہم کریں، یعنی نظام قضاء قائم کریں اور مسلمان رضا کارانہ طور پر شریعت کے فیصلوں کو اپنے اوپر نافذ کریں۔

نظام قضاء کا قیام اور اس کی شرعی اور سماجی اہمیت:

اس حقیقت سے شاید ہی کوئی انکار کرسکے کہ اسلام نے عورتوں کو جو حقوق دیئے ہیں اور انہیں جو مقام عطا کیا ہے دنیا کے کسی مذہب اور کسی قانون میں شاید ہی اس کی مثال مل سکے، لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے ملک کے عدالتی نظام نے ان حقوق کے حاصل کرنے کو بہت ہی دشوار بنادیا ہے، مقدمات کی طویل کارروائیاں اور اخراجات کے بوجھ کی وجہ سے مظلوموں کو اپنا حق حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں، اس لئے قانون شریعت سے فائدہ اٹھانے کے لئے دارالقضاء کا نظام نہ صرف شرعی نقطہ نظر سے بلکہ سماجی اعتبار سے بھی نہایت ضروری اور اہم ہے۔

مسلمان خواہ دنیا کے کسی خطہ میں ہوں، انہیں اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے دائرہ میں رہتے ہوئے ہی زندگی گزارنی ہے اور کتاب وسنت کے فیصلوں کے سامنے ہمیشہ سر تسلیم خم رکھنا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فلا وربک لایؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لایجدوا فی أنفسھم حرجاً مما قضیت ویسلموا تسلیماً۔ (النساء56) ''سو قسم ہے تیرے رب کی وہ مؤمن نہ ہوں گے یہاں تک کہ تجھ کو ہی منصف جانیں اس جھگڑے میں جوان میں اٹھے، پھر نہ پاویں اپنے جی میں تنگی تیرے فیصلے سے اور قبول کریں خوشی سے''۔ اللہ اور رسول کا فیصلہ کیسے معلوم ہوگا؟ قاضی کے فیصلے کے ذریعہ، اس لئے مسلمان خواہ کسی علاقہ میں ہو، نظام قضاء کا قائم کرنا ان پر واجب ہے، متعدد فقہاء نے بار بار اس بات کو لکھا ہے، علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں:

''وہ ممالک جہاں مسلمان مغلوب ہیں جیسے قرطبہ، بلنسیہ آج کے زمانے میں، ایسے ملکوں میں مسلمانوں پر واجب ہے کہ اپنے میں سے کسی ایک شخص کے امیر ہونے پر متفق

ہو جائیں اور وہی امیر ان کے لئے قاضی مقرر کرے، یا خود خصومات کی سماعت کر کے فیصلہ کرے"۔

چنانچہ ہندوستان میں جب انگریزوں نے تسلط حاصل کرلیا تو حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے اپنے فتاویٰ میں ہندوستان کے مسلمانوں پر نظام قضاء کے قیام کو لازم قرار دیا اور مختلف علماء نے اس کے لئے کوششیں کیں، بالآخر اس عظیم فریضہ محکمہ کے قیام کے لئے اللہ تعالیٰ مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کو اٹھایا اور انہوں نے بہار واڑیسہ میں نہایت منظم طریقہ پر نظام قضاء قائم فرمایا۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کو شروع سے نظام قضاء کی اہمیت کا احساس ہے، اجلاس جے پور میں اس کے لئے باضابطہ تجویز منظور ہو چکی ہے اور بورڈ نے بار بار علماء اور ارباب حل وعقد کو اس جانب متوجہ کیا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ پورے ملک میں نظام قضاء کا جال بچھا دیا جائے اور مسلمانوں کو یہ بات سمجھائی جائے کہ وہ اپنے نزاعی معاملات کو قاضیوں کے ذریعہ حل کریں، دارالقضاء کے پاس گو پولس کی طاقت نہ ہو، لیکن اس کے ہاتھوں میں اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول کی سنت ہوگی اور اس کا فیصلہ خدا اور اس کے رسول کی مرضیات کا آئینہ دار ہوگا، انشاء اللہ یہی چیز مسلمانوں کو دارالقضاء تک کھینچ کر لائے گی، انہیں انصاف بھی ملے گا، وہ عدالتوں میں بار بار حاضری کی ذلت سے بھی بچیں گے، جھوٹی قسموں سے اپنے دین وایمان کی حفاظت کریں گے، بلاوجہ کثیر رقم کے بے جا خرچ سے بھی اپنے آپ کو بچاسکیں گے، اور اسلام کے سماجی قوانین میں جو راحت، جو عدل، جو رعایت اور عافیت ہے وہ اس سے فائدہ اٹھاسکیں گے، حقیقت یہ ہے کہ عورتوں کو ان کے جائز حقوق دلانے کی اس سے بہتر کوئی اور صورت نہیں، حقوق خواہ کتنے بھی مقرر کر لئے جائیں، اگر وہ حاصل نہ ہوسکیں اور ان کے حصول کو آسان نہ بنایا جاسکے تو ان کا کچھ فائدہ نہیں۔

قانون شریعت کی افادیت کا ادراک:

اس سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے کہ ہم خود قانون شریعت اور اس کی اہمیت سے واقف ہوں اور اپنے آپ کو اتنا باشعور بنائیں کہ نہ صرف دوسرے مسلمانوں بلکہ اپنے غیر مسلم بھائیوں کو بھی ان قوانین کی افادیت، فطرت انسانی سے ان کی مطابقت اور انسانی زندگی کے لئے ان کی اہمیت بتاسکیں اور ان کی غلط فہمیوں کو دور کرسکیں، کیوں کہ یہ جمہوریت کو بچانے اور سیکولرزم کی حفاظت کرنے کی لڑائی ہے، اس میں ہمیں دوسری اقلیتوں اور خود اکثریتی فرقہ کے سیکولر اذہان کے حامل اشخاص کو بھی ساتھ لینا ہے اس لئے کہ یہ محض مسلمانوں کا مسئلہ نہیں بلکہ اس ملک میں مذہبی قدروں کی بقا کا مسئلہ ہے، افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے بہت سے مسلمان بھائی جنہوں نے یا تو اسلام کو پڑھا نہیں یا مستشرقین کی کتابوں میں پڑھا ہے، وہ خود اسلام کے تئیں غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

احکام شریعت پر عمل:

دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ ہم قانون شریعت پر عمل کریں، حقیقت یہ ہے ہم خود ہی اللہ اور رسول کے احکام کو توڑتے ہیں، عورتوں کے ساتھ ظلم وزیادتی کو روا رکھتے ہیں، بیٹی کو میراث نہیں دی جاتی، بیوہ کو اس کے حق سے محروم رکھا جاتا ہے، شادیوں میں جہیز اور تلک کا مطالبہ کیا جاتا ہے جو قطعاً ناجائز اور حرام ہے، بڑی تعداد میں بارات لے جائی جاتی ہے، بعض لوگ عورتوں کو لٹکا کر چھوڑ دیتے ہیں نہ ان کے حقوق ادا کرتے ہیں اور نہ انہیں طلاق دے کر اپنے نکاح سے آزاد کرتے ہیں، محض جذبہ عناد کے تحت ایک سے زیادہ نکاح کئے جاتے ہیں اور بیویوں کے ساتھ عدل وانصاف کا برتاؤ نہیں کیا جاتا ہے، کسی ضرورت شرعی کے بغیر محض وقتی اشتعال کے تحت طلاق دی جاتی ہے اور وہ بھی "ایک" نہیں بلکہ "تین"۔ غرض بہت سی معاشرتی بیماریاں ہیں جو کچھ تو جہالت اور خدا ناترسی کی وجہ سے ہیں، اور کچھ

برادرانِ وطن کے رسم ورواج سے متاثر ہوکر ہمارے سماج میں گھس آئی ہیں، اگر ہم نے ان برائیوں کو دور نہیں کیا تو اللہ کی مدد ہم سے اٹھ جائے گی اور ظاہر ہے کہ نصرت خداوندی کے بغیر ہمارا یہ کارواں آگے نہیں بڑھ سکتا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اپنی بداعمالیوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے دوسروں کو اس بات کا موقع فراہم کیا ہے کہ وہ قانون شریعت پر انگلیاں اٹھائیں اور شریعت مطہرہ کے خلاف زبان کھولیں، اس سے زیادہ بدنصیبی اور بدبختی کیا ہوسکتی ہے کہ ہم اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر انگشت نمائی کا ذریعہ بنیں۔

اتحاد امت:

تیسری ضروری چیز امت کا اتحاد واتفاق ہے، 1972ء میں ہمارے بزرگوں نے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی صورت میں ایک ایسا قافلہ ترتیب دیا جس میں حوصلہ تھا، جذبہ اتحاد تھا، قانون شریعت کے تحفظ کا عزم تھا اور ہر قیمت پر راہ کی مشکلات سے گزر کر منزل تک پہنچنے کا پختہ ارادہ تھا، یہی وہ چیز تھی جس نے حکومت کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کیا اور اسی وجہ سے مختلف مواقع پر قانون شریعت کی حفاظت کی مہم میں ہم نے کامیابیاں حاصل کیں، اور آئندہ بھی اتحاد ہماری کامیابی کی ضمانت ہے۔

مصیبت اور آزمائش دو متضاد چیزوں کو اکٹھا کردیتی ہیں، جب سیلاب آتا ہے اور آندھیاں اٹھتی ہیں تو شیر اور ہاتھی اور سانپ اور نیولے سبھی مل کر اپنی جان بچاتے ہیں، آج مسلمان آزمائش کی اسی گھڑی میں ہیں، فرقہ پرست طاقتیں اقتدار کے نشہ میں ہیں اور وہ اعلانیہ مسلمانوں کو قانون شریعت سے محروم کرنے اور ہم پر خود ساختہ قوانین کو مسلط کرنے کے درپے ہیں، وہ چاہتی ہیں کہ ہمارے صفوں میں انتشار پیدا کریں تاکہ ہمارا شیرازہ بکھر جائے کیوں کہ ایک کمزور اور بکھری ہوئی قوم کو اپنی گرفت میں لینا آسان ہوتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ ہم ہر طرح کے گروہی مسلکی اور جماعتی اختلافات سے اوپر اٹھ کر مشترکہ

مسائل میں اتحاد کا ثبوت دیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ولا تنازعوا فتفشلوا وتذهب ريحكم (الانفال 46) ’’اور آپس میں نہ جھگڑو، پس بزدل ہوجاؤ گے اور جاتی رہے گی تمہاری ہوا‘‘۔

آخری بات:

اگر ہم اپنی صفوں کو متحد رکھیں گے، اشتعال سے بچتے ہوئے تدبر اور حکمت عملی کے ساتھ قدم آگے بڑھائیں گے، اللہ کے دین کی محبت ہمارا زاد سفر ہو اور حوصلہ وہمت ہمارا ہتھیار، باہمی اعتماد اور ہر حال میں نظم واجتماعیت کے ساتھ رہنے کا عزم، تو کوئی طاقت نہیں جو ہماری راہ میں رکاوٹ بن سکے اور ہمیں منزل مقصود تک پہنچنے سے روک سکے۔

لتوفیق وهو المستعان.

☆☆

حکومت کو مسلم پرسنل لا میں مداخلت کا کوئی حق نہیں

● مولانا محمد یوسف اصلاحی

کسی بھی راسخ العقیدہ مسلمان سے سوال کیجئے کہ وہ اسلامی شریعت سے اتنی محبت کیوں کرتا ہے تو اس کا سیدھا سادا جواب یہ دے گا کہ ایک فرد جو اللہ اور رسولؐ سے محبت کرتا ہے ان کی اطاعت وفرماں برداری کا عہد کر چکا ہے، اور اس عہد کو **أشهد أن لا إلـه الا اللـه وأشهد أن محمد رسول الله** کہہ کر دن رات میں بار بار دہراتا رہتا ہے۔ اس کی گھٹی اور فطرت میں یہ بات ودیعت ہو چکی ہے کہ وہ اس دین اور شریعت سے محبت کرے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی معرفت نازل فرمایا ہے اور اس طرح اپنی چند روزہ زندگی میں خدا کے ساتھ اپنی وفاداری کا ثبوت پیش کرے۔ آپ اس سے اگر یہ سوال کریں کہ وہ اپنے پرسنل لاء میں ترمیم کیوں نہیں چاہتا تو دوٹوک لفظوں میں یہی کہے گا کہ چوں کہ اسلامی شریعت کو وہ مکمل اور دین کا جز سمجھتا ہے نیز تمام دنیا کے قوانین سے بالا و برتر اصح اور کامل سمجھتا ہے۔ اس لئے وہ مسلم پرسنل لا میں جو شریعت اسلامیہ کا ایک حصہ ہی کسی کتر بیونت کا قائل نہیں ہے۔

وہ آپ کو یہ بھی بتلائے گا کہ وہ اس بات پر یقین کامل رکھتا ہے کہ اس چند روزہ دنیاوی زندگی کے مقابلے میں آخرت کی زندگی بدرجہا بہتر بھی ہے اور وہ یوم حساب کی اس بازپرس

سے ڈرتا ہے کہ اس نے اس مختصر سی زندگی میں خدا اور اس کے رسول کے احکام کی فرمانبرداری کیوں نہیں کی۔ اس کا عقیدہ ہے کہ اسلام صرف نماز، روزہ کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک مکمل دین ہے جس کے ہر جز کی اتباع اسی طرح لازم ہے جس طرح نماز روزہ کے احکام کی، لہٰذا اگر وہ ان تمام احکام کی پابندی کرتا ہے جن میں اس کا پرسنل لا بھی شامل ہے تو وہ امید رکھتا ہے کہ خدا اپنے فضل سے اس کو دائمی مسرت کے اس مقام میں داخل کرے گا جس کا نام جنت ہے، لیکن اگر اس نے کسی حکم کی نافرمانی کی خواہ وہ پرسنل لاء ہی کے سلسلہ میں کیوں نہ ہو تو اس کو سخت عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا جس کے تصور ہی سے اس کی روح لرز جاتی ہے۔ وہ بہت سنجیدگی کے ساتھ آپ سے یہ بھی کہے گا کہ خدا کے ماننے والے اگر اس کے کسی ایک حکم میں کتر بیونت کرنے لگیں تو ایسے لوگ نہ صرف یہ کہ دوسرے احکام خداوندی کا کانٹ چھانٹ میں جری ہو جائیں گے بلکہ کسی بھی مروجہ قانون اور لیجسلیچر کے احکام کی پابندی سے بھی گریز کرنے لگیں گے۔

ممکن ہے کہ حکومت ہماری ان باتوں کو فرقہ واریت پر محمول کرے کیوں کہ ہمارا تعلق جماعت اسلامی سے ہے اور جماعت کو حکومت آئے دن بلاوجہ ملعون کرتی رہتی ہے، لیکن اگر اپنے مذہب کی باتیں بیان کرنے اور ان پر یقین کامل رکھنے کا نام فرقہ واریت ہے تو ہم بخوشی اس الزام کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں، البتہ حکومت کو یہ بتلائے دیتے ہیں کہ یہ خیالات صرف جماعت اسلامی ہی کے نہیں بلکہ سارے ہی مسلمانوں کے ہیں۔ اس سلسلے میں مناسب ہوگا کہ انڈین نیشنل کانگریس کے ایک سابق صدر اور حکومت ہند کے ایک ممتاز مرکزی وزیر مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی رائے غور سے سن لی جائے جن کے الفاظ یہ ہیں۔

’اسلام کے احکام میں کوئی راز نہیں جن تک گورنمنٹ کی رسائی نہ ہو، چھپی ہوئی کتابوں میں مرتب ہیں اور مدرسوں کے اندر شب وروز یہ درس وتدریس دیتے ہیں، پس گورنمنٹ کو چاہئے کہ صرف اس بات کی جانچ کرے کہ واقعی اسلام کے شرعی احکام ایسے ہی

ہیں یا نہیں؟ اگر ثابت ہوجائے کہ ایسا ہی ہے تو پھر دو ہی راہیں گورنمنٹ کے سامنے ہونی چاہیئے۔ یا مسلمانوں کے لئے ان کے مذاہب کو چھوڑ دے اور کوئی ایسی بات نہ کرے جس سے ان کے مذہب میں مداخلت ہو۔ یا پھر اعلان کردے کہ اس کو مسلمانوں کے مذہبی احکام کی کوئی پرواہ نہیں ہے، نہ اس پالیسی پر قائم ہے کہ ان کے مذہب میں مداخلت نہ ہوگی۔ اس کے بعد مسلمانوں کے لئے بھی نہایت آسان ہوجائے گا کہ اپنا وقت بے سود شور وفغان میں ضائع نہ کریں اور برٹش اور اسلام ان دونوں میں سے کوئی ایک بات اپنے لئے پسند کریں۔' (مسئلہ خلافت وجزیرہ عرب 5-204 طبع ثانی)

ہمیں پورا یقین ہے کہ مولانا آزاد مرحوم اگر آج زندہ ہوتے تو وہ بھی 'اسلام کے شرعی احکام' کے سلسہ میں جماعت اسلامی ہی کی صف میں نظر آتے۔

دراصل یہ باتیں جماعت اسلامی یا ہندوستان کے مسلمانوں کی ہی من گھڑت نہیں بلکہ اسلام کا یہ مسلمہ اصول اور مسلمانان عالم کا ہمیشہ سے یہ متفقہ مسلک رہا ہے کہ احکام خداوندی میں کوئی بھی ترمیم نہیں کی جاسکتی۔

ایک بے وزن بات:

مسلمانوں کو مغالطہ دینے کے لئے یہ بات بار بار دہرائی جاتی ہے کہ فلاں مسلم ملک نے مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کردی ہے، اس لئے ہندی مسلمانوں کو بھی اپنے پرسنل لا میں تبدیلی کردینی چاہیئے۔ لیکن یہ دلیل ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ فلاں فلاں مسلمان چوں کہ شراب پیتے ہیں یا جوا کھیلتے ہیں، کیوں نہ دوسرے مسلمان بھی ایسا ہی کریں۔ ظاہر ہے کہ ایسے استدلال کو استدلال کہنا استدلال کی توہین ہے۔ یہاں سوال اصول کا ہے نہ کہ کسی کے عمل کا۔ اگر کسی کا عمل اصول کے خلاف ہے تو ایسے عمل کو غلط قرار دیا جائے گا۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ شریعت کے کسی منصوص جز میں ترمیم کا کسی کو کوئی حق حاصل نہیں

ہے، خواہ اقدام کوئی کرے، بفرض محال ساری دینا کے مسلمان متفقہ طور پر بھی اگر کسی حکم خداوندی میں ترمیم کردیں تو ان کا یہ اقدام غلط ہی ہوگا کیوں کہ وہ اس کے قطعی مجاز نہیں ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے بموجب کہ **'لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق'** ایسے تمام احکام وقوانین دیوار پر دے مارنے کے قابل ہیں جو کتاب وسنت سے بے نیاز ہوکر بنائے گئے ہیں۔

جو لوگ ایسے احکام وضع کریں ان کو ڈرنا چاہیئے کہ خدا کی سزا بڑی سخت ہے۔ اب ان تبدیلیوں کی بھی حقیقت جان لینی چاہیئے جو بعض مسلم ممالک نے، مسلمانوں نے پرسنل لا میں کی ہیں۔ یہ حقیقت فی الاصل بس اتنی ہے کہ جن ممالک میں مسلم پرسنل لا میں ترمیم واصلاح کی گئی ہے ان سب میں سوائے دو ملکوں کے۔ یہ ترمیم واصلاح تمام تر حدود شریعت کے اندر رہتے ہوئے کی گئی ہے۔ یعنی کسی ایک ہی مکتب فقہہ کی بجائے مختلف فقہی مسالک کو سامنے رکھ کر اخذ وانتخاب کا طریقہ اختیار کرکے ایک مجموعہ قوانین مدون کرلیا گیا ہے یعنی اس مجموعہ قوانین کا سرچشمہ بہرحال اسلامی ذخیرہ فقہ ہی ہے۔ پھر اس سلسلے میں جو کچھ کیا ہے وہ خود مسلمانوں ہی نے کیا ہے۔ اور علماء ماہرین قانون اسلام کے مشورے سے کیا ہے غیر مسلمین کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں رہا ہے۔ اس ذیل میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان مسلمان ملکوں نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لئے یکساں سول کوڈ بنانے کی کوشش نہیں کی ہے جیسا کہ ہمارے ملک کے سیاست دانوں کے پیش نظر ہے۔ بلکہ غیر مسلموں کے لئے ان کے پرسنل لا محفوظ رکھے گئے ہیں۔

اس بات کو پھر ذہن نشیں کرلینا چاہیئے کہ اگر کسی مسلم ملک نے کوئی ایسی تبدیلی کی بھی ہو جو قرآن وسنت کے خلاف ہو تو خدا اور اس کے مقابلے میں یہ ایک باغیانہ روش اور غیر مجاز عمل ہے جس کو نہ تو نظیر بنایا جاسکتا ہے نہ اس کو بنیاد بنا کر قرآن وسنت کے مطابق عمل کرنے پر اصرار کرنے والوں کے مقابلے میں کوئی حجت قائم کی جاسکتی ہے۔ کتاب وسنت

ہی دراصل مسلمانوں کی پوری زندگی کے لئے مشعل راہ ہیں۔ ان کا ہر چھوٹا بڑا حکم ان کے لئے واجب الاتباع ہے۔

ایک غلط دعویٰ:

عام طور سے یہ دعویٰ بھی کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کے دستور کی رو سے پارلیمنٹ کو مسلم پرسنل لا میں ترمیم کا حق حاصل ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دستور ہند کے کچھ اجزاء بنیادی ہیں اور کچھ غیر بنیادی۔ ان بنیادی اجزا میں ترمیم کا کسی پارلیمنٹ کو اختیار حاصل نہیں ہے۔ ہندوستان کے شہریوں نے ملکی ڈھانچے اور نظام کو اس وجہ سے قبول کیا ہے کہ اس میں بنیادی حقوق کی دفعات موجود ہیں۔ ان حقوق میں کانٹ چھانٹ سے اندیشہ ہے کہ ایک نئے انقلاب کا دروازہ کھل جائے گا۔ جس میں شہریوں کے بنیادی حقوق کی مستحکم ضمانت دی گئی ہو۔ ہندوستانی شہری اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ عارضی طور پر کامیابی حاصل کرنے والی پارٹیوں کی خواہشات پر ہوا کے اکھڑے ہوئے پتوں کی طرح اڑتے رہیں۔ بلکہ انہوں نے بجا طور پر ایسی مستقل بنیادوں کو دستور میں جگہ دے رکھی ہے جو بنیادی انسانی حقوق کی ضامن ہیں اور اہل ملک کی ہر اٹھنے والی قیادت کو پابند کیا ہے کہ وہ ان بنیادوں میں رخنہ اندازی نہ کرے۔

یہ صحیح ہے دستور ہند میں بنیادی حقوق کے باب کے بعد، رہنما اصولوں کے باب کے تحت ایک دفعہ میں مشترکہ سول کوڈ کا تصور بھی دیا گیا ہے۔ لیکن لوگوں کو مغالطہ میں نہیں رہنا چاہئے کہ ریاست اس کی عملاً بھی پابند ہے۔ اس سلسلے میں ایک واضح مثال شراب بندی کے قانون کی ہے جو رہنما اصولوں میں درج ہے لیکن حکومت اسے نافذ کرکے اب دھیرے دھیرے ختم کرتی جارہی ہے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ دستور ہند کی رو سے کسی شہری کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ حکومت اگر کسی رہنما اصول پر عمل درآمد کرنے سے

مجموعہ القاسم: جلد پنجم — مسلم مسائل اور اس کا حل

قاصر رہے تو عدالتی چارہ جوئی کرکے اسے مجبور کیا جاسکے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ دستور ہند میں یکساں سول کوڈ کی دفعہ 44 دستور کے چوتھے باب کا ایک جز ہے۔ دستور کے چوتھے باب میں چندوہ رہنما اصول مندرج ہیں جن کو پیش نظر رکھ کر حکومت کو قانون سازی کرنی ہے۔ دفعہ 44 کے الفاظ یہ ہیں:

’’ریاست ملک کے تمام شہریوں کے لئے ایک مشترک سول کوڈ مہیا کرنے کی کوشش کرے گی۔‘‘ دستور کے باب سوم کا عنوان ہے ’’بنیادی حقوق‘‘ اور اس باب میں ہندوستان میں رہنے والے تمام ہی باشندوں کے لئے چند حقوق کو ان کے بنیادی حقوق کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے اور ان کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے۔ ان بنیادی حقوق میں سے ایک حق مذہب کو اختیار کرنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کا ہے۔ (دفعہ 25) اور اسی باب میں (دفعہ 39) کے ذریعہ یہاں کے شہریوں کے ہر طبقہ کو اپنے مخصوص کلچر کو برقرار اور محفوظ رکھنے کی حق کی ضمانت دی گئی ہے۔

دستور ہند کے ان دونوں ابواب یعنی باب سوم اور باب چہارم کے تقابلی مطالعہ سے یہ بات نکھر کر سامنے آتی ہے کہ بنیادی حقوق کو رہنما اصولوں پر فوقیت اور بالادستی حاصل ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اگر کوئی رہنما اصول کسی بنیادی حق سے متصادم ہو تو اس رہنما اصول کو پس پشت ڈال دیا جائے گا۔ اس فرق کو متعین کرنے والے چند وجوہ یہ ہیں۔

بنیادی حقوق کے متعلق دستور ہی کی دفعہ 32 میں اس باب کی صراحت کردی گئی ہے کہ بنیادی حق کو سپریم کورٹ کے ذریعہ نافذ کرایا جاسکے گا۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ دفعہ 32 کی گنجائش دفعہ 226 سے مستزاد ہے جس کے تحت ہر ہائی کورٹ میں کسی بھی حق کے نفاذ کے لئے رٹ داخل کی جاسکتی ہے۔ اس دفعہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر ریاست کسی بھی فرد کو کسی قانون کے ذریعے یا کسی عاملانہ حکم کے ذریعہ اس کے کسی بنیادی حق سے محروم کرے تو وہ اس قانون یا حکم کو عدالت میں چیلنج کرکے اس کی منسوخی کا فیصلہ کرسکتا ہے۔

لیکن رہنما اصولوں کے تعلق سے ایسی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے اور قانون دانوں کے درمیان یہ بات متفق علیہ ہے کہ اگر ریاست کسی رہنما اصول کو اختیار کرنے میں قصور اور کوتاہی کرے تو کسی عدالت کے ذریعہ ریاست کو اسے اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ اس صورت حال سے بھی بنیادی حقوق کی رہنما اصولوں پر بالا دستی واضح ہوتی ہے۔

بنیادی حقوق کو دفعہ 13 ضمن 2 کے ذریعے مزید مستحکم کر دیا گیا ہے اس دفعہ کی رو سے ریاست کے اختیارات قانون سازی پر یہ صریح تحدید عائد کی گئی ہے کہ ریاست کوئی ایسا قانون نہیں بناسکتی جس سے باب سوم میں مندرج بنیادی حقوق میں کسی کے حق پر کوئی ضرب ہوتی ہو۔

رہنما اصولوں کے باب میں ایسی کوئی مثبت یا منفی نوع کی دفعہ شامل نہیں ہے۔ جس سے ریاست پر کوئی لزوم عاید ہوتا ہے یا شہریوں کے حقوق کو محدود کیا گیا ہو۔

دستور کے باب سوم میں جن بنیادی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے وہ اپنی نوع میں بنیادی انسانی حقوق ہیں جو انسان کی فطری عزوشرف کا خاصہ ہیں۔ اور جن کو آج کی ہر متمدن ریاست تسلیم کرتی ہے۔ نیز وہ اقوام متحدہ کے منشور برائے بنیادی حقوق میں بھی شامل ہیں۔ اور اس منشور پر دستخط کر کے حکومت ہند نے بھی ان کو تسلیم کرلیا ہے۔ اسی لئے اس باب سوم میں بیشتر بنیادی حقوق کی ضمانت (بشمول دفعہ 25 میں دی ہوئی مذہبی آزادی کے) تمام لوگوں کے لئے ہے جب کہ یکساں سول کوڈ کا دائرہ صرف ہندوستان کے شہریوں تک ہی محدود ہے۔ جس کا مطالبہ یہ ہے کہ مذہبی آزادی کے بنیادی حق سے ہندوستان میں رہنے والا ہر مقیم کوئی بھی شخص حتی کہ ایک غیر شہری بھی جو عارضی طور پر ہندوستان میں مقیم ہو مستفید ہوسکتا ہے۔ اور اس کے تحفظ کے لئے ہندوستان کی عدالتوں کی پشت پناہی اسے حاصل ہوگی۔ رہنما اصول کے مقابلے میں بنیادی حقوق کا یہ عموم بھی ان بالا دستی کو ظاہر کرتا ہے۔

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر پارلیمنٹ یا کوئی ریاستی مجلس قانون ساز ایسا قانون وضع کرے جو دستور میں دئے ہوئے بنیادی حقوق سے متصادم ہو تو وہ قانون غیر آئینی ہوگا۔ اور یہی بات یکساں سول کوڈ کے لئے بھی ہے۔

یہ حقیقت بھی مسلمہ ہے کہ پارلیمنٹ ایک ایسا ادارہ ہے جو دستور ہند کی بعض دفعات کے نتیجے میں وجود میں آیا ہے۔ اس لئے اس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دستور کے صحیح منشاء کے خلاف کوئی قانون وضع کرے اور اس کے ذریعہ اقلیتوں کے بنیادی حقوق کو غصب کرلے دستور ہر حال میں پارلیمنٹ سے بالاتر ہے۔ اس کی بالا دستی کے علی الرغم پارلیمنٹ اگر کوئی ایسا قانون وضع کرتی ہے جو اس کے بنیادی حقوق سے متصادم ہو تو یہ سمجھا جائے گا کہ پارلیمنٹ نے اپنے حقوق سے تجاوز کیا ہے اور ان سب لوگوں کو جو ایسا قانون وضع کرنے میں کسی حیثیت سے شریک ہوں یہ سمجھا جائے گا کہ ان کا یہ اقدام حلف وفاداری کے خلاف ہے جو انہوں نے دستور ہند کے مطابق عمل کرنے کے سلسلے میں اٹھایا ہے۔

دستور ہند کی مذکورہ بالا خصوصیات کی بناء پر یہ نتیجہ نکالنا بالکل صحیح ہے کہ پارلیمنٹ کو مسلم پرسنل لا میں ترمیم کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ اس لئے کہ مسلم پرسنل لا دین اسلام کا اہم جز ہے۔ اور اسلامی کلچر میں داخل ہے۔ اس لئے کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جاسکتا ہے جو اس کلچر پر ضرب لگاتا ہو۔

مشترکہ سول کوڈ کی ایک جھلک:

مسلم پرسنل لا کے سلسلے میں ہمیں ایک اور اندیشہ بھی لاحق ہے جس سے خبر دار رہنے کی ضرورت ہے یہ اندیشہ اس شکل میں سامنے آرہا ہے کہ اس وقت ایسے متعدد قوانین منظور کئے گئے اور کئے جاسکتے ہیں جو مسلم معاشرے کے شخصی قوانین پر اثر ڈالنے والے ہیں اور جو مشترکہ سول کوڈ میں شامل ہیں۔

بچوں کی تبنیت (Child adoption) کے سلسلے میں اس وقت عام آبادی پر ایک قانون نافذ کرنا حکومت کے پیش نظر جس کو (Adoption of children 1972) کے نام سے پاس کرانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ یادرہے کہ پارلیمنٹ میں یہ بل حکومت کی طرف سے پیش کیا گیا ہے، لہٰذا یہ کہنا کہ حکومت مسلم پرسنل لا کو ابھی بدلنا نہیں چاہتی ہے، صحیح نہیں ہے۔ صاف دیکھا جاسکتا ہے کہ غیر محسوس طریقہ پر پرسنل لا میں تبدیلیوں کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس بل کی دفعہ 13 ملاحظہ ہو۔

تبنیت کا اثر:

(1) حکم تبنیت اس تاریخ سے نافذ متصور ہوگا جس تاریخ کی صراحت ڈسٹرکٹ کورٹ نے اپنے حکم نامہ میں کی ہو یا اگر تحت دفعہ 12 اس حکم کے خلاف کوئی مرافعہ کیا گیا ہو تو اس تاریخ سے جس کی صراحت عدالت مرافعہ کے حکم میں کی گئی ہو۔

(2) وہ بچہ جس کے بارے حکم نامہ تبنیت جاری ہوا ہو حکم نامہ میں مندرج تاریخ سے جملہ اغراض کے لئے (بشمول بلا وصیت انتقال کی صورت کے) مثل اپنے متبنی گیرندہ کے حقیقی بچہ کے اور اس کے متبنیٰ گیرندگان مثل اس کے حقیقی والدین کے متصور ہوں گے گویا کہ وہ ان کے رشتہ مناکحت کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے اور اس تاریخ سے اس بچہ کے جملہ تعلقات اپنے خاندان پیدائش سے منقطع اور متبنی گیرندگان کے خاندان سے قائم شدہ متصور ہوں گے مگر شرط یہ ہے:

(الف) وہ بچہ کسی ایسے فرد سے شادی نہ کرسکے گا جس سے وہ شادی نہ کرسکتا اگر وہ اپنے خاندان پیدائش ہی میں رہتا۔

(ب) اگر کوئی جائداد تاریخ حکم نامہ تبنیت سے قبل اس بچہ کو حاصل ہوچکی تھی تو تابع ان شرائط کے، اگر کوئی ہوں، جن کے تحت وہ اس بچے کو حاصل ہوئی تھی، وہ اس بچہ کی

ملکیت میں باقی رہے گی۔

(ج) متبنی کسی فرد کو کسی ایسی جائداد کے حقوق ملکیت سے محروم نہ کرے جو حکم نامہ تبنیت سے قبل اس فرد کو حاصل ہوچکے ہوں۔''

متبنی کے یہ حقوق بعینہٖ وہی ہیں جو Hindu Adoption and Maintenance Act1956 کے تحت ہندوؤں کے سلسلے میں مقرر کئے گئے ہیں اور اب ان کو سب ہندوستانیوں پر لاگو کیا جانا پیش نظر ہے۔

چناں چہ 72ء کے اس بل کے اغراض ومقاصد میں یہ بات واضح طور پر کہی گئی ہے کہ اس مسودہ قانون کا مقصد تبنیت کے بارے میں مروجہ ہندو قانون تبنیت وگذارے کے جز ومتعلقہ تبنیت اور اس سلسلہ کے سارے رواجی قوانین کو ختم کرا کے ایک ایسا قانون بنانا ہے جو تمام فرقوں پر لاگو ہو۔

اس سے قیاس کر لیجئے کہ مشترکہ سول کوڈ کس طرح اکثریت کے مزاج اور روایات کا عکس بن کر سامنے آنے والا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن وسنت نے مسلمان خاندان کے نظم واستحکام کے لئے شخصی قوانین بنائے ہیں ان پر اگر آزادانہ اور غیر متعصّبانہ طور پر غور کیا جائے تو ہر منصف مزاج انسان یہ مطالبہ کرنے پر آپ کو آمادہ پائے گا کہ ان قوانین کو مسلم سماج ہی کے لئے خاص رکھنے کے بجائے ملک گیر اور آفاقی حیثیت دی جانی چاہئے۔ کیوں کہ ان کے علاوہ خاندان کا استحکام اور سماجی انصاف کسی اور طرح ممکن ہی نہیں۔ مگر برا ہو تنگ نگاہی کا اس کے باعث ایسے مفید اور جامع قوانین سے استفادہ کرنا تو درکنار، الٹا ان لوگوں کو بھی اس سے محروم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے جو ان کو اپنائے ہوئے ہیں۔

ہم یقیناً اس وقت ایک اجنبی ماحول میں گھرے ہوئے ہیں تاہم مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ تاریکی کا وجود ہی اس امر کا متقاضی ہے کہ اس میں روشنی کا چراغ جلایا جائے۔ ہمیں اپنی جگہ اس وقت ایک طرف تو یہ عزم کر لینا چاہئے کہ اپنے معاشرہ میں اسلامی روح کے

مطابق خاندانوں کی اصلاح کریں گے اور ہمارا ایک ایک گھر خدمت دین اور اقامت دین کا روشن منارہ بنے گا۔ دوسری جانب ملی پیمانہ پر ہماری طرف سے اس بات کا صریح مطالبہ کیا جانا چاہئے کہ مسلم پرسنل لا میں ترمیم وتبدیلی کا کسی حکومت یا پارلیمنٹ کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

ڈاکٹر امبیڈکر کا انتباہ:

اس ذیل میں یہ تذکرہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا کہ جب مجلس دستور ساز میں مجوزہ دستور پر دفعہ وار بحث ہورہی تھی اور یہ دفعہ 44 (جو مسودہ دستور میں دفعہ 35 تھی) زیر بحث آئی تو بعض ممبران اسمبلی دستور ساز نے اس کی شدت سے مخالفت کی اور ان تقریروں سے یہ بات بھی کھل کر سامنے آئی کہ اس کی مخالفت صرف مسلمان ہی نہیں کرتے بلکہ خود ہندو کا ایک بڑا طبقہ مشترکہ سول کوڈ کا مخالف ہے اور اس کو مداخلت فی الدین اور دستور میں دیئے گئے بنیادی حقوق کے مغائر سمجھتا ہے، اس موقع پر ڈاکٹر امبیڈکر صاحب نے جنھوں نے دستور کا مسودہ تیار کرنے میں نمایاں حصہ لیا تھا اس بارے میں یہ فرمایا تھا۔

''ریاست صرف یہی چاہتی ہے کہ اسے اس طرح کے قانون بنانے کا حق حاصل ہوجائے اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ریاست مسلم پرسنل لا کو ختم کرنے کی پابند ہوجائے۔ لہٰذا کسی شخص کو اس بات کا اندیشہ نہیں ہونا چاہئے کہ اگر ریاست نے اپنے لئے اس قسم کا اختیار حاصل کرلیا ہے تو وہ فوراً ہی اس اختیار کا استعمال اور اس کو اس طرح نافذ بھی کردے گی جو مسلمان یا عیسائیوں یا دوسرے فرقوں کے لئے قابل اعتراض ہو۔

کوئی بھی ریاست اپنے اختیارات کا استعمال اس طرح نہیں کرسکتی جس کے باعث مسلمانوں کو بغاوت پر آمادہ ہوجانا پڑے اگر ریاست ایسا کرے تو میری دانست میں وہ پاگل پن ہوگا۔''

اس بحث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صرف دفعہ 44 کے تحت یکساں سول کوڈ کے خطرہ سے اپنے کو محفوظ کرلینے پر بات ختم ہوجاتی ہے، صورت حال یہ ہے کہ اس وقت بھی ملک میں چند ایسے قوانین نافذ ہیں جو مسلم پرسنل سے متصادم ہیں، ان میں خصوصیت سے (Special Marrige Act) قابل ذکر ہے۔ یہ قانون ہندوستان کی آزادی کے بعد ہماری پارلیمنٹ نے 1984ء میں بنایا ہے۔ اس کی رو سے نکاح کے لئے نہ تو جانبین کا ہم مذہب ہونا ضروری ہے اور نہ ہی نکاح کے منعقد ہونے کے لئے کسی مذہبی رسم کا ادا کرنا۔ صرف حکومت کے ایک عہدہ دار کے پاس اس بات کا تحریری اقرار کافی ہے کہ طرفین قانون مذکورہ کے تحت رشتہ مناکحت میں بندھ رہے ہیں اور اس قانون کے تحت شادی کے بعد طرفین اور ان کی اولاد وراثت کے باب میں (indian succession Act) سے متعلق ہوں گے نہ کہ ان میں سے کسی ایک کے شخصی قانون وراثت سے، اس قانون کا ایک عجیب پہلو یہ ہے کہ اگر طرفین ایک ہی مذہب کے ہوں یعنی مرد اور عورت دونوں ہندو یا دونوں مسلمان ہوں تب اس قانون کے تحت شادی کرلینے کے نتیجہ میں ان کا مذہبی قانون وراثت ان سے متعلق نہ ہوگا بلکہ مذکورہ بالا قانون Indian succession Act سے متعلق ہوگا جو ہندو قانون وراثت اور اسلامی قانون وراثت سے مختلف ہے۔ اس طرح کے تمام قوانین کو منسوخ کرانے کی ضرورت ہے یا یہ طے کرالیا جائے کہ ان قوانین کا اطلاق مسلمانوں پر نہ ہوگا۔ اسی طرح اس وقت عدالتوں میں محمڈن لاء رائج ہے وہ فی الواقع اینگلو محمڈن لاء ہے اور اس میں متعدد قوانین شریعت سے متصادم یا مختلف ہیں ان تمام قوانین پر نظر ثانی کرکے انہیں کتاب وسنت اور فقہ اسلامی کے مطابق بنانے کی ضرورت ہے۔

اس قسم کے غیر اسلامی قوانین یا قوانین مروّجہ کے غیر شرعی اجزاء کو شریعت اسلامیہ کے مطابق بنانے کا کام ظاہر ہے کہ ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں بلکہ اس کے لئے وہی لوگ اہل ہیں جن کو کتاب وسنت کا کماحقہ علم حاصل ہو اور جو اسلامی فقہ، اسلامی فلسفہ

قانون اور اسلامی تاریخ پر عبور کے ساتھ ساتھ ان معاملات میں بصیرت بھی رکھتے ہوں۔

مندرجہ بالا امور کی روشنی میں بعض باتیں قابل توجہ ہیں جو درج ذیل ہیں۔

مسلمانوں کے مطالبات:

مسلم پرسنل لا کے سلسلے میں حکومت سے مسلمانوں کا مطالبہ ہے کہ:

(1) رہنما اصولوں میں سے دفعہ 44 منسوخ ہو۔ (2) مسلم پرسنل لا میں حکومت کوئی ترمیم نہ کرے۔ (3) اسپیشل میرج ایکٹ کا اطلاق مسلمانوں پر نہ ہو۔ (4) متبنیٰ بل 72ء واپس لیا جائے یا کم از مسلمانوں کو اس کے دائرہ اثر سے خارج رکھا جائے۔ (5) حکومت آئندہ کوئی ایسا بل نہ لائے جس کی منشا یکساں سول کوڈ کو جزاء جزاء نافذ کرنا ہو، جیسا کہ وہ اس وقت کر رہی ہے۔ جب تک یہ مطالبات پورے نہ ہوں گے مسلمانوں کو چین نصیب نہ ہوگا اور وہ یہ محسوس نہ کرسکیں گے کہ ان کا دین وایمان اور ان کی شریعت وتہذیب ملک میں محفوظ ہے۔

یقیناً طوفان شدید ہے لیکن اگر حکمت ودانش عزم واتحاد اور توکل علی اللہ سے کام لے کر آگے بڑھیں تو نصرت ایزدی سے اس طوفان میں سے اپنے لئے راستہ نکال سکتے ہیں۔

واللہ خیر الناصرین.

☆☆

مجموعه القاسم: جلد پنجم — مسلم مسائل اور اس کا حل

مسلم پرسنل لاء خطرات کے سائے میں

● سید احمد قادری

”حکومت شہریوں کے لئے ایک ایسا مشترکہ سول کوڈ رائج کرنے کے لئے جدوجہد کرے گی جس کا نفاذ ہندوستان کے طول وعرض میں ہو۔“

دستور ساز اسمبلی کے متعدد مسلم وغیر مسلم ممبروں نے اس رہنما اصول پر اعتراض کیا تھا اور بعض مسلمان ممبروں نے ترمیم بھی پیش کی تھی لیکن ان کی ترمیم منظور نہیں کی گئی۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے جن کی نگرانی میں دستور بن رہا تھا اقلیت سے تعلق رکھنے والے ممبروں کو یہ یقین دہانی کرائی تھی اور دستور ساز اسمبلی میں اعلان کیا گیا۔

حکومت کو محض اختیار دیا جا رہا ہے، جس کا یہ مطلب نہیں کہ مذہبی، شخصی قوانین ختم کر دینا اس لئے لازم ہوگا۔ کسی صاحب کو یہ خطرہ نہیں ہونا چاہئے محض یہ اختیار مل جانے کے باعث حکومت فوراً اس پر عمل کرنے پر مصر ہو جائے گی خواہ ملک کے مسلمان یا عیسائی یا کوئی اور فرقہ اس سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ کرے۔ حکومت کے اختیار عملاً ہمیشہ محدود ہوتے ہیں، خواہ آپ انہیں لفظی طور پر کتنا ہی لامحدود کر دیں، کیوں کہ حکومت اپنے اختیارات کا استعمال اس طرح نہیں کرسکتی جس کے نتیجے میں مسلمان بغاوت پر آمادہ ہو جائیں۔ اگر کسی وقت گورنمنٹ ایسا کرنے کی سوچے تو اسے فاتر العقل کہنا چاہئے۔

لیکن بہت جلد معلوم ہوگیا کہ یہ یقین دہانی سیاسی طفل تسلی کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ حکومت ہند نے دفعہ 44 کو اپنا نصب العین بنائے رکھا اور وہ بتدریج یکساں سول کوڈ کی

طرف قدم بڑھا رہی ہے۔ وہ اپنے ملازمین پر بلاتفریق مذہب، تعدد ازدواج کا دروازہ بند کرچکی ہے اوران کے لئے یک زوجگی کو لازم قرار دے چکی ہے۔ وہ اسپیشل میرج ایکٹ پاس کرچکی ہے جس کے تحت ایک مسلمان عورت اپنا مذہب تبدیل کئے بغیر کسی غیر مسلم سے شادی کرسکتی ہے اور جس کے تحت وہ اپنے شوہر کی نصف جائداد کی مالک ہوجاتی ہے۔ صوبہ یوپی وغیرہ کی اسمبلیاں زرعی ایکٹ پاس کرچکی ہیں اور یہ ایکٹ مسلمانوں پر بھی نافذ ہیں۔ ان میں زرعی زمین کی وراثت کے ضابطے اسلامی شریعت کے بالکل خلاف بنائے گئے ہیں اور ابھی حال میں ’’لے پالک بل‘‘ پارلیمنٹ میں پیش ہوچکا ہے۔ مرکزی وزرائے قانون نے حکومت کی نیت کو چھپایا بھی نہیں ہے بلکہ بآواز بلند اس کو ظاہر کیا ہے تاکہ مقتدی اپنے امام کی نیت سے بخوبی واقف ہوجائیں جب ’’ہندوکوڈ بل‘‘ پاس ہورہا تھا تو اس وقت کے مرکزی وزیر قانون مسٹر پاٹسکر نے اپنی ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا۔

’’ہندو قوانین میں جو اصلاحات کی جارہی ہیں وہ مستقبل قریب میں ہندوستان کی تمام آبادی پر نافذ کی جائیں گی، اگر ہم ایسا قانون بنانے میں کامیاب ہوگئے جو ہماری پچاس فیصدی آبادی کے لئے ہو تو اس کا نفاذ باقی آبادی پر مشتمل نہ ہوگا اس قانون سے پورے ملک میں یکسانیت پیدا ہوگی۔‘‘

ابھی جو ’متبنیٰ بل‘ زیر غور ہے اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے موجودہ وزیر قانون نے صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ یہ یکساں سول کوڈ کی طرف پہلا قدم ہے۔ جیسا کہ اوپر گذرا یہ پہلا قدم نہیں ہے بلکہ پہلے بھی کئی قدم اٹھائے جاچکے ہیں۔ ان اقدامات واعلانات کے بعد حکومت کا ارادہ بالکل واضح ہوچکا ہے۔ کانگریس الیکشن کے وقت جو اعلانات کرتی ہے یا حکومت کے ذمہ دار افراد خاص مواقع پر مسلمانوں کو جو تسلی دیتے ہیں اس سے دھوکا نہیں کھانا چاہئے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا عبرتناک معاملہ ہمارے سامنے ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس صورتحال میں ہم مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے۔

ہمارے نزدیک اس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ حکومت کو مداخلت فی الدین کے اس ارادے سے باز رکھنے کے لئے ہم مسلمانوں کو پورے عزم اور حوصلہ کے ساتھ، ایک سخت جدوجہد اور کشمکش (اسٹرگل) کے لئے تیار ہونا چاہئے اور اس جدوجہد میں ان مذہبی غیر مسلموں سے بھی تعاون حاصل کرنا چاہئے جو کسی کے مذہب میں مداخلت کو غلط سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک مسلمانوں کے پرسنل لاء کا تحفظ دو باتوں پر موقوف ہے، ایک یہ کہ دستور ہند کے رہنما اصول کی دفعہ 44 ختم کی جائے اور دوسری یہ کہ شخصی قوانین سے متعلق مقدمات کے فیصلہ وتصفیہ کا اختیار دین دار اور اسلامی شریعت سے واقف مسلمان ججوں اور قاضیوں کے حوالہ کیا جائے۔ میں نے اس پر اختصار کے ساتھ اظہار اپنی تحریر ’قضاء شرعی کا قیام ضروری ہے‘ میں کیا ہے جو اسی شمارے میں شائع ہو رہی ہے۔ ہمارے نزدیک کوشش کی صحیح سمت یہی ہے۔

جدوجہد کی صحیح سمت متعین کرلینے کے بعد کوشش کا یک رخ تو وہ ہے جس کا تعلق وقت کی حکومت سے ہے اور دوسرا رخ وہ ہے جس کا تعلق خود ہم مسلمانوں سے ہے جن میں ہم حکومت کی منظوری کے محتاج نہیں ہیں۔ اس سلسلے کی چند تدابیر ہم یہاں اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

(1) سب سے پہلی تدبیر یہ ہے کہ شرعی قوانین پر مسلمان خود عمل کریں۔ نکاح، مہر طلاق، وراثت، ہبہ، وصیت اور اسی طرح کے شرعی احکام پر اگر مسلمان خود عمل نہ کریں یا اس کے خلاف عمل کریں تو پھر مسلم پرسنل لاء کے تحفظ اور قضاء شرعی کے قیام کا مطالبہ وہ کس بنیاد پر کریں گے اور ان کی کوشش موثر کس طرح سے ہوگی؟ علماء اور مسلمان تنظیموں کے رہنما، اہل علم اور اخبارات ورسائل کو پوری کوشش کرنی چاہیے کہ جہاں کہیں مسلمان، شریعت کے خلاف، مقامی رسم ورواج یا خاندانی وروایات پر عمل کررہے ہیں وہ اسے ترک کردیں اور قوانین شریعت پر عمل شروع کردیں۔

(2) لوک سبھا، راجیہ سبھا اور ریاستی اسمبلیوں کے مسلمانوں ممبروں کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہئے کہ وہ مسلم پرسنل لا کے تحفظ اور قضا شرعی کے قیام کے مطالبہ میں مسلمانوں کا ساتھ دیں اور مسلمانوں سے متعلق ہر ایسے بل کی مخالفت کریں جو شریعت کے کسی قانون کے خلاف ہو مثال کے طور پر اس وقت متبنیٰ (لے پالک) بل لوک سبھا کے سامنے ہے اس کے خلاف انہیں اپنی آواز بلند کرنی چاہئے۔

(3) ایسے تمام انصاف پسند غیر مسلموں کا تعاون حاصل کرنا چاہئے جو دستور میں اقلیتوں کو دئے ہوئے حقوق کے حامی ہیں اور جو مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں حکومت کی مداخلت کو پسند نہیں کرتے، اس طرح عیسائیوں اور دوسری اقلیتوں کو بھی ساتھ لینا چاہئے جن کے پرسنل لا یکساں سول کوڈ کی زد میں آجائیں گے۔

(4) مسلمان خواتین کو خصوصیت کے ساتھ اس جدوجہد میں حصہ دار بنانا چاہئے، کیوں کہ عام طور پر انہیں کی مظلومیت کا نعرہ لگا کر مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی کا جواز پیدا کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں کچھ کوششیں بھی ہوئی ہیں اور متعدد بڑے شہروں میں اہم اجتماعات منعقد ہو چکے ہیں لیکن انہیں پر اکتفا کرنا صحیح نہیں ہوگا کیوں کہ ہمیں اپنی جدوجہد اس وقت تک جاری رکھنی ہوگی جب تک حکومت ہمارا مطالبہ تسلیم نہ کرے۔

(5) مسلم پرسنل لا کی دین اسلام میں کیا اہمیت ہے اس کو تمام مسلمانوں اور غیر مسلموں پر واضح کرتے رہنا چاہئے۔ جہاں تک تعلیم یافتہ مسلمانوں پر اسے واضح کرنے کا تعلق ہے اس پر خاصہ کام ہوا ہے۔ متعدد کتابیں، پمفلٹ، مضامین اور اخبارات ورسائل پر مسلم پرسنل لا نمبر شائع ہو چکے ہیں اور ماہنامہ معارف قاسم جدید کا یہ نمبر بھی اسی کوشش کا ایک حصہ ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی واضح کرتے رہنے کی ضرورت ہے کہ جن شرعی قوانین کے مجموعہ کو مسلم پرسنل لا کہا جاتا ہے وہ انگریزوں کے وضع کئے ہوئے نہیں ہیں بلکہ اللہ رب العالمین نے انہیں اپنی کتاب قرآن مجید میں نازل فرمایا ہے۔ اس وضاحت کی

ضرورت یوں ہے کہ جو لوگ مسلم پرسنل لا میں تبدیلی چاہتے ہیں وہ مسلمانوں کو یہ مغالطہ بھی دے رہے ہے کہ مسلمانوں کے لئے مسلم پرسنل لا انگریزوں نے وضع کیا تھا لہذا اس میں تبدیلی کرنا دین میں مداخلت نہیں ہے۔ یہ باور کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے کہ وہ لوگ اتنی بات نہ جانتے ہوں کہ مسلمانوں کے شخصی قوانین کے لئے انگریزی زبان میں صرف مسلم پرسنل لا کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ انگریزوں نے وہ قوانین وضع نہیں کئے ہیں۔ کیا وہ حضرات یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے لئے مثال کے طور پر تعدد ازدواج کا قانون انگریزوں نے وضع کیا تھا؟ دراصل جان بوجھ کر وہ مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

☆☆

عالم اسلام میں نافذ

مسلم پرسنل لاء کی صورت حال

● ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

مسلم پرسنل لا اسلامی زندگی کی اہمیت کو واضح کرنے اور اس کے کردار کو عالم انسانی کی صحیح اور مضبوط تعمیر میں ایک بنیادی عنصر قرار دینے کا ایک عملی اور مؤثر طریقہ ہوسکتا ہے، کسی بھی مسلم معاشرہ کے افراد کے لئے اس طریقہ کو اختیار کرنا انتہائی ضروری ہے، تاکہ کسی شرعی لغزش کی بنا پر اس کی اسلامیت مجروح نہ ہونے پائے اور وہ اپنی تمام ضروریات میں خواہ وہ عائلی ہوں یا انفرادی یا اجتماعی ہوں شریعت کی ہدایت کا محتاج رہے۔

یہی وہ طریقہ حیات ہے جس سے ایک مسلمان کی زندگی قابل تقلید اور قابل رشک قرار پاتی ہے، اس طریقۂ حیات کی مکمل تشریح کو ہم شریعت سے تعبیر کرتے ہیں، اس میں ائمۂ مجتہدین کے اجتہاد کے تنوع کو بھی رحمت الٰہی کا ایک مظہر تصور کرتے ہیں، بہت سے مسائل ایسے ہیں جن میں ائمہ اسلام کا اجتہادی اختلاف پایا جاتا ہے اور اس کی وجہ سے عام انسانی زندگی کی مشکلات دور کرنے میں مدد ملتی ہے۔

اور عام طور سے صرف ہند و پاک میں امام ابوحنیفہؒ کا اجتہادی مسلک رائج نہیں ہے، بلکہ دنیا کے بہت سے ملکوں اور خطوں میں شرعی معاملات میں اس پر عمل کیا جاتا ہے، رہا عالم اسلام کا پرسنل لا تو مصر جیسے گہوارۂ علم و فن اور مرکزِ فقہ و قانون میں حنفی مسلک رائج ہے، اور اسی کو قابل عمل سمجھا جاتا ہے، اگرچہ دوسرے ائمۂ شریعت کے مسلک پر عمل کرنے والے

وہاں موجود ہیں، لیکن اسلام کے قدیم اور اولین زمانے ہی سے امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلک کو عملی حیثیت سے اسلامی روح اور شریعت کے مزاج کے مطابق ہونے کے باعث اسے قابلِ ترجیح سمجھا گیا، لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہ سمجھا جائے کہ دوسرے فقہی مسالک کے تمام ماننے والے بھی اسی فقہ حنفی کو ترجیح دیتے تھے، اور عالم اسلام کے دوسرے حصوں میں جہاں مذہب حنفی کے بجائے حنبلی یا شافعی یا مالکی فقہ کے ماتحت ان کا عائلی اور اجتماعی قانون رائج تھا، وہ بھی مذہب حنفی کے تابع تھے، لیکن میرا خیال ہے کہ حنفی مسلک کی مقبولیت کا راز اس کا زندگی سے زیادہ قریب ہونا اور انسانی مزاج سے زیادہ مطابقت رکھنے میں مضمر ہے۔

مصر کے باشندگان قدیم دور سے اسی حنفی مسلک سے وابستہ ہیں، امام ابوزہرہؒ اپنی کتاب ”الأحوال الشخصية“ میں رقمطراز ہیں:

”دور عباسی میں جب بغداد کو علوم وفنون کا ایک بڑا مرکز تسلیم کیا گیا اور امام ابو یوسفؒ وہاں چیف جسٹس کی حیثیت سے متعین ہوئے تو وہاں کی اسلامی حکومت میں فقہ حنفی کو اولین مرتبہ حاصل ہوا، اور جو ممالک بھی سلطنتِ عباسی کے تابع تھے وہاں بھی تمام شرعی امور میں اسی مسلک پر عمل کیا گیا، محاکم شرعیہ کے اندر انہیں قاضیوں کا تقرر ہوتا تھا جو امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کے ماننے والے تھے، چنانچہ سلطنتِ عباسی کا شرعی مسلک ”حنفی مسلک“ قرار پایا۔

مصر بھی انہیں اسلامی ملکوں میں تھا جہاں کا سرکاری قانون مذہب حنفی کے مطابق تھا، وہاں کے سب سے پہلے قاضی فقہ حنفی کے مسلک پر عمل کرنے والے اسماعیل بن الیسع الکندی تھے، جب ان کی رائے مذہب حنفی کے مطابق اوقاف کو ختم کرنے کے سلسلہ میں ظاہر ہوئی جو اہل مصر کے عمل کے خلاف تھا، تو وہاں کے علماء اور فقہا کی طرف سے اس کی مخالفت ہوئی، ان میں لیث بن سعد جو وہاں کے سب سے بڑے فقیہ تھے وہ اسماعیل بن الیسع الکندی کے پاس گئے اور ان سے اس موضوع پر مناقشہ کیا، یہاں تک کہ اس وقت کے

خلیفہ مہدی نے ان کو معزول کردیا، اس طرح شریعت کے تمام معاملات میں حنفی مسلک رائج تھا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شافعی اور مالکی مسلک سے وابستہ افراد موجود نہیں تھے، بلکہ واقعہ ہے کہ امام شافعیؒ نے مصر میں اپنی آخری زندگی گزاری اور وہیں ان کا انتقال ہوا، اور وہیں تدفین بھی ہوئی، اس لئے عوام الناس پر ان کے مسلک کا بہت اثر تھا، اسی طرح امام مالکؒ کے شاگردوں کی تعداد وہاں پر بہت زیادہ تھی، ان میں قابل ذکر عبدالرحمٰن بن القاسم بن طولونی اور اخشیدی دور تک باقی رہا، اور امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے مسلک کے مطابق بھی قاضیوں کا تقرر حکومت کی طرف سے ہوتا تھا، اور اسی بنا پر قاضی القضاۃ کبھی حنفی ہوتا تھا، کبھی شافعی اور کبھی مالکی، محمد علی کے دور میں وہاں صرف مسلک حنفی کا دور دورہ تھا اور وہاں کے پرسنل لا میں مذہب حنفی کے مطابق عمل ہوتا تھا‘‘۔

عالمِ اسلام کے نمائندہ ملک مصر میں مسلک حنفی کے مطابق مسلم پرسنل لا ہونے کی وجہ سے دوسرے اور چھوٹے ممالک میں جو شرعی معاملات مصر کے تابع ہوا کرتے تھے وہ مسلک حنفی کے مطابق زندگی کے تمام معاملات میں عمل کرتے تھے۔

سعودی عرب میں ترکی حکومت کے خاتمہ تک فقہ حنفی ہی کا رواج تھا، لیکن سلطان سعود کے آنے کے بعد جو امام احمد بن حنبلؒ کے ماننے والے اور ان کی فقہ پر عمل کرنے والے تھے اور وہاں فقہ حنبلی کے نمائندہ تھے، پورے سعودی عرب میں فقہ حنبلی کے مطابق عمل درآمد ہوتا رہا، اور شرعی احکام وحدود میں اس کی پابندی کی جاتی رہی، اور وہاں کے تمام شہروں اور حتیٰ کہ دیہاتوں میں شرعی عدالتیں قائم ہیں، اور انہیں کے مطابق عمل درآمد ہوتا ہے، میں نہیں سمجھتا کہ اس مقدس سرزمین میں عصری عدالتیں بھی قائم ہوں اور زندگی کے معاملات میں ان سے مراجعت کی ضرورت پڑتی ہو۔ اور دیگر اسلامی ممالک میں شرعی عدالتیں اپنی پرزور نمائندگی کے ساتھ ساتھ قائم ہیں اور معاملات میں لوگ ان کی طرف رجوع کرتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ عصری اور مدنی عدالتیں بھی ہیں جو بعض معاملات میں اپنا فیصلہ کرتی ہیں

اور ایسے غیر مسلم جو ان ملکوں میں موجود ہیں وہ اپنے معاملات میں ان سے رجوع کرتے ہیں، غالبًا ان ملکوں میں مدنی عدالتوں کے قیام کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہاں کے غیر مسلم باشندے اپنے معاملات میں ان کے فیصلے کو تسلیم کریں، خلیجی ممالک کے اندر عام طور سے مالکی مسلک کے ماننے والے حضرات موجود ہیں، اور مالکی مسلک کے مطابق قاضی اور رئیس القضاۃ مقرر کئے جاتے ہیں، لیکن بہت سے ایسے معاملات ہوتے ہیں جن میں فقہ حنفی کے مطابق بھی فیصلہ ہوتا ہے اور لوگ اس کی وسعت اور سہولت کی بناء پر اس سے مستفید ہوتے ہیں۔

اس طرح اگر عالم اسلام کے پورے رقبہ کا جائزہ لیا جائے تو مسلم عوام کے ساتھ غیر مسلم بھی سکونت پذیر ہیں، اور نہ صرف یہ کہ اہل سنت عالم اسلام میں اپنا وجود رکھتے ہیں بلکہ دیگر مسالک اور طریقوں کے ماننے والے مسلمان بھی خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں، ان سب میں سنّیوں کے بعد سب سے بڑی آبادی شیعہ حضرات اور اسی طرح دروزی، نصیری اور اسماعیلی اور فرقہ باطنیہ سے تعلق رکھنے والے بھی پائے جاتے ہیں، جن کا فقہی مسلک عام مسلمانوں کے مسلک سے مختلف ہے، اور وہ اپنے پرسنل لا کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔

☆☆

ملک بھر میں وقف املاک کی لوٹ کھسوٹ

● ادارہ

بشیر بدر کا ایک شعر ہے:

نام پانی پر لکھنے سے کیا فائدہ
لکھتے لکھتے ترے ہاتھ تھک جائیں گے

اس شعر کو پڑھیں اور ہندوستان کی حکومتوں کا رویہ دیکھیں خواہ وہ مرکزی حکومت کا ہو یا ریاستی حکومتوں کا یہ شعر بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ مسلمان جدوجہد کررہے ہیں، لیکن حکومت کے سرجوں تک نہیں رینگ رہی ہے اس کی ایک وجہ یہ ہے جدوجہد اور دھواں دھار تقریر کرنے والوں میں سے بعض لوگ چند سکوں کے عوض اپنا ایمان فروخت کرچکے ہوتے ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمانوں کا مسئلہ حل نہ ہو اور حکومت گھٹنے نہ ٹیک دے۔

شاہ بانو کیس کے سلسلے میں راجیو گاندھی جب کہ وہ دو تہائی سے زائد نشستوں کے ساتھ حکومت کررہے تھے جھکنا پڑا تھا۔ اس لئے کہ اس وقت مولانا منت اللہ رحمانیؒ، قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ اور مولانا ابوالحسن علی ندوی میاں رحمۃ اللہ جیسے بلند پایہ کے عالم دین اور رہنما موجود تھے جنہوں نے بے خطر اور بے لوث ہوکر تحریک کی قیادت کی تھی اور نتیجہ سامنے آیا تھا، لیکن اس وقت ہندوستان میں مسلم رہنماؤں کے جو حالات ہیں ان میں سے کسی پر آنکھ بند کرکے اعتماد نہیں کرسکتے، اس لئے ہر رہنما اپنے ذاتی مفاد کے حصار میں

مقید ہیں۔ بیان بازی، تھوڑا بہت احتجاج، دھرنا، کانفرنس، مظاہرہ اور ملاقات اپنی قیمت بڑھانے کے لئے کرتے ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو وقف املاک کی تباہی، مسجدوں پر قبضے، کسی مسئلے کا حل نہ ہونا اور حکومت اور افسران کا ان مسائل کے تئیں غیر سنجیدہ رویہ نہ ہوتا۔ ابھی حالیہ دو خبریں مسلمانوں کے لئے جہاں سوہان روح ہیں وہیں ایک خبر ایسی بھی ہے جسے مسلمان مثال بنا کر وقف املاک کی بازیابی کے لئے مقدمات کا سلسلہ شروع کرسکتے ہیں۔ ایک دہلی کی جنگ پورہ میں واقع نور مسجد سے متعلق ہے جب کہ دوسرا معاملہ کرناٹک وقف املاک کی لوٹ سے ہے اور تیسرا معاملہ آندھرا پردیش ہائی کورٹ کا وہ فیصلہ ہے جس میں 1600 سے زائد ایکڑ زمین کو وقف املاک قرار دیا گیا ہے۔ اس سے امید کی ایک کرن نمودار ہورہی ہے جس کے سہارے اگر مسلمان چاہیں تو اپنا منزل مقصود حاصل کرسکتے ہیں اور انہیں اپنے معاشرے کو خواندہ، خوشحال اور مہذب بنانے میں حکومت کی طرف نہیں دیکھنا ہوگا۔ کیوں کہ مسلمانوں کے آباء واجداد نے اتنی وقف جائدادیں چھوڑی ہیں اگر صرف نصف پر ہی انہیں تصرف حاصل ہوجائے اور اس کا صحیح کرایہ آنے لگے تو چند برسوں میں مسلمان نان شبینہ کے محتاج نہیں رہیں گے اور نہ ہی دیگر قوم کے دروازے پر اپنے بچوں کی تعلیم وروزگار کے لئے دستک دینے کی ضرورت ہوگی۔

جنوب کو شمال کے مقابلے میں کم بدعنوان تصور کیا جاتا ہے اور وہاں کے مسلمانوں کے بارے میں بھی شمال کے مسلمانوں کی اچھی رائے ہے کیوں کہ جو بھی رہنما آتے ہیں اس کے پس منظر میں ترقیات ہوتے ہیں خواہ وہ تعلیم سے متعلق ہو یا روزگار، صحت سے متعلق ہو یا معاشرے سے لیکن حالیہ ایک خبر نے شمالی ہند کے مسلمانوں کے تصوراتی محل کو مسمار کردیا ہے۔ کرناٹک میں وقف املاک کی لوٹ اور دو لاکھ کروڑ روپے کا گھپلہ سامنے آیا ہے جواب تک ہندوستان میں کسی بھی گھپلے سے بڑا ہے۔ کرناٹک کے وزیر اعلی ڈی سدانند گوڑا نے اسمبلی میں سات ہزار صفحات پر مشتمل ایک رپورٹ پیش کی ہے جس میں یہ انکشاف کیا

گیا ہے کہ کرناٹک میں دو لاکھ کروڑ روپے کا وقف گھپلہ سامنے آیا ہے۔ کرناٹک میں 54ہزار ایکڑ وقف کی رجسٹرڈ زمینیں ہیں۔ ان میں سے ۲۲ ہزار سے ۲۷ ہزار ایکڑ زمین فروخت کردی گئی ہیں۔ اس گھپلہ میں کرناٹک کے اعلی سیاست داں، وقف بورڈ کے ممبران، وقف بورڈ کے ملازمین، دلال، بچولیے اور زمین مافیا شامل ہیں۔ اس رپورٹ کو کرناٹک اقلیتی کمیشن کے چیرمین انور پڑی نے تیار کیا ہے۔ اگرچہ یہ رپورٹ اسمبلی میں پیش ہونے سے پہلے افشا ہوگئی تھی جس میں کئی ممبران اسمبلی کے نام سامنے آئے ہیں، جس پر اپوزیشن چراغ پا ہے۔ وقف بورڈ کی زمین میں ہوئے زبردست گھپلے اور گڑبڑیوں کی شکایتوں اور اخبارات میں شائع خبروں کے بعد ریاستی حکومت نے الزامات کی جانچ کے لئے گزشتہ برس نومبر میں انکوائری کمیشن کی تشکیل دی تھی۔ اپوزیشن پارٹی کانگریس اور جنتادل (سیکولر) نے اسمبلی کے دونوں ایوانوں میں ریاستی وقف بورڈ کے تقریباً دولاکھ کروڑ روپے کے زمین گھوٹالے کی مرکزی تفتیشی بیورو (سی بی آئی) سے انکوائری کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ یہاں محافظ ہی لٹیرا نکلا۔ اتنا بڑا گھپلہ ہوتا رہا ہے اس معاملے پر حکومت نے توجہ نہیں دی۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ میڈیا میں خبر نہیں آئی ہوگی خصوصاً کرناٹک سے شائع ہونے والے اردو اخبارات نے اس معاملے کو ضرور اچھالا ہوگا لیکن حکومت کی بے حسی کی وجہ سے یہ معاملہ سردخانے ڈال دیا گیا۔ حکومت اور عدلیہ کی بے رخی کی وجہ سے ہندوستان کا سب سے بڑا گھپلہ سامنے آیا ہے۔ اتنا بڑا گھپلہ حکومت کی سرپرستی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اعلی سطحی انکوائری کراکے وقف املاک کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے والوں کو نہ صرف وقف املاک کو واگزار کرایا جائے بلکہ اس کے خاطیوں کو قرار واقعی سزا دی جائے تاکہ دوسری ریاستوں کے لئے مثال ثابت ہو اور وہ وقف املاک کو خردبرد نہ کرسکیں۔ کرناٹک وقف بورڈ کے ریکارڈ کے مطابق یہاں 27338 وقف ادارے اور 32334 جائیدادیں۔ ۲۰۰۸ر کی پارلیمانی کمیٹی کی رپورٹ

مجموعه القاسم: جلد پنجم — مسلم مسائل اور اس کا حل

کے مطابق ان میں ۱۸۹ر پر قبضہ ہوچکا تھا۔ ان میں سے ایک زمین پر قبضہ ایک ہوٹل نے کیا ہوا ہے جس کی قیمت پانچ سو کروڑ روپے سے زائد ہے۔ کرناٹک میں وقف املاک کو کرایہ قانون سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے، لیکن اس کے باوجود وقف املاک معمولی کرایہ پر یا مفت میں استعمال ہو رہی ہیں۔

مدھیہ پردیش میں 1961 میں وقف بورڈ کی تشکیل ہوئی تھی۔ وقف املاک کے تحفظ کیلئے تین ادارے مدھیہ پردیش وقف بورڈ، شاہی اوقاف اور اوقاف عامہ قائم کئے گئے تھے۔ ان تینوں اداروں میں وقف املاک کی کل تعداد 14533 ہے، سروے ابھی جاری ہے۔ مدھیہ پردیش کے سبھی اضلاع میں وقف جائیدادیں موجود ہیں۔ آل انڈیا مسلم تہوار کمیٹی کے مارچ 1999 کے سروے کے مطابق مدھیہ پردیش میں 55 ہزار کروڑ کی وقف املاک ہیں لیکن آج تک وقف بورڈ کی سالانہ آمدنی 55 لاکھ بھی نہیں پہنچ سکی۔ وقف بورڈ کی 70 فیصد زمین پر ناجائز قبضہ ہے۔ اس پر حکومت اور عام لوگوں کے علاوہ ان لوگوں کا بھی بڑی تعداد میں قبضہ ہے جن کا تعلق مذہبی طبقہ سے ہے۔ مدھیہ پردیش کی وقف املاک کی تباہی کا اندازہ اس اعداد و شمار سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۶۹۱ میں صرف بھوپال میں قبرستانوں کی تعداد 187 تھی جو گھٹ کر محض 23 رہ گئی ہے۔

وقف املاک میں سب سے زیادہ لوٹ مار آندھرا پردیش میں ہوئی ہے۔ 1958-1965 کے سروے کی رپورٹ کے مطابق ریاست میں وقف اراضی جہاں 1.33 لاکھ ایکڑ تھی وہیں 2001 سے جنوری 2010 کے درمیان ہوئے سروے میں بڑھ کر 1.67 لاکھ ایکڑ ہوگئی۔ ریاست میں 40 فیصد وقف جائیدادوں پر ناجائز قبضے ہیں۔ گزشتہ پانچ دہائیوں میں تقریبا 55,000 ایکڑ وقف اراضی پر قبضہ کی بات سامنے آئی ہے۔ 60 فیصد حیدرآباد میں اور 55 فیصد رنگاریڈی میں وقف اراضی اب بورڈ کے پاس نہیں رہی۔ حیدرآباد میں بیشتر اراضی پر ناجائز قبضہ پرانے شہر میں ہے۔ سب سے زیادہ

قبضوں والے دیگر اضلاع گنٹور، ورنگل، کرنول، محبوب نگر، میڈک اور وشاکھا پٹنم ہیں۔ عام طور پر قبضے خود وقف ملازمین کے ساتھ سازباز کرکے انجام دیئے جاتے ہیں۔

ایس وائی آر اور چندرابابو نائیڈو کی حکومت نے جن زمینوں کو مختلف کمپنیوں اور اداروں کو وقف کی زمین الاٹ کی تھی اسے آندھراپردیش ہائی کورٹ نے ریاستی حکومت کے دعوے کو خارج کرتے ہوئے اسے وقف املاک قرار دیا ہے۔ اس فیصلے سے کانگریس ممبر پارلیمنٹ ایل راجگوپال کی کمپنی لینکو کو زبردست دھکا لگا ہے۔ اس کمپنی کو 2006 میں وائی ایس راج شیکھر ریڈی کی حکومت نے 108 ایکڑ زمین الاٹ کی تھی۔ اس کمپنی نے پہلے اس زمین پر ایک ٹیکنالوجی پارک کی تعمیر کا منصوبہ بنایا تھا لیکن بعد میں وہاں پر مہنگے گھر اور بلند بالا عمارتیں بنانے کا فیصلہ کیا۔ ہائی کورٹ نے نہ صرف اس زمین کو بلکہ وہاں کے آس پاس کی کل 1654 ایکڑ زمین کو وقف املاک بتایا ہے اور کہا ہے کہ یہ زمین حضرت حسین شاہ ولی کی درگاہ کی ملکیت ہے۔ عدالت کے فیصلے سے لینکو کمپنی کے ساتھ کئی دوسری بڑی کمپنیوں کو بھی دھکا لگا ہے جنہیں وائی ایس آر حکومت نے یہ زمین دی تھی۔ ان میں ایمار پروپرٹیز، مائیکروسافٹ، انفوسس، وپرو، پولارس سافٹ ویئر اور انڈین اسکول آف بزنس کے علاوہ مولانا آزاد اردو یونیورسٹی بھی شامل ہیں۔ حالانکہ وقف بورڈ اور دوسرے مسلم تنظیموں نے اس وقت ان کمپنیوں کو زمین دینے کے فیصلے کی کافی مخالفت کی تھی لیکن حکومت نے اسے نظرانداز کرتے ہوئے یہ زمین ان کمپنیوں کے حوالے کردی تھی۔ 2007 سے اس زمین کو لے کر عدالت عالیہ میں مقدمہ چل رہا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس میں حکومت کے دو محکمہ ایک دوسرے کے خلاف لڑ رہے تھے۔ ایک طرف اقلیتوں کی فلاح و بہبود شعبہ اور وقف بورڈ اس زمین پر اپنا دعویٰ کر رہے تھے وہیں آمدنی کے محکمہ کا دعویٰ تھا کہ یہ سرکاری زمین ہے اور وہ اسے جسے چاہے دے سکتی ہے۔ اس زمین پر 7200 کروڑ روپے کی منصوبہ کے لئے تعمیر کررہے لینکو گروپ نے اس زمین کو سرکاری زمین ثابت کرنے

کے لئے مشہور وکیل سولی سوراب جی کی خدمات لی تھیں، مگر وقف بورڈ اور حسین شاہ ولی درگاہ کمیٹی کے وکلا نے عدالت عالیہ میں یہ ثابت کردیا کہ یہ زمین حیدرآباد کے نواب نے درگاہ کو تحفے میں دی تھی اور اس کا مکمل سرکاری ریکارڈ بھی عدالت میں پیش کیا گیا۔ اس فیصلے نے ریاستی حکومت کی پریشانی اور بڑھادی ہے، کیونکہ یہ فیصلہ کئی اور ایسے ہی معاملات کا پٹارا کھول سکتا ہے۔ یہ فیصلہ ایک مثال ثابت ہوسکتا ہے اگر مکمل محنت دستاویز اور ثبوت کے ساتھ کی جائے تو کامیابی یقیناً ملے گی، اگر اسی طرح تندہی سے دہلی وقف بورڈ اپنا مقدمہ پیش کرے تو کوئی وجہ نہیں وقف جائداد کی بازیابی نہ ہو۔

دہلی کے جنگ پور میں واقع نور مسجد کو ڈی ڈی اے نے ۱۲/جنوری کو صبح چھ بجے پولیس عملہ کی موجودگی میں شہید کردیا تھا۔ اس زمین کا اندراج، جس کا رقبہ ۶ بیگھہ ۱۳/بسوا ہے، دہلی حکومت کے گزٹ نوٹیفکیشن ۱۹۷۵/میں خسرہ نمبر۶۳۳/کے طور پر درج ہے اس کا پرانا نام علی گنج ہے اور اس کا اندراج نمبر۲۰/ہے۔ اس کے علاوہ ۱۹۴۷-۴۸/میں جمع بندی میں باضابطہ طور پر درج ہے۔ یہ وقف جائداد دہلی میونسپل کارپوریشن کے ریکارڈ میں بھی درج ہے۔ ثبوت کے طور پر ڈی ڈی اے کو تمام ثبوت فراہم کئے گئے تھے، گزٹ کی کاپیاں دی گئی تھیں اس کے باوجود ڈی ڈی اے کے عملہ نے مسجد کو شہید کردیا تھا۔ زبردست احتجاج کے بعد شیلا حکومت نے اس مسئلہ کو حل کرنے کی یقین دہانی کرائی تھی۔ ڈی ڈی اے کی دیدہ دلیری دیکھئے اس چارسو گز الاٹ کرنے کے ۹۰/لاکھ روپے کا مطالبہ کیا تھا جسے حکومت دہلی نے دینے کا وعدہ کیا تھا، لیکن ایک طویل عرصہ گزر جانے کے بعد اب تک اس رقم کی ادائیگی دہلی حکومت نے نہیں کی ہے۔ اب نمازیوں کو صفیں بچھانے اور سائبان لگانے سے روک دیا گیا ہے۔ سب سے زیادہ افسوس یہاں کے مسلم رہنما پر ہوتا ہے کہ وہ ہر موقع پر سودے بازی کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ جب تک مسجد کی دوبارہ تعمیر کا پروانہ جاری نہ ہوتا اور خاطی افسران برخاست نہ کئے جاتے اس وقت تک مسلم لیڈروں اور مسلمانوں کو اپنا

مظاہرہ جاری رکھنا چاہئے تھا،لیکن وعدے اور سودے بازی کے سبب ایسا نہیں ہوا۔اگر مسلم لیڈران ایسا کرنے میں کامیاب ہوجاتے تو مستقبل میں ڈی ڈی اے یا دیگر سرکاری افسران اس طرح کی زیادتی کرنے سے گریز کرتے۔اسی کے ساتھ مسلم لیڈروں کو جنگپورہ آر ڈبلیو اے اور ڈی ڈی اے افسران کے خلاف ہائی کورٹ میں مقدمہ دائر کرنا چاہئے تھا، کیوں کہ انہوں نے مسجد کے تعلق سے عدالت کو گمراہ کیا ہے اور عدالت میں ڈی ڈی اے نے اپنی زمین کا دعویٰ پیش کیا تھا، جب کہ یہ اس کی زمین نہیں تھی پھر وہ کیسے کسی مسجد کو مسمار کرسکتی تھی اور ڈی ڈی اے کو یہ بھی معلوم تھا کہ یہ مسجد وقف بورڈ کی زمین پر بنی ہے۔اس معاملے کو عدالت میں منظم اور مدلل انداز میں اٹھانا چاہئے۔متعصب افسران کو کیفر کردار تک پہنچانے کا یہی واحد طریقہ ہے۔اس لئے یہ اچھا موقع تھا کہ اسے مناسب انداز میں جواب دیا جاتا۔اگر یہی معاملہ ڈی ڈی اے نے کسی گرودوارہ یا مندر کے ساتھ کیا ہوتا کتنے افسران معطل ہوچکے ہوتے اور تعمیر نو اور معاوضہ حکومت ادا کرچکی ہوتی اور اسی کے ساتھ حکومت ایک بار نہیں سیکڑوں بار معافی مانگ چکی ہوتی۔باہری دہلی میں کئی ایکڑ زمین کو وقف بورڈ نے کوڑیوں کے بھاؤ میں غیر مسلموں کو لیز پر دے دیا۔مسلمان کس سے شکایت کریں؟

دہلی میں اوقاف کی اراضی پر ڈی ڈی اے کا قبضہ؟:

دہلی میں وقف املاک پر اگر کوئی سب سے بڑا قابض ہے تو وہ ڈی ڈی اے ہے۔ جہاں بھی انہیں وقف املاک نظر آتی ہے وہ اس پر ڈی ڈی اے لینڈ کا بورڈ لگا دیتا ہے اور وقف بورڈ کے ملازمین اور افسران تماشہ دیکھتے رہتے ہیں۔نظام الدین درگاہ بس اسٹاپ کے سامنے جو قبرستان ہے اس پر کچھ سال قبل اس نے ڈی ڈی اے لینڈ کا بورڈ لگا دیا ہے۔ اسی طرح ہمایوں کے مقبرے کے چوراہے کے شمال میں جو پارک ہے جو کچھ عرصہ پہلے تک خسرو پارک ہوا کرتا تھا اب یہ ڈی ڈی اے لینڈ کا بورڈ لگا ہوا ہے۔اسی طرح کی بیشمار وقف

کی جائدادیں ہیں جس پر ڈی ڈی اے نے قبضہ کر رکھا ہے۔وقف بورڈ اور مسلم لیڈر اس وقت غفلت سے بیدار ہوتے ہیں جب زمین پر قبضہ ہوچکا ہوتا ہے۔مسلم لیڈران اور مسلم تنظیموں کو چاہئے کہ مسلمانوں کی پسماندگی کا رونا دھونا چھوڑ کر دہلی سمیت پورے ہندوستان کی وقف املاک کے قدیم ریکارڈ کا مطالعہ کرکے وقف جائداد کی نشاندہی کریں اور دلائل وشواہد کے ساتھ حکومت ہند سے ان املاک کو واگزار کرانے کا مطالبہ کریں۔یہ کام قومی اور علاقائی سطح کے مسلم لیڈران بھی کرسکتے ہیں اور مسلمانوں کی ملک گیر جماعتیں بھی کرسکتی ہیں۔مسلم جماعتوں میں جمعیۃ علماء ہند، جماعت اسلامی ہند (جس کے پاس ہر شعبے سے وابستہ پڑھے لکھے لوگوں کی کثیر تعداد موجود ہے اور یہ کام وہ بہ آسانی کر بھی سکتی ہے) اور مرکزی جمعیت اہل حدیث ہیں جن کی شاخیں بلاک سطح سے لے کر صوبائی مرکزی سطح تک پھیلی ہوئی ہیں اور ہر جگہ ان جماعتوں کے دفاتر موجود ہیں۔افرادی قوت اور فنڈ کی بھی ان کے پاس کوئی کمی نہیں ہے۔ان جماعتوں پر ذمہ داری اس لئے بھی عائد ہوتی ہے کیوں کہ ان کا نصب العین بھی یہی ہے۔

وقف املاک کی تباہی کی ایک بڑی وجہ بااختیار چیرمین اور چیف ایگزیکیٹو افسر کا نہ ہونا بھی ہے۔وقف بورڈ کا جو بھی چیرمین ہوتا ہے وہ وقف املاک سے زیادہ اس پارٹی کا وفادار ہوتا ہے جس کی حکومت نے انہیں چیرمین بنایا ہے۔وقف املاک قبضہ پر کارروائی تو دور کی بات چیف ایگزیکیٹو افسر کے نوٹس کا جواب تک افسران دینا ضروری نہیں سمجھتے۔ابھی حالیہ دنوں میں ہی میں حضرت نظام الدین کے دہلی پبلک اسکول کے بغل میں قبرستان پر لوگوں نے قبضہ کرلیا ہے۔وہاں سے تھانہ بمشکل سو میٹر کی دوری پر ہے، وقف بورڈ کے ارکان کو بھی اس کے بارے میں معلوم ہے،لیکن ابھی تک کوئی کارروائی نہیں کی گئی ہے، جب کہ قبضہ ابھی بالکل نیا ہے۔پلاسٹک سے گھیر کر قبضہ کیا گیا ہے۔اسے پولیس کی مدد سے جلد خالی کرایا جاسکتا ہے، لیکن جب محافظ ہی لٹیرا بن جائے ،افسران توجہ نہ دے اور وقف بورڈ کے حکام کے پاس کوئی

خاص اختیار نہ ہو تو وقف املاک کو واگزار کرانے کے لئے آسمان سے فرشتے آنے سے رہے۔
مسلم رہنما کو ہی اس سلسلے میں بےلوث ہوکر آگے آنا ہوگا اور وقف بورڈ کو خودمختار بنانے کے لئے طویل جدوجہد کے لئے تیار رہنا ہوگا۔ یہ کوشش اس وقت تک جاری رکھنی ہوگی جب تک کہ مسلمانوں سے متعلق بورڈوں اور کمیشنوں کو آئینی درجہ حاصل نہ ہوجائے۔

بہار اور جھارکھنڈ میں وقف اراضی کی حالت:

مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے ریاست بہار بشمول جھارکھنڈ میں وقف کیے گئے اثاثے زبردست بدنظمی اور بدحالی کے شکار ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ وقف کی وسیع و عریض جائداد کا منظّم طریقے سے استعمال کیا جائے تو یہ اثاثے ریاست کے مسلمانوں کی پست حالی دور کرنے کا اہم ذریعہ بن سکتے ہیں۔

ریاستی وقف بورڈ میں گزشتہ پینتیس سالوں سے اکاؤنٹنٹ امتیاز حیدر کے مطابق بہار اور جھارکھنڈ میں سنی اور شیعہ وقف بورڈ سے منسلک تقریباً ستائس سو وقف اسٹیٹس ہیں جن کے اثاثوں کی قیمت قریب چھ سو کروڑ روپے ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ان میں سے نصف اثاثے غیرقانونی قبضے میں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حالیہ برسوں کی کوششوں سے اوقاف سے ہونے والی آمدنی میں اضافہ ہوا ہے، لیکن یہ آمدنی اب بھی کافی کم ہے۔ اوقاف کی زمین وسیع پیمانے پر غیرقانونی قبضے کا شکار ہے۔ اس وجہ سے اوقاف کے محکموں کو ضلعی عدالتوں میں تقریباً تین سو مقدمے لڑنا پڑ رہے ہیں۔ ہائی کورٹ میں بھی اکسٹھ مقدمے زیر سماعت ہیں۔ ان میں سے بعض مقدمے تو تیس سال پرانے ہیں۔

اوقاف کے لیے قائم مشترکہ پارلیمانی کمیٹی کے چیئرمین لال جان باشا کمیٹی کے دیگر ممبران کے ہمراہ اوقاف کی حالت کا جائزہ لینے کے لیے حال ہی میں ریاست کے تین روزہ دورے پر آئے تھے۔ مسٹر باشا کے مطابق اوقاف کی زمین اور عمارتوں پر کئی جگہ

حکومت بھی قابض ہے اور کئی جگہوں پر وقف کی زمین کے سلسلے میں حکومت کے ساتھ مقدمے چل رہے ہیں۔

حکومت بہار کی جانب سے مشترکہ پارلیمانی کمیٹی کو جو رپورٹ دی گئی ہے اس میں اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ وقف کی آدھی جائداد سے کوئی آمدنی نہیں ہوتی۔ جن اثاثوں سے آمدنی ہوتی ہے ان میں صرف تین فی صد ایسے ہیں جن کی سالانہ آمدنی ایک لاکھ سے زائد ہے۔

وقف کی آدھی جائداد سے تقریباً کوئی آمدنی نہیں ہوتی:

بہار سنی وقف بورڈ کے چیف ایگزیکیٹو آفیسر قمرالدین لاری کے مطابق وقف کی زمین پر دکانیں آمدنی کا بڑا ذریعہ بن سکتی ہیں لیکن کئی وجوہات کی بنا پر ان سے ملنے والے کرایے مضحکہ خیز حد تک کم ہیں۔

ان کے مطابق پندرہ بیس سالوں سے کرایوں میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ہے اور جن دکانوں سے ماہانہ تین ہزار روپئے کی آمدنی ہوسکتی ہے ان سے محض سو روپئے مل رہے ہیں۔

ریاست میں مسلمانوں کی بدحالی پر حکومت کے لیے رپورٹ تیار کرنے والے ادارے ایشین ڈیولپمنٹ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے اہلکار شیبال گپتا کہتے ہیں کہ وقف کی جتنی جائداد ہے اس کا اگر ایک اچھے کارپوریٹ ہاؤس کی طرح استعمال ہو تو مسلمانوں کی بدحالی مٹانے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔

وقف کی املاک کے لحاظ سے نالندہ ضلع کافی زرخیز تصور کیا جاتا ہے۔ اس ضلع کے ہیڈ کوارٹر بہار شریف میں واقع صغریٰ وقف اسٹیٹ کے جواں سال متولی عبدالحق کہتے ہیں کہ وقف کی جانب سے کئی فلاحی کام شروع کیے گئے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ وقف کی دکانوں اور زرعی زمین سے ہونے والی آمدنی مدرسے میں مقیم طلباء، ایک ہیلتھ سنٹر چلانے اور

مسجدوں کے خرچ کے لیے تقسیم کی جاتی ہے۔

اس وقف کی مدد سے چلنے والا مدرسہ عزیزیہ ایک زمانے میں پورے علاقے میں شہرت رکھتا تھا، لیکن چند برسوں سے یہ بدحالی کا شکار ہے۔ طلبہ کے رجسٹر پر نام تو سینکڑوں بچوں کے ہیں لیکن مطالعہ کے لیے غیر مقیم بچے کم ہی آتے ہیں۔

بہار اور جھارکھنڈ میں سنی اور شیعہ وقف بورڈ سے منسلک تقریباً ستائس سو وقف اسٹیٹس ہیں۔

عبدالحق کہتے ہیں کہ انہوں نے مدرسّوں سے اسکی بدحالی کا سبب جاننا چاہا تو انہوں نے اس کی ذمہ داری سابق متولی پر ڈال دی۔

خود بہار سنی وقف بورڈ عملے کی کمی کا شکار ہے۔ بورڈ کے سی ای او قمر الدین لاری کے مطابق پچاس کی جگہ صرف بیس اسٹاف ممبر ہیں۔

بقول مسٹر لاری ’اتنے کم اسٹاف میں سروے، بقایا جات کے لیے تقاضے کرنا اور مختلف وقف اسٹیٹس سے رابطہ رکھنے جیسے دیگر کام میں مشکلات پیدا ہوتی ہیں، لیکن فنڈ کی کمی سے نئے اسٹاف کی تقرری بھی ممکن نہیں ہے۔‘

بہار وقف بورڈ کے لیے ریاستی ریلیزیئس ٹرسٹ بورڈ کے چیئر مین کشور کنال کی کوششیں مثال بن سکتی ہیں۔ وہ مندروں اور مٹھوں کی زمین سے ہونے والی آمدنی کی بدولت مختلف مقامات پر ہسپتال چلا رہے ہیں۔ ان میں سے ایک مہاویر کینسر ہسپتال تو کافی مقبول ہے۔ مسٹر کنال کا کہنا ہے کہ وقف کی جائداد پر بہت زیادہ قبضہ ہوا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بورڈ کے لوگوں نے ان سے رابطہ کیا ہے اور انکا مشورہ یہ ہے کہ وقف کی جائداد سے وسیع پیمانے پر رفاہی کام کیا جاسکتا ہے۔ بہار کے اقلیتی بہبود کے محکمے کے سیکریٹری رشید احمد خان کہتے ہیں کہ وقف کے اثاثوں کی حفاظت اور ان سے مطلوبہ آمدنی حاصل کرنے کے لیے حکومت نے حال ہی میں بعض اقدام کیے ہیں۔

انہوں نے بتایا کہ یہ کوشش ہو رہی ہے کہ تمام اوقاف کا سروے کروا کر یہ ریکارڈ تیار کیا جائے کہ وقف کی کتنی جائداد کہاں اور کس حالت میں ہے۔ اسکے علاوہ مقدمات کو جلد از جلد نمٹانے کے لیے ٹرائیبونل میں انکی منتقلی کی کوشش بھی شروع کی گئی ہے۔

مہاراشٹرا میں اوقاف کی زمینوں پر ناجائز قبضہ!:

دہلی سے ممبئی آنے والی مشترکہ پارلیمانی کمیٹی کے سامنے مہاراشٹر وقف بورڈ کے ذریعے کئی اراضیوں کی مبینہ خرید وفروخت اور زمینوں پر ناجائز قبضہ کی شکایات پیش کی گئی ہیں۔

مہاراشٹر وقف بورڈ کی کارکردگی پر سوال اٹھاتے ہوئے ممبئی کے رہائشیوں نے کہا کہ آج تک لوگوں کو یہ پتہ نہیں ہے کہ وقف بورڈ کے پاس کتنی زمین ہے جبکہ کتنی ہی زمینوں پر قبضہ ہو چکا ہے اور تو اور زمینوں سے حاصل ہونے والی آمدنی کا حساب کتاب نہیں بتایا جاتا اور یہ بھی پتہ نہیں کہ کتنی زمینیں فروخت کر دی گئی ہیں۔

مرکزی حکومت کی ایماء پر تیلگو دیسم کے رکن پارلیمان لعل جان پاشا کی سربراہی میں ایک دس رکنی وفد مختلف ریاستوں میں وقف کی جائیداد اور بورڈ کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لیے ملک گیر دورے پر ہے۔ ممبئی میں دو روزہ دورے کے دوران لوگوں نے وفد سے بورڈ کی مبینہ بے ضابطگیوں کا ذکر کیا۔

تاہم اس اجلاس میں صرف الٹاماؤنٹ روڈ پر انڈیا کے امیر ترین تاجر مکیش امبانی کی زیر تعمیر عمارت اور مہاراشٹر میں سابق وزیر اعلیٰ ولاس راؤ دیشمکھ کے بھائی دلیپ دیشمکھ کو فروخت کی گئی زمین کا معاملہ حاوی رہا۔

لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ زمین وقف کی تھی اور اسے فروخت کیا جانا غیر قانونی تھا۔ لوگوں کا الزام تھا کہ یہ سب مبینہ بے ضابطگی بورڈ کے چیئر مین ایم اے عزیز کی نگرانی میں ہو رہی ہے۔ امبانی کو فروخت کی گئی زمین جس کا رقبہ 4,532 مربع فٹ ہے، وہاں پہلے کریم

بھائی خوجہ یتیم خانہ تھا لیکن سن دو ہزار میں وقف کی یہ زمین فروخت کردی گئی اور اب اس پر عالیشان عمارت تعمیر ہو رہی ہے۔مہاراشٹر میں 55 ہزار ایکڑ کے رقبے پر وقف کی زمینیں ہیں لیکن ان میں سے بیشتر فروخت کردی گئی ہیں۔اجلاس میں شرکت کرنے والے افراد نے صادق قادری کی رپورٹ کے نفاذ کا بھی مطالبہ کیا جس کو مہاراشٹر کے وزیر برائے اوقاف انیس احمد نے چھ ماہ قبل وقف بورڈ کی مبینہ بے ضابطگیوں کی تحقیقات کے لیے نامزد کیا تھا۔ یہ رپورٹ دیشمکھ کو اکتیس مارچ کو سونپ دی گئی ہے۔مہاراشٹر میں 55 ہزار ایکڑ کے رقبے پر وقف کی زمینیں ہیں لیکن ان میں سے بیشتر یا تو فروخت کردی گئیں یا پھر ان پر ناجائز قبضہ کرلیا گیا ہے۔ان میں چند تو ایسی ہیں جنھیں محض سو روپے ماہانہ پر لیز پر دیا گیا ہے۔

امبانی کو فروخت کی گئی زمین میں ہونے والی بے ضابطگی سے چیئرمین عزیز نے انکار کرتے ہوئے بی بی سی کو بتایا کہ وہ زمین کچھ برس قبل انٹیلیا کمرشل گروپ کو محض اکیس کروڑ روپے میں فروخت کی گئی تھی لیکن سن دو ہزار تین میں چارج سنبھالنے کے بعد انہوں نے زمین کی قیمت نکالی اور بعد میں سترہ کروڑ روپے اور وصول کیے گئے جو وقف کے خزانے میں آئے۔

مسٹر عزیز نے وزیر اعلیٰ دیشمکھ کے بھائی کو فروخت کی گئی زمین کے بارے میں بھی صفائی دیتے ہوئے کہا: ’اس زمین کے لیے برسوں تک قانون لڑائی لڑی گئی اور مراٹھواڑہ بورڈ اسے وقف کی زمین ثابت کرنے میں ناکام ہو گیا تھا‘۔انہوں نے کہا کہ تین ایکڑ زمین نرمان بھارتی کمپنی کو پہلے ہی فروخت کردی گئی تھی اسے بیچنے میں ان کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔

اجلاس میں موجود ایڈوکیٹ سعید اختر نے کمیٹی سے سوال کیا کہ آخر عوام کو وقف بورڈ کی زمینوں کا فائدہ کیوں نہیں پہنچتا۔انہوں نے وقف بورڈ کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے ممبئی کے اسماعیل یوسف کالج کی زمین پر ناجائز قبضہ ہٹا کر اسے کمیٹی کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا۔

مہاراشٹر میں وقف کی اتنی زمینیں ہیں کہ اگر کوئی ایمانداری کے ساتھ اس کی دیکھ بھال کرے تو اس سے ہونے والی آمدنی سے مہاراشٹر کے مسلمانوں کی تعلیمی اور اقتصادی

مدد کے لیے کسی اور کا سہارا نہیں لینا پڑے گا۔

ایڈوکیٹ سعید اختر کا کہنا تھا: ’مہاراشٹر میں وقف کی اتنی زمینیں ہیں کہ اگر کوئی ایمانداری کے ساتھ اس کی دیکھ بھال کرے تو اس سے ہونے والی آمدنی سے مہاراشٹر کے مسلمانوں کی تعلیمی اور اقتصادی مدد کے لیے کسی اور کا سہارا نہیں لینا پڑے گا‘۔ممبئی سے بھوپال کے لیے روانہ ہونے سے قبل لعل چاند پاشا نے اعتراف کیا کہ پورے ملک میں وقف بورڈ کی کارکردگی بہت ہی ناقص ہے۔زمینیں فروخت کی جا رہی ہیں اور اس کا کوئی فائدہ مسلمانوں کو نہیں پہنچ رہا ہے۔انہوں نے کرناٹک کی طرز پر مہاراشٹر میں بھی وقف بورڈ کو ریاستی حکومت کی طرف سے مالی امداد دینے پر زور دیا اور اسی لیے وزیر اعلیٰ نے پندرہ کروڑ روپے دینے کا وعدہ بھی کیا۔

مہاراشٹر کے شہر ممبئی، اورنگ آباد، جالنہ، مراٹھواڑہ میں وقف کی بے شمار زمینیں ہیں جنھیں وقت کے ساتھ ساتھ یا تو غیر قانونی طور پر فروخت کردیا گیا یا پھر اس پر ناجائز قبضہ کرلیا گیا۔

مرکزی وقف کونسل کے سابق ممبر حبیب فقیہہ کے مطابق وقف کا مطلب ہے کہ وہ زمین اللہ کے نام وقف کردی گئی ہے اس لیے اسے بغیر کسی صحیح وجہ کے فروخت نہیں کیا جا سکتا ہے۔اس کے باوجود بڑے پیمانے پر مہاراشٹر میں زمینیں فروخت کردی گئی ہیں کیونکہ پھر عدالت میں پیش کرنے کے لیے وقف کے پاس پرانے کاغذات بھی نہیں ملتے جس سے اس فروخت کو چیلنج کرنے والا اپنے دعوی کو صحیح ثابت کرے اور یہی دلیپ دیشمکھ کے کیس میں ہوا۔

☆☆

وقف کے قانون کا اثر دار ہونا ضروری!

● مولانا سید محمد ولی رحمانی

اوقاف کی جائدادوں کی شکل میں ملت اسلامیہ کا قیمتی اجتماعی سرمایہ پورے ملک میں پھیلا ہوا ہے، اگر ان جائدادوں سے بھرپور اور صحیح مصرف لیا جائے، تو نہ صرف مسلمانوں کی تعلیمی اور اقتصادی حالت بدل جائے گی، بلکہ پورے ملک کی تصویر پر اس کا گہرا اثر ہوگا، اس لیے مسلمانان ہند کے مذہبی اور سماجی نمائندوں نے ایسے نئے وقف ایکٹ کا برابر مطالبہ کیا ہے، جو مضبوط، اثر دار ہو، وقف کی جائداد سے غلط اور ناجائز قبضوں کو ہٹانے کی طاقت رکھنے والا ہو، اور وقف کی ترقی کا ذریعہ بن سکے، وقف کی جائدادوں سے ملت اسلامیہ کی صلاح وفلاح کا راستہ بن سکے، اور بہت سے رکے پڑے اجتماعی کام انجام دیئے جاسکیں۔

صورتحال یہ ہے کہ وقف کی جائدادوں پر ناجائز قبضے ہیں، ان جائدادوں کو وقف بورڈ نے بیچا جو غلط ہے یا طویل مدت کے لیے لیز پر لگادیا، جو قانون کے دائرہ سے باہر کی چیز ہے، یا کچھ مہینوں کے لیے ٹھہرنے اور کام کرنے کی اجازت دی گئی، اب لوگ ان پر برسوں سے قابض ہیں، انہیں خالی کرانے کی ساری ترکیبیں ناکامی تک پہنچتی ہیں، اور وہ ناجائز قبضہ والے وقف جائدادوں پر جمے بیٹھے ہیں، انہیں خالی کرانے کے لیے طویل قانونی جنگ کرنا پڑتی ہے، اور اکثر حالات میں نتیجہ ناکامی کی شکل میں ہاتھ آتا ہے، صورت حال عام طور پر یہ

ہے کہ جن جگہوں کا کرایہ کئی ہزار روپئے ہونا چاہئے، وہاں دس، بیس، سو پچاس کرایہ ہے، اور کرایہ داری کے جو قوانین ہیں ان کے پیش نظر قانوناً بھی کرایہ داروں کو ہٹانا بیحد مشکل ہے۔

صوبائی وقف بورڈوں کا نظم اتنا کمزور ہے، کہ وہاں عام طور پر اوقاف کی حفاظت اور ترقی کے لیے پروگرام بنانا تو دور کی بات ہے، دفتر کو کارگذار بنائے رکھنا، ریکارڈ کو محفوظ رکھنا، اسٹاف کو تنخواہ دینا بھی وقت پر نہیں ہوتا، ایسی حالت میں ''کوئی اقدام'' اور وقف بورڈ سے کسی بہتری کی توقع نہیں کی جاسکتی —— پھر وقف بورڈوں کی تشکیل کا قانون کچھ ایسا ہے، کہ وہ ارباب اقتدار اور حکمراں جماعت کا نمائندہ بورڈ کا ممبر اور چیرمین ہوجاتا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ وقف بورڈ صوبائی حکومت کے رحم وکرم پر رہتا ہے، اور حکومتیں بوقت ضرورت اور زائد از ضرورت اس کا استعمال کرتی ہیں، مثلاً چند برسوں قبل دہلی شہر میں دس ایکڑ زمین دہلی وقف بورڈ نے حکومت کے حوالہ کردیا اور اس پر ملینیم پارک بن گیا، اور عمارت بھی حکومت نے اس پر تعمیر کرادی، جو بودھ تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے۔

وقف ایکٹ کو اتنا مستحکم تو ہونا ہی چاہئے کہ وہ کم از کم خود اپنی حفاظت کرسکے، مگر جو ایکٹ ابھی ہے، اور جو آنیوالا ہے وہ کچھ ایسا ہے کہ وقف بورڈ متعلق صوبہ کے وزیر اعلی کے رحم وکرم پر تشکیل پاتا ہے، اور جب وزیر اعلیٰ صاحب تھوڑا سا بھی ناراض ہوتے ہیں، تو وقف بورڈ توڑ دیا جاتا ہے، (سپر سیڈ کرنے کے واقعات بہت عام ہیں) اور بورڈ کے سارے اختیارات کسی اسپیشل افسر کے حوالہ کردیئے جاتے ہیں، جو لخت جگر جانِ پدر قسم کے ہوتے ہیں، پھر وقف بورڈ اور وقف کی جائدادوں کے ساتھ وہ ہوتا ہے، جو کبھی نہیں ہونا چاہئے، صورتحال یہ ہے کہ بعض صوبوں میں وقف بورڈ کو برسوں برس تک ایک سال بھی چلنے نہیں دیا گیا، اور وقف بورڈ کی تشکیل ہوتی رہی اور اسے توڑنے اور سپر سیڈ کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔

حکومت نے وقف بورڈوں کے ذریعہ وقف کے انتظام اور اہتمام کو اپنے قابو میں کرلیا، اور پھر اوقاف سیاسی اداروں کی مرضی کی تکمیل کا ذریعہ بنتے رہے، ابھی تک اوقاف

کا سروے اکثر و بیشتر صوبہ میں نہیں ہوا ہے، نامکمل اندراج نے سنگین مسائل پیدا کیے ہیں —— موجودہ وقف ترمیمی بل جو راجیہ سبھا میں زیر غور ہے، میں اسی وقف اندراج کے لیے وقف رجسٹریشن کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اور قانون کے لفظوں کا رخ یہ ہے، جو وقف رجسٹرڈ (درج شدہ) نہیں ہوں گے، انہیں عدالت میں اپنے دفاع یا چارہ جوئی کا حق نہیں ہوگا، یعنی صرف وہی وقف عدالتوں کی نظروں میں وقف ہوں گے جو وقف بورڈ کے رجسٹر میں درج (رجسٹرڈ) ہوں، اگر کوئی سو دو سو سال پرانی مسجد ہے، وہ وقف بورڈ میں درج نہیں ہے، تو اس مسجد کی عدالت کی نظر میں کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے، اگر کسی نے اس کو توڑ ڈالا تو اس نے ایک سا موہک بھون (اجتماعی عمارت) کو توڑا ہے، اللہ کے گھر کو نہیں!

ہمارے صوبائی وقف بورڈ آزادی کی نصف صدی گذرنے کے بعد بھی اوقاف کو درج کرنے کا کام پورا نہ کر سکے، مرکزی حکومت کی حوصلہ افزائی اور مدد کے باوجود دفتر کو کمپیوٹرائزڈ نہیں کر سکے، ان سے یہ توقع کرنا کہ وہ رجسٹریشن کا کام دو تین سال میں کر لیں گے —— آرزو ہو سکتی ہے عملاً ایسا ہونیوالا نہیں ہے، اس لیے مسلم پرسنل لا بورڈ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ رجسٹریشن کا کام ہو اور جاری رہے، جب جس وقف کی خبر ملے تحقیق کے بعد اسے رجسٹرڈ کر لیا جائے، جو جائداد وقف ہوگئی، وہ بہر حال وقف ہے، وقف رہے گی، چاہے حکومت کے ریکارڈ میں اسے وقف بتایا گیا ہو یا نہیں —— نیا وقف ایکٹ (زیر غور) یہ بتاتا ہے کہ وقف بورڈ کے رجسٹریشن کے بعد بھی اگر حکومت کے ریکارڈ میں وہ جائداد وقف نہیں ہے، تو قانوناً ریونیو ریکارڈ کے مطابق فیصلہ ہوگا۔

اسی طرح جو وقف کی جائداد وقف بورڈ میں رجسٹرڈ نہیں ہے، وہ بھی وقف ہے، اور اس کا استعمال اس کے وقف ہونے کی تائید کرتا ہے، سپریم کورٹ نے اپنے فیصلہ میں استعمال کے ذریعہ وقف ہونے کو مانا ہے، جس کے لیے Waqf by use کا لفظ فیصلہ میں لکھا ہوا ہے، اسی طرح سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ بھی ہے کہ ایک بار جو چیز وقف ہوگئی وہ

ہمیشہ وقف ہی رہے گی —— ایسی حالت میں وقف کے ثبوت کے لیے رجسٹریشن کی شرط لگانا (جیسا کہ نئے زیر غور وقف ایکٹ کے مسودہ میں ہے) نہ شرعاً درست ہے، اور نہ سپریم کورٹ کے فیصلہ کے مطابق ہے، اس لیے یہ مسودہ قانون وقف کے معاملات کو الجھانے والا ہے، اس سے گتھیاں سلجھیں گی نہیں —— مسلم پرسنل لا بورڈ کی رائے ہے کہ ایکٹ پر غور کرتے وقت سپریم کورٹ کے فیصلہ کو بھی سامنے رکھنا چاہئے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کا یہ بھی ماننا ہے کہ اگر کوئی وقف رجسٹرڈ (اندراج) نہ ہو سکا، تو یہ وقف کرنیوالے یا اس کے منتظم اور وقف بورڈ کے افسروں اور اسٹاف کی غلطی ہو سکتی ہے، اس لیے انہیں سزا دینی چاہئے، وقف کی اصل حیثیت کو ختم یا کم کر کے اس سے فائدہ اٹھانیوالوں کو سزا دینا صحیح نہیں ہے! اور موجودہ زیر غور ایکٹ فائدہ اٹھانیوالوں کو سزا دینا چاہتا ہے، جبکہ قصور ان کا نہیں دوسروں کا ہے۔

زیر غور وقف ایکٹ میں اسی طرح کی کئی بنیادی خامیاں ہیں، جن میں تبدیلی ضروری ہے، اسی مقصد کے پیش نظر بورڈ نے کوشش کی اور یہ زیر غور قانون پارلیمنٹ کی سلیکٹ کمیٹی کے حوالہ کیا گیا جہاں وہ سولہ مہینوں سے زیر غور ہے —— موجودہ زیر غور قانون میں اور بورڈ کے نقطۂ نظر میں جو بنیادی فرق ہے، اس کی تفصیل یہ ہے:

زیر غور وقف بل ۲۰۱۰ء میں کیا گیا:

۱	وقف کی جائداد کے خالی کرانے کے لئے پبلک پریمیسیز ایکٹ نافذ کرنے پہ ایکٹ خاموش ہیں۔
۲	ناجائز قبضہ اور متولی کی تعریف ادھوری ہے۔
۳	وقف عدالتی چارہ جوئی سے محروم ہوں گے۔
۴	غیر رجسٹرڈ وقف کے لئے وقف کمشنر اور متولی قصوروار نہیں۔

۵	موقوفہ جائداد کا ہبہ یا فروختگی ناممکن۔
۶	مسجد، مقبرہ، امام باڑہ، درگاہ، قبرستان کا اکوزیشن ہوسکتا ہے۔
۷	وقف بورڈ سے مسلم تنظیموں کی نمائندگی ختم۔
۸	وقف بورڈ میں ٹاؤن پلانر، بزنس منیجر اور ماہر زراعت کا نمائندہ ہو۔
۹	وقف بورڈ کا ایک ممبر ڈپٹی سکریٹری رینک کا ہو۔
۱۰	غیر مسلم وقف نہیں کرسکتا۔
۱۱	وقف سروے کا کام ان اوقاف پر ہوگا، جو ایکٹ کے نفاذ کے وقت وقف کی شکل میں ہوں۔
۱۲	واقف اور وقف علی الاولاد کی تعریف غیر واضح۔
۱۳	اوقافی جائداد میں ریونیو ریکارڈ بنیادی ہوں گے۔

مسلم پرسنل لاء بورڈ کا موقف:

۱	موقوفہ جائداد کو خالی کرانے کیلئے پبلک پریمیسیز ایکٹ نافذ کیا جائے (تب ہی یہ ایکٹ مؤثر ہوگا)۔
۲	بورڈ نے ناجائز قبضہ اور متولی کی جامع تعریف کی ہے۔
۳	رجسٹریشن ہونا چاہئے مگر: (الف) غیر رجسٹرڈ وقف عدالتی چارہ جوئی سے محروم نہ ہوں۔ (ب) جو جائدادیں وقف ہیں، جو ماضی میں وقف رہی ہیں اور جو مستقبل میں ہوں گی، ہر ایک کا رجسٹریشن برابر جاری رہے۔
۴	متولی، وقف کمشنر اور سروے افسر کو قصوروار ٹھہرایا جائے۔
۵	ہبہ نہیں ہونا چاہئے، مگر بہت ہی خاص حالات میں وقف کو فروخت کرکے مقاصد وقف اور منافع وقف کی حفاظت کی جائے۔

۶	اکوزیشن سے مسجد، مقبرہ، امام باڑہ، درگاہ، قبرستان کو علیحدہ رکھا جائے۔
۷	دو مشہور تنظیموں کے عہدہ داروں کو رکن بنایا جائے۔
۸	غیر ضروری ہے۔
۹	غیر ضروری ہے۔
۱۰	غیر مسلم وقف کرسکتا ہے۔
۱۱	شرعی قانون اور سپریم کورٹ کا فیصلہ ہے کہ جو جائداد ایک بار وقف ہوگئی وہ ہمیشہ وقف رہے گی، اس لئے ماضی اور حال کے تمام اوقاف کا سروے ہو، اور یہ سلسلہ جاری رہے۔
۱۲	واضح تعریف ہونی چاہئے۔
۱۳	اوقافی جائداد میں وقف رجسٹرڈ کی حیثیت بنیادی ہوگی، ریونیو ریکارڈ اسی لحاظ سے درست کئے جائیں، اس لیے کہ وقف جائداد کو سروے ریکارڈ میں عام طور پر سرکاری کارندے سرکاری زمین یا اسی طرح کی کوئی چیز لکھ دیتے ہیں۔ جس طرح بعض صوبوں میں قبرستان کو کبیرا استھان لکھا گیا ہے۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے سلیکٹ کمیٹی کے سامنے تین بار اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے اور اب کمیٹی کی رپورٹ آخری شکل لینے والی ہے، پھر اسے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں سے منظور ہونا ہے، مسلم پرسنل لا بورڈ چاہتا ہے کہ قانون ساز اداروں اور حکومت پر اپنا موقف مستحکم رہے، اور رائے عامہ بیدار رہے۔ اسی جذبہ اور ارادہ کے تحت آئینی حقوق بچاؤ تحریک مسلم پرسنل لا بورڈ منظم کررہا ہے۔

(مضمون نگار مسلم پرسنل لا بورڈ کے سکریٹری اور خانقاہ رحمانی مونگیر کے سجادہ نشیں ہیں)

☆☆

وقف بورڈ اور حکومت کا نظریہ

● ادارہ

ہندوستان میں اوقاف کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے، جتنی خود مسلمانوں کی تاریخ۔ ابتداء سے ہی عام مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور شعائر اسلامی کی ترویج و اشاعت کے لئے ملت کے اہل خیر حضرات، امراء، نوابین اور سلاطین، بلکہ عام مسلمانوں تک نے اپنی جائیدادیں وقف کیں اور اس عمل کو جاری وساری رکھنے کے لئے ترغیبات دیں۔ وقف شدہ املاک پر مسجد ومدرسے، یتیم خانے، شفاء خانے اور عام مسلمانوں کی فلاح وتعلیمی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے مختلف ادارے قائم کئے گئے اور ان املاک سے حاصل ہونے والی آمدنی کو مستحق غرباء ومساکین کی امداد کے لئے استعمال کیا گیا۔ یہ حقیقت ہمیشہ تسلیم شدہ رہی ہے کہ وقف کی املاک یا اس سے حاصل ہونے والی آمدنی کا استعمال واقف کی منشاء کے مطابق کیا جائے گا اور اگر واقف نے کوئی مخصوص شرط نہیں رکھی، تو اس کا عمومی استعمال مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے کیا جائے گا۔ اسلامی شرعی قانون میں اس سلسلے میں بالکل صاف صاف وضاحت کردی گئی ہے کہ وقف کرنے والا ثواب کی نیت سے وقف خاص یا وقف عام کرسکتا ہے اور وقف خاص میں وقف کی آمدنی کا ایک حصہ ہی امور خیر کے لئے وقف ہوتا ہے، جبکہ وقف عام میں جملہ آمدنی خیر میں صرف کی جاتی ہے۔

سلمان خورشید کی نئی تشریح

ابتداء سے لے کر اب تک وقف کی املاک اور اس سے ہونے والی آمدنی کے متعلق

یہی شرعی طریقہ کار رائج رہا ہے۔ پورے ملک میں اربوں کی وقف املاک ہیں اور خاص طور پر آزادی کے بعد وقف کی املاک پر ہونے والے چوطرفہ حملوں، غاصبانہ کارروائیوں اور غیر مسلموں کی جانب سے ان کو اپنی تحویل میں لینے کے بے شمار افسوس ناک واقعات کے باوجود نہ تو اوقاف کی املاک کی پوزیشن میں کوئی تبدیلی آئی اور نہ ہی اس کی ملکیت اور اس کے استعمال کے سلسلے میں کبھی کوئی نیا شوشہ چھوڑا گیا۔ خود مسلمانوں کے ہاتھوں وقف کی املاک کا غلط استعمال ہوا۔ حکومت اور بعض غیر مسلموں کی جانب سے اس پر غاصبانہ قبضے کی کوششیں ہوتی رہیں، پھر بھی وقف املاک کی نوعیت اور اس کے استعمال کے دائرہ کار کے سلسلے میں کبھی کوئی تنازعہ کھڑا نہیں ہوا اور یہ املاک مسلمانوں کی اور مسلمانوں کے لئے ہی رہیں اور حکومت کے ذریعہ قائم وقف بورڈ کی نگرانی میں واقف کی منشاء کے مطابق استعمال میں لائی جاتی رہی ہیں۔ اب اقلیتی امور کے سابق مرکزی وزیر سلمان خورشید نے ایک بالکل ہی نیا اور غیر شرعی شوشہ چھوڑا کہ وقف کی املاک یا اس سے ہونے والی آمدنی کو غیر مسلموں کی فلاح و بہبود کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے اور اس کے لئے ایک منصوبہ ترتیب دیا۔ انہوں نے اس منصوبہ کے مطابق پورے ملک میں پھیلی ہوئی اربوں وکھربوں کی وقف جائیدادوں کو قومی اقلیتی مالیاتی ترقیاتی کارپوریشن کے تحت ڈیولپ کرکے اس کو ایک کمپنی کے طور پر چلایا جائے گا، جس کے فوائد میں مسلمانوں کے علاوہ دیگر اقلیتوں کو بھی شامل کیا جائے گا۔ سلمان خورشید کی شریعت کی نئی توضیح کے مطابق اوقاف کی املاک یا اس سے ہونے والی آمدنی کو غیر مسلموں پر استعمال کرنے میں شریعت کی جانب سے کوئی رکاوٹ نہیں ہے، یعنی واقف کی چاہے جو بھی منشاء رہی ہو، یا اوقاف کے استعمال کے سلسلے میں اب تک اسلامی قانون اور فقہ کا چاہے جو بھی فیصلہ رہا ہو، سلمان خورشید کے مطابق اب اس میں تبدیلی لائی جاسکتی ہے اور مسلمانوں کے ذریعہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے مقصد سے وقف کی گئی املاک کے استعمال اور اس سے ہونے والی آمدنی میں غیر مسلموں کو بھی حصہ دار

بنایا جاسکتا ہے اور وہ اس سلسلے میں سرکاری سطح کی منصوبہ بندی کررہے ہیں۔ یہ اب تک صاف نہیں ہوسکا ہے کہ وقف کی املاک اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی کے سلسلہ میں یہ نیا غیر شرعی اور اسلامی قانون مخالف فیصلہ وزیر اقلیتی امور سلمان خورشید کا اپنا ہے یا پھر حکمراں جماعت کانگریس نے اس قسم کا فیصلہ کیا ہے اور وہ وقف کے سلسلے میں ایک نیا قانون لانے کا منصوبہ بنا رہی ہے، تاکہ حسب روایت مسلمانوں کو ایک بار پھر مشتعل کرکے ان کو سڑکوں پر لایا جاسکے۔ چونکہ خود حکمراں جماعت کے بعض دیگر مسلم اراکین، سلمان خورشید کے اس منصوبے کی مخالفت کررہے ہیں، اس لئے اب تک تو یہی سمجھا جاسکتا ہے کہ یہ انتہائی افسوسناک اور مسلمانوں کو ورغلانے والا فیصلہ حکومت نے نہیں، بلکہ ان کے نہایت وفاشعار اور اپنی سیکولر امیج کا ہمیشہ مظاہرہ کرکے سیاسی دنیا میں اعتبار حاصل کرنے کی کوشش کرنے والے ایک وزیر کا ہے۔ کانگریس کے ایک ترجمان رکن پارلیمان راشد علوی کہتے ہیں کہ بنیادی طور پر وقف جائیدادوں کے فوائد میں شمولیت کے لئے وقف کرنے والے کی منشاء حتمی فیصلہ رکھتی ہے۔ وقف مسلمانوں کے لئے ہے اور اس کا استعمال انہیں پر ہوگا۔

آخر اس بیان کی وجہ کیا ہے؟

اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ کانگریس نے وقف املاک کی نگرانی کرنے والے ادارے وقف بورڈ کو ہمیشہ ایک سیاسی یتیم خانے کے طور پر دیکھا، بلکہ اس کو ایک سیاسی یتیم خانہ بنائے رکھنے کی ہمیشہ کوشش کی۔ پورے ملک میں کروڑوں کی وقف جائیدادیں تباہ ہوگئیں یا انہیں غیر قانونی طریقے سے غلط استعمال کے لئے دے دیا گیا۔ آج بھی کہنے کو وقف بورڈ اور وقف کونسل جیسے سرکاری ادارے قائم ہیں، لیکن وہ کتنے مؤثر اور متحرک ہیں، اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ خود ملک کی راجدھانی دہلی تک میں برسوں تک وقف بورڈ کا کوئی چیئرمین بحال نہیں کیا جاتا ہے اور وقف کی املاک کی ملکیت کے مقدموں

تک کی پیروی کے سارے معاملات اس لئے التوا میں پڑے رہتے ہیں کہ کوئی اسے سنجیدگی سے لینے کے لئے تیار نہیں ہے۔ یہی نتیجہ ہے کہ اس بے عملی اور نااہلی کی وجہ سے مقدمات وقف بورڈ کے خلاف فیصل ہورہے ہیں، اس لئے ضرورت تو یہ تھی کہ وقف کی املاک کے تحفظ اور اس کے استعمال کے لئے صحیح منصوبہ بندی کی جائے اور کم از کم مسلمان ہونے کے ناطے سلمان خورشید اتنا تو کام ملی جذبے کے تحت سنجیدگی اور ایمانداری سے کردیتے، لیکن اگر اپنے امتحان کی کاپی میں نمبر بڑھوانا ہی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہو تو پھر فرائض منصبی اور ملی جذبے جیسی ساری باتیں بے معنی ہوجاتی ہیں۔ حالانکہ سلمان خورشید کے سیکولر ہونے کا اب پارٹی میں سب کو یقین ہوچکا ہے اور انہوں نے اس سلسلے میں اب تک جو اپنے کارنامے پیش کئے ہیں، اس سے ان کے سیکولر امیج کی پختگی مزید مستحکم ہوگئی ہے، پھر آخر بار بار ملت کو زدوکوب کرنے کی یہ کوششیں کیوں جارہی ہیں۔ وزارت اقلیتی امور ان کو ایک مسلمان ہونے کے ناطے سونپا گیا، لیکن مسلم اقلیت کے لئے شاید ہی کوئی ایک کاغذ کا ٹکڑا بھی مہیا کرایا ہو۔ یتیم خانے، تعلیمی ادارے، لائبریری یا کسی قسم کی کوئی بھی تعلیمی فلاحی ایسی اسکیم شروع کی ہو، جس سے کسی ایک کا بھی فائدہ ہوا ہو، لیکن ان باتوں کا اگر شکوہ نہ بھی کیا جائے، تو کم از کم ان سے اتنی تو امید کی ہی جاسکتی ہے کہ وہ نئے زخم لگانے کی کارروائی اپنے ہاتھ سے نہ کریں۔ کیا وقف املاک سے ہونے والی آمدنی اتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ مسلمانوں کے مسائل پر خرچ کرنے کے بعد بھی وہ اتنی باقی بچی رہ جاتی ہے کہ اس کے غیر مسلموں پر استعمال کرنے کا منصوبہ بنایا جارہا ہے۔ صرف دہلی میں ہی ہزاروں ایسے مسلم بچے ہیں، جو چھوٹے چھوٹے کارخانوں میں کام کررہے ہیں اور فٹ پاتھ جھگیوں میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اگر ان کے لئے کسی بسیرے کا ہی انتظام کردیا جاتا تو سلمان خورشید کی نیک نیتی کا اظہار ہوتا۔ کچھ تو کرکے دکھایئے، پھر زخم پر نمک چھڑکنے کا حق حاصل کیجئے۔

(بشکریہ نئی دنیا)

بینک میں مسلمانوں کی مشکلات

ہندوستان میں اب تک ایسی کئی رپورٹیں آچکی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ روزگار اور تعلیمی سہولتوں کے لحاظ سے مسلمان پیچھے ہیں۔ مائنارٹی کمیشن کے مطابق بہت سے مسلمانوں کو مبینہ طور پر یا تو بینک اکاؤنٹ کھولنے نہیں دیا گیا یا پھر انہیں قرض دینے سے انکار کیا گیا ہے۔ یہ اعداد وشمار پچھلے سال کے مقابلے میں دوگنا ہوگئے ہیں۔کمیشن کا کہنا ہے کہ یہ مبینہ امتیازی سلوک آندھرا پردیش میں سب سے زیادہ دیکھا گیا جہاں ۹۰/ ہزار مسلمان حکومت کی طرف سے ملنے والی وظیفے کی رقم بینک میں جمع نہیں کرا پائے۔کمیشن کا کہنا ہے کہ کیرلا اور آسام میں مسلمان کھاتے داروں کی تعداد آدھی ہوگئی ہے۔

بی بی سی کے نامہ نگار سنجے مجومدر کا کہنا ہے کہ یہ رپورٹ کافی تشویشناک ہے کیونکہ بھارت میں مسلمان ملک میں سب سے غریب ہیں اور اس لیے نجی بینکوں میں مسلمان صارفین کم ہوتے ہیں اور بینک امیر لوگوں کے ساتھ لین دین کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔

بھارتی بینک ایسوسی ایشن کا کہنا ہے کہ وہ نئے احکامات جاری کرے گی تاکہ اقلیتوں کو بہتر طریقے سے بینک کی سہولیتوں کا فائدہ مل سکے۔ بھارتی پلاننگ کمیشن کی ایک رکن حمیدہ سعید نے صورتِ حال پر اپنے ردِعمل میں کہا 'یہ واقعی بڑا مسئلہ ہے۔ وزراتِ خزانہ نے سب بینکوں کو ہدایت کی ہے کہ مسلمانوں کا خیال رکھیں اور انہیں قرض کی سہولیت دیں'۔

انہوں نے کہا کہ لوگوں کی شکایات ثبوت ہیں کہ بینکوں نے ان احکامات کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ بینک سرکار کے ماتحت کام کرتے ہیں اور بینک حکام کو اس مسئلے پر توجہ دینی

چاہیے۔وزیراعظم نے اس پر اپنی تشویش ظاہر کی ہے اور وزارتِ خزانہ سے کہا ہے کہ وہ اس مسئلے کو ختم کرے۔

حمیدہ سعید نے کہا کہ اگر کوئی قصوروار ہے تو وہ بینکنگ کے شعبے میں کام کرنے والے مڈل کلاس کے ملازم ہیں اور ان لوگوں کی نفسیات کو بدلنے کی ضروت ہے۔

کچھ بینک حکام نے بی بی سی کو بتایا کہ ایسا مذہب کی وجہ سے نہیں ہو رہا ہے بلکہ کمزور معاشی حالت کی وجہ سے مسلمان بینکوں کی سہولت نہیں حاصل کر سکتے۔ ایسی کئی رپورٹ آچکی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ روزگار اور تعلیمی سہولتوں کے لحاظ سے مسلمان پیچھے ہیں۔ پچھلے سال کے حکومتی اعداد وشمار کے مطابق سال دو ہزار چھ اور سات کے مقابلے میں سال دو ہزار سات اور آٹھ میں بھارت میں اقلیتوں کے حقوق کی خلاف ورزی کے واقعات بڑھے ہیں۔اقلیتوں کی حالتوں پر سچر کمیٹی کی رپورٹ آنے کے بعد مرکزی حکومت نے اقلیتوں کی حالت سدھارنے کے لیے چند سال پہلے پندرہ نکاتی پروگرام کا اعلان بھی کیا تھا۔اس پروگرام کے تحت مختلف سرکاری منصوبوں میں سے پندرہ فیصد رقم اقلیتوں کے لیے خرچ کرنے کا پروگرام تھا۔

انہوں نے کہا کہ لوگوں کی شکایات ثبوت ہیں کہ بینکوں نے ان احکامات کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ بینک سرکار کے ماتحت کام کرتے ہیں اور بینک حکام کو اس مسئلے پر توجہ دینی چاہیے۔وزیراعظم نے اس پر اپنی تشویش ظاہر کی ہے اور وزارتِ خزانہ سے کہا ہے کہ وہ اس مسئلے کو ختم کرے۔حمیدہ سعید نے کہا کہ اگر کوئی قصوروار ہے تو وہ بینکنگ کے شعبے میں کام کرنے والے مڈل کلاس کے ملازم ہیں اور ان لوگوں کی نفسیات کو بدلنے کی ضروت ہے۔

کچھ بینک حکام نے بی بی سی کو بتایا کہ ایسا مذہب کی وجہ سے نہیں ہو رہا ہے بلکہ کمزور معاشی حالت کی وجہ سے مسلمان بینکوں کی سہولت نہیں حاصل کر سکتے۔ایسی کئی رپورٹ آچکی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ روزگار اور تعلیمی سہولتوں کے لحاظ سے مسلمان پیچھے ہیں۔

پچھلے سال کے حکومتی اعداد و شمار کے مطابق سال دو ہزار چھ اور سات کے مقابلے میں سال دو ہزار سات اور آٹھ میں بھارت میں اقلیتوں کے حقوق کی خلاف ورزی کے واقعات بڑھے ہیں۔ اقلیتوں کی حالتوں پر سچر کمیٹی کی رپورٹ آنے کے بعد مرکزی حکومت نے اقلیتوں کی حالت سدھارنے کے لیے چند سال پہلے پندرہ نکاتی پروگرام کا اعلان بھی کیا تھا۔ اس پروگرام کے تحت مختلف سرکاری منصوبوں میں سے پندرہ فیصد رقم اقلیتوں کے لیے خرچ کرنے کا پروگرام تھا۔ گاؤں دیہات کے مسلم باشندوں کو بھی مختلف مشکلات سے بینکوں میں دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس قسم کی شکایتیں بھی مسلسل موصول ہوتی رہتی ہیں۔

☆☆

وقف املاک پر قبضہ میں

پنجاب پہلے تو دہلی دوسرے نمبر پر

● ادارہ

پورے ملک میں وقف جائیدادوں کے تعلق سے ریاستی حکومت کا رویہ ہمیشہ افسوس ناک رہا ہے۔ وقف املاک کو تحفظ دینے کے بجائے حکومتیں خود ان پر قابض ہیں۔ سینٹرل وقف کونسل سے حاصل شدہ لسٹ کے مطابق اب تک پنجاب ایک ایسی ریاست ہے جہاں وقف کی سب سے زیادہ ۳۸۵ جائیدادوں پر ریاستی حکومت اور اس کی ایجنسیوں کا قبضہ ہے۔ پرائیوٹ لوگوں کے قبضہ میں یہاں کل ۴۱۵۱ جائیدادیں ہیں۔ اس کے بعد دوسرا نمبر دہلی وقف بورڈ کا ہے، کل ۳۱۲ جائیدادوں پر حکومت اور اس کے محکمہ قابض ہیں، ان میں سے ۱۱۴ جائیدادوں پر ڈی ڈی اے، ۲۶ پر حکومت کی ایجنسیاں اور ۱۷۲ پر آثار قدیمہ کا ناجائز قبضہ ہے۔ پرائیویٹ لوگوں کی بات کریں تو ۱۱۰۰ جائیدادیں ان لوگوں کے ناجائز قبضہ میں ہیں اور اطلاع کے مطابق ان لوگوں میں مسلمان بھی اچھی خاصی تعداد میں شامل ہیں۔ بورڈ کل ۹۹۰ جائیدادوں کے سلسلہ میں عدالت میں مقدمات میں مصروف بھی ہے۔

قابل ذکر ہے کہ سینٹرل وقف کونسل نے جو لسٹ مہیا کرائی ہے اس میں کچھ فرق ہونے کا پورا امکان ہے، کیونکہ بیشتر ریاستوں نے کونسل کے ساتھ مکمل تعاون نہیں کیا ہے اور کئی جگہ سروے ہونا باقی بھی ہے۔

پورے ملک میں ۲۲ ریاستوں میں بورڈ قائم کئے جاچکے ہیں جبکہ چھ ریاستوں

اروناچل پردیش، گوا، میزورم، سکم، ناگالینڈ اور ڈامن ڈیو میں بورڈ کا قیام اب تک نہیں ہوسکا ہے۔ سینٹرل وقف کونسل کے سکریٹری علی احمد خاں نے بتایا کہ ہم نے تمام ریاستوں کو مکمل فہرست تیار کر کے دینے کو کہا تھا تاکہ فہرست کو نیٹ پر ڈاؤن لوڈ کیا جاسکے جس سے کوئی بھی شخص کسی بھی جائیداد کے بارے میں آسانی سے جان سکے مگر زیادہ تر ریاستوں نے ابھی تک مکمل فہرست نہیں دی ہے۔

دہلی وقف بورڈ کے چیئرمین چودھری متین احمد کو جب وقف املاک کے قبضہ کی بات بتائی گئی تو انھوں نے کہا کہ بورڈ ان جائیدادوں کو آزاد کرانے کی پوری کوشش کررہا ہے۔ دیکھا جائے تو یوپی سنی سینٹرل بورڈ آف وقفس کے پاس سب سے زیادہ کل ۱۳۵۰۰۰ جائیدادیں ہیں جبکہ سب سے کم دادرحویلی بورڈ کے پاس ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ وقف املاک رجسٹرڈ ہونے کے باوجود ریاستیں اور پرائیوٹ لوگ ان پر قبضہ جمائے بیٹھے ہیں۔ قابل ذکر ہے کہ آنجہانی وزیراعظم اندرا گاندھی نے تمام ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ کو مکتوب لکھ کر کہا تھا کہ وہ حکومت کے ماتحت وقف املاک کو وقف بورڈ کے حوالہ کریں مگر دوسری پارٹیوں تو کیا خود کانگریس کے وزرائے اعلیٰ نے وزیراعظم کی ہدایت پر عمل نہیں کیا تھا۔ دراصل وقف بورڈوں کے پاس ڈی ڈی اے کی طرح اپنی جائیدادیں خالی کرانے کا اختیار نہیں ہے۔ بورڈ بھلے ہی ریاستوں کے ماتحت چل رہے ہوں مگر ریاستیں اکثر اپنے مفاد میں بورڈوں کا استعمال کرتی آئی ہیں۔

☆☆

ملک بھر میں تقریباً 10 ہزار وقف جائیدادوں پر

ریاستی حکومتوں اور عام لوگوں کا قبضہ

ریاستی وقف کے نام	کل جائدادیں سروے سے قبل	کل جائدادیں وقف ایکٹ 1995ء کے دوران	جائدادیں جن پر ریاستی حکومت یا ایجنسیاں قابض ہیں	جائدادیں جن پر پرائیویٹ لوگ قابض ہیں	کل مقدمات
آندھراپردیش اسٹیٹ وقف بورڈ	35703	سروے کی رپورٹ نہیں آئی	3	4	5
آسام بورڈ آف وقفس	167	178	کوئی نہیں	کوئی نہیں	کوئی نہیں
بہاراسٹیٹ سنی وقف بورڈ	2450	2459 رجسٹرڈ اور 1000 غیر رجسٹرڈ	5	19	ریکارڈ مہیا نہیں کرایا
بہاراسٹیٹ شیعہ وقف بورڈ	222	225 (24 وقف علی الاولاد اور 181 وقف عنداللہ)	ریکارڈ مہیا نہیں کرایا	16	ریکارڈ مہیا نہیں کرایا
چھتیس گڑھ اسٹیٹ	کوئی نہیں	1811	ریکارڈ مہیا نہیں کرایا	114	ریکارڈ مہیا نہیں کرایا
گجرات وقف بورڈ	13521	12000	ریکارڈ نہیں دیا	ریکارڈ نہیں	ریکارڈ نہیں دیا

ہریانہ وقف بورڈ	11929	11929	195	715	ریکارڈ نہیں دیا
ہماچل پردیش وقف بورڈ	622	کوئی نہیں	ریکارڈ نہیں دیا	ریکارڈ نہیں	ریکارڈ نہیں دیا
جھارکھنڈ اسٹیٹ بورڈ آف وقفس	کوئی نہیں	167	کوئی نہیں	2	2
کرناٹک اسٹیٹ بورڈ آف وقفس	22192	31530	ریکارڈ نہیں دیا	188	183
کیرالہ وقف بورڈ	7277	7284 رجسٹرڈ، 15000 غیر رجسٹرڈ	2	162	162
مدھیہ پردیش وقف بورڈ	13375	14777	52	1026	1026
مہاراشٹر اسٹیٹ بورڈ آف وقفس	15374	23566 رجسٹرڈ انسٹی ٹیوشن	ریکارڈ نہیں دیا	ریکارڈ نہیں	ریکارڈ نہیں دیا
وقف بورڈ منی پور	231	632	کوئی نہیں	کوئی نہیں	کوئی نہیں
میگھالیہ بورڈ آف وقفس	30	کوئی نہیں	کوئی نہیں	2	2
اوڈیشہ بورڈ آف وقفس	3500	3729	16	18	18
پنجاب وقف بورڈ	23000	24335	385	4151	ریکارڈ نہیں دیا
راجستھان بورڈ آف مسلم وقفس	18810	19000	63	185	3341
تمل ناڈو وقف بورڈ	6150	6150	ریکارڈ نہیں دیا	886	48

تری پورہ بورڈ آف وقفس	603	695	کوئی نہیں	10	6
اتراکھنڈ وقف بورڈ	2500	کوئی نہیں	ریکارڈ نہیں دیا	ریکارڈ نہیں دیا	ریکارڈ نہیں دیا
یوپی سنی سینٹرل بورڈ آف وقفس	135000	122839	ریکارڈ نہیں دیا	ریکارڈ نہیں دیا	ریکارڈ نہیں دیا
یوپی شیعہ سینٹرل بورڈ آف وقفس	8000	کوئی نہیں	ریکارڈ نہیں دیا	ریکارڈ نہیں دیا	ریکارڈ نہیں دیا
بورڈ آف وقفس مغربی بنگال	8044	6150	ریکارڈ نہیں دیا	ریکارڈ نہیں دیا	ریکارڈ نہیں دیا
انڈمان اینڈ نکوبار آئس لینڈ	59	کوئی نہیں	کوئی نہیں	1	1
چنڈی گڑھ وقف بورڈ	کوئی نہیں	32	6	3	1
دہلی وقف بورڈ	1977	1934	147	1100	990
دادرا اینڈ نگر حویلی وقف بورڈ	10	15	کوئی نہیں	کوئی نہیں	کوئی نہیں
لکشدیپ اسٹیٹ وقف بورڈ	311	310	کوئی نہیں	کوئی نہیں	کوئی نہیں
پانڈیچری اسٹیٹ وقف بورڈ	571	607	کوئی نہیں	84	3

☆☆

نئے نئے 'وقف' قائم کئے جاسکتے ہیں، اگر...

● مولانا سید محمد ولی رحمانی

اوقاف کی جائداد ملک میں بڑے پیمانے پر موجود ہے، اگر صحیح طور پر وقف کی زمینوں کا سروے کیا جائے تو ریلوے اور آرمی کی زمینوں کے بعد کل ہند سطح پر سب سے زیادہ زمین اوقاف کی قرار پائے گی ــــ جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں، وہاں مسجد اور قبرستان موجود ہیں، اور ہر مسلم آبادی کے ساتھ یہ دو وقف ضرور ہیں۔ اسی طرح ہر قابل ذکر بڑی آبادی میں کنواں، تالاب، سبیل، مکتب، مدرسہ، یتیم خانہ، مسافر خانہ، امام باڑہ، عاشور خانہ، خانقاہ اور مختلف قسم کے دینی، رفاہی اور اجتماعی کاموں کے لئے ماضی میں اہل خیر نے چھوٹی بڑی بہت سی زمین، مکانات وقف کئے، جن سے لوگوں کو فائدہ پہونچتا رہا اور صدیوں تک یہ اوقاف عام لوگوں کی ضرورتوں (خصوصاً پینے اور استعمال کے پانی، مسافروں کے آرام کیلئے جگہیں، شفا خانے) اور خاص طور پر مسلمانوں کی مذہبی، تعلیمی، سماجی اور رفاہی ضرورتوں کو پورا کرتے رہے ہیں۔

وقف جائدادوں کی یہ کثرت دینی جذبہ اور اجتماعی رفاہی کاموں سے دلچسپی کی وجہ سے ہوئی، لوگ یہ یقین رکھتے رہے کہ وقف کی ہوئی جائداد سے دینی وابستگی ہوگی، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہوتی ہے۔ ساتھ ہی دینی جذبہ کی وجہ سے کوئی اسپر نہ غلط قبضہ کرے گا، اور نہ اس کا غلط استعمال ہوگا، اور یہ اجتماعی جائداد رہتی دنیا تک باقی رہے گی، فائدہ پہنچاتی رہے گی اور وقف کرنے والے کو ثواب ملتا رہے گا، یہی وجہ ہے کہ صدیوں میں عوامی جائداد

(وقف) کا اتنا بڑا غیر سرکاری ذخیرہ جمع ہو گیا جس کا ابھی تک پورا حساب نہیں لگایا جاسکا، نہ اس کی سروے رپورٹ تیار ہوسکی۔ انگریزوں کے عہد سے پہلے، حکومتوں نے اس جائداد کا غلط فائدہ کبھی نہیں اٹھایا، نہ اسپر کسی کی غاصبانہ نظر پڑی، اور نہ ملک کے باشندوں (ہندو اور مسلمان) نے اس سے کوئی ذاتی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، بلکہ مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں اور سکھوں نے بھی جائدادیں وقف کیں، مسجدیں بھی بنائیں اور دوسرے رفاہی کاموں میں جائداد وقف کر کے حصہ لیا۔

اوقاف کے سلسلہ میں بڑے پیمانہ پر سب سے پہلے برطانوی حکومت نے گڑبڑ کی، صرف دہلی میں ہی نہیں، کئی بڑے شہروں میں وقف کی زمینوں، مکانات، یہاں تک کہ مسجدوں کو شہید کر کے، اس کا دوسرا مصرف لیا گیا، دہلی میں سپریم کورٹ کی عمارت، پارلیمنٹ ہاؤس اور راشٹر پتی بھون کی عمارتیں بڑی حد تک وقف کی زمین پر ہیں۔ یوپی اے کے مرکزی دفتر کے کیمپس میں موجود کم از کم پانچ سو سال پرانی چھوٹی سی ویران مسجد خود بتاتی ہے کہ اس پورے خطہ میں مسجدیں شہید کی گئیں، جس علاقہ میں کام کرنیوالے مستری اور مزدور مسلمان رہے ہوں گے وہاں کی مسجدیں بچ گئیں۔ ابھی بھی اپولو ہاسپٹل سے جسولا کی طرف جایئے تو مختلف ملٹی نیشنل کمپنیوں کے دفاتر سے ذرا پہلے سڑک کے کنارہ مختصر سے سبزہ زار کے بیچ کھڑا بہت پرانے طرز کا مینار مسجد کی گواہی دے رہا ہے۔ اور ابھی چند دنوں پہلے نیتاجی سبھاش پارک (سابق ایڈورڈ پارک) کے سبزہ کے نیچے مسجد کی صفیں اور دیوار کے آثار نکلے ہیں، اسپر تو معاملہ چل ہی رہا ہے!

صرف دہلی میں اگریمنٹ کی ۱۱۳ مسجدیں بتاتی ہیں کہ برطانوی سامراج نے مسجدوں کو منہدم کرنے کی کیسی قانونی سازش کی تھی ــــ اور دہلی ہی نہیں، ملک کے مختلف شہروں میں برطانوی سامراج نے بڑا خراب معاملہ کیا، مثلاً کلکتہ کا راج بھون وقف کی زمین پر انگریزوں نے بنوایا، اور آج بھی حکومت بنگال صوبائی وقف بورڈ کو راج بھون کی زمین کا

کرایہ سالانہ ساڑھے پانچ ہزار روپے ادا کرتی ہے، فٹبال کی مشق کیلئے موہن بگان اور دوسری بڑی بڑی ٹیموں کو سیکڑوں ایکڑ وقف کی زمین بہت معمولی کرایہ پر دی گئی، اور آج بھی کھیل کے یہ ادارے چند ٹکوں کی کرایہ داری پر جمے بیٹھے ہیں۔ کرایہ دار کو پوری سہولت مل رہی ہے، اور مالک (وقف بورڈ) کی ضرورت کے لالے پڑے ہیں۔ جاننے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ رائٹرس بلڈنگ (بنگال حکومت کا مرکزی دفتر) بھی وقف کی زمین پر ہے، اس طرح اوقاف کی بہت بڑی جائداد پر برطانوی سامراج نے قبضہ کیا۔ اور عملاً لینڈ یوز کو بدل دیا، جس کا کوئی قانونی حق حکومت کو نہیں تھا کہ وقف کی زمینوں پر سرکاری دفاتر اور رہائشی مکانات بنائے — ہندوستان میں وقف کی بربادی کا یہ وہ مرحلہ ہے جس کی حقیقت اور شہادت آج بھی واضح ہے!

انگریزوں کے ان اقدامات کے نتیجہ میں ہندوستان کے باشندوں کا بھی وقف پر ناجائز قبضہ کا مزاج بنا، خود ہمارے چھوٹے سے شہر مونگیر میں سرائے کی مسجد موجود ہے، جسکی نئی تعمیر چند برسوں قبل (۹۱ء-۹۳ء میں) ہوئی ہے، یہ مسجد اصل میں سرائے میں ٹھہرنے والوں کیلئے تقریباً دو سو سال پہلے بنائی گئی تھی اور سرائے کا پورا خطہ جو عمارت اور خالی اراضی پر مشتمل تھا۔ ۲۷ بیگھہ کا تھا، اب چند کٹھہ زمین باقی ہے جس کے کچھ حصہ میں مسجد ہے اور وہ پوری اراضی (۲۷ بیگھہ) جو وقف تھی، اس پر بہت سارے غیر مسلم حضرات کے مکانات بنے ہوئے ہیں پیٹرول پمپ ہے، دوکانیں ہیں۔ سرائے کے وقف پر قبضہ انگریزوں کے زمانہ میں ہوا اور تعمیرات آزادی سے پہلے ہوئیں اور بعد میں بھی! اس طرح حکومت کی بدنیتی اور بدعملی نے عوام کو بھی حوصلہ دیا اور انہوں نے بھی اوقاف کی جائداد پر قبضہ کا سلسلہ شروع کر دیا۔

امید یہ تھی کہ آزادی کے بعد صورت حال بدلے گی، مگر مرکزی اور صوبائی حکومتوں کا مزاج وقف جائداد کے سلسلہ میں نہیں بدلا، جس عملاً نتیجہ یہ ہوا کہ خود مرکزی اور صوبائی

حکومتیں وقف جائدادوں پر قبضہ کرتی چلی گئیں — بہادر شاہ ظفر مارگ نئی دہلی کے آخری سرے پر مسجد عبد النبی اور اس سے وابستہ وقف جائداد پر حکومت نے کنٹرول کیا، بڑی کاوش کے بعد مسجد عبد النبی کا انتظام مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ نے ایک کمیٹی کو منتقل کرایا، مرکزی حکومت نے حضرت مفتی صاحبؒ کو کمیٹی کا صدر بنایا، اور میر مشتاق احمد صاحب، بیرسٹر نور الدین، جناب عزیز الشفیع جیسی نمایاں شخصیتیں ممبر تھیں، عرصہ ہوا یہ مسجد غیر سرکاری طور پر جمعیۃ علماء کے زیر نظم آ گئی، جس کی برکت سے ''مرکزی حکومت'' کی قبضہ کی ہوئی مساجد میں سب سے بہتر حالت میں پر رونق ہے ورنہ درجنوں مسجدیں حکومت کے زیر نظم، حفاظت کے نام پر ویران پڑی ہیں، سرکاری انتظامیہ نے غیر قانونی طور پر نماز پڑھنے سے بھی روک رکھا ہے اور مسجد کی بے حرمتی اور خلاف شریعت حرکتیں وہاں کا معمول ہیں

مسجد عبد النبی کے ساتھ شیخ عبد النبی کی خانقاہ، مہمان خانہ، اصطبل اور قبرستان پانچ سو بیگھہ اراضی پر مشتمل وقف تھا جہاں اب آئی ٹی او، کمشنر آفس، گاندھی پیس فاؤنڈیشن، روزنامہ پرتاپ، ملاپ اور دوسرے انگریزی اور ہندی اخبارات کی عمارتیں ہیں اور بہت سارے دفاتر کھڑے ہیں۔ وقف کی جائداد کا سرکاری الاٹمنٹ اور غیر سرکاری مصرف لینا آزادی کے بعد کی کارروائی ہے۔ اسی طرح بہادر شاہ ظفر مارگ کی دوسری جانب گرونانک بھون، پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف اور ان جیسی عمارتوں کے ساتھ پنت ہاسپٹل کے ڈاکٹروں کے رہائشی مکانات، مولانا آزاد میڈیکل کالج کا پورا حلقہ وقف شیخ عبد الحقؒ کی اراضی رہی ہے، جس کا حلقہ شیخ عبد النبی سے بھی بڑا رہا ہے، آزادی کے بعد بھی اس حلقہ میں کئی مسجدیں تھیں، ویران مدرسہ تھا، ۱۹۵۷ء میں میں نے ان میں سے ایک مسجد میں کئی بار نماز پڑھی ہے، جس پر مسجد شیخ عبد الحقؒ کا کتبہ لگا ہوا تھا، اسی مسجد میں شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ اکثر عبادت، تلاوت، اور مطالعہ بھی کیا کرتے تھے۔

یہ جو بھی پنت ہاسپٹل کا مردہ خانہ اور جے پرکاش نرائن اسپتال کے ڈاکٹرس اور

اسٹاف کوارٹرس کے درمیان قبرستان مہندیان تھوڑی سی زمین پر باقی ہے جہاں حضرت شاہ ولی اللہؒ، ان کے بلند مراتب صاحبزادے اور ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا پہلا فتویٰ دینے والے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اور اپنے زمانہ کے مشہور بزرگ شیخ عبدالعزیز شکر بارؒ کے مزارات ہیں۔ یہ قبرستان بہت بڑا تھا، بڑی محنت، جاں نثاری اور تین سو چونتیس مقدمات لڑنے اور جیتنے کے بعد جناب علی محمد شیر میواتیؒ نے اس قبرستان کے تھوڑے سے حصہ کو بچایا اور چہار دیواری دلوائی، ورنہ یہ وقف بھی بہت بڑا تھا—— جہاں ابھی جے پرکاش نرائن اسپتال کی مرکزی عمارت ہے، وہاں بہت بڑی سہ منزلہ مہندیوں کی رسم ادائیگی کیلئے عمارت اور زمین وقف تھی، اور برابر میں یہ قبرستان تھا، خواجہ میر دردؒ کی قبر بھی اسی قبرستان میں تھی، جن کے نام پر اب میر درد روڈ ہے۔ جے پرکاش اسپتال، پنت اسپتال کی عمارت اور اس کے بعد چہار دیواری سے باہر پچھم جانب موجودہ بوسیدہ یک منزلہ سرکاری عمارتیں آزادی کے بعد حکومت نے بنوائی ہیں اور یہ سب مہندیوں کی رسم اور قبرستان کیلئے وقف زمینوں پر بنائی گئی ہیں۔ اسی وقف زمین سے متصل مسجد بارہ کھمبا ہے!

حکومت کا وقف جائداد کے ساتھ جب یہ طرز عمل ہو، تو وقف کے قانون کے مؤثر ہونے کی گنجائش کہاں؟—— جائداد وقف کرنے کے رجحان اور عمل میں کمی کی دوسری اہم وجہ ایک تو یہ ہے کہ وقف کا قانون کمزور ہے بے حد کمزور، دوسرے وقف بورڈ کے ذمہ دار کمزور تر، نگاہ سرکار دیکھ کر فیصلہ بدلنے والے—— نتیجتاً وقف کی جائیداد حکومت اور حکومت رسیدہ لوگوں کا لقمہ تر بنتی رہی، اور بن رہی ہے، واقف کا مقصد اور اس کی منشا تو پیش نظر رہی ہی نہیں، اسے مسلمانوں کی اجتماعی جائیداد اور مسلمانوں کے عمومی، خاص طور پر تعلیمی فائدہ کیلئے استعمال کرنا بھی مشکل ہے، ابھی حال ہی میں دہلی وقف بورڈ نے دس ایکڑ وقف زمین حکومت دہلی کو تحفتاً دے دی جہاں پارک اور بدھ استمبھ طرز کی عمارت بنی ہے، مگر دہلی وقف بورڈ نے کسی مسجد کی تعمیر، کسی مدرسہ، اسکول، کالج، ہسپتال، یتیم خانہ، مسافر خانہ

کیلئے کوئی زمین الاٹ نہیں کی ہے، دہلی میں بعض مسجد اور مسجد سے ملحق اراضی پر علماء نے چند مدرسے ضرور کھولے ہیں، جو غریب مسلمانوں کی تعلیمی ضرورت کی تکمیل کا بہترین ذریعہ ہیں! اور بعض مدرسوں میں غریب ہندو بچے بھی پڑھنے کیلئے آتے رہے ہیں۔

پھر وقف بورڈ کی بدانتظامی، رشوت ستانی کے نتیجہ میں صورتحال یہ بنی کہ وقف جائداد کے رجسٹر بھی بعض صوبوں کے دفاتر میں پورے طور پر موجود نہیں ہیں، ایک عرصہ تک وقف کا رجسٹریشن کرانا بھی بڑا مشکل کام رہا ہے جس کے لئے تدبیریں اور ترکیبیں کی جاتی تھیں —— بعض قوانین کا غلط استعمال بھی اوقاف کی جائیداد اور اس کے ذمہ داروں کیلئے حوصلہ شکن بنا ہے مثلاً لینڈ سیلنگ ایکٹ کے تحت ہر ادارہ (Institution) کو ایک یونٹ قرار دیا گیا اور ایک یونٹ سے زیادہ زمین جہاں تھی وہ سیلنگ میں چلی گئی، مسجد اور مدرسہ کا قبضہ ختم ہوا اور کسی آتمارام کسی پھاگن منڈا کے نام کلکٹر صاحب بہادر نے پرچہ کٹوایا اور زمین بٹوادی—— بہار کے کٹیہار ضلع میں ضمیرا گاؤں کی تقریباً پونے سات سو بیگھہ مسجد کی زمین بانٹ دی گئی، اور ہائی کورٹ تک سے حقدار کو حق نہیں ملا۔ یہ تو ایک مسجد کا بڑا وقف تھا، جس کا ذکر آ گیا، ایسے بہت سے اوقاف ہیں جن پر سیلنگ ایکٹ کو غلط طور پر نافذ کیا گیا، اور ضلع انتظامیہ نے ایک یونٹ سے زیادہ زمین تقسیم کردی۔

پریوی کونسل سے لے کر سپریم کورٹ تک کا فیصلہ ہے کہ ایک بار وقف ہونے کے بعد وہ جائداد ہمیشہ وقف رہے گی، اس کی اصل حیثیت نہیں بدل سکتی، (Once a waqf always waqf) مگر دستور ہند میں دیئے گئے مذہبی امور کے تحفظ، سپریم کورٹ کے واضح فیصلوں کے باوجود لوئر کورٹ اور ہائی کورٹ نے بھی ضمنی یا اضافی قانون کے سہارے وقف کی حیثیت کو ختم کیا ہے، اور قبرستان کی زمین کو بھی کسی مانس مرمو کسی راجن ٹکا کے حوالہ کرنے کے انتظامی فیصلہ کو درست قرار دیا ہے—— ہاں! جہاں مسلمانوں نے قبرستان کی حفاظت کی اور مرنے مارنے پر تُل گئے، وہاں یہ ''قانونی قدم'' نہیں اٹھایا جاسکا، جیسے

سہسرام میں گھسیا (غوثیہ) کلاں کا قبرستان سرکاری دستبرد سے بچا ہوا ہے، جس کا رقبہ پونے تین سو بیگھہ ہے، اس طرح وقف کی اہمیت، عظمت اور حفاظت کا جو تصور عام ہندوستانیوں خاص طور پر مسلمانوں میں رہا ہے، وہ ہلکا پڑتا چلا گیا— اور وقف بورڈ کی کمزوریوں کی وجہ سے متولی یا انتظامی کمیٹی بھی کمزور اور بعض حالات میں ناجائز طریقہ کار اختیار کرنے کا ذریعہ بن گئے۔

ان حالات میں وقف کرنے کا رجحان کم ہوتا چلا گیا—اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لوگوں میں ''دینے'' اور ''اللہ کیلئے دینے'' کا جذبہ کم ہوگیا ہے، مدارس کی بڑی عمارتیں، خوبصورت اور قیمتی مسجدیں اور کئی رفاہی کام ایسے ہیں، جن پر خوب خرچ کیا جاتا رہا ہے، دینی کتابوں کی طباعت اور تقسیم کا رجحان بھی بڑھا ہے، لیکن جائداد کے وقف کرنے کا مزاج کمزور پڑا ہے، جس کی واضح طور پر چند وجہیں ہیں:

۱۔ وقف کی جائداد کے ''غیر محفوظ'' ہونے کا واضح خطرہ
۲۔ وقف بورڈ کی کمزور کارکردگی اور کمزوریاں
۳۔ وقف کے منتظمین میں انتظامی صلاحیت کی کمی یا غلط روش
۴۔ وقف جائداد کے ساتھ حکومتوں کا سوتیلا پن
۵۔ وقف کے انتظام کے لئے کمزور یا غلط قانون سازی

آج بھی اگر لوگوں کا اعتماد بحال ہو تو بڑے بڑے اوقاف قائم ہو سکتے ہیں، جس کی مثال ۱۹۹۸ء میں نواب زادہ صلاح الدین احمد خانصاحب کی وقف کی ہوئی کوٹھی اور ملحق اراضی ہے، صلاح الدین صاحب برسوں سے اس جائیداد کو میری تجویز کے مطابق تعلیم، صحت اور رفاہی کاموں کے لئے وقف کرنا چاہتے تھے، برسوں اس تجویز پر عمل نہ ہو سکا، جب میں نے متولی بننے کی رضامندی دے دی تو فوراً انہوں نے کئی گواہوں کے سامنے اس جائیداد کو وقف کیا، اس جائداد کی قیمت وقف کرتے وقت تقریباً پانچ کروڑ کی تھی، میں

نے چاہا کہ واقف کی منشا، سلسلہ تولیت کی تفصیل اور جائیداد کی باقاعدہ رجسٹری ہوجائے، معلوم ہوا کہ بہت حساب کتاب لگا کر اور کانٹ چھانٹ کر کے بھی چالیس لاکھ روپے سے زیادہ خرچ ہوں گے تب رجسٹری ہوگی— نتیجتاً رجسٹری کرانے کی آرزو حسرت بن گئی، اور اسے وقف بورڈ میں رجسٹرڈ کرایا گیا۔

ابھی یکم مارچ ۲۰۱۲ء کو کشن گنج میں ۲۸؍ ایکڑ زمین وقف کی گئی، جس کا متولی بھی مجھے ہی بنایا گیا، لوگ آج بھی وقف کرنے کا ارادہ کرتے ہیں، مگر کمزور ہاتھوں میں وزنی چیز دیتے ہوئے طبیعت رکتی ہے اور یہ کھٹکا بھی وقف کرنے والوں کے دل میں رہتا ہے کہ کب وقف بورڈ کا کوئی ''ایکٹو چیرمین'' بنا دیا جائے، اور اس کی ایکٹیویٹی وقف کی اصل حیثیت کو ہی تہہ وبالا کردے۔ اگر آئین ہند کے پیش نظر پریوی کونسل اور سپریم کورٹ کے فیصلوں کو سامنے رکھتے ہوئے، اوقاف کے سلسلہ میں حاصل ہوئے تجربات کی روشنی میں ایمانداری کے ساتھ مضبوط قانون سازی ہو، اور وقف بورڈ کو سیاسی نومینیشن کا ذریعہ نہ بنایا جائے تو اوقاف کی حالت بہت بہتر ہوسکتی ہے، پھر نئے نئے اوقاف قائم ہوں گے، جس کے نتیجہ میں ہندوستان کی اجتماعی رفاہی جائداد میں اضافہ ہوتا رہے گا۔

☆☆

مسلم شناخت وسکونت
تعلیم وروزگار کے مسائل

● ڈاکٹر اوصاف احمد

''ہم نے اسلام کو ہمیشہ اپنے مذاہب میں سے ایک سمجھا ہے، ہندوستان میں اسلام پھلتا پھولتا رہے گا، ہمارے تہذیبی نقش ونگار میں ہر چیز کو اپنی شکل اور اپنا رنگ سلامت رکھنے کی اجازت ہے۔ ہندوستان کے مسلمان، اس کی قومی زندگی میں اس کے پیداواری عمل میں اس کی سیاست ومعیشت، تجارت وتعلیم، اس کے فنون اور ثقافت، میں برابر کے حصہ دار ہیں۔ ہر وہ موقع جو ایک ہندوستانی کو مہیا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بھی کھلا ہے۔ ہم کسی مذہب کے پیروؤں کے خلاف کوئی امتیاز نہیں برتتے۔''

مسز اندرا گاندھی

وزیر اعظم ہند

(۲۸/جنوری کو وگیان بھون، نئی دہلی میں پندرہویں صدی ہجری کی تقریبات کے موقع پر ایک بین الاقوامی سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے۔)

۹/مارچ ۲۰۰۵ء کو حکومت ہند نے ملک میں مسلمانوں کی مشہور زمانہ سماجی، معاشی اور تعلیمی پس ماندگی سے متعلق مسائل کا جائزہ لینے کے لئے ایک اعلیٰ سطحی کمیٹی کا تقرر کیا، جو اپنے صدر نشیں جسٹس راجندر سچر کے نام پر سچر کمیٹی کہلائی، کمیٹی سے کہا گیا کہ وہ ہندوستانی

مسلمانوں کے معاشی اعمال، ان کے جغرافیائی پہلوؤں، ان کے اثاثوں، اور آمدنی کی سطح، ان کو ملنے والی سہولتوں، بینک کے قرضوں، اور حکومت سے ملنے والی امداد وخدمات کا جائزہ لے۔ اس کام کو سرانجام دینے کے لئے کمیٹی کو حکومت کے مختلف شعبوں اور فائلوں تک رسائی دی گئی تاکہ وہ اپنی ضرورت کے اعداد وشمار جمع کر سکے۔

سچر کمیٹی کی رپورٹ ۳۰/نومبر ۲۰۰۶ء کو لوک سبھا میں پیش کی گئی گو کہ تادم تحریر اس پر بحث کی نوبت نہیں آئی، تاہم امید کی جانی چاہئے دیر یا سویر، کمیٹی کی رپورٹ زیرِ بحث آہی جائے گی، کیونکہ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلی بار ہوا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی سماجی اور اقتصادی پس ماندگی کے مسائل پر کسی سرکاری کمیٹی کی رپورٹ ایوان کے سامنے رکھی گئی ہو، ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ ایسی کسی کمیٹی کا تقرر کیا گیا ہو، کمیٹی نے اپنی رپورٹ کی ابتداء میں ہی کہا ہے'' گو کہ (ہندوستانی) مسلمانوں کی محرومی کا تاثر عام ہے تاہم ملک کی مذہبی اقلیتوں کی صورتحال کا تجزیہ کرنے کی کوئی منظّم ومنضبط کوشش نہیں کی گئی۔ (صفحہ ۳)

سچر کمیٹی کے تقرر سے کافی پہلے ۸۰ کی دہائی میں ہی یہ اعتراف کرتے ہوئے'' کہ یہ احساس عام ہو رہا ہے کہ حکومت اور ریاستی حکومتوں کی پالیسیوں کے فائدے اقلیتوں (یعنی مسلمانوں)، مندرج فہرست ذاتوں اور قبائل اور معاشرے کے دوسرے کمزور حصّوں کو نہیں پہنچ پاتے، ۱۰/مئی ۱۹۸۰ء کو ایک اعلیٰ سطحی کمیٹی کا تقرر کیا کہ وہ ان احساسات کی چھان بین کرے اور اگر یہ احساس درست پائے جائیں تو ایسے اقدامات تجویز کرے جن کے ذریعہ یہ فوائد ان کمزور طبقات تک پہنچ سکیں۔ کمیٹی نے ۱۴/جون ۱۹۸۳ء کو اپنی رپورٹ حکومت کو پیش کر دی، لیکن اس وقت کی حکومت نے بوجوہ اس کو لوک سبھا (ایوانِ زیریں) میں پیش کرنا مناسب نہیں سمجھا کہ ان مسائل پر قومی سطح کی بحث کا آغاز ہو سکتا ہے۔ یہ رپورٹ حکومت کے سرد خانوں میں ایک عرصہ تک دھول کھاتی رہی تا آنکہ وی پی سنگھ کی

قیادت والی حکومت نے اس رپورٹ کو جاری کرنے کا فیصلہ کردیا۔ پارلیمنٹ میں بحث پھر بھی نہیں ہوئی۔ آزادی کے بعد سماجی علوم کے بعض ماہرین نے اس جانب کوششیں کیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کی سماجی و معاشی صورت حال کا عملی تجزیہ کریں اور اس ضمن میں شواہد جمع کریں، اس ضمن میں اوصاف احمد، مشیر الحسن، عمر خالدی اور رفیق زکریا کی کوششوں کا ذکر خاص طور پر کیا جاسکتا ہے، ان لوگوں کی کتابیں شائع ہوئیں۔ اور اب تک تو اس موضوع پر اچھی خاصی کتابیات جمع ہوسکتی ہے۔

سچر کمیٹی کے سپرد جو معاملات کئے گئے وہ اس سے بھی وسیع تر تھے جو گوپال سنگھ پینل کے حوالے کئے گئے تھے۔ بالخصوص کمیٹی سے مندرجہ ذیل معاملات پر توجہ دینے کے لئے کہا گیا۔

۱۔ ان ریاستوں، علاقوں، ضلعوں، اور بلاکوں کی نشان دہی جہاں ہندوستان کے مسلمان آباد ہیں۔

۲۔ ان کے معاشی اعمال کا جغرافیائی طرز۔

۳۔ ان کے اثاثوں کی بنیاد اور آمدنی کی سطح (ریاستی اور ضلعی سطح پر دوسرے گروہوں کے مقابلہ میں)۔

۴۔ مختلف ریاستوں میں دوسری پس ماندہ ذاتوں میں مسلم پسماندہ ذاتوں کا تناسب۔

۵۔ حکومت اور دوسرے سرکاری اداروں کے ذریعہ دی جانے والی شہری خدمات، طبی سہولتوں اور تعلیم تک مسلمانوں کی رسائی۔ سچر کمیٹی رپورٹ انہیں مسائل کے گرد گھومتی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی سماجی اور معاشی صورتحال کے بارے میں یہ ایک تفصیلی دستاویز ہے جو ۱۲/ابواب اور ۴۰۰ صفحات پر محیط ہے ان میں سے ۲۴۰ صفحات میں تو رپورٹ کا متن ہے اور بقیہ صفحات میں شماریاتی معلومات اور ضمیمے ہیں۔

مسلم شناخت کا مسئلہ:

سچر کمیٹی رپورٹ آزادی کے بعد غالباً پہلی سرکاری دستاویز ہے جس میں کھل کر یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ ہندوستانی مسلمان شناخت کے مسئلہ سے دوچار ہیں اور یہ مسئلہ ہندوستانی مسلمانوں کو درپیش دوسرے مسائل کے حل میں بھی رکاوٹ بنتا ہے، رپورٹ میں کہا گیا ہے:

''بہتوں کے لئے مسلمان کی حیثیت سے پہچانا جانا دشواریوں کا سبب بنتا ہے، مسلم شناخت کی نشانیاں، برقع، پردہ، اور ٹوپی وغیرہ گو کہ ہندوستانی مسلمانوں کو امتیازی حیثیت بخشتی ہیں لیکن عام زندگی میں ان کے لئے تشویش کا باعث بھی ہیں، مسلم مردوں کو اگر ڈاڑھی رکھے ہوئے ہیں یا ٹوپی پہنے ہوئے ہیں تو انہیں پارکوں، ریلوے اسٹیشنوں اور بازاروں سے تفتیش کے لئے سب سے پہلے بلایا جاتا ہے۔ کمیٹی کو بعض عورتوں نے بتایا کہ پردہ نشیں عورتوں کے لئے کارپوریٹ زمرۂ کار میں ملازمت پانا انتہائی دشوار ہے۔ برقع پہننے والی عورتوں نے بازار، اسپتالوں، اسکولوں، اور عوامی اہمیت کی جگہوں جیسے ریلوے اور بسوں میں نامناسب برتاؤ کی شکایت کی۔ (صفحہ ۱۲)

اس سلسلے میں یہ عرض کیا جاسکتا ہے، کہ برقع، ڈاڑھی، اور ٹوپی کو مسلم شناخت کی نشانیاں قرار دے کر سچر کمیٹی مسلمانوں کے ایک خاص تصور کو فروغ دے رہی ہے، گو کہ کمیٹی نے اپنے ارادوں کو ''ہندوستانی مسلمانوں کے امتیازی نشانات'' کے پیچھے چھپانا چاہا ہے، لیکن ایسا لگتا ہے کہ کمیٹی بھی میڈیا کے اس تصور سے ہم آہنگی محسوس کرتی ہے کہ جب کبھی مسلمانوں کا تذکرہ آجائے تو اسکرین پر ایک ناخواندہ شخص کی تصویر ابھرتی ہے، جو ڈاڑھی رکھے ہوئے ہو، کرتا، پائجامہ، یا لنگی میں ملبوس ہو، اور ٹوپی لگائے ہو۔ اب آج کل تو اس تصویر پر ایک دہشت گرد کی تصویر حاوی آگئی ہے، جو دھمکی آمیز انداز میں پستول یا

کلاشنکوف لہراتا ہوا نظر آتا ہے۔کیا کمیٹی کو یہ بتا کے جانے کی ضرورت تھی کہ ٹوپی، برقع اور ڈاڑھی اس طرح اسلامی عقیدے کا جز نہیں ہیں جس طرح پگڑی، کڑا، اور داڑھی سکھ عقیدے کا جز ہیں۔لاکھوں مسلمان ہیں جو نہ تو ڈاڑھی رکھتے ہیں اور نہ ٹوپی پہنتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ یہ چیزیں مسلمانوں کی روایتی شناخت کا جز ہوں۔لیکن فی زمانہ مسلم شناخت ان نشانیوں تک ہی محدود نہیں۔آج کل کروڑوں ایسے مسلمان مل جائیں گے جو کم از کم شبیہ کی حد تک ''دوسروں'' سے بڑی مماثلت رکھتے ہیں، لیکن جیسے ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بے ضرر سا معصوم آدمی ''مسلمان'' ہے لوگوں کا رویّہ بدل جاتا ہے۔اس سلسلے میں درج ذیل چشم کشا واقعہ سن لیجئے۔

دہلی کے نواح میں ایک فیشن ایبل کیفے میں جہاں انگریزی بولتے ہوئے لڑکے اور لڑکیاں خدمات انجام دیتے ہیں، اس ریستوراں کا دستور یہ ہے کہ جب آپ اپنا آرڈر لکھائیں تو اپنا نام بھی لکھادیں تاکہ بعد میں لڑکے لاؤڈ اسپیکر پر پکار سکیں۔

''مسٹر شرما، آپ کا آرڈر تیار ہے''۔

کمپنی نے یہ ترکیب اپنے گاہکوں سے ذاتی تعلق قائم رکھنے کے لئے نکالی ہے۔چند دن قبل، کافی کے ایک گرما گرم پیالہ کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے میں اس ریستوران میں گھس گیا۔ چند اشخاص کیش کاؤنٹر کے پاس کھڑے تھے، جیسے ہی میں نے اپنا آرڈر لکھایا، کیشیر نے پوچھا:

یور نیم پلیز (your name please)

''احمد''

جیسے ہی میری زبان سے یہ لفظ نکلا ایسی خاموشی چھاگئی جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو، کچھ لوگوں نے تو مجھے یوں پلٹ کر دیکھا جیسے میں ابھی ابھی مریخ سے اترا ہوں۔

سچر کمیٹی رپورٹ میں مسائل کے تاریخی اسباب سے بحث نہیں کی گئی لیکن ہمارے

لئے یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ شناختوں کے بحران، ہندوستانی سماج میں ۱۹۲۰ کی دہائی سے ہی موجود ہے جب ہندوستانی قومیت خود اپنی شناخت دریافت کرنے میں مشغول تھی۔ مسلم شناخت اور ہندوستانی شناخت کے درمیان کشمکش اس وقت سے موجود ہے۔یہ کشمکش اس قدر تند و تیز تھی کہ ابوالکلام آزاد جیسے قوم پرست کو انڈین نیشنل کانگریس کی مجلس صدارت سے اعلان کرنا پڑا تھا کہ وہ ایک مسلمان بھی ہیں اور ہندوستانی بھی۔ جہاں ہندوستان کے مفادات کا سوال ہے وہ پہلے ایک ہندوستانی ہیں اور مسلمان بعد میں۔لیکن اگر سوال اسلام اور اس کے مفادات کا ہو تو وہ پہلے ایک مسلمان ہیں۔انہوں نے کہا تھا کہ وہ ایک ہندوستانی ہیں اور اس حیثیت میں ہندوستان کی بہترین روایات کے وارث ہیں، لیکن مسلمان ہونے کی حیثیت سے وہ اسلام اور مسلمانوں کی بہترین روایات کے وارث بھی ہیں۔اور یہ ورثہ بھی انہیں عزیز ہے۔

ہم کو یہ بھی تسلیم کرنا چاہئے کہ شناخت کے مسئلہ پر خود ہندوستانی ذہن میں تضاد اور کشمکش موجود ہے، ہم سب کی مذہبی شناخت ہے! ہم سب کی علاقائی شناخت ہے۔ان میں سے کس شناخت کو اوّلیت حاصل ہے اور کون سی شناخت ثانوی ہے۔اس مسئلہ پر ہمارا ذہن صاف نہیں ہے۔کبھی ہماری ہندوستانی شناخت ہماری دوسری شناختوں پر حاوی ہوجاتی ہے، خاص طور پر اس وقت جب ہمارا قومی مفاد خطرے میں ہو۔دوسرے موقعوں پر ہمارے دوسرے مفادات ہمارے لئے زیادہ اہم ہوجاتے ہیں۔ان موقعوں پر ہم پہلے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی ہیں اور ہندوستانی بعد میں، اسی طرح اپنے علاقائی مفادات کے تحفظ میں ہم پہلے بنگالی، پنجابی، گجراتی، مراٹھی، تامل، اور تیلگو ہیں، بعد میں کچھ اور! ہندوستانی ذہن کے پوشیدہ تعصّبات اس وقت کھل کر سامنے آتے ہیں جب دو غیر تعلیم یافتہ، اجنبی، دیہاتی ہندوستانی ایک دوسرے سے پہلی بار ملتے ہیں ایک طرف تو میزبان اپنے مہمان کی خاطر تواضع کرے گا، جو کچھ بھی اسے میسر ہے، پانی دودھ، چھاچھ، مکھن، گڑ، اسے

پیش کرے گا تو دوسری جانب گفتگو سے اس کے صدیوں پرانے تعصّبات جھلکیں گے۔ پہلے تو مذہب کے بارے میں سوال ہوگا، ''کون دھرم ہو!'' اگر اس سوال کا جواب صحیح ہوا یعنی میزبان اور مہمان کا دھرم ایک ہوا تو دوسرا سوال آئے گا ''کون جاتی ہو'' اگر اس سوال کا جواب بھی صحیح ہوا تو مہمان عزیز قبول ورنہ اس کو اس کی دھرم اور جاتی والے کے پاس بھیج دیا جائے گا۔

مذہبی، علاقائی اور ذات پات کی شناخت ہمارے وجود کا ایک حصہ ہے، اس بات کو تسلیم کیوں نہیں کرلیا جاتا۔ ان تعصّبات کو دور ہونے میں بہت وقت لگے گا۔

سکونت کے مسائل:

سچّر کمیٹی نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ مسلمانوں کے لئے اپنے پسندیدہ علاقوں میں مکان کرائے پر لینا، یا خریدنا بھی ایک مشکل کام ہے۔ اگر ایک طرف مالکان اپنی جائیداد مسلمانوں کو کرائے پر دینے یا فروخت کرنے پر ہچکچاتے ہیں تو دوسری جانب ایسی بھی اطلاعات ہیں کہ بعض ہاؤسنگ سوسائٹی کے ذمہ داروں نے مسلمانوں کو ممبر بنانے سے گریز کیا۔

سچر کمیٹی کے معزز ممبران کے لئے یہ کوئی ''نئی بات'' ہوگی لیکن دہلی اور ممبئی جیسے بڑے شہروں میں رہنے والے مسلمانوں کے لئے یہ کوئی ''نئی بات'' نہیں۔ یہ ان کا روزمرہ کا تجربہ ہے۔ جب کوئی مسلمان کسی بڑے شہر میں کرائے پر مکان حاصل کرنے کے لئے ایجنٹ (دلّال) کے پاس جاتا ہے تو ایجنٹ مالک مکان کو اس طرح اطلاع دیتا ہے:

''مجھے توقع ہے کہ آپ کو لہسن، پیاز، میٹ، مچھلی وغیرہ پر تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا''

اگر مالک مکان کو اعتراض ہوا تو ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہے گا ''مجھے افسوس ہے، یہ مکان تو صرف سبزی خور حضرات کے لئے ہے۔ اگر اس مرحلہ پر اعتراض نہ ہوا اور بات معاہدہ پر دستخط کرنے تک پہنچی اور اس وقت معلوم ہوا کہ مکان کرائے پر چاہنے والا خان،

صدیقی، فاروقی، یا احمد ہے تو مالک مکان کہے گا ''اچھا تو خان صاحب آپ کل تشریف لے آیئے۔ تب ہم تفصیلات طے کرلیں گے''۔ اگر خان صاحب اتنے ہی احمق ہوئے کہ اب بھی بات نہ سمجھے اور دوسرے دن واقعی پہنچ گئے تو ان کا استقبال اس طرح کیا جائے گا:

''اخاہ خان صاحب! خوش آمدید، لیکن آج آپ کو آنے میں کچھ دیر ہوگئی، بھئی مکان تو میں نے ابھی کوئی ایک گھنٹہ پہلے اٹھادیا۔ میں تو آپ کا انتظار کرتا رہا، آپ مجھے بتادیتے تو تھوڑا انتظار اور کرلیتا۔''

سچر کمیٹی کو اس بات سے تسلی ہوسکتی ہے کہ ہندوستانی سماج میں کوئی نئے نہیں ہیں۔ یہ رجحانات تو آزادی کے فوراً بعد ہی پیدا ہوگئے تھے، غالبًا ملک کی تقسیم کے نتیجہ میں جس کے لئے مسلمانوں کو ذمہ دار ٹھہرایا جارہا تھا۔ ۱۹۶۰ کی دہائی میں مشہور اردو افسانہ نگار کرشن چند رنے اس موضوع پر ایک ڈرامہ بھی لکھا تھا، ''جس کا عنوان تھا دروازے کھول دو'' یہ نہ صرف کتابی شکل میں مکتبہ جامعہ سے شائع ہوا بلکہ اس کا ایک ریڈیائی روپ آکاش وانی سے بھی نشر کیا گیا تھا۔ ڈرامہ کا مضمون یہ تھا کہ ایک مسلم سائنس داں کا تبادلہ ممبئی سے دہلی ہوجاتا ہے وہ دہلی میں کسی جدید علاقے میں مکان لینے کا خواہش مند ہے اور بوجوہ مسلم علاقوں میں نہیں رہنا چاہتا۔ وہ جہاں کہیں بھی جاتا ہے، دروازے بند پاتا ہے۔ (چنانچہ ڈرامے کا عنوان ''دروازے کھول دو'' اسی لئے رکھا گیا ہے)۔ بالآخر اس کو اپنی پسند کا مکان مل جاتا ہے، لیکن اس کے لئے اسے اپنے آپ کو ایک ہندو ظاہر کرنا پڑتا ہے۔

ہمارے شہر فرقہ وارانہ بنیادوں پر بٹ چکے ہیں، ہر بڑے شہر میں ایک فرقہ وارانہ لکیر موجود ہے جو شہر کو ہندو علاقہ اور مسلم علاقہ میں بانٹتی ہے۔ اب تو یہ زہر بڑے شہروں سے نکل کر چھوٹے شہروں تک میں پہنچ گیا ہے۔ اس طرح ہندو شہریوں کے لئے مسلم علاقوں میں بسنا مشکل ہوتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلم علاقے گندی بستیوں میں تبدیل ہوتے جارہے ہیں۔ یہ صورت حال فرقہ وارانہ فسادات کے وقت بہت کام آتی ہے۔

اچھے تعلیمی اداروں میں داخلے:

سچر کمیٹی نے اس حقیقت کا اعتراف بھی کیا ہے کہ اقلیتی شناخت اچھے ’معروف‘ اور معتبر تعلیمی اداروں میں داخلے کے لئے ایک بڑی رکاوٹ ہے، اس ضمن میں یہ اعتراف بھی ضروری ہے کہ اس معاملہ میں امتیازی برتاؤ نا حوالہ نہ صرف آسان ہے بلکہ ایک سیاسی ضرورت بھی ہے۔ سچر کمیٹی نے بھی یہی معروف اور آسان راستہ اختیار کیا ہے۔ راقم الحروف کا خیال اور تجربہ یہ ہے کہ اگر اقلیتی طبقہ کے کسی فرد کے ساتھ امتیازی برتاؤ کیا جاتا ہے تو یہ ایک اعزاز کی بات ہے۔ امتیازی برتاؤ اس کے اعلیٰ معیار اور قابلیت کا اعتراف ہے۔ مسلمانوں اور دوسرے ثقافتی گروہوں کی اعلیٰ تعلیمی اداروں سے غیر موجودگی یا کمی ایک حقیقت ہے جس کی وضاحت امتیازی برتاؤ یا پس ماندگی کی بنا پر آ جا سکتی ہے۔ اگر کسی کی درخواست اس بناء پر رد کردی جاتی ہے کہ وہ داخلہ یا روزگار کے لئے کم سے کم اہلیت نہیں رکھتا تو اسے امتیازی برتاؤ نہیں قرار دیا جاسکتا۔ امتیازی برتاؤ تو اس وقت ہوگا کہ درخواست گذار نہ صرف کم سے کم اہلیت رکھتا ہو بلکہ دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ اہل ہو لیکن ذات پات، علاقہ یا طبقہ یا مذہب کی بنیاد پر اس کا انتخاب نہ کیا جائے، تعصب اس مرحلہ پر اپنا کام کرتا ہے۔ کیا یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ تعصب کے بغیر امتیازی برتاؤ کا وجود ناممکن ہے، پہلے مرحلہ پر عام طور پر درخواستوں کی چھان بین کسی غیر امتیازی معیار کی بنیاد پر کی جاتی ہے، مثلاً: اہلیت، کسی لیاقتی ڈگری یا سرٹی فکٹ کا وجود، وغیرہ۔ اگر اسی مرحلہ پر کسی درخواست گذار کی درخواست رد ہوجاتی ہے تو اس کو امتیازی برتاؤ نہیں کہیں گے۔ امتیازی برتاؤ ہمیشہ لائق لوگوں کے خلاف ہوتا ہے۔ تعصب، اعلیٰ لیاقت (میرٹ) سے لڑنے کا ایک ہتھیار ہے۔ جب میرٹ کا مقابلہ میرٹ سے ناممکن ہوتا ہے تو تعصب سے کام لیتے ہیں۔

یہ واضح ہونا چاہئے کہ ہم ہندوستانی سماج میں تعصب کے وجود سے انکار نہیں کرتے۔

ایک ایسے سماج میں جہاں چھوت چھات کا رواج ہو، جہاں سیاست ذات پات اور بھید بھاؤ کی بنیاد پر ہوتی ہو، جہاں معاشی نابرابری اور علاقائی عدم مساوات کا وجود ہو۔ جہاں ذاتی اور گروہی مفادات کو قومی اور انسانی مفادات پر ترجیح دی جاتی ہو۔ امتیازی برتاؤ اور تعصب کے وجود سے فی الفور انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مزید برآں، تاریخی وجوہات کی بناء پر بھی ہندوستان میں مذہبی بنیاد پر تعصب کے وجود کا خاصا امکان ہے۔ تاہم تجزیاتی مقاصد کی خاطر تعصب اور پس ماندگی کے اسباب کو الگ الگ رکھنا مناسب ہے کہ ان کے علاج بھی الگ الگ ہیں۔

روزگار کے مسائل:

سچر کمیٹی رپورٹ میں مسلم روزگار کے مسائل کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے، اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت چھوٹے موٹے کاروبار، غیر منظّم زمرہ، اور چھوٹے پیمانے کی دستکاری وصفت میں لگی ہوئی ہے، قرضوں کی کمی، جدید تکنیکی اصطلاحات کی قلت، جدید انتظام وانصرام کی کمی کے باعث اس زمرے میں آمدنی اور پیداوار میں اضافہ کے چنداں امکانات نہیں ہیں۔ نجی اور سرکاری زمرے میں مسلمانوں کی موجودگی، آبادی میں ان کی موجودگی سے کہیں کم ہے مزید برآں جیسے جیسے فیصلہ سازی کے مرحلوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، مسلمانوں کا تناسب مزید گھٹتا جاتا ہے۔ ان نتائج سے گوپال سنگھ پینل کے پہلے نتائج کی تصدیق ہوتی ہے۔ بعض محققین بھی ان نتائج کا تذکرہ کر چکے ہیں۔ اس سے بھی مسلم طبقہ کی عام پسماندگی ظاہر ہوتی ہے کہ گذشتہ ۳۰-۲۵ سال کے عرصہ میں ہندوستانی مسلمانوں کی معاشی حالت میں زیادہ فرق نہیں پڑا۔

ان تمام معاملات پر اور سچر کمیٹی کی تجاویز پر قومی سطح پر بحث ومباحثہ کی ضرورت ہے تاکہ بیشتر معاملات کے اوپر ایک قومی اتفاق رائے ابھر سکے۔

☆☆

امت مسلمہ کے مسائل اور ان کا حل

● فائزہ صدیقی

آج اگر امت مسلمہ کے مسائل و مشکلات کی بات کی جائے تو وہ ذاتی زندگی سے متعلق بھی ہیں اور اجتماعی نظم سے بھی انفرادی زندگیوں میں بھی بے شمار کوتاہیاں دیکھنے میں آرہی ہیں اور معاشرتی سطح پر بھی کمزوریاں بڑھتی چلی جا رہی ہیں عوام کو بھی اپنی اصلاح کی فکر کرنی ہے اور حکمرانوں کو بھی اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنا ہوگا۔ ان امور کی نشاندہی کی جائے جو ہمارے مسائل و مشکلات، بگاڑ و فساد اور زوال و انحطاط کا اصل سبب ہیں۔ جب عوام و خواص، رعایا اور حکمران، فرد اور معاشرہ سب اپنی کمزوریوں اور ذمہ داریوں کا احساس و ادراک کر کے ان اسباب کے ازالے کی فکر کریں گے تب کہیں بہتری کے آثار نمودار ہونا شروع ہوں گے۔ ان شاءاللہ

ایمان محکم، عمل صالح، خوف الٰہی اور فکر آخرت:

ہمارے پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسے اپنے معاشرے کی اصلاح کی اور کن بنیادوں پر صحابہ کرام کو کھڑا کیا کہ وہ زمانے کے مقتداء و پیشوا بن گئے۔ ایک ایسا معاشرہ جو جہالت اور گمراہی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا، جہاں قتل و غارتگری کا رواج تھا، وہ لوگ راہ راست سے اس حد تک بھٹکے ہوئے تھے کہ کوئی ان پر حکمرانی کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ ہمارے آقا نے اس معاشرے کا نقشہ ہی بدل دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

اس معاشرے کو ایمان محکم، عمل صالح، خوفِ الٰہی اور فکر آخرت کی ایسی بنیادیں فراہم کیں کہ جن کی وجہ سے پورا معاشرہ یکسر بدل گیا وہ لوگ جو پہلے قاتل اور لٹیرے تھے وہ زمانے کے مقتداء اور پیشوا بن گئے۔ ان کا معاشرہ جنت کا نمونہ بن گیا، وہ قیصر و کسریٰ جیسی عالمی طاقتوں سے ٹکرا کر فاتح ٹھہرے۔ ہمارے حکمرانوں کا معاملہ ہو یا عوام کا، انفرادی زندگیاں ہوں یا اجتماعی نظم یقین محکم کی قوت، کردار و عمل کی طاقت، خوف الٰہی کا زادِ راہ اور فکر آخرت کی دولت سے ہم انفرادی اور اجتماعی طور پر محروم ہو گئے۔ جب ہمارے پاس ایمان و یقین کی بنیاد اور اخلاص پر مبنی جذبہ ہی نہیں، کردار و عمل کے اعتبار سے ہم کمزور ہو گئے، محاسبہ کی فکر سے آزاد ہو گئے، مرنے کے بعد کی زندگی کو بھول بیٹھے تو یہ وہ پہلی اینٹ ہے جو غلط رکھ دی گئی اس اینٹ کو جب تک صحیح نہیں کیا جائے گا اور ان چار بنیادوں پر اپنی اجتماعی اور انفرادی زندگی کو لانے کی کوشش نہیں کی جائے گی اس وقت تک اصلاحِ احوال کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

وھن کی بیماری:

اس وقت امت مسلمہ مسائل و مشکلات کے جس گرداب میں پھنسی ہوئی ہے، ہر طرف ظلم و ستم کی آندھیاں زوروں پر ہیں، ہر جگہ مسلمانوں کا لہو بہہ رہا ہے، ہر آنے والا دن گزرے دن سے زیادہ مصائب و آلام لے کر طلوع ہوتا ہے۔ دشمن اہل ایمان کو کاٹ کھانے اور صفحہ ہستی سے مٹا ڈالنے کے لیے بھوکوں کی طرح امت مظلومہ پر ٹوٹا پڑ رہا ہے اس صورت حال سے نہ صرف یہ کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بہت پہلے خبردار کر دیا تھا بلکہ اس زوال و انحطاط کی وجہ بھی بتا دی تھی کہ جب امت ''وھن'' کی بیماری میں مبتلا ہو جائے گی یعنی دنیا سے محبت کرنے لگے گی اور موت کی ناپسندیدگی کا شکار ہو جائے گی تو پھر اس قسم کے حالات سے دوچار ہو جائے گی اس وقت ہمیں امت مسلمہ میں

یقین محکم، عمل صالح، خوفِ الٰہی اور فکرِ آخرت کا شعور اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی باقاعدہ مہم چلانے کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے اجتماعی نظم اور اپنے دل و دماغ سے وھن کی بیماری کو یعنی دنیا کی محبت اور موت کی ناپسندیدگی کو ختم کردیں کیونکہ دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے، موت کی ناپسندیدگی بزدلی اور غیروں کی غلامی کا سبب بنتی ہے۔ جب ہم اس بیماری سے نجات پاجائیں گے تو اس کے نتیجے میں بہت سی مشکلات پر قابو پانا آسان ہو جائے گا۔ ان شاءاللہ۔

اتحاد و اتفاق کا فقدان:

اس وقت امت مسلمہ کے مسائل و مشکلات کی ایک بڑی وجہ اتحاد و اتفاق کا فقدان ہے۔ ہمارے ہاں مذہبی بنیادوں پر، مسلکی بنیادوں پر، علاقائی بنیادوں پر اور لسانی بنیادوں پر نفرتوں کے ایسے بیج بوئے گئے ہیں کہ ان کی فصل اب بالکل تیار ہے۔ دشمن نے ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' پالیسی کے تحت ہمیں یوں آپس میں دست و گریباں کیا کہ ہمارے مابین دوریوں کی خلیج حائل ہوگئی اور امت کا شیرازہ بری طرح بکھر کر رہ گیا۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عصبیت کے جن کلموں کو بدبودار باتیں کہہ کر چھوڑنے کا حکم دیا تھا انہی چیزوں نے اس امت واحدہ کو بانٹ رکھا ہے۔ ہمارے مسلکی اختلافات مخالفت اور تشدد کی شکل اختیار کرجاتے ہیں اور پھر نہ ختم ہونے والے فساد اور انتشار کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ اگر آج مسلکی ہم آہنگی، عصبیت کے خاتمے، علاقائی اور لسانی تفریق کو مٹانے اور جدید و قدیم کی خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ مسائل و مشکلات ہمیں یوں ہی گھیرے رکھیں اور اگر آج ہم نیل کے ساحل سے لے کر کاشغر تک پھیلی ہوئی اسلامی دنیا کو اتحاد و اتفاق کی لڑی میں پرونے اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو ہمارا مقدر یقیناً بدل سکتا ہے۔ آج اگر یورپی یونین کی شکل میں یورپی ممالک کا

بلاک موجود ہے، افریقی ممالک آپس میں معاہدے کر کے ایک قوت بن سکتے ہیں، سارک ممالک اکٹھے ہوسکتے ہیں تو اسلامی دنیا مشترکات پر اکٹھی ہو کر اپنا ایک بلاک بنا لینے کی ہمت کیوں نہیں کرتی؟ یاد رکھئے جب تک اس پہلو پر توجہ نہیں دی جائے گی اس وقت تک ہماری پریشانیاں کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی رہیں گی۔

تعلیم کی کمی:

امت مسلمہ کے مسائل کی ایک بڑی وجہ تعلیم کی کمی ہے۔ اور یہ بھی ایک ایسا سبب ہے جس کے ذمہ دار افراد بھی ہیں اور مسلمان معاشرے بھی، عوام بھی ہیں اور حکمران بھی ایک ایسی امت جس کی پہلی وحی کا آغاز اقرا سے ہوتا ہے، ایک ایسی امت جس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قل رب زدنی علماً کا حکم ہوتا ہے، ایک ایسی امت جس کی شناخت اور پہچان ہی تعلیم و تعلم ہے اگر وہ امت تعلیم کے میدان میں دنیا سے پیچھے رہ جائے تو اس پر افسوس کے اظہار کے سوا اور کیا کیا جاسکتا ہے؟ مسلمانوں کو تعلیم سے محروم رکھنے کے ذمہ دار جہاں حکمران ہیں کہ انہوں نے اعلیٰ تعلیمی اداروں کے قیام، تعلیمی سہولیات و ضروریات کی فراہمی، اعلیٰ معیار کی درس گاہوں کے انتظام و انصرام، تعلیم کے لیے معقول بجٹ مختص کرنے اور اپنی قوموں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کے معاملے میں ہمیشہ مجرمانہ غفلت کا مظاہرہ کیا وہیں عوام نے بھی انفرادی طور پر اس معاملے میں افسوسناک حد تک تغافل برتا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی ہو یا جدید ایجادات، میڈیکل اور انجینئرنگ ہو یا کوئی دوسرا علم، ہم اپنے شاندار اور تابناک ماضی کے حوالے تو دیتے ہیں، چند مسلمان سائنسدانوں کا تذکرہ تو کرتے ہیں لیکن کیا ہم نے سوچا کہ آج وہ بڑے بڑے سائنسدان کیوں جنم نہیں لیتے؟ آج ہم ہر معاملے میں غیروں کے محتاج کیوں ہیں؟ آج اسلامی دنیا میں شرح خواندگی اتنی کم کیوں ہے؟ آج دنیا کی معیاری درسگاہیں اور رصد گاہیں عالم اسلام میں کیوں نہیں؟

یونیورسٹیز کی ریٹنگ میں اسلامی دنیا کے تعلیمی اداروں کا سراغ تک کیوں نہیں ملتا؟

ہمیں اس معاملے پر خوب سوچ و بچار کر کے اس کے تدارک کی حکمت عملی وضع کرنی ہوگی ورنہ مستقبل مزید تاریک سے تاریک تر ہوتا چلا جائے گا۔

سستی، کاہلی اور عیش پرستی:

امت مسلمہ کے مسائل میں سے ایک اور بڑا مسئلہ ہماری اجتماعی اور انفرادی سستی، کاہلی اور عیش پرستی بھی ہے۔ ہم لوگ محنت سے جی چراتے ہیں، کام کرنے سے جان چھڑاتے ہیں، ہمارے حکمرانوں کا شاہانہ طرزِ زندگی ہو یا امراؤ وروساء کی عیش پرستی، عوام کی سہل پسندی ہو یا نوجوانوں کی عیش کوشی ان چیزوں نے نہ صرف یہ کہ ہمیں زوال وانحطاط سے دوچار کیا بلکہ دنیا کے سامنے تماشا بنا کر رکھ دیا ہے۔ ہمارے نوجوان شمشیر وسناں چھوڑ کر طاؤس ورباب کے دلدادہ ہوگئے، فحاشی وعریانی کے زہر نے ہماری پوری نسل کو کھوکھلا کر ڈالا، لایعنی مشاغل اور فضولیات ولغویات میں انہماک نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔ وہ لوگ جو ایمان کی دولت سے بھی محروم ہیں اور اللہ کی نصرت ومدد کا بھی ان سے کوئی وعدہ نہیں لیکن جب انہوں نے محنت کو اپنا شعار بنایا تو کامیابی وکامرانی ان کا مقدر بنتی چلی گئی اور ہم ہاتھوں پر ہاتھ دھرے اچھے مستقبل کے انتظار میں بوڑھے ہوتے چلے گئے۔ ہمیں اس اجتماعی اور انفرادی کمزوری کا احساس بھی کرنا ہوگا اور اس معاملے پر قابو پانے کی کوشش بھی کرنی ہوگی۔

وسائل کا ضیاع اور اسراف:

جس طرح ہم وقت اور انسانی صلاحیتوں کو بے دریغ ضائع کرتے ہیں اس سے کہیں بڑھ کر ہم قدرتی وسائل کو بھی ضائع کر رہے ہیں۔ اللہ رب العزت کا خصوصی فضل وکرم ہے کہ عالمِ اسلام کے پاس ہر قسم کے وسائل کی فراوانی ہے، سیال سونے کے کنویں موجود ہیں، معدنیات کے ذخائر موجود ہیں، جغرافیائی اعتبار سے دیکھا جائے یا زرعی لحاظ سے، معدنی

اعتبار سے بات کی جائے یا موسمی اعتبار سے سب سے زیادہ وسائل اور ترقی کے مواقع عالم اسلام کے پاس ہیں لیکن ہم نے انہیں بروئے کار لانے اور منصوبہ بندی سے برتنے کا اہتمام ہی نہیں کیا، اسلامی دنیا سے تیل دشمن نکال کر لے جاتے ہیں، ریکوڈک سے سونا نکالنے کا ٹھیکہ ہم کسی اور کو اونے پونے داموں میں دے دیتے ہیں، دریاؤں پر ڈیم بنانے کی ہمیں توفیق نہیں ہوتی، ہمیں تو **اعدو لهم ما استطعتم من قوة و من رباط الخیل** کا حکم تھا لیکن ہم دشمن کے خلاف قوت جمع کرنا تو کجا اپنی ضرورت کے وسائل کو سلیقے سے برتنے کی توفیق سے بھی محروم ہیں اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ وسائل کے ضیاع کے ساتھ ساتھ اسراف جسے قرآن نے شیطان کے بھائیوں والا کام قرار دیا ہے اس کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ہمارے حکمرانوں کی بیگمات کے سونے اور زیورات کے قصے آپ نے سنے اور پڑھے ہوں گے اور شادی بیاہ سے لے کر لباس و پوشاک تک اور موبائل فون سے لے کر پانی وبجلی کے استعمال تک عام لوگوں کے طرز عمل کا مشاہدہ بھی کیا ہوگا۔ وسائل کے بے دریغ ضیاع اور فضول خرچی واسراف کی عادت میں ہم نے سب کو مات دے دی اور یہی وہ کمزوری ہے جس نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا اگر اس معاملے میں ہم سیدنا یوسف علیہ السلام والی حکمت عملی اپنائیں اور جس طرح انہوں نے دیانت، کفایت شعاری اور منصوبہ بندی کے صرف تین گر اپنا کر پورے مصر کو قحط سالی میں ریلیف مہیا کیا ہم بھی ان تینوں چیزوں یعنی دیانت داری، کفایت شعاری اور بہتر منصوبہ بندی کے ذریعے پورے عالم اسلام کے فقر وافلاس اور زوال وانحطاط کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔

کرپشن اور بددیانتی:

کرپشن اور بددیانتی ہمارے معاشرے کا ایسا ناسور ہے جس نے آج ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کو بری طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ حکمران ہوں یا عوام جس کو جب

، جہاں اور جیسا موقع ملتا ہے وہ لوٹ کھسوٹ، بددیانتی اور کرپشن سے خود کو نہیں بچا پاتا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شاید انہی حالات کے بارے میں پیشین گوئی فرمائی تھی کہ قرب قیامت میں دیانت وامانت کو اٹھالیا جائے گا لوگ کہیں گے کہ فلاں قبیلے یا فلاں علاقے میں ایک شخص ہے جو بڑا امانت دار اور دیانت دار ہے۔ آج اگر ہماری ریاستیں، ہمارا معاشرہ، ہمارے ممالک، ہمارے ادارے اور ہماری انفرادی زندگی کرپشن اور بددیانتی کی لعنت سے پاک ہو جائے تو دنیا کا نقشہ بدل سکتا ہے۔

ظلم وزیادتی اور ناانصافی:

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا مشہور قول ہے کہ معاشرے کفر کے ساتھ تو باقی رہ سکتے ہیں لیکن ظلم کے ساتھ باقی نہیں رہ سکتے۔ آج ہمارے ہاں ظلم کی جو مختلف شکلیں رائج ہیں، ناانصافی کے جو افسوسناک مناظر دیکھنے میں آتے ہیں ان کی وجہ سے بھی امت مسائل ومشکلات کا شکار ہے۔ غیروں اور دشمن کے مظالم اور زیادتیاں تو اپنی جگہ لیکن ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں ہر طاقت، قوت، دولت اور اثر رسوخ رکھنے والا دوسروں کو اپنے ظلم وزیادتی کا نشانہ بنا رہا ہے، انصاف اور مساوات کے تصورات معدوم ہوتے چلے جارہے ہیں، جب تک ہم انفرادی اور اجتماعی طور پر انصاف کی بالادستی اور نظامِ عدل کے نفاذ کیلئے کوشش نہیں کریں گے اس وقت تک ہمارے مسائل کم ہونے کی بجائے بڑھتے چلے جائیں گے۔

احساس کمتری:

ہمارے مسائل کی ایک بڑی بنیاد احساس کمتری بھی ہے۔ اس احساس کمتری کی وجہ سے مرعوبیت، دوسروں کی غلامی اور حاشیہ نشینی، بیرونی قوتوں کی مداخلت اور ڈکٹیشن قبول کرنے سے لے کر اپنی اقدار وروایات کو ترک کر کے دوسروں کی نقالی اور ان کی تہذیبوں کو فخر کے ساتھ اپنانے کی جو روش چل نکلی ہے اس سے بھی چھٹکارہ حاصل کرنا از حد ضروری

ہے جب تک ہمیں سر اٹھا کر جینے کا ہنر نہیں آجاتا، اپنی خود مختاری کی حفاظت کا سلیقہ نہیں آتا، اپنی اقدار وروایات پر ناز کرنے کی ہمت نہیں ہوتی اس وقت تک ہم کسی کو کیا الزام دے سکتے ہیں؟

طبقاتی تفریق:

ہمارے مسائل ومشکلات کی ایک بڑی وجہ طبقاتی تفریق بھی ہے۔ V.I.P کلچر، جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام اور بیوروکریسی کی مختلف شکلیں اس طرح ہمارے اوپر مسلط ہیں کہ کبھی یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے ہم نے طبقاتی اور معاشرتی اونچ نیچ اور ذات پات کے چکر میں ہندوؤں کو بھی مات دے دی ہو، ہمارے قواعد وضوابط اور قوانینِ جزا وسزا ہر ایک کے لئے الگ الگ ہیں۔ امیر اور طاقتور ہر قسم کے قاعدے اور ضابطے سے مستثنیٰ ہے اور غریب ہر ظلم وزیادتی کا شکار ہیں حالانکہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صورتحال کو سابقہ قوموں کی تباہی وبربادی کی بنیادی وجہ قرار دے کر اس سے اجتناب کا درس دیا تھا۔

ذرائع ابلاغ پر غیروں کا غلبہ:

اسی طرح ہمارا ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے ذرائع ابلاغ وہ کسی بھی شکل میں ہوں ان پر کسی نہ کسی درجے میں غیروں کی چھاپ نظر آتی ہے۔ اگرچہ میڈیا کے بعض ادارے اور کچھ افراد اپنی طرف سے اصلاح احوال کی کوششوں میں بھی مصروف عمل ہیں اور انفرادی طور پر کئی لوگ ایسے ہیں جنہیں اس شعبے میں امید کی کرن کہا جا سکتا ہے لیکن مجموعی طور پر جس طرح ذرائع ابلاغ فحاشی وعریانی پھیلانے، اپنی اقدار وروایات کو ختم کر کے غیروں کی تہذیب مسلط کرنے اور فکری حوالوں سے غلط فہمیاں اور گمراہی پھیلانے میں جو کردار ادا کر رہے ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں عالمی سطح پر میڈیا کی اسلام دشمن، مسلم کش، اخلاق باختہ اور حیا سوز پالیسیوں کے تدارک کے لیے امت مسلمہ نے کبھی سنجیدگی سے نہیں سوچا نہ اس

صورتحال کی تلافی کی کوئی سنجیدہ کوشش کی جس کا خمیازہ آج ہم سب کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔اس لیے ہم سب کو بالخصوص ہمارے حکمرانوں اور میڈیا سے وابستہ ہمارے مسلمان بھائیوں کو امت کو اس سنگین مشکل سے نجات دلانے کے لیے اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔

دوسروں کی اصلاح اور خود سے غفلت:

یہ بھی ہمارا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے کہ ہمارے ہاں جو بھی امت مسلمہ کے مسائل ومشکلات کے اسباب کی نشاندہی کر کے ان کے تدارک اور امت کی اصلاح کا بیڑہ اٹھاتا ہے وہ ہمیشہ اصلاح کا عمل دوسروں سے شروع کرتا ہے اور خود کو بھول جاتا ہے۔عوام حکمرانوں کو کوستے ہیں اور حکمران عوام کو تمام خرابیوں کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔اگر ہم دیکھیں تو اس وقت ہمارے حکمرانوں اور عوام کا رخ اور ترجیحات ہی مختلف ہیں۔حکمران غیروں کے مقاصد کی تکمیل میں لگے ہیں اور انہیں عوامی مسائل ومشکلات سے نہ صرف یہ کہ کوئی سروکار نہیں بلکہ عوامی اضطراب کا احساس وادراک تک نہیں۔یہ اعتماد کا فقدان اور الزام تراشی کی روش صرف عوام اور حکمرانوں کے مابین ہی نہیں ہے بلکہ مختلف طبقات اور مختلف افراد بھی اس کا شکار ہیں بلکہ بحیثیت مجموعی ہم سب قول وفعل کے بدترین تضاد میں مبتلا ہیں اس لیے ہمیں سب سے پہلے اپنی اصلاح کرنی ہوگی،معاشرے میں پھیلی تاریکیوں اور ظلمت شب کا شکوہ کرنے کی بجائے اپنے حصے کا چراغ جلانا ہوگا،اور امت کو اجتماعی، انفرادی،حکومتی اور عوامی مسائل ومشکلات سے نجات دلانے کیلئے تن من دھن کی بازی لگانی ہوگی۔اللہ رب العزت ہمیں اس کی توفیق مرحمت فرمائے۔آمین

☆☆

ہندوستانی مسلمانوں کے حالات

(ایک جائزہ)

● رحمت اللہ کلیم اللہ امواوی

عالمی سطح پر اپنی الگ شناخت رکھنے والا ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے جو کہ 28 ریاستوں کا مجموعہ ہے آبادی کے اعتبار سے دنیا بھر میں دوسرا مقام رکھنے والا یہ ملک روز افزوں تیزی کے ساتھ ترقی کے مراحل طے کرتا جا رہا ہے چونکہ یہاں انتشار میں بھی اتحاد کی آواز نکلتی ہے، یہاں مختلف زبانوں کے بولنے والے ایک ساتھ رہتے ہیں اور مختلف مذاہب کے ماننے والے بھی اپنے مذہبی اصول پر پوری آزادی کے ساتھ گامزن رہنے کا حق رکھتے ہیں۔فی الوقت مسلمانون کی تعداد اس ملک میں 23 کروڑ سے زائد ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ اس سرزمین پر مسلمانوں نے 800 سالوں تک حکومت بھی کی ہے اور ہندوستان کی زمین کو گل گلزار بنایا ہے،اس چمن کی اپنے خون جگر سے آبیاری بھی کی،اس کیلئے سر بھی کٹائے اور اس کی خاطر اپنے جان ومال کو بھی قربان کر دیا۔وہ ایک ایسا زمانہ تھا جب مسلمان ہر میدان میں قیادت کر رہے تھے اور ترقی کے بام عروج پر پہنچ چکے تھے، ہندوستان کی سرزمین پر ہندوؤں کو حسین وعمدہ تہذیب وثقافت سے آشنا کرا رہے تھے ان کو طرز ہائے زندگی کا خوشنما اصول بتا رہے تھے،زندگی گزارنے کا ڈھنگ سکھا رہے تھے، مسلمانوں کا ہر طرف بول بالا تھا،ہر کسی پر مسلمانوں کا اخلاقی رعب ودبدبہ تھا لیکن زمانے نے ایک ایسی کروٹ لی کہ مسلمانوں کی شام ہونے لگی اور بہت جلد انگریزوں کا آفتاب

طلوع ہوا، ہندوستان پر فرنگیوں کا قبضہ ہو گیا اور ہندوستانیوں کے اوپر ظلم و جبر کیا جانے لگا۔ لیکن باغیرت ہندوستانیوں کو غلامانہ زندگی ہرگز پسند نہ تھی جن میں زیادہ تر مسلمان تھے، ان حضرات کے دلوں میں آزادی کی چنگاڑی پھوٹ رہی تھی مگر یہ چنگاڑی بہت جلد شعلہ میں نہیں بدل سکی ،لیکن جب انگریزوں کا ظلم و جبر حد سے تجاوز کر گیا تو یکا یک آزادی کیلئے دلوں میں اٹھ رہی چنگاری شعلہ فشاں ہوئی اور ایک آن میں انگریز حکومت کو خاکستر کر دیا اور ہندوستان پھر سے آزاد ہو گیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس جنگ آزادی میں مسلمان بھی برابر کے شریک رہے اور اپنا لہو بہا کر اس سرزمین کو آزادی کا تحفہ دیا۔ آزادی کے فوراً بعد ایک عظیم سانحہ ہندوپاک کے بٹوارے کا رونما ہوا، مولانا ابوالکلام آزاد دلی کی جامع مسجد سے مسلمانوں کو ہندوستان چھوڑنے سے روکتے رہے چونکہ وہ جانتے تھے کہ اتحاد کی قوت کیا ہوتی ہے اور اگر ہم ہندوپاک دوملکوں مین منتشر ہو جائیں گے تو پھر ہماری طاقت کمزور ہو جائیگی اور محکوم بن جائینگے ،لیکن ابولکلام آزاد کی بات کا بہت کم اعتبار کیا گیا اور مسٹر جناح کی قیادت میں مسلمانوں کی اکثریت پاکستان ہجرت کر گئی اور بہت کم تعداد ہندوستان میں باقی رہ گئی۔ آزادی کو اب 65 سال ہو گئے ہیں لیکن اس مدت میں ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ کیا کچھ ہوا اور کیا سب کیا گیا ان تمام چیزوں کو پڑھنے اور سننے کے بعد رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، جمہوریت کے نام پر اقلیت جان کر مسلمانوں کے ساتھ جو کھیل کھیلا گیا اس سے جمہوریت شرما اٹھی اور مسلمانوں کے ساتھ جو کھیل کھیلا گیا اس سے انسانیت گھبرا اٹھی۔ الغرض مسلمانوں کو ہر محاذ پر کمزور کرنے کی کوشش کی گئی ،اقلیت کہہ کر کے ہمت و طاقت چھین لی گئی اور کمزور جان کر مذہبی آزادی تلف کر لی گئی اور ساتھ ہی ساتھ ناقابل سمجھ کر سیاسی میدان میں حاشیہ نشیں بنا دیا اور فی الحال مسلمانوں کی جو حالت ہے وہ بھی سب کے سامنے ظاہر و باہر ہے۔

سیاسی حالات: فی الحال ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کی جو شراکت ہے وہ آٹے

میں نمک کے برابر ہے اور مسلم سیاسی قائدین کی اتنی تعداد ہے کہ انہیں با آسانی انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ آزادی کے بعد سے اب تک صرف ایک ہی مسلم قائد ابوالکلام کی شکل میں پیدا ہوا جو پارلیمنٹ میں ببانگ دہل اپنی بات اور اپنی زبان بولتے تھے اور امت مسلمہ کے مسائل کو اٹھایا کرتے تھے تاکہ مسلمانوں کو بھی اس ملک میں کسی طرح کی پریشانیاں نہ اٹھانی پڑے۔ ان کے بعد سے اب تک کوئی قائد اور سیاسی لیڈر تاریخ میں نظر نہیں آتا جنہوں نے مسلمانوں کے درد کو سمجھا ہو اور ایوان بالا و ایوان زیریں میں ان کے مسائل اٹھائے ہوں اور مسلمانوں کے ظلم پر آنسوں بہاتے ہوئے ان کے دکھ درد اور غم بانٹنے کی کوشش کی ہو، بلکہ ہر کوئی صرف اور صرف اپنی اور اپنے پارٹی کے مفاد کی بات کرتا رہا ہے، مسلمانوں کا نمائندہ ہو کر بھی انکے مسائل کو حکومت کے سامنے پیش کرنے کی کوشش نہیں کرتا ہے، لیکن جب الیکشن کا وقت ہوتا ہے تو اپنے بھائیوں سے ایسے ایسے وعدے کرتا ہے گویا وہ کل جیتنے کے بعد ان کی زندگی میں چار چاند لگا دینگے اور بے چارے سیدھے سادھے مسلمان ان کے بہلاوے میں آ کر انہیں اپنا نمائندہ چن لیتے ہیں اس کے بعد یہی لوگ اپنے عوام سے کیے ہوئے وعدوں کو بدن پر لگے ہوئے غبار کی طرح جھاڑ دیتے ہیں یہ رویہ جہاں غیر مسلم لیڈروں کا ہے وہیں مسلم نمائندوں کا بھی۔ ایک دوسری کمزوری مسلمانوں کی سیاسی میدان میں یہ رہی کہ اب تک ہندوستان کی سرزمین پر مسلمانوں کی کوئی معتبر پارٹی ابھر کر سامنے نہیں آئی، البتہ دو چند مسلم لیڈران ہندوستانی وزارت میں دیکھنے کو ملتے ہیں جو ایسی پارٹی سے ہیں جن کے منشور میں مسلمانوں کی کمر توڑے رکھنا بھی شامل ہے۔

سماجی حالات: یہ بات حقیقت پر مبنی ہے کہ کل تک مسلم سماج و معاشرے کی پہچان ہماری خوبیوں اور اچھائیوں کے ذریعے ہوا کرتی تھی، ہمارا سماج و معاشرہ ہر قسم کے خرافات سے مبرا تھا، صبح ہوتے وقت گھروں سے تلاوت کلام اللہ کی بھینی بھینی صدائیں بازگشت کرتی تھیں، صفائی ستھرائی کو نصف ایمان جان کر اس کا پورا خیال کیا جاتا تھا، شرم و حیاء کا یہ

عالم تھا کہ معاشرہ اس پر نازکناں تھا،لوگ باہمی ہمدردی کو فروغ دیا کرتے تھے، اسلامی اصول پر ہمارا سماج و معاشرہ گامزن تھا،لوگ ایک دوسرے کے ہمدرد و بہی خواہ تھے، اتحاد و اتفاق کا ایسا حسین منظر دیکھنے کو ملتا کہ اب نظریں ترس رہی ہیں لیکن مرورزمانہ کے ساتھ ساتھ سماج کی خوبیاں بھی مرورکرگئیں ،اورآج مسلم سماج و معاشرے کی جو حالت اور جو علامت ہے اس کو دیکھ کر آدمی تشویش میں پڑ جاتا ہے اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا وہی مسلمانوں کا سماج ہے جو کل تھا؟ جہاں کل نصف ایمان کا درجہ جان کر صفائی وستھرائی کا پورا اہتمام کیا جاتا تھا آج وہیں مسلم معاشرے میں گندگیوں کا ہونا اس قوم کی علامت بن گئی ہے، جہاں لوگ کل خوددار وخودمختار ہوا کرتے تھے اور محنت ومشقت سے باعزت حلال روٹی کما کر کھاتے تھے آج مسلم معاشرے سے ہر روز صبح صبح فقیروں کا جتھا نکلتا ہے اور کاسۂ گدائی لیے جگہ جگہ بھیک مانگتا پھرتا ہے، جہاں کل مسلم معاشرے میں پردے کا پورا اہتمام کیا جاتا تھا آج اس کے برعکس عریانیت وفحاشیت عروج پر ہے، بے پردگی اور بے حیائی کا بول بالا ہے،خواتین کے سر سے آنچل اور دوشیزاؤں کے بدن سے لباس ہٹتا جارہا ہے، لوگوں نے اپنے غیرت وحمیت کا سودا مغربی تہذیب سے کرلیا ہے اور عزت وعفت کو مغربی ایجادات سے بیچ دیا ہے جس کی وجہ سے زناکاری،کوٹ میرج اور غلط تعلقات پروان چڑھ رہے ہیں، معاشرے میں نئی نسلوں کو محفوظ رکھنا محال ہوگیا ہے،اس کے ساتھ ہی جہاں کل مسلم علاقوں سے صبح صبح تلاوت کلام پاک کی آواز نکلتی تھی آج اس کے برعکس موسیقی کے ذریعے ان کی صبح ہوتی ہے، جہاں کل تک اسلامی جلسہ گاہوں اور درسگاہوں میں بیٹھ کر اسلامی خطبات سنا کرتے تھے آج سینما ہال میں بیٹھ کر مسلم نوجوان شہوانیت بھڑکانے والی ویڈیو اور خواہشات کو برانگیختہ کرنے والے گانوں کو سنا کرتے ہیں،اسلامی تقاریر وتلاوت قرآن کی جگہ فحش گانے سنے جارہے ہیں، جلسہ وتقریری پروگراموں کی جگہ ناچ گانے کا پروگرام منعقد کیا جارہا ہے۔اس کے علاوہ مسلم سماج میں چوری ڈکیتی،لوٹ گھسوٹ اور مار

پیٹ سرعام ہورہا ہے،اسلامیات اور اسلامی تعلیمات کا دور دور تک سائبہ نظر نہیں آتا،اور ایک بہت بڑی حقیقت یہ بھی ہے کہ مغرب نے مسلمانوں کو اسلامیات سے دور کرنے کا خواب دیکھا تھا جس کو آج وہ شرمندہ تعبیر ہوتے دیکھ رہا ہے،اگر دولفظوں میں مسلم سماج و معاشرے کی تعریف کی جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ دور مسلم سماج کے اندر جہالت کا دور ہے جس کو ہم ترقی کا نام دے کر خوش فہمی کے شکار ہیں۔

اخلاقی حالات: موجودہ دور میں مسلمانوں کے اخلاق کا اگر تجزیہ کرنے جائیں گے تو آپ یقیناً انگشت بدنداں ہوجائیں گے اور یہ سوچنے پر مجبور ہوجائیں گے کہ کیا یہ وہی محسن انسانیت کے پیروکار ہیں جن کا اخلاق رہتی دنیا کے لیے مشعل ہے؟ اور کیا یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے دنیا کو اخلاق حسنہ کا درس دیا تھا؟ یقیناً آپ تشویش میں پر جائیں گے اور آپ کو گمان بھی نہیں ہوگا کہ مسلمان اخلاقی اعتبار سے اتنے گر جائیں گے۔

موجودہ دور میں مسلمانوں کی جو اخلاقی حالت ہے واقعتاً ناگفتہ بہ ہے،ان کے یہاں ادب واحترام نام کی کوئی چیز ہی نہی ہے،ایک دوسرے کے حقوق تلف کرنے میں لوگ کامیابی سمجھ رہے ہیں ،والدین کو ایک عام فرد کا مرتبہ دیتے ہیں ،باہمی مار پیٹ ،قتل و خونریزی اور مادیت کی خاطر رشتے ناطے کو پامال کرنا ایک عام فعل بن گیا ہوا ہے، چھوٹے بڑے سبھوں کے ساتھ بے ادبی اور بدتمیزی میں کوئی قباحت نہیں، پڑوسی کا کوئی خیال نہیں، کمزوروں پر ظلم کرنا ان کا شیوہ بن گیا ہے اور ہر برا فعل ان کے اخلاقیات میں شامل ہے جبکہ اسلام نے ان تمام چیزوں کے بارے میں سب سے عمدہ تعلیمات پیش کیا ہے لیکن یہ سب صرف اب کتابوں تک محدود ہے، زندگی میں نفاذ ایک قصہ پارینہ بن گیا ہے۔

تعلیمی حالات:

ہندوستان کی سرزمین پر تئیس کڑور سے زائد مسلمانوں کی آبادی ہے اس کے باوجود

مسلمانوں کی تعلیمی حالت کافی خراب ہے اور تعجب خیز بات تو یہ ہے کہ جس مذہب کا آغاز ہی حصول تعلیم کی تلقین سے ہوا اور جس مذہب کے اندر تعلیم حاصل کرنا مذہبی اور قانونی حق ہو اس دین کے ماننے والوں کے اندر تعلیمی میدان سے نا کے برابر رغبت پائی جاتی ہے، لیکن خوش آئند بات یہ ہے کہ اس ملک میں فی الحال مسلمانوں کے اندر تعلیمی بیداری پیدا ہوئی ہے جبکہ آج سے دس سال قبل مسلمانوں کی تعلیمی حالت بہت ہی کمزور تھی ،مسلمان اپنے بچوں اور بچیوں کو اسکول و مدرسہ بھیجنے سے کتراتے تھے چونکہ ان کا یہ ماننا تھا کہ آج لڑکا پڑھ لکھ کر کل اتنا ہی کمائے گا جتنا کہ ایک شہروں میں کام کرنے والا آدمی کماتا ہے لہذا لوگ اپنے بچوں کو اسکول و مدرسے کی جگہ باہر شہروں میں کام کرنے بھیجا کرتے تھے جس کی وجہ سے جہالت عام ہوتی جارہی تھی البتہ ابھی گذشتہ دس سالوں سے مسلمانوں میں تعلیمی بیداری پیدا ہوئی ہے اور یہ شعور پیدا ہوا ہے کہ بچوں اور بچیوں کو تعلیم حاصل کرانا ہی دونوں کی کامیابی ہے جس کی وجہ کر مسلمان تعلیم کے تئیں بیدار مغزی کے عالم میں ہیں اور اس تیزی کے ساتھ مسلمان ترقی کرنے لگے ہیں کہ دشمنان مسلمان کی نیندیں اڑ گئی ہیں اور اس رجحان کو دیکھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پھر سے بہت جلد ہندوستان میں مسلمانوں کا آفتاب طلوع ہوجائیگا، لیکن حکومت ہند کو مسلمانوں کی ترقی ایک آنکھ بھی نہیں بھا رہی ہے لہذا تعلیمی میدان میں قدم رنجاں تاریخ رقم کرنے والے مسلم نوجوانوں کو ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت مسلسل بے جا گرفتار کیا جانے لگا ہے اور جیل میں رکھ کر حصول تعلیم کی عمر ختم ہوجانے کے بعد باعزت بری کیا جارہا ہے۔ دراصل ہندوستان کو ہندوواد بنانے والوں کو یہ خوف لاحق ہے کہ مسلم نوجوان جب تعلیم یافتہ ہوجائیں گے تو ہر محاذ پر وہی ہونگے اور ہماری کمر توڑنے میں ذرا برابر بھی کوتاہی نہیں کریں گے لہٰذا اس سے پہلے کے وہ ہماری کمر توڑے اسی کے کمر کو پہلے ہی کمزور کردی جائے تا کہ نہ رہے بانس نہ باجے بانسری۔ ایک دوسری حقیقت یہ بھی ہے کہ موجودہ حکومت امریکہ واسرائیل کے اشارے کی محتاج ہے اور

اسرائیل وامریکہ شروع ہی سے مسلمانوں کا کھلا دشمن رہا ہے اور وہ کسی دور میں مسلمانوں کو ترقی کرتے دیکھ کر خاموش نہیں بیٹھ سکتا اور یہ انہیں کے اشارے کا نتیجہ ہے کہ تعلیمی میدان میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے والے مسلم نوجوانوں کو غلط الزام میں پھانس کر جیل کے سلاخوں کے پیچھے دھکیلا جارہا ہے اس کیلئے اے ٹی ایس، پولس کی جماعت اور بہت سی خفیہ ایجنسیاں بھی سرگرم عمل ہیں اور ملک کی ہر ریاست میں اس کا جال پھیلا ہوا ہے، مسلم نوجوانوں کو خائف کرنے اور تعلیم سے دور کرنے کی سازش کو کامیابی کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچانے میں اس طرح کی تنظیمیں جٹی ہوئی ہیں، اس کے خلاف ہندوستان وبیرون ہند بھی احتجاج کیا گیا، آواز اٹھائی گئی، غیر معینہ بھوک ہڑتال کیا گیا اس کے باوجود ہندوستانی حکومت پر کوئی اثر نہیں ہوا اور امید بھی نہیں ہے، جو کہ اس بات کی بین دلیل ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ ہورہے ظلم سے حکومت کہیں نہ کہیں اتفاق رکھتی ہے اور شاید یہی سوچ رہی ہے کہ مسلمانوں کو تعلیمی میدان میں آگے نہ آنے دیا جائے۔

عمومی حالات: ہندوستان کی سرزمین پر مسلمانوں کا شاندار ماضی رہا ہے لیکن آزادی کے بعد سے مسلمانوں کیلئے یہ زمین تنگ ہوتی گئی اور موقع بہ موقع مسلمانوں کو ہی نشانہ بنایا گیا، بڑے بڑے فسادات برپا کر کے مسلمانوں کو بے گھر کردیا گیا، ان کے لہو سے ہولیاں کھیلی گئیں، مسلم ماؤں کے بڑھاپے کے سہارے اور نور نظر کو قتل کردیا گیا۔ نئی نویلی دلہن کا سہاگ اجاڑ دیا، بے شمار معصوم بچوں اور بچیوں کو یتیم کردیا گیا اس کے علاوہ ہماری بہنوں کے ساتھ انسانیت سوز جنسی کھیل کھیلا گیا جس کی زندہ جاوید مثال مرادآباد کا فساد، گجرات کا دلدوز سانحہ، حیدرآباد کا کرب ناک واقعہ، آسام کا حیرت انگیز فتنہ ہے جہاں مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا گیا، مساجد ومدارس کو منہدم کردیا گیا، اسلامی کتابوں اور اسلامی مقامات پر بینڈ لگا دیا گیا، ساتھ ہی ساتھ مذہبی آزادی بھی سلب کرلی گئی اور مسلمانوں کی اس طرح کمر توڑ دی گئی کہ اٹھنا محال ہوگیا۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود اب تک دشمنان مسلمان

کا پیٹ نہیں بھرا ہے اور ہر مسلمان کو ناکارہ اور نست ونابود کرنے کی تیاری میں جٹا ہوا ہے اور پورے ہندوستان کو ہندو واد بنانے کی تیاری ہو رہی ہے جس کے لیے بڑی بڑی جماعتیں سرگرم عمل ہیں، جگہ جگہ فرقہ وارانہ فسادات کیے جا رہے ہیں اور مسلمانوں پر مظالم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں اور مسلمان دنیاوی رعنائیوں میں مست ومگن ہیں، انتشار کے شکار ہیں اور اپنے ہونے والے کل کی بربادی کیلئے آج سوچ بھی نہیں رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم پہلے پہل اپنی اصلاح کریں، دین سے اپنے آپ کو جوڑیں، اپنی زندگی میں مکمل اسلامی تعلیمات کو نافذ کریں، دعوۃ الی اللہ کو اپنا نصب العین بناتے ہوئے اتحاد واتفاق کے ساتھ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں اور دشمنان اسلام کا دنداں شکن جواب دینے کیلئے کمر بستہ ہو جائیں اگر ہم ایسا کر لیتے ہیں تو پھر وہ دن دور نہیں جب ہندوستان میں پھر سے ہمارا آفتاب نکل آئے گا اور جب دینی غیرت ومذہبی حمیت سے سرشار ہو کر نکلیں گے تو پوری دنیا میں صرف ہمارا ہی بول بالا ہوگا۔ اللہ ہمیں نیک ارادے کے ساتھ اپنی اصلاح کرنے کی توفیق دے اور صحیح فہم وادراک سے نوازے، آمین۔

☆☆

ہندوستانی مسلمان اور پسماندگی

ذمہ دار کون؟

● ادارہ

کچھ عرصے سے بہار کے وزیر اعلیٰ نتیش کمار گجرات کے نریندر مودی کا نام سنتے ہی طیش میں آجاتے ہیں، وہ بی جے پی کے اتحادی ہیں اور یہ اشارہ کرتے رہے ہیں کہ مودی انہیں وزیر اعظم کے طور پر قبول نہیں ہونگے۔ نتیش کی جماعت جنتا دل یونائیٹڈ اٹل بہاری واجپائی کی وزارت عظمیٰ کے دور سے ہی بی جے پی کی سب سے قریبی اتحادی رہی ہے۔ گودھرا ریلوے اسٹیشن کے نزدیک جب 2002 میں ٹرین کے ایک ڈبے میں انسٹھ کارسیوکوں کو ہلاک کیا گیا تھا اس وقت نتیش کمار واجپائی کی کابینہ میں ریلوے کے وزیر تھے۔ انہوں نے گودھرا کے واقعہ کی الگ سے تحقیقات کرانی بھی ضروری نہیں سمجھی تھی، یہی نہیں فسادات کے بعد بھی وہ وزارت میں برقرار رہے اور ان کی جماعت نے کسی مرحلے پر مودی کے کردار یا ان کی پالیسیوں پر کبھی انگلی نہیں اٹھائی۔

ہندوستان میں اسے ووٹ بینک کی سیاست کہتے ہیں۔ ایک طرف مودی کی طاقت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور دوسری جانب نتیش کی مقبولیت بہار میں تیزی سے گھٹ رہی ہے۔ انہیں مسلمانوں کے ووٹ کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ بدلتے ہوئے حالات میں ووٹ بینک کی ان کی یہ سیاست انہیں سیاسی طور پر کافی مہنگی پڑ سکتی ہے۔

ہندوستان میں سبھی سیاسی جماعتیں مسلمانوں کو ووٹ بینک کے طور پر استعمال کرتی

رہی ہیں۔ملک میں سب سے سیکولر تصور کی جانے والی کمیونسٹ جماعتوں کے تیس برس کے اقتدار میں مغربی بنگال کے مسلمان ہندوستان کے سب سے غریب مسلمان بن کر ابھرے۔کمیونسٹوں نے مسلمانوں کی آبادیوں میں اسکول، کالج، یونیورسٹیز اور جدید ادارے قائم نہیں کیا۔

مسلمانوں کی حمایت سے اقتدار میں آنے والی ممتا بنرجی مساجد کے اماموں کو تنخواہ دینے، مدرسوں کو فنڈ فراہم کرنے اور بنگلہ بولی جانے والی ریاست میں اردو پڑھائے جانے جیسے اقدامات کو ریاست کے کروڑوں مسلمانوں کی تعلیمی، اقتصادی اور سماجی پسماندگی کے خاتمے کا حل بتا رہی ہیں۔اتر پردیش میں وزیر اعلیٰ اکھلیش یادو نے ریاست میں مسلمانوں کے تمام مسائل حل کرنے کے لیے چند سو اردو ٹیچرز مقرر کر دیے ہیں۔یہ الگ بات ہے کہ ان کے والد ملایم سنگھ یادو یا خود انہوں نے مسلم آبادی والے علاقون میں شاید ہی کوئی یونیورسٹی، کالج اور اسکول کھولے ہوں۔مسلمانوں کے مسیحا سمجھے جانے والے لالو پرساد یادو کی کارکردگی ہی ان سبھی جماعتوں میں سب سے اچھی رہی ہے، کیونکہ انہوں نے مسلمانوں کے لیے ہی نہیں کسی کے لیے کچھ نہیں کیا۔

مسلمانوں کے کچھ اپنے مذہبی اور خود ساختہ قسم کے ادارے ہیں جو گزشتہ ساٹھ برس سے مسلمانوں کی نمائندگی کا دعویٰ کرتے رہے ہیں۔یہ تنظیمیں اور ادارے ہندوستان کے مسلمانوں کی کتنی ہمدرد ہیں اس کا اندازہ صرف اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ دینی تنظیمیں کالجز اور یونیورسٹیز میں مسلمانوں کے تعلیم حاصل کرنے کی یہ کہہ کر مخالفت کرتی ہیں کہ یہ غیر اسلامی ہیں۔

مسلم پرسنل لا بورڈ پچاس برس میں خواہ شادی کے لیے ایک ماڈل نکاح نامہ بھی نہ تیار کر سکا ہو، لیکن وہ ہر قومی اور بین الاقوامی معاملات پر اپنی دانشورانہ رائے سے ضرور نوازتا رہا ہے۔پرسنل لا بورڈ تمام بچوں کے لیے تعلیم کو بنیادی حقوق میں شامل کرنے، شادی کے

مجموعه القاسم: جلد پنجم
مسلم مسائل اور اس کا حل

لیے کم سے کم عمر طے کرنے اور شادی کا سرکاری اندراج کرانے جیسے اہم حکومتی اقدامات کی مذہب کے نام پر مخالفت کر چکا ہے۔یہ ان نام نہاد سیاسی جماعتوں کی کارکردگی ہے یا ان مذہبی تنظیموں کے فرسودہ خیالات کہ آج ہندوستان کا مسلمان ملک کی سب سے پسماندہ برادری بن کر کھڑا ہے۔بے رحم مسابقت اور تغیر کے اس دور میں اپنی پسماندگی سے نکلنے کے لیے مسلمانوں کو سب سے پہلے ان سیاسی جماعتوں کے شکنجے سے نکلنا ہوگا۔

سچر کمیٹی نے ملک کے مسلمانوں کی جو حالت بتائی ہے وہ کوئی نیا انکشاف نہیں ہے، یہ حقائق کسی نہ کسی شکل میں پہلے سے عیاں تھے، لیکن یہ ضرور ہے کہ سچر کمیٹی مسلمانوں کی صورتحال کا تجزیہ کرنے کی پہلی مفصل اور منظم کوشش ہے۔اس کمیٹی کی تفصیلات سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ مسلمان ملک کے نئے دلت ہیں۔وہ تعلیم میں، تجارت میں، ملازمت میں، صحت میں غرض زندگی کے ہر شعبے میں ملک کی دوسری برادری سے پیچھے ہیں۔سچر کمیٹی نے نہ صرف ان کی پسماندگی کا تجزیہ کیا ہے بلکہ اپنی رپورٹ کے ایک باب میں اس نے مسلمانوں کے سب سے پسماندہ طبقے کو رزرویشن دینے کی بھی سفارش کی ہے۔مسلمان خود اپنے حقوق سے نا آشنا ہیں، تعلیم اور ملازمت میں جو سہولیات انہیں دی جا چکی ہے وہ انکا بھی فائدہ نہیں اٹھا پائے ہیں۔

مسلمانوں کو تعلیم اور ملازمتوں میں ریزرویشن دینے کی کئی حلقوں کی طرف سے مخالفت کے جائے گی۔سچر کمیٹی نے جب اپنی رپورٹ کے سلسلے میں فوج سے بعض تفصیلات طلب کی تو میڈیا میں ایسا واویلہ مچایا گیا کہ جیسے اس کمیٹی نے بغاوت کا ارتکاب کر دیا ہو۔خود فوج کا رویہ بھی مثبت نہیں تھا اور بی جے پی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ یہ عمل ملک کو تقسیم کرنے کا عمل ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی پسماندگی سمجھنے لیے یہ ضروری ہے کہ پہلے یہ جانا جائے کہ یہاں کے مسلمانوں کا معاشرہ بھی ہندوؤں کی طرح مکمل طور پر ذات پات پر مبنی ہے۔شادی

بیاہ سے لے کر انسانی رشتوں اور برتاؤ تک کا تعین ذات کی بنیاد پر ہوتا ہے۔مسلمانوں کے تمام اہم تعلیمی اداروں اور مذہبی اداروں پر ابتدا سے ہی اعلیٰ ذات کے مسلمانوں کا قبضہ رہا ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں میں تعلیم کے لیے کبھی کوئی تحریک نہیں رہی ہے۔مسلمانوں کے تمام بڑے مذہبی اداروں نے بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر جدید تعلیم کے حصول کی حوصلہ شکنی کی ہے۔ذات پات کے نظام نے صورتحال کو مزید پیچیدہ بنا دیا ہے۔خود مسلمان بھی چھوٹے موٹے کاموں کو تعلیم پر ترجیح دیتے رہے ہیں، لیکن مسلمانوں کے مصائب کے لیے صرف انہیں ہی ذمے دار قرار نہیں دیا جا سکتا۔مسلمانوں کے معاملات ہندوستان میں شجر ممنوعہ کی طرح رہے ہیں۔گزشتہ ساٹھ برسوں میں حکومت نے دانستہ اور منظم طریقہ سے مسلمانون کو نظر انداز کیا ہے۔ جہاں جہاں مسلمانوں کی آبادیاں ہیں ان علاقوں میں اسکول، بینک اور دیگر سرکاری ادارے نہیں کھولے گئے۔ سرکاری ریکارڈ اور میڈیا نے مسلمانوں کے علاقوں کو 'حساس علاقہ' بتایا جاتا ہے۔مسلمانوں کو بینکوں سے عموماً قرضے نہیں مل پاتے۔

سیاسی جماعتیں پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کے لیے مسلمانوں کو مناسب نمائندگی نہیں دیتیں۔سیاست میں عموماً ایسے مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے جو دور جدید کے تقاضوں کے شعور سے نا آشنا تھے۔

دلت رہنما ادت راج کا کہنا ہے کہ مسلمان گزشتہ ڈیڑھ سو برس سے صرف مذہبی اور نزاعی معاملات میں الجھے ہوئے ہیں۔'وہ انتخاب میں اپنی روزی روٹی، تعلیم اور ملازمت کا سوال نہیں اٹھاتے وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ بی جے پی کو کیسے شکست ہو، یہ ایک منفی رجحان ہے'۔ادت راج کا خیال ہے کہ مسلمانوں کو اس طرح کی نفسیات سے باہر آنا ہوگا۔

سماجی امور کے ماہر یوگیندر یادو کا بھی یہ ہی خیال ہے کہ 'مسلمان خود اپنے حقوق سے نا آشنا ہیں، تعلیم اور ملازمت میں جو سہولیات انہیں دی جا چکی ہے وہ ان کا بھی فائدہ نہیں اٹھا

پائے ہیں'۔ ہندوستان تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ پیداوار کے روایتی طریقے بدل رہے ہیں۔ روایتی گھریلو صنعتیں شدید دباؤ سے گزر رہی ہیں۔ آنے والے دنوں میں چھوٹی اکائیوں کی جگہ بڑی کمپنیاں لے لیں گی۔ نئے معاشی نظام میں چھوٹی چھوٹی ملازمت کے لیے بھی تعلیم ایک ضرورت ہوگی۔ اپنی تعلیمی پسماندگی کے سبب مسلمانوں کے لیے پیچیدگیاں اور بڑھیں گی۔ ہندوستان کا مسلمان ایک ایسے مقام پر کھڑا ہے جہاں وہ اب مزید غلطیوں کا متحمل نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ ایک مشکل صورتحال ہے۔ سچر کمیٹی کی رپورٹ حکومت کی طرف سے مسلمانوں کی صورتحال کو سمجھنے کی یقیناً ایک سنجیدہ کوشش ہے۔ اور اس سلسلے میں بعض اقدامات کے پہلے اشارے کیے جا چکے ہیں، لیکن مسلمانوں کو بھی اپنی کمیوں کا تجزیہ کرنا ہوگا اور خود بھی انہیں دور کرنے کے راستے تلاش کرنے ہوں گے۔

☆☆

اخوت، اجتماعیت، اتحاد و یکجہتی
امت مسلمہ کا امتیاز

● پروفیسر دلاور خان رحمانی

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

’’اور (تم) سب مل کر اللہ کی (ہدایت کی) رسی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہنا اور فرقہ فرقہ نہ ہوجانا اور اللہ کی اس مہربانی کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں (ایک دوسرے کی) الفت ڈال دی اور تم اس (اللہ) کی مہربانی سے بھائی بھائی بن گئے اور تم (کفر وجہالت کی وجہ سے) آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ چکے تھے تو اللہ نے تمہیں اس سے بچالیا۔ اس طرح اللہ تمہیں اپنی آیتیں کھول کھول کر سناتا ہے تاکہ تم ہدایت پاجاؤ‘‘ (سورہ آل عمران)

مسلمان جسد واحد کی طرح ایک جسم وجان کی مثال ہیں۔ اسلامی اخوت و بھائی چارہ امن کی اساس اور باہمی ترقی، تحفظ اور بقا کی ضمانت ہے۔ قرآن مجید اور احادیث مبارکہ میں اس پر بہت زور دیا گیا ہے، جیسا کہ مندرجہ بالا آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے کتاب و سنت کو اپنی رسی قرار دیتے ہوئے اسے مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے۔ متحدہ و منظم امت ہی اللہ کی پسند جبکہ فرقہ بندیاں، دھڑے بندیاں، اختلاف وانتشار جہاں اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے وہیں امت مسلمہ کی کمزوری، زبوں حالی اور دوسری قوموں کی غلامی کی علامت۔ مسلمانوں کی عظمت بیان کرتے ہوئے اللہ نے اپنی نعمتِ عظمیٰ کا تذکرہ

فرمایا کہ کچھ عرصہ پہلے تک تمہاری کیفیت کیا تھی، تم قبیلوں اور قوموں میں بٹے ہوئے تھے اور ایک دوسرے کی گردنیں مارتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے رحمت کائنات علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو مبعوث فرماکر قرآن مجید نازل فرمایا، جو رہتی دنیا تک کے لئے باعث رشد و ہدایت اور خیر خواہی کا ذریعہ ہے، اللہ نے اپنی رحمت سے دینی محبت والفت تمہارے دلوں میں ڈال کر ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا۔ یہ اسلام کی برکت ہے کہ تم ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے، وگرنہ تمہاری تنزلی و بربادی تو اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ تم اپنے کفر و جہالت کی وجہ سے جہنم کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ چکے تھے، یعنی ایک طرف تم شرک کی لعنت میں گرفتار ہوکر دائمی عذاب کا شکار ہوکر جہنم میں گرے جارہے تھے تو دوسری جانب باہمی انتشار، نااتفاقی، معمولی باتوں پر نسل در نسل قتل وغارت، بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے اور لوٹ مار کی وجہ سے تمہاری دنیوی زندگی بھی جہنم بن چکی تھی۔ امن وامان اور سلامتی مفقود اور ایک دوسرے کا خوف تم پر مسلط تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں دنیوی واخروی سے نجات عطا فرمائی اور تمہیں بچالیا۔ اللہ تعالیٰ اس طرح تمہیں اپنی نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم اسلامی اخوت کی لڑی میں بندھ کر یکجاں ہوجاؤ اور کفر وضلالت سے دامن چھڑا کر اسلام کی نورانی کرنوں سے اپنے دلوں کی دنیا روشن رکھو جو ہمیشہ راہِ ہدایت کی طرف تمہاری رہنمائی کرتی رہیں گی۔

اسلامی اخوت و بھائی چارہ ایسی عظیم نعمت ہے جو تمام امتیازات مٹا کر اہل ایمان کو یکجان بنادیتی ہے۔ نبی رحمت نے جب مکہ مکرمہ سے ہجرت فرماکر مدینہ منورہ کو اپنا مسکن بنایا اور ستم رسیدہ اہل ایمان کو بھی مدینہ ہجرت کا حکم فرمایا تو تاریخ انسانی کی منفرد مواخات قائم فرمائی اور مہاجرین وانصار کے درمیان ایسا مثالی بھائی چارہ قائم فرمایا جو رہتی دنیا تک کے لئے ایک مثال ہے۔ کل تک ایک دوسرے کی جانوں کے دشمن، آج دوسرے کی جان و مال، عزت وآبرو کے محافظ اور اسلام کے سپاہی بن گئے، ایک دوسرے پر جانیں نچھاور

کرنے لگے۔ ایثار و قربانی کے نادر الوجود واقعات رونما ہونے لگے جو قیامت تک انسانیت کے ماتھے کا جھومر ہیں۔ خود بھوکے سو جاتے، یہاں تک کہ معصوم بچوں کو بھی کھلائے پلائے بغیر سلا دیتے لیکن کوشش یہی ہوتی کہ نبی کریم کا بھیجا ہوا مہمان، میرا دینی بھائی پیٹ بھر کر کھانا کھالے۔ تب ہی تو اللہ تعالیٰ نے ان نفوس قدسیہ کے اس ایثار و محبت کو قرآن مجید میں ہمیشہ کے لئے یادگار بنا دیا۔ ارشاد فرمایا: ''یہ مال ان ہجرت کرنے والے مفلس مسلمانوں کے لئے (بھی) ہیں جو اپنے گھروں اور مالوں سے بے دخل کر دیئے گئے ہیں اور وہ (محض) اللہ تعالیٰ کے فضل و رضامندی کے طلبگار ہیں اور اللہ کے دین اور اس کے رسولؐ کی مدد کرتے ہیں۔ یہی لوگ سچے (مسلمان) ہیں۔ نیز (یہ مال) ان لوگوں کے لئے (بھی) ہے جو ان سے پہلے یعنی مہاجرین کی آمد سے پہلے ہی ایمان لا چکے اور مدینہ میں مقیم ہیں (اور) جو شخص ہجرت کر کے ان کے پاس آجاتا ہے، اس سے محبت کرتے ہیں اور اپنے دلوں میں سے اس چیز سے کوئی تنگی (خلش) نہیں پاتے جو (مہاجرین) کو دی گئی اور (ان کی ایمانی کیفیت تو ایسی ہے کہ) انہیں اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں خواہ وہ خود فاقہ کشی سے دوچار کیوں نہ ہوں اور (حقیقت یہ ہے کہ) جو کوئی اپنے نفس کے بخل سے بچالیا گیا تو ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ (سورۃ الحشر)

اس آیت کریمہ کا شان نزول یہ ہے کہ نبی کریم کی خدمت میں ایک مہمان آئے تو آپ نے صحابہ کرامؓ سے دریافت فرمایا: کوئی ہے جو مہمانداری کرے۔ ایک صحابی ثابت بن قیس انصاریؓ انہیں اپنے گھر مہمان بنا کر لے گئے۔ گھر میں کھانا صرف اتنا ہی تھا کہ ان کے بال بچوں کا گزارہ ہو سکے۔ انہوں نے اپنی بیوی سے کہا کہ بچوں کو کسی بہانے سے بھوکا سلا دو۔ بیوی نے کہا کہ جب میں دسترخوان لگاؤں تو آپ مہمان کے ساتھ بیٹھ جانا، میں کسی ترکیب سے چراغ بجھا دوں گی آپ صرف منہ چلانا اور کھانا نہ کھانا، تاکہ مہمان پیٹ بھر کر کھانا کھالے۔ چنانچہ دونوں نے ایسا ہی کیا۔ مہمان نے پیٹ بھر کر کھایا، جبکہ میاں

بیوی اور بچے بھوکے ہی سو گئے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے پیارے بندے کی یہ ایثار و قربانی پسند آئی کہ قرآن میں اس کا ذکر کر کے قیامت تک کے لئے اسے نشانی بنا دیا۔ (ترمذی)

اسلامی اخوت و بھائی چارہ کی بیشمار مثالیں احادیث میں وارد ہیں۔

جنگ موتہ کے موقع پر صحابہ کرامؓ کا ایثار بھی اسلامی اخوت کی روشن دلیل ہے کہ چھ زخمیوں میں سے کسی نے پہلے پانی پینا گوارا نہ کیا بلکہ خواہش تھی تو یہی کہ میرا بھائی پی لے۔ کیا یہ کیفیت آج ہمارے اندر موجود ہے؟ یہ اسلامی اخوت کی برکت تھی کہ اسلام کا پرچم مشرق و مغرب میں سر بلند ہوا۔ آج ہم ذلت و رسوائی کا شکار کیوں ہیں؟ اگر غور کیا جائے تو حقیقت ظاہر ہوگی کہ ہم فرقہ بندی، قومیت اور علاقائیت میں تقسیم ہو کر کمزور ہو گئے جبکہ اسلام اور پیغمبر اسلامؐ نے تو ہمیں باہمی اخوت و محبت کا درس دیا اور یہی اتحاد امن کی ضامن بن سکتا ہے۔

☆☆

ہندوستانی مسلمانوں کا دشمن کون؟

● ڈاکٹر میم ضاد فضلی

سال 2013 میں تقریبا 10 ریاستوں میں اسمبلی انتخابات ہونے ہیں، جن میں سے تین چھوٹی ریاستوں میں انتخابات کا عمل مکمل ہو چکا ہے، باقی ماندہ ریاستوں میں بھی اوائل اکتوبر تک انتخابات کا عمل مکمل ہونا ہے۔ اس سال انجام پذیر ہونے والے انتخابات کے نتائج جہاں آئندہ 2014 میں ہونے والے عام انتخابات میں یوپی اے، این ڈی اے اور دیگر غیر اتحادی جماعتوں کا مستقبل بھی طے کریں گے، وہیں کانگریس کی غریب دشمن پالیسیوں کے نتیجے میں ٹوٹ چکے ملک کے 80 فیصد باشندوں یعنی غریبوں اور مزدوروں کو اس غریب دشمن جماعت سے اپنا حساب کتاب برابر کرنے کا موقع بھی ملے گا۔ بہر حال ہمیں آج ہندوستان کے اس طبقہ کے حوالے سے گفتگو کرنی ہے جسے نام نہاد سیکولر جماعتیں اپنا زر خرید غلام تصور کرتی ہیں اور انہیں اطمینان رہتا ہے کہ ایک عدد مخلص قائد اور رہنما سے محروم مسلم طبقہ معمولی فرقہ ورانہ فساد کے خوف سے ہی سہم جائے گا اور بھیڑ کے ریوڑ کی طرح صف بستہ ہو کر ان کی جھولی میں اپنے ووٹ ڈالنے پر مجبور ہو جائے گا، آزادی کے بعد ملک بھر میں لگ بھگ انہیں خطوط پر کانگریس بشمول دیگر سیکولر جماعتیں کار بند رہی ہیں۔ زیر نظر مضمون میں کانگریس پارٹی کا جائزہ لیا جا رہا ہے دیگر سیاسی جماعتوں کی حیثیت علاقائی نوعیت کی ہیں، جبکہ کچھ سیاسی جماعتوں کے شعبدہ باز سربراہوں کے فریب کا گھڑا پھوٹ چکا ہے اور ان کی چال بازیوں کو خصوصا مسلم رائے دہندگان نے متعدد بار مواقع

فراہم کر کے بحسن و خوبی سمجھ لیا ہے۔ مثال کے طور پر آج عرش سے فرش پر آ چکے لالو یادو اور رام ولاس پاسوان کے اترے ہوئے چہرے ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ جبکہ ملائم سنگھ یادو کی چکنی چپڑی باتوں اور ان کے صاحبزادے کی بھولی بھالی صورت پر یقین کر کے اتر پردیش کے مسلمان ایک مرتبہ پھر دھوکہ کھا رہے ہیں مگر اب پچھتاوے کا ہوت جب چڑیا چگ گئی کھیت' کے مصداق مسلمانوں کیلئے کف افسوس ملنے کے علاوہ کچھ بھی نہیں بچا ہے۔ کانگریس کا دعویٰ ہے کہ اس کی حیثیت ایک قومی پارٹی کی ہے، لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آج کی تحریر میں صرف کانگریس پارٹی کی بات کی جائے، تا کہ قارئین کو ہماری معروضات کے سمجھنے میں کسی قسم کا جھول محسوس نہ ہو اور مضمون کے گڈمڈ ہونے کا اندیشہ بھی دامن گیر نہ ہو۔ قارئین! ہم 47 سے مسلسل دیکھتے آ رہے ہیں کہ اقلیتوں کے تعلق سے کانگریس پارٹی نے ہمیشہ دوہرا پیمانہ اختیار کیا ہے، مسلمانوں کی ترقی اور فلاح و بہبود کے معاملے میں کانگریس ہمیشہ قول و عمل کے تضاد کا شکار رہی ہے، چاہے وہ صوبائی یا مرکزی ایوانوں میں اقلیتوں کو مناسب نمائندگی دینے کا مسئلہ ہو یا سرکاری اداروں میں ان کیلئے روزگار کی فراہمی کا، یہ لٹی پٹی قوم ہر محاذ پر نظر انداز کی گئی اور اس کی گذارشوں اور مطالبوں کو پائے حقارت سے ٹھکرایا جاتا رہا۔ کانگریس پارٹی میں ہمیشہ فرقہ پرست عناصر کا غلبہ رہا ہے۔ مجھے یاد آتا ہے 30 جنوری 1948 کا وہ بھیانک واقعہ جس کے نتیجے میں بابائے قوم مہاتما گاندھی کو موت کی نیند سلا دیا گیا اور چشم زدن میں پورے ملک کو یتیم کر دیا گیا، میں بتانا یہ چاہ رہا ہوں کہ اگر ایک طرف بابائے قوم مہاتما گاندھی کو قتل کرنے کیلئے آر ایس ایس کی ناپاک ذہنیت لائحہ عمل مرتب کر رہی تھی تو دوسری جانب خود کانگریس میں شامل کچھ انسانیت دشمن عناصر اس منصوبہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں حائل رکاوٹیں دور کرنے کا فریضہ ادا کر رہے تھے۔ بالآخر بابائے قوم قتل کر دئے گئے، اس کے بعد بھی کانگریس میں شامل فرقہ پرست عناصر کی نفرت کی آگ سرد نہیں ہوئی، جواہر لال نہرو سے وابستہ کانگریسی گاندھی کے قاتلوں کو عبرتناک سزا

دلانے کی تگ و دو میں لگے تھے تو کانگریس میں ہی شامل دوسرا طبقہ قاتلوں کو بچانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔ یہ تو رہی انڈین نیشنل کانگریس میں فرقہ پرست عناصر کے غلبہ کی باتیں۔ اب آیئے سرسری طور پر کانگریس پارٹی کے دعوائے مساوات اور کانگریس کا ہاتھ عام آدمی کے ساتھ جیسے نعروں کی حقیقت کا پتہ لگائیں کہ اس نعرے میں کچھ سچائی بھی ہے یا یہ غریبوں کو جذباتی طور سے بلیک میل کرنے کا اجارہ داروں اور سرمایہ کاروں کا منصوبہ بند فریب ہے۔ اس سلسلے میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے کانگریس کی تشکیل اور وجود کے ابتدائی حالات کو جانا جائے، تاکہ کانگریس کے عام آدمی کی پارٹی ہونے کی حقیقت بآسانی سمجھ میں آجائے۔ قارئین! کانگریس کی تشکیل 1885 میں انگریزی داں ہندوستانیوں کے کلب کے طور پر ہوئی تھی۔ کلب کی رکنیت اعلیٰ تعلیم یافتہ رئیسوں زمینداروں اور انگریزی حکومت میں شامل سینئر افسروں تک ہی محدود تھی۔ اس دعویٰ کو احمقانہ تاویل ہی کہا جائے گا کہ کانگریس پارٹی میں امیر و غریب اور اعلیٰ و ادنیٰ کو بلا امتیاز مقام حاصل تھا۔ کلب والے ماحول میں غریبوں کی شمولیت کی باتیں اپنے آپ میں خود ہی ایک مذاق ہے۔ یہ تصور سے بھی بالاتر ہے کہ جس تنظیم کی تشکیل روسائے وقت کی تفریح طبع کیلئے ہوئی ہو وہاں غریبوں مزدوروں کو کھڑا ہونے کی اجازت رہی ہوگی؟ جبکہ تاریخی صداقت یہ ہے کہ اس وقت جاگیردارنہ اور زمیندارانہ ماحول میں کمزوروں بے بسوں اور مفلوک الحال انسانوں کو پالتو جانوروں سے بھی ہیچ سمجھا جاتا تھا۔ یہاں ہمارے پاس ان حالات کا تجزیہ پیش کرنے کی گنجائش نہیں ہے، ہم تو صرف اس پہلو پر روشنی ڈالنا ضروری سمجھتے ہیں جو ہماری آج کی تحریر کا مقصد ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ کانگریس کا قیام امرائے ہند کی تفریح طبع کیلئے ایک کلب کی شکل میں ہوا تھا، وہاں غریبوں کے داخلے کے دعوے کو تاریخ کے ساتھ عصمت دری کے علاوہ اور کہا بھی کیا جاسکتا ہے۔ اگر قسمت سے کسی ایک آدھ کو اس کلب میں شرکت کا زرّیں موقع مل گیا ہو تو یہ ممکن ہے، مگر مجموعی طور سے اس

جماعت پر غلبہ امرائے ہند کا ہی رہا ہے۔ امیروں کو غریبوں مزدوروں سے ہمیشہ نفرت رہی ہے، ہمیشہ دھنوانوں نے غریبوں کی ہڈیوں کا سرمہ بنا کر اپنی آنکھوں کو زینت بخشی ہے۔

آج مسلمانوں کی تباہی و بربادی اور پسماندگی کا جو رونا رویا جا رہا ہے اور مسلمانوں کی ترقی کیلئے دارالحکومت دہلی سمیت ملک کے بڑے شہروں کے فائیو اسٹار ہوٹلوں میں نام نہاد ملی رہنماؤں کے ذریعہ جو مجلسیں آراستہ کی جا رہی ہیں اس کی حقیقت بس اتنی ہے کہ یہ ساری میٹنگیں خود کانگریس یا کسی نہ کسی سیکولر جماعت کی عنایتوں کے طفیل منعقد ہوتی ہیں۔ اس میں شرکت کرنے والے عناصر کرایے پر بلائے گئے ہوتے ہیں اور میٹنگوں کے کنوینز وہ لوگ ہوتے ہیں جو کئی پشتوں سے مسلم اقلیتوں کیلئے دیے جانے والے فنڈ کو اپنا موروثی مال سمجھ رہے ہیں۔ اگر آپ سروے کریں تو اندازہ ہوگا کہ ہندوستان کے 30 کروڑ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کیلئے دی جانے والی خطیر رقم مصیبت زدہ، بے بس اور انتہائی مفلوک الحال غریبوں کی ترقی اور بھلائی میں استعمال ہونے کی بجائے چند جاہ پرست صاحب جبہ و دستار کی جیبوں میں چلی جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ ملک کی مسلم اقلیتوں کی 98 فیصد آبادی کی پسماندگی دور کرنے کیلئے دی جانے والی مرکز کی رقم پر صرف ان 2 فیصد سفید پوش مسلم نما ایمان فروشوں کی اجارہ داری ہے جن کے آباء و اجداد کل غلامی کے عبرتناک دور میں بھی انگریزی آقاؤں کی مہربانیوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور آزادی کے بعد بھی ملک میں اقلیتوں کی فلاح و ترقی سے متعلق تمام اسکیمیں اور رقوم انہیں مٹھیوں میں قید ہیں۔ بعد کے ادوار میں چند دوسرے مسلم خاندان بھی لٹیروں کے اس قافلہ میں شامل ہوگئے، مگر ان کی تعداد آٹے میں نمک برابر ہے۔ اگر آپ عقیدت اور اندھی ارادت مندی کی عینک اتار کر حالات کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوگا کہ ملک بھر میں جن خاندانوں کے چشم و چراغ آج ہندوستان کے مسلمانوں کی بے سروسامانی اور پسماندگی کا رونا رو رہے ہیں انہیں اور ان کے اجداد کو شاہانہ اور پر تعیش زندگی ہمیشہ حاصل رہی ہے۔ تقسیم وطن کی قیامت

خیزی میں بھی وہ مامون ومحفوظ رہے اور 47 سے لے کر آج تک ملک بھر میں برپا ہونے والے فرقہ ورانہ فسادات میں بھی مسلمانوں کا یہ طبقہ اپنی تمام عیش وعشرت کیساتھ حکومت کی پناہ میں بے خوف ومامون رہا اور مسلمانوں پر ٹوٹنے والی ہر قیامت کے بعد منصوبہ بند طریقے سے انہیں مظلوموں کی لاشوں پر سیاست کرنے کا بھرپور موقع فراہم کیا گیا۔ یہ سارا کھیل نام نہاد سیکولر جماعت یعنی کانگریس کے ذریعہ کئی دہائی سے کھیلا جارہا ہے۔ کانگریس پارٹی میں شامل مسلم لیڈروں کو سب کچھ دیکھتے ہوئے خاموش رہنے کی ہدایت ہے، یعنی انہیں اس سے قطعی مطلب نہیں ہونا چاہئے کہ ان کی پارٹی میں موجود فرقہ پرست عناصر کیا کر رہے ہیں اگر انہیں شاہانہ ٹھاٹ باٹ اور عیش وعشرت سے مالامال زندگی کی ضمانت چاہئے تو وہ بس خاموش رہیں اور تمام فرقہ وارانہ فسادات کے بعد ایک ایجنٹ کی طرح پارٹی کی کالی شکل پر ملمع سازی کا کرتب دکھاتے ہوئے مسلمانوں کو الو بناتے رہیں۔

قارئین! میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ ملک کی اقلیتوں کی فلاح و بہبود کیلئے مرتب کردہ تمام اسکیموں پر پورے ہندوستان سے جمع کر کے کانگریس نے محض چند مسلم خاندانوں کا مکمل تسلط قائم کر دیا ہے تاکہ ملک بھر کے مسلمانوں کی بہتری کیلئے کسی بھی قسم کے اقدامات کی عملی کوشش نہ کرنی پڑے، بلکہ انہیں چند خاندانوں کو بہرہ مند کر کے پورے ملک کے مسلمانوں کی واہ واہی بٹور لی جائے۔ اگر کانگریس پارٹی اپنے قول وعمل میں تضاد کا شکار نہ ہوتی تو ان خاندانوں کے چشم وچراغ کے آگے ایسے مسلم لیڈروں کی تلاش بھی کی جاتی جو خاندانی اعتبار سے چاندی کا کٹورا منھ میں لے کر پیدا نہ ہوئے ہوں، بلکہ انہوں نے اپنی قوم کو درپیش مصائب وآلام کا بذات خود سامنا کیا ہو اور قوم کی بھلائی وخیر خواہی کے نیک جذبہ نے انہیں عملی طور پر سرگرم ہونے کیلئے بے چین وبے قرار کر رکھا ہو۔ مگر ملت اسلامیہ ہند کا المیہ یہ ہے کہ یہاں مسلمانوں کی اکثریت ہمیشہ غربت وافلاس کا سامان رہی ہے۔ بادشاہوں اور نوابوں کے دور میں بھی مٹھی بھر زمین داروں نے غریب ہندوستانی

مسلمانوں کا لہو اپنے لئے حلال کر رکھا تھا اور آزادی کے بعد دونوں طرف انہیں مٹھی بھر خاندانوں کے ہاتھوں میں کروڑوں مسلمانوں کی تقدیر تھمادی گئی۔ تقسیم شدہ ہندوستان کے دونوں جانب دیکھ لیں اگر اس کنبہ کے کچھ فرد ہندوستانی سیاست میں سرگرم رہے تو اسی خاندان کے کچھ حصے نے سرحد پار جا کر سیاسی دکانیں آراستہ کر لیں اور دنیا کی تمام ترقیات کو صرف اپنے لئے فرض کر کے بیٹھ گئے۔ ان حالات میں غیور قوم کے ایسے نوجوانوں کو میدان میں آنے کی ضرورت ہے جنہیں صدقہ خیرات کی دولت وراثت میں نہ ملی ہو بلکہ ان کا خمیر غربت کی بھٹی سے اٹھا ہو اور انہوں نے محنت ومزدوری کر کے حلال کمائی کے ذریعہ اپنی حالت سدھارنے میں کامیابی حاصل کی ہو۔ اس طبقہ کے نوجوانوں اور جیالوں پر اب فرض ہو گیا ہے کہ جرات مندانہ طریقے سے میدان میں اتریں اور چھان بین کر کے ان خاندانوں کے چہروں کو بے نقاب کریں جنہوں نے مسلمانوں کی فلاح سے متعلق منصوبوں کو سرکاری ٹھیکہ کے طور پر حاصل کر رکھا ہے۔

(مضمون نگار صحافی اور ریکس طبی میگزین کے ایڈیٹر ہیں۔)

☆☆

تمام مسائل کا صرف ایک حل

● محمد الیاس ندوی بھٹکلی

اس وقت ہمارے ملک ہندوستان میں شاید ہی کوئی ہفتہ ایسا خالی جاتا ہو جس میں کسی بھی ادارہ یا تنظیم کی طرف سے مسلمانانِ ہند کے موجودہ مسائل پر کوئی کل ہند سمینار، کانفرنس ،سمپوزیم یا مشاورتی نشست نہ ہوتی ہو، اسی طرح کوئی دن ایسا نہیں جاتا جس میں قومی سطح کے اخبار میں کسی مسلمان لیڈر، عالم دین یا ایسے غیر مسلم دانشور کا انٹرویو شائع نہ ہوتا ہو جس کو مسلمانوں سے ہمدردی ہو اور اس کی گفتگو کا محور مسلمانوں کے موجودہ مسائل اور اس کا حل نہ ہو، ان سب کا خلاصہ ہم مندرجہ ذیل مسائل کی صورت میں بیان کر سکتے ہیں:

’’مسلمانوں کا تعلیمی میدان میں پچھڑا پن، اقتصادی معاشی بدحالی، سرکاری ملازمتوں میں کمی، ملکی سطح پر سیاسی میدان میں کم ہونے والی نمائندگی اور پارلیمنٹ واسمبلیوں میں ان کی گھٹتی تعداد، وقفہ وقفہ سے ہونے والے فسادات اور محکمہ پولس کی طرف سے ہونے والی ہراسانی، مسلم نوجوانوں کی آئے روز کی دھڑ پکڑ، بے بنیاد الزامات کے ذریعہ ان کی گرفتاری، خود عدلیہ کی طرف سے مسلمانوں کے حق میں ہونے والی ناانصافی وغلط فیصلے اور ان کے عائلی مسائل یعنی پرسنل لاء وغیرہ میں آئے روز مداخلت وغیرہ وغیرہ۔‘‘

ان سب مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے ہم تھوڑی دیر کے لیے ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ ان سب مسائل کے پیدا کرنے میں جن لوگوں کا ہاتھ ہے وہ ہمیشہ اس طرح وقفہ وقفہ سے ہمیں کیوں پریشان کرنا اور دینی/ سماجی/ سیاسی/ معاشی اور تعلیمی میدان میں ہمیشہ

ہمیں زک پہنچانا چاہتے ہیں، اس کے کیا محرکات اور اسباب ہیں اور ان کی اس ذہنیت کے پیچھے کیا عوامل کارفرما ہیں؟

کیا اگر ہم اپنی سیاسی طاقت کے زور پر یا احتجاج کے ذریعہ حکومت وقت کو مجبور کر کے اپنے جائز مطالبات منوالیں، اپنی منصوبہ بندی کے ذریعہ ملت کی ان اقتصادی وتعلیمی کمیوں کو دور کر لیں، ہمیں اسمبلیوں میں اپنی آبادی کے اعتبار سے ریزرویشن یا الیکشن کے ذریعہ نمائندگی مل جائے یعنی ساڑھے پانچ سو ممبران پارلیمنٹ میں ۲۸/ کے بجائے سو مسلم ممبران پارلیمنٹ پہنچ جائیں، حکومت ۲۰/ فیصد ریزرویشن سرکاری ملازمتوں اور ملکی اداروں میں ہمارے لیے مختص کر دے، مسلم تعلیمی تناسب ۵۵ فیصد کے بجائے سو فیصد ہو جائے، مسلمان پورے ملک میں معاشی میدان میں ترقی کی آخری منزل کو پا جائیں اور ہماری پسماندگی کا خاتمہ ہو جائے، پورے ملک کی جیلوں سے ہمارے مسلم نوجوان رہا ہو جائیں اور عدالتوں میں ہمارے خلاف ہونے والے تمام فیصلوں کو حکومت پارلیمنٹ میں نیا قانون بنا کر رد کر دے، غرض یہ کہ بالفرض اگر یہ ہمارے تمام معاشی/تعلیمی/ سماجی/ سیاسی اور دینی مسائل حل ہو جائیں تو کیا آپ کو اور ہمیں اس بات کا اطمینان رہے گا کہ ۶/ ۵ سال کے بعد ان فرقہ پرست ذہنیت کے حامل سرکاری افسران اور دیگر برادران وطن کی طرف سے دوبارہ ہمیں پریشان کرنے یا نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی جائے گی یا پھر کسی اور چور دروازہ سے ہمارے عائلی قوانین میں مداخلت اور نئی مسلم نسل کو ذہنی طور پر پریشان کرنے اور سیاسی اور تعلیمی ومعاشی میدان میں ہم کو پہلے سے زیادہ کمزور کرنے کی کوشش نہیں کی جائے گی؟

اس کا جواب یہی ہے کہ ہمارے ان سب مسائل کے حل ہونے کے باوجود ملک کے بڑے مناصب پر فائز ہمارے فرقہ پرست یہ برادران وطن جن کے ہاتھوں درحقیقت ملک کی زمام ہے پہلے سے زیادہ ہمارے خلاف منصوبہ بنانے میں لگ جائیں گے اور ان کا غیظ وغضب ہمارے خلاف پہلے سے زیادہ ہو جائے گا، اس لیے کہ ان کو جس بنیاد پر ہم سے

نفرت اور وحشت تھی اس کا ازالہ نہیں ہوا اور جن عوامل کی وجہ سے وہ ہم سے بدظن سے تھے اس کا کوئی خاتمہ نہیں ہوا، اس کی مثال ویسے ہی ہے جیسے کسی مریض کے سر درد یا بخار کو ختم کرنے کیلئے نیم حکیم یہ نہ معلوم کرے کہ مریض اس تکلیف میں کس وجہ سے مبتلا ہے اور وہ اس کے محرکات کو جانے بغیر صرف بخار یا سر درد کا علاج کر دے، نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسرے دن سر درد ختم ہونے کے بعد پھر کمر میں درد شروع ہوگا، بخار کے جانے کے بعد سردی اور زکام کا آغاز ہوگا، کامیاب حکیم وہی ہے جس کو اس نتیجے میں دیر نہ لگے کہ اس کے پیٹ کی خرابی کی وجہ سے ہی یہ سب بیماریاں اس کو لاحق ہو رہی ہیں، اس لئے اس کا صحیح علاج یہی ہے کہ پیٹ کی خرابی کا ازالہ کیا جائے تا کہ آنے والی تمام بیماریوں کا خاتمہ ہو سکے۔

اسی طرح آج ہمارا حال ہے کہ ہم مسائل کو تو حل کرنے پر اپنی توجہ مبذول کر رہے ہیں، لیکن یہ مسائل جن عوامل اور اسباب کی بناء پر پیدا ہوئے ہیں اس کی طرف ہمارا ذہن نہیں جا رہا ہے۔

اس ملک میں ہمارے ان سب مسائل کا جو اس وقت ہمیں درپیش ہیں اگر سنجیدگی سے تجزیہ کیا جائے تو اس کے پس پردہ صرف ایک محرک نظر آتا ہے اور وہ اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے ان کے دلوں میں موجود خدشات، شبہات اور غلط فہمیاں ہیں، اگر اس پر ہم سنجیدگی سے توجہ دیں اور ایک کامیاب حکیم کی طرح اصل مرض کی تشخیص کرتے ہوئے اس کے ازالہ کی کوشش کریں تو سرے سے ہمارے ان سب مسائل ہی کا خاتمہ ہو جائے، اس لیے کہ عالمی سطح پر اس وقت ناگفتہ بہ حالات کے باوجود دعوتی اعتبار سے دیگر خطوں بلکہ اکثر مسلم ممالک کے مقابلہ میں ہندوستان کے حالات نہ صرف غنیمت بلکہ بہت بہتر ہیں جسکی ہمیں قدر کرنی چاہیے اور دعوتی نقطہ نظر سے اس سے بھر پور فائدہ اٹھانا چاہیے، اس لئے کہ اب بھی الحمدللہ برادران وطن کی اکثریت اسلام کے تعلق سے بدظن ہونے سے محفوظ ہے اور ہماری تھوڑی سی کوشش سے ہی اسلام کے حق میں اس کے اچھے اثرات ظہور پذیر ہو سکتے ہیں۔

ہمیں جسم کی مختلف ظاہری بیماریوں کا علاج کرنے کے بجائے بدن میں پہنچنے والے اس مرض کے ازالہ کی کوشش کرنی چاہئے جس کی وجہ سے آئے دن نت نئے امراض کی طرح امت مسلمہ کے سامنے اس طرح کے مسائل آ رہے ہیں، ہمیں حکمت عملی، خیر خواہی اور ہمدردی کے جذبہ کے ساتھ اپنے برادران وطن تک اس دعوت کو پہنچانا چاہئے جس میں خود ان کی ہمیشہ ہمیشہ کی کامیابی مضمر ہے، جدید ترقیات کی روشنی میں اسلام کی حقانیت و ابدیت کو ثابت کرنا اس وقت جتنا آسان ہے ماضی کی تاریخ میں کبھی اتنا آسان نہیں تھا، اسی طرح ہمیں دعوت کے میدان میں جدید وسائل واسباب کا بھی شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے بھر پور استعمال کرنا چاہئے اور اپنے ان برادران انسانیت تک بھی توحید و رسالت اور آخرت کے دلائل پہنچانے چاہئے جو کسی وجہ سے نہ ہمارے پاس آ رہے ہیں اور خاص حالات کی وجہ سے ہم بھی ان تک نہیں پہنچ پا رہے ہیں، آپ کہیں گے کہ نہ ہم ان کے پاس جا سکتے ہیں اور نہ وہ ہمارے پاس آ رہے ہیں پھر ان تک اپنی بات پہنچانے کا کون سا طریقہ رہ جاتا ہے، ہم نے اعزاز دے کر اپنا پیغام سنانے کے لئے اپنے جلسوں میں ان کو مدعو کیا، وہ نہیں آئے، ہم نے ان تک قرآن پہنچانا چاہا، انہوں اس کو قبول نہیں کیا، ہم نے پیام حق ان کو سنانا چاہا، وہ سننے کے لئے تیار نہیں ہوئے لیکن آپ کے ان سب دلائل کے باوجود ہمیں اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس جدید ٹیکنالوجی کے دور میں ہم ان کے پاس گئے بغیر بھی ان تک اپنا پیغام پہنچا سکتے ہیں، ان کے نہ چاہتے ہوئے بھی اسلام کی حقانیت ان کی نظروں سے گذار سکتے ہیں اور غیر محسوس طریقہ پر بھی اللہ کا پیغام ان کو سننے پر مجبور کیا جا سکتا ہے، مثلاً ایکنئی جگہ ہم دوکان لگاتے ہیں، کیا دوکان کے نہ چلنے پر دو تین ماہ کے اندر ہی اپنی دوکان بند کر دیتے ہیں؟ نہیں بلکہ ہم واقعی اگر تاجر ہیں تو پہلے مرحلے میں یہ سوچتے ہیں کہ ممکن ہے اسٹاف نااہل ہے، اس کو تبدیل کیا جاتا ہے، پھر بھی فائدہ نہیں ہوتا تو سوچتے ہیں شاید دوکان کا باہری منظر اور اندر کا فرنیچر گاہکوں کو ترغیب دلانے میں ناکام ہے، اس کو

بھی تبدیل کرتے ہیں، پھر بھی گاہک نہیں آتے تو دوکان کا ایٹم یعنی سامان ہی بدل دیتے ہیں، سال بھر کی کوششوں کے باوجود بھی جب مثبت اثرات نظر نہیں آتے تو دوکان ہی کو اس جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دیتے ہیں، ان سب کوششوں کا بھی جب اثر نظر نہیں آتا تو جدید اور نئے تشہیری اسباب اختیار کرتے ہیں، یہاں تک کہ ایک دن وہ آجاتا ہے کہ رزاق حقیقی آپ کے صبر وتحمل سے خوش ہوکر کاروبار میں اتنی ترقی سے نوازتے ہیں کہ آپ خود حیرت میں رہ جاتے ہیں لیکن افسوس ہمارا یہی دماغ جو تجارت میں نت نئے تجربات کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے دعوت کے میدان میں پرانے تجربات کے علاوہ کچھ نئے تجربات اور حکمت کے ساتھ اس میدان میں کچھ نئے اسباب کو اختیار کرنے کے متعلق سوچنا بھی گوارہ نہیں کرتا، اگر تجارت کی طرح ہمارا دل ودماغ بھی دعوت کے میدان میں استعمال ہونے لگے تو چند ہی سالوں میں ہمارے اس ملک کی جو فضا ہوگی وہ نہ صرف مسرت آمیز بلکہ حد سے زیادہ خوش کن ہوگی، برادران وطن کی نئی نسل کو جو اسکولوں اور کالجوں میں زیر تعلیم ہے ابھی سے منصوبہ بندی کے ساتھ اسلام سے قریب کرنے کی کوشش کی جائے تو صرف دس سال کے بعد اس برصغیر کی اسلام کے حق میں جو پرامن فضا ہوگی وہ تصور سے زیادہ حیرت انگیز ہوگی، اپنے اس دعوتی فریضہ کی ادائیگی کے بغیر ہمیں اس ملک میں اپنے برادران وطن کی طرف سے اپنے اوپر ہونے والے ناگہانی مظالم کے باوجود اللہ تعالی کی مدد ونصرت کی امید نہیں رکھنی چاہئے، اس لئے کہ انسانوں کی نظروں میں تو وہ ظالم اور ہم مظلوم ہیں لیکن ان تک اسلام کی دعوت اور توحید کا پیغام نہ پہنچانے کی وجہ سے اللہ تعالی کے پاس وہ مظلوم اور ہم ظالم ہیں اور اس دعوتی فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی کی تلافی کے بغیر ہم اللہ رب العزت کی مدد کے مستحق نہیں بن سکتے۔

☆☆

مسلمانوں میں اتحاد کا فقدان

اسباب و علاج

● محمد ساجد رضا مصباحی

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ اتحاد واتفاق باعث خیر وبرکت اور اجتماعی عروج وارتقاء کا موثر ترین ذریعہ ہے، جبکہ افتراق وانتشار، تباہی وبربادی، غربت وافلاس کا پیش خیمہ ہے۔ تاریخ عالم کے مطالعے سے یہ بات پوری طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ ہر دور اور ہر زمانے میں وہی قومیں اپنی عظمت وسطوت کے پرچم لہراتی ہیں جنہوں نے آپسی بغض وعناد اور اختلاف وانتشار سے دور رہ کر اپنی پوری توانائی ملکی، ملی، سماجی اور سیاسی اصلاح میں صرف کی۔ اس کے برعکس وہ قومیں جو خانہ جنگی کا شکار ہوکر الگ الگ ٹولیوں میں بٹ گئیں انہیں زندگی کے ہر شعبے میں شکست وریخت کا سامنا کرنا پڑا اور زندگی کے ہر شعبے میں انہیں ناکامی ونامرادی ہی ہاتھ آئی۔

عالمی منظرنامے میں مسلمانوں کی موجودہ صورتحال کسی بھی صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ مسلمان معاشیات، اقتصادیات، سیاسیات بلکہ زندگی کے تمام اہم شعبوں میں تشویش ناک حد تک پچھڑتے جارہے ہیں۔ عالمی تجارتی منڈیوں میں ان کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر ہوتی جارہی ہے۔ آپس کے اختلاف وانتشار نے انہیں پوری طرح کھوکھلا کر ڈالا ہے۔ تمام تر معدنی ذخائر پر قبضہ ہونے کے باوجود زندگی کے تمام شعبوں میں دوسروں کے دست نگر بنے ہوئے ہیں۔ مغربی ممالک کی چاپلوسی کا جذبہ اس قدر غالب ہوچکا ہے کہ

ہمارے سیاسی قائدین اسلامی ممالک کی تباہی و بربادی کا تماشا نہایت خاموشی کے ساتھ دیکھ کر مغربی ممالک کے ساتھ اپنی وفاداری کا ثبوت پیش کررہے ہیں۔سقوط بغداد اور افغانستان کی تباہی اس کی واضح مثالیں ہیں۔آخر تمام اسلامی حکومتیں اپنے سیاسی و مذہبی حریفوں کے خلاف کیوں متحد نہیں ہوجاتیں؟ انما المومنون اخوۃ کے اسلامی درس کو کیوں فراموش کردیا گیا؟ آخر یہ رشتہ اخوت کب کام آئے گا؟

مخالفین اس وقت اپنی پوری توانائی اس مقصد کے لئے صرف کررہے ہیں کہ مسلمانوں میں آپسی اتحاد واتفاق کے ہر ممکن طریقے کو روکا جائے اور انہیں مسلکی ومشربی مسائل میں اس قدر الجھادیا جائے کہ سیاسی، سماجی اور معاشی واقتصادی استحکام کا موقع ہی نہ مل سکے۔اپنے اس مقصد کے حصول کے لئے وہ وقتاً فوقتاً نئے نئے شوشے چھوڑتے رہتے ہیں۔ہمارے سیاسی قائدین مخالفین کی اس پالیسی کو ناکام بنانے کے لئے موثر لائحہ عمل تیار کرنے کے بجائے دانستہ یا نادانستہ اس سے صرف نظر کررہے ہیں۔بلاشبہ یہ غفلت مستقبل میں ہمارے لئے مزید مسائل پیدا کرسکتی ہے۔

مسلمانوں کو آپسی اختلاف وانتشار کی تشویش ناک صورتحال سے نمٹنے کے لئے آپسی مذاکرات اور افہام وتفہیم کے ساتھ ساتھ قرآنی اور اسلامی اصولوں پر عمل پیرا ہونا بھی ضروری ہے۔اسلام نے ہر موڑ پر فرد پر جماعت کو ترجیح دی ہے۔انفرادیت کے بجائے اجتماعیت کو باعث فتح ونصرت قرار دیا ہے۔فرمان رسالت ہے:

'اللہ تعالیٰ کی حمایت جماعت کے ساتھ ہے۔'

اتبعوا السواد الاعظم ' وارکعو مع الراکعین

اوران جیسے دوسرے احکام سے ہمیں اجتماعیت کا واضح درس ملتا ہے۔

اسلامی سماج ومعاشرے میں اتحاد واتفاق کی فضا اسی وقت قائم ہوسکتی ہے جب ہمارا مطمع نظر مادیت کے بجائے روحانیت اور حصول دنیا کے بجائے دین کی ترویج واشاعت

ہو۔آپسی بغض وعناد اور بے جا مسلکی ومشربی تعصّبات سے بالاتر ہوکر ہم ایمانی رشتہ اخوت کے بندھن میں بندھ جائیں اور ایک دوسرے کے تعلق سے اپنے دل میں دردمندانہ جذبہ پیدا کریں۔

لیکن آج حالات نہایت ناگفتہ بہ ہوچکے ہیں۔خلوص وللّٰہیت بہت حد تک رخصت ہوچکی ہے۔آج ذاتی مفادات کے حصول کے لئے جماعت کا بڑے سے بڑا نقصان بھی بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرلیا جاتا ہے۔بعض جاہ پرست افراد دنیا طلبی کی خاطر ہمیشہ مشربی اختلافات کو ہوا دیتے رہتے ہیں۔انہیں جماعت کا اتحاد واتفاق ایک آنکھ نہیں بھاتا۔اختلاف وانتشار کی آگ بھڑکانے کے لئے اپنی ذہنی وفکری توانائیاں صرف کررہے ہیں۔ہمیں ایسے افراد کو نگاہ میں رکھ کر کیفر کردار تک پہنچانا ہوگا تاکہ ہماری جماعت مزید تباہی وبربادی سے محفوظ رہ سکے۔

اتحاد واتفاق کی قوت کا اندازہ چند برسوں پہلے رونما ہونے والے ڈنمارک کے حادثے سے لگایا جاسکتا ہے۔جب وہاں کے ایک گستاخ کارٹونسٹ نے رسول اکرم ﷺ کا اہانت آمیز کارٹون بنا کر اخبارات میں شائع کیا تھا۔پھر عالم اسلام سے پے در پے شدید احتجاجات کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا اور متفقہ طور پر ڈنمارک کی مصنوعات کا بائیکاٹ کردیا گیا تھا۔نتیجہ کے طور پر ڈنمارک کی معیشت تباہ وبرباد ہونے لگی تھی۔آخرکار ڈنمارک حکومت کو لاچار ومجبور ہوکر عالم اسلام سے معافی طلب کرنی پڑی تھی اور اعلانیہ طور پر اپنی غلطی کا اعتراف کرنا پڑا تھا۔یقیناً یہ اعتراف مسلمانوں کے آپسی اتحاد ہی کا نتیجہ تھا۔آج بھی اگر قوم مسلم آپس میں اتحاد واتفاق کی فضا قائم کرکے ایک دوسرے کے دست وبازو بن جائیں تو اپنی عظمت رفتہ کی بازیابی میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔

☆☆

مسلم نوجوانوں کی بے روزگاری کے اسباب

ایک سرسری جائزہ

● رضی احمد

آزاد ہندوستان میں جب مسلمانوں نے خمارِ شب کی سرگرانی سے ہلکے ہوکر آنکھیں کھولیں تو انہوں نے زمین وآسمان کو بدلا ہوا پایا۔ چاروں طرف ایک ایسا بھیانک اندھیرا چھایا ہوا تھا کہ انہیں راہ تو کیا دکھائی دیتا ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دے رہا تھا۔ ایسے اندھیرے میں نہ دوستوں کی تمیز رہ گئی تھی نہ دشمنوں کی پہچان، اس وقت تقسیم کے لازمی نتیجے سے عہدہ برآ ہونا مسلمانوں کے لئے کچھ آسان نہیں رہ گیا تھا۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب اپنے بے گانے ہوگئے تھے اور جنہیں وہ کل تک غیر سمجھتے تھے وہ کھل کر غیریت پر اتر آئے تھے۔

اگر ہم تقسیم کے فوراً بعد کے برسوں کا ٹھنڈے دل سے مطالعہ کریں تو محسوس ہوگا کہ ان دنوں مسلمانوں کو ہندوستانی قوم کا ایک ایسا مفلوج عضو سمجھ کر نظر انداز کیا جارہا تھا، جسے جڑ سے کاٹ پھینکنا آسان نہیں ہوتا اور اسے باقی رکھنے میں کوئی فائدہ بھی نظر نہیں آتا، لیکن وقت ہر زخم کو بھر دیتا ہے اور مصائب آہستہ آہستہ خود درد کا درماں بن جاتے ہیں۔ مسلمان ایک دہے تک حد سے زیادہ دشوار حالات اور بے چینی کی حالت میں رہا اور پھر رفتہ رفتہ قدرے سکون کی زندگی بسر کرنے لگا، مگر صدیوں تک محکومی کی زندگی بسر کرنے والے برادرانِ وطن کے دلوں میں موجود بدلے کی چنگاری ابھی بجھی نہیں ہے، وہ کچوکے لگاتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آزادیٔ وطن کے 65 سال بعد بھی سرکاری محکموں میں مسلمانوں

کی نمائندگی قابل افسوس حد تک کم ہے۔ برادرانِ وطن کا خاص کر اعلیٰ طبقہ آج بھی مسلمانوں کو تعصب اور نفرت کی نظر سے ہی دیکھتا ہے۔ بھلا ہو ووٹ کی گندی سیاست کا کہ آٹے میں نمک کے برابر ہی سہی مسلمان سرکاری ملازمتوں میں نظر آتے ہیں۔

دراصل کسی ملک میں مسلمانوں کی سیاسی ومعاشی قوت کا زوال تاریخ میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تنزل اور انحطاط کی ایسی مثالیں بے شمار ہیں لیکن ہندوستان میں مسلم دورِ حکومت کے اختتام کی بنیادی اہمیت اس حقیقت میں پوشیدہ ہے اور اسلامی تاریخ میں شاید اس کی کوئی نظیر بھی نہیں مل سکے گی کہ 1857 کے بعد مسلمان اپنے سابقہ محکومین کو نہ صرف اپنے مساوی بلکہ مدمقابل کی حیثیت سے تسلیم کرنے پر مجبور تھے۔ انگریزوں کی آمد کے بعد مواقع روزگار کے جو بھی محدود امکانات تھے ان میں انہیں اپنی بقا کے لئے ہندوؤں کے دوش بدوش جدوجہد کرنا تھا، لیکن عہد جدید یعنی 1857 کے ہنگامے کے فرو ہوجانے کے بعد مغربی اور جنوبی ہند میں تو ہندوؤں اور مسلمانوں نے عام طور پر نئے زمانے کے چیلنجوں کا ایک ہی سا جواب دیا تھا، مگر شمالی ہند میں اس معاملے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے طرز عمل میں بہت فرق تھا۔ ہندوؤں نے بنگال میں کوئی 40 برس پہلے مغربی تعلیم کی طرف توجہ شروع کردی تھی۔ مسلمان بحیثیت جماعت انگریزی حکومت اور مغربی تعلیم وتہذیب سے سخت بیزار تھے۔ اس لئے ان کا انداز سراسر مخالفانہ تھا۔ علماء انگریزی تعلیم کے حصول اور انگریزی تعلیم یافتہ افراد کی سختی سے نہ صرف مخالفت کرتے تھے بلکہ حکومت کی جانب سے کئے جانے والے فلاح وبہبود کے ہر قدم کو شک وشبہ کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ ان مذہبی علماء نے جدید مغربی تصورات کے خلاف فوائد ونقصانات کا تجزیہ کئے بغیر ایک قسم کی جنگ کی تلقین شروع کردی جو فتح کے نام پر ہزیمت کے سوا کچھ نہ تھا۔ ان حالات میں مسلمان تعلیم کے لحاظ سے محض دینی مدارس میں قلعہ بند ہوکر بیٹھ گئے اور ان کی پسماندگی کا گڈھا مزید گہرا ہوتا چلا گیا، حالانکہ کئی دانشوروں اور مستقبل شناس رہنماؤں نے یہ ثابت کرنے

کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کہ اسلام نے بدلتے حالات کے ساتھ ہمیشہ ہم آہنگی پیدا کی ہے اور یہی لچک اسلام کی ہمہ گیر اور آفاقیت کی مظہر ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ بتایا کہ کس طرح ابتدائی دور میں مسلمانوں نے لباس، طرز تعمیر، نظم ونسق، ڈاک، سرحدوں کی تقسیم، طب، فلسفہ، ادب وفنون، لطیفہ، علم نجوم، علم الحساب وغیرہ میں یونان، ایران، روم اور ہندوغیرہ سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ لیکن ان سب باتوں کا کوئی خاطر خواہ اثر علماء نے نہیں لیا۔ نتیجے کے طور پر ان سب عوامل کا اثر مسلمانوں کی تعلیمی زندگی پر پڑا۔ انگریزی اور انگریزی علوم سے گریز اور اجتناب کا یہ عالم تھا کہ ''کسی کے گھر میں اگر ردّی میں بھی کسی انگریزی زبان کی کتاب کے چند صفحات پڑے مل گئے تو انہیں چمٹے سے اٹھا کر باہر پھینکا گیا اور گھر کے اس حصے کو اچھی طرح دھو کر پاک کیا گیا۔'' (ہندوستان کی دینی درس گاہیں ص:۴۳)

اس سخت گیری کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان کے لئے ملکی عہدوں اور منصوبوں کی راہیں محدود ہوگئیں۔ اس پر طرفہ تماشا یہ ہوا کہ شمالی ہند خاص کر بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت نے مسلمان امراء اور جاگیرداروں کو جو اپنی جائیدادوں کی مال گزاری وصول کرنے کا ٹھیکہ ہندو مستاجروں کو دے دیا کرتے تھے بے دخل کر کے براہ راست ان ہندو مستاجروں سے معاملہ رکھا اور 1793ء کے دوامی بندوبست کے ذریعے ان لوگوں کو موروثی زمین دار بنا دیا۔ اس طرح مسلمان امراء کا پورا طبقہ ہی ختم کر دیا گیا۔ اس طرح حکومت مسلمانوں کو سرکاری ملازمت سے بھی الگ کر کے رفتہ رفتہ بنگالی ہندوؤں کو ان کی جگہیں دے رہی تھی۔ (Religious thought of Syed Ahmad Khan By Basheer Ahmad) اور اس میں انہیں اس وجہ سے بھی آسانی ہوئی کہ مسلمان عام طور پر انگریزی جو تیس سال پہلے سرکاری زبان بن چکی تھی نہیں پڑھتے تھے۔ اب تک انہیں رعایت کے طور پر نوکری مل جاتی تھی۔ اب یہ رعایت ختم کر دی گئی اور مسلمانوں پر بحیثیت مجموعی سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند کر دیئے۔ انگریزوں کے اس امتیازی رویے کو

ہندوؤں نے بالعموم سراہا، لیکن جب مختلف اسباب کے پیش نظر حکومت نے اپنی اس پالیسی پر نظر ثانی کی اور مسلمانوں کے ساتھ مصالحاتی حکمت عملی اختیار کی تو ہندوؤں کے ایک طبقے نے اس بات کو پسند نہیں کیا اور ان کے اخبارات نے ''ناقابل تسخیر کو مسخر کرنے کی غیر عاقلانہ کوشش پر لمبے چوڑے مضامین شائع کئے۔'' (ہندو مسلم کلچرل آرکائز، سید محمود ممبئی 1949ء) مثلاً 1857 میں کلکتہ سے نکلنے والے ایک اخبار Hindu Patriot نے حکومت سے اس بات کی اپیل کی کہ ''وہ مسلم نواز پالیسی سے باز آئے کیونکہ تمام مسلمان غدار اور انگریزوں کے دشمن تھے۔'' (Religious thought of Syed Ahmad Khan By Basheer Ahmad Dar) اس جائزے سے بہر حال ایک بنیادی اور واضح نکتہ یہ سامنے آتا ہے کہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو نظر انداز کرنے کا یہ سلسلہ کوئی نیا نہیں ہے۔ یہ ایک ذہنیت بن چکی تھی جسے خاص کر برادران وطن کا اعلیٰ طبقہ آج بھی اپنے پرکھوں کی اس روایت اور سازشی حکمت عملی پر پوری طرح کاربند ہے۔ ثبوت کے طور پر آج کی سیکولر اور نام نہاد جمہوری حکومت میں سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی صورتحال کا ریکارڈ ملاحظہ فرمائیں اور اندازہ لگائیں، جن حکومتوں کی کرسیوں کو مسلمانوں نے سہارا دے رکھا ہے ان حکومتوں نے بدلے میں کیا دیا ہے۔ سچر کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب 4.9 فیصد ہے جبکہ کل ملازمین کی تعداد 88 لاکھ 44 ہزار 669 ہے۔

اس صورت حال کا ایک افسوس ناک پہلو یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کی اس ناگفتہ بہہ حالت کا اندازہ خود حکومت کو بھی ہے جس کا وہ جا بجا اقرار بھی کرتی ہے مگر اس کے مداوا کی جانب قدم بڑھانا تو درکنار الٹے خود روزگار پیدا کر کے زندگی گزار رہے نوجوانوں کو جھوٹے اور بے بنیاد الزامات عائد کر کے جیلوں میں بند کر رہی ہے۔

مسلمانوں کی پسماندگی اور مسلم نوجوانوں کی بے روزگاری کے ذمہ دار بہت حد تک

مساجد و مکاتب کے کم علم واعظین بھی ہیں۔ یہ لوگ مادی دولت اور راحت کا جو سبق مسلمانوں کو پڑھاتے ہیں وہ بھی غلط ہے اور اسلامی نقطۂ نظر کی غلط تعبیر پر مبنی ہے۔ یہ حضرات افلاس کی تعریف میں زمین وآسمان کے قلابے ملاتے ہیں اور بزرگان دین کی زندگی کی مثالیں پیش کرکے یہ ثابت کرتے ہیں کہ ناداری خدا کی رحمت ہے۔ مگر اس بات کو نظرانداز کردیتے ہیں کہ جبری افلاس اور اختیاری افلاس میں فرق ہے۔ جبری افلاس سماج کی نالائقی یا بے انصافی کی علامت ہے اور اس پر قناعت کرنا اور دوسروں کو قناعت کرنے کی تلقین کرنا مذہبی اور اخلاقی جرم ہے۔ مذہب اور اخلاق دونوں کی طرف سے ہم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم اس افلاس کے خلاف اور ان حالات کے خلاف جو اس کے پیدا کرنے کے ذمہ دار ہیں بغاوت کریں اور ان کا خاتمہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔

اب رہی بات اختیاری افلاس کی تو اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس کا محرک کاہلی اور بےحسی ہے۔ دوسرا جس کا محرک زہد وایثار ہے۔ ظاہر ہے ایسی ناداری جو کاہلی اور بے حسی کا نتیجہ ہے قابل شرم ہے۔ وہ شخص جسے محنت سے جی چرانے کی عادت ہے اور وہ جو موقع ملنے پر بھی نہیں کماتا ایک خطرناک اخلاقی مرض میں مبتلا ہے جس سے اور طرح طرح کے روگ پیدا ہوتے ہیں۔ کاہل مفلس عام طور پر پست ہمت، بے حمیت، حاسد اور حریص ہوتے ہیں اور روپیہ کمانے کی آسان راہ کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر امیروں اور نیتاؤں کے طفیلی یا گداگری اور اگر اتفاق سے کچھ من چلے ہوئے تو جرائم کی دنیا میں چلے جاتے ہیں، البتہ وہ فقیرانہ زندگی جو خدا کے خاص بندے زہد وایثار کی نیت سے اختیار کرتے ہیں تعریف اور عقیدت واحترام کے مستحق ہیں اور اس کی تقلید ہر سچے مسلمان کا نصب العین ہونا چاہئے۔

ہم مسلمانوں کا بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم اپنا امام اور ذاکر اسے تسلیم کرلیتے ہیں جو اسلام کی الف سے بھی پوری طرح واقف نہیں ہوتا چہ جائے کہ قرآن وحدیث اور اسلامی

معاش ومعیشت کے اصولوں سے واقف ہو۔ ہمارے اکثر امام اور خطبہ خواں جو سماج میں بیداری پیدا کرنے اور عوام کو طرز زندگی اور ضروریات زندگی کا درس دینے کے لئے روح کی حیثیت رکھتے تھے اور ہیں معمولی پڑھے لکھے اور محض پنج وقتہ نمازوں کے قائد بن کر رہ گئے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے اکثر واعظین کسب معاش کے وسائل حاصل کرنے کے لئے یا ان میں وسعت پیدا کرنے کے لئے سعی ومحنت کی ضرورت پیش آئے تو اسے طلب دنیا کہہ کر رد کردیتے ہیں، لیکن اگر بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے کہیں سے پیسہ مل جائے تو اسے خدا کی دین سمجھ کر خوشی سے قبول کرلیتے ہیں۔ مسلمانوں کی پستی اور بےروزگاری کا باعث بڑی حد تک افلاس اور قناعت کرنے کا یہ رجحان بھی ہے۔

بےروزگاری کی ایک اور بنیادی وجہ یہ ہے کہ ٹیکنیکل تعلیم سے جس کے لئے زیادہ محنت کی ضرورت ہے مسلمان نوجوان گھبراتے ہیں۔ مسلمانوں کا وہ طبقہ جن میں پشتوں سے تعلیم ہی نہیں ہے یہ توقع کرنا کہ وہ اپنے بچوں کو پہلے عام تعلیم اور پھر ٹیکنیکل تعلیم دلائیں گے فضول ہے اور پڑھے لکھے ملازمت پیشہ خاندانوں کے لوگ ہر چند کے وہ نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ عام طور پر ہاتھ کے کام کو کسر شان سمجھتے ہیں اس لئے اپنی اولاد کو ٹیکنیکل تعلیم نہیں دلانا چاہتے خواہ آگے چل کر بےروزگاری اور گداگری کی منزلیں طے کرنی پڑے۔ حالانکہ اس رجحان میں کچھ تبدیلی آئی ہے اور تعلیم یافتہ طبقے نے ٹیکنیکل تعلیم کی طرف تھوڑی بہت توجہ شروع کی ہے لیکن اس کے لئے سخت مقابلہ کرنا پڑتا ہے جس سے مسلمان نوجوان گھبراتے ہیں۔

اس سے بھی کہیں سخت رکاوٹ ٹیکنیکل تعلیم بلکہ ہر طرح کی تعلیم کی راہ میں یہ ہے کہ متوسط طبقوں کے مسلمان شدید مالی پریشانیوں میں مبتلا ہیں اور اپنی اولاد کو اعلیٰ بلکہ بعض صورتوں میں ابتدائی تعلیم دلانے کی بھی استطاعت نہیں رکھتے۔ مسلمانوں کی پسماندگی دور کرکے انہیں عام ملکی دھارے سے جوڑنے کے لئے حکومت کی جانب سے کئی منصوبے اور

اسکیمیں چلائی جارہی ہیں، مسلم بچوں کی تعلیم کے لئے حکومت وظائف اور مالی تعاون دینے کا دم بھرتی ہے مگرانہیں جاری کرنے کے لئے ایسی ایسی شرطیں عائد کردیتی ہے کہ مسلمانوں کے ان طبقوں تک حکومت کے فنڈ کی بوبھی نہیں پہنچتی۔ایسی صورت میں مسلم نوجوانوں کی بے روزگاری میں اضافہ ہی ممکن ہے۔

اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں میں جولوگ فکروعمل کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ مصمم ارادہ کرلیں کہ ایک مدت تک اپنی ساری توجہ اورکوشش تعلیمی اصلاح وترقی پرصرف کریں گے جیسا کہ سرسید نے انیسویں صدی کے ربع آخر میں کیا تھا۔ مگرنئی تعلیمی تحریک کوسرسید کی کامیابیوں اور ناکامیوں سے سبق حاصل کرکے ایسی راہ عمل اختیارکرنی ہے جوموجودہ حالات اورضروریات کے مطابق ہوں۔

☆☆

بابری مسجد مقدمہ

عدالت اور مسلم پرسنل لا بورڈ

● محمد وقارالدین لطیفی ندوی

بابری مسجد کا قضیہ بلاشبہ ہندوستانی تاریخ میں اپنی نوعیت کا ایک منفرد قضیہ ہے جس کے مقدمہ کی عمرطویل ہونے کے ساتھ ساتھ ہندوستان جیسے جمہوری اور سیکولر ملک کی تاریخ میں ایک بدنما داغ بھی ہے۔ جبکہ بابری مسجد ۱۵۲۸ء اپنے قیام کی تاریخ سے ۲۲؍دسمبر ۱۹۴۹ء کی نماز عشاء تک پورے طور پر مسجد رہی اوراس میں پنج وقتہ نماز پابندی سے ہوتی رہی۔اس قضیہ کی ابتداء فرقہ پرست طاقتوں نے باقاعدہ ۲۲؍دسمبر ۱۹۴۹ء کی رات کے اندھیرے میں شری رام اورشری لکشمن جی کی مورتی رکھ کرکی، اس کے بعد عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹائے گئے لیکن عدالتوں سے جمہوری امیدوں کا گلہ گھونٹنے کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا اس لئے کہ عدالت کے ذریعہ اس ملک کی تاریخ میں ایک سیاہ صفحہ کا اضافہ کرنا تھا اور شرمناک تاریخ مرتب ہونی تھی جو ہوئی۔اس بیچ طرح طرح کی اٹکلیں اور گواہیوں کا دور چلتا رہا، سنی وقف بورڈ اترپردیش نے بھی ۱۹۶۱ء میں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا مگر ہوا کچھ نہیں، جومسلمان پنج وقتہ نمازادا کرتا تھا اسکے داخلہ پر پابندی لگادی گئی۔

ہمارے ملک کی عدلیہ کا بڑا عجیب وغریب اورنرالہ انداز ہے کہ فرقہ پرستوں نے انگریزی دوراقتدار میں کبھی بھی ایک بار بھی یہ نہیں کہا کہ مسجد کی جگہ پر شری رام چندر جی پیدا ہوئے ہیں، لیکن آزادی کے بعد مسلمانوں کی قربانیوں کا صلہ دینے کے واسطے ۱۹۴۷ء میں

ہندوستان آزاد ہوا اور دسمبر ۱۹۴۹ء میں اسکی ایک مسجد چھین لینے کی ناپاک کوشش کی جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہندوؤں کے یہاں اس سے پہلے یہ عقیدہ نہیں تھا بلکہ گذشتہ تین سو سالوں سے الگ الگ جگہوں کے بارے میں یہ عقیدہ تھا کہ رام جی یہاں پیدا ہوئے ہیں اور اس سے پہلے ان کا یہ عقیدہ تھا کہ رام جی ایودھیا میں پیدا ہوئے تھے نہ کہ بابری مسجد کی جگہ پر پیدا ہوئے تھے، حالانکہ خود غیر مسلموں نے اپنے بیانات میں اور ججوں نے اپنے فیصلے میں جگہ جگہ اس کو مسجد تسلیم کیا ہے لیکن اسکے ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ۱۹۳۶ء سے مسلمان بھی عبادت کرتے ہیں اور ہندو بھی، اور یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمان صرف جمعہ کی نماز ادا کرتے تھے اور باقی دنوں میں ہندو بھائی پوجا کرتے تھے جبکہ حقیقت اس کے بالکل برخلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ۲۲/دسمبر ۱۹۴۹ء کی رات سے پہلے پہلے ایسا کچھ تھا ہی نہیں، یہ مکمل منصوبہ بند پلاننگ کے تحت جھوٹ گھڑا گیا اور اس کو لکھنؤ بنچ نے عقیدہ کے طور پر تسلیم کیا۔

بابری مسجد کی شہادت سے قبل ملک کی چند تنظیمیں بابری مسجد کے معاملہ کو دیکھ رہی تھی شہادت کے بعد ضرورت محسوس ہوئی اور ملت اسلامیہ ہندیہ کا اصرار ہوا کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے اور وہی اس کی نگرانی کرے اور قانونی لڑائی بھی لڑے، چنانچہ بورڈ نے ۹/جنوری ۱۹۹۳ء کو مجلس عاملہ کی ایک ہنگامی میٹنگ طلب کی جسمیں باتفاق رائے یہ تجویز منظور کی گئی کہ:

۱۔ مسجد کی عمارت کا انہدام مسجد کے تقدس کو مجروح کرتا ہے اور یہ اسلام کے مذہبی شعائر کی توہین ہے۔

۲۔ مسجد کی عمارت منہدم کئے جانے کے بعد بھی وہ زمین جس میں ۱۵۲۸ میں مسجد کی بنیاد ڈالی گئی تھی شرعاً مسجد ہے اور قیامت تک مسجد رہے گی۔ اور مسجد کی حرمت سے متعلق تمام شرعی احکام اس قطعہ آراضی پر آج بھی نافذ ہیں۔

۳۔ مسجد کی عمارت گرادینے سے یا ناجائز طور پر مورتیوں کو رکھدینے اور ظلم وجبر کے

ساتھ بتوں کی پوجا جاری کرادینے سے مسجد کا مسجد ہونا ختم نہیں ہوتا۔

۴۔ کسی مسجد میں ایک عرصہ تک چاہے یہ عرصہ کتنا ہی ہو نماز کا نہ پڑھا جانا مسجد کی شرعی حیثیت کو ختم نہیں کرتا۔

۵۔ کوئی بھی مسلمان کسی بھی حال میں کسی مسجد کو بت خانہ بنادینے کی اجازت نہیں دے سکتا۔

۶۔ آراضی مسجد کا سرکاری طور پر ایکوائر کیا جانا ظلم صریح ہے اور شرعاً ناجائز و باطل ہے اور مذہبی آزادی کے حق میں صریح مداخلت ہے۔ حکومت کی جانب سے بابری مسجد کے عوض کسی اور مقام پر متبادل مسجد تعمیر کی جائے تو وہ شرعاً مسجد نہیں ہوگی، اور اگر ایسی مسجد کی تعمیر کے لئے کوئی ٹرسٹ تشکیل دیا جائے تو کوئی مسلمان اس میں شریک نہیں ہوسکتا۔

بورڈ نے اپنی مذکورہ تجویز کے بعد اس معاملہ کو پورے طور پر اپنے ہاتھ میں لیا اور اس سے متعلق مقدمات (ملکیت وحقیت اور اسباب انہدام بابری مسجد) وغیرہ کی نگرانی اور قانونی پیروی کرنے لگا اور اس وقت سے مسلسل مسلم پرسنل لا بورڈ اس مقدمہ کو دیکھ رہا ہے اور جب جس طرح کی ضرورت پیش آئی اسکو پوری کرتا آرہا ہے۔

الہ آباد ہائی کورٹ کے لکھنؤ بنچ کے ملکیت مقدمہ کے سنسنی خیز فیصلے نے پوری ملت اسلامیہ ہندیہ اور ملک کے سیکولر غیر مسلموں کو بھی جھنجھوڑ کر رکھدیا الغرض آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے بڑی ذمہ داری کے ساتھ اس فیصلہ کی جانچ کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی اور اس کمیٹی کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ ملک کے ممتاز سینئر وکلا کو منتخب کریں اور جونیئر وکلا کی ایک پوری ٹیم بنائیں جو اس فیصلہ کا ہر پہلو سے جائزہ لے اور اپنی رپورٹ کنوینر کو پیش کرے۔ الحمد للہ وکلا کی یہ ٹیم پوری طرح سرگرم ہے اور اپنا کام کررہی ہے۔ مقدمہ کے فیصلہ کے بعد بورڈ نے فوری طور پر ۱۶/۱۰ اکتوبر ۲۰۱۰ء کو مجلس عاملہ کی نشست بلائی جس میں حسب ذیل تجویز منظور کی گئی:

’’مجلس عاملہ کا احساس ہے کہ اس فیصلہ میں کئی ایک نقائص ہیں، فاضل عدالت نے آستھا کے اصول کو قانون کی عمل داری کے اصول پر فوقیت دی ہے۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی مجلس عاملہ اس کو ہندوستانی مسلمانوں کا حق اور فریضہ سمجھتی ہے کہ اس فیصلہ کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا جائے تاکہ اس فیصلہ کے ذریعہ آئین کی بنیادی قدروں اور عدل گستری کے مسلمہ اصولوں میں کی گئی تبدیلیوں کو دور کیا جاسکے۔

سپریم کورٹ سے رجوع ہونے کے طریقہ کار اور اس کی صورتوں کے تعین کے لئے اجلاس نے صدر بورڈ اور جنرل سکریٹری صاحبان کو مجاز گردانا کہ وہ ایک کمیٹی تشکیل کر کے یہ اختیارات اس کے حوالے کریں۔‘‘

چنانچہ بورڈ کے صدر و جنرل سکریٹری صاحبان نے ایک کمیٹی تشکیل دے کر یہ معاملہ اس کے حوالہ کیا، بورڈ کے اس اقدام اور فیصلہ کے بعد اس کمیٹی نے تیاری شروع کردی، کمیٹی نے یہ طے کیا کہ ۹/ الگ الگ اپیلیں داخل کی جائیں تاکہ اس کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جائے، جبکہ اس فیصلہ میں جج صاحبان نے بابری مسجد کو مسجد کہلانے کے کئی ثبوتوں کا جو دستاویزی ثبوت ہیں کا اقرار کیا ہے اور اسی فیصلہ میں یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ اندرونی حصہ (گنبد کے نیچے کا حصہ) ۱۹۴۹ء تک مسجد کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی جج صاحبان نے مانا ہے کہ درمیانی گنبد کے نیچے کی جگہ شری رام چندر جی پیدا ہوئے ہیں جو کہ سراسر جھوٹ پر مبنی ہے اور دلائل وشواہد سے چشم پوشی برتی گئی ہے جبکہ یہ مقدمہ حق ملکیت کا داخل کیا گیا تھا نہ کہ تقسیم کا! اور ججوں نے صرف عقیدہ کو بنیاد بنا کر اس کی تقسیم کا فیصلہ سنا دیا اور فیصلہ کس طرح کا ہے اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے، آپ کے علم میں ہے۔ اور ابتدائی مرحلہ میں ہی سپریم کورٹ نے اس فیصلہ پر سخت اعتراض جتایا ہے اور اس کو عجیب وغریب قرار دیا۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی بابری مسجد کمیٹی نے پورے فیصلہ کا حرف بحرف جائزہ

لیا اس کے بعد یہ طے کیا کہ جوں جوں فیصلہ کی رجسٹرڈ کاپی ملتی جائے گی سپریم کورٹ میں اپیلیں فائل کی جاتی رہیں گی اس طرح بورڈ کا ۹/ اپیلیں داخل کرنے کا ارادہ ہے اب تک لکھنؤ سے فیصلہ کی ۴/ کاپیاں بنام محمد ہاشم انصاری، محمد مصباح الدین، سنی وقف بورڈ اتر پردیش سوٹ نمبر ۴ اور ۵ کی رجسٹرڈ کاپی بورڈ کو حاصل ہوئی اور بورڈ ان چاروں کی طرف سے سپریم کورٹ میں اپیل داخل کر چکا ہے، اسی طرح ایک اپیل حافظ محمد صدیق کی طرف سے جمعیۃ العلماء نے بھی داخل کی ہے اور ہندوؤں کی طرف سے بھی ۴/ اپیلیں داخل کی جاچکیں ہیں۔

ان ہی اپیلوں کی بنا پر ۹/ مئی کو پہلی پیشی ہوئی جسمیں ملک کی سب سے بڑی عدلیہ کے دو ججوں (جسٹس آفتاب عالم اور آر ایم لودھا) کی بنچ نے مشاہداتی تجزیہ کے بعد ہائی کورٹ کے بابری مسجد زمینی تنازع کے فیصلے کو روک لگاتے ہوئے اس کو حیرت انگیز قرار دیا اور یہ کہہ کر اس فیصلہ کو نامنظور کردیا کہ ہائی کورٹ زمین کیسے تقسیم کرسکتا ہے جبکہ کسی فریق نے بٹوارے کی مانگ نہیں کی ہے۔

☆☆

بابری مسجد
تاریخ کے آئینے میں

● محمد عمادالدین قاسمی

انتہا پسند ہندو آج بھی ایودھیا میں اس مقام پر مندر کی تعمیر کے بارے میں پر عزم ہیں جہاں 1992 میں بابری مسجد شہید کردی گئی تھی۔

1528: ایک ایسے مقام پر مسجد کی تعمیر جو ہندوؤں کے دعویٰ کے مطابق 'رام' کی جائے پیدائش تھی۔

1853: ایودھیا کے پہلے مذہبی فسادات۔

1859: برطانوی نوآبادیاتی حکومت کی جانب سے عبادت کی جگہ کی تقسیم کردی گئی۔

1949: مسجد کے اندر سے 'رام' کی مورتی کی دریافت۔ حکومت نے متنازعہ مقام قرار دے کر مسجد بند کروادی۔

1984: ویشو ہندو پریشد کی جانب سے 'رام' کی جائے پیدائش کو آزاد کروانے کے لیے تحریک کا اعلان۔ بی جے پی کے رہنما لال کرشن ایڈوانی نے اس تحریک کی قیادت سنبھال لی۔

1986: ضلعی عدالت کی جانب سے ہندوؤں کو متنازعہ مقام پر پوجا کی اجازت، مسلمانوں کی جانب سے بابری مسجد ایکشن کمیٹی کا قیام۔

1989: ویشو ہندو پریشد نے مسجد سے ملحقہ زمین پر رام مندر کی بنیاد رکھ دی۔

1990: ویشو ہندو پریشد کے حامیوں نے مسجد کو جزوی طور پر نقصان پہنچایا، وزیرِ اعظم کی جانب سے مسئلے کے حل کی کوشش۔

1991: ریاست اتر پردیش میں بی جے پی حکومت کا قیام۔

1992: ویشو ہندو پریشد کے حامیوں کی جانب سے بابری مسجد کی شہادت۔ ہندو مسلم فسادات، دو ہزار افراد ہلاک۔

2001: شہادت کے نو برس مکمل ہونے پر وشوا ہندو پریشد کی جانب سے رام مندر کی تعمیر کا عزمِ نو۔

جنوری 2002: وزیرِ اعظم اٹل بہاری واجپئی کے دفتر میں 'ایودھیا سیل' کا قیام۔

فروری 2002: بی جے پی کی جانب سے انتخابی منشور میں سے رام مندر کی تعمیر کی شق خارج۔ ایودھیا سے واپس آنیوالے ہندوؤں کی ٹرین پر حملہ ۵۸/ ہلاک۔ وشوا ہندو پریشد کی جانب سے رام مندر کی تعمیر کیا آغاز کے لیے پندرہ مارچ کی تاریخ کا اعلان۔

مارچ 2002: گجرات مسلم کش فسادات میں دو ہزار افراد ہلاک۔

اپریل 2002: ایودھیا کے متنازعہ مقام کی ملکیت کے بارے میں مقدمے کی سماعت کا آغاز۔

جنوری 2003: ماہرینِ آثارِ قدیمہ کی جانب سے عدالت کے حکم پر متنازعہ مقام کے جائزہ کا آغاز۔

اگست 2003: ماہرینِ آثارِ قدیمہ کی جانب سے مسجد کے نیچے مندر کی موجودگی کے شواہد کا اعلان۔ مسلمانوں کی جانب سے اعتراضات۔

ستمبر 2003: عدالت کی طرف سے بابری مسجد کی شہادت پر اکسانے کے الزام میں ۷/ رہندو رہنماؤں پر مقدمہ چلانے کا فیصلہ۔

اکتوبر 2003: مسلم تنظیموں کی جانب سے ماہرینِ آثارِ قدیمہ کی رپورٹ کومکمل طور پر مسترد کرنے کا مطالبہ۔

دسمبر 2003: شہادت کی گیارہویں برسی پر حیدرآباد دکن میں فسادات، پانچ افراد ہلاک۔

جولائی 2004: شیوسینا کے رہنما بال ٹھاکرے کی جانب سے مسئلے کے حل کے لیے متنازعہ مقام پر قومی یادگار کی تعمیر کی تجویز۔

اکتوبر 2004: لال کرشن ایڈوانی کی جانب سے مندر کی تعمیر کی عزم کا اعادہ۔

نومبر 2004: الٰہ آباد ہائی کورٹ کی جانب سے بابری مسجد معاملہ میں لال کرشن ایڈوانی کو نوٹس۔

☆☆

لبراہن کمیشن

دل کے بھلانے کو یہ خیال اچھا ھے........

● ادارہ

حق وانصاف کے برہنہ مذاق کی اگر کوئی مثال دیکھنی ہو تو لبراہن کمیشن کی کارکردگی کے فسانۂ عجائبات کا مطالعہ کریں اور حکومت وعدلیہ کی اٹھکھیلیوں سے روبرو ہونا ہو تو بابری مسجد سے متعلق مقدمات کی رفتار کا جائزہ لے سکتے ہیں۔

بابری مسجد شہادت کے ذمہ دار عناصر کی شناخت اور پورے ملک کو جھنجھوڑ دینے والے اس اندوہناک واقعہ کی تحقیقات کے لیے قائم جسٹس لبراہن کمیشن کے حوالے سے گذشتہ ہفتہ پارلیمنٹ میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ کمیشن فروری 2008 تک اپنی رپورٹ پیش کردے گا لیکن ایک بار پھر اس پر عمل آوری نہیں ہوسکی اور کمیشن کی مدت کار میں توسیع کردی گئی ہے، واضح ہو کہ لبراہن کمیشن کی یہ 44ویں توسیع ہوئی ہے۔ انصاف کے عمل میں ملک وملت کے ساتھ یہ مذاق ایک جمہوری نظام کے لیے سم قاتل کے سوا کچھ نہیں۔

6 دسمبر 1992 کو بابری مسجد کی شہادت کا واقعہ سیاہ رات کے سناٹے میں نہیں بلکہ دن کے اجالے میں رونما ہوا تھا، وہ بھی ریموٹ کنٹرول کے ذریعے نہیں بلکہ لاکھوں کارسیوک اس تاریخی مسجد کو زمیں بوس کرنے میں صبح سے شام تک اپنے خونی ارادوں کو انجام دینے میں ڈٹے رہے۔ رام بھگتوں کی غنڈہ گردی کے جملہ مناظر بعض ٹی وی چینلوں نے راست طور پر دکھایا تھا اور وہ سبھی مناظر کیمرے میں اب بھی محفوظ ہیں اور اس بات کے

بھی بہت سے شواہد وثبوت موجود ہیں کہ کارسیوکوں کی بے لگام بھیڑ کی پشت پناہی کرنے والے اورانہیں دادشجاعت دینے والے لال کرشن اڈوانی، مرلی منوہر جوشی، اوما بھارتی اور ونے کٹیار جیسے لیڈران وہاں بنفس نفیس موجود تھے، جن کی سرکردگی میں تاریخی بابری مسجد کو جنونیوں نے شہید کرڈالا۔ یہی نہیں کارسیوک بابری مسجد کی اینٹ بھی اپنے ساتھ بطور یادگار لے گئے اورمختلف شہروں میں اینٹ کی نمائش کے ساتھ فاتحانہ جشن بھی منایا گیا جن کی تصویریں اخبارات کی بھی زینت بنیں۔

اعلانیہ جرم کے اس منظرنامے میں سبھی مجرموں کی شکلیں جانی پہچانی اور پس منظر سے پورے ملک کی واقفیت کے باوجود حکومت کو بابری مسجد منہدم کرنے والوں کی تلاش اوراس کی وجوہات کی دریافت کے لیے ایک عدد تحقیقاتی کمیشن کی ضرورت آن پڑی، چنانچہ جسٹس لبراہن کی سربراہی میں 14 دسمبر 1992 کو تحقیقاتی کمیشن قائم کردیا گیا۔

وقتی طور پر مسلمانوں کے غم وغصہ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے قائم کیے گئے اس کمیشن کی سرگرمی کا ایک برس تک تو پتہ ہی نہیں چل پایا، کمیشن نے جب 41 افراد اور پانچ تنظیموں کے خلاف نوٹس جاری کیے تو اس پر اگست 1995 میں دہلی ہائی کورٹ نے اسٹے آرڈر جاری کردیا، پھر 23 جولائی 1996 کو جسٹس دیوندر گپتا اور جسٹس ایم کے شرما نے مذکورہ اسٹے آرڈر کو منسوخ کرکے کمیشن کی نوٹس کو جائز قرار دیا۔ کمیشن کی کارکردگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ کمیشن کا کام پورے پانچ برسوں کے بعد بھی نوٹس، اسٹے اوراسٹے آرڈر کی منسوخی تک ہی پہنچا تھا، اس کے بعد جسٹس لبراہن کبھی پنجاب وہریانہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کی حیثیت سے چنڈی گڑھ میں اور کبھی مدراس ہائی کورٹ کے فرائض منصبی ادا کرنے کے لیے چنئی میں رہے اور کمیشن کا دفتر نئی دہلی میں بے یارومددگار اپنی غیر فعالیت کی کہانی سناتا رہا۔

بابری مسجد کی شہادت کے بعد ملک بھر میں پھوٹ پڑنے والے فرقہ وارانہ فسادات

کے دوران پورا دیش جلتا رہا اور ہندو مسلم کشیدگی پروان چڑھتی رہی لیکن لبراہن کمیشن کی کارکردگی اپنی سست رفتاری کا ریکارڈ درج کراتی رہی، یہاں تک کہ ملک کے اقتدار پران ہی لوگوں کا قبضہ ہوگیا جو بابری مسجد کی شہادت میں راست طور پر ملوث تھے۔ اقتدار کے نشے میں چور بی جے پی نے نہ سی بی آئی کی پرواہ کی اور نہ لبراہن کمیشن کی اور چاہا کہ بابری مسجد کو منہدم کیے جانے کے مقدمے میں ماخوذ اپنے قائدین کو بھی بچالیں اور رام مندر کی تعمیر بھی ممکن العمل ہوجائے، اس کے لیے اقتدار کا دھونس کبھی سی بی آئی پر جمایا تو کبھی عدالتوں کو متاثر کرنے کی کوشش کی، ایک موقع پر تو رائے بریلی کی عدالت نے لال کرشن اڈوانی کو باعزت بری بھی کردیا تھا۔

دوسری طرف بی جے پی کے اہم لیڈران نے لبراہن کمیشن کے سامنے پیش ہوکر یہ باور کرانے کی بھی کوشش کی کہ وہ کمیشن سے تعاون کا معاملہ کررہے ہیں جبکہ شروع سے لے کراب تک کمیشن کے ساتھ ان کا عدم تعاون کا معاملہ رہا ہے چنانچہ کمیشن کی رپورٹ نہ مکمل ہونے میں بہت سی وجوہات کے ساتھ ساتھ ایک بڑی وجہ بی جے پی کے لیڈران کا عدم تعاون رہی ہے۔ عجیب بات ہے کہ لکھنؤ کی خصوصی سی بی آئی عدالت نے نامزد ملزموں کو یہ کہہ کر بری کردیا کہ ریاستی حکومت نے جوایف آئی آر درج کی تھی اس میں الزامات قوی نہیں ہیں، یہ سب دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ جب اقتدار پر خود ملزم فائز ہوتو پھر سارے فیصلے اور تاویلات ان ہی کے حق میں ہوتے ہیں۔

لبراہن کمیشن نے اس ڈی بی رائے کو بھی نوٹس دی تھی جو بابری مسجد کی شہادت کے وقت فیض آباد کے پولس کمشنر تھے، انہوں نے بھی کمیشن کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا اور بار بار کی یقین دہانیوں کے بعد بھی کمیشن کے سامنے اپنا بیان درج کرانے سے بچتے رہے، اس دوران انہوں نے ملازمت چھوڑ کر بی جے پی میں شمولیت بھی اختیار کی اور ممبر پارلیمنٹ بھی منتخب کیے گئے۔

لبراہن کمیشن کے سکریٹری ایس کے پچوری اور کمیشن کے رجسٹرار ارون جیت لال کا درد یکساں ہے، وہ کہتے ہیں کہ کمیشن کے اختیارات محدود ہونے کی وجہ سے رپورٹ کی تکمیل میں بہت ساری دشواریاں پیش آئیں۔

ہندوستان میں بہت سے کمیشن تشکیل دیے گئے لیکن زیادہ تر کمیشنوں کی رپورٹ اور سفارشات کو حکومت نے لائق اعتنا نہیں سمجھا۔ لبراہن کمیشن کی رپورٹ میں غیر معمولی تاخیر کو دیکھتے ہوئے یہ سمجھنا بہت مشکل نہیں کہ اس کے ساتھ بھی وہی رویہ روا رکھا جائے گا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب رپورٹ مکمل ہو چکی تھی تو پھر اعلان کے باوجود وہ پیش کیوں نہیں ہوئی؟ بعض تجزیہ کاروں کا اس سلسلے میں ماننا ہے کہ چونکہ اس رپورٹ میں کانگریس پارٹی پر بھی بابری مسجد کے انہدام کی اخلاقی ذمہ داری عائد کی جائے گی کیونکہ بابری مسجد کے انہدام کو نہ روک پانے کی مجرم کلیان سنگھ کی حکومت تھی تو دوسری طرف نرسمہا راؤ کی حکومت نے بھی غفلت برتنے کا سنگین جرم کیا تھا، شاید خصوصی اختیارات اور دباؤ سے ایسے تمام نکات خارج کرنے کے لیے اس رپورٹ کو صرف دو مہینے کے لیے ٹالا گیا ہے اور خبروں میں یہ کہا گیا ہے کہ اسے حتمی شکل دینے کے لیے توسیع دی گئی ہے۔ بہر حال اس رپورٹ سے زیادہ توقع کرنا احمقوں کی جنت میں گھر بسانا ہے تاہم اس کا انتظار تو ہے ہی۔

☆☆

بابری مسجد، رام جنم بھومی
فیصلہ یا سمجھوتہ؟

● عامر صابری

بابری مسجد مقدمہ کا فیصلہ بظاہر 30 ستمبر کو الہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بنچ نے سنا تو دیا لیکن چھوڑ گیا ایسے کئی سوال جس کا جواب نہ تو کسی بڑے لیڈر کے پاس ہے اور نہ ہی کسی ماہر قانون کے پاس۔ صاف صاف اور سیدھے سیدھے اس فیصلے پر کوئی بھی شخص اپنی رائے ظاہر کرنے سے بچ رہا ہے۔

جہاں تک سوال ہے عدالت کے فیصلہ کا تو اس سے پہلے بھی ایک فیصلہ عدالت کا 1986 میں آیا تھا جو ضلع جج نے کیا تھا کہ تالا کھلوا دیا جائے اور تالا کھل گیا اور تالا کھلتے ہی شروع ہو گئے فرقہ وارانہ فسادات۔ جس کا خمیازہ بھی مسلمانوں کو بھگتنا پڑا اور نقصان بھی ہر طرح سے مسلمانوں کا ہی ہوا اور اب پھر عدالت کا سب سے بڑا اور تاریخی فیصلہ 30 ستمبر 2010 کو آیا کہ جہاں مورتیاں رکھیں ہیں وہی رام جنم استھان ہے۔ اب یہ فیصلہ کوئی چھوٹی موٹی عدالت کا نہیں بلکہ ہائی کورٹ بنچ کا ہے بہر حال فیصلہ تو آنا ہی تھا اور یہ بھی پہلے سے طے تھا کہ فیصلہ کیا آئے گا؟

حیرت فیصلہ پر نہیں ہوئی حیرت اس بات پر ہوئی ہے کہ فاضل جج صاحب نے اپنے فیصلہ میں جو الفاظ استعمال کئے ہیں وہ اپنے پیچھے ایسے سیکڑوں سوال چھوڑ گئے ہیں جس کا جواب آنے والے وقتوں میں نہ تو عدلیہ کو دیتے بنے گا اور نہ ہی ایگزیکیٹو ہی دے پائے گی کیونکہ فاضل جج نے لکھا ہے کہ وہ دیوا ستھلی ہے اور وہی رام جنم استھان ہے۔ ایسا ہندوؤں کا ماننا ہے۔

یہ (بھاشا) زبان جوفاضل جج نے استعمال کی ہے وہ ایک جج کی کم ایک وشو ہندو پریشد، آر ایس ایس کے کارکن کی زیادہ معلوم ہوتی ہے جبکہ جسٹس ایس یو خاں اور جسٹس سدھیر اگروال نے صاف طور پر تاریخ کے حوالے سے کوڈ کیا ہے کہ ایسی کوئی بھی نظیر نہیں ملتی ہے جس سے پتہ چلے کہ مندر توڑ کر مسجد بنائی گئی، ہاں اس کے برعکس پوری دنیا نے آنکھوں سے دیکھا کہ جہاں مسجد تھی اور مسجد میں مورتیاں رکھیں گئیں اور اس کے بعد قانونی داؤ پیچ کے ذریعہ اس کا تالا کھلوایا گیا اور پھر غنڈہ گردی کے دم پر آستھا اور مانیتا کی جے کار کرتے ہوئے دہشت گردی کا ماحول پیدا کر کے مسلمانوں کو خوف وہراس میں دھکیل کر وہ تاریخی مسجد جو بابری مسجد کے نام سے جانی جاتی تھی 6 دسمبر 1992 کو شہید کردی گئی اور پھر دنیا کے ہر مذہب وملت کے لوگوں نے دیکھا کس طرح وہاں مسجد شہید کرنے کے بعد 48 گھنٹہ تک مندر کا کام چلتا رہا۔ دنیا نے یہ بھی دیکھا ملک میں کس طرح مسلمانوں کو دہشت گردی کا نشانہ بنایا گیا۔ ہزاروں بے قصور لوگوں کو اپنی جانیں گنوانی پڑیں۔

یہی ماحول اس بار بھی فیصلہ سے پہلے وشو ہندو پریشد، آر ایس ایس کے علاوہ دیگر ہندو فرقہ پرست تنظیموں نے بنانا شروع کردیا تھا کہ یہ فیصلہ عدالت نہیں کرسکتی ہے۔ یہ آستھا کا سوال ہے اور یہ بات چیت کے ذریعہ ہی طے ہونا چاہئے اس طرح کے بیانات فیصلہ کے ٹھیک ایک دن پہلے تک آتے رہے اور مسلمان ایک دم سہما سہما سا رہا اور پھر 30 ستمبر کو ٹھیک 4:40 منٹ پر فیصلہ آیا اور فیصلہ آتے ہی ملک کا مسلمان ہکا بکا سا رہ گیا اور وہ سارے لوگ جو ایک دن پہلے تک ہر سطح پر عدلیہ کے فیصلہ کی مخالفت کررہے تھے اچانک سب کی زبانیں بدل گئیں اور ایک آواز میں سب نے اس فیصلہ کا استقبال کیا اور مسلمانوں کو مشورہ دینا شروع کردیا کہ ”اب ایک نئے بھارت کا نرمان (تعمیر) کریں ایک نئے بھارت کا اُدَے کریں اور امن وشانتی بنائیں رکھیں۔“ ملک کا ہر ذی شعور آدمی کہیں نہ کہیں اس فیصلہ کے تئیں دبے ہی لفظوں میں سہی تنقید کرتے ہوئے دیکھا گیا۔ وہ جان رہا ہے کہ یہ فیصلہ نہ ہو کر ایک سمجھوتہ ہوا ہے اور اس سمجھوتے کے پیچھے کہیں نہ کہیں سیاسی کھیل ضرور ہوا ہے اور اس

کیس پر ہر ہوش مند آدمی کانگریس کو منھ بھر بھر کر کوس رہا ہے، کیونکہ اب تک تاریخی اعتبار سے بابری مسجد کے متعلق جتنے بھی حادثات یا مسلمانوں کے خونریزی کے جتنے بھی واقعات پیش آئے وہ سب کے سب کانگریس کے ہی دورِ حکومت میں پیش آئے وہ بھی جب، جب مسلمانوں نے کانگریس کی حکومت بنوانے میں پوری محنت کی جیسا کہ اس مرتبہ بھی ہندوستان کے سب سے بڑے صوبہ اتر پردیش میں مسلمانوں کی ہی بدولت آج کانگریس اتنی نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب رہی، بہرحال فیصلہ تین رکنی بنچ کا تھا اور انہیں میں سے دو ججوں نے کھل کر اپنی اپنی بات کہی یا فیصلہ میں لکھیں اگر ڈی وی شرما نے کھل کر وشو ہندو پریشد اور آر ایس ایس کی بولی بولی تو وہیں جسٹس ایس یو خاں نے شرافت اور قانون کے دائرے اور اسلامی نقطہ کے مدنظر وہ ساری باتیں بھی کہہ ڈالیں جو ایک منصف کو کہنا چاہئے۔ مسٹر خان نے صلح حدیبیہ کا ذکر کرتے ہوئے مسلمانوں سے بہت ہی مختصر لفظوں میں نصیحت کرتے ہوئے علامہ اقبال کے شعر کو کوڈ کیا۔ انہوں نے باور کرایا کہ یہ فیصلہ آخری نہیں اور تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ چلو بظاہر صلح حدیبیہ کی صلح بہت دب کر ہوئی تھی لیکن اس کے اثرات ایسے ہوئے کہ یہ بغیر لڑے ہی مکہ فتح ہو گیا۔

جسٹس خان اور جسٹس اگروال نے ایک بات تو بہت صاف لکھ دی جو برحق ہے کہ ایسی کوئی نظیر نہیں ملتی کہ مندر توڑ کر مسجد بنائی گئی۔ دنیا کی ہر عدالت گواہوں اور ثبوتوں کے بنا پر ہی فیصلہ کرتی ہے اور اس کیس میں اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملا کہ بابر یا اس کے وزیر میر باقی نے کسی مندر کو توڑ کر مسجد تعمیر کرائی ہو جبکہ اس بات کی پوری دنیا گواہ ہے کہ 6 دسمبر 1992 کو کورٹ کے اسٹے کے باوجود مسجد شہید کر کے 48 گھنٹے تک مندر بنایا گیا۔ اس کے برعکس ثبوتوں اور گواہوں کو درکنار کر کے مندر کے حق میں فیصلہ سنایا گیا جو نہایت ہی شرمناک اور قانون کا گلا گھوٹنے والا ہے جو کھلے طور پر آئین کی خلاف ورزی تو ہے ہی ساتھ ہی ایک فرقہ کے ساتھ کھلا سوتیلا سلوک بھی ہے۔

☆☆

بابری مسجد کی جگہ پر

کسی مندر کا ثبوت نہیں

● ادارہ

بابری مسجد کی ملکیت کے سلسلے میں الہ آباد ہائی کورٹ کی تین نفری لکھنؤ بنچ کا جو فیصلہ آیا، اس کی بنیاد اس مفروضے پر رکھی گئی تھی کہ جہاں بابری مسجد کی تعمیر کی گئی تھی، وہاں پہلے ہندو مندر تعمیر تھا۔ اگر اس خیال کو تسلیم نہ کیا گیا ہوتا، تو بابری مسجد کی اراضی کی ملکیت کے کیس کا ہرگز یہ فیصلہ نہ ہوتا۔ گویا اس پورے فیصلے کی بنیاد ہی اس بات کو تسلیم کرنے پر رکھی گئی تھی کہ جہاں بابری مسجد موجود تھی، وہ جگہ ایک ہندو مندر کی تھی، جبکہ ہندوستان کے تمام معتبر اور تسلیم شدہ مؤرخین، ماہرین آثار قدیمہ اور حکومت کی جانب سے اس دعوے کی تصدیق کرنے کے لئے قائم کی گئی آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کی تاریخی آثار کی کھدائی کرنے والی ٹیم سب ہی ثبوت وشواہد کی روشنی میں مسلسل یہ بات کہتے رہے تھے کہ بابری مسجد کی جگہ پر پہلے کوئی مندر کی عمارت موجود نہیں تھی اور کسی بھی تحقیق میں ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی ہے۔

سابق چیئرمین، انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ پروفیسر آر ایس شرما، یونیورسٹی آف کورکشیتر کے ڈپارٹمنٹ آف آرکیالوجی کے صدر شعبہ پروفیسر سورج بھان، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ سے وابستہ مشہور مؤرخ پروفیسر اطہر علی اور دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ڈی این جھا کی ٹیم نے وزیر داخلہ کو ایک بہت ہی تفصیلی رپورٹ پیش کی تھی، جس میں

بہت صاف صاف کہا گیا تھا کہ اس تحقیق کے بعد کوئی بھی تحقیق ایسا تاریخی یا آرکیالوجیکل ثبوت نہیں ملا، جس کی بنیاد پر یہ کہا جاسکے کہ بابری مسجد اور اس کے اردگرد کی اراضی پر 18 ویں صدی سے پہلے کی تعمیر کے آثار موجود ہیں، بلکہ صاف صاف کہا جائے، تو یہاں رام جی کی پیدائش سے منسوب کسی مندر کا کوئی نشان نہیں پایا جاتا ہے۔ تاریخی طور پر بھی بابری مسجد کے مقام پر رام جنم بھومی کے ہونے کی بات انیسوی صدی سے پہلے کی کسی تحریر یا دستاویز میں موجود نہیں ہے اور یہ تنازعہ اٹھارہویں صدی کے بالکل آخر کا پیدا کیا ہوا ہے۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ بابری مسجد کی اراضی کی ملکیت کے تنازعہ پر جب بابری مسجد ایکشن کمیٹی اور وشو ہندو پریشد کے درمیان وزارت داخلہ کی جانب سے مفاہمت کیلئے بلائی گئی آخری میٹنگ بھی ناکام ہوگئی تھی، تو وزارت داخلہ نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ دونوں فریق کو اس فن کے ماہرین کی ایک ایک ٹیم اپنی تحقیق کرکے اپنی اپنی رپورٹ پیش کرے گی، لیکن وشو ہندو پریشد نے وزارت داخلہ کو کوئی ایسی رپورٹ پیش نہیں کی، جبکہ بابری مسجد ایکشن کمیٹی کی تشکیل دی گئی مندرجہ بالا ماہرین آثار قدیمہ اور مؤرخین کی ٹیم نے پوری تحقیق کے بعد حکومت کو یہ رپورٹ پیش کی تھی، جس میں کہا گیا تھا کہ وہاں کسی ہندو مندر کے کبھی ہونے کے ثبوت نہیں ملتے ہیں۔ یہاں یہ بات بالکل واضح رہے کہ مندرجہ بالا ماہرین کی ٹیم میں شامل لوگ ملک کے بہت ہی معتبر اور جانے پہچانے ماہرین آثار قدیمہ اور مؤرخین میں شمار کئے جانے والے افراد تھے، جن کا کسی طرح سے بھی ایکشن کمیٹی سے کوئی تعلق نہیں تھا، اسی لئے اس فن کے کسی بھی ماہر نے ان کی اس رپورٹ پر کوئی سوالیہ نشان نہیں لگایا۔ 36 صفحات پر مشتمل اس رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ 1891 میں جب اے فہرر نے نارتھ ایسٹ پروونس اینڈ اودھ کے تاریخی آثار کی فہرست تیار کی تھی، تو بابری مسجد کو اس نے کلاس ٹو مونومنٹ قرار دیا تھا اور اس کے سلسلے میں تفصیل تحریر کرتے وقت درج کیا تھا کہ اس مسجد کا انتظام پرائیویٹ باڈیز اور انفرادی افراد کے ہاتھ میں ہے۔ بابری مسجد کو

1904 کے قدیم مونومنٹ ایکٹ کے تحت ایک پروٹیکٹیڈ مونومنٹ قرار دیا گیا تھا، جسے بعد میں 1958 میں بھی ری لیجسلیٹ کیا گیا اور اس میں کہا گیا تھا کہ چونکہ یہ ہمارے کامن نیشنل ہیریٹیج کا حصہ ہے، اس لئے حکومت کو چاہیے کہ اسے مکمل طور پر پروٹیکٹیڈ مونومنٹ کی طرح تحفظ فراہم کرے۔

اس رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ اس جگہ پر کوئی ہندو مندر پایا جاتا تھا' تاریخ میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے۔ پہلی بار 1890 میں یہ تنازعہ پیدا کیا گیا اور کہا گیا کہ یہاں رام چندر جی پیدا ہوئے تھے، جس کا کوئی بھی تاریخی ثبوت موجود نہیں ہے۔ تاریخ دانوں اور ماہرین آثار قدیمہ کی اس رپورٹ میں قدیم ہندو کتابوں اور دستاویزات کے بھی حوالے دیئے گئے تھے اور کہا گیا تھا کہ ہندوؤں کی مشہور کتاب سکندر' پران میں یہ تو بہت صاف صاف ذکر کیا گیا ہے کہ جب رام چندر جی کا دیہانت ہوا' تو ان کی راکھ کو ایودھیا کے سورگ دوار کے نزدیک دفنایا گیا تھا' لیکن اس میں اس کا کوئی ذکر نہیں تھا' کہ ان کی اصل جائے پیدائش کہاں تھی۔ اس کے علاوہ بابری مسجد کی تعمیر کے 50 سال کے بعد ہی تلسی داس نے رام چندر جی کی سوانح رام چرت مانس تحریر کی تھی۔ اس میں بھی انہوں نے کہیں نہیں ذکر کیا تھا کہ رام چندر جی کی جائے پیدائش پر موجود مندر کو توڑ کر وہاں بابری مسجد بنادی گئی ہے۔ یہ اتنے قریب کے زمانے کا معاملہ تھا کہ اگر ایسا ہوتا' تو ہندوؤں کے اس جذبات انگیز واقعے کا ضرور اس میں ذکر کیا جاتا۔ ماہرین کی اس رپورٹ میں اور بھی بہت سارے تاریخی ثبوت اور شواہد پیش کئے گئے ہیں۔ یہ رپورٹ منظر عام پر بھی آئی تھی' لیکن نہ تو کسی مؤرخ یا ماہر آثار قدیمہ نے اور نہ ہی وی ایچ پی کی جانب سے اس پر اس وقت کوئی سوال اٹھایا گیا تھا۔ اس کے باوجود الٰہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بینچ کے ججوں کے پاس آخر وہ کون سا تاریخی ثبوت موجود تھا' جس کی وجہ سے انہوں نے یہ بات تسلیم کر لی تھی کہ بابری مسجد کی جگہ پر پہلے ایک ہندو مندر تعمیر تھا اور مسجد کے ٹھیک مصلّے کے پاس ہی رام جی کی پیدائش ہوئی تھی اور اس

بات کو تسلیم کرنے کے بعد اس اراضی کی ملکیت کا فیصلہ صادر فرمادیا تھا۔

مشہور مؤرخ عرفان حبیب، شیریں موسوی اور سید علی رضوی ایسے بہت سارے تاریخی اور آرکیالوجیکل شواہد پیش کرتے ہیں، جو فاضل ججوں کے سامنے بہت تفصیل سے پیش کئے گئے، لیکن ان پر غور کرنے کی بھی زحمت گوارہ نہیں کی گئی، ورنہ فیصلے کی نوعیت ہی بالکل مختلف ہوتی، جبکہ آرکالیوجیکل سروے کی ایک نہایت متنازعہ اور ماہرین کی جانب سے رد کی جانے والی رپورٹ کو تسلیم کر کے اس پر پورے فیصلے کی بنیاد رکھ دی گئی۔ عرفان حبیب کہتے ہیں کہ مسجد کے قریب مسلم قبرستان میں پائے جانے والے 50 ستونوں کے بارے میں اے ایس آئی کی متنازعہ رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ یہ ہندو طرز تعمیر کے ستون ہیں، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں پہلے مندر تھا' جس کو مسجد بناتے وقت منہدم کیا گیا تھا اور یہ ستون اسی مندر کے ہیں، لیکن یہ بات کیسے ثابت کی جاسکتی ہے کہ یہ ستون مندر کے ہی ہیں اور یہ ستون مسلمانوں نے نہیں بنوائے ہوں گے، جبکہ ایسے ہی کئی ستون (پلر) قبرستان میں موجود بعض قبروں میں استعمال کئے گئے تھے۔ اس کے علاوہ خود اسی اے ایس آئی کی کھدائی میں زیر زمین سے بہت ساری ہڈیاں اور اسلامی طرز کے ٹائلز اور مٹی کے منقش ظروف ملے تھے، جس سے ثابت ہوتا تھا کہ یہاں پہلے مسلم آبادی موجود تھی، لیکن نہ تو اس رپورٹ میں اس کا ذکر کیا گیا اور نہ ہی کھدائی میں حاصل ہوئی ان تمام اشیاء کے موجود ہونے اور ان کی تفصیل عدالت کے سامنے پیش کئے جانے کے باوجود ججوں نے ان تاریخی ثبوتوں کو قابل اعتبار سمجھا اور محض معمولی سی متنازعہ رپورٹ کی بنیاد پر یہ تسلیم کر لیا کہ بابری مسجد کی جگہ پہلے کوئی مندر موجود تھا۔

عرفان حبیب کہتے ہیں کہ جس وقت ہائی کورٹ نے یہ آرڈر دیا تھا کہ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کی ایک ٹیم کھدائی کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ مسجد کے نیچے کسی دوسری عمارت کے آثار موجود ہیں یا نہیں' اسی وقت صورت حال کو دیکھتے ہوئے

انڈین ہسٹری کانگریس نے اس پر احتجاج کیا تھا' کیونکہ اس عدالتی حکم کے فوراً بعد ہی موجود ڈائریکٹر جنرل آف اے ایس آئی کو تبدیل کرکے اس وقت کی بھاجپا حکومت نے اپنے وفادار شخص کو ڈائریکٹر جنرل نامزد کردیا تھا اور بابری مسجد رام جنم بھومی بنچ کا نام تبدیل کرکے رام جنم بھومی بنچ کردیا تھا اور جو 20 لوگوں کی ٹیم بنائی گئی تھی' اس میں صرف ایک مسلمان کو شامل کیا گیا تھا۔ اسی سے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس سروے رپورٹ کی کیا صورت بننے والی ہے۔ آج بھی تمام مستند اور معتبر مؤرخین اور ماہرین آثار قدیمہ اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ بابری مسجد کسی مندر کے مقام پر تعمیر کی گئی تھی۔

☆☆

بابری مسجد کی شہادت، واجپئی بھی مجرم

● ادارہ

6 دسمبر کو بابری مسجد کی شہادت ہوئی، لیکن اس سے ایک دن پہلے ہی وہاں تمام تیاریاں کرلی گئی تھیں۔ کارسیوکوں کے کس گروپ کو سب سے پہلے بیری کیڈس توڑ کر مسجد کے احاطے میں داخل ہونا تھا، انہیں توڑ پھوڑ کے اوزار کہاں سے ملنے والے تھے، دوسری لائن کس وقت یلغار کرے گی اور یہ سارا کام کتنے وقت میں انجام دے دیا جائے گا۔ مسجد کے ٹھیک سامنے بنائے گئے پلیٹ فارم پر کارسیوکوں کی ہمت بڑھانے اور انہیں احکامات وپیغامات دینے کے لئے کون کون قائدین موجود رہیں گے اور مسجد کے پورے طور پر انہدام کے بعد یہ تمام قائدین کس وقت اس پلیٹ فارم کو چھوڑ کر غائب ہوجائیں گے، یہ ساری تفصیلات بہت واضح انداز میں پہلے سے طے کرلی گئی تھیں، لہٰذا جب 6 دسمبر کو بابری مسجد پر کارسیوکوں کی یلغار ہوئی، تو پلیٹ فارم پر کارسیوکوں کی ہمت بڑھانے اور ان کی رہنمائی کرنے کیلئے وشو ہندو پریشد' بھاجپا' بجرنگ دل اور سنگھ پریوار کے تمام جانے پہچانے لیڈران موجود تھے اور اپنی اپنی تقریروں اور پرجوش نعروں کے ذریعہ کارسیوکوں کی ہمت بڑھا رہے تھے۔

پلیٹ فارم پر موجود ان تمام چہروں میں ایک بہت ہی جانا پہچانا چہرہ وہاں سے غائب تھا۔ یہ جانا پہچانا چہرہ ایک دن پہلے 5 دسمبر کو بابری مسجد کے علاقے میں دیکھا گیا تھا اور پھر اسی شام اس نے لکھنؤ میں ایک جلسہ عام میں بہت ہی پرجوش انداز میں یہ بھی کہا تھا کہ کل ایودھیا میں کیا ہونے والا ہے' اس کا پتہ تو کل ہی چل سکے گا۔ گویا کہ اس چہرے کو کل ہونے

والے حادثے کے امکانات کی پوری آگاہی تھی۔ یہ چہرہ اٹل بہاری واجپئی کا تھا، جو 6 دسمبر کو کارسیوکوں کو اخلاقی مدد پہنچانے اور فتح وظفر کے گیت گانے کے لئے بابری مسجد کے سامنے پلیٹ فارم پر تو موجود نہیں تھا' لیکن وہ اس منصوبے کے ہر خاکے میں بہت نمایاں تھا اور جس کو سنگھ پریوار نے وزیراعظم کو اپنے ساتھ ملائے رکھنے کا نہایت اہم کام سونپ رکھا تھا۔ بابری مسجد کی مسماری کے بعد اس موضوع پر جتنی بار بھی سنگھی قائدین کے کردار پر گفتگو ہوئی، بابری مسجد کی مسماری کے ملزمین کی فہرست تیار ہوئی اور ہندوؤں کے جذبات کو ابھار کر ان کو ''رن بھومی'' میں لاکھڑا کرنے والوں کا ذکر ہوا' تو اس میں واجپئی کبھی کہیں نظر نہیں آئے۔ گویا ان کو ہمیشہ یہ کلین چٹ حاصل رہی کہ بابری مسجد کی مسماری کے جرم میں وہ شامل نہیں تھے، کیونکہ وہ اس کو اپنے سیاسی اصولوں کے خلاف سمجھتے تھے۔ ان کی اسی بنائی گئی امیج نے ان کو وزیراعظم کی کرسی تک پہنچا دیا' لیکن حقیقت یہ ہے کہ بابری مسجد کی مسماری سے جڑے ہوئے جتنے بھی کردار نظر آتے ہیں، بساط پر ان کی حیثیت پیادے یا فیل سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ اصل شاہ اور وزیر تو نرسمہا راؤ اور واجپئی تھے' جنہوں نے اس خوفناک منصوبے کا اصل خاکہ تیار کیا تھا اور جو سب کچھ کر گزرنے پر پوری قدرت رکھتے تھے' لیکن یہ حقیقت بہت دنوں تک بہت سارے لوگوں کی نظر سے اوجھل ہی رہی۔ وہ نہایت کمال کے ساتھ ایک مہذب مکھوٹا لگائے ہندوستانیوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے رہے کہ وہ سنگھ پریوار کے دوسرے اہل خاندان سے بہت مختلف ہیں۔

دوسری طرف سنگھ پریوار نے بھی مسلسل ان کے اس مہذب مکھوٹے کو اپنے منصوبے کے تحت اپنے حق میں استعمال کیا اور ہندوستانی سیاست کے کارزار میں ان کو اپنے ایک ایسے وفادار سپاہی کی طرح اتارے رکھا' جو فکری تشدد سے نفرت کرتا دکھائی دیتا ہے اور جو سب کو ساتھ لے کر چلنے پر اصرار کرتا ہے۔ آر ایس ایس کی طرف سے بعض دفعہ ڈھکے چھپے انداز میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ اٹل بہاری واجپئی سنگھ کی اصل فکر سے مطابقت نہیں

رکھتے اور اسی لئے سنگھ کے ایک بڑے حلقے میں ان کو احترام اور اعتبار کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ سنگھ نے ہی ان کے لئے یہ ''مہذب مکھوٹا'' تیار کیا تھا' جس کو وہ زندگی بھر اپنے چہرے پر سجائے گھومتے رہے' لیکن مکھوٹا تو مکھوٹا ہی ہوتا ہے۔ کبھی نہ کبھی تو اس کے پیچھے چھپا ہوا چہرہ ضرور سامنے آتا ہے اور واجپئی کا وہ اصلی چہرہ ہندستانیوں کے سامنے اس وقت بالکل صاف طور پر سامنے آگیا' جب لبراہن کمیشن کی رپورٹ سامنے آئی' جس میں بغیر کسی لاگ لپیٹ کے یہ بات کہہ دی گئی تھی کہ یہ سمجھنا کہ بابری مسجد کی مسماری میں واجپئی کا کوئی تعلق نہیں تھا' ایک نہایت ہی گمراہ کن حقیقت ہے اور ثبوت وشواہد اس کی بالکل توثیق نہیں کرتے ہیں۔ بابری مسجد کی مسماری کے پورے منصوبے میں واجپئی کو نہایت مرکزی حیثیت حاصل تھی اور صرف مسجد کی مسماری ہی میں نہیں' بلکہ مسجد کی مسماری کے بعد پورے ملک میں جو فرقہ وارانہ فسادات بھڑکے' اس کو ہوا دینے اور زیادہ پر تشدد بنانے میں ان کی تقریروں اور خاص طور پر 5 دسمبر کو لکھنؤ میں دیئے گئے ان کے اس بیان کا بہت دخل تھا' جس میں ہندوؤں کے جذبات کو بھڑکانے کی بھرپور کوشش کی گئی تھی۔

چونکہ لبراہن کیشن رپورٹ میں واجپئی کے اس مکھوٹے کو ہٹا دیا گیا تھا' جس میں ''مہذب اور شریف'' کے الفاظ کندہ تھے اور ان کا اصل چہرہ سامنے آگیا تھا' اس لئے اس پر سب سے پہلے سنگھ پریوار نے زوردار ہنگامہ کیا اور دھمکی دی کہ رپورٹ سے واجپئی کے متعلق لکھا ہوا حصہ نہیں ہٹایا گیا' تو وہ پورے ملک میں اس کے خلاف جارحانہ قدم اٹھائیں گے۔ ایل کے اڈوانی تو پورے ملک میں اس پر ہنگامہ کرتے پھرے کہ ہمارے سب سے مہذب لیڈر کو بدنام کرنے کی کوشش کی جارہی ہے' جبکہ ان کا دور دور تک مسجد کی مسماری سے کوئی تعلق نہیں تھا اور ثبوت میں پورا سنگھ پریوار یہ کہتا ہے کہ 6 دسمبر کو ایودھیا میں مسجد کے سامنے بنے پلیٹ فارم پر سب ہی قابل ذکر سنگھی قائدین موجود تھے' لیکن ان میں واجپئی شریک نہیں تھے' جبکہ سچائی یہ ہے کہ 5 دسمبر کی دوپہر میں واجپئی کا ایودھیا میں دیکھا

جانا ثابت ہے اور پھر اسی شام لکھنؤ میں ان کی کی گئی وہ بھڑکاؤ تقریر کا پورا ٹیپ موجود ہے‘ جس میں انہوں نے بہت جوشیلے انداز میں کہا تھا کہ کل ایودھیا میں جو کچھ ہوسکتا ہے‘ اس کا اندازہ بھی نہیں لگایا جاسکتا ہے۔ اسی تقریر میں انہوں نے کہا تھا کہ وہ لکھنؤ اس لئے آئے ہیں‘ تا کہ کل ایودھیا میں ہونے والی کارسیوا میں شریک ہوسکیں‘ لیکن ان کے حوارین‘ آر ایس ایس کے قائدین اور دیگر تمام منصوبہ سازوں اور کہا جاتا ہے کہ اس میں نرسمہاراؤ کی بھی یہی خواہش تھی کہ سنگھ کا یہ مہذب مکھوٹا بذات خود اس وقت ایودھیا میں موجود نہیں رہے‘ جب ظلم وستم کی کہانی تحریر کی جارہی ہو۔ انہوں نے خود اپنی لکھنؤ والی گفتگو میں صاف صاف کہا کہ مجھے اس وقت کہا گیا ہے کہ میں دہلی واپس چلا جاؤں۔ گویا ایسا نہیں ہے کہ واجپئی مسجد کی مسماری کے منصوبے سے ذاتی طور پر الگ تھے اور وہ اس سے اختلاف رکھتے تھے‘ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ واجپئی اس منصوبے میں ایک کلیدی کردار کی حیثیت رکھتے تھے اور یہ منصوبے کا ہی حصہ تھا کہ وہ جائے ظلم وستم پر موجود نظر نہ آئیں۔

لبراہن کمیشن کی رپورٹ میں ان کی لکھنؤ والی پوری تقریر اور ان کی عملی پوری مصروفیت کو تفصیل سے پیش کیا گیا ہے اور انہیں بھی بابری مسجد کی شہادت کے ذمہ داروں میں شامل کیا گیا ہے، بلکہ اس رپورٹ میں مجرمین کی جو فہرست دی گئی ہے، اس میں واجپئی کا نام اڈوانی سے بھی اوپر موجود ہے۔ واجپئی جی نے بابری مسجد کی شہادت کے کئی دنوں بعد دہلی میں بڑے ڈرامائی انداز میں اپنی پوری مہذب امیج کے ساتھ اعلان کیا کہ ان کے لئے یہ حادثہ اتنا تکلیف دہ ہے کہ انہوں نے عملی سیاست سے سنیاس لینے کا فیصلہ کرلیا ہے‘ لیکن یہ سنیاس لینے کے فیصلے کا اعلان کس فیصلے کا نتیجہ تھا، اس کا اندازہ اسی سے لگایا جاسکتا ہے کہ واجپئی اس کے بعد دو دفعہ ہندوستان کے وزیر اعظم بنے اور ان کو یہ کامیابی ایودھیا کی فتح کے پرچم تلے ہی حاصل ہوئی۔

☆☆

خواتین کی ملازمت کا مسئلہ

● مولانا سید جلال الدین عمری

خاندانی نظام میں عام طور پر مرد کی حیثیت سربراہ کی ہوتی ہے، وہ اس کی حفاظت اور نگرانی کرتا ہے، بیوی بچوں اور بعض اوقات قریبی عزیزوں کی معاش اور دوسری ضروریات کا نظم کرتا ہے، تعلیم وتربیت اور شادی بیاہ کے اخراجات برداشت کرتا ہے، عورت امور خانہ داری انجام دیتی ہے، جس میں گھر کے نظام کو ٹھیک رکھنا، بچوں کی دیکھ بھال اور پرورش اور شوہر کے مال کی حفاظت جیسے امور شامل ہیں، خاندان کا یہی نظام عرب میں بھی رائج تھا، اس نظام میں بعض بڑی بے اعتدالیاں تھیں، ایک دوسرے کے حقوق متعین نہیں تھے، ذمہ داریاں واضح نہیں تھیں، بعض اوقات عدل وانصاف کے صریح تقاضے پورے نہیں ہوتے تھے، عورت اپنی طبعی کمزوری کی وجہ سے سب کچھ برداشت کرتی تھی، اسلام نے خاندان کا نظام باقی رکھا، اسے ظلم وناانصافی سے پاک کیا، مرد اور عورت کے حقوق اور ذمہ داریوں کا تعین کیا، مرد کی مطلق بالادستی ختم کی، عورت کی کمزوری کی رعایت کی اور اسے قانونی تحفظ فراہم کیا، خاندان کی بقا اور استحکام کے لئے اس نے مرد کو عوت کی معاش کا ذمہ دار قرار دیا، یعنی از روئے قانون مرد پر عورت کا نان ونفقہ واجب ہے تا کہ عورت گھر کے داخلی نظم کو چلانے کے لئے خود کو فارغ کرسکے۔

موجودہ دور میں عورت معاش کے معاملہ میں خود کفیل ہونا چاہتی ہے، وہ خاوند یا کسی دوسرے فرد پر انحصار کرنا نہیں چاہتی، اسے اس کے مواقع بھی حاصل ہوں، اس سلسلے میں

جو بعض سوالات ابھرتے ہیں یہاں ان کا جواب دینے کی طالب علمانہ کوشش کی جائے گی۔

۱- شریعت اسلامی خواتین کے لئے کسب معاش کو کس نظر سے دیکھتی ہے؟

اسلام نے عورت کو معاش کی فکر سے بڑی حد تک بے نیاد کر رکھا ہے، لیکن اس کی معاشی جدوجہد کو ناپسندیدہ نہیں کہا جا سکتا، رزق کو قرآن مجید میں اللہ کا فضل کہا گیا اور اسے تلاش کرنے کی ہدایت دی گئی ہے، سورۂ جمعہ میں ارشاد ہے:

”فاذا قضيت الصلوة فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللّٰه“

عورت کو بھی اللہ کا فضل تلاش کرنے کا حق ہے، اس کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ حق صرف مرد کو حاصل ہے عورت کو حاصل نہیں ہے، اس پر ایک اور پہلو سے بھی غور کیا جا سکتا ہے۔

عورت کو مختلف ذرائع سے مال حاصل ہوتا ہے، ان میں مہر اور میراث شامل ہے، تحفہ، عطیہ اور ہبہ کی شکل میں بھی اس کے پاس مال آ سکتا ہے، وہ وقف کی مالک ہو سکتی ہے، اپنی اس دولت کو وہ محنت اور کوشش سے ترقی دے سکتی ہے اور اپنی آزادی مرضی سے اس میں تصرف کا بھی حق رکھتی ہے۔

”للمرأة الرشيدة التصرف فی مالها كله بالتبرع والمعاوضة“ (ابن قدامہ ۶/۶۰۲)

۲- شریعت نے عام حالات میں عورت پر معاشی ذمہ داری نہیں ڈالی ہے، خود اس کا نفقہ پیدائش کے بعد سے بلوغ تک بلکہ جب تک شادی نہ ہو جائے باپ کے ذمہ ہے، شادی کے بعد شوہر پر اس کا نان ونفقہ واجب ہے، لیکن بعض حالات میں کسی نہ کسی درجہ میں اس پر بھی معاشی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اس کی بعض مثالی ذیل میں دی جا رہی ہے:

فقہاء نے صراحت کی ہے کہ اگر بچوں کا باپ نہیں ہے تو ماں پر ان کا نان ونفقہ واجب ہوگا، علامہ ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں:

مجموعه القاسم: جلد پنجم
مسلم مسائل اور اس کا حل

”اِن الام تجب نفقتها ويجب عليها أن تنفق على ولدها اذا لم يكن له أب وبهذا قال أبو حنيفة والشافعي“ (المغنی لابن قدامہ ۱۱/۳۰۳)

(ماں کا نفقہ اولاد پر واجب ہے، اسی طرح ماں پر واجب ہے کہ وہ اپنی اولاد پر خرچ کرے، اگر اس کا باپ نہ ہو، امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کی بھی یہی رائے ہے)

امام مالک کو اس سے اختلاف ہے، ان کے نزدیک عصبات پر نفقہ واجب ہوتا ہے۔

”حكى عن مالك انه لا نفقة عليه ولا لها لانها ليست عصبة لولدها. (المغنی ۱۱/۳۷۳)

مزید فرماتے ہیں: **”فان اعسر الاب وجبت النفقة على الام ولم ترجع بهذا عليه ان ايسر“** (المغنی ۱۱/۳۷۳)

(اگر باپ تنگ دست ہو اور اولاد کا نفقہ نہ برداشت کر سکے تو ماں پر اس کا نفقہ واجب ہو جائے گا، یہ اس کی طرف سے قرض نہ ہوگا، اس لئے باپ خوش حال یا صاحب حیثیت ہو جائے تو اس کا مطالبہ نہ کر سکے گی۔)

اسی طرح یہ بھی کہا گیا ہے: **ام معسرة وجدة موسرة النفقة على الجدة“** (المغنی ۱۱/۳۷۶)

(ماں تنگ دست اور دادی خوش حال ہے تو نفقہ دادی پر واجب ہوگا)۔

بالغ اولاد جو اپنا خرچ نہیں اٹھا سکتی اس کے متعلق فقہ حنفی میں کہا گیا: **”وتجب نفقة الابنة البالغة والابن الزمن على ابويه اثلاثا على الاب الثلثان وعلى الام الثلث“** (ہدایہ نصب الرایہ ۳/۴۰۷)

(لڑکی جو بالغہ ہے اور لڑکا جو بلوغ کے بعد معذور اور اپاہج ہے اس کا نفقہ باپ اور ماں دونوں پر واجب ہوگا، باپ پر دو ثلث اور ماں پر ایک ثلث)۔

اسی طرح کہا گیا ہے کہ بھائی اگر تنگ دست ہے تو بہنوں پر ان کی میراث کے لحاظ

سے نفقہ واجب ہے، ''**ونفقة الآخ المعسر على الاخوات المتفرقات اخماسا على قدر الميراث**'' (ہدایہ مع فتح القدیر ۴/۳۸۱) وہ اس طرح کہ حقیقی بہن پر ۳/۵ اور اخیافی بہن اور علاتی بہن میں سے ہر ایک پر ۱/۵ ہوگا۔

اسی طرح کی اور بھی صورتیں ہوسکتی ہیں جن میں عورت پر از روئے شرع افراد خاندان کا نفقہ واجب ہوتا ہے، یہ ایک قانونی بحث ہے، افراد خاندان میں الفت ومحبت اور تعاون و ہمدردی کے جو فطری جذبات پائے جاتے ہیں، اس کے کچھ اور تقاضے ہیں، اسلام ان جذبات کو ابھارتا اور تقویت پہنچاتا ہے، شوہر کا نفقہ بیوی پر کسی حال میں واجب نہیں ہے، لیکن خوش حال بیوی تنگ دست شوہر کی مدد کرسکے تو یہ اعلیٰ اخلاق کا ثبوت ہوگا، شریعت اسے بہت بڑے اجر وثواب کا عمل قرار دیتی ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی معاشی حالت اچھی نہیں تھی، ان کی بیوی زینبؓ ان پر اور اپنے یتیم بچوں (جو سابق شوہر سے تھے) پر خرچ کرتی تھیں، انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا:

''**ایجزی عنی ان انفق علی زوجی وایتام فی حجری**'' (کیا میرا اپنے شوہر پر اور اپنے ان یتیم بچوں پر جو میری حفاظت اور نگرانی میں ہیں خرچ کرنا میری طرف سے کافی ہوجائے گا اور میں اپنے فرض سے سبکدوش ہوجاؤں گی) یہی سوال ایک اور خاتون کو درپیش تھا، ان کا نام بھی زینب تھا، آپ نے دونوں سے فرمایا:

''**نعم لهما أجر ان أجر القرابة وأجر الصدقة**'' (**بخارى، كتاب الزكوٰة، باب الزكوٰة على الزوج والايتام فى الحجر، مسلم، كتاب الزكوة، باب فضل النفقة والصدقة على الاقربين والزوج والاولاد الخ۔**)

(ہاں ان کے دو اجر ہیں، ایک قرابت کا اجر اور ایک صدقہ کا اجر)

حضرت ام سلمہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ ابوسلمہؓ کے بچوں پر اگر میں خرچ کروں تو کیا مجھے اس کا اجر ملے گا، میں انہیں چھوڑ بھی نہیں سکتی، بہرحال وہ میرے بچے

ہیں، آپ نے فرمایا: ''**نعم لک اجر ما انفقت علیهم**'' (بخاری، کتاب النفقات حدیث ۵۳۶۹)

اس سلسلہ میں فقہی مباحث سے قطع نظر بعض اوقات عورت پر افراد خانہ کے نان ونفقہ کی قانونی اور اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اس لئے اگر وہ اپنی مالی حیثیت کو بہتر بنانے کی کوئی جائز تدبیر اختیار کرے تو اسے غلط نہیں کہا جاسکتا۔

۳- اسلام نے دنیا میں ملوث ہونے اور اپنی تمام توانائیوں کو اس میں لگانے سے منع کیا ہے اور قناعت کی تعلیم دی ہے، لیکن اس کے ساتھ اگر کوئی شخص جائز اور حلال ذرائع سے مال حاصل کرتا ہے اور آرائش وراحت کی زندگی گزارتا ہے تو اس کی بھی اجازت ہے، اس معاملہ میں مرد اور عورت کے درمیان فرق کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے، عورت بھی اسلامی حدود میں عزت کی جگہ راحت کی زندگی گزارنے کی کوئی تدبیر اختیار کرے تو اسے غلط نہیں کہا جاسکتا۔

۴- عورت کے اندرون خانہ اپنی معاشی مصروفیت کے لئے شوہر سے اجازت لینی ضرورت ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت کے نان ونفقہ کا مرد ذمہ دار ہے، وہ کسب معاش کے لئے مجبور نہیں ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ نان ونفقہ کے عوض شوہر کے لئے وہ اپنا وقت فارغ کرتی ہے، ہدایہ میں ہے:

''**النفقة جزاء الاحتباس، فكل من كان محبوسا بحق مقصود لغيره كانت نفقة عليه**''

اس کی دلیل یہ دی گئی ہے:

''**اصله القاضي والعامل فى الصدقات**'' (ہدایہ مع الدرایہ ۳/۳۹۶)۔

جب عورت کے اوقات شوہر کے لئے فارغ ہیں تو وہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی دوسری مصروفیت نہیں اختیار کرسکتی۔

۵-عورت کے گھر کے اندر کوئی ذریعہ معاش اختیار کرنے کے لئے جب شوہر کی اجازت ضروری ہے تو اس مقصد سے باہر نکلنے کے لئے بدرجہ اولیٰ اجازت ضروری ہوگی، شوہر اسے اجازت بھی دے سکتا ہے اور منع بھی کر سکتا ہے۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں:

"وللزوج منعها من الخروج الى مالها منه بد"

(شوہر کو یہ حق ہے کہ عورت کو باہر نکلنے سے ان امور کے لئے بھی منع کر دے جو اس کے لئے ضروری ہیں)۔

مزید کہتے ہیں: **ولا يجوز لها الخروج الا باذنه"** (المغنی ۱۰/۲۲۴)

(عورت کے لئے شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نکلنا جائز نہیں ہے)

اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ شوہر کو قانونی طور پر اس کا حق ہے کہ بیوی کو اپنے والدین کی عیادت کے لئے جانے سے بھی منع کرے، لیکن یہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کے منافی ہے، اس لئے اس کی اجازت دینی چاہئے، اسی طرح وہ بیوی کو مسجد جانے سے بھی روک سکتا ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ انہیں نہ روکا جائے۔

عورت کے سفر کے سلسلہ میں حدیث میں صراحت ہے کہ مسافت سفر سے زیادہ کا سفر ہو تو اس کے ساتھ محرم کا ہونا ضروری ہے، حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **"لا تسافر امراة مسيرة يوم وليلة الا ومعها ذو محرم"** (متفق علیہ)

آج کل ملازمت کبھی دن کی ہوتی ہے اور کبھی رات کی، خطرات دونوں میں ہیں، اس سلسلہ میں کوئی اصول وضع نہیں کیا جا سکتا، دیندار مرد اور عورت فائدہ اور نقصان اور عدم خطرہ کا خود ہی فیصلہ کر سکتے ہیں۔

عورت کی کفالت کی ذمہ داری اس کے ولی یا شوہر کی ہے، اگر وہ اس ذمہ داری کے ادا کرنے سے معذور ہیں یا عملاً ادا نہیں کر رہے ہیں تو اس کے احکام دوسرے ہیں، اس سے

اس کا یہ حق نہیں ہوتا کہ ان کی اجازت ہی سے گھر سے باہر نکلنا چاہئے۔

۶-اس ذیل میں تین اہم اصول سامنے آتے ہیں، ایک یہ کہ مرد ہو یا عورت وہ ایسی ملازمت نہیں اختیار کر سکتے جو شرعی نقطہ نظر سے جائز نہ ہو، جیسے بینک یا شراب کا کاروبار، یا اسی نوعیت کے دوسرے کام جن کی حرمت قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ عورت کو اس کے ولی یا شوہر کی اجازت حاصل ہو۔

تیسرا اصول یہ ہے کہ عورت اور مرد کا اختلاط نہ ہو، اس پر تفصیل سے بحث آگے آرہی ہے۔

خواتین ایسے اداروں میں ملازمت کر سکتی ہیں جہاں خواتین ہی خدمت انجام دیتی ہوں اور کام کی جگہوں میں مرد نہ ہوتے ہوں۔ مرد ذمہ دار ہوں تو شرعی حدود کے اندر ان سے بات ہو سکتی ہے، اس سلسلہ میں دو امور غور طلب ہیں، ایک یہ کہ عورت کی حدود وحجاب، دوسرے عورت کا کسی غیر محرم سے بات کرنا۔

جہاں تک عورت کے حجاب کا تعلق ہے، یہ قرآن وحدیث سے ثابت ہے، اس میں چہرہ اور ہاتھ کا پردہ بھی شامل ہے۔ (کسی قدر تفصیل کے لئے دیکھی جائے: المغنی ۹/۴۹۸-۵۰۰)۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں کہ عورت کسی اجنبی کے سامنے اپنے بدن کا کوئی حصہ نہیں کھول سکتی اور کسی معقول وجہ کے بغیر مرد کا اسے دیکھنا بھی جائز نہیں ہے۔

"نظر الرجل الى الاجنبية من غير سبب فانه محرم الى جمعيها" (المغنی ۹/۴۹۸)

فقہ حنفی میں کہا گیا ہے کہ بوقت ضرورت عورت کے چہرہ اور ہاتھ کو دیکھا جا سکتا ہے۔

"وينظر من الاجنبية الى وجهها وكفيها فقط للضرورة" (الدار المختار مع ردالمختار ۹/۵۳۱)

ابن قدامہ کہتے ہیں کہ اگر کسی عورت سے کاروبار یا اجرت کا معاملہ ہو تو اس کے چہرہ کو آدمی دیکھے گا تاکہ اسے پہچان سکے اور نقصان ہو تو تاوان کا مطالبہ کرسکے ایک روایت ہے کہ امام احمدؒ نے اسے ناپسند کیا ہے یا بڑی بوڑھی عورت سے متعلق قرار دیا ہے۔

ابن قدامہ کہتے ہیں کہ اس کا تعلق اس سے ہے کہ آدمی عورت کو بے ضرورت دیکھے لیکن جہاں ضرورت ہو اور شہوت نہ پائی جاتی ہو تو دیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

”فأما مع الحاجة وعدم الشهوة فلا بأس“(المغنی ۹/۴۹۸)

اس سے اتنی بات واضح ہے کہ عورت حسب ضرورت ہاتھ اور چہرہ کھلا رکھ سکتی ہے اور مرد کے لئے اس کا دیکھنا جائز ہے، لیکن اس میں یہ احتیاط ضروری ہے کہ اس سے شہوانی جذبات نہ مشتعل ہوں اور آدمی غلط روی نہ اختیار کرے۔

فقہاء کے ہاں نامحرم کے سامنے چہرہ اور ہاتھ کھولنے کی گنجائش ملتی ہیں، ان میں سے بیشتر کا تعلق وقتی اور ہنگامی ضروریات سے ہے، اس لئے اسے قاعدہ کلیہ بنانے میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔

چہرہ اور ہاتھ کھولنے کی جو صورت بیان ہوئی ہے ان میں یہ شرط موجود ہے کہ جنسی جذبہ محرک نہ ہو ورنہ اس کا جواز ختم ہو جائے گا۔

اس پس منظر میں کسی خاتون کا سیلز گرل ہونا یا ایسی نوع کا کام کرنا صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ اس میں حدود حجاب کی پابندی ممکن نہیں ہے، نامحرم مردوں سے مسلسل ربط وتعلق اور ایک طرح کا اختلاط ہوتا ہے، کاروباری گفتگو میں گاہک کو متاثر کرنے کے لئے گفتگو میں دل ربائی کا انداز اختیار کرنا پڑتا ہے، جسے پسندیدہ نہیں کہا جاسکتا۔

(مضمون نگار امیر جماعت اسلامی ہند ہیں)

☆☆

خواتین کی عصمت وناموس کے تحفظ کا مسئلہ
قانون اور معاشرہ کی روشنی میں

● مفتی احمد نادر القاسمی

آج پوری دنیا میں خواتین کے تحفظ وحقوق کا مسئلہ ہر دن کہیں نہ کہیں زیر بحث رہتا ہے، اس کے بارے میں مختلف انداز سے غور وفکر بھی ہو رہا ہے، قراردادیں بھی منظور ہو رہی ہیں، قوانین بھی پاس ہو رہے ہیں، اقوام متحدہ پوری دنیا میں اپنی طاقت صرف کر رہا ہے، مگر نتیجہ صفر ہے، دراصل اقوام متحدہ کی جو کوشش ہے وہ خواتین کے Freedom اور آزادی کی ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ اسے صرف ہر قسم کی آزادی دی جائے، مگر اقوام متحدہ اس حقیقت کو نظر انداز کرتا ہے کہ بے مہابا اور بے لگام آزادی بھی خود انسان کیلئے مصیبت بن جاتی ہے، اور خواتین کے ساتھ یہی ہو رہا ہے، خواتین کی ضرورتوں، ان کی حقیقی مصلحتوں اور تقاضوں کو پس انداز کرنے کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ ان کی مصیبت کم کیا ہوگی کہ روز بروز بڑھتی ہی جارہی ہے، ”مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی“ کی صورت حال سے پوری دنیا میں یہ کمزور مخلوق دوچار ہے، مرض کچھ ہے اور دوا کوئی اور تجویز کی جارہی ہے، المیہ یہ ہے کہ خواتین کے حق میں جتنے بھی قوانین بن رہے ہیں ان میں سب سے بڑی خرابی یہ ہوتی ہے کہ ان میں قانون فطرت اور خواتین کی نفسیات کو نظر انداز کرکے قانون ترتیب دینے کی کوشش کی جاتی ہے، اگر ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس جانب کوشش ہوتی تو یقیناً مفید ہوتی۔

اس وقت ہمارے آزاد بھارت میں بھی اس مخلوق کا کچھ ایسا ہی حال ہے، جہاں پورا معاشرہ ایک طرف ذہنی طور پر بیمار ہے، تو دوسری طرف اس بیماری کو تقویت پہونچانے والے اسباب وعوامل بھی عروج پر ہیں، اور دونوں مل کر اس طرح اپنا کمال دکھا رہے ہیں کہ کوئی دن ایسا نہیں گذرتا جس میں کوئی واقعہ خواتین پر زیادتی، عصمت دری، قتل اور آبروریزی کا پیش نہ آتا ہو، پورے بھارت میں عصمت دری کے ہونے والے وہ واقعات جو شاید روشنی میں آجاتے ہیں ان کے اعداد وشمار کا ہی اندازہ لگانا اور صحیح ڈاٹا پیش کرنا ناممکن ہے، اور جو دبائے گئے، یا عورت نے خوف اور دھمکی کی وجہ سے اس کا اظہار نہیں کیا وہ تو علاحدہ ہیں، یہ کیسا سماج ہے، کیسا ملک کا نظم وانتظام ہے۔ میں اس وقت حیرت زدہ رہ گیا جبکہ ۲۶/دسمبر ۲۰۱۲ء کے روزنامہ انقلاب میں یہ خبر پڑھی کہ ۵۰/خواتین تنظیموں نے زنا کی سزا موت کی مخالفت کی ہے، غور طلب بات ہے کہ ایک طرف ملک کے ارباب دانش اس لعنت سے معاشرے کو پاک کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے قانونی تدابیر تلاش کر رہے ہیں، اور دوسری طرف خواتین ہی اس کی مخالفت کر رہی ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس ملک کی عورتیں چاہتی کیا ہیں؟ اس باب میں خواتین تنظیموں کا سزائے موت کی مخالفت کرنا حد درجہ ناعاقبت اندیشانہ ہے اور ناسمجھی پر مبنی ہے، اس ملک کے موجودہ معاشرے کو دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمام تدبیروں کے بعد بھی یہ لعنت تو ختم نہیں ہوگی، البتہ عورتوں کے قتل کی وارداتوں میں اضافہ ضرور ہو جائے گا، لوگ عصمت دری کے بعد اپنا جرم چھپانے کیلئے عورتوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کریں گے، اس بارے میں اچھی طرح غور وفکر کی ضرورت ہے۔ بہر حال بھارت کے ہر ذی شعور انسان کیلئے یہ لمحہ فکر یہ ہے کہ ہندوستان کا انسانی معاشرہ آج کس راہ پہ جا رہا ہے، اسے کون سی اخلاقی تربیت دی جا رہی ہے؟ اسے کس طرح ایجوکیٹ کیا جا رہا ہے کہ وہ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود ناخواندہ جیسی حرکتیں کر رہا ہے، تاریخی تجزیہ بتاتا ہے کہ قانون کے نام پر چاہے جتنا بھی سخت قانون نافذ

کر دیا جائے صرف قانون سازی سے معاشرہ کی بے راہ روی پر قدغن لگنے والا نہیں ہے، اور نہ ہی خواتین اور بچیوں کی عصمت کو ہم خاطر خواہ تحفظ فراہم کرنے میں کامیاب ہوں گے، بلکہ معاشرہ میں پائی جانے والی ان خرابیوں پر اسی وقت قابو پانا ممکن ہے جب ہم خود انسانی معاشرہ کو صحیح انسانی اور اخلاقی خطوط پر استوار کرنے کی تدبیر کریں، ان وجوہات کو جاننے کی کوشش کریں جن کی وجہ سے یہ معاشرہ اخلاقی گراوٹ کے اس مقام تک پہنچا ہے۔

آج عصمت دری کے سنگین واردات کے سد باب کیلئے ملک کے دانشوران اور یہاں تک کہ وہ لوگ جو اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کے وجود سے نفرت کر رہے تھے، اور اسلامی قانون کو وحشیانہ قانون بتا رہے تھے وہ بھی اسلام کے قانون زنا کو نافذ کرنے کی بات کہہ رہے ہیں، یہ بہت اچھی علامت اور خوش آئند بات ہے، اور ہمارے ملک کے بہت بڑے ہندو دھرم کے نمائندہ مذہبی شخصیت سادھو اوم نے یہ بات کہی ہے یہ کوئی کم بڑی بات نہیں ہے، ہم ان کا استقبال کرتے ہیں کہ انہوں نے انسانیت کے تئیں اور خواتین کی عصمت کے تحفظ کے جذبہ سے انسانیت کیلئے نفع بخش اسلامی قانون کی نافعیت اور معنویت کو سمجھا۔ اور اس کا مطالبہ کیا اور ملک کے قانون ساز ادارے کو اس پر مجبور کرنے کا عندیہ بھی دیا ہے، ہم ان سے بھی مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ سماج سیوک اور سماج کے شبھ چنتک کی حیثیت سے اس پر بھی غور کریں کہ سماج میں اس طرح کی خرابیاں پیدا ہونے کے اسباب کیا ہیں؟ اور انہیں کو جڑ سے ختم کرنے کی تدبیر کریں، جب وہ ختم ہو جائیں گے تو اپنے آپ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

قانون زنا کے نفاذ سے پہلے اس حقیقت کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اسلام کس طرح کا انسانی معاشرہ تشکیل دینا چاہتا ہے، اس کے لئے کیا تدابیر کرتا ہے جب تک اس کے پورے خدوخال ہمارے سامنے نہیں ہوں گے اس کی جامعیت کو ہمارے لئے سمجھنا ممکن نہیں ہے، معاشرہ کے تئیں اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ وہ پر امن، صاف وشفاف اور ہر طرح

کے جرائم وکرائم سے پاک انسانی معاشرہ کی تشکیل کی وکالت کرتا ہے، اور سب سے پہلے ان بنیادوں اور وجوہات کو ختم کرنے پر زور دیتا ہے جن کی وجہ سے جرائم پیدا ہوتے ہیں، آپ زنا کو ہی لے لیجئے! معاشرہ میں کبھی اس طرح کی واردات نہ ہو اس کے لئے اسلام نے مردوں پر بھی پابندیاں عائد کیں ہیں اور عورتوں کو بھی اخلاقی طور پر ذمہ داری دی ہے، آج ہمارے ملک میں لڑکے اور لڑکیوں کی شادیوں میں بے جا تاخیر، معاشرہ میں بے پردگی اور کھلا پن، سنیما اور ٹی وی اشتہارات سے لیکر اخبار وجرائد تک عریانیت کی گرم بازاری اور کو ایجوکیشن کی وجہ سے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کا اختلاط وغیرہ، اخلاقی جرائم کے پنپنے میں سب سے زیادہ معاون و مددگار ہیں اور نئی نسل کو بے راہ روی کی طرف لے جانے اور زنا و عصمت دری جیسے گھناؤنے فعل کا ارتکاب کرنے میں مہمیز کا کام دیتے بلکہ اس پر ابھارتے ہیں اور یہ صورت حال تقریباً پوری دنیا کے آزاد معاشرہ میں ہے اور ہمارا بھارت بھی پوری طرح اس کی دلدل میں پھنسا ہوا ہے اس سے پاک نہیں ہے۔

میں ان حقائق کی طرف بھی توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں جو ایک جرائم سے پاک معاشرہ کیلئے لازمی عنصر حیثیت رکھتے ہیں، اسلام کہتا ہے کہ لڑکا اور لڑکی جب بالغ ہو جائیں تو خود ان کی شادی کا بندوبست کیا جائے، مگر ہمارا معاشرہ آج کی معاشی الجھنوں کی وجہ سے اس کو ماننے کو تیار نہیں ہے۔ اسلام ایک غیر محرم مرد اور عورت کی یکجائی، تعلقات اور میل ملاپ کو سختی سے منع کرتا ہے اور اسے ناجائز تصور کرتا ہے، واقعات بتاتے ہیں کہ بہت سے خودکشی، عصمت دری اور قتل کی واردات میں اس طرح کے تعلقات بھی کارفرما رہے ہیں، کیا ہمارا ہندوستانی معاشرہ کو تسلیم کرنے کو تیار ہے؟ ہمارے ملک میں قانوناً ایک مرد اور ایک عورت اپنی مرضی سے بغیر شادی کے کسی بھی طرح کا تعلق اگر رکھتے ہیں تو اسے جرم تسلیم نہیں کیا جاتا، (سماج بھلے ہی اسے غلط تصور کرتا ہو مگر قانوناً جرم نہیں مانا جاتا) جبکہ اسلام اس کو بھی نہ صرف یہ کہ جرم مانتا ہے، بلکہ اسے قابل سزا جرم قرار دیتا ہے، ہمارا ہندوستانی معاشرہ

بلاتفریق مذہب وملت اس کو تسلیم کرنے کو راضی ہے؟ اور پھر مرد وعورت دونوں کیلئے لباس و پوشاک کا مسئلہ ہے جس کی وجہ سے انسانی طبیعت اذیت ناک حد تک ہیجانی کیفیت کا شکار ہوتی ہے، اس تعلق سے انسان کی دونوں جنس اپنا رویہ تبدیل کرنے پر کیا آمادہ ہیں؟ اسلام نے ان تمام چیزوں کے بارے میں واضح ہدایات دئے ہیں، اور اس کے علاوہ دنیا کے موجودہ کسی بھی مذہب میں اتنی واضح تعلیمات ہمیں نہیں ملتیں، اسلام ان تمام اخلاقی حد بندیوں کے بعد قانون کا سہارا لیتا ہے، اگر ہندوستانی معاشرہ بھی اسلام کے ان شفاف اصولوں کو اختیار کر لیتا ہے تو پھر کبھی یہ شکایت نہیں ہوگی کہ بھارت میں عورتوں کی عصمت محفوظ نہیں ہے، اور اس کے بعد یقیناً عورتوں کے ساتھ اختیار کئے جانے والے حیوانی رویوں پر بندش لگانا ممکن ہوگا۔

سماج کو صحیح قالب میں نہ ڈھالنے کی ہی وجہ ہے آپ دیکھتے ہوں گے کہ بہت سے مسلم ممالک جہاں انسانی معاشرہ کو صحیح اسلامی خطوط پر استوار نہیں کیا گیا ہے وہاں قانون موجود ہونے کے باوجود برائیاں موجود ہیں اور خوب پھل پھول رہی ہیں۔ اس لئے نیک نیتی اور معاشرہ وسماج کی خیر خواہی اور تعمیر کے جذبہ سے اس راہ میں قدم رکھنے کی ضرورت ہے، اور انسانی اقدار واخلاق سمجھنے والے سبھی لوگوں کیلئے تشویش اور فکرمندی کا موقعہ ہے، سرکار کو چاہئے کہ وہ اس بارے میں ملک کی بڑی بڑی سماجی تنظیموں کو بھی اپنے ساتھ رکھے، جیسے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا، جماعت اسلامی ہند اور دیگر ہندو تنظیمیں اور ان سے قانون کے پورے خدوخال اور نوک پلک پر گفت وشنید کرے اور پھر پارلیمنٹ میں قانون کا جامع مسودہ پیش کرے۔

آخر میں میں ان وجوہات کی طرف بھارت کے پورے معاشرے کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ انسانوں میں جرائم، عصمت دری، اور فساد وعدوان جیسے گھناؤنے جذبات کیوں پیدا ہوتے ہیں، اور ہمارے ہندوستانی معاشرے میں اس طرح کے ذہنی فتور

پیدا ہونے کے کیا اسباب ہیں، اس پر غور وفکر کرنے سے جو چیزیں سامنے آئی ہیں ان کو مندرجہ ذیل امور میں نمبر وار سمیٹا جا رہا ہے:

۱۔ میرے تجزیہ کے مطابق بھارتی معاشرہ میں سماجی، نظریہ سازی، طرز زندگی کے تعین اور فکر وسوچ اور لوگوں کے دل ودماغ کو بنانے اور تبدیل کرنے میں بہت بڑا رول فلمی کلچر اور فلم انڈسٹری کا ہے، آپ اگر جرائم کے اسٹائل اور نہج پر غور کریں تو ہر جگہ آپ کو وہی فلمی انداز اور ساز باز نظر آئے گا۔ جس طرح اور جس اسٹائل میں زنا، اجتماعی عصمت دری، کالجوں، سڑکوں پر لڑکیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ، چوری، ڈاکہ زنی، شراب وسگریٹ نوشی، مار پیٹ، چیٹنگ وغیرہ فلموں میں دکھائے جاتے ہیں، اسی انداز سے معاشرے میں جرائم کا ارتکاب ہوتا ہے، معلوم یہ ہوا کہ یہ سارے نالج معاشرے میں فلموں سے سپلائی ہوتے ہیں، اگر جرائم پر قابو پانا ہے تو اس پر بندش لگانا لازمی ہے، فلم انڈسٹری کے لوگ بہانا بنا کر کہتے ہیں کہ جو سماج میں ہو رہا ہے ہم اس کو فلما کر دکھاتے ہیں، ایسا نہیں ہے، سماج میں جو ہوتا ہے وہ آنے والی نسلوں کیلئے نظیر اور اسے اختیار کرنے والا طریقہ نہیں سمجھا جاتا، مگر فلموں کے ذریعہ بار بار دکھائے جانے سے نئی نسل میں ویسے ہی جذبات پیدا ہوتے ہیں، اس لئے پہلے اس سوتے کو بند کرنا ضروری ہے، اگرچہ یہ مشکل کام ہے، مگر دیش اور سماج اور قانون اور ان کے مفادات سے کوئی چیز اوپر نہیں ہے۔

۲۔ بھارت کے اسکول اور کالج میں ہماری بچیوں کے جو لباس اور اسکول ڈریس ہیں، ہماری جوان بچیاں نیم برہنہ ہو کر اسکول جاتی ہیں، یہ کس قدر بے غیرتی کی بات ہے اور ہم صرف یہ کہہ کر اس کو قبول کرتے ہیں کہ یہ اسکول کا پورٹوکول ہے، انسانی فطرتوں کو محض قانون کے سہارے بدلا نہیں جاسکتا، اس کے لئے روش کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے، اس طرح سے دیش کی بچیوں کو بے لباس یا کم لباس کر کے اس کے وقار کو چھینا اور غیر محفوظ کیا جارہا ہے، اگر سماج کو بدلنا ہے تو اسے بھی گہرائی کے ساتھ دیکھنے کی ضرورت ہے۔

۳۔ کلاس میٹ اور لڑکے اور لڑکیوں کے دوستانہ ماحول کو جس طرح اسلام نے غیر شرعی قرار دیا ہے، اس کو اسی فریم میں غلط اور جرم تصور کیا جانا چاہئے۔

۴۔ لڑکے اور لڑکیوں کی شادی میں جس میں کے اس کی فطرت اس کی متقاضی ہو چکی ہو، تعلیم وتربیت اور سیٹل ہونے کے نام پر تاخیر نہ کی جائے۔

۵۔ کالج اور یونیورسٹی کے طلبہ وطالبات کو پکنک کے نام پر دوسرے شہروں میں گھومائے جانے کے سسٹم کو یا تو بند کیا جائے یا پھر سپریٹ کیا جائے۔

۶۔ گرلس ہوسٹلوں میں اگر کوئی بچی تاخیر سے اپنے کمرے میں آتی ہو تو انتظامیہ اور پیرنٹس کی طرف سے ہوسٹل کے ذمہ دار کو پابند کیا جائے کہ وہ لڑکیوں سے باز پرس کرے، کہ آپ کے کالج ختم ہونے کا جو وقت ہے اس سے اتنی تاخیر کیوں ہوئی، اس کا ان کو اختیار دیا جائے، اسکول اور کالج سے تاخیر گھر پہونچنے والی لڑکیوں اور لڑکوں سے والدین دریافت کریں کہ آپ تاخیر سے کیوں آرہے ہیں، اور کہاں تھے۔

۷۔ خواتین کی آزادی کے نام پر جس طرح بے لباسی عام ہو رہی ہے قانوناً ملک میں اس کی ایک حد مقرر کی جائے۔

۸۔ اخبارات، اور الیکٹرونک میڈیا میں برہنہ اور نیم برہنہ اشتہارات اور عورتوں کی تصاویر چھاپنے اور نشر کرنے پر پابندی لگائی جائے۔

۹۔ گھروں میں فرینڈس کے نام پر بچیوں سے ملنے آنے والے جوان لڑکوں پر والدین نظر رکھیں اور اپنی بچیوں کو بھی جائز ونا جائز حدود کو سمجھائیں۔

۱۰۔ تفریح گاہوں میں غیر شادی شدہ اور شادی شدہ جوڑوں کی نازیبا حرکتوں پر پولیس اور انتظامیہ کی طرف سے نظر رکھی جائے اور پابندی لگائی جائے، ورنہ بے راہ روی اور معاشرہ کی بربادی کو روکا نہیں جاسکے گا۔

۱۱۔ فیشن شو اور مقابلہ حسن کے نام پر جس طرح ہمارے دیش کی بچیوں کو دنیا کے

سامنے برہنہ کیا جاتا ہے،اس پر پابندی لگائی جائے۔

ان مذکورہ اصولوں کونظرانداز کر کے محض سخت سے سخت قانون معاشرہ کیلئے نہ تو مفید ہوگا اور نہ ہی عورتوں اور بچیوں کے عزت و ناموس کے تحفظ کی کوئی ضمانت ہوگی، بلکہ یہ ساری قانونی جدوجہد بے معنی ہوگی۔ بہرکیف محض تفریح اورانٹرٹینمنٹس کے نام پر بھارت کے معاشرے کومغرب کی حیاسوز تہذیب کی بھٹی میں نہیں جھونکا جاسکتا،اگراس پر ابھی سے ہی روک نہیں لگی تو کل کے بھارت کی تہذیب کی بربادی کے سیلاب کو روکنا بہت مشکل ہوگا،اور پھر ہمارے بھارت میں نہ تو عورتوں کی عزت محفوظ رہے گی اور نہ ہی ملک میں کوئی اچھا معاشرہ باقی رہ سکتا ہے،وہ لوگ جن کی نظروں میں یہ کوئی عیب اور برائی نہیں ہے،ان کو نہ مانیں اور عقلی گھوڑے دوڑائیں، اس سے انکار نہیں کرسکتے، بہرکیف ہر قیمت پر ہمارا مطالبہ ہے کہ بھارت میں ایک ایسا معاشرہ وجود میں آئے جو ہر طرح کی اخلاقی خرابیوں سے پاک اور پرامن ہو،اس کی ذمہ داری قانون نافذ کرنے والے،اپنے شہریوں کوتحفظ فراہم کرنے والے اداروں کی بھی ہے،اوراس ملک میں بسنے والے ہرانسان کی ہے، پھر دیکھئے مشرق سے مغرب تک کوئی عورت تنہا سفر کرے گی اوراسے کوئی خوف نہیں ہوگا،جس طرح اسلامی دور میں ہوا کرتا تھا۔

(مضمون نگار ماہراسلامیات اورفقہ اکیڈمی انڈیا سے وابستہ ہیں)

☆☆

مسلم طالبات کی اعلیٰ تعلیم کا مسئلہ

● نور جہاں شکیل

علم ایک قوت ہی نہیں تسخیر قوت ہے۔اپنے خالق کو پہچاننے اور دنیا کو سمجھنے کے لئے علم کی ضرورت ہے۔ اسلام میں علم کا حاصل کرنا ہر مرد و عورت پر فرض قرار دیا گیا ہے۔اور قرآن نے لفظ ''اقرأ'' کہہ کر علم کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔علم کی بدولت ہی انسان نے سنگلاخ زمینوں اور چٹیل میدانوں کو سبزہ زار بنایا ہے۔سمندر کی تہوں سے بے شمار معدنیات نکالے ہیں اورآسمان کی وسعتوں کو کھنگال کر تحقیق کے نئے پرچم لہرائے ہیں۔دنیا میں جتنے بھی محیرالعقول کارنامے ہیں خواہ وہ تعمیری ہوں یا تخریبی، سب علم کی بدولت ہی وجود میں آئے ہیں۔ بیسویں صدی دنیا کی بڑی ترقی اور ایجادات کا دور ہے۔سائنس، ٹکنالوجی اور علم الفلکیات میں انسان نے بیحد ترقی کی ہے۔علوم وفنون میں نئی نئی راہوں کا اضافہ ہوا ہے۔انسانی ذہن کی وسعتیں لامحدود ہوگئی ہیں۔

لفظ ''علم'' کی اس تعریف یا تمہید کے بعد اس وقت ہمارے سامنے ایک اہم مسئلہ ہے ''مسلم طالبات کی اعلیٰ تعلیم'' کا۔ظاہر ہے ہم بھی اسی دنیا کے فرد ہیں اوراسی سماج کا حصہ، وقت کے تقاضوں سے انحراف کرنا یا چشم پوشی اختیار کرنا ہمارے لئے نہ قومی لحاظ سے مفید ہے اور نہ ملی لحاظ سے،قوموں کی ترقی کا راز ہمیشہ سے حصول علم میں پنہاں رہا ہے اس لئے کھلے ذہن کے ساتھ ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ مسلم طالبات کے لئے بھی آج اعلیٰ تعلیم کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی مردوں کو۔مرد و عورت زندگی کی گاڑی کے دو پہیئے ہیں۔

اس گاڑی کا توازن برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ دونوں پہیئے متوازن ہوں اگر صرف مردوں کے لئے اعلیٰ تعلیم کے حصول کو ضروری قرار دیا گیا اور لڑکیوں کے لئے غیر ضروری تو نہ صرف ہمارا خانگی نظام درہم برہم ہوگا بلکہ آنے والی نسلوں کے لئے بھی نقصان دہ ہوگا۔ بچے کی پہلی درسگاہ ماں کی گود ہے۔ سب سے پہلے وہ جو کچھ سیکھتا ہے ماں کی گود سے سیکھتا ہے۔ اپنے گردوپیش کے حالات اور آوازوں سے وہ لاشعوری طور پر متاثر ہوتا ہے اور یہیں سے اس کا ذہن بتدریج شعوری مدارج طے کرتا ہے۔ ماں کی علمیت، صلاحیت اور دانشمندی ایک بچے کی تعمیری اور تخلیقی قوتوں میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک مرد کی ترقی میں ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے خواہ وہ بیوی ہو، بہن ہو یا ماں، اس لئے ہم ایک لڑکی کی اعلیٰ تعلیم کو ثانوی حیثیت نہیں دے سکتے۔

علم ایک روشنی ہے جو انسانی ذہن کو جلا بخشتی ہے، اسے اچھے اور برے کے درمیان امتیاز کرنے کی صلاحیت دیتی ہے، ایک باعزت زندگی گزارنے کے لئے راہیں ہموار کرتی ہے اور انسان میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ اگر مسلمان لڑکیوں کے پاس بھی اعلیٰ تعلیم ہوگی تو وہ عزت ووقار کے ساتھ دنیا میں زندگی گذار سکیں گی۔ کوئی نہیں جانتا انسان کی زندگی کے کس دور میں کیا مصیبت آجائے ایسے وقت میں علم ہی ایسی طاقت ہے جو اس کی ڈھارس بندھاتی اور زندگی کی تاریک راہوں میں چراغ جلاتی ہے۔ اس کے برعکس ایک غیر تعلیم یافتہ لڑکی کے پاس کسی مصیبت کے وقت کوئی ذریعہ نہیں ہوتا بجز اس کے کہ وہ کسم پرسی کی زندگی گذارے اور دوسروں کی محتاج ہوکر رہ جائے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ زندگی عزت کے ساتھ گذارنے کے لئے دی ہے۔

اب سے تقریباً ستر اسّی سال قبل اکبرالہ آبادی نے ایک شعر کہا تھا:

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

یہ شعر اپنی عمر کے لحاظ سے چاہے کتنا ہی پرانا کیوں نہ ہو لیکن اپنی افادیت اور اہمیت کے لحاظ سے آج بھی (اور شاید ہمیشہ) نیا رہے گا۔ لڑکیوں کے لئے اعلیٰ تعلیم جہاں ضروری ہے وہیں ''خاتون خانہ'' کا ہونا بھی ضروری ہے۔ تعلیم کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ ایک عورت اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے گھر کی یا ازدواجی زندگی کی ذمہ داریوں سے مستثنیٰ ہوجائے۔ گھر ایک عورت کی مملکت ہے جس کی خوشگواری کا انحصار زن وشو دونوں کے باہمی اعتماد اور خوشگوار تعلقات پر منحصر ہے۔ مذہب اسلام نے بیوی اور بچوں کی کفالت کی پوری ذمہ داری ایک مرد (شوہر) کے ذمہ سپرد کی ہے۔ وہ تمام اخراجات کا کفیل ہے جبکہ عورت پر اس طرح کی کوئی ذمہ داری نہیں حتی کہ وہ اپنے اثاثہ میں سے اپنے گھر اور بچوں پر کچھ خرچ نہ کرنا چاہے تو اس سے باز پرس کرنے کا کوئی مجاز نہیں۔ ایک لڑکی شادی کر کے ایک مرد کی صرف شریک زندگی ہی نہیں ہوتی وہ رفیق زندگی بھی ہوتی ہے۔ اس لئے بچپن سے لڑکیوں کو ایک ایسی تربیت کی شدید ضرورت ہے جو انہیں آئندہ آنے والی خانگی اور ازدواجی زندگی کا احساس دلائے۔ وہ لڑکیاں جو اعلیٰ تعلیم کے زعم میں ہر سطح پر مردوں سے برابری کا دعویٰ کرتی ہیں گھر کو کبھی خوشگوار ماحول نہیں دیتیں۔ گھر کوئی مٹی گارے سے بنی دیواریں نہیں بلکہ ایسا قلعہ ہے جہاں زندگیاں جنم لیتی ہیں، نسلیں پروان چڑھتی ہیں اور جہاں سے رہنے والے زندگی کی توانائی حاصل کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مرد وعورت دونوں کو بنایا ہے اور ایک گھر کا خوشگوار ماحول دونوں کے پیار ومحبت سے پروان چڑھتا ہے۔ علمی اور ذہنی اعتبار سے وہ ہم پلہ ہوسکتے ہیں لیکن جسمانی ساخت اور قوت میں وہ ایک مرد سے بالکل منفرد ہیں اسی لئے ان کے دائرہ کار بھی الگ ہیں۔ عورت کو اللہ تعالیٰ نے تخلیق کی عظیم قوت دی ہے تو مرد کو اس کا نگہبان اور نگراں بنایا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ضروری ہے کہ لڑکیوں کو بچپن سے ایسا ماحول اور تربیت دی جائے جہاں انہیں معلوم ہو کہ وہ مسلمان ہیں اور اسلام کے احکام کیا ہیں۔ ان کی ذمہ داریاں

کیا ہیں، پاکیزگی کردار کی اسلام میں کیا اہمیت ہے، اعلیٰ تعلیم کا مقصد کیا ہے، بچپن کی تعلیم و تربیت ایک انسان کی پوری زندگی کا احاطہ کرتی ہے، بقول حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی ''یہ امت محمدی ہے، علم اور قلم سے اس کا رشتہ جوڑ دیا گیا ہے۔ بغیر علم کے مسلمان مسلمان نہیں رہ سکتا، قرآن اور حدیث کے علم کے ذریعہ ہمیں جو حقائق بتائے گئے ہیں ان کے جانے بغیر یہ دین نہیں رہ سکتا''۔

آج عصری اور نصابی تعلیم کا دائرہ بہت وسیع ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے گھروں میں دینی تعلیم کا چراغ مدھم سے مدھم تر ہوتا جا رہا ہے، ضرورت ہے کہ اس چراغ کی روشنی کو زیادہ سے زیادہ نورانی بنائیں تاکہ ہمارے بچے جب اعلیٰ عصری تعلیم حاصل کریں تو یہ نور ان کی رہنمائی کرتا رہے۔ ورنہ جو علم خوف خدا کے بغیر ہوگا وہ انسانیت کی تباہی و بربادی کے اسباب مہیا کرے گا۔ سائنس کی ان عظیم ایجادات کے سہارے یہ بسی بسائی دنیا ایک لمحہ میں خس وخاشاک کی طرح اڑ جائے گی۔

مسلم طالبات کے لئے اعلیٰ تعلیم کی ضرورت ہے لیکن اسی کے ساتھ دینی علم وبصیرت کا ہونا بھی ضروری ہے۔

☆☆

جدید ہندوستان میں اردو تعلیم۔ مسائل اور ممکنہ حل

(اسکولی سطح پر)

● پروفیسر ریاض عمر

اردو تعلیم کا مسئلہ جدید ہندوستان کے لئے نیا نہیں ہے۔ جس دن سے ہندی کو قومی زبان کا درجہ دیا گیا اور اردو تعلیم کا رشتہ روٹی روزی سے بتدریج علیحدہ ہونا شروع ہوا اسی دن سے اس مسئلہ کی داغ بیل پڑ گئی۔

بلا مبالغہ لا تعداد ایک روزہ، دو روزہ، سہ روزہ سیمینار، ورک شاپ اور کانفرنسیں منعقد ہو گئیں اور اہل زبان اور اہل سیاست نے ببانگ دہل بہت سے اعلانات کئے لیکن فی صد کے حساب سے اردو تعلیم حاصل کر کے اس سے ریاستی اور قومی سطح پر فوائد حاصل کرنے والوں کی شرح کا گراف گرتا ہی جا رہا ہے۔ دیکھا جائے تو کچھ ریاستوں میں اردو میڈیم اسکولوں کی تعداد بڑھی ہے جیسے مہاراشٹر، آندھرا وغیرہ اور اردو میں تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد بھی بڑھی ہے۔ کچھ افراد نے نمایاں کامیابیاں بھی حاصل کی ہیں لیکن ملک کی بقیہ ریاستوں کا کیا حال ہے۔ یوپی، بہار، پنجاب حتیٰ کہ دہلی تک میں اردو تعلیم حاصل کر کے مقابلہ جاتی امتحانات میں اور درمیانے اور اعلیٰ درجے کی ملازمتوں میں ان کا حصہ ناقابل بیان حد تک نچلی سطح پر ہے۔

اس موضوع کو یہاں ختم کرتے ہوئے ہم اپنا دائرۂ بحث اس عنوان تک مرکوز رکھتے ہیں کہ جدید ہندوستان میں اردو تعلیم کے سلسلے میں کیا کیا مسائل سامنے موجود ہیں اور ان

سے خوش اسلوبی سے نمٹنے کے لئے کیا کیا ممکنہ حل ہو سکتے ہیں۔ اس دائرہ کو ہم مزید محدود کرتے ہوئے صرف اسکولی سطح پر اردو تعلیم کے مسائل پر غور کرتے ہیں۔ یہاں ہم اسکولوں کو دو کیٹیگری میں تقسیم کرتے ہیں۔

۱۔ ایسے اسکول جہاں درجہ اول سے لے کر دسویں جماعت تک اردو صرف بحیثیت ایک اختیاری مضمون پڑھائی جاتی ہے اور دیگر مضامین کے لئے ذریعہ تعلیم انگریزی، ہندی یا دیگر مقامی زبان ہے۔

۲۔ ایسے اسکول جہاں پرائمری سے لے کر سیکنڈری تک یا چھٹی جماعت سے سیکنڈری تک اردو لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی ہے اور دیگر مضامین کی تعلیم بھی اردو میڈیم کے ذریعے ہوتی ہے۔

پہلی کیٹیگری کے اسکول عموماً کوئی سرکاری امداد نہیں پاتے اور پرائیویٹ سوسائٹی یا ٹرسٹ کے ذریعے ان کا انتظام وانصرام ہوتا ہے۔ ان اسکولوں میں اردو تعلیم کے سلسلے میں دو بنیادی مسئلے ہیں:

اول یہ کہ ایسے طلباء اور طالبات کی تعداد کم از کم دس ہو تو اسکول کے اربابِ اختیار سے درخواست کی جاتی ہے کہ اردو تعلیم کا اہتمام کریں اور دوئم یہ کہ اردو تعلیم دینے والے استاد تعلیمی صلاحیت کے اعتبار سے اعلیٰ درجے کے ہوں۔ اس کے ساتھ ہی ان میں اپنے شاگردوں کی ذہنی تربیت کا جذبہ بھی ہو اور اسکول کے کل تعلیمی ماحول اور پروگرام میں بھرپور لگن اور محنت کے ساتھ شامل رہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ صورت حال بہت افسوسناک ہے۔ نہ تو ان اسکولوں کے طلباء کے والدین کو ہی دلچسپی ہے کہ ان کے بچوں کو اردو تعلیم دی جائے اور نہ ہی ان کے گھروں کا ماحول ہی ایسا ہے کہ اردو تعلیم سے رغبت ہو۔ صرف وہ اسکول جو مسلم انتظامیہ کی نگرانی میں چل رہے ہیں وہاں اردو تعلیم کا باقاعدہ اہتمام ہے لیکن ایسے کتنے اسکول ہیں۔ آٹے میں نمک کے برابر۔

اب آیئے اساتذہ کی طرف بلکہ صرف استاد کی طرف کیونکہ ان اسکولوں میں صرف ایک استاد سے ہی کام چلایا جاتا ہے۔ وہ بھی جیسے تیسے مل گیا۔ یہ استاد عموماً اپنے آپ کو اسکول کے مکمل تعلیمی ماحول میں سمو نہیں پاتا اور دبا دبا محسوس کرتے ہیں۔ اردو تعلیم کے لئے غیر مسلم استاد تو ملتے ہی نہیں اور مسلمان اپنے مخصوص تہذیبی اور معاشرتی ماحول کے اثرات کی وجہ سے کوئی خاص مقام نہیں بنا پاتے۔ نہ ہی انہیں نصاب سے دلچسپی ہوتی ہے اور نہ اپنی اور اپنے طلباء کی ذہنی نشو ونما سے۔

گذشتہ چند سالوں میں دہلی اور دیگر شہروں میں کچھ ایسے اسکول مسلم انتظامیہ کے زیر نگرانی قائم ہوئے ہیں جہاں اردو بطور لازمی مضمون شامل ہے۔ یہاں طلباء کی تعداد بھی کافی ہے اور اردو کے اساتذہ کا مشاہرہ بھی ان کی تعلیمی صلاحیت کے مطابق ہے لیکن گرد و پیش کے ماحول اور اثرات کی وجہ سے والدین کی عدم دلچسپی اور طلباء کی لاپرواہی برابر موجود ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ مارکیٹ میں اس کی اہمیت اور مانگ کم ہے اور کوئی بھی اپنا مستقبل خلائی امیدوں پر داؤں پر لگانے کے لئے تیار نہیں ہے۔

اب دوسری کیٹیگری کے اسکولوں کو لیجئے جہاں اردو درجہ اول سے یا درجہ ششم سے سینئر سیکنڈری درجات تک بطور لازمی مضمون تو پڑھائی جاتی ہی ہے ساتھ ہی دیگر مضامین بھی اردو میڈیم سے ہی پڑھائے جاتے ہیں۔ ان میں صرف پرائمری درجات تک کے اسکول یا تو سرکاری ہیں یا پرائیویٹ جہاں کل اخراجات کی ذمہ داری اہل علاقہ یا چند حضرات پر مشتمل ایک غیر منظور شدہ سوسائٹی پر ہے۔

کانوں سنی نہیں آنکھوں دیکھی کہتا ہوں کہ اکثر سرکاری اسکولوں میں تعلیم کے نام پر اردو سے مذاق ہو رہا ہے۔ ایک طرف نصابی کتابوں کی کمی اور دوسری طرف استادوں کی کم تربیت اور عدم دلچسپی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب طلباء پرائمری پاس کر کے ثانوی اسکولوں میں پہنچتے ہیں تو اردو املا سے ناواقف یا کچے ہوتے ہیں۔

جب بنیاد ہی کمزور ہوگی تو آگے کی جماعتوں میں ان کو سمجھنے اور سمجھانے میں کیا کیا مشکلات آتی ہیں اس کا اندازہ آپ بخوبی لگا سکتے ہیں۔

غیر سرکاری اسکول جو زیادہ تر مسلم علاقوں میں مساجد میں قائم ہیں وہاں اردو تعلیم غیر تربیت یافتہ استادوں کے ذریعے دی جاتی ہے جن کا ماہانہ مشاہرہ سرکاری دفتر کے ایک خاکروب اور چپراسی کے مشاہرے سے بھی کم ہوتا ہے جو ان کی غیر حاضریوں اور فرائض سے عدم دلچسپی کا سبب بنتا ہے۔ ادھر منتظمین بھی اپنے اپنے دنیاوی جھمیلوں میں اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ اسکولوں کی ضروریات کے تقاضوں کی طرف پوری توجہ نہیں دے پاتے۔ ان سب باتوں کے باوجود ایک روشن کرن یہ ہے کہ ان مدارس سے فراغت پا کر مڈل درجات میں داخلہ لینے والوں کی صلاحیت اور املا اور ہجوں پر قدرت سرکاری اسکولوں کے طلباء سے بہتر ہوتی ہے۔ مگر ایک ستم یہ ہے کہ مسلم بچیاں ایسے مدارس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا پاتیں اور اکثر و بیشتر تعلیم سے محروم رہ جاتی ہیں۔

اب آتے ہیں ایسے اسکولوں کی طرف جہاں ثانوی درجات سے سیکنڈری یا سینئر سیکنڈری درجات تک اردو تعلیم لازمی ہے اور دیگر مضامین بھی اردو میڈیم کے ذریعے ہی پڑھائے جاتے ہیں۔ خیال رہے کہ ایسا ایک بھی اسکول انگلش میڈیم اسکولوں کی طرز پر قائم نہیں ہے جہاں ایک طرف تو مکمل اخراجات فیسوں اور ٹرسٹ فنڈ سے پورے کئے جاتے ہیں اور دوسری طرف ان کا معیار تعلیم بھی اکثر و بیشتر مقابلتاً بہت بہتر ہوتا ہے کیونکہ وہاں اساتذہ پر اچھی تعلیمی صلاحیت اور اعلیٰ کارکردگی کا دباؤ بنا رہتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اردو تعلیم اور اردو زبان کی ترقی و ترویج کے دعوے بھی جب کوئی اسکول قائم کرنے کے بارے میں سوچتے ہیں اور واقعتاً قائم کرنے میں مرکزی اور اہم کردار ادا کرتے ہیں تو وہ صرف انگلش میڈیم ہوتا ہے اور اسی کے طرز اور معیار کو ذہن میں رکھا جاتا ہے۔ چوں کفر از کعبہ برخیزد......

اس کیٹگری میں اب وہ اسکول رہ گئے جنہیں 95 فی صد گرانٹ سرکار سے ملتی ہے اور

مجموعه القاسم: جلد پنجم — مسلم مسائل اور اس کا حل

بقایا 5 فیصد منتظمہ کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ غیر مندرج اخراجات کے لئے منتظمہ کو علیحدہ سے انتظام کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح منتظمہ کی ذمہ داری دوگنی ہوجاتی ہے۔ ان اسکولوں میں فیس کے نام پر صرف پی۔ ٹی۔ اے (P.T.A.) کی مد ہے۔ اخراجات کی مد میں اسٹاف کی تنخواہیں اور متفرق اخراجات کی مد ہیں جو ہمیشہ گرانی کے دباؤ میں رہتی ہیں۔ نتیجہ یہ کہ منتظمہ کی مالی ذمہ داریاں بھی بہت تیز رفتاری سے بڑھتی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر 1960ء میں اگر کسی ایڈڈ Aided اسکول کے لئے 5 فی صد کی ذمہ داری صرف 16 ہزار روپے سالانہ تھی تو 2005ء میں یہ بڑھ کر 8 لاکھ روپے سالانہ تک ہوگئی جب کہ منتظمہ کے پاس بطور ٹرسٹ کوئی مستقل آمدنی والی جائداد یا دیگر انویسٹمنٹس نہیں ہیں۔ صرف کمیونٹی کے مخیرّ حضرات کے آگے جھولی پھیلا کر یہ خیرات حاصل کی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ماہ بماہ تنخواہوں کی ادائیگی وقت پر نہیں ہوتی اور بہت سے روزمرہ کے اخراجات کو مؤخر کرنا پڑتا ہے۔ ڈیولپمنٹ کے بارے میں تو سوچنا ہی کیا۔ ان مالی آنکڑوں کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ واضح ہوجائے کہ منتظمہ مستقل مالی دباؤ اور تناؤ میں رہتی ہے۔

نتیجتاً اساتذہ کے فرائض پر کنٹرول ڈھیلا اور کمزور ہوجاتا ہے اور طلباء کی دلچسپی اور نتائج ناگفتہ بہ ہوجاتے ہیں اور پھر معطی حضرات بھی ہاتھ کھینچ لیتے ہیں۔

ان اسکولوں میں نصاب تعلیم تو این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی کا تیار شدہ ہی ہوتا ہے۔ لیکن کتابیں اکثر ترجمہ شدہ ہوتی ہیں اور ایسی اصطلاحات سے بھری ہوتی ہیں جن کا چلن یا تو مفقود ہوچکا ہے یا عام فہم نہیں ہوتیں۔

گذشتہ نسلوں کے اردو اساتذہ اور موجودہ نسل کے اردو طلبا کے مابین زبان و بیان کی سمجھ میں بہت بُعد ہے۔ قدم قدم پر انگریزی اور ہندی اصطلاحات کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ سیکنڈری اور سینئر سیکنڈری کلاسوں تک پہنچتے پہنچتے خصوصی مضامین جیسے کامرس، اکاؤنٹس، فِزکس، کیمسٹری، بائیولوجی، جغرافیہ، اکنومکس وغیرہ کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے انگریزی

اصطلاحوں اور الفاظ کے استعمال کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں ہے۔ کیا اسے ہم اردو تعلیم کہیں گے یا اردو میڈیم کی تعلیم کہیں گے یا پھر کچھ اور......

میرے خیال سے اب وقت آگیا ہے کہ اردو تعلیم کو نئے نئے زاویوں سے دیکھنا پڑے گا۔ حکومت کی نئی تعلیمی پالیسی کو سمجھنے اور اسے اپنانے کے لئے اردو والوں کو اپنی شرکت لازمی بنانی ہوگی۔

نئی صدی میں اردو کو بحیثیت ایک مادری زبان کے کل طریقۂ تعلیم میں ایک مؤثر ذریعے کے طور پر تیار کرنا ہوگا اور پرائمری اور سیکنڈری سطح پر اردو تعلیم کو مرکزی تعلیمی نظام سے ہم آہنگ کرنا ہوگا۔ کمپیوٹر، انٹرنیٹ یا انفارمیشن ٹیکنالوجی نے بالخصوص ایک خاموش مگر زندگی کے ہر میدان میں ایک انقلابِ عظیم برپا کردیا ہے لیکن اردو تعلیم والے ابھی اس نعمت غیر مترقبہ سے یا تو بالکل محروم ہیں یا اونچی بلڈنگ کی اولین سیڑھیوں پر۔ اردو کے ذریعہ اس طرف خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

انڈسٹریل ٹریننگ انسٹیٹیوٹ میں جو پیشہ ورانہ تعلیم دی جاتی ہے اس سے اردو والے بہت دور ہیں۔ اردو کے ذریعے کم از کم شمالی ہند میں ITI کا مؤثر نیٹ ورک اردو میڈیم کو استحکام بخش سکتا ہے۔

کاروباری اور انتظامی امور کے متعلقہ علوم میں عملی مہارت ہی اصل جوہر ہے۔ اردو تعلیم والوں کو اپنے نصاب میں ان علوم کا بھی احاطہ کرنا چاہئے تاکہ اردو میڈیم کی گہرائی اور گیرائی میں اضافہ ہوسکے۔

اردو تعلیم کے پرائمری سطح کے اساتذہ کے لئے خصوصی ریفریشر کورسز کا اہتمام اردو اکادمیوں یا مختلف ریاستوں کے تعلیمی ٹریننگ اداروں .S.C.R.T کے ذریعے ہونا چاہئے۔

اردو تعلیم کے اداروں کو مالی اور دوسری کمیاں دور کرنے کے لئے باہمی تعاون اور پولنگ Pooling کے اصولوں کو اپنانا چاہئے جیسے:

(i) اگر کسی اسکول میں سائنس کی لیبارٹیری کا بہتر انتظام ہے تو دوسرے اردو میڈیم اسکولوں کے طلباء کو بھی انہیں استعمال کرنے کی سہولت فراہم کریں۔

(ii) اگر کچھ مضامین میں مختلف اسکولوں کے اساتذہ اپنی قابلیت کی وجہ سے مشہور ہیں تو کوچنگ کلاسیز کا باہمی نظم قائم کیا جائے اور اِن اساتذہ کی خدمات مناسب معاوضہ پر حاصل کی جائیں۔

(iii) مختلف اردو میڈیم اسکولوں میں پڑھنے والے بہت سے طلباء ایک ہی محلے میں رہتے ہیں۔ ان کی حوصلہ افزائی کے لئے باہمی تعاون سے درسی کتابوں کی ایک لائبریری قائم کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

محلے کی مساجد کے منتظمین کی اجازت اور مشورے سے ریڈنگ روم قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔

(iv) اسکول کے اولڈ بوائز یعنی سابق طلباء کی انجمنوں کو فروغ دیں اور ان سے مالی مسائل کو حل کرنے کے لئے تعاون حاصل کریں۔

(v) اردو تعلیم کے دانشوروں کو پرائمری اور ثانوی سطح پر اعلیٰ درجہ کے تعلیمی مدارس قائم کرنے کے لئے مشوروں کے ساتھ ساتھ عملی اقدامات کے لئے اپنی خدمات از خود پیش کرنی چاہئیں اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا چاہئے۔

نئی صدی میں اردو تعلیم اور اس کی بقا اور ترقی کو ایک چیلنج کے طور پر لینا ہوگا اور ہر حالت میں اپنے آپ کو اور آنے والی نسلوں کو قومی تعلیمی دھارا میں سمونا ہوگا۔

؏　　اٹھ! کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے

اٹھئے اور ہندوستانی سماج میں اپنا جائز اور واجب مقام حاصل کیجئے۔ اچھے راہ بر اور اچھے پیروکار دونوں کے لئے بہت گنجائش ہے۔　☆☆

(مضمون نگار آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے خازن ہیں)

ہندوستان میں مسلم خواتین

تعلیمی-اقتصادی و معاشرتی صورتحال

● غلام محمود بنات والا

کسی معاشرہ کی پہچان میں عورت کا مقام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اسلام نے عورت کو بے مثال عظمت ورتبہ عطا کیا ہے، فرانس کے لی بان نے جب مطالعہ ومشاہدہ کیا تو بے اختیار کہہ اٹھا: ''مبارک ہو! محمد ﷺ آگئے اور سماج میں عورتوں کا مقام محفوظ اور بلند ہوگیا''۔

انسانی تہذیب کے مسلمہ اقدار میں عورت کی قدر ومنزلت نہ صرف یہ کہ شامل ہے، بلکہ سماج پر نمایاں اثرات مرتب کرتی ہے، لیکن جدید ہندوستان میں مسلم خواتین کی تعلیمی، اقتصادی و معاشرتی صورت حال کا جائزہ کوئی اچھی تصویر پیش نہیں کرتا، دیگر فرقے کی خواتین کی صورتحال کی روشنی میں تقابلی جائزہ مسئلہ کی سنگینی کو مزید واضح کردیتا ہے۔

تعلیمی صورتحال:

مردم شماری 2001 کے مطابق مسلمانوں کی کل آبادی کا تقریباً 40% فی صد حصہ ناخواندہ ہے، جس کے اعتبار سے تقریباً 30 فیصد مسلم مرد لکھنے پڑھنے کی استعداد نہیں رکھتے، جبکہ مسلم خواتین کی آدھی سے زائد آبادی اس معمولی استعداد سے بھی محروم ہے، موازنہ شہری ودیہی آبادی اور مختلف مذہبی طبقات کی شرح خواندگی کے لحاظ سے کیا جائے تو زیادہ معنی خیز رہے گا، دیہی علاقوں میں تقریباً 57 فیصد مسلم خواتین ناخواندہ ہیں۔ مسلم عورتوں میں شرح

خواندگی شہری آبادی میں 63 فیصد اور دیہی علاقوں میں محض 43 فی صد ہے۔ اس طرح شہروں اور دیہاتوں میں بسنے والی مسلم عورتوں کی شرح خواندگی میں 20 فیصد پوائنٹ کا بڑا فرق ہے۔ مسلم مردوں کے بمقابل مسلم خواتین کی شرح خواندگی شہری آبادی میں 13 فیصد پوائنٹ اور دیہی علاقوں میں 19 فیصد پوائنٹ کم ہے۔ درج ذیل نقشہ دیکھا جائے:

شرح خواندگی، فیصد، مردم شماری ۲۰۰۱

فرقے	شہری آبادی (کل مرد و خواتین)			دیہی آبادی (کل مرد و خواتین)		
تمام فرقے	80	86	73	59	71	46
مسلمان	70	76	63	53	62	43
ہندو	81	88	74	59	72	46
ایس سی/ ایس ٹی	68	78	58	49	61	36
دیگر	85	90	78	64	77	52

شہروں میں مسلمان عورتیں ہندو خواتین سے خواندگی میں گیارہ فیصد کم ہیں مگر دیہاتوں میں مسلم عورتیں ہندو عورتوں سے محض تین فیصد کم چل رہی ہیں۔ اعداد وشمار کے مطابق مسلم خواتین، دلت خواتین سے، کچھ بہتر پوزیشن میں ہیں۔ ہندوؤں اور دلتوں کو چھوڑ کر دیگر فرقے (یعنی عیسائی، سکھ، جین، بدھسٹ وغیرہ) کی عورتوں کی شرح خواندگی دیکھی جائے تو مسلم خواتین شہروں میں 15 پوائنٹ فیصد اور دیہاتوں میں 9 پوائنٹ فیصد پیچھے ہیں۔

یہ خیال رہے کہ ایک فرد کے ''خواندہ'' ہونے اور ''تعلیم یافتہ'' ہونے میں بڑا فرق ہے، نیز مسلمانوں کے تعلق سے یہ بھی نوٹ کیا جائے کہ بچے اور بچیوں کو ابتدائی عمر میں ہی قرآن شریف پڑھنا سکھلایا جاتا ہے، اور صرف اسی استطاعت کی بنا پر وہ خواندہ سمجھے جاسکتے ہیں۔

ملک کی مختلف ریاستوں میں صورتحال یکساں نہیں ہے، تقریباً ریاستوں میں مسلمانوں کی شرح خواندگی ریاستی اوسط سے اونچی ہے، ان میں جھارکھنڈ (مسلم شرح 55.6 ریاستی اوسط 53.6) کرناٹک (مسلم شرح 70.1 ریاستی اوسط 66.6)، مہاراشٹر (مسلم شرح 78.1 ریاستی اوسط 76.9) آندھرا پردیش مسلم شرح 68 ریاستی اوسط 60.5) اور گجرات (مسلم شرح 73.5 ریاستی اوسط 69.1) شامل ہیں۔ ریاستوں میں مختلف مذہبی طبقات نیز شہری اور دیہاتی آبادیوں میں شرح خواندگی میں نمایاں فرق ہے۔ تامل ناڈو میں مسلمانوں کی شرح خواندگی دیگر مذہبی فرقوں سے بہتر ہے، کیرالا میں یہ فرق معمولی ہے۔ کئی ریاستوں میں صورتحال افسوسناک ہے۔ اتر پردیش میں مسلم خواتین، ہندو خواتین سے شہروں میں 21 اور دیہاتوں میں 6 فیصد پوائنٹ سے پیچھے ہیں۔ اسی طرح اترانچل میں شہروں میں 28 اور دیہاتوں میں 23 فیصد پوائنٹ، مغربی بنگال میں شہروں میں 19 اور دیہی آبادی میں 8 فیصد پوائنٹ، آسام میں شہروں میں 17 اور دیہاتوں میں 19 فیصد پوائنٹ، دہلی میں شہروں میں 17 اور دیہی علاقوں میں 19 فیصد پوائنٹ، ہریانہ میں شہروں اور دیہاتوں دونوں میں 20 فیصد پوائنٹ، اور پنجاب میں شہروں میں 27 اور دیہاتوں میں 20 فیصد پوائنٹ پیچھے ہیں۔ مدھیہ پردیش میں پوزیشن قدرے بہتر ہے کہ شہری آبادی میں مسلم خواتین، ہندو خواتین سے شرح خواندگی میں شہروں میں 4 فیصد پوائنٹ پیچھے ہیں، اور دیہی علاقوں میں 7 فیصد پوائنٹ آگے ہیں۔ بہار میں شہروں میں مسلم خواتین، ہندو خواتین سے 7 فیصد پوائنٹ اور دیہاتوں میں 2 فیصد پوائنٹ پیچھے ہیں۔ بہر حال محض معمولی لکھنے پڑھنے کی صلاحیت سے بھی محروم رہ جانا المیہ ہے۔

مسلمان طلبہ کا ڈراپ آؤٹ یا چند جماعتوں کے بعد پڑھائی ترک کردینے کی شرح بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ پندرہ نکاتی اقلیتی پروگرام کے ایک حالیہ ریویو میں بتلایا گیا ہے کہ 2006-07 کے دوران پرائمری سطح تک مسلم طلبہ کا اندراج 9.39 فیصد تھا۔ اور اپر پرائمری

درجات یعنی درجہ ششم سے درجہ آٹھ تک یہ تعداد تقریباً دو فی صد گھٹ کر 7.52 ہوگئی۔ اقلیتوں کے لئے ہائی پاور گوپال سنگھ کمیٹی کی رپورٹ (1984) سے پتہ چلتا ہے کہ 65-67 فیصد بچے بیچ میں ہی تعلیم چھوڑ دیتے ہیں۔ لڑکیوں کا ڈراپ آؤٹ لڑکوں سے زیادہ ہے۔ مردم شماری 2001 کے مطابق شہروں میں 71.3 فیصد مسلم لڑکے اور 70.9 فیصد لڑکیاں پرائمری تعلیم پوری کرپاتے ہیں۔ جبکہ 36.1 لڑکے اور 32.2 لڑکیاں میٹرک مکمل کرتے ہیں۔ دیہاتوں میں حالات اور ابتر ہیں۔ 58.9 لڑکے اور 47.8 لڑکیاں پرائمری تعلیم پوری کرتے ہیں۔ لیکن میٹرک مکمل کرنے میں لڑکے 22.0 فیصد اور لڑکیاں 11.2 فیصد ہی رہ جاتی ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ مڈل اسکول تعلیم کے دوران ڈراپ آؤٹ شرح زیادہ رہتی ہے۔ میٹرک مکمل کرنے میں مسلم لڑکے شہری اور دیہاتی دونوں علاقوں میں دلتوں سے بھی پیچھے ہیں۔ مسلم لڑکیاں دلتوں سے لگ بھگ برابر کی پوزیشن میں ہیں۔
درج ذیل چارٹ اسکولی تعلیم کی تین سطحوں پر پوزیشن واضح کرتا ہے:

پرائمری اسکول تعلیم مکمل کرنے والے طلبہ: فیصد: 2001

فرقے		شہری آبادی		دیہی آبادی	
	کل	لڑکے	لڑکیاں	لڑکے	لڑکیاں
مسلمان	60.9	71.3	70.9	58.9	47.8
ایس سی/ایس ٹی	61.4	80.2	74.8	66.1	47.0
دیگر	79.3	89.6	88.1	80.8	67.6

مڈل اسکول تعلیم مکمل کرنے والے طلبہ: فیصد: 2001

فرقے		شہری آبادی		دیہی آبادی	
	کل	لڑکے	لڑکیاں	لڑکے	لڑکیاں

مسلمان	40.5	49.6	51.1	37.3	29.4
ایس سی/ایس ٹی	41.3	59.8	56.3	43.7	29.3
دیگر	62.7	76.7	76.7	62.0	49.0

میٹرک تعلیم مکمل کرنے والے طلبہ: فیصد: 2001

فرقے		شہری آبادی		دیہی آبادی	
	کل	لڑکے	لڑکیاں	لڑکے	لڑکیاں
مسلمان	23.9	36.1	32.0	22.0	11.2
ایس سی/ایس ٹی	21.1	42.1	31.8	24.5	10.2
دیگر	42.5	63.0	57.9	71.8	23.8

ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کے ایک سروے نے انکشاف کیا کہ بہار کشن گنج میں مسلم آبادی کا ایک تہائی حصہ ایسے افراد پر مشتمل ہے جنہوں نے اپنی تعلیم کو بیچ میں ہی ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ درجہ ششم سے درجہ ہشتم کے دوران تقریباً 70 فیصد بچوں نے تعلیم ترک کردی۔ پروفیسر اے آر مومن لکھتے ہیں کہ راجستھان کے دیدوانا میں پرائمری جماعتوں میں داخلہ لینے والے طلبہ میں سے تقریباً 60 فیصد بچوں نے پرائمری تعلیم مکمل کرنے سے پہلے پڑھائی چھوڑ دی۔

ابوصالح شریف اور مہتاب اعظم علی گڈھ یونیورسٹی میں کئے ایک سروے کا ذکر کرتے ہیں، یونیورسٹی کے قمر اعظم اور ایم این خان کا یہ تقابلی سروے بتلاتا ہے کہ علی گڑھ اسکول میں تعلیم پانے والے ایک بھی ہندو طالب علم نے اسکول نہیں چھوڑا۔ جبکہ 4.5 مسلم لڑکے اور 5.7 مسلم لڑکیوں نے پڑھائی ترک کردی۔ تجزیہ نے ظاہر کیا کہ 57.72 فیصد ہندو لڑکوں اور 69.79 فیصد لڑکیوں کو کسی مالی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا، جبکہ بہتیرے مسلم لڑکے اور

لڑکیوں کو والدین کی غربت کی وجہ سے تعلیم ترک کرنی پڑی۔

یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مسلمانوں میں تعلیم سے بے توجہی ہے۔ کلکتہ کے مسلم جھوپڑ واسیوں (Slums) کے ایک سروے نے بتلایا کہ 94.12 فیصد والدین نے تعلیم کو لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لئے نہایت ضروری قرار دیا۔ تعلیم کو محض کسب معاش کے لئے ہی ضروری نہ سمجھا گیا۔ 107 خاندانوں میں سے صرف 35 خاندانوں نے بچوں کی تعلیم کو بہتر ملازمت کے لئے ضروری ٹھہرایا جبکہ 65 خاندانوں نے تعلیم کو روزمرہ زندگی کے لئے بھی ضروری سمجھا۔ 21 خاندانوں نے تعلیم کو اچھا ازدواجی جوڑا تلاش کرنے میں معاون پایا۔ 14 نے تعلیم کو سماجی وقار کی خاطر ضروری قرار دیا۔ اکانامک اینڈ پولیٹکل ویکلی بتاریخ 8 جنوری 2005 مضمون ذاکر حسین صفحہ 137)

Hyman اور Boudon کہتے ہیں کہ مختلف سماجی فرقے وطبقات انسانی اقدار کے بارے میں مختلف نظریات رکھتے ہیں، جن سے تعلیمی معیار بھی متاثر ہوتا ہے، اسلام دینی و دنیوی دونوں ہی علم کے حصول پر بے مثال زور دیتا ہے، خودرب علیم وخبیر تلقین کرتا ہے'' اور دعا کرو: اے رب! مجھے مزید علم عطا کر''۔ (سورہ طٰہٰ: 144) قرآن جگہ جگہ علم کو ایمان (سورہ سبا:6) زہد (سورہ قصص:8) فضیلت (سورہ نمل:15) روشنی (سورہ رعد:16) اور دیگر خوبیوں کا سرچشمہ بتاتا ہے، اور کفر وشرک (سورہ اعراف:138) اوران گنت برائیوں کو لاعلمی و جہالت کا نتیجہ قرار دیتا ہے، حضور کریمؐ نے فرمایا کہ ''علم کے خواہش مند کو جنت میں فرشتے خوش آمدید کہیں گے، غزوہ بدر کے قیدیوں کے لئے یہ فدیہ بھی طے پایا کہ ''مدینہ کے دس دس بچوں کو لکھنا سکھادو اور آزاد ہوجاؤ''۔ حضرت زید بن ثابتؓ نے اسی طرح لکھنا سیکھا تھا۔

مذہب اسلام علم کی حصولیابی کی زبردست ترغیب دیتا ہے، لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ جدید ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم تک رسائی دشوار ہے۔ سچر کمیٹی رپورٹ

بتلاتی ہے کہ جہاں مسلم آبادی معقول ہے، وہاں تعلیمی سہولتیں مہیا نہیں ہیں۔ اور جہاں مسلم آبادی کم ہے، یہ سہولتیں فراہم ہیں۔ 69 فیصد ایسے دیہاتوں میں جہاں مسلم آبادی زیادہ ہے مگر تعلیمی سہولتوں کا فقدان ہے۔ اتر پردیش میں 1943 دیہات ایسے ہیں جن میں مسلم آبادی معقول ہے اور کوئی تعلیمی ادارہ نہیں ہے، مغربی بنگال اور بہار میں مسلم آبادی والے ایک ہزار دیہات ہر تعلیمی سہولت سے محروم ہیں۔ اہم مسئلہ یہ ہے کہ یہ سہولتیں فراہم ہوں۔ مسلم معاشرہ طالبات کے لئے علیٰحدہ اسکول بھی چاہتا ہے، اسکول کا گھر سے زیادہ فاصلہ یا پڑوس کے دیہات میں۔ واقع ہونا بھی طالبات کے لئے پریشان کن ہے۔ سن بلوغ کے بعد طالبات کے لئے خصوصی تعلیمی ادارے اور گرلز ہاسٹل بھی ناگزیر ضرورت ہیں۔

مسلمانوں کی تعلیمی زبوں حالی کی ایک وجہ غربت ہے، والدین تعلیمی اخراجات کا بوجھ نہیں اٹھا پاتے۔ ہندوؤں کی فی فرد ماہانہ قوت خرچ (Mothly Per Capita Expenditure) مسلمانوں سے 80 فیصد زائد ہے۔ یہ امر بھی قابل نوٹ ہے کہ شہروں کی بہ نسبت دیہاتوں میں عام مسلمانوں کی حالت قدرے بہتر ہے، گھریلو آمدنی میں بھی کچھ اضافہ ہو جائے اس کے لئے بھی بچوں کو اسکول چھوڑنا پڑتا ہے۔

ایک کھلی حقیقت یہ بھی ہے کہ ملک کے ماحول میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلیم سے ہونے والے معاشی فائدہ کے امکانات میں نمایاں فرق ہے۔ ملازمت وغیرہ حاصل کرنے میں مسلمانوں کو تعصب سے بھی پالا پڑتا ہے، لہٰذا لڑکوں کی مزید تعلیم میں دلچسپی نہیں رہتی۔ اس صورتحال کا تقاضا ہے کہ مڈل اسکول سے جو طلبہ آگے نہیں بڑھتے انہیں معاشی استحکام کے لئے ٹیکنیکل تعلیم کی سہولت فراہم کی جائے۔

ہندوستان میں تقریباً ہر طبقہ کا بڑا حصہ اعلیٰ تعلیم کی نعمتوں سے محروم ہے۔ مسلمانوں میں یہ محرومی بے حد زیادہ ہے۔ پلاننگ کمیشن کے سروے 88-1987 کے مطابق ہائی

اسکول سطح سے اونچے تعلیم یافتہ مسلمان بمشکل 1.2 فیصد تھے۔ جبکہ ہندوؤں میں یہ شرح 3.4 فیصد تھی۔ نیشنل سیمپل سروے (NSS 1999-2000) نے نقشہ پیش کیا کہ ہندوؤں میں گریجویٹ کا تناسب مسلمانوں سے تین گنا زاید ہے۔ اعداد وشمار اس طرح ہیں:

گریجوٹ فی صد تناسب NSS 1999-2000

فرقے	شہری آبادی		دیہی آبادی	
	مرد	خواتین	مرد	خواتین
ہندو	17.4	10.9	3.5	0.9
مسلمان	6.0	3.4	2.1	0.4

2001 کی مردم شماری بتلاتی ہے کہ چالیس لاکھ سے کچھ کم مسلمانوں نے گریجوٹ درجہ تک تعلیم مکمل کی جو کہ ان کی آبادی کا صرف 0.6 فیصد ہے۔ ٹیکنیکل کوالیفکیشن رکھنے والوں میں مسلم تناسب بمشکل 0.4 فیصد ہے۔ ڈپلوما کورسز میں بھی مسلم تناسب بے حد کم ہے، اور سچر کمیٹی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ شدید کمی اس لحاظ سے بھی بے حد تشویشناک ہے کہ مسلم سماج میں دستکار وغیرہ اچھا خاصا تناسب رکھتے ہیں اور کچھ ضروری تعلیم کے ساتھ اقتصادی طور پر بہتر پوزیشن میں ابھر سکتے ہیں۔

اقتصادی صورت حال:

اسلامی معاشرہ میں خاندانی نظام کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔ اس نظام میں مالی ذمہ داریاں مرد پر عائد ہیں۔ بہرحال کسب معاش کی دوڑ میں کچھ مسلم خواتین بھی شریک ہیں۔ ابو صالح شریف اور مہتاب اعظم نے نیشنل سیمپل سروے آرگنائزیشن 94-1993 کے کچھ اعداد وشمار پر تبصرہ کیا ہے، ان اعداد وشمار سے درج ذیل نقشہ مرتب ہوتا ہے:

ہندو و مسلم خواتین کی فیصد ایمپلائمنٹ پوزیشن بمطابق تعلیمی سطح

تعلیم	مسلم خواتین	ہندو خواتین
غیر تعلیم یافتہ	18.3	44.01
پرائمری سطح تک تعلیم یافتہ	13.59	27.75
پرائمری تعلیم سے زائد	13.06	18.12

معاشی جد و جہد میں شامل 70 فیصد مسلم عورتیں حاصل کردہ کام اپنے گھروں میں کرلیتی ہیں۔ زراعت میں مسلمانوں کا تناسب دیگر فرقوں کے کے مقابل کم ہے۔ جہاں مسلمانوں کو زرعی زمین حاصل ہے، خواتین کے کام کرنے کے امکانات زیادہ ہیں، لیکن ایک تہائی مسلمان زرعی زمین نہیں رکھتے اور جنہیں زرعی زمین میسر ہے ان میں بمشکل 10 فیصد پانچ ایکڑ یا اس سے زیادہ زمین رکھتے ہیں۔

بیڑی تمباکو صنعت میں کل خواتین میں مسلم خواتین 35 فیصد ہیں، اسی طرح ٹیکسٹائل صنعت میں مسلم عورتیں 21 فیصد ہیں۔ اردو اسکولوں میں پرائمری سطح پر خواتین ٹیچرز کی تعداد 70 فیصد ہے۔ ثانوی اور اعلیٰ سطحوں پر یہ تعداد کم ہوجاتی ہے۔ سچر کمیٹی نے گرلز اسکولوں کی سفارش کے ساتھ ساتھ زور دیا ہے کہ تمام تعلیمی اداروں میں لیڈیز ٹیچرز کی تعداد زیادہ ہو۔

کئی مسلم ممالک کی معیشت میں مسلم خواتین کی فعالیت میں کافی اضافہ پایا جارہا ہے۔ بنگلہ دیش کی بدلتی معیشت میں مسلم عورتوں کی شمولیت بڑھ رہی ہے۔ مصر، ترکی اور ملیشیاء میں زراعت کے شعبہ میں کل افراد میں خواتین کے تناسب میں کمی آئی ہے، جبکہ سماجی خدمات کے شعبہ (service sector) میں کافی اضافہ دیکھا جارہا ہے۔ مصر ملیشیاء اور مراکش کے سماجی خدمات سکٹر میں خواتین کا بڑا اضافہ ہوا ہے اور کل افراد میں آدھے

سے زیادہ خواتین ہیں۔ مراکش میں زراعتی کاموں میں بھی خواتین کا حصہ بڑھا ہے۔ انڈسٹری میں مصر اور مراکش میں خواتین کی حصہ داری کم ہوئی ہے، اور ترکی میں بڑھی ہے۔ ابوصالح شریف چار منتخب مسلم ممالک کے تعلق سے یہ چارٹ پیش کررہے ہیں:

منتخب مسلم ممالک میں خواتین ایمپلائمنٹ میں تبدیلیاں

اقتصادی طور پر کل فعال آبادی کا فیصد تناسب (1990-98)

ممالک	زراعت میں		انڈسٹری میں		سماجی خواتین	
	خواتین		خواتین		خواتین	
	1990	1998	1990	1998	1990	1998
مصر	52.0	35.3	10.2	9.1	37.5	55.6
ملیشیا	25.3	15.0	28.2	28.3	46.8	56.7
مراکش	3.1	4.8	50.2	42.9	46.5	51.5
ترکی	75.8	70.0	9.8	10.6	14.5	19.4

لیکن معاشی ضرورت پر خواتین مذہبی حدود و ثقافتی تقاضوں کو کس طرح ملحوظ رکھیں؟ خواتین کے معاش کی تئیں یہ اہم مسئلہ ہے۔ اس کے حل میں ملک و ملت دونوں ہی کی فلاح ہے۔

معاشرتی صورت حال:

یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ آج ہمارے معاشرہ میں عورت سنگین صورت حال سے دوچار ہے، کئی خاندانوں میں وہ ظلم و ناانصافی کا شکار ہے، خیال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان خاندانوں کے افراد میں آخرت کے شدید مواخذہ کا اندیشہ بھی جاتا رہا ہے؟ یہ صورتحال اصلاح اور تعمیل شریعت کی متقاضی ہے۔ یہ منظر نامہ اسلام اور خواتین کی بہت غلط تصویر بھی

دنیا کو پیش کررہا ہے۔

ہندوستان میں قانون اور عدالتی فیصلوں نے مسلم معاشرہ میں کافی پیچیدگیاں پیدا کردی ہیں، زیر نظر مضمون میں اس کے احاطہ کی گنجائش نہیں۔ درج ذیل چند امور کی نشاندہی کی جارہی ہے:

(۱) وقوع طلاق:

سپریم کورٹ نے طلاق کے وقوع کو تسلیم کرنے کے لئے کئی شرطیں لگائی ہیں (الف) طلاق بغیر کسی معقول شرط کے وقوع نہیں ہوگی، شوہر کو اس بارے میں عدالت کو مطمئن کرنا ہوگا۔ (ب) طلاق سے پہلے تحکیم یا مفاہمت کا مرحلہ لازمی ہے۔ طلاق سے پہلے دونوں خاندان سے حکم چنے جائیں، جو مفاہمت کی کوشش کریں۔ اس کوشش کی ناکامی کے نتیجہ میں ہی طلاق دی جاسکتی ہے۔ اور اسی صورت میں طلاق مؤثر ہوگی اور تسلیم کی جائے گی۔ (ج) طلاق زبانی یا تحریری ہوسکتی ہے، لیکن اس کا اظہار ضروری ہے۔ فطری انصاف کا تقاضہ ہے کہ عورت کو طلاق کی اطلاع پہنچے (د) نان ونفقہ کی عدالتی کارروائی پر شوہر کا یہ عذر قابل تسلیم نہیں کہ وہ ماضی کی کسی تاریخ پر طلاق دے چکا ہے۔ طلاق کا اعلان کیا جانا چاہئے تھا اور اسے عدالت میں ثابت کرنا ہوگا۔

(دیکھا جائے: شمیم آراء، بنام ریاست یوپی AIR 2002 SC 3551، مزید: AIR 2003 AP 123: 1981-1 Gauhati law reports 358)

دہلی ہائی کورٹ نے حال میں کہا ہے کہ اگر طلاق ایسے شدید غصہ میں دی جائے کہ جس میں ذہن ماؤف ہوجاتا ہے تو طلاق واقع نہ ہوگی، عدالت نے کہا ہے کہ تین طلاق کو اگر خارج کردیا جائے تو یہ قرآن وسنت اور اسلام کے بنیادی اصولوں کے خلاف نہ ہوگا۔ مدراس ہائی کورٹ کا فیصلہ ہے کہ خط کے ذریعہ دی ہوئی طلاق میں اگر طلاق کا ذکر صرف ایک بار کیا گیا ہو

اور تین بار طلاق کا تذکرہ نہ ہو تو طلاق واقع نہ ہوگی۔ (AIR 2002 Mad 162).

وقوع طلاق کا مسئلہ سنگین صورتحال پیدا کرتا ہے۔ عورت کی حیثیت متاثر ہوتی ہے۔ اس کے حقوق متاثر ہوتے ہیں۔ اگر شریعت کے مطابق عورت بیوی کی حیثیت کھودے اور عدالتی فیصلہ کے اعتبار سے بیوی کی حیثیت جاری رہے تو انتہائی پیچیدہ اور سنگین صورتحال سامنے آئے گی۔ قرآن بار بار تاکید کرتا ہے کہ جو حکم خدا نے نازل فرمایا اسی کے مطابق فیصلہ ہو، اوروں کی خواہشوں کی پیروی نہ ہو (سورۃ المائدہ: 49) جو کتاب تم پر تمہارے پروردگار کے ہاں سے نازل ہوئی ہے اس کی پیروی کرو اور اس کے سوا اور رفیقوں کی پیروی نہ کرو (سورہ اعراف: 73) خدا سے اچھا حکم کس کا ہے (سورہ مائدہ: 50) کسی مومن مرد و عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کے رسولؐ کسی امر کا فیصلہ کردیں تو ان کے اپنے معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہے۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے گا وہ کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہوگا (سورہ احزاب: 36) اللہ اور اس کے رسولؐ کی عملاً نافرمانی کرگزرنا تو درکنار اگر فیصلہ کو دل میں تنگی محسوس کرتے ہوئے قبول کیا گیا تو ایمان کے سلب ہوجانے کا خطرہ ہے۔ ارشاد نبویؐ ہے کہ ”تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک اس کی خواہشات میرے احکام کے مطابق نہ ہوجائیں۔“

(۲) نفقہ مطلقہ:

شاہ بانو مقدمہ میں نفقہ مطلقہ کے بارے میں سپریم کورٹ نے شرع کے خلاف فیصلہ دیا۔ اس پر اندرون اور بیرون پارلیمنٹ تحریک کے نتیجہ میں مسلم مطلقہ کے حقوق کا قانون 1986 منظور ہوا۔ لیکن کئی ہائی کورٹ کے فیصلے آئے اور سپریم کورٹ نے بھی اس قانون کی دفعات کی جو تشریح وتعبیر کی اس سے اصل مقصد ہی فوت ہوگیا ہے۔ (دانیال لطیفی و دیگر بنام یونین آف انڈیا، (2001) 7 SCC 740)۔

(۳) سرلا مُدگل مقدمہ میں سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا کہ اگر کوئی ہندو عورت مسلمان ہوجائے تو تبدیلی مذہب کے باوجود ہندو طریق پر رچایا نکاح قائم رہے گا اور باطل نہ ہوگا۔ اس سے قبل عدالتوں نے تسلیم کیا تھا کہ ایسا نکاح ختم ہوجاتا ہے۔ نیز عدالت پابند نہیں ہے کہ شوہر کے پرسنل لا کو ہی نافذ کرے۔ (عائشہ بی بی بنام سوبودھ چکرورتی (49 C.W.N. P.439) لیکن اب سپریم کورٹ کے فیصلہ کی رو سے اس قسم کے تمام قبل ازیں فیصلے بے اثر ہوجائیں گے۔ ظاہر ہے کہ سپریم کورٹ کا فیصلہ سنگین صورت حال پیدا کرتا ہے۔

(۴) یوپی زمینداری قانون کے تحت مسلم خواتین کاشت کی اراضی میں حق وراثت سے محروم ہیں۔ یہ شرعی حق وراثت بحال ہونا چاہئے۔

(۵) آج مسلم معاشرہ میں عورت کو طلاق دئے بغیر معلق رکھنے کی کیفیت، خلع کے حاصل کرنے میں یا فسخ نکاح کی دشواریوں نے بھی عورت کو مظلوم بنا رکھا ہے۔ عدالتی فیصلہ مہنگا اور وقت طلب ہے اور شرعی قباحتوں کے اندیشے لئے ہوئے ہے۔ دارالقضاء جہاں ہیں بڑی خدمات انجام دے رہے ہیں، لیکن اپنے حکم کو نافذ کرنے کی قوت نہیں رکھتے۔ اور اب سپریم کورٹ میں نظام قضاء کے خلاف رٹ پٹیشن داخل ہوچکی ہے۔ مسلم خواتین کو موجودہ حالت زار سے چھٹکارا دلانا اور راحت پہنچانا ہوگا۔ کٹھن مسائل کا سامنا ہے۔ دانشمندی، قوت ارادی، فیصلہ وعمل اور ثابت قدمی ہی میں فلاح ہے۔

☆☆

مسلم خواتین مسائل اور حل

● اے۔ امیر النساء

اکبرالہ آبادی نے کہا تھا:

تعلیم عورتوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتون خانہ ہو وہ سبھا کی پری نہ ہو

موجودہ دور کی خواتین کے نزدیک خاتونِ خانہ بننا قید خانوں کی سزا ہے، اس کے برعکس سبھا کی پری بننا معراجِ ترقی ہے، ہم شطرنج کے وہ مہرے ہیں جو شاطر کھلاڑیوں کے دامِ فریب میں آگئے، بے شک ناخواندگی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے مگر یہ ہماری سب سے بڑی بھول تھی کہ ہم نے حجاب کو تعلیم کی راہ میں رکاوٹ سمجھا، اور تعلیم حاصل کرنے کے بہانے پردے کی قید سے آزاد ہوگئیں اسی پر ہی بس نہیں ہمارا نقطۂ نظر ہے کہ ملک کی سماجی اور اقتصادی ترقی عورتوں کو نظر انداز کرکے ممکن ہی نہیں کیونکہ آبادی کے لحاظ سے ہر ملک میں نصف عورتیں ہوتی ہیں، گویا عورتوں اور مردوں کے درمیان قرآن پاک کے مطابق کی گئی تقسیم درست، ارشادِ خداوندی ہے (ہم نے مردوں پر ذریعہ معاش کی ذمہ داری رکھی اور عورتوں کو گھر کے نظام کی ذمہ داری) اگر ملک کی سماجی اور اقتصادی ترقی کے دروازے عورتوں کو گھر سے باہر نکال کر ہی کھلتے ہیں تو قرآن پاک کے احکامات کس معانی میں آتے ہیں؟ مغربی اقوام نے عورتوں کو آزادی کے بہانے گھر کی تحفظ بھری چار دیواری سے باہر نکال کر سڑکوں کا کوڑا بنا دیا اب ان کی جگہ کوڑا دان ہی ہے گھر کا صاف ستھرا ایوان نہیں، اسی

کے برعکس مومن عورت کے لئے گھر کی چاردیواری قید خانہ یا کال کوٹھری نہیں بلکہ نسوانی تحفظ کا مضبوط قلعہ ہے، اگر وہ بیٹی ہے تو باپ کی نظروں کے حصار میں ہے، بہن ہے تو بھائی کی مضبوط پناہ گاہ میں محفوظ ہے، اگر بیوی ہے تو شوہر کی آبرو ہے۔ مگر مغرب زدہ سوچ رکھنے والوں کو ہماری صاف ستھری تہذیب راس نہ آئی اور مغربی قوم کے بچھائے ہوئے جال میں آسانی سے ہم اس لئے پھنس گئے کہ اس کی جھوٹی چمک دمک نے ہمیں یقین دلا دیا کہ سماجی نابرابری اور حقوقِ نسواں کے غاصب صرف مرد ہیں، جبکہ قرآنِ پاک کہتا ہے کہ ''الرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَاءِ'' ہم نے ان آیات کی نفی کرتے ہوئے مردوں کی حاکمیت سے انحراف کیا اور اپنے لئے شخصی آزادی کا جواز ڈھونڈ نکالا تھا یہ وہ ناخوشگوار حالات ہیں جن میں ہم خود مبتلا ہوئے، وہ بھی اس پروپیگنڈے کے تحت کہ مشرقی عورت پر مرد کی بالادستی قائم ہے اس کی اپنی کوئی رائے نہیں، وہ ہر طرح سے مظلوم ہے، وہ نہ صرف اقتصادی بدحالی کا شکار ہے بلکہ مردوں کی دستِ نگر ہے، اسے قلعے میں بند کر کے اسے تمام حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے، اپنی مظلومی کی داستان غیروں کی زبانی سنتے سنتے وہ اپنی جنت سے خود نکل آئی یا بی بی حواؑ کی طرح جنت سے نکال دی گئی، اب وہ جنت کے لباس سے محروم ہو کر خود کو درختوں کے پتوں سے چھپانے پر بخوشی راضی ہے، اپنے حقوق کی جنگ لڑنے کے لئے اس نے شرعی حدود کے دائرے کو پھلانگ کر مردوں کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ان کی نظروں سے نظریں ملا کر ان کے شانہ بشانہ چلتی ہوئی ترقی کی راہ میں آگے ہی آگے بڑھتی ہوئی بہت کچھ پیچھے چھوڑ آئی ہے، آزادی کے نام پر اس نے سب سے پہلے اپنا شاندار ماضی کھویا اور مخلوط درسگاہوں کی زینت بنی دورانِ تعلیم کسی کی محبوبہ بنی تو کسی کی گرل فرینڈ۔ تعلیم سے فراغت کے بعد اپنے تقدس بھری چادر کو تار تار کرتی ہوئی تلاش معاش کی جستجو میں خالص مردوں کے اداروں میں پہنچ کر کسی کی سکریٹری بنی تو کسی کی منظورِ نظر، ترکِ حجاب کے بعد چادر نے بھی صدائے احتجاج بلند کی، چادر اتری تو مختصر ترین لباس اس کا

آئیڈیل بنا، یہی لباس اس کی نام نہاد ترقی کے در کھولتا گیا، وہ اپنے لباس کے نام بے لباسی پر شاداں و فرحان، اپنی صاف ستھری تعلیمات کو نظر انداز کرتی ہوئی شیطانی نظروں کے زہریلے تیروں کا شکار ہوتی رہی اور اپنے حقوق منواتی رہی، مجلس قانون ساز سے بھی اس نے اپنے حقوق محفوظ کروالئے، یہ الگ بات ہے کہ اس جنگ میں اس نے پایا کم اور کھویا زیادہ۔ عزت و آبرو کی نیلامی کیساتھ گھریلو سکھ سے بھی محروم ہوئی! حدیث پاک کا مفہوم ہے کہ ''عورت چھپا کر رکھنے کی چیز ہے جب وہ باہر نکلتی ہے تو شیطان نظریں اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگتا ہے۔'' (مشکوۃ المصابیح) سورۃ النور میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''مسلمان عورتوں سے کہو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں بجز اس کے جو خود ظاہر ہو جائے اپنے گریبانوں پر اوڑھنیاں ڈالے رہیں اور اپنی آرائش کو کسی کے سامنے ظاہر نہ کریں سوائے محرم رشتہ داروں کے''۔ عورت پہلے پہل پردے کو ڈھال بنا کر اپنے حقوق محفوظ کرانے کے بہانے گھر سے باہر نکلی، رفتہ رفتہ اپنے گھر کا راستہ بھول گئی، آزادی کے نام پر مخلوط محفلوں کی زینت بنی اداکاری کے بہانے اپنے ناز و انداز دکھائے، کلبوں میں اپنے حسن کا جادو جگایا، مختصر ترین لباس کیساتھ کھیلوں میں حصہ لے کر موضوعِ بحث بنی، غرض کہ ہر طرح سے اپنے حسن کا خراج وصول کرتی رہی، دورِ حاضر میں ترقی اور آزادی کا مفہوم حصول تعلیم اور معاشی تگ و دو نہیں بلکہ مغرب کی نقالی اور نمائشی حسن ہے، اس طرز زندگی نے اس کی نازک کلائیوں سے چوڑیوں کا خوبصورت بوجھ ہٹا کر وزنی ہتھکڑیوں کا بوجھ پہنا دیا ہے جہاں اس نے بخوشی ملک کی اقتصادی بحالی کے لئے مردوں کے دوش بدوش ہر کام میں حصہ لیا اور لے رہی ہے وہیں اپنی خانگی ذمہ داریوں سے منہ موڑ کر نہ صرف گھر کے نظام کو درہم برہم کیا بلکہ کہیں نسل کشی کا باعث بنی تو کہیں ایسی نسل کو وجود میں لانے کی ذمہ دار بنی جو اخلاقی دیوالیہ پن کی شکار ہے، اگر عورت فطرت سے بغاوت نہ کرتی اور اپنی خانگی ذمہ داریوں سے غفلت نہ برتتی تو ملک و قوم کو درپیش مسائل اس قدر شدید نہ ہوتے، تحریک

آزادیٔ خواتین نے انسانیت کو بامِ عروج پر تو نہیں پہنچایا البتہ پستی اور ذلت کے نشیب میں دھکیل دیا۔

کہیں کہیں تو آج اسی کی مظلومیت دور جہالت سے بھی سوا ہوگئی ہے، جس کا واضح اثر ہماری نئی نسل پر پڑ رہا ہے آج ہماری قوم پر دہشت گردی کا لیبل چسپاں ہوگیا ہے کیا اس کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی؟ برائیاں ہر سماج کا حصہ ہیں اس میں مسلم اور غیر مسلم کی تفریق نہیں، البتہ غور طلب بات یہ ہے کہ کیا مسلم سماج کی اقتصادی بدحالی عورت کے گھر سے باہر نکلنے پر ختم ہوگئی؟ کیا اس کے سارے حقوق جسے حاصل کرنے کے لئے وہ در بدر بھٹکتی رہی شرعی حدود کے دائرے سے باہر اسے مل گئے؟ کیا مسلم عورتوں کی ناخواندگی دور ہوگئی؟ کیا اس کی تباہی اور ذلت قدر و منزلت میں تبدیلی ہوگئی؟ یا گھر سے باہر نکل کر اس کی عزت و آبرو محفوظ ہوگئی؟ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مسلم معاشرے کے بگاڑ کی پچاس فیصد ذمہ داری مسلم عورتوں پر عائد ہوتی ہے، ہم نے اپنی تعلیمات سے اپنی اور غیروں کی اصلاح نہیں کی، احکاماتِ خداوندی سے منہ موڑا اور اپنی ذمہ داریوں سے پہلو تہی کی شرعی حدود کی خلاف ورزی کی، اپنے بچوں کی بنیادی دینی تعلیم پر عصری تعلیم کو ترجیح دی، ہماری قابلِ گرفت غلطی یہ ہے کہ ہم پانی کے بہاؤ کی سمت بدلنے یا اس پر بند باندھنے کی بجائے پانی کی سمت بہہ گئے، ہمارے پاس اسلامی تعلیمات کی شکل میں ہر مرض کی دوا موجود ہے، مگر ہم نے اپنا علاج خود کرنے کے بجائے دوسروں کی تشخیص میں اپنے مرض کا علاج ڈھونڈا خود بھی علیل ہوئے اور سارے سماج کو بھی بیمار بنا دیا، بیمار سماج کا شافی علاج صرف اور صرف اسلامی تعلیمات میں مضمر ہے جسے ہم نے کوتاہیٔ عمل سے کھو دیا۔

☆☆

مجموعہ القاسم: جلد پنجم
مسلم مسائل اور اس کا حل

کشمیر میں مسلم خواتین: مشکلات و مسائل

● پروفیسر ڈاکٹر حسینہ حاشیہ

ریاست جموں و کشمیر کو تین مختلف خطوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کشمیر، جموں اور لداخ، یہ تینوں خطے جغرافیائی اعتبار سے بالکل مختلف ہیں۔ تینوں خطوں میں الگ الگ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ کشمیر میں کشمیری، جموں میں ڈوگری اور لداخ میں بلتی اور شینو۔ تینوں خطوں میں لوگوں کی طرز رہائش یکسر مختلف ہے۔

کشمیر کی وجہ تسمیہ یوں بتائی گئی ہے کہ اصل میں اِس خطہ کا نام 'کشپ مر' تھا۔ یعنی کشپ رشی کے رہنے کی جگہ۔ یہ کہا جاتا ہے کہ زمانۂ قدیم میں اِس خطہ کی صورت ایک تالاب جیسی تھی اور ہر طرف اس میں پانی ہی پانی تھا۔ اس تالاب کا نام 'ستی سر' تھا۔ بعد میں کشپ رشی نے بارہمولہ میں خادنیار نامی جگہ کے پاس پانی کا اخراج کر کے اِسے آباد کیا اور اُسی کے نام سے مشہور ہوکر یہ 'کشپ مر' کہلانے لگا۔ کچھ مؤرخین کے مطابق پانی کا اخراج حضرت سلیمانؑ کے ذریعے ہوا ہے۔ کچھ مؤرخین کا خیال ہے کہ زمانہ قدیم سے ہی اس کا نام کشمیر تھا۔ 'کم' پانی کو کہتے ہیں۔ اس میں سے 'ک' لیا گیا ہے۔ اور 'شمیر' باہر نکالنے کو کہتے ہیں۔ چونکہ اس کا پانی باہر نکالا گیا، اس لئے کشمیر ہوا۔ بعض مؤرخین کے مطابق ایک قوم 'کاش' نام کی جو درہ سندھ سے یہاں بسنے کے لئے آئی اس کے نام سے 'کاشمیر' کا نام پڑ گیا۔ کاشغر اور کاغان (کاشان) وغیرہ شہر بھی اسی قوم کے نام سے مشہور ہوئے۔

وادیٔ کشمیر چاروں طرف فلک بوس کوہستانوں اور پہاڑوں سے گھری ہوئی ہے اور

میدان میں دریا، تالاب، چشمے اور تناور درخت چنار و سفیدہ وغیرہ ہیں۔ وادیٔ کشمیر کی آب و ہوا از بس تر وتازہ، صحت بخش و راحت افزا ہے۔ چنانچہ جو بھی نامی سیاح و محققین یہاں آئے۔ سبھوں نے اس کی آب وہوا، موسم نیز چشمہ ہائے پُر بہار وانہار و مرغزار بے خار باغات ومیوہ جات اور سبز ہائے نادر بوقلموں کو سراہا ہے۔ شاہان مغلیہ کو بھی اس کے دلکش و دلآویز موسم جان سے زیادہ عزیز تھے۔ چنانچہ انہوں نے یہاں بہت سے عظیم الشان محلات و باغات رشک افزائے روضۂ رضوان بنا کر آراستہ و پیراستہ کئے اور خود محو تماشا ہوئے۔ یہاں کی سیر وسیاحت سے محظوظ ومسرور ہو کر انہوں نے اس کو زبدۃ الاقالیم بتایا

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است وہمیں است

اکثر مریض جو کہیں تندرست نہیں ہوتے تھے، یہاں آکر صحت پاتے تھے، چنانچہ بقول عرفیؔ

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید
گر مرغ کباب است کہ بابا و پر آید

یہ خطہ بسبب اپنے زیادہ تر بلندی و کوہستان کے ہندوستان کے بیشتر میدانوں سے نسبتاً بہت سرد ہے۔ دریائے جہلم چشمہ ویری ناگ سے نکل کر لمبی مسافت طے کر کے سری نگر کے وسط سے گذر کر بارہمولہ میں خادنیار کے راستے وادیِ کشمیر سے رخصت ہو جاتا ہے۔

۲۰۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق کشمیر خطہ کی کل مسلم آبادی 53,21,600 ہے، جن میں مرد 27,53,565 اور خواتین 25,68,035 ہیں۔ چھ ضلعوں پر مشتمل یہ خطہ 2001 کے اعداد وشمار کے مطابق مندرجہ ذیل حقائق سے ہمیں روشناس کراتا ہے:

Table No: 1

Kashmir Division: District Wise Datea (Muslims)

کام میں شرکت کی شرح (Work Participation Rate)		شرح خواندگی (Literacy Rate)		جنسی شرح *(Sex Ratio)	نام اضلاع	نمبر شمار
Male	Female	Male	Female			
70.9	29.9	66.9	33.0	945	کپواڑہ	1
76.6	23.0	65.7	34.2	921	بارہمولہ	2
82.8	16.2	61.0	39.0	909	سری نگر	3
69.1	30.0	64.8	35.0	948	بڈگام	4
73.5	26.4	62.6	37.3	959	پلوامہ	5
70.0	29.8	64.0	36.0	937	اننت ناگ	6
74.5	25.5	63.7	36.2	933	کشمیر (مسلم)	
47.2	22.0	58.7	34.9	927	جموں و کشمیر (مسلم)	
47.5	14.1	67.6	50.1	936	انڈیا (مسلم)	
51.7	25.6	75.3	53.7	933	انڈیا (کل)	

Source: Census of India (Religion - Wise) 2001

تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ زمانہ قدیم سے ہی کشمیری سماج میں لڑکیوں کو فوقیت

حاصل تھی۔ اونچے اور آسودہ حال گھرانوں میں لڑکی کو تعلیم کے زیور سے شروع سے آراستہ کیا جاتا تھا، پندرہویں صدی سے جب کشمیر کی عنان حکومت سکھوں اور ڈوگرہ حکمرانوں کے ہاتھوں میں آگئی تو مسلمانوں کے ساتھ ان کا رویہ سوتیلی ماں کی طرح ہونے لگا جس سے مسلمان معاشی طور پر کافی پسماندہ ہوگئے اور جس کا اثر تعلیم وترقی، صنعت وحرفت وغیرہ پر بھی پڑا نیز مسلم سماج کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔

آزادی کے بعد حکومت کی خصوصی توجہ کی وجہ سے کشمیریوں کی مالی حالت سدھرنے لگی، مرد وخواتین مختلف میدانوں میں آگے آنے لگے۔

مندرجہ بالا جدول کے جائزے سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ کشمیری مسلمانوں کی جنسی شرح قومی سطح کی جنسی شرح کے مساوی ہے۔ مردوں کی شرح خواندگی حوصلہ افزا ہے۔ جب کہ خواتین تعلیمی میدان میں ابھی مردوں سے بہت پیچھے ہیں۔

گذشتہ دو دہائیوں سے کشمیری بری طرح بدامنی، خلفشار، دہشت گردی ظلم وزیادتیوں کی لپیٹ میں آگئے ہیں۔ جس سے جانی، مالی، اخلاقی، تعلیمی، اقتصادی، غرضیکہ ہر فرنٹ پر انہیں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔ حل طلب مسائل پیچیدہ ہوتے گئے اور نئے نئے مسائل نے سر ابھارا۔ جنت نظیر سرزمین پر اب دوزخ کے سائے منڈلانے لگے ہیں۔

کشمیری خواتین گوناں گوں مسائل سے دوچار ہیں، سب سے بڑا مسئلہ فوجیوں کے ہاتھوں عصمت دری کا ہے۔ چھاپوں اور تلاشیوں کے دوران بے شمار خواتین ودوشیزائیں اجتماعی عصمت دری کا شکار ہوگئیں۔ سیکڑوں عورتوں اور لڑکیوں کو اغوا کر کے فوجی اہلکاروں نے درندگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں اپنی ہوس کا نشانہ بنایا ہے۔ ان درندوں نے عمر، کمزوری، صحت یا کسی قدرتی ناتوانی کا بھی کوئی خیال نہیں کیا۔

شک وشبہ کی بنا پر بھی خواتین کو نشانہ بنایا گیا۔ ان کو نام نہاد مخبری، جنگجوؤں کی مدد کرنے کے من گھڑت الزامات میں ملوث کر کے نشانہ بنایا گیا اور جنسی استحصال کیا گیا۔ دور

دراز علاقوں میں چھاپوں کے دوران مردوں کو بنکروں اور فوجی اڈوں میں بند کر کے خواتین پر جنسی مظالم ڈھائے گئے۔ ان ساری چیزوں سے نہ صرف عورتوں کی جسمانی صحت متاثر ہوئی، بلکہ وہ دماغی ونفسیاتی طور پر بھی مفلوج ہو کے رہ گئی ہیں۔ ایک طرف اپنے عزیزوں کے بچھڑنے کا غم دوسری جانب فوج کی بربریت اور تیسری طرف جنگجوؤں کی بے جا مداخلت۔ ان سب چیزوں نے مل کر کشمیری خواتین کو زندہ درگور کر دیا ہے۔ بیواؤں اور یتیموں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوا ہے اور مالی مشکلات بھی بڑھتی جا رہی ہیں۔ جوان لڑکیوں کے رشتے ملنے میں انتہائی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ انہیں شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ کشمیر کے طول وعرض میں فوج کا جال بچھا ہوا ہے۔ اپنی سوسائٹی کے مرد بھی لڑکیوں کو شک کی بنا پر قبول کرنے سے ہچکچا رہے ہیں۔ شادی شدہ عورتوں کا جب افواج کے ہاتھوں استحصال ہوتا ہے تو ان کے خاوند بھی انہیں قبول نہیں کرتے اور انہیں ذلیل کر کے گھروں سے نکال دیتے ہیں۔ جن گھروں کی لڑکیوں کی آبروریزی ہوتی ہے وہاں کی کسی بھی لڑکی کے لئے رشتہ مِلنا تقریباً ناممکن ہوجاتا ہے۔ سماج انہیں قبول کرنے سے اِنکار کرتا ہے۔ سرکاری وغیر سرکاری اطلاعات کے مطابق کافی عورتیں اور لڑکیاں تنگ آکر خودکشی کا راستہ اپنا لیتی ہیں۔

ایسے حالات میں پلنے والے بچے دماغی یا نفسیاتی مریض بن گئے ہیں۔ اپنی ماؤں کے ساتھ ہونے والے ذلت آمیز سلوک اور گوناگوں مالی مشکلات کا ان کے دماغ پر گہرا اثر ہوا ہے۔

بیشتر اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنے والی لڑکیوں نے اس وجہ سے اپنی پڑھائی کو خیرباد کہدیا ہے کہ آتے جاتے فوجی نوجوان ان پر بازاری فقرے کستے ہیں اور ہوس بھری نگاہوں سے انہیں اپنی ہوس کا نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔ کچھ لڑکیوں نے اس وجہ سے بھی پڑھائی ادھوری چھوڑ دی۔ کہ انہیں ذہنی طور پر بیمار ماؤں کی تیمارداری کا فریضہ اور گھروں کی

دیکھ بھال کا فریضہ انجام دینا پڑتا ہے۔

اس وقت پبلک کمیشن آن ہیومن رائٹس رپورٹ (1990-2000) کے مطابق میں کچھ حقائق کی نشاندہی کرنا ضروری سمجھتی ہوں۔

(۱) بجبہاڑہ (اسلام آباد) کی رہنے والی سائرہ کے ساتھ چھ فوجیوں نے عصمت دری کی اور ساتویں دن اُسے شوہر کے حوالے کیا۔ غیور شوہر نے اسے قبول کرنے سے انکار کیا۔ علاقے کے کچھ جنگجوؤں کی مداخلت سے شوہر نے اسے گھر میں رہنے کی اجازت تو دی، مگر اس کے ساتھ جانوروں سے زیادہ بدتر سلوک کیا جاتا ہے۔

(۲) عورتوں کے خلاف سب سے بڑا عصمت دری کا واقعہ ۱۹۹۱ کا ہے۔ سرکاری ذرائع کے مطابق 53 عورتوں کی اجتماعی طور پر عصمت دری کی گئی، جبکہ غیر سرکاری ذرائع کے مطابق خواتین کی تعداد ۱۰۰ بتائی جاتی ہے۔ یہ شرمناک واقعہ ضلع کپوارہ کے کنان پوشپورہ میں چوتھی راجپوتانہ رائفلز یونٹ کنان پوشپورہ کے فوجی جوانوں کے ہاتھوں وقوع پذیر ہوا۔ اِس شرمناک اور دِل دہلانے والے واقعے میں 70 سال کی بزرگ خواتین، حاملہ اور معذور خواتین تک کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتی گئی۔ Amenesty International، ملکی و بیرونی میڈیا، Human Rights Groups نے اس واقعہ کو کافی اچھالا لیکن ملزمان کا کوئی کچھ نہ بگاڑ سکا، انہوں نے ڈنکے کی چوٹ پر اس واقعہ کی نفی کی۔

(۳) اِسی نوعیت کا ایک واقعہ واوَوسہ گاؤں (شوپیاں) میں 1997ء میں ہوا۔ حریت کانفرنس نے اِس کے احتجاج میں ہڑتال کی اپیل کی، ریاستی و قومی پریس نے کافی دنوں تک اس واقعہ کے بارے میں لکھا، نتیجہ یہ ہوا کہ آرمی بریگیڈیر نے علاقے کے لوگوں کو اتنا ہراساں کیا کہ ان کے جان کے لالے پڑ گئے۔ انہیں جھوٹے کیسوں میں پھنسایا، جس سے انہیں خاموشی کے سوا کوئی راستہ نظر نہیں آیا۔

(۴) ۲۰/جون ۲۰۰۰ کی وہ تلخ صبح آج بھی یاد کر کے لوگوں میں ایک ہیجانی کیفیت

برپا کرتی ہے۔ جب پو پھٹتے ہی 21 راشٹریہ رائفلز کے جوانوں نے واڈورہ (ہندوارہ) کے گاؤں میں کریک ڈاؤن کیا۔ تقریباً 500 لوگوں کو گھروں سے نکال کر فوجی کیمپوں میں یرغمال بنایا۔ ان میں کم سے کم 100 خواتین شامل تھیں۔ شام ہونے کے بعد سبھوں کو اپنے اپنے گھر جانے کی اجازت مل گئی سوائے دو خوبصورت عورتوں کے۔ ایک بدنصیب شاملی زوجہ محمد شفیع اور دوسری ساجہ زوجہ غفار میر۔ دونوں نو مہینے سے حاملہ تھیں۔ علاقے کے لوگوں نے ان کی رہائی کے لئے کافی منت وسماجت کی۔ لیکن ان کے کانوں میں جوں نہ رینگی۔ ایک نوجوان غلام قادر نے ہاتھ جوڑے۔ لیکن بے رحم فوجیوں نے ان کو موت کے گھاٹ اتارا۔ پہلے 21 رائفلز کے میجر ملک (Major Malik) نے ان دونوں کا جنسی استحصال کیا۔ ان خواتین کے بیان کے مطابق کئی دنوں تک کم سے کم 58 فوجی جوان ان کے جسم کا استحصال کرتے تھے، ایک ہفتے تک ان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا گیا۔ بالآخر ان کی حالت بگڑ گئی۔ ساجہ نے مرے ہوئے بچے کو جنم دیا اور شاملی کا بچہ پیدا ہونے کے تھوڑی دیر بعد مر گیا۔ علاقے کے لوگوں نے بڑی دشواری کے بعد انہیں رہا کروایا۔ اور RR21 کے خلاف کیس دائر کیا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس کے برعکس فوجیوں نے ان گھر والوں کو اتنا پریشان کیا، ایسی ایسی دھمکیاں دیں کہ وہ کیس واپس لینے پر مجبور ہو گئے۔ گھر والوں نے عورتوں کو ہی قصوروار ٹھہرایا کہ وہ بدنامی کی باعث بنیں اور کیس لڑنے کے لئے ان کی وجہ سے کافی روپیہ پیسہ برباد ہوا۔ ایسے حالات نے دونوں کا دماغی توازن بگاڑ دیا۔ شاملی کو شوہر نے بھی طلاق دیدی اور ساجہ موت وزندگی کی کشمکش میں ہے۔

پورے جموں وکشمیر میں ایسے لاتعداد کیس ہوئے، ہوتے رہتے ہیں جو چند دنوں تک لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے رہتے ہیں۔ بعد میں پولیس کی دھمکیوں اور زیادتیوں کی وجہ سے وہ اپنی موت آپ مرجاتے ہیں اور کشمیری عورتوں کی بدنصیبیوں میں اضافہ کر جاتے ہیں۔

کشمیری خواتین پر ظلم و بربریت کی داستان یہیں نہیں ختم ہوتی ہے بلکہ ہزاروں

خواتین ایسی ہیں جنکے شوہر مفقود الخبر ہیں۔ ایسی خواتین کو Half Widows کا خطاب دیا گیا ہے ایسی خواتین، بیواؤں سے بھی بدتر زندگی گزار رہی ہیں۔ ایک طرف وہ مالی مشکلات سے دوچار ہیں، دوسری طرف سماج کے سرد رویہ کی شکار۔

علماء اپنے اپنے مسلک کے مطابق انہیں صرف صبر کی تلقین اور شوہروں کا اِنتظار کرنے کے مشورے دیتے ہیں۔ حکومت کے نزدیک وہ بیواؤں کے زمرہ میں نہ آکر سرکاری امداد کی بھی حقدار نہیں رہی ہیں۔ اس طرح ان کا اور ان کے بچوں کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔

جنگجوؤں کا رویہ بھی خواتین کے تئیں مناسب نہیں ہے۔ کہیں پردے کی آڑ لے کر ان پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے اور کہیں سرکاری مخبر مشہور کر کے انہیں دماغی وجسمانی اذیتیں پہنچا کر مار ڈالتے ہیں۔

ان سب وجوہات نے کشمیری خواتین کو بے حد غلط اور قابل اعتراض کام کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ سالِ رواں کا جنسی اسکنڈل اسی کا نتیجہ ہے جو کشمیر کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ ہے اور جس میں اعلیٰ سول وفوجی آفیسر منسٹر اور بیروکریٹ ملوث ہیں۔ بار ایسوسی ایشن آف کشمیر اور عدلیہ کی مداخلت سے یہ اسکنڈل منظر عام پر آسکا۔

کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ سماجیات کے پروفیسر بشیر احمد ڈبلہ کے ذریعہ جون ۱۹۹۹ء میں کئے گئے ایک سروے کے مطابق کشمیر میں تقریباً ۲۰ر ہزار بیوائیں اور یتیم بچے ہیں (دس ہزار بیوائیں دس ہزار یتیم بچے)۔

کچھ صحافیوں کے ایک سروے کے مطابق سال ۲۰۰۵ء تک بیواؤں کی تعداد بیس ہزار تک پہنچ گئی ہے اور یتیم بچوں کے تعداد میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ Half widows کی تعداد کم سے کم ۳۰ر ہزار ہے۔ ان میں سے اکثر کسمپرسی کی حالت میں دن گذار رہی ہیں۔

مالی امداد بہم پہنچانے کے ذرائع پر 300 بیواؤں کے سیمپل سروے سے مندرجہ ذیل حقائق سامنے آئے ہیں:

Table : 2

مالی امداد کی فراہمی کا ذریعہ ۳۰۰ کا سیمپل

ذریعہ (Source)	امداد (فی صدی) (Financial Support)
1- رشتہ دار	33.0
2- غیر سرکاری ادارے	7.3
3- سرکاری مدد	33.6
4- دوسری تنظیمیں، لوگ	01.4
5- جن کو کوئی امداد نہیں ملتی	24.7

Soucrce: Public Commission on Human Rights, Srinagar.

ٹیبل-۲ کے مشاہدے سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ سب سے زیادہ امداد حکومت فراہم کرتی ہے۔ NGO's، دوسری تنظیمیں اور سماج کے افراد کا حصہ برائے نام ہے۔

موجودہ دور میں وادیِ کشمیر میں خواتین کے درجِ ذیل مسائل ہیں:

۱۔ خواتین میں تعلیمی ترقی اور خاص کر پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کی ضرورت،

۲۔ خواتین کو مختلف شعبہ جات میں باعزت طریقے سے کام کرنے کے مواقع کی فراہمی،

۳۔ لڑکیوں اور خواتین کی صحت (جسمانی، دماغی، ونفسیاتی) کی طرف خصوصی توجہ کی ضرورت۔

۴۔ مفاد عامہ کی مختلف اسکیموں کی جانکاری اور اپنے حقوق و فرائض (Self

Empowerment) کی جانکاری،

۵۔ بیواؤں کے مسائل کی طرف خصوصی توجہ، ان کے تحفظ اور ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری،

۶۔ Half Widows کے ساتھ مکمل انصاف،

۷۔ متأثرہ خواتین کو قانونی وسماجی انصاف (Support System) کی فراہمی۔

☆☆

کیرالہ میں مسلم خواتین کے مسائل

اعداد و شمار اور حقائق کی روشنی میں

● کے اے صدیق حسن

بیشتر مؤرخین کا کہنا ہے کہ اسلام کیرالہ میں عہدِ رسالت ہی میں پہنچ چکا تھا۔ اس تعلق سے ساحلی مملکت کدنجلور (Kodungalloor) کے راجہ چیرماں پرمال کے قبول اسلام کا قصہ بہت مشہور ہے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ وہ واقعہ شق القمر کے مشاہدے سے اتنے متأثر ہوئے کہ اپنی مملکت چھوڑ کر حضورؐ سے ملنے کے لئے روانہ ہوگئے۔ کیرالہ کے معروف عالمِ دین زین الدین المخدوم نے اپنی مشہور کتاب ''تحفۃ المجاہدین'' میں اس قصہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مشہور صحابی ابوسعید الخدریؓ کی ایک حدیث میں ہندوستان کے ایک راجہ کا قصہ مذکور ہے۔ وہ حضورؐ کی مجلس میں حاضر ہوئے اور ہندوستان کے تحائف حضورؐ کے سامنے پیش کئے۔ آں حضرتؐ نے اسے تمام صحابیوں کے درمیان تقسیم کردیا۔

مندرجہ بالا قصہ کے صحت وسقم سے قطع نظر یہ حقیقت ہے کہ حضور کے زمانے ہی میں کیرالہ کے ساحلی علاقے میں اسلام پہنچ چکا تھا۔ اس پر تمام مؤرخین متفق ہیں۔

اصل میں عہد رسالت سے کئی سو سال قبل مالابار اور عرب کے درمیان تجارتی تعلقات تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتداء میں اسلام کی دعوت اسی علاقے میں پہنچی اور یہ فطری بات تھی۔

ساتویں صدی ہجری میں چھ عرب تاجر مالابار علاقے میں آئے۔ انہوں نے اسلام کی دعوت دی اور وہاں کے خاندانوں سے شادی بھی کی مالابار کے ہندو رسم ورواج اور اسلامی

تہذیب کا امتزاج (Mixer) انہی خاندانوں میں برقرار رہا۔لیکن یہ بات واضح تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بہت خوشگوار تعلقات تھے۔ مالا بار کے راجا سامری کے بارے میں یہ قصہ مشہور ہے کہ انہوں نے اپنے ملک کے باشندوں کو یہ حکم دیا تھا کہ تمام خاندانوں میں سے کم سے کم ایک فرد کو اسلام قبول کرنا چاہیے۔ چنانچہ بڑے پیمانے پر لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ اشاعت اسلام کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اسی زمانے میں مالا بار کے ساحلی علاقوں میں بیرونی افواج کا گاہے بگاہے حملہ ہوتا تھا۔ ہندو عقیدے کے مطابق سمندری سفر حرام تھا۔ راجا سامری اپنے ملک کی حفاظت کے لئے ایک سمندری فوج تیار کرنا چاہتا تھا۔ مسلم شہریوں سے فوجیوں کا ملنا آسان تھا، ساتھ ساتھ مسلم نوجوان خاص طور پر عرب کی نئی نسل سمندری سفر میں ماہر بھی تھی۔ چنانچہ ایک بڑی تعداد پہلی صدی ہجری میں مشرف بہ اسلام ہوئی۔

ہندو سماج مختلف طبقات میں بٹے ہوئے تھے۔ عموماً خواتین کی حالت بہت خراب تھی، لیکن اعلی طبقات کے درمیان خواتین کا مقام کافی بلند تھا۔ ان خاندانوں میں حکمراں خواتین ہوا کرتی تھیں، لیکن عام طور پر خواتین کمزور تھیں۔ تعلیم میں بھی ان کو دخل نہیں تھا۔ ہندو سماج میں خواتین کو کپڑا پہننے کی آزادی نہیں تھی۔ مالا بار کے علاقے میں ٹیپو سلطان کے زمانے میں ان کے حکم سے ہندو خواتین کے درمیان کپڑا پہننے کا رواج شروع ہوا۔ اسی زمانے میں مسلم خاندانوں میں ایک مخلوط تہذیب رائج ہوئی۔ والد کی طرف سے اسلامی تہذیب اور والدہ کی طرف سے ہندو رسم و رواج اس کا حصہ بن گیا۔

Modern Education شروع ہونے سے پہلے مسلمانوں کے یہاں علم اور تعلیم کا مرکز مساجد ہوا کرتا تھا۔ وہاں ناظرہ، قرآن، حدیث، فقہ اور عربی زبان کی تعلیم دی جاتی تھی۔ دیہاتوں میں چھوٹے چھوٹے مکاتب بھی قائم ہو چکے تھے۔ لیکن وہاں بھی خواتین کو نظر انداز کیا جاتا تھا۔ روایتی علماء کے نزدیک تو خواتین کو تعلیم دینا ہی حرام تھا۔

Modern Secular Education کی طرف بھی ان کا موقف ایجابی نہیں تھا۔ اسی لئے عصری تعلیم کے میدان میں ملت اسلامیہ پیچھے رہی۔ ہندو سماج میں حکمراں طبقے کے اثر و رسوخ اور ان کے مصلحین کی کوششوں کے نتیجے میں عصری تعلیم کو جلد ہی فروغ مل گیا۔ مسلم خواتین کی تعلیم خصوصاً عصری تعلیم کے علماء سخت مخالف تھے۔ اسی وجہ سے خواتین تعلیم کے میدان میں سب سے پیچھے رہ گئیں۔

روایتی علماء کے اس رجعت پسندانہ موقف اور ملت اسلامیہ کے ان توہمات اور خرافات کے خلاف کئی مصلحین انیسویں صدی میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان میں سب سے نمایاں سید ثناء اللہ مقدی تنغل (1847-1912) اور عبد القادر مولوی ہیں۔ ان دونوں کو ریاست کیرالا کی نشاۃ ثانیہ کے سربراہ کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ دونوں دینی علوم میں ماہر تھے۔ مولوی عبد القادر صاحب نے کیرالہ کے جنوبی علاقے اور سید ثناء اللہ صاحب نے شمالی علاقے کا اپنے میدان کار کی حیثیت سے انتخاب کیا۔ دونوں نے تعلیم کی اہمیت پر زیادہ زور دیا، خاص طور پر خواتین کی تعلیم پر۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی اسی مقصد کے لئے قربان کردی۔ اس کے لئے انہوں نے تحریر و تقریر کے جتنے وسائل ممکن تھے، ان کا استعمال کیا۔ کتابیں تصنیف کیں۔ اخبار بھی جاری کیا، وعظ و نصیحت اور تقاریر کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے حکومت کے سامنے ایک Memmorandum پیش کیا۔ بالآخر ملت کے اندر اور بھی کئی مصلح پیدا ہوئے۔ ان تمام نے ملت کی پسماندگی کا سب سے بہتر علاج تعلیم کو بتلایا، خاص طور پر خواتین کی تعلیم پر انہوں نے کافی زور دیا۔

اس فہرست میں سب سے نمایاں افراد سعید علی ماسٹر تروری (1856-1919)، شیخ محمد ماہین ہمدانی تنغل (وفات 1922) اور مولانا چالی للگت حاجی کنج محمد نے علوم کی اصلاح اور عصری علوم کی اہمیت پر کافی زور دیا۔ جو دراصل علوم اسلامیہ کا ہی حصہ ہیں۔ ساتھ ساتھ خواتین کی تعلیم کے لئے بھی انہوں نے بڑی کوششیں کیں۔ مدارس اور مکاتب

قائم کئے۔ بچوں کے ساتھ بچیوں کو بھی داخلہ دیا۔ تعلیمی بیداری مہم چلائی، اخباروں اور منشورات کے ذریعے لوگوں کو آگاہ کیا۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں ملت کی نشو ونما کے لئے کئی تحریکیں اٹھیں۔ ان میں ندوۃ المجاہدین، جماعت اسلامی جیسی تحریکوں کا کلیدی کردار ہے۔ ساتھ ساتھ تعلیمی میدان کی کئی تحریکیں اٹھیں، ان میں سے MES (Muslim Education Society)، MSS (Muslim Seuice Society) جیسی تنظیموں کا نام قابل ذکر ہے۔ اس زمانے میں مسلم مسلک کے قائدین نے بھی ملت کی اصلاح اور تعلیمی بیداری کے لئے کوششیں کیں۔ کے ایم بی صاحب، سیتی پوکر صاحب، اپی صاحب، یم کے حاجی صاحب جیسے سیکڑوں علماء اور قائدین نے اس مقصد کے حصول کے لئے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ مسلم بچیوں کے لئے الگ سے اسکول قائم کئے گئے۔ ان کے لئے تعلیمی وظائف کا انتظام بھی کیا گیا۔ ملت کے اندر تعلیمی بیداری ایک آندولن کی شکل اختیار کرگئی۔

ملت کی تعلیمی نشو ونما میں برطانوی حکومت کا حصہ بھی قابلِ ذکر ہے۔ 1921 میں تحریک خلافت برطانوی حکومت کے خلاف ایک بڑا چیلنج بن کر سامنے آئی۔ اس نے حکومت کو آنکھیں کھولنے پر مجبور کردیا۔ ان کا خیال تھا کہ تحریک آزادی کے پیچھے روایتی دینی تعلیم ہے، اور اس کے اثرات سے ملت کو دور رکھنے کے لئے عصری علوم کا فروغ ضروری ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مالا بار کے کئی علاقے میں برطانوی حکومت کی طرف سے اسکول کھولنے کا فیصلہ ہوا۔

ساتھ ساتھ حکومت کے اندر ملت کی نمائندگی سے مسلمانوں کا یہ فائدہ ہوا کہ زیادہ سے زیادہ اسکول کھولنے اور مسلم بچوں کے لئے الگ سے اسکول قائم کرنے کا موقع ملا۔ مسلم بچیوں کے لئے حکومت کی طرف سے تعلیمی وظائف کا بھی اہتمام ہوا۔

مندرجہ بالا اسلامی تحریکوں کی طرف سے خاص طور پر سلفی تحریک اور جماعت اسلامی

کی طرف سے سیکڑوں مدارس کھولے گئے۔ ان میں دینی اور عصری علوم کا اہتمام بھی ہوا، بچوں کی طرح بچیوں کو بھی داخلہ دیا گیا۔

انیسویں صدی کے اوائل میں مولانا احمد علی ابوالصباح کے زیر نگرانی کالی کٹ کے قریب فاروق کالج کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بعد سیکڑوں کالجز قائم ہوئے۔ ابھی ملت اسلامیہ کے ایسے انجینیئر نگ اور میڈیکل کالجز قائم ہیں۔

ان تمام کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملت اسلامیہ کے اندر تعلیمی میدان میں ایک بڑا انقلابی اقدام (Break through) آیا۔ یہ ترقی بتدریج ہوتی رہی۔ پہلے کی حالت آہستہ آہستہ تبدیل ہوتی گئی، مثال کے طور پر یہ جدول دیکھئے:

1931 (مسلم بچوں کی تعداد)	1921 (مسلم بچوں کی تعداد)
Arts & Science Colleges 28 (697)	Arts & Science Colleges 7 (541)
Secondary Schools 1246 (19761)	Secondary Schools 721 (6648)
Elementary Schools 79383 (292009)	Elementary Schools 56168 (219891)

اس تبدیلی نے ملت کے اندر ایک نئے رجحان کا دروازہ کھولا۔ مثال کے طور پر ملت کے اہم اداروں میں بچوں سے زیادہ بچیاں زیرِ تعلیم ہیں۔ اعداد وشمار کے مطابق ملت کے سب سے قدیم اور بڑے ادارے فاروق کالج کی سات شاخوں میں بچیوں کی مجموعی تعداد 2548 ہے۔ انہیں اداروں میں بچوں کی تعداد 2225 ہے۔ ایسے ہی MES کے دس اداروں میں کل 1347 بچیاں پڑھتی ہیں، وہاں بچوں کی تعداد 1449 ہے۔ ۱۳

MES اسکولوں میں 1833 بچیاں پڑھتی ہیں وہاں بچوں کی تعداد 2713 ہے۔ یہ خوش آئند تبدیلی تمام میدانوں میں نمایاں ہے۔ کالی کٹ کے آس پاس کے مختلف اداروں سے متعلق Study رپورٹ میں بھی اس کی تائید وتوثیق کی گئی ہے۔ ریاست کیرالہ کی مجموعی صورت حال درج ذیل جدول میں نمایاں ہے:

1989-90 میں ریاست کے تمام اسکولوں میں 6.51 لاکھ مسلم بچیاں پڑھتی تھیں، یہ ریاست کے اسکول جانے والی بچیوں کے 23.42 فیصد کی نمائندگی ہے۔ Lower Primary (لور پرائمری) 27.60 اور UP لیول پر 27.78% اور High School لیول پر 17.79% تھا۔ High School لیول کو چھوڑ کر تمام مراحل میں مسلم تعداد کافی اطمینان بخش ہے۔

تعلیمی میدان کی اس ترقی نے دوسرے تمام میدانوں میں بھی اپنے نمایاں اثرات چھوڑے ہیں۔ تعلیمی میدان کے Women Empowerment کی وجہ سے زندگی کے دوسرے تمام میدانوں میں تبدیلی ہورہی ہے۔ آج اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور حکومتی اداروں جیسے تمام میدانوں میں مسلم خواتین کا تناسب کافی بڑھ گیا ہے۔ ڈاکٹرز، انجینئرز، اور ایڈوکیٹس جیسے پروفیشنل میدانوں میں بھی اس کا تناسب کو دیکھا جاسکتا ہے، حتیٰ کہ کیرالہ کی ایک مسلم خاتون ہندوستان کے سپریم کورٹ میں جج کے عہدے تک پہنچ گئیں۔ ہائی کورٹ جج، میڈیکل کالج پرنسپل جیسے اعلیٰ مناصب پر بھی مسلم خواتین فائز ہیں۔

تعلیمی اقتدار کی وجہ سے سماجی سطح پر بھی ان کا مقام بلند ہورہا ہے۔ ابھی آج کل زندگی کے تمام میدانوں میں مسلم خواتین کا رول نمایاں ہے۔ کیرالہ میں تعلیم کے میدان میں خواتین بہت آگے ہیں۔ مثال کے لئے کالی کٹ کے مضافاتی اداروں کا درج ذیل جدول دیکھئے:

ادارے کا نام	طلبہ کی تعداد	مرد	خواتین
NIIT Chatamangalam	1959	317	1642
Govt. Arts College	1425	450	975
St. Josephes College	1145	991	154
Farooque College	1889	741	1148
Govt. Trainning College	109	32	77

مالابرم ضلع کے شہر مخیری میں مسلم مینجمنٹ کے زیر نگرانی ایک Women's College کا قیام عمل میں آیا ہے۔ اس ضلع میں خواتین کے لئے کئی عربی اسلامی کالجز بھی قائم ہیں۔

دوسری طرف SSLC، +2، VHSC جیسے امتحانوں میں پچھلے پندرہ سال سے مسلسل مسلم بچیاں آگے ہیں۔ کبھی کبھی وہ سب سے آگے ہوتی ہیں۔ پروفیشنل کورسز کے انٹرینس امتحانوں میں بھی مسلم بچیوں کی کارکردگی بہتر ہے۔ IDB اسکالرشپ کے مستحقین میں بھی بچیوں کی پوزیشن اچھی ہے۔

لیکن اس حقیقت کو ہمیں نہیں بھولنا چاہئے کہ مسلم خواتین ہنوز ہندو کرسچین خواتین کے مقابلے میں کافی پیچھے ہیں۔ خاص طور پر پروفیشنل میدان میں ملازمت کی مسابقت اور Compitetive Examination میں یہ پسماندگی کا باعث بن جاتا ہے۔

مسلم خواتین کی تعلیمی ترقی، اسلامی تحریکات کی سرگرمیاں اور خود خواتین کی اپنی تنظیمی کارکردگی نے مجموعی طور پر ان کی سماجی حیثیت پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ دینی اور سماجی سطح پر بھی تبدیلیاں نمایاں ہیں۔ مندرجہ بالا نکات تصویر کا ایک پہلو ہے، دوسرا پہلو اتنا اطمینان بخش نہیں ہے، روایتی علماء اور ان کی تنظیمیں ابھی بھی ان کی تعلیمی ترقی میں دلچسپی نہیں لے رہی ہیں۔ کبھی کبھی یہ لوگ ان کی ترقی کے راستے میں رکاوٹیں بھی ڈالتے ہیں، پھر بھی اللہ کے فضل سے کافی نمایاں تبدیلیاں ہوئی ہیں، آج کیرالہ میں سیکڑوں مساجد میں مسلم خواتین جمعہ اور عیدین میں بھی شرکت کرتی ہیں۔ سیاست میں بھی ان کا اپنا نمایاں کردار ہے۔ بیس

پچیس برس پہلے ایک مسلم خاتون کیرالہ کے اسمبلی کی اسپیکر رہیں۔ حالیہ اسمبلی الیکشن میں بھی مسلم خواتین منتخب ہوئیں ہیں۔

یہ تبدیلیاں اپنے اندر ایک خوش آئند پہلو رکھتی ہیں، لیکن چند تشویشناک چیزیں بھی ہمارے ذہن میں رہنی چاہئیں۔ تعلیمی اور سماجی میدان کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کا منفی پہلو بھی سامنے آرہا ہے۔ سماج کے اعلیٰ طبقے خصوصاً جو دولت مند طبقے ہیں مغربی تہذیب کے اثرات، ان کی اسلامی قدروں کو گھن کی طرح کھا رہے ہیں۔ گلف ہوم کی وجہ سے عام مسلمان کی حالت میں کافی تبدیلی ہوئی ہے۔ غربت وافلاس سے ملت کو کسی حد تک نجات تو ملی ہے۔ لیکن فضول خرچی، جہیز کا رواج اور مغربی تہذیب کا اثر جیسی خرابیاں سماج کے ایک بڑے گروہ کے اندر پائی جاتی ہیں۔

دوسری طرف توہمات اور نکاح وطلاق کے غلط استعمال، جہیز کی لعنت وغیرہ سماج کے پسماندہ طبقہ کے لئے ایک زہر ہلاہل ہے۔ خواتین اس سے سب سے زیادہ متاثر ہیں۔ چنانچہ تعلیمی ترقی، خواندگی کی بہتری اور اصلاحی تنظیموں کی کوششوں کے نتیجے میں یہاں بھی قابل قدر تبدیلیاں ہوئی ہیں۔

نوٹ: یہ اعداد وشمار مختلف تحقیقی مراکز سے لئے گئے ہیں۔

☆☆

پولیس اور مسلمانوں میں خلا پُر کرنے کی کوشش

● عاصم جلال

اردو صحافیوں کے ساتھ ایک خصوصی ملاقات کے دوران مہاراشٹرا ے ٹی ایس کے سربراہ راکیش ماریہ نے مسلمانوں اور اے ٹی ایس کے درمیان خلاء کو پر کرنے کی ضرورت کا اظہار کیا۔ اے ٹی ایس سربراہ کی اس کوشش کا خیر مقدم کیا جانا چاہئے اور یقیناً انہیں مسلمانوں کی طرف سے بھرپور تعاون بھی ملنا چاہئے مگر اس سے پہلے اس بات پر بھی گفتگو ہونی چاہئے کہ یہ خلاء کیوں کر پیدا ہوا اور اسے دور کرنے کیلئے کن اقدامات کی ضرورت ہے۔

جمعرات ۳؍جنوری ۲۰۱۳ء کو اردو صحافیوں کے ساتھ ایک خصوصی ملاقات کے دوران مہاراشٹرا ے ٹی ایس کے سربراہ راکیش ماریہ نے مسلمانوں اور اے ٹی ایس کے درمیان خلاء کو پر کرنے کی ضرورت کا اظہار کیا۔ اے ٹی ایس سربراہ کی اس کوشش کا خیر مقدم کیا جانا چاہئے۔ یہ بات باعث مسرت ہے کہ دیر سے ہی سہی سیکوریٹی ایجنسی کے ایک ذمہ دار افسر کو بھی اس بات کا احساس ہوا کہ پولیس اور مسلمانوں کے درمیان ایک خلاء موجود ہے جسے پر کیا جانا اشد ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معاشرے کو جرائم سے پاک رکھنے اور خاطیوں کی شناخت نیز انہیں کیفر کردار تک پہنچانے کیلئے پولیس اور مسلمانوں میں ہی نہیں بلکہ پولیس اور عوام کے درمیان اعتماد کا ایک مضبوط رشتہ ضروری ہے۔ ایسا رشتہ جس میں جرائم

پیشہ افراد تو سیکورٹی ایجنسیوں کے اہلکاروں کو دیکھ کر لرز اٹھیں مگر عوام اُنہیں دیکھ کر راحت کا سانس لیں اور ان میں تحفظ کا احساس پیدا ہو۔ یہ رشتہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ عوام کے تعاون کے بغیر پولیس کے لئے اپنے فرائض منصبی کو احسن طریقے سے انجام دینا تقریباً ناممکن ہے۔

افسوس کہ ممبئی ہی نہیں پورے ملک میں ایسا نہیں ہے۔ عالم یہ ہے کہ عام آدمی ''پولیس کے چکر'' میں پڑنے سے ہی بچنا چاہتا ہے۔ اگر خدانخواستہ اسے کسی تھانے میں جانے کی ضرورت پیش ہی آجائے تو وہ کسی ایسے شخص کا سہارا تلاش کرتا ہے جس کا پولیس اسٹیشن میں 'آنا جانا' ہو۔ یعنی عام آدمی اُس دفتر میں داخل ہونے سے بھی ڈرتا ہے جو فی الحقیقت اسی کے تحفظ کیلئے قائم کیا گیا ہے۔ اس کی جو مختلف وجوہات ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں۔ رہی مسلمانوں اور اے ٹی ایس یا پولیس کے درمیان موجود خلاء کو پر کرنے کی ضرورت تو یہ صرف ممبئی یا مہاراشٹر تک محدود نہیں ہے بلکہ پورے ملک میں اس کی اشد ضرورت ہے۔

مہاراشٹر اے ٹی ایس کے سربراہ اگر اس سلسلے میں واقعی سنجیدہ ہیں تو یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔ یقیناً انہیں مسلمانوں کی طرف سے بھر پور تعاون ملنا چاہئے مگر اس سے پہلے اس پر گفتگو ہونی چاہئے کہ یہ خلاء کیوں کر پیدا ہوا اور اسے دور کرنے کیلئے کن اقدامات کی ضرورت ہے۔ واضح الفاظ میں کہیں تو اس خلاء کی اہم وجہ پولیس اور مسلمانوں میں اعتماد کا فقدان ہے۔ ایک طرف جہاں قومی میڈیا دہشت گردی کے الزام میں ہونیوالی گرفتاریوں کو بے چون و چرا بالکل اسی طرح تسلیم کر لیتا ہے جیسا کہ پولیس بتائے تو دوسری طرف مسلمانوں کا ایک بڑا حلقہ اس ضمن میں ہونے والی ہر گرفتاری کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کی وجہ بھی ہے۔ مسلمانوں میں احساس مظلومیت اور یہ احساس شدید تر ہوتا جارہا ہے کہ پولیس کا رویہ ان کے ساتھ جانبدارانہ ہوتا ہے اور دہشت گردی کے الزام میں مسلم نوجوانوں کو بے جا گرفتار کیا جارہا ہے۔ افسوس کہ ان کے اس احساس کو ختم کرنے کے بجائے قومی کیا

گیا اور ایسا صرف مہاراشٹر کی سطح پر نہیں بلکہ قومی سطح پر ہوا۔ پورے ملک میں دہشت گردی کے نام پر ہونیوالی متعدد گرفتاریاں تنازعات کا شکار ہیں۔ مہاراشٹر میں مالیگاؤں کے ۲۰۰۶ء کے بم دھماکوں کے معاملے نے اے ٹی ایس کی شبیہ کو پورے ملک میں جو نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی مشکل ہے۔ قومی سطح پر دیکھیں تو حیدر آباد میں مکہ مسجد میں دھماکہ ہوتا ہے تو اس کے الزام میں بھی مسلمانوں کو ہی گرفتار کیا جاتا ہے، اجمیر میں دہشت گردانہ کارروائی ہوتی ہے تو اس کا ٹھیکرا مسلم نوجوانوں کے سر پھوڑ دیا جاتا ہے، سمجھوتہ ایکسپریس میں بم پھٹتے ہیں تو بھی مسلمانوں کو ہی تلاش کیا جاتا ہے۔ مہاراشٹر میں جالنہ، پورنے اور دیگر علاقوں میں ہونے والے چھوٹے چھوٹے دھماکوں میں بھی پہلے مسلم نام ہی تلاش کرنے کی کوشش کی گئی جبکہ ناندیڑ میں بم سازی کرتے ہوئے مبینہ بھگوا دہشت گردوں کی ہلاکت کے باوجود ابتداء میں اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی۔

یہ اور اس طرح کے دیگر واقعات نے پولیس اور خاص طور سے اے ٹی ایس کی شبیہ کو بری طرح سے داغدار کر دیا ہے۔ عام تاثر یہ ہے کہ پولیس محض شبہ کی بنیاد پر مسلم نوجوانوں کو دھر دبوچتی ہے اور پھر دہشت گردی مخالف سخت قوانین کے سبب ان پر خود کو بے قصور ثابت کرنے کی ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے۔ پولیس اور مسلمانوں کے درمیان موجود خلاء کو دور کرنے کیلئے اس تاثر کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ مہاراشٹر کے اے ٹی ایس چیف کا کہنا ہے کہ جب سے انہوں نے محکمہ کا چارج سنبھالا ہے تب سے اب تک کسی بھی بے گناہ شخص کو گرفتار نہیں کیا گیا۔ ان کی بات کی تردید نہیں کی جاسکتی مگر اورنگ آباد میں ناندیڑ سے گرفتار کئے گئے چار نوجوانوں میں سے ایک کی درخواست ضمانت پر شنوائی کے دوران جو کچھ ہوا اس کی وجہ سے اے ٹی ایس کے تعلق سے عوام میں کیا تاثر قائم ہوگا؟ عدالت کی سرزنش کے باوجود اے ٹی ایس کورٹ میں مذکورہ نوجوانوں کے خلاف کوئی ثبوت نہیں پیش کرسکی۔ اس سے عوام میں یہ تاثر مزید قوی ہوا ہے کہ پولیس بلا ثبوت ہی گرفتاریاں کرتی

ہے ورنہ اگر ثبوت تھا تو اسے عدالت میں پیش کیوں نہیں کر دیا گیا۔

جہاں تک دہشت گردی کے خاتمے کا تعلق ہے تو مسلمانوں سے زیادہ اس سے کسی اور کو فائدہ نہیں پہنچے گا۔ اس لئے کہ دہشت گردانہ کارروائی میں وہ مارے بھی جاتے ہیں اور دہشت گردی کے الزام میں ان کے نوجوان گرفتار بھی ہوتے ہیں۔ اس لئے دہشت گردی کے خاتمے کیلئے کی جانے والی ہر کوشش کو مسلمانوں کا تعاون حاصل ہوگا، مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ انہیں اعتماد میں لیا جائے، مظلومیت کے ان کے احساس کو ختم کیا جائے اور ان کے ساتھ صرف انصاف نہ ہو بلکہ ان میں انصاف کا احساس بھی پیدا کیا جائے۔ محض کیس حل کر لینے کیلئے گرفتاریاں نہ ہوں بلکہ کیس حل ہونے کی صورت میں گرفتاریاں ہوں۔ ساتھ ہی پولیس اور اس کے محکمہ انسداد بدعنوانی میں مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے نمائندگی دی جائے۔

ہمیں امید ہے کہ اگر اے ٹی ایس اور ممبئی پولیس مسلمانوں میں اپنا اعتماد بحال کر لے تو وہ خلاء یقیناً پر ہو جائے گا جس کی جانب مہاراشٹرا اے ٹی ایس سربراہ نے پیش قدمی کی ہے۔ اتنا ہی نہیں ملک کے دیگر حصوں میں اس طرح کی پیش قدمیوں کی ضرورت ہے۔

(مضمون نگار صحافی اور روزنامہ انقلاب ممبئی سے وابستہ ہیں)

☆☆

پولیس اور فوج میں مسلمانوں کی نمائندگی

● مولانا حسان جامی

وزارت داخلہ کی رپورٹ کے مطابق اتر پردیش اور بہار جیسی ریاستوں کی پولیس فورس میں بھی نمائندگی یا ملازمت دیئے جانے میں مسلمانوں کیساتھ امتیازی سلوک روا رکھا گیا ہے۔

ہندوستان کی پولیس فورس میں مسلمانوں کی نمائندگی برائے نام بھی نہیں ہے، کیونکہ ملک کی مختلف ریاستوں کی پولیس میں مسلم افسروں اور اہلکاروں کی شرح تناسب کل ملا کر صرف 6 فیصد ہے، جن میں سے 2 فیصد جموں وکشمیر پولیس میں تعینات ہیں، وزارت داخلہ نے اس بات پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے انکشاف کیا ہے کہ پولیس میں اتنے بھی مسلمان افسر نہیں کہ انھیں مسلم علاقوں میں تعینات کیا جاسکے، بھارت کی مختلف ریاستوں میں قائم پولیس فورس کی کل افرادی قوت 16 لاکھ 60 ہزار کے لگ بھگ ہے، اگر مسلم اکثریتی ریاست جموں وکشمیر کی پولیس فورس میں تعینات 46 ہزار 250 مسلمان افسروں اور اہلکاروں کو نکال دیا جائے تو پورے ہندوستان کی تمام ریاستوں کی پولیس فورس میں مسلم افسروں اور اہلکاروں کا تناسب گھٹ کر صرف 4 فیصد رہ جاتا ہے، یعنی ہندوستان میں 16 کروڑ سے زیادہ مسلمانوں کی پولیس فورس میں نمائندگی برائے نام ہے۔

مرکزی وزارت داخلہ کے اعداد وشمار کے مطابق پورے ہندوستان میں پولیس افسروں اور اہلکاروں کی کل تعداد 16 لاکھ 60 ہزار کے لگ بھگ ہے، جبکہ مسلمان افسروں اور اہلکاروں کی کل نمائندگی صرف ایک لاکھ 8 ہزار ہے، ہندوستانی پولیس فورس میں مسلم نوجوانوں

کونظر انداز کرنے کے معاملے میں نئی دہلی نمبرون پر ہے، کیونکہ دہلی پولیس کی کل افرادی قوت 75 ہزار 117 ہے، جس میں حیران کن طور پر مسلمان افسروں اور اہلکاروں کی کل نمائندگی صرف ایک ہزار 521 ہے، یہ اعداد وشمار ظاہر کرتے ہیں کہ دہلی پولیس فورس میں مسلمانوں کی نمائندگی 2 فیصد سے زیادہ نہیں ہے۔ وزارت داخلہ کی رپورٹ کے مطابق اتر پردیش اور بہار جیسی ریاستوں کی پولیس فورس میں بھی نمائندگی یا ملازمت دیئے جانے میں مسلمانوں کیساتھ امتیازی سلوک روا رکھا گیا ہے، کیونکہ مسلم آبادی کے اعتبار سے ان دو بڑی ریاستوں میں مسلم افسروں اور اہلکاروں کا مقامی پولیس فورس میں تناسب 5 فیصد سے زیادہ نہیں ہے۔

رپورٹ کے مطابق جموں وکشمیر کے بغیر باقی تمام ریاستوں کی پولیس فورس میں مسلمانوں کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر ہے، میڈیا رپورٹس میں بتایا گیا ہے کہ وزارت داخلہ نے فرقہ وارانہ فسادات کے دوران مسلم آبادی والے علاقوں میں پولیس اور فورسز کے ہاتھوں مبینہ زیادتیوں کی شکایات کو مدنظر رکھتے ہوئے اور ملک کی اس سب سے بڑی اقلیت کا اعتماد بحال رکھنے کیلئے مسلم اکثریتی علاقوں میں قائم پولیس چوکیوں کا چارج مسلمان افسروں کوسونپنے پر زور دیا، لیکن وزارت داخلہ کے مرتب کردہ منصوبہ پر اس لئے عمل درآمد نہ ہوسکا، کیونکہ پورے ملک میں اتنے مسلم افسر یعنی اتنی تعداد میں مسلم انسپکٹر اور سب انسپکٹر دستیاب ہی نہیں کہ انہیں اقلیتی علاقوں کا چارج دیا جائے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ سچر کمیٹی کی رپورٹ نے بھی مختلف سرکاری خدمات میں غریب مسلمانوں کی نمائندگی کے لئے نشاندہی کی تھی، جبکہ مذکورہ کمیٹی نے آبادی کے درمیان اعتماد کی تعمیر کرنے کا ایک طریقہ کے طور پر پولیس اسٹیشنوں میں مسلمان افسران کی سفارش بھی کی، اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لئے وزیر اعظم کا 15 نکاتی پروگرام بھی مشروط تھا کہ پولیس اہلکاروں کی بھرتی میں ریاست کی حکومتوں کو اقلیتوں کو خصوصی غور دینا تھا اور سلیکشن کمیٹیوں میں اس مقصد کے لئے اقلیتی برادری کے نمائندوں کو ہونا چاہئے تھا، لیکن بہت کم ریاستوں نے ایسا کیا۔

☆☆

مجموعہ القاسم: جلد پنجم
مسلم مسائل اور اس کا حل

مسلمانوں کی پارلیمان میں کم ہوتی نمائندگی

● صلاح الدین

ہندوستان میں ۱۴ ر فی صد مسلمان آبادی ہے۔ ہندوستان کے پندرہویں لوک سبھا میں مسلمانوں کی نمائندگی مزید کم ہوئی ہے اور اس بار ۵۴۳ ر رکنی پارلیمان میں صرف ۲۹ ر مسلم ارکان ہی منتخب ہوکر آئے ہیں۔ چودھویں لوک سبھا میں مسلم ارکان کی تعداد ۶۳ ر تھی۔ دوہزار ایک کے سرکاری جائزے کے مطابق ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی تیرہ اعشاریہ چار فیصد ہے لیکن اس بار پارلیمان میں ان کی نمائندگی صرف پانچ فیصد ہی رہ گئی ہے جبکہ چودھویں لوک سبھا میں ان کی نمائندگی چھ فیصد سے زیادہ تھی۔

کانگریس پارٹی کے ٹکٹ پر اس بار آٹھ مسلم امیدوار کامیاب ہوئے جبکہ بہوجن سماج پارٹی اور کشمیر کی نیشنل کانفرنس کی جماعت سے چار چار امیدوار جیتے ہیں۔

انڈین مسلم لیگ اور ترنمول کانگریس کے ٹکٹ پر دو دو مسلم کامیاب ہوئے جبکہ سی پی ایم، جنتا دل یو، بی جے پی، آل انڈیا مجلس اتحاد المسلمین، یوڈی ایف اور ڈیم کے جیسی پارٹیوں سے ایک ایک رکن منتخب ہوا ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ اس بار لالو پرساد یادو کی جماعت راشٹریہ جنتا دل اور ملائم سنگھ کی سماجوادی پارٹی کے ٹکٹ پر ایک بھی مسلم امیدوار کامیاب نہیں ہوا۔ یہ دونوں جماعتیں ریاست بہار اور یوپی میں پچھڑے طبقے اور مسلمانوں کے نام پر سیاست کے لیے جانی جاتی رہی ہیں۔

ریاست اتر پردیش میں اسّی نشستیں ہیں اوراٹھارہ فیصد سے بھی زیادہ مسلمان آباد ہیں۔ یہاں سے سب سے زیادہ سات مسلم امیدوار منتخب ہوئے ہیں۔ ریاست مغربی بنگال میں بیالیس سیٹیں ہیں اوراٹھائیس فیصد مسلمان ہیں۔اس بار یہاں سے صرف چھ ارکان منتخب ہوکرآئے ہیں۔کشمیر سے چاراور ریاست بہار سے تین جہاں چالیس نشستیں اورتقریبا سترہ فیصد مسلمان ہیں۔ کیرالا سے تین، تامل ناڈواورآسام سے دودو، آندھرا پردیش اورلکشد یپ سے ایک ایک مسلم امیدوار کامیاب ہوا۔

جیتنے والےمسلمان امیدوراوں میں کرکٹر اظہرالدین کانام بھی شامل ہے۔

آسام کی جہاں آراءعرف رانی نارہ اورمغربی بنگال کے کبیر سمن نے بھی کامیابی حاصل کی ہےلیکن ان دونوں کےمتعلق صورتحال واضح نہیں کیونکہ ان دونوں نے اپنا مذہب تبدیل کیا تھا۔ان اعداد وشمار کی روشنی میں دیکھا جاسکتا ہے کہ گجرات، مدھیہ پردیش، راجستھان، مہاراشٹر، اڑیسہ، کرناٹک اور پنجاب جیسی بڑی ریاستوں سے ایک بھی مسلم منتخب نہیں ہوا۔

گزشتہ کئی انتخابات سےلوک سبھا یعنی ایوان زیریں میں مسلمانوں کی نمائندگی مسلسل کم ہوتی جاری ہے۔۱۹۸۰ء میں سب سے زیادہ اڑتالیس مسلمان امیدوار منتخب ہوئے تھے۔اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی تقریبا گیارہ فیصد تھی اوراس مناسبت سے پارلیمان میں ان کی نمائندگی نو فیصد تھی۔۸۴ء کے انتخاب میں یہ تعداد ا۱،۴۱ء رہوگئی اور پھرایسے گرتی گئی کہ ۹۰ء کے دہے میں صرف پانچ فیصد ہی بچی۔۱۹۹۷ء اور۲۰۰۴ء میں اس میں قدرے اضافہ ہوالیکن ۲۰۰۹ء میں ایک بارپھر یہ پانچ فیصد رہ گئی ہے۔

اس کمی کی وجہ یہ نہیں کہ مسلمانوں کو ہندوستانی سیاست میں دلچسپی نہیں بلکہ اس کے بر عکس اس بار کے انتخاب میں تقریبا۸۰۷ء مسلم امیدوار میدان میں تھےاور مسلمانوں نے حق رائے دہی کا بھی مناسب استعمال کیا ہے،لیکن ان میں سے زیادہ تر آزاد امیدوار تھے

اورکسی بھی سیاسی جماعت نےمسلمانوں کی آبادی کی مناسبت سےانہیں ٹکٹ نہیں دیا تھا۔

اگر کشمیر کوالگ کردیں تو کانگریس پارٹی نےتیس سے بھی کم مسلم امیدواروں کوکھڑا کیا تھااورکئی ریاستوں میں پارٹی نے ایک بھی مسلم امیدوار نہیں اتارا۔ بی جے پی نے صرف پانچ مسلمانوں کوٹکٹ دیا۔مایاوتی کی جماعت بہوجن سماج پارٹی نے سب سے زیادہ مسلم امیدواروں کوکھڑا کیااورمحض یوپی میں اس کے تیرہ مسلم امیدوار تھے،جبکہ ملائم سنگھ یادو نے بارہ امیداروں کوٹکٹ دیا۔

فاروق عبداللہ کےعلاوہ اس بارکوئی تجربہ کارمسلم پارلیمینٹ نہیں جیتا جبکہ نئے چہروں میں کرکٹر محمد اظہرالدین، بےنظیر نوراورعطر کےمشہور تاجر بدرالدین اجمل شامل ہیں۔ سلمان خورشید، ای احمد بھی کامیاب ہوئے اوراسد الدین اویسی بھی حیدرآباد سے جیت گئے ہیں۔

ہارنے والوں میں شاہد صدیقی، طارق انور، رشید مسعود، بیگم نور بانو، سی کے جعفر شریف، عبدالرحمٰن انتولے،سلیم شیروانی، اکبراحمد ڈمپی افضل انصاری، الیاس اعظمی، شاہد اخلاق،اےاے فاطمی اورمختار عباس نقوی جیسے رہنما شامل ہیں۔

☆☆

مسلم قیدیوں کی تعداد میں اضافہ

ایک لمحہ فکریہ!

● ادارہ

ہندوستان میں جاری کردہ ایک رپورٹ میں انکشاف کیا گیا ہے کہ ملک کی جیلوں میں 22 فیصد مسلمان قید ہیں اور بعض جیلوں میں تو مسلمانوں کی تعداد 65 فیصد تک ہے۔ یہ وہ واحد جگہ ہے جہاں آبادی کے تناسب میں اقلیت مسلمان سب سے زیادہ اکثریت میں ہیں۔ اسکولوں میں مسلمانوں کی تعداد کم، سرکاری نوکریوں میں مسلمانوں کی تعداد کم، مسلم ڈاکٹروں اور انجینئروں کی تعداد کم، مسلم لیڈروں اور رہنماؤں کی تعداد کم، لیکن جیلوں میں مسلم قیدیوں کی تعداد ملک میں ان کی آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ کیا مسلمان چوری، ڈکیتی، قتل اور عصمت دری میں ماہر ہوتے ہیں؟ کیا ملک میں ایسی کوئی جگہ یا ادارہ ہے جہاں پر انہیں جرائم کی ٹریننگ دی جاتی ہے؟ اگر نہیں تو پھر ملک کی جیلوں میں جرائم کے ان معاملات میں مسلم قیدیوں کی ہی تعداد زیادہ کیوں ہے؟ کیوں پولس کی سب سے پہلی نظر صرف مسلمانوں پر ہی پڑتی ہے؟

مسلمانوں کی حالت دیکھ کر اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ کتنی ناانصافی ہوئی ہے۔ ان کے حقوق کے تحفظ کی ذمہ داری حکومتوں پر تھی، جنہیں عوام نے منتخب کر کے مرکز یا مختلف ریاستوں میں حکومت بنانے کا موقع عطا کیا تھا، لیکن ان حکومتوں نے اپنی یہ ذمہ داری پوری نہیں کی۔ اس کے لیے اگر ملک میں سب سے زیادہ ذمہ دار اگر کوئی پارٹی ہے تو وہ کانگریس

ہے، کیوں کہ آزادی کے بعد سے اب تک اس ملک میں حکومت کی باگ ڈور سب سے زیادہ کانگریس کے پاس ہی رہی ہے۔ کانگریس پر جب مسلمانوں کی اندیکھی کرنے کا الزام حد سے زیادہ بڑھنے لگا مرکز میں زیر اقتدار کانگریس کی قیادت والی یو پی اے–1 حکومت نے سچر کمیٹی کی تشکیل کر کے اس ملک کے مسلمانوں کی صحیح صورتِ حال جاننے کی کوشش کی، اور جب سچر کمیٹی کی رپورٹ منظر عام پر آئی تو ہندوستان کا ہر شہری یہ سن کر حیران تھا کہ آج ملک میں مسلمانوں کی حالت دلتوں سے بھی بدتر ہے۔ اس رپورٹ نے بتایا کہ مسلمان تعلیمی، سماجی اور اقتصادی طور پر بہت زیادہ پچھڑ چکے ہیں۔ سچر کمیٹی کی ہی رپورٹ نے پہلی بار اس بات کا بھی انکشاف کیا کہ ملک کی جیلوں میں مسلمانوں کی تعداد ملک میں ان کی آبادی کے تناسب سے بہت زیادہ ہے، یعنی پورے ملک میں مسلمانوں کی آبادی جہاں تقریباً 12 فیصد ہے، وہیں جیلوں میں ان کی آبادی تقریباً 22 فیصد ہے۔ سچر کمیٹی نے 2006 میں کہا تھا کہ سب سے زیادہ مسلم قیدی مہاراشٹر میں ہیں، لیکن موجودہ اعداد وشمار کے مطابق مسلم قیدیوں کے معاملے میں پہلے نمبر پر مغربی بنگال ہے، جب کہ مہاراشٹر اب دوسرے نمبر پر پہنچ چکا ہے۔ نیشنل کرائم ریکارڈس بیورو کے اعداد وشمار (دسمبر 2010 تک) کے مطابق، سب سے زیادہ 47 فیصد مسلم قیدی مغربی بنگال میں، 32 فیصد مسلم قیدی مہاراشٹر میں، 26 فیصد اتر پردیش میں اور 23 فیصد مسلم قیدی بہار میں ہیں۔ یہی وہ چار ریاستیں ہیں جہاں پر زیر سماعت مسلم قیدیوں کی تعداد سزا یافتہ مسلم قیدیوں سے کئی گنا زیادہ ہے۔ اس سے مسلمانوں کے تئیں پولس کا متعصّبانہ رویہ صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ سچر کمیٹی کی رپورٹ سے متاثر ہو کر ٹاٹا انسٹیٹیوٹ آف سوشل سائنسز نے مہاراشٹر کی متعدد جیلوں کا سروے کیا تھا اور ان میں بند مسلم قیدیوں کی صورتِ حال کو جاننے کی کوشش کی تھی۔ اس کی تحقیق کے دوران مسلم قیدیوں سے متعلق درج ذیل حقائق سامنے آئے: ممبئی سینٹرل اور تھانے سینٹرل جیل میں مسلم قیدیوں کی کل تعداد 52 فیصد ہے اور یہ تمام قیدی انڈر ٹرائل ہیں۔

پورے مہاراشٹر میں 18 سے 30 سال کی عمر کے جتنے بھی قیدی ہیں، ان میں مسلم قیدیوں کا حصہ 65.5 فیصد ہے۔

یہ مسلم قیدی یا تو اَن پڑھ ہیں یا پھر انہوں نے صرف پرائمری اسکول تک تعلیم حاصل کی ہے۔ گرفتاری کے وقت بہت کم مسلمان ایسے تھے جو بے روزگار رہے ہوں، بلکہ زیادہ تر کچھ نہ کچھ کما رہے تھے اور ان کی ماہانہ آمدنی 2000 روپے سے لے کر 5000 روپے تک تھی۔

تحقیق میں یہ بھی پتہ چلا کہ جو مسلم نوجوان گرفتار کیے گئے وہ اپنی فیملی میں کمانے والے واحد فرد تھے اور پوری فیملی کا پیٹ اُن کی کمائی سے ہی بھرتا تھا۔ جن مسلم قیدیوں کا انٹرویو کیا گیا ان میں سے 75.5 فیصد ایسے تھے، جنہیں پہلی بار گرفتار کیا گیا تھا، یعنی وہ کرمنل بیک گراؤنڈ کے نہیں تھے۔

مسلم قیدیوں کے زیادہ تر معاملے انسانی جسم کو نقصان پہنچانے سے متعلق تھے۔ اس میں قتل، قتل کی کوشش، عصمت دری، اغوا یا کسی پر حملہ کرنا شامل ہے۔ ان میں بھی زیادہ تر معاملے خاندانی رشتے، پیسے یا پراپرٹی کے جھگڑے، عشق، بدلہ لینے کی سوچ وغیرہ سے متعلق ہیں، جن میں اکثریت ان معاملوں کی ہے جو شوہر اور بیوی کے درمیان جھگڑے سے متعلق ہیں۔

حیرانی کی بات یہ ہے کہ زیادہ تر معاملوں میں قیدیوں نے اپنی گرفتاری کے لیے ناقص پولس سسٹم کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ جرم کرنے سے باز آنا چاہتے ہیں، لیکن ایک بار جرم کر دینے اور گرفتار ہو جانے کے بعد ان کے علاقہ میں جب بھی کرائم کا کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو پولس پہلے انہیں ہی گرفتار کرتی ہے، جس کی وجہ سے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بار بار جیل پہنچ جاتے ہیں اور جرائم کی دنیا سے پیچھا نہیں چھڑا پاتے۔ کچھ مسلم قیدیوں کا یہ بھی ماننا ہے کہ پولس کے متعصّبانہ رویہ کی وجہ سے مسلمانوں کو بار بار گرفتار کیا جاتا ہے۔

ماہرین کا خیال ہے کہ مسلمانوں کی اس حالت کے لیے ان کی غریبی اور ناخواندگی تو ذمہ دار ہے ہی، ساتھ ہی ذمہ دار ہے ملک کا ناقص پولس سسٹم۔ ہندوستانی جیلوں پر گہری نظر رکھنے والے ماہرین مسلمانوں کے تئیں متعصّبانہ کرمنل جسٹس سسٹم کو بھی اس کی ایک بڑی وجہ مانتے ہیں۔ مسلم قیدیوں کی کیس اسٹڈی سے پتہ چلتا ہے کہ جیلوں میں ایسے قیدیوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے، جنہیں پراپرٹی سے متعلق جھگڑے، مار پیٹ، قتل یا قتل کرنے کی کوشش، عصمت دری اور چوری ڈکیتی جیسے معاملوں میں گرفتار کیا گیا ہے۔ دوسری طرف حقائق یہ بھی بتاتے ہیں کہ ان میں سے زیادہ تر مسلم قیدیوں کو زیادہ سے زیادہ سات دن تک پولس کسٹڈی میں رکھنے کی اجازت دی گئی، کیوں کہ یا تو پولس نے اپنی جانچ سات دنوں میں مکمل کر لی اور کوئی بڑا جرم ثابت نہ کر پانے کی وجہ سے عدالت کی طرف سے ان ملزموں کو ضمانت مل گئی، یا پھر عدالت نے اس بات کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ ان مسلم قیدیوں کو زیادہ دنوں تک جیلوں میں بند رکھا جائے، لیکن ان سب کے درمیان سب سے حیران کرنے والی بات یہ ہے کہ زیادہ تر مسلم قیدیوں کی عمر 18 سے 30 سال کے درمیان ہے۔ اتنی کم عمر میں کسی بڑے جرم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہندوستانی جیلوں میں جتنے مسلم قیدی اس وقت بند ہیں، ان میں سے بہت کم ایسے ہیں، جن کا جرم ثابت ہو چکا ہے اور اکثریت ایسے افراد کی ہے، جن کا معاملہ سالوں سے عدالت کے سامنے زیر غور ہے۔ بہت سے ایسے معاملات ہیں جن کا مشاہدہ کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ قیدی نے کوئی چوری نہیں کی تھی، لیکن اس پر زبردستی چوری کا الزام لگا کر گرفتار کر لیا گیا۔ عدالت میں پہلی پیشی کے دوران چونکہ اس نے اپنا جرم قبول کرنے سے منع کر دیا تھا، اس لیے عدالت نے اسے عدالتی تحویل میں بھیج دیا اور اس کے معاملہ کی مزید تفتیش کرنے کا حکم دیا اور اس طرح عدالت سے اس قیدی کو تاریخ پر تاریخ ملتی رہی۔ کچھ سال گزرنے کے بعد قیدی نے اپنا جرم قبول کرنا ہی مناسب سمجھا لیکن تب جا کر اسے معلوم ہوا کہ جس چوری

کے جھوٹے الزام میں اسے گرفتار کیا گیا تھا اس کی سزا صرف چھ ماہ قید کی ہے، لیکن اب تک اس نے تین سال یا اس سے بھی زیادہ کا عرصہ حراست میں گزار دیا ہے۔

ہم اکثر ٹی وی چینلوں پر یا اخبار میں اس قسم کی خبریں دیکھتے یا پڑھتے ہیں کہ پولس نے فلاں شخص کو فلاں جرم میں گرفتار کر لیا، لیکن اس گرفتاری کے پیچھے حقیقی اسباب کیا تھے، ان کے بارے میں نہ تو کہیں کسی ٹی وی چینل پر دیکھنے کو ملتا ہے اور نہ ہی اخباروں میں پڑھنے کو ملتا ہے، البتہ چند رضا کار تنظیموں کی طرف سے قیدیوں کی زندگی پر کی گئی ریسرچ سے بعض دفعہ کچھ حقائق دیکھنے اور سننے کو مل جاتے ہیں۔ جیلوں سے متعلق کی گئی ریسرچ اور رپورٹوں کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی جیلوں میں اب بھی ہزاروں ایسے افراد بند ہیں، جنھوں نے کوئی جرم نہیں کیا اور انہیں بغیر کوئی گناہ کیے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑ رہی ہیں۔ ان میں سے چند واقعات تو کافی حیران کر دینے والے ہیں۔ مثال کے طور پر ممبئی کی ایک جیل میں بند منیر نام کے ایک نوجوان مسلم لڑکے کی کہانی یہ ہے کہ ایک دن جب اسے اپنے والد کے کافی بیمار پڑنے کی خبر ملی تو ٹرین پکڑ کر اپنے گھر کے لیے روانہ ہو گیا، لیکن راستے میں اچانک اس کے پیٹ میں کافی درد ہونے لگا، جس کی وجہ سے وہ بیچ راستے میں ہی کسی پلیٹ فارم پر اتر گیا اور سوچنے لگا کہ کیسے ڈاکٹر تک پہنچے، تبھی دو پولس والے اس کے پاس آئے اور اس سے پوچھنے لگے کہ اسے کہاں جانا ہے اور وہ کہاں سے آ رہا ہے۔ ان پولس والوں نے اس کے بیگ کو جب کھول کر دیکھا تو اس میں بارہ ہزار روپے پڑے ہوئے تھے۔ اس پیسے کو دیکھ کر پولس والوں کی نیت خراب ہو گئی۔ وہ منیر کو لے کر پولس اسٹیشن گئے، وہاں اسے چائے پلائی اور پیٹ درد کے لیے دوا بھی دی۔ کچھ دیر بعد وہ اسے ایک سینئر پولس والے کے سامنے لے گئے اور وہاں پر اس کے بیگ کو دوبارہ کھولا۔ بیگ میں سے ایک 'پیکٹ' ملا، جس کے بارے میں پولس نے منیر سے پوچھ گچھ کی اور اسے مارا پیٹا کہ یہ اس کے بیگ میں کیسے پہنچا۔ جب منیر نے مار کھانے کے بعد بھی لاعلمی کا اظہار کیا تو پولس والوں نے کہا کہ

اس 'پیکٹ' میں غیر قانونی 'ڈرگ' ہے اور پھر اسی کی بنیاد پر انہوں نے منیر کو گرفتار کر لیا۔ منیر کا یہ ماننا ہے کہ پولس والوں نے اسے 12 ہزار روپے کی وجہ سے گرفتار کیا اور اس کے خلاف 'ڈرگ' اسمگلنگ کا جھوٹا الزام لگا دیا۔ منیر کی جیل میں خبر خیریت لینے والا کوئی نہیں ہے، وہ نہ تو اپنے والد کو اس کی اطلاع دے سکتا ہے کیوں کہ وہ پہلے سے ہی بیمار ہیں اور نہ ہی اس کی ماں اس سے ملنے اتنی دور ممبئی آ سکتی ہیں۔ وہ اپنی گرفتاری کی خبر اپنے گاؤں تک نہیں پہنچنے دینا چاہتا، کیوں کہ اسے ڈر ہے کہ اس کی ایک غیر شادی شدہ بہن کی شادی میں بعد میں چل کر دقت آ سکتی ہے۔ اس کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں ہیں کہ وہ کوئی وکیل کر سکے اور عدالت میں اپنی بے گناہی ثابت کر سکے۔ اس طرح وہ ناکردہ گناہوں کی سزا کاٹ رہا ہے۔

ان حقائق کا جائزہ لینے کے بعد اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ آخر اس کا علاج کیسے کیا جائے۔ ملک کے پولس نظام کو تو درست کرنے کی ضرورت ہے ہی، کیونکہ موجودہ پولس سسٹم انگریزوں کے دور کا ہے اور انگریزوں نے پولس سسٹم ہندوستانیوں کو غلام بنانے اور ان پر حکمرانی کرنے کے لیے تیار کیا تھا، آزاد ہندوستان میں اس کے کام کاج کے طریقے اور نظریے میں تبدیلی آنی چاہیے تھی، لیکن ایسا نہیں ہوا، جس کی وجہ سے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ اس ملک کے دیگر باشندے بھی پولس سسٹم سے پریشان ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ صرف پولس کے متعصبانہ رویہ کی وجہ سے ہی جیلوں میں مسلم قیدیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے، بلکہ اس کے لیے خود مسلمان بھی ذمہ دار ہیں۔ وہ اس لیے ذمہ دار ہیں، کیوں کہ ان کے اندر تعلیم نہیں ہے، ان کے والدین بچپن سے ہی انہیں کسی کام میں لگا دیتے ہیں تا کہ ان کا بچہ زیادہ سے زیادہ پیسہ کما سکے، لیکن یہ وہ عمر ہوتی ہے جس میں بھٹکنے کے چانسز زیادہ ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ بچے چوری، نشہ خوری اور اس جیسی دوسری بری عادتوں میں پھنس جاتے ہیں اور بڑے ہو کر اپنی انہی بری عادتوں اور خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے بڑے جرائم کو انجام دینے لگتے ہیں، لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمانوں کو تعلیم یافتہ بنایا جائے، لیکن بعض دفعہ ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ تعلیم یافتہ ہونے

کے باوجود مسلمانوں کو نوکری نہیں ملتی۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی اپنی تعلیم کے لیے صرف مدرسوں کا رخ کرتی ہے، جہاں پر جدید تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے، اس لیے انہیں کوئی اچھی نوکری نہیں مل پاتی اور اس طرح پڑھ لکھ کر بھی وہ غریبی کے اندھیرے سے باہر نہیں نکل پاتے، اور ہم سب جانتے ہیں کہ سماج میں زیادہ تر برائیوں کی جڑ غریبی ہی ہے اور مسلمان بھی اس سے اچھوتے نہیں ہیں۔اس کے علاوہ ہمارے ملک کے میڈیا نے مسلمانوں کی شبیہ کو سب سے زیادہ بگاڑا ہے۔میڈیا کا یہ حال ہے کہ مسلمانوں کے مسائل سے متعلق خبریں اور رپورٹیں تو کم دیکھنے یا پڑھنے کو ملتی ہیں، لیکن اگر کسی مسلمان نے دہشت گردی کا کوئی واقعہ انجام دے دیا تو کئی کئی دنوں تک ٹی وی پر اس کے بارے میں رپورٹیں پیش کی جاتی ہیں، اخباروں کے پہلے صفحہ پر اس خبر کو شائع کیا جاتا ہے۔میڈیا کے اس رویہ میں تبدیلی آنی چاہیے اور اسے مسلمانوں کے ان ایشوز پر بھی فوکس کرنا چاہیے، جن سے انہیں تعلیمی، معاشی اور سماجی پس ماندگی سے باہر نکالا جاسکے۔حکومت کی طرف سے مسلمانوں کی پس ماندگی کو دور کرنے کے لیے کوششیں ہو رہی ہیں، لیکن نیت صاف اس لیے نہیں ہے، کیوں کہ کسی بھی پارٹی کی حکومت اگر مسلمانوں کی فلاح وترقی سے متعلق کوئی کام کرتی ہے تو اس کا پہلا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اگلے انتخاب میں مسلمان اسے زیادہ سے زیادہ تعداد میں ووٹ دیں۔ اس لیے یہاں بھی خلوص کا فقدان ہے، اسی لیے حکومت کی تمام کوششوں کے باوجود مسلمانوں کی حالت جوں کی توں بنی ہوئی ہے اور اخیر میں مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ ان کے درمیان کوئی ایسا رہنما نہیں ہے، جو انہیں صحیح راستہ دکھا سکے اور ایک اچھا شہری بننے کی طرف ان کی رہنمائی کر سکے اور انہیں متحد رکھ سکے۔ان تمام خامیوں کو دور کر کے ہی مسلمانوں کو بہتر زندگی جینے کا موقع فراہم کرایا جاسکتا ہے، ورنہ مسلمانوں کی اندیکھی کر کے ہمارا ملک ترقی یافتہ ممالک کی صف میں شامل ہونے کا اپنا خواب کبھی پورا نہیں کر سکتا۔

☆☆

عدلیہ سے غائب ہوتے مسلمان

● ڈاکٹر قمر تبریز

ہندوستان میں مسلمان دوسری سب سے بڑی اکثریت ہیں۔سو کروڑ سے زیادہ کی آبادی میں ان کا حصہ تیرہ سے پندرہ فیصد کے درمیان ہے، لیکن کسی بھی سرکاری محکمے میں چلے جائیں، اونچے عہدوں پر مسلمان کہیں نظر نہیں آتا۔آزادی کے ساٹھ سال سے زیادہ کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی نہ تو آج تک کسی مسلم کو اس ملک کا وزیر اعظم بنایا جاسکا ہے اور نہ ہی آرمی چیف۔اس وقت ہندوستان میں مسلمان سب سے زیادہ پریشان اس بات کو لے کر ہیں کہ انہیں دہشت گردی کے نام پر سرکاری ایجنسیوں کے ذریعے نشانہ بنایا جارہا ہے، شک کی بنیاد پر مسلم نوجوانوں کی بے روک ٹوک گرفتاری کا سلسلہ جاری ہے۔

دہشت گردی کو چھوڑ بھی دیں، تو دیگر سماجی ومعاشی حالات سے پیدا ہونے والے مسائل اور جھگڑا فساد کی وجہ سے بھی مسلمانوں کی تعداد جیلوں میں بڑھتی جارہی ہے۔ وزارتِ داخلہ کے ماتحت کام کرنے والے نیشنل کرائم ریکارڈس بیورو کی تازہ رپورٹ بتاتی ہے کہ اس وقت ملک کی کل 1,393 جیلوں میں بند قیدیوں کی مجموعی تعداد 3 لاکھ 68 ہزار 998 ہے، جن میں مسلم قیدیوں کی تعداد 76 ہزار 701 ہے۔حیرانی کی بات تو یہ ہے کہ ان میں صرف 22 ہزار 672 مسلم قیدی ایسے ہیں، جنہیں ان کے جرم کی سزا سنائی جاچکی ہے، جب کہ 53 ہزار 312 مسلم قیدیوں کا معاملہ ابھی عدالت کے سامنے زیر غور ہے، یعنی انڈر ٹرائل مسلم قیدیوں کی تعداد ساٹھ فیصد سے بھی زیادہ ہے۔ہم سب جانتے ہیں کہ

ایک تو ملک کی جیلوں میں قیدیوں کی تعداد ان جیلوں میں قیدیوں کو ٹھہرانے کی استعداد سے کہیں زیادہ ہے، یعنی اس وقت ملک کی جیلوں میں کل 3 لاکھ 20 ہزار 450 قیدیوں کو رکھا جا سکتا ہے، لیکن ان جیلوں میں 3 لاکھ 68 ہزار 998 قیدیوں کو ٹھونس ٹھونس کر رکھا گیا ہے۔ اس سے ان قیدیوں کی دیکھ بھال پر تو اثر پڑا ہی ہے، جیل انتظامیہ پر بھی کافی بوجھ بڑھ گیا ہے۔ دوسری طرف ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ملک کی عدالتوں کے سامنے اتنے زیادہ معاملے زیر سماعت ہیں کہ ایک مقدمہ کے نمٹانے میں کئی سال لگ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ عدالتوں میں ججوں کی بھی بھاری کمی ہے۔ جب جج ہی نہیں ہوں گے تو بھلا مقدمے کی سماعت کون کرے گا اور پھر ان کا فیصلہ کون کرے گا۔

مسلمانوں کو اکثر یہ بھی شکایت رہی ہے کہ عدالتوں میں ان کے معاملوں کی سماعت اکثر تعصب سے پاک نہیں ہوتی اور چونکہ جج یا سرکاری وکیل ان کا ہم مذہب نہیں ہوتا، اس لیے ان کے معاملات کو وہ ان کے مذہبی، سماجی و معاشرتی پس منظر میں ٹھیک ڈھنگ سے نہ سمجھ پانے کی وجہ سے صحیح فیصلہ نہیں دے پاتا۔ ایسے میں مسلم ججوں کی ضرورت شدت سے محسوس کی جاتی ہے۔ لیکن ہندوستان میں جیسا کہ دیگر تمام سرکاری اداروں میں دیکھنے کو ملتا ہے، عدلیہ میں بھی مسلمانوں کی نمائندگی صرف 7.8 فیصد ہے، حالانکہ عدلیہ میں تقرری کا عمل نہایت صاف ستھرا اور بہتر مانا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ماتحت عدلیہ (سب آرڈینیٹ جیوڈیشری) کی تقرری کے لیے اسٹیٹ پبلک سروس کمیشن سب سے پہلے ایک تحریری امتحان کراتا ہے۔ اس میں شامل ہونے کے لیے قانون میں گریجویٹ کی ڈگری ہونا لازمی ہے۔ یہ امتحان سب کے لیے اوپن ہے۔ اس امتحان کو پاس کر لینے کے بعد انٹرویو ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہائی کورٹ کے ایک جج کی صدارت میں سلیکشن کمیٹی، جس میں اسٹیٹ پبلک سروس کمیشن کا نمائندہ بھی شامل ہوتا ہے، امتحان اور انٹرویو میں حاصل ہونے والے کل نمبرات کی بنیاد پر خالی عہدوں کے لیے امیدواروں کا انتخاب کرتی ہے۔ چونکہ ماتحت عدلیہ کے تحریری

امتحان میں امیدوار کی پہچان کو ظاہر نہیں کیا جاتا، اس لیے تقرری کے اس عمل میں مسلمانوں یا کسی اور کے ساتھ تعصب برتنے کی بات کو خارج از امکان قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود عدلیہ میں مسلمانوں کی کم شراکت داری بڑے پیمانے پر تشویش کا باعث ہے۔

سچر کمیٹی نے ہندوستانی عدلیہ سے وابستہ جن مسلم عہدیداروں کی تفصیلات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی، ان میں ایڈووکیٹ جنرل، ڈسٹرکٹ اور سیشن جج، ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اور سیشن جج، چیف جیوڈیشیل مجسٹریٹ، منصف، سرکاری وکیل کے ساتھ ساتھ ملک کی نچلی عدالتوں میں کام کرنے والے اے، بی، سی اور ڈی گریڈ کے ملازمین شامل تھے۔ یہی وہ تمام عہدے ہیں، جو عدالتی نظام کی تشکیل کرتے ہیں۔ عدلیہ کے اس پورے ڈھانچے میں مسلمانوں کی نمائندگی پر بات کرنا ضروری اس لیے ہے، کیوں کہ خود وزارتِ داخلہ کی اسٹینڈنگ کمیٹی کا بھی یہی ماننا ہے کہ 80 فیصد معاملوں کی سنوائی نچلی عدالتوں میں ہی ہوتی ہے، جس میں ڈسٹرکٹ اور سیشن کورٹ شامل ہیں۔ جموں و کشمیر ملک کی واحد ریاست ہے جہاں پر مسلمان اکثریت میں ہیں۔ یہاں پر ان کی آبادی 66.97 فیصد ہے، لیکن افسوس کہ عدلیہ میں یہاں بھی ان کی نمائندگی ان کی آبادی کے تناسب میں نہیں ہے اور ریاست کی عدلیہ میں ان کی حصہ داری صرف 48.3 فیصد ہے، البتہ آندھرا پردیش ہندوستان کی واحد ریاست ہے جہاں پر عدلیہ میں مسلمانوں کی نمائندگی ان کی آبادی کے تناسب سے زیادہ ہے، یعنی ریاست کے اندر مسلمانوں کی کل آبادی 9.2 فیصد ہے، لیکن عدلیہ میں ان کی حصہ داری 12.4 فیصد ہے۔ آندھرا پردیش کو چھوڑ کر ملک کی کسی بھی ریاست میں عدلیہ میں مسلمانوں کی نمائندگی ان کی آبادی کے تناسب سے نہیں ہے۔ مثال کے طور پر آسام میں مسلمانوں کی آبادی 30.9 فیصد ہے، لیکن وہاں کی عدلیہ میں ان کی نمائندگی صرف 9.4 فیصد ہے۔ اسی طرح مغربی بنگال میں مسلمانوں کی آبادی 25.2 فیصد ہے، لیکن ریاستی عدلیہ میں ان کی نمائندگی صرف 5 فیصد ہے۔

آزادی سے لے کر اب تک ہندوستانی سپریم کورٹ کے 37 چیف جسٹس میں سے صرف چار ہی مسلمان، چیف جسٹس کے عہدے تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے: جسٹس ایم ہدایت اللہ، جسٹس ایم حمید اللہ بیگ اور جسٹس اے ایم احمدی، جسٹس التمش کبیر جب کہ سپریم کورٹ کے اب تک کل 141 ججوں میں سے صرف 10 جج ہی مسلم ہوئے ہیں۔ سپریم کورٹ میں اس وقت ججوں کی کل تعداد 27 ہے، جن میں سے صرف دو جج مسلمان ہیں: جسٹس محمد ابراہیم کلیف اللہ اور جسٹس آفتاب عالم۔ یہ نابرابری آخر کیوں ہے؟ کیا مسلمانوں میں عدلیہ کے اونچے عہدوں تک جانے کی صلاحیت موجود نہیں ہے یا پھر یہ پہلے سے طے کر دیا گیا ہے کہ کسی مسلمان کو کسی بھی اونچے عہدے تک نہیں جانے دینا ہے؟ کیا یہ ہمارے جیوڈیشل سسٹم کا کھلا مذاق نہیں ہے؟ ملک کے آئین میں تو ہندوستان کے ہر شہری کو مذہب، ذات پات، رنگ نسل کی تفریق کے بغیر یکساں حقوق فراہم کرنے کی بات کہی گئی ہے۔ اس کے باوجود اگر صلاحیت ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں کو اونچے عہدوں تک پہنچنے نہیں دیا جاتا، تو اسے آئین کی خلاف ورزی نہیں تو اور کیا کہیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ آئین کے ذریعے دی گئی ضمانت کے باوجود صحت، تعلیم اور روزگار کے شعبوں میں حکومت کی طرف سے مسلمانوں کو یکساں مواقع فراہم نہیں کرائے گئے، جس کی وجہ سے آج وہ دلتوں سے بھی بدتر زندگی جینے پر مجبور ہیں۔

ہندوستان میں فلم انڈسٹری اور جیلوں کو چھوڑ کر دوسری کوئی بھی ایسی جگہ نہیں ہے، جہاں پر مسلمان زیادہ تعداد میں دکھائی دیتے ہوں۔ سرکاری نوکریوں میں مسلمانوں کا فیصد آزادی کے ۶۵/سالوں بعد بھی اب تک پانچ فیصد کی حد کو پار نہیں کر سکا ہے۔ موجودہ اعداد و شمار تو یہی بتاتے ہیں کہ انڈین ریلوے میں مسلمانوں کی نمائندگی 4.5 فیصد، سول سروسز میں 3 فیصد، فارین سروس میں 1.8 فیصد اور انڈین پولس سروس میں صرف 4 فیصد ہے۔ اسی طرح اگر ریاست جموں وکشمیر کو چھوڑ دیں تو ایک دو کو چھوڑ کر ملک کی کسی بھی

ریاست میں کوئی مسلم وزیر اعلیٰ نہیں بن سکا ہے۔ ملکی سیاست میں مسلمانوں کی نمائندگی کا یہ حال ہے کہ اس وقت 543 ممبرانِ پارلیمنٹ میں سے صرف ۲۹/ایم پی ہی مسلمان ہیں۔ ہندوستان ایک سیکولر اور جمہوری ملک ہے۔ یہاں کے آئین نے ہر شہری کو برابر کے حقوق دیے ہیں اور ان کمزور طبقوں کے لیے الگ سے ریزرویشن کا انتظام بھی کیا ہے، جو سماجی، معاشی اور تعلیمی میدان میں دوسری قوموں سے پیچھے رہ گئے، لیکن جب ہم مسلمانوں کی بات کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ بحیثیت قوم انہیں مجموعی طور سے کمزور کرنے کی کوشش کی گئی۔ اگر یہ بات جھوٹ ہوتی تو، حکومت آج یہ تسلیم کرنے پر مجبور نہیں ہوتی کہ اس ملک میں مسلمانوں کی حالت دلتوں سے بھی بدتر ہے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ 2005 میں یو پی اے حکومت کے ذریعے تشکیل کردہ سچر کمیٹی کی رپورٹ منظر عام پر آ جانے کے بعد بھی سرکار کی طرف سے اب تک کوئی ایسا بڑا قدم نہیں اٹھایا جا سکا ہے، جس سے مسلمانوں کی اقتصادی، معاشی اور تعلیمی بدحالی کو دور کیا جا سکے، یا اگر مرکزی حکومت کی طرف سے مسلمانوں کے حق میں کبھی کوئی اعلان بھی ہوتا ہے تو بی جے پی جیسی مسلم مخالف جماعتیں اسے مسلمانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کا قدم بتاتی ہیں اور اتنا شور مچاتی ہیں کہ برسر اقتدار پارٹی کا یہ صرف ایک اعلان ہی ہو کر رہ جاتا ہے اور اس سے مسلمانوں کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچتا۔ اسی طرح، چونکہ مرکز میں برسر اقتدار کانگریس پارٹی کی نیت مسلمانوں کے تئیں کبھی بھی صاف نہیں رہی، اس لیے اس کی طرف سے مسلمانوں کے لیے اگر کبھی کوئی انتظام کیا بھی جاتا ہے تو عدالتیں اسے ٹھکرا دیتی ہیں اور اس طرح اس کا نفاذ نہیں ہو پاتا، جیسا کہ ابھی ساڑھے چار فیصد ریزرویشن کے معاملے میں ہوا۔

یہ بات صحیح ہے کہ ملک کی تقسیم کے وقت مسلمانوں کا ایک بڑا تعلیم یافتہ، مالدار اور دانشور طبقہ پاکستان چلا گیا تھا اور ہندوستان میں ایسے بہت کم مسلمان بچے تھے، جو تعلیمی یا معاشی اعتبار سے طاقتور ہوں لیکن جب ہندوستان کے آئین نے انہیں یکساں حقوق اور

مواقع فراہم کیے ہیں، تو انہیں بھی دوسری قوموں کے ساتھ ساتھ ترقی کی منزلیں طے کرنی چاہیے تھیں۔ اگر ۶۵ سال کے اتنے لمبے عرصے میں مسلمان دوسری قوموں سے پیچھے رہ گئے، تو اس کی بنیادی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں ان کی اندیکھی کی گئی ہے۔ اور صرف اندیکھی ہی نہیں کی گئی، بلکہ مسلمانوں کی اس بدتر حالت کو چھپا کر بھی رکھنے کی کوشش کی گئی، ورنہ جب سچر کمیٹی نے ہندوستانی عدلیہ یا فوج میں کام کرنے والے مسلمانوں کی تعداد جاننے کی کوشش کی تھی، اس وقت بی جے پی یا دیگر مسلم مخالف جماعتوں کی طرف سے ہنگامہ برپا نہیں کیا جاتا اور یہ دلیل دینے کی کوشش نہیں کی جاتی کہ یو پی اے حکومت عدلیہ یا فوج جیسے سیکولر اداروں کو فرقہ وارانہ رنگ دینا چاہتی ہے۔ معاملہ کسی بھی سرکاری ادارے کو فرقہ وارانہ رنگ دینے کا نہیں ہے، بلکہ یہ معاملہ ملک کی دوسری سب سے بڑی اکثریت کی فلاح و ترقی سے جڑا ہوا ہے۔ ملک مجموعی طور سے تب تک ترقی نہیں کر سکتا، جب کہ ملک میں رہنے والے ہر شہری کا خیال نہ رکھا جائے، چاہے اس کا تعلق کسی بھی علاقے، ذات، مذہب یا فرقے سے ہو۔ ہندوستان کے سابق چیف جسٹس جے ایس ورما بھی یہی مانتے ہیں کہ ''ہندوستان میں جس قسم کا معاشرہ ہے، اسے برقرار رکھنے کے لیے صرف جمہوریت ہی کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے ایک شمولیتی جمہوریت کی ضرورت ہے۔ یہ جمہوریت زیادہ دنوں تک تبھی برقرار رہ سکتی ہے، جب معاشرے کے ہر طبقہ کو ساتھ لے کر چلا جائے۔''

عدلیہ کے ساتھ ساتھ پولس اور نوکرشاہی جیسے سرکاری محکموں میں مسلمانوں کی حد سے زیادہ کمی کی سب سے بڑی وجہ تقرری کے دوران مسلمانوں کے ساتھ برتا جانے والا تعصب ہے، خاص کر انٹرویو کے دوران۔ مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک کا یہ رویہ صرف اعلیٰ عہدوں سے متعلق ہونے والی تقرریوں کے دوران ہی دیکھنے کو نہیں ملتا، بلکہ یہ گروپ 'سی' اور گروپ 'ڈی' جیسے چوتھے درجے کی سرکاری ملازمتوں میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اسے دور کرنے کے لیے مختلف دانشوروں اور مسلم تنظیموں کی طرف سے بار بار یہ تجویز پیش کی گئی کہ سلیکشن

کمیٹی کا کم از کم ایک رکن کسی مسلمان کو بنایا جائے، لیکن آج تک اس پر عمل نہیں ہو سکا ہے، جس کی وجہ سے مسلمانوں کے ساتھ تعصب کا یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ اسی طرح پولس فورس میں معمولی سپاہی کی بھرتی میں بھی مسلمانوں کے ساتھ کیے جانے والے امتیاز کی شکایتیں ملتی رہی ہیں، لیکن اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوتی۔ بعض ریاستوں میں پولس بھرتی میں مقامی زبان اور ہندو مذہب کے بارے میں ٹھوس معلومات ہونا لازمی ہے، کیوں کہ ٹیسٹ میں ان کے بارے میں سوالات پوچھے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان جگہوں پر مسلمانوں کے ٹیسٹ پاس نہ کر پانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں میں بڑے پیمانے پر اب یہ سوچ پیدا ہو گئی ہے کہ سرکاری نوکریوں میں ان کا سلیکشن نہیں ہوگا، اس لیے اب وہ ان نوکریوں کے لیے اپلائی بھی نہیں کرتے، جس کی وجہ سے ان نوکریوں میں ان کی تعداد دنوں دن گھٹتی جا رہی ہے۔ اس کے لیے مرکزی اور ریاستی حکومتیں ہی ذمہ دار ہیں، کیوں کہ مسلمانوں کے اندر اگر یہ سوچ پیدا ہوئی ہے تو یہ صرف ایک یا دو دن کے تجربہ کی وجہ سے پیدا نہیں ہوئی ہے، بلکہ ان کے خلاف کئی دہائیوں سے ہونے والے امتیازی برتاؤ اور سرکار کی طرف سے اس کے خلاف کسی قسم کی تادیبی کارروائی نہ کرنا اور مسلمانوں کی مسلسل اندیکھی کی وجہ سے ان کے اندر یہ سوچ پیدا ہوئی ہے۔ اب حکومت بجائے اس کے کہ اپنی کمزوریوں کو دور کرتی، سسٹم میں پیدا ہونے والی خرابی کو درست کرتی، وہ اپنی غلطی کو چھپانے کے لیے اب یہ دلیل پیش کر رہی ہے کہ مسلمان اپنے بچوں کو پڑھاتے ہی نہیں، سرکاری نوکریوں کے لیے ہونے والے امتحان میں مسلمان بچے بیٹھتے ہی نہیں، اس لیے ان کا سلیکشن نہیں ہوتا اور سرکاری ملازمتوں میں ان کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔ سیاست میں بھی چونکہ مسلمانوں کی نمائندگی زیادہ نہیں ہے، اس لیے ان کی آواز کو ایوانِ سیاست میں اٹھانے والا کوئی نہیں ہے اور اگر کوئی اٹھاتا بھی ہے تو چونکہ اس کی آواز میں طاقت نہیں ہوتی، اس لیے سرکار اس پر کوئی خاص دھیان نہیں دیتی۔ ☆☆

(مضمون نگار صحافی اور ہفت روزہ چوتھی دنیا سے وابستہ ہیں)

ہندوستانی فوج میں
مسلمانوں کی گنتی کیوں ضروری ہے؟

● عزیز اے مبارکی

ہندوستانی فوج کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ یہ ادارہ پوری طرح سیکولر ہے، اور یہاں پر مذہب، ذات یا نسل کو لے کر کسی قسم کا بھید بھاؤ نہیں برتا جاتا۔ انڈین آرمی کا سربراہ اب تک جن لوگوں کو بنایا جاتا رہا ہے، ان کا تعلق مختلف مذاہب سے رہا ہے، لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ اب تک ہندوستان میں کسی بھی مسلم کو فوج کا سربراہ مقرر نہیں کیا گیا ہے۔ سچر کمیٹی، جس کی تشکیل حکومت ہند کے ذریعے ملک کے مختلف سماجی واقتصادی شعبوں میں مسلمانوں کی موجودگی کا پتہ لگانے کے لیے کی گئی تھی، نے چند سال قبل فوج میں مختلف سطحوں پر تعینات مسلم فوجیوں کی تعداد جاننے کی کوشش کی تھی، لیکن اُس وقت کے آرمی چیف، جنرل جے جے سنگھ نے اس کی زبردست مخالفت کی اور یہ دلیل دی کہ اس قسم کی گنتی سے فوجی ادارہ کی روح مجروح ہوگی۔ لیکن اس قسم کی جانکاری حاصل کرنے میں کوئی نقصان نہیں ہے، کیوں کہ حکومت کو یہ جاننے کا پورا اختیار حاصل ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی موجودہ صورتِ حال کیا ہے۔ حکومت کی سب سے بڑی تشویش قومی سلامتی ہونی چاہیے، لیکن جانکاری حاصل کرنے کے اس قدم کا بھی خیرمقدم کیا جانا چاہیے کہ مسلم برادری ترقیات کے معاملے میں مختلف شعبوں میں کس مقام پر ہے، اس کی صورت حال کیا ہے، کیوں کہ اس سے حکومت کو پس ماندہ برادری کی سماجی حالت کو بہتر بنانے سے متعلق

متعدد اسکیموں کو عملی جامہ پہنانے میں مدد ملے گی۔

فوج میں مسلمانوں کی گنتی کو لے کر احتجاج ومخالفت کا یہ سلسلہ صرف آرمی ہیڈکوارٹرس تک ہی محدود نہیں رہا، بلکہ جنوری 2006 میں اُس وقت لوک سبھا میں حزب اختلاف کے لیڈر، ایل کے اڈوانی نے فوج میں مسلمانوں کی گنتی کی تجویز کے مدعے پر ایوان سے واک آؤٹ کیا تھا، لیکن سوال یہ اٹھتا ہے کہ مسٹر اڈوانی اینڈ کمپنی کو انڈین آرمی میں مسلمانوں کی گنتی سے اتنا ڈر کیوں لگ رہا ہے؟ اس میں آخر چھپانے کی یا صیغہء راز میں رکھنے کی کیا بات ہے؟ جب کہ ملک میں نیم فوجی دستوں اور پولس محکمے میں اس قسم کے سروے پہلے کیے جا چکے ہیں۔ دراصل، چار ایسی وجوہات ہیں جن کی بنیاد پر فوج میں مسلمانوں کی گنتی ضروری ہوجاتی ہے:

1. سچر کمیٹی کی تشکیل متعدد پبلک اور پرائیویٹ سیکٹر میں برسر روزگار مسلمانوں کی نمائندگی کا پتہ لگانے کے لیے کی گئی تھی۔ لہٰذا، اگر یہ کمیٹی مختلف سطحوں پر باروزگار مسلمانوں کی تفصیلات حاصل کرنا چاہتی تھی، تو مسلح افواج کے معاملے میں اتنا ہنگامہ کیوں برپا کیا گیا؟۔

2. فوج کے اندر برطانوی نوآبادیات کے زمانے سے ہی علاقے یا برادری کی بنیاد پر رجمنٹ قائم کی جاتی رہی۔ جنگ کے دوران جو نعرے لگائے جاتے ہیں، جنہیں عرفِ عام میں 'بیٹل کرائی' کہتے ہیں، وہ بھی مذہب اور مختلف مذاہب کے دیوتاؤں کے نام پر ہوتے ہیں۔ پھر مسلم فوجیوں کی گنتی پر اتنا ہنگامہ کیوں؟

4. اور سب سے اہم یہ کہ، آرمی چیف حکومت کے ماتحت ہوتا ہے، جیسا کہ ہم نے ماضی میں آرمی چیف، اس کے جائز سوال اور اس کے نتیجہ کو اب تک دیکھا، پھر ایسے میں اُس وقت کے آرمی چیف نے حکومت کے ایک فیصلہ پر سوال کیوں اٹھایا؟ اور اگر انہوں نے سوال اٹھایا بھی، تو کیا جمہوریت میں یہ قابل قبول ہے؟

شاید چیزوں کو اتنے رازدارانہ طریقے سے چھپانے کے پیچھے سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ فوج میں مسلمانوں کی نمائندگی تشویش ناک حد تک کم ہے۔فوج میں مسلمانوں کی تعداد کے بارے میں کوئی سرکاری رپورٹ تو موجود نہیں ہے،تاہم مائنارٹی رپورٹ کے نام سے ایک نیوز چینل کے سروے پروگرام کے مطابق انڈین آرمی میں صرف دو فیصد مسلمان ہیں،یعنی دس لاکھ فوجیوں پر مبنی مضبوط انڈین آرمی میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً 29 ہزار ہے۔اور اگر جموں وکشمیر (جے اینڈ کے) انفینٹری میں موجود مسلم فوجیوں کو، جو تقریباً 50 فیصد ہیں اور آرمی کے متعدد دوسرے وِنگ میں کام کررہے وہ مسلمان جن کا جنگی کارروائیوں سے براہِ راست کوئی لینا دینا نہیں ہے، اگر انہیں نکال دیا جائے تو پھر فوج میں مسلمانوں کی تعداد کافی کم ہو جاتی ہے۔یوں اگر دیکھا جائے تو تقریباً 20 کروڑ مسلم آبادی والے ہندوستان میں، مسلم فوجیوں کی تعداد محض 29,000 ہی کیوں ہے؟۔

یہ سوال ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ساتھ ہی، ہمارے لیے یہ بھی ایک افسوس ناک بات ہے کہ ملک میں اب تک ایک بھی مسلم آرمی چیف دیکھنے کو نہیں ملا،سوائے ایئر چیف مارشل ادریس حسن لطیف، پی وی ایس ایم کے، جو انڈین ایئر فورس کے پہلے مسلم چیف آف ایئر اسٹاف تھے اور جنہوں نے ایئر فورس کو نئے اور جدید اسلحوں سے لیس کرنے میں پوری سنجیدگی سے کام کیا۔انہوں نے حکومت ہند کو اس بات کے لیے آمادہ کیا کہ وہ جنگی طیارہ 'جگوار' کی خریداری کو منظوری دے، جب کہ یہ تجویز حکومت کے سامنے 8 سالوں تک پڑی ہوئی تھی۔انہوں نے روسیوں کے ساتھ بھی بات چیت کی اور اس طرح ایڈین ایئر فورس میں مِگ-23 اور بعد میں مِگ-25 جنگی طیاروں کو شامل کرایا۔ہمارے لیے اس سے زیادہ بد قسمتی کی بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ 1965 کی ہند-پاک جنگ میں بہادری سے لڑکر شہید ہونے والے حولدار عبدالحمید کی بیوہ، رسولن بی بی کے ہاتھ میں بہادری کا سب سے بڑا انعام پرم ویر چکر تو دے دیا گیا،لیکن 2008 میں اپنی موتیا بند کا آپریشن

کرانے کے لیے رسولن بی بی کو صدرِ جمہوریہ پرتبھا دیوی سنگھ پاٹل سے اس معاملے میں مداخلت کرنے کی درخواست کرنی پڑی۔

دراصل، ہندوستانی فوج میں مسلمانوں کی کم نمائندگی کے تاریخی اسباب ہیں، جسے عام کرنے سے کسی کو کوئی نقصان ہونے والا نہیں ہے۔حقیقی فیصد چاہے جتنا ہو، یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی فوج میں تعداد کافی کم ہے۔وہیں دوسری جانب فوج میں سکھوں کا فیصد حد سے بہت زیادہ ہے۔کیا تضاد ہے۔سکھ ہندوستان کی مجموعی آبادی کا صرف 1.86 فیصد ہیں، لیکن انڈین آرمی میں ان کی شراکت داری 8 فیصد ہے، جب کہ اس ملک میں مسلمانوں کی کل آبادی 18 فیصد ہے لیکن انڈین آرمی میں وہ صرف 2 فیصد ہی ہیں۔مسلح افواج میں ہندوستانی مسلمانوں کی اتنی کم نمائندگی کو آخر چھپا کر کیوں رکھا جارہا ہے؟ ہندوستانی حکمرانوں کی طرف سے رازداری کی بکواس دلیل کیوں پیش کی جارہی ہے، جب کہ اس کے افشا ہونے سے کسی کو بھی کوئی نقصان ہونے والا نہیں ہے۔آرمی میں جس طرح مسلمانوں کی نمائندگی کافی حد تک کم ہے، تقریباً ایسا ہی حال بنگالی، بہاری، اڑیا، گجراتی اور جنوبی ہند کے باشندوں کا ہے۔دوسری طرف آرمی میں جس طرح سکھوں کی شراکت داری حد سے زیادہ ہے، اسی طرح جاٹ، ڈوگرا، گڑھوالی، کماؤنی، گرکھا، مراٹھا اور دیگر برادری کی نمائندگی ان کی آبادی کے فیصد سے کہیں زیادہ ہے۔انڈین آرمی کی تقرری کا پیمانہ 150 سال پرانا ہے، جسے 1857 کی سپاہیوں کی بغاوت کے دوران ترتیب دیا گیا تھا۔اس بغاوت سے انگریزوں کو اتنا صدمہ پہنچا کہ انہوں نے تقرری کے لیے ایسی حکمت عملی بنائی جس میں ان لوگوں کو سزائیں دی گئیں جنہوں نے اس بغاوت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، اور ان لوگوں کو انعامات سے نوازا جو انگریزوں کے وفادار رہے۔چونکہ اودھ، بہار اور مغربی بنگال کے مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف اس بغاوت کی قیادت کی تھی، اس لیے انگریزوں نے ان علاقوں کے لوگوں کا بطور سپاہی تقرر کرنا بند کردیا۔ان

علاقوں کے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کو بھی بلیک لسٹ کر دیا گیا، کیوں کہ بنگال میں واقع ان کی رجمنٹ کے سپاہیوں نے بھی اس بغاوت میں حصہ لیا تھا۔ دوسری طرف انگریزوں نے اُن ذاتوں سے سپاہیوں کی بھرتی شروع کردی، جنھوں نے 1857 کے انقلاب کو دبانے میں انگریزوں کا ساتھ دیا۔ انگریزوں نے انہیں 'مارشل ریس' کا نام دیا۔ گزشتہ 90 سالوں سے فوج کی بھرتی میں اسی 'ریس' یا نسل کو ترجیح دی جاتی رہی ہے۔ ہندوستان کے دیگر اداروں کی طرح ہی انڈین آرمی بھی ماضی کی قیدی ہے۔ آج بھی ہندوستانی فوج مارشل ریس میں شامل لوگوں کو ہی تقرری میں اولیت دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی ان ذاتوں کی فوج میں نمائندگی ان کی آبادی کے فیصد سے بہت زیادہ ہے۔

اگر ہم 2004 سے 2006 کے درمیان فوج میں بھرتی کیے گئے جوانوں کی تعداد پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس دوران فوج میں دو لاکھ 87 ہزار جوانوں کی بھرتی ہوئی، جن میں سے 44 ہزار 471 جوان تین 'مارشل' ریاستوں، یعنی پنجاب، ہریانہ اور پہاڑی ریاست اترا کھنڈ سے تھے۔ لہٰذا، یہ تینوں ریاست جہاں کی آبادی ہندوستان کی مجموعی آبادی کا پانچ فیصد ہے، انڈین آرمی میں یہاں کے فوجیوں کی تعداد 15 فیصد ہے۔ اس کے برخلاف 'نان مارشل' ریاستوں، یعنی مغربی بنگال اور بہار سے فوجیوں کی تقرری بہت کم رہی۔ ان دونوں ریاستوں کی کل آبادی ہندوستان کی مجموعی آبادی کا 30 فیصد ہے، لیکن مذکورہ تین سال کے دوران انڈین آرمی میں یہاں کے صرف 14 فیصد جوانوں کی بھرتی عمل میں آئی۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو ہندوستانی فوج میں نہ صرف مذہب کی بنیاد پر امتیاز برتا جاتا ہے، بلکہ تقرری کے عمل میں ذات اور علاقہ کی بنیاد پر بھی کافی بڑا فرق دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس امتیاز کا ایک نمونہ ہمیں دس سال قبل جموں کے ڈیفنس آفس سے جاری کی گئی پریس ریلیز سے ملتا ہے۔ انڈین آرمی میں بھرتی کے لیے وہاں سے جو پریس ریلیز جاری کیا گیا، اس میں صاف طور پر لکھا تھا کہ ''مسلمانوں اور تاجروں کے لیے کوئی اسامی

نہیں''، جس کا مطلب یہ ہوا کہ جارحیت پسند ڈوگراؤں کا خیر مقدم ہے، لیکن تجارت پیشہ ہندو ذاتیں، جیسے بنیا اور کھتری کو اپلائی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

ہندوستانی فوج میں سکھ، جاٹ، ڈوگرا، گڑھوالی، کماؤنی، مہر، ناگا اور گرکھا رجمنٹس کیوں ہیں، اور ایک بھی مسلم رجمنٹ کیوں نہیں ہے؟ یہ ایک الم ناک صورتِ حال ہے، پر ہے حقیقی جسے دبایا نہیں جانا چاہیے۔ اس کو تسلیم کرتے ہوئے اس سے نمٹا جانا چاہیے۔ انڈین آرمی میں مسلمانوں کی کم تر نمائندگی تقسیم کا نتیجہ ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کی رقابت کو دونوں ممالک میں ہندو بہ مقابلہ مسلم کی شکل میں دیکھا جاتا ہے، جو کہ پوری طرح غلط ہے۔ یہ ذہنیت بھی باصلاحیت اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کو فوج میں اپلائی کرنے سے روکتی ہے۔ فوج میں مسلمانوں کی کم تر نمائندگی کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ انہی وجوہات کے سبب مسلمان فوج جیسے زندگی کے پائدار اور بہتر روزگار کے موقع سے محروم ہوتے چلے گئے۔ یہ افسوس ناک صورتِ حال ہے، جس کا درست ہونا بھی اتنا آسان نہیں ہے۔

ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہندوستان کی مسلح افواج کو ملک کے تئیں مسلمانوں کی وفاداری پر شک ہے، اس لیے وہ مسلم فوجیوں کی تقرری سے گریز کرتی ہیں۔ یہ امتیاز گزشتہ 60 سالوں سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان چلی آرہی کٹر دشمنی کا بھی نتیجہ ہے۔ اس قسم کے حالات میں، پوری دنیا میں ایسے ہی نتائج سامنے آرہے ہیں۔ مثال کے طور پر اسرائیلی آرمی ڈیفنس سیکورٹی سے متعلق نوکریوں میں اپنے ہی عرب سپاہیوں پر اعتماد نہیں کرتی۔ بدھسٹ سنہلی آرمی ہندو تملوں کو فوج میں اس لیے بھرتی نہیں کرتی، کیوں کہ انہیں یہ خوف لاحق رہتا ہے کہ ان کی ہمدردی تمل ٹائیگرس کے ساتھ ہوسکتی ہے۔ اسی طرح 9/11 کے بعد امریکی فوج نے بھی مسلم امریکی پر عیسائی امریکی کو فوقیت دینا شروع کردیا ہے۔

ہندوستانی فوج میں مسلمانوں اور دیگر ذاتوں یا علاقائی گروہوں کی کم نمائندگی سے ان برادریوں کو فائدہ پہنچ رہا ہے، جن کی نمائندگی فوج میں پہلے ہی بہت زیادہ ہے۔ مغربی

بنگال کی آبادی اترا کھنڈ سے آٹھ گنا زیادہ ہے، لیکن فوج میں ہر سال جتنی بھرتی اترا کھنڈ سے ہوتی ہے، اتنی ہی تقریباً مغربی بنگال سے بھی ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر ہم 'مارشل' پنجاب کا موازنہ 'نان مارشل' گجرات سے کریں، تو پتہ چلتا ہے کہ پنجاب کی کل آبادی گجرات کی کل آبادی کا آدھا ہے۔ ایسے ہی راجستھان کے مقابلے تمل ناڈو کی آبادی زیادہ ہے، لیکن فوج میں تقرری راجستھان سے زیادہ ہوتی ہے اور تمل ناڈو سے کافی کم۔ ہندوستانی فوج سے اس قسم کی تفریق کو ختم کیا جانا چاہیے۔ اس ملک کے مسلمان اتنے ہی ہندوستانی ہیں، جتنی کہ دوسری قومیں اور ملک پر جب بھی جان نثار کرنے کی بات آئی ہے، مسلمان ہمیشہ سب سے آگے کھڑے دکھائی دیے ہیں۔ ایک دو استثنیٰ کی وجہ سے پوری قوم کی وفاداری پر سوالیہ نشان نہیں لگایا جانا چاہیے، کیوں کہ اس کے نتائج برے ہو سکتے ہیں۔ شرپسندی کے واقعات میں تو دوسری قوموں کے لوگ بھی ملوث پائے گئے ہیں، پھر صرف مسلمانوں کو ہی مکمل قصوروار ٹھہرانا کسی بھی طرح درست نہیں ہے۔ لہٰذا، ضرورت اس بات کی ہے کہ بداعتمادی اور امتیازی رویہ کے لیے ذمہ دار اور تفریق پیدا کرنے والے قانون ختم ہونے چاہئیں، لیکن ان کا خاتمہ تبھی ہوسکتا ہے، جب ہم اس سمت میں کچھ مثبت قدم اٹھائیں، کیوں کہ اس قسم کی ذہنیت سے اقلیتوں (مسلمانوں) اور اکثریتوں (ہندوؤں) کے درمیان خلیج اور بڑھے گی۔

مسلم فوجی جنھوں نے ملک وقوم کا سر فخر سے اونچا کیا:

پرم ویر چکر: کمپنی حولدار میجر عبدالحمید (4 گرینیڈیرس)۔

مہاویر چکر: محمد اسماعیل: 1947-48 آپریشن۔

بریگیڈیئر محمد عثمان: ہند–پاک جنگ۔

کیرتی چکر: 2007: محمد شان احمد (بعد از مرگ) جھانسی کے پوسٹ آفس میں کیش

ایئر تھے۔ 26 دسمبر، 2005 کو کچھ مسلح افراد نے کیش لوٹنے کی کوشش کی، مزاحمت کے دوران شان احمد بری طرح زخمی ہوئے اور بعد میں اس کی تاب نہ لاکر موت کی آغوش میں چلے گئے۔ وہ جھانسی (یوپی) کے رہنے والے تھے۔

2009: لانس حولدار عزیز محمد: 20 جموں وکشمیر رائفلس (بعد از مرگ)۔

سپر/آپریٹر ایگزیکیٹیو مشینری بدھو خان (بعد از مرگ)، نائک محمد صادق۔

2008: رائفل مین عبدالحمید چارا: 162 انفینٹری بٹالین ٹی اے (ایچ اینڈ ایچ) جے اے کے ایل آئی/ 18 راشٹریہ رائفلس (بعد از مرگ)۔

2007: رائفل مین ریکی احمد غنائی: جموں اینڈ کشمیر لائٹ انفینٹری/ 50 راشٹریہ رائفلس۔

2006: حولدار محمد معروف: 23 راجپوت رجمنٹ:

حولدار ابراہیم: جموں اینڈ کشمیر لائٹ انفینٹری/ 47 راشٹریہ رائفلس۔

رائفل مین ریاض احمد بھٹ: آسام رجمنٹ/ 35 راشٹریہ رائفلس۔

سینا میڈل (بہادری کے لیے):

2009: حولدار الیاس علی: 32 آسام رائفلس۔

لانس نائک جاوید احمد وانی: جموں اینڈ کشمیر لائٹ انفینٹری/ 44 راشٹریہ رائفلس۔

2008: صوبیدار محمد راشد: جموں اینڈ کشمیر لائٹ انفینٹری/ 28 راشٹریہ رائفلس۔

نائک محمد امین بھٹ: جموں اینڈ کشمیر لائٹ انفینٹری/ 62 راشٹریہ رائفلس۔

سپاہی عبدالحمید: 153 انفینٹری بٹالین (ٹی اے) ڈوگرا۔

سپاہی عبدالحمید: 156 انفینٹری بٹالین ٹی اے (ایچ اینڈ ایچ) پنجاب// 58 راشٹریہ رائفلس۔

سپاہی قمرالدین بیگ: 156 انفینٹری بٹالین ٹی اے (ایچ اینڈ ایچ) پنجاب/ 58 راشٹریہ رائفلس۔

رائفل مین اشتیاق احمد: جموں اینڈ کشمیر لائٹ انفینٹری/ 18 راشٹریہ رائفلس۔

رائفل مین محمود احمد اٹو: جموں اینڈ کشمیر لائٹ انفینٹری/ 33 راشٹریہ رائفلس۔

رائفل مین محمد یوسف لون: 161 انفینٹری بٹالین ٹی اے (ایچ اینڈ ایچ) جموں اینڈ کشمیر لائٹ انفینٹری۔

رائفل مین مظفر اقبال: 14 آسام رائفلس

2007: کیپٹن انس احمد: 19 کماؤں رجمنٹ۔

لانس نائک محمود شاہ: 3 جموں اینڈ کشمیر لائٹ انفینٹری۔

سپاہی محمد شریف: 159 انفینٹری بٹالین (ٹی اے) (ایچ اینڈ جی) ڈوگرا، 23 راشٹریہ رائفلس۔

سپاہی جابر خان: میکنائزڈ انفینٹری/ 9 راشٹریہ رائفلس۔

رائفل مین گوہر علی خان: جموں اینڈ کشمیر لائٹ انفینٹری/ 19 راشٹریہ رائفلس۔

رائفل مین محمد سید منٹو: جموں اینڈ کشمیر لائٹ انفینٹری/ 18 راشٹریہ رائفلس۔

رائفل مین عبدالرحیم ڈار: 162 انفینٹری بٹالین (ٹی اے) جموں اینڈ کشمیر لائٹ انفینٹری/ 14 راشٹریہ رائفلس۔

رائفل مین نظیر احمد وانی: 162 انفینٹری بٹالین (ٹی اے) جموں اینڈ کشمیر لائٹ انفینٹری/ 14 راشٹریہ رائفلس۔

رائفل مین محمد ابراہیم خان: 33 آسام رائفلس۔

2006: کمپنی حولدار میجر محمد اشرف شیخ: 22 مراٹھا لائٹ انفینٹری۔

لانس نائک فاروق احمد راتھر: 20 جموں اینڈ کشمیر رائفلس۔

پرم وششٹ سیوا میڈل:

2008: لیفٹیننٹ جنرل ضمیر الدین شاہ، ایس ایم، وی ایس ایم: رجمنٹ آف آرٹیلری (جنرل کیڈر)۔

اَتی وششٹ سیوا میڈل:

2009: میجر جنرل سید عطا حسنین، ایس ایم، وی ایس ایم: انفینٹری: ایچ کیو 19 انفینٹری ڈویژن۔

وششٹ سیوا میڈل:

2009: ایئر کموڈور نسیم اختر: فلائنگ (پائلٹ)۔

2008: گروپ کیپٹن ضیا احمد رضوی: لوجسٹکس۔

سینا میڈل:

2009: بریگیڈیئر خورشید مانیک بلسارا: ناگا رجمنٹ۔

بریگیڈیئر پٹیاری مل محمد علی ہریز، وی ایس ایم: میکنائزڈ انفینٹری/ ایچ کیو 91 انفینٹری بریگیڈ۔

2008: کرنل اسٹیو مظفر اسماعیل: 1/2 گورکھا رائفلس۔

صوبیدار محمد الیاس: 3، جموں اینڈ کشمیر لائٹ انفینٹری رجمنٹل سنٹر۔

وایو سینا میڈل (بہادری کے لیے):

2009: رکشک: لانس/ نائک عبدالرشید خان: ٹیری ٹوریل آرمی 5 راشٹریہ رائفلس۔

رائنو: کیپٹن مدثر اقبال: 2 بہار۔

☆☆

دیش میں کم، جیل میں زیادہ

● ترجمہ: رضوان الحق قاسمی

اگر آپ ہندوستان میں مسلمان ہیں تو اس بات کا اندیشہ زیادہ ہے کہ آپ جیل میں ہوں گے۔ تقریباً دوگنا زیادہ۔ 'انڈیا ٹوڈے' کی تقریباً چار ماہ کی تحقیق، حق اطلاعات قانون کے تحت 30 سے زیادہ جیلوں سے لئے گئے اعداد و شمار اور مرکزی وزارت داخلہ کے براہ راست کنٹرول میں کام کرنے والی تنظیم 'قومی جرائم ریکارڈ بیورو (این سی آر بی) کے اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو جیل بھیجنے کے معاملے میں ہندوستان کی سیکولر اور کمیونل حکومتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

ایک عرصہ تک لیفٹ کا گڑھ رہے مغربی بنگال میں ہر چوتھا شخص مسلمان ہے، مگر وہاں بھی جیلوں میں تقریباً نصف قیدی مسلمان ہیں۔ یہ بات قابل غور ہے بنگال میں کبھی کسی فرقہ پرست پارٹی کی حکومت نہیں رہی۔ یہی نہیں مہاراشٹر میں ہر تیسرا، تو اتر پردیش میں ہر چوتھا قیدی مسلمان ہے۔ یہ حالت ٹھیک ویسی ہے جیسی امریکی جیل میں سیاہ فام قیدیوں کی۔ امریکی جیلوں میں قید 23 لاکھ لوگوں میں آدھے سیاہ فام ہیں، جبکہ امریکی آبادی میں ان کا حصہ صرف 13 فیصد ہے۔

جموں کشمیر، پانڈیچری اور سکم کے علاوہ ملک کے عام طور پر ہر صوبے میں مسلمانوں کی جتنی آبادی ہے، اس سے زیادہ تناسب میں وہ جیل میں ہیں۔ 2001 کی مردم شماری کے مطابق ملک میں مسلم آبادی 13.4 فیصد تھی اور دسمبر 2011 کے این سی آر بی کے اعداد و

شمار کے مطابق جیل میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً 21 فیصد ہے۔

ترنمول کانگریس کوٹے سے یو پی اے حکومت میں وزیر رہے رکن پارلیمنٹ سلطان احمد کا کہنا ہے کہ ہم لوگ خود کو اقلیت کہتے ہیں، لیکن جیل میں ہم اکثریت میں ہیں، یہ ہمارے ملک اور معاشرے کے لئے بدقسمتی کی بات ہے۔ قومی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین وجاہت حبیب اللہ کہتے ہیں 'جب میں (راجیو گاندھی کے وقت) پی ایم او میں تھا، اس وقت بھی یہ سوال آیا تھا، لیکن اس بارے میں ابھی تک یہ جائزہ نہیں لیا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے''۔

حق اطلاعات کے تحت ملی معلومات کے مطابق 2 ستمبر 2012 کی صبح تک علی پور سینٹرل جیل میں بند 1222 زیر غور قیدیوں میں 530 مسلمان ہیں۔ یو پی کے غازی آباد جیل کے زیر غور میں 2200 / قیدیوں میں 720 مسلمان تھے۔ دیگر جیلوں سے ملے اعداد و شمار بھی حیرت انگیز ہیں، جسے ریاستی سطح پر پیش کیا گیا ہے۔

مہاراشٹر کی جیلوں میں کئے گئے ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنسز (ٹی آئی ایس) کے مطالعہ سے مسلمانوں کے سلسلے میں پولیس اور عدالتی نظام کا تعصب ظاہر ہوتا ہے۔

سروے میں شامل کئے گئے زیادہ تر قیدیوں کا دہشت گردی یا منظّم جرائم سے واسطہ نہیں تھا، ان میں زیادہ تر (71.9 فیصد) باہمی تنازعات میں الجھے تھے اور پہلی بار معمولی جرائم کے الزام میں جیل جانے والوں کی تعداد 75.5 / فیصد تھی۔

اقلیتی امور کے مرکزی وزیر کے رحمان خان کہتے ہیں کہ زیادہ تر مسلمان معمولی جرم میں بند ہوتے ہیں، انہیں قانونی مدد نہیں ملتی اور مفت قانونی مدد کے بارے میں معلومات نہیں ہوتی۔ شہری و دیہی علاقوں میں ان کے پاس پلیٹیکل پاور نہیں رہتی''۔

لکھنؤ ضلع جیل کے سپرنٹنڈنٹ ڈی آر موریہ خان اس سے اتفاق کرتے ہیں کہ جیل میں بند تقریباً 90 فیصد مسلمان قیدیوں پر نشے کا کاروبار کرنے، چوری، لوٹ جیسے معاملات چل رہے ہیں، سنگین جرائم میں بند مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے۔

کس جرم کی سزا؟

میرٹھ کی ضلع عدالت میں روزانہ چکر لگانے والی 51 سالہ افروز نے نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہے اپنے دونوں بیٹوں-نور عالم قریشی اور شاہ عالم قریشی کے لئے زمین خریدی، جس کا سودا بچولیے نے کرایا۔اس نے افروز کے لئے زمین کا سودا گھوس پور کے باشندے جے پرکاش سے ایک لاکھ چالیس ہزار میں کیا،لیکن وہ مبینہ طور پر پیسے لے کر بھاگ گیا اور جے پرکاش نے زمین دینے سے انکار کردیا۔افروز نے ضلع کلکٹر کو دیئے تحریر میں بھورا اور جے پرکاش کے خلاف شکایت کی۔اس کے دو دن بعد ہی براؤن کے بھائی فرید نے افروز کے دونوں بیٹوں کے خلاف اپنے بھائی کے اغوا کی شکایت درج کرادی، حالانکہ فرید نے ڈی آئی جی دفتر کو حلف نامہ دے کر سمجھایا کہ بھورا شاطر مجرم ہے اور افروز کے بیٹوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ہائیکورٹ نے دیگر معاملے میں براؤن کو پیش کرنے کا حکم دیا،تو پولیس نے فرید کو پکڑا لیکن اس نے اپنی جان بچانے کے لئے بھورا کے اغوا کا الزام دہرا دیا،اس کے بعد پولیس نے افروز کے بیٹے 17 سالہ نور عالم کو گرفتار کرکے جیل میں ڈال دیا۔

افروز کہتی ہیں کہ 14 سال پہلے شوہر کی موت ہوگئی، بچوں کو نہیں پڑھا پائی، اب سوچا تھا کہ زمین لے کر بچے کچھ کام کرلیں گے،لیکن ہمارے پاس کچھ نہیں بچا۔افروز کا کیس لڑ رہے میرٹھ کورٹ کے وکیل کہتے ہیں کہ افروز کو زمین بھی نہیں ملی، پیسہ بھی گیا اور بیٹا ملزم بن گیا۔ یہ معاملہ اس ریاست کی پولیس کے طریقہ کار کی طرف اشارہ کرتا ہے جو 1980-90 کی دہائی میں فرقہ پرستی کی آنچ سے خود کو نہیں بچا پائی۔ پولیس اور انصاف کے نظام کی بے اعتنائی کا ذکر کرتے ہوئے جے این یو کے پروفیسر اور ماہر سماجیات آنند کمار کہتے ہیں۔ پولیس اور عدالتی نظام میں اقلیتوں کے خلاف عام تعصب ہے۔اعدادوشمار سے واضح ہے کہ سیاسی نظریہ سے بہت فرق نہیں پڑتا ہے اور ہر پارٹی کی حکومتیں مسلمانوں کو گرفتار کرنے یا سزا دلانے میں آگے ہیں۔ وہ سماجی، اقتصادی، تعلیمی پسماندگی کو مسلمانوں کے جیل میں

زیادہ ہونے کی ایک اہم وجہ مانتے ہیں۔ پولس کی گرفت میں زیادہ تر ایسے ہی لوگ پھنستے ہیں جو قانونی دفاع کرنے کے قابل نہیں ہیں، وہ کہتے ہیں کہ پارلیمنٹ پر حملے میں ملزم بنائے گئے دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر گیلانی جیسے تعلیم یافتہ اور قابل لوگوں کو بھی خود کو بے گناہ ثابت کرنے میں 10 سال لگ گئے۔

سب سے بڑا سوال: آخر کیوں؟:

ظاہر ہے مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد میں جیل میں ہونے کی وجہ جاننے کے لئے سماجی سطح پر جائزے کی کمی ہے، پھر بھی کچھ وجوہات پر اتفاق رائے ممکن ہے۔ پولس اور حکام کا تعصب، غربت، ناخواندگی اور سیاسی نظام میں رسوخ کی کمی۔ بی ایس ایف کے سابق ڈائریکٹر جنرل پرکاش سنگھ کہتے ہیں کہ مسلمان جدید تعلیم حاصل نہیں کریں گے، مدرسے میں ہی پڑھنے جائیں گے اور پھر کہیں گے ہمارے لوگ آئی ایس نہیں بنتے، پولیس میں کم ہیں، بعد میں پولیس پر الزام لگائیں گے۔

مسلمانوں کے جیل میں ہونے کی وجہ سے سی پی ایم لیڈر اور سابق ممبر پارلیمنٹ محمد سلیم نے پچھلی لوک سبھا میں رکن پارلیمنٹ رہتے ہوئے ایک سوال پوچھا تھا، ملک میں ایسے کتنے لوگ ہیں جو 10 لاکھ روپے کا انکم ٹیکس رٹرن بھرتے ہیں اور کسی مقدمے میں مجرم ثابت ہوئے ہیں؟ بقول سلیم انہیں جواب ملا تھا کوئی نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جو شخص یا سماج طاقتور ہے اور پولیس، پرسی کیوشن، وکیل خریدنے کی صلاحیت رکھتا ہے اس کی سماعت ہر جگہ ہوتی ہے،لیکن بدقسمتی سے مسلم سماج ایسا نہیں کرپاتا۔

مہاراشٹر کی جیلوں میں کئے گئے ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنسز (ٹی آئی ایس ایس) کے مطالعہ سے پتہ چلا کہ 58 فیصد قیدی یا تو ناخواندہ یا پھر پرائمری پاس تھے۔ 43.6/فیصد قیدیوں کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اپنے لئے وکیل رکھ سکیں۔ 61 فیصد کو یہ پتہ

نہیں تھا کہ جیل میں کوئی این جی او ہے، جن سے وہ مدد مانگ سکتے ہیں۔ اس سماج کے جیل میں زیادہ ہونے پر جمعیۃ علما ہند کے جنرل سیکرٹری مولانا محمود مدنی کی دلیل ہے کہ سماج میں تعلیم کی کمی، پسماندگی زیادہ ہے۔ خود سچر کمیٹی نے بھی تسلیم کیا ہے کہ مسلمانوں کی حالت دلتوں سے بھی بدتر ہے۔ وہیں جامعہ ٹیچرس سالڈریٹی ایسوسی ایشن (جے ڈی ایس اے) کی منیشا سیٹھی کا کہنا ہے کہ دوسری باتوں کے علاوہ اس میں ہمدردی نہ رکھنے والے ججوں اور ایسے نظام کا بھی قصور ہے، جو صرف دھن دولت والوں کا ہی سپورٹ کرتی ہے۔ یہ حالت اس وقت ہے جب آئی پی سی کی دفعہ 436 اور 436ء میں اس بات کا صاف انتظام ہے کہ کوئی بھی زیرغور قیدی اگر اپنے اوپر لگے جرم میں ہونے والی سزا کی نصف مدت پوری کر چکا ہو تو اسے ذاتی باؤنڈ پر ضمانت دی جانی چاہیے۔ یوپی کے ڈاسنا جیل کے سپرنٹنڈنٹ وی ریش راج شرما کہتے ہیں کہ جیل انتظامیہ اور عدالت اب خبردار ہے، جب سے یہ دفعہ عمل میں آیا ہے، جیلوں میں ایسی صورت حال نہیں ہے کہ چھوٹے موٹے جرم میں لوگ سالوں سال سلاخوں کے پیچھے صرف اس لئے رہیں کہ کوئی ضمانت دینے والا نہیں ہے۔

شرما کے دعویٰ کو مان لیا جائے تو جن معاملات میں طویل عرصے کے بعد کورٹ بری کر دیتا ہے، اس میں پولیس کی ذمہ داری کون طے کرے گا؟ لیڈر اور وزیر ہر بار اس طرح کی کارروائی سے پولس کا حوصلہ گرنے کا بہانہ بناتے ہیں۔ وجاہت حبیب اللہ کہتے ہیں کہ حیدرآباد میں 22 کیس ایسے تھے، جس میں عدالت نے من گڑھت قرار دیتے ہوئے لوگوں کے ساتھ ناانصافی بتایا، میں نے اس معاملے میں آندھرا کے سی ایم کرن کمار ریڈی سے قصوروار پولیس والوں پر کارروائی کا مطالبہ کیا، تو انہوں نے پولیس کے ڈسپلن پر خراب اثر پڑنے کی بات کہی۔

اگر سچر کمیٹی کی سفارشات پر عمل کیا جاتا تو پولیس کو مسلم مانس کے تعین میں آسانی ہوتی اور اس کے حوصلہ گرنے کی نوبت نہیں آتی۔ کمیٹی نے پولیس فورس میں مسلمانوں کی تعداد

بڑھانے اور مسلم اکثریتی علاقوں میں مسلمان پولیس افسروں کی تقرری کی سفارش کی تھی۔ جسٹس سچر کہتے ہیں کہ دہلی میں سیکولر حکومت ہے، لیکن دہلی پولیس میں اب بھی صرف دو فیصد مسلمان ہیں۔ وزارت داخلہ کے مطابق ملک میں 16.6/ لاکھ پولیس فورس میں 1.08/ لاکھ مسلمان ہیں، یعنی ان کی تقریباً 6 فیصد نمائندگی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے تقریباً آدھے (46250) جموں کشمیر میں ہیں۔

دہشت گردی کے نام پر زیادتی:

دہلی کے محمد عامر خان کا معاملہ انتظامیہ کے تعصب اور جانب داری کی کہانی بیان کرتا ہے۔ دسمبر 1996 اور اکتوبر، 1997 میں دہلی، روہتک، سونی پت اور غازی آباد میں قریب 20 دیسی بم دھماکوں کے الزام میں گرفتار اس وقت 18 سالہ عامر کو 14 سال بعد عدالت نے رہا کر دیا، لیکن ان سالوں میں ان کی دنیا اجڑ گئی۔ گرفتاری کے تین سال بعد والد ہاشم خان سماج کے بائیکاٹ اور انصاف کی امید چھوڑ کر دنیا سے چل بسے، تو اس لڑائی کے بعد 2008-09 میں آخر عامر کی ماں کی ہمت بھی جواب دے گئی، وہ فالج زدہ ہو گئیں، جنوری 2002 میں جیل سے رہا عامر کہتے ہیں ’آج بھی اپنی والدا کے منہ سے بیٹا لفظ سننے کو ترستا ہوں‘۔

مسلم نوجوانوں پر ظلم کے معاملے میں سی پی ایم کے جنرل سکریٹری پرکاش کرات کی قیادت میں ایک وفد نے 17 نومبر کو صدر پرنب مکھرجی سے بھی ملاقات کر کے 22 مسلمانوں کے برسوں بعد کورٹ سے بری ہونے کا ذکر کرتے ہوئے ایک میمورنڈم بھی سونپا۔ اس وفد میں شامل عامر نے کہا ’ میں نے صدر جج سے کہا کہ ہم ماضی کو بھولنا چاہتے ہیں اور بہتر مستقبل بنانا چاہتے ہیں جس میں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔‘‘

کرات کا کہنا ہے کہ پولیس اور احکام مسلمانوں کے تئیں تعصب کا شکار ہے، جب بھی

کوئی واردات ہوتی ہے، مسلم نوجوانوں کو پکڑا جاتا ہے۔اتر پردیش کے اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے امور کے وزیر اعظم خان بھی مانتے ہیں کہ کئی بے قصور مسلم نوجوانوں کو دہشت گرد بتا کر جیل میں ٹھونس دیا گیا ہے۔ یہی نہیں فرقہ وارانہ فسادات میں بھی سب سے زیادہ یہی طبقہ متاثر ہوا ہے، مسلمان ہی فسادات میں مارے جا رہے ہیں اور پولیس ان ہی لوگوں کو ملزم بنا کر جیل میں بند کر رہی ہے، لیکن اسے روکنے کے لئے ابھی تک کوئی ٹھوس اقدامات نہیں کئے گئے ہیں۔ پرکاش سنگھ کا کہنا ہے کہ پولیس سے بھی غلطی ہو سکتی ہے، لیکن مکمل نظام ہی غلط ہے ایسا نہیں کہہ سکتے۔ پولیس میں بھی کچھ خراب لوگ ہو سکتے ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر معاملے میں پولیس کو نشانہ بنایا جائے۔

کئی معاملات میں تعلیم یافتہ مسلم نوجوان صرف اپنے معاشرے کی وجہ سے پولس کے ظلم کا شکار ہو جاتا ہے۔ مدھیہ پردیش کے کھنڈوا کے 68 سالہ عبدالوکیل اپنے خاندان کو سیمی کے نام پر مظلوم مانتے ہیں، ان کے چھوٹے بیٹے محمد اظہر کو سیمی کا دہشت گرد بتا کر مہاراشٹر پولیس نے اورنگ آباد میں 26 مارچ، 2012 کو انکاؤنٹر میں مار ڈالا۔ اظہر کی والدہ کی آنکھیں بھر آتی ہیں۔ اظہر اندور سے کمپیوٹر ہارڈ ویئر کا کورس کر کے نوکری کی تلاش میں ایک کمپنی کا انٹرویو دینے اورنگ آباد گیا تھا، اس کے بعد انہیں تو بس کھنڈوا پولیس سے یہ اطلاع ملی کہ ان کا بیٹا انکاؤنٹر میں مارا گیا ہے' اس خاندان کو نہیں معلوم کہ بیٹے اظہر کا جرم کیا تھا۔ والد کے ذریعہ سی بی آئی جانچ کے مطالبہ پر آج تک توجہ نہیں دی گئی، الٹے پولیس نے عبدالوکیل کے دو اور بیٹوں رقیب اور راشد کو بھی 12 مئی 2012 کو پوچھ گچھ کے لئے اٹھا لیا اور سیمی کا بتا کر جیل بھیج دیا۔ شہر قاضی سید انصار علی کہتے ہیں 'مسلمانوں کے سلسلے میں پولیس زیادتی کی وجہ سے جیلوں میں ان کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ حکومت کسی بھی پارٹی کی رہی، مسلمانوں پر ہمیشہ ظلم کیا گیا۔ سیمی کے نام پر نوجوانوں کو گرفتار کرنے کی پولیس کی کارروائی پر عدالتیں کئی بار ناراضگی بھی ظاہر کر چکی ہیں۔

حال ہی میں سپریم کورٹ کو گجرات پولیس کو یہ ہدایت دینی پڑی تھی کہ یہ یقینی بنائیں کہ کسی بے گناہ کو اس طرح کی زیادتی کا سامنا نہ کرنا پڑے کہ میرا نام 'خان' ہے، لیکن میں دہشت گرد نہیں ہوں' غور طلب ہے کہ ریاست میں پوٹا میں 280 افراد کو گرفتار کیا گیا، جن میں 279 مسلمان تھے، یہی نہیں پوٹا اور ٹاڈا میں ثبوت پیش کرنے کے باوجود، ان معاملات میں سزا پانے کی شرح صفر رہی ہے۔ ٹاڈا کے تحت گرفتار صرف 1.5 / فیصد کو سزا ملی۔ پوٹا کا ریکارڈ تو اور خراب ہے۔ 1031 / گرفتار افراد میں سے صرف 13 لوگوں کو ہی سزا ملی۔

تعصب یا سچ کا سامنا؟:

سابق اولمپین ہاکی کھلاڑی اور سابق مرکزی وزیر اسلم شیر خان کا کہنا ہے کہ مدھیہ پردیش کی بی جے پی حکومت مسلمانوں کے تئیں انتہائی سخت ہے اور انہیں کثیر تعداد میں جیل بھیج کر انتخابی فائدہ کے لئے ان کی غربت پسماندگی کی کہانی بنتی ہے۔ اس بارے میں مدھیہ پردیش کے سابق وزیر اعلی اور کانگریس کے قومی جنرل سکریٹری دگ وجے سنگھ کہتے ہیں کہ اپنے خلاف ہو رہے پولس ظلم کو لے کر اگر مسلمان بے بسی محسوس کر رہے ہیں تو یہ کانگریس کی بھی کمزوری ہے۔

لیکن شیوراج سنگھ چوہان حکومت میں اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے وزیر اجے وشنوئی کہتے ہیں' ایک رات میں چیزیں نہیں بدل سکتیں، لیکن ہماری کوشش سے تبدیلی محسوس ہو رہی ہے، ملک میں کسی بھی گروپ کے جرم کے پیچھے غربت اور ناخواندگی اہم وجہ ہے، جب یہ مسئلہ ختم ہوگا تو تبدیلی نظر آجائے گی۔

حالانکہ پرکاش سنگھ کہتے ہیں' پولیس کسی کو گرفتار کرتی ہے تو اس کا نسل، ذات مذہب نہیں دیکھتی۔ اگر کوئی دہشت گرد واردات میں پکڑا جائے تو کیا ہم پہلے اس سے نسل کے

بارے میں پوچھیں؟ کیا پولیس کسی کو گرفتار کرنے سے پہلے این سی آر بی سے اعداد وشمار پوچھنے جائے، اگر کوئی جرم میں ملوث ہے تو پولیس اسے پکڑتی ہے، کیا ہو گیا ہے اس ملک کو؟ ہر چیز میں ووٹ بینک، مذہب شامل کیا جارہا ہے، کسی کا کوئی اصول نہیں ہے۔ اگر پولیس سے اتنی پریشانی ہے تو پولیس نظام کو ہی ختم کر دیجئے، پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

جے ٹی ایس اے کی صدر سیٹھی کہتی ہیں 'پولیس والے پہلے سے مان لیتی ہے کہ جیلوں میں مسلمانوں کی زیادہ تعداد ان کے دہشت گرد حملوں یا فرقہ وارانہ فسادات میں شامل ہونے کا ہی نتیجہ ہے۔ ملی گزٹ کے ایڈیٹر ظفر الاسلام خان کہتے ہیں کہ پولیس نے جج کا کام ختم کر دیا ہے، وہ کسی ملزم کو پکڑتی ہے تو اسے مجرم قرار دیتی اور میڈیا میں اسے قانونی چارہ جوئی کے بغیر ہی مجرم قرار دے دیا جاتا ہے'۔

تو کیا معاملہ اتنا سیدھا ہے کہ اس ملک کی پولیس اور عدلیہ ایک خاص کمیونٹی کے خلاف جھکی ہوئی ہے، یہ مکمل سچ نہیں ہے۔ اقلیتوں اور اکثریت کی پیچیدگیاں کسی ایک برادری کے خلاف کام نہیں کرتیں۔ جموں کشمیر اس کی بہترین مثال ہے۔ صوبے میں 66.97 رفیصد آبادی مسلمانوں کی ہے اور اس کی بہ نسبت کافی کم قیدی ہی مسلمان ہیں، وہاں اعداد وشمار کا حساب مسلمانوں کے حق میں جھکا ہوا نظر آتا ہے۔

کمیونسٹوں کی حقیقت:

ملک میں مسلمانوں کی سب سے بدتر صورت حال مغربی بنگال میں تھی، لیفٹ فرنٹ کے بعد مغربی بنگال میں اقتدار میں آئی ترنمول کانگریس کو بھی دیر سویر اس سوال سے ٹکرانا ہوگا۔ مسلمانوں کی ہمدردی کا دم بھرنے والی پارٹیاں بھی اقتدار میں پہنچنے کے بعد کچھ نہیں کر پارہی ہیں۔ اتر پردیش کی ایس پی حکومت نے انتخابات سے پہلے وعدہ کیا تھا کہ غلط الزام میں پھنسا کر جیل میں ڈالے گئے مسلم نوجوانوں کو رہا کر دیا جائے گا، لیکن ابھی تک کوئی نتیجہ

نہیں نکلا ہے۔

یوپی پی یو سی ایل کے راجیو یادو کا کہنا ہے کہ یہ سیاسی چال ہے عدالت نے حکومت کی کوششوں پر پانی پھیر کر اسے واضح کر دیا ہے۔ بی جے پی کے قومی نائب صدر مختار عباس نقوی کہتے ہیں ''سچر کمیٹی نے کہا تھا کہ اگر مسلمان کہیں سب سے زیادہ ہیں تو وہ جیلوں میں ہیں۔ سیکولرازم کے کندھے پر سیاست کرنے والے ریاستوں میں یہ مسئلہ زیادہ ہے، اسے انسانی طریقے سے حل کرنا ہوگا''۔

ظاہر ہے مسلمانوں کے جیل میں زیادہ ہونے کے سلسلے میں ایک ایماندارانہ سوچ کے ساتھ ساتھ پولیس اور انصاف کے نظام میں تبدیلی کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

(مضمون نگار صحافی اور روزنامہ راشٹریہ سہارا سے وابستہ ہیں)

☆☆

میڈیا مسلمانوں کی شبیہ خراب کرنے میں مصروف

● جسٹس مارکنڈے کاٹجو

انڈین پریس کونسل کے سربراہ مارکنڈے کاٹجو کے مطابق مسلمانوں کے تئیں بھید بھاؤ سے ان میں ناانصافی کا جذبہ بڑھ رہا ہے۔انہوں نے میڈیا کی سرزنش کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ وہ غیر ذمہ دارانہ صحافت کے ذریعے مسلمانوں کے بارے میں غلط تشہیر میں مصروف ہے۔کاٹجو نے کہا کہ جب بھی کوئی دھماکہ یا اس طرح کی واردات ہوتی ہے تو ایک گھنٹے کے اندر کئی ٹیلی ویژن چینل انڈین، جے ای ایم، یا حرکت الجہاد اسلام یا کسی مسلم شخص کے ذریعے بھیجے گئے ای میل یا ایس ایم ایس دکھانے لگتے ہیں، جن میں حملے کی ذمہ داری لینے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔انہوں نے کہا کہ کوئی بھی شرارتی شخص ایک ای میل یا ایس ایم ایس بھیج سکتا ہے لیکن جب آپ اسے ٹیلی ویژن پر دکھاتے ہیں اور اگلے دن اخبار میں شائع کرتے ہیں تو آپ (میڈیا) واضح طور پر یہ پیغام دیتے ہیں کہ سبھی مسلمان دہشت گرد ہیں اور ان کے پاس بم پھینکنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں ہے اور پورے مسلم سماج کی شبیہ داغدار کرتے ہیں اور فرقہ پرستی کو بڑھاوا دیتے ہیں۔

''دی ہندو'' اخبار کی جانب سے رپورٹنگ ٹیرر: ''ہاؤسنسیٹیو از دی میڈیا'' موضوع پر منعقد ایک کانفرنس میں انہوں نے اس طرح کی خبروں کیلئے میڈیا کی سرزنش کی۔مسٹر کاٹجو نے کہا کہ کیا یہ میڈیا کا ذمہ دارانہ رویہ ہے، مجھے لگتا ہے کہ یہ پوری طرح سے غیر ذمہ دارانہ صحافت ہے، جس سے ملک میں فرقہ پرستی کو بڑھاوا مل رہا ہے۔ میں نے اس کے خلاف

آواز اٹھائی تو انہوں نے کہا کہ میں میڈیا کو دبا رہا ہوں۔انہوں نے کہا کہ کیا آپ کو فرقہ پرستی پھیلانے کی آزادی ہے۔آپ کو برے کام کرنے سے روکا جائے گا، میں میڈیا کی آزادی کا سب سے بڑا حامی ہوں، لیکن میں اس طرح کے برے کام کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔آپ کو قومی مفاد کے تئیں ذمہ دار بننا ہوگا۔کاٹجو نے کہا کہ دہشت گردی کی وجہ ناانصافی ہے، غریبی اور جانبداری ختم کرنے سے دہشت گردی پر نکیل کسنے میں مدد ملے گی۔بے روزگاری کی صورت میں لوگوں کے پاس یا تو خودکشی کرنے یا دہشت گردی کی جانب قدم بڑھانے کا متبادل ہوتا ہے۔انہوں نے کہا کہ 1857 کی جدوجہد آزادی کے وقت ملک میں دہشت گردی صفر فیصد تھی، لیکن ہندوستان سے پاکستان اور بنگلہ دیش کی تقسیم کے بعد سے یہاں بھید بھاؤ کافی بڑھ گیا ہ۔ان کے مطابق کسی بھی طرح کی تقسیم کاری کی پالیسی، جھوٹی حب الوطنی کی مثال ہے۔تقسیم کے بعد اگر ہندوستان نے سیکولرزم کی پالیسی اپنائی ہے تو یہاں کسی بھی فرقے کے ساتھ بھید بھاؤ نہیں کیا جانا چاہئے۔انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ مفاد عامہ میں ہر طرح کی آزادی پر کچھ واجب پابندیاں عائد کی جاتی ہیں، ساتھ ہی انہوں نے کہا کہ وہ پہلے ہی وزیر اعظم سے پریس کونسل قانون میں ترمیم کی ضرورت کے سلسلہ میں اپیل کر چکے ہیں۔

☆☆

میڈیا کے رجحان پر قومی اقلیتی کمیشن کو تشویش

(وجاہت حبیب اللہ کا جسٹس کاٹجو کو مکتوب)

● عبدالحیٔ خان

قومی اقلیتی کمیشن نے اس بات پر تشویش کا اظہار کیا ہے کہ دہشت گردی کی کسی بھی واردات سے اسے ایک خاص فرقہ سے جوڑ دیا جاتا ہے اور میڈیا اسی کو نشانہ بنانے میں مصروف ہوجاتی ہے۔اس سلسلہ میں ۲۱رفروری کی شام حیدرآباد کے دل سکھ نگر میں دہشت گرانہ واقعہ کا حوالہ دیا گیا ہے۔قومی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین وجاہت حبیب اللہ نے اس سلسلہ میں پریس کونسل آف انڈیا کے سربراہ جسٹس مارکنڈے کاٹجو کو ایک مکتوب لکھ کر کہا ہے کہ میڈیا کی منفی رپورٹوں کو ذمہ دار افراد نے مختلف انداز سے لیا ہے۔انہوں نے چنئی کے انسٹی ٹیوٹ فار ٹوپیکل اسٹڈیز کے جی رمن کا آؤٹ لک میں شائع ایک مقالہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ رجحان یہ بن گیا ہے کہ اگر کہیں دہشت گردی ہے تو وہ مسلمان ہے اور اگر وہ مسلمان ہے تو اس کا تعلق انڈین مجاہدین سے ہے اور اگر وہ انڈین مجاہدین سے وابستہ ہے تو اسے پاکستانی آئی ایس آئی کی پشت پناہی حاصل ہے۔ان سے ایسا لگتا ہے کہ پولیس اور سیکورٹی ایجنسیاں اس کی عادی ہوچکی ہیں۔وجاہت حبیب اللہ نے مکتوب میں مزید کہا ہے کہ اس طرح کے رجحان کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے اور اس کی حوصلہ شکنی کی جانی چاہئے۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ایسے ماحول میں بھی کچھ آوازیں اٹھتی ہیں،لیکن وہ بکھری ہوئی ہیں اور یہ آوازیں بھی میڈیا کے ذریعہ اٹھائی جاتی ہیں۔

کمیشن نے پریس کونسل کے چیئرمین سے اپیل کی ہے کہ میڈیا کے ذمہ داروں کو مشورہ دیا جائے کہ وہ خبروں کو جاری کرنے میں احتیاط سے کام لیں اور اس طرح کی حساس خبروں کی نگرانی کی جائے جو ملک کے ایک بڑے طبقہ کیلئے غم وغصہ کا باعث بنتی ہیں۔پریس کونسل کے چیئرمین جسٹس کاٹجو نے اقلیتی کمیشن کے چیئرمین کو مذکورہ بالا مکتوب کا جواب دیتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ ہمارے ملک میں بم دھماکے اور دہشت گردانہ کارروائیاں ہوتی رہتی ہیں اس بارے میں جب تک قصوروار کی درست شناخت نہ کرلی جائے،اس وقت تک اس کو مجرم قرار نہ دیا جائے کیونکہ ان کے نظریہ میں اکثر بے قصور مسلم نوجوانوں کو گرفتار کرلیا جاتا ہے اور پھر وہ برسوں جیلوں میں قید رہتے ہیں۔انہوں نے مزید کہا کہ یہ بدقسمتی ہے کہ ہمارے ملک میں تحقیقات کا کوئی سائنٹفک طریقہ نہیں ہے اور نہ ہی ہمارا پولیس عملہ تربیت یافتہ ہے،جبکہ مغربی ملکوں میں جب کوئی واردات ہوتی ہے تو پولیس سب سے پہلے وہاں سے ثبوت جمع کرتی ہے۔انگلیوں کے نشانات لئے جاتے ہیں،خون میں سنی ہوئی چیزیں جمع کی جاتی ہیں اور انہیں تجربہ گاہ میں بھیجا جاتا ہے۔اس کے بعد ڈی این اے ٹسٹ ہوتا ہے۔ان ثبوتوں کی روشنی میں مجرم کی شناخت کی جاتی ہے۔انہوں نے اس سلسلہ میں گرین ریور سیریل کلر کیس کی مثال پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس کیس میں مجرم کی شناخت میں ۲۰رسال لگ تھے۔انہوں نے مزید کہا کہ بعض حلقوں کا یہ شبہ ہے کہ مسلمان ہی دہشت گرد ہوتے ہیں۔پولیس مسلمانوں کو گرفتار کرلیتی ہے اور پھر انہیں ضمانت نہیں مل پاتی اور سرکاری وکیل ان کی ضمانت کی مخالفت کرتا رہتا ہے۔اس کی حالیہ مثال عامر ہے،جسے ۱۷رسال کی عمر میں گرفتار کیا گیا تھا اور ۱۴رسال اس نے قیدوبند کی صعوبتیں برداشت کیں۔آخرکار عدالت نے اسے بے گناہ ثابت کیا اور ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔بڑی تعداد میں بم دھماکوں کے ایسے معاملے ہیں جن میں مسلمانوں کو غلط طریقہ سے پھنسایا جاتا ہے۔جسٹس کاٹجو نے واضح کیا کہ وہ میڈیا سے بات چیت اور ٹی وی انٹرویو میں کہتے رہے ہیں کہ

ہندوستان مختلف مذاہب کا گہوارہ ہے اور اس کو صرف سیکولرزم کے راستے پر چل کر ہی متحد رکھا جاسکتا ہے۔اس لئے تمام مذاہب کا یکساں احترام کرنا ضروری ہے۔

وجاہت حبیب اللہ کی تشویش پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بعض فرقہ پرست طاقتوں کی طرف سے یہ پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے کہ مسلمان دہشت گرد ہوتے ہیں جبکہ ہمارے ملک کے مسلمانوں کے ساتھ ملازمتوں، بینک قرضوں، کرائے پر مکان دینے میں امتیاز برتا جاتا ہے۔ان باتوں کا ذکر سچر کمیٹی کی سفارشات میں بھی کیا گیا ہے۔انہوں نے آخر میں ہندوستان کی عوام سے اور خصوصاً میڈیا سے اپیل کی کہ وہ فرقہ وارانہ نفرت پھیلانے سے گریز کرے اور بم دھماکوں و دہشت گردانہ سرگرمیوں کی خبر نگاری کرتے وقت احتیاط سے کام لے۔

وجاہت حبیب اللہ کا حکومت سے احتجاج:

اقلیتی قومی کمیشن کے پاس پیسے کی قلت ہے جس کی وجہ سے اقلیتی امور کی نگرانی کرنے والا ادارہ اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے سے قاصر ہے۔اس صورتحال پر کمیشن کے چیئرمین وجاہت حبیب اللہ نے حکومت سے سخت احتجاج کیا ہے۔مسٹر حبیب اللہ نے بتایا کہ عملہ کی تنخواہیں اور الاؤنس ادا کرنے کے بعد اتنا پیسہ نہیں بچتا کہ کمیشن ایسا کوئی کام کرے جو قانون کے تحت اس کی ذمہ داری ہے۔انہوں نے ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے کہا ہم نہ تو کانفرنسیں کرسکتے ہیں نہ بین مذاہب پروگرام۔نہ ہی ہم اقلیتوں کے حقوق کی پامالی سے متعلق مقدمات کو آگے بڑھا سکتے ہیں۔کمیشن کو مسلسل ایسی شکایات موصول ہوتی رہتی ہیں جن پر قانونی چارہ جوئی کی ضرورت ہے مگر اس کیلئے کوئی قانونی ڈھانچہ موجود نہیں ہے۔انہوں نے کہا کہ لاء افسر تو ہے مگر مقدمات کیلئے کوئی مناسب قانون سیل نہیں ہے۔قانون کے مطابق کمیشن کے اخراجات مرکزی حکومت کی براہ راست گرانٹس کے ذریعہ پورے

ہونے چاہئیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اقلیت کے حقوق کا ادارہ اقلیتی امور کی وزارت کو بجٹ سے ملنے والی رقم پر کسی طرح چل رہا ہے۔اقلیتی کمیشن کا سیکشن ۱۰/صاف کہتا ہے کہ مرکزی حکومت گرانٹس کے ذریعہ کمیشن کو پیسہ دے گی تاکہ اس مقصد کیلئے اس کا استعمال کیا جاسکے، مگر اس واضح نظم کے باوجود کمیشن کو جو بھی پیسہ ملتا ہے وہ اقلیتی امور کی وزارت سے ہی ملتا ہے اور یہ رقم اتنی قلیل ہوتی ہے کہ اس کے لازم اخراجات بھی اس سے پوری نہیں ہو پاتے۔ حبیب اللہ نے وزارت کی طرف سے ملنے والی قلیل رقم پر بے اطمینانی ظاہر کی۔

انہوں نے بتایا کہ انہوں نے اس ضمن میں اقلیتی امور کی وزارت کو مراسلہ بھیجا ہے۔کمیشن کو جو کام سونپے گئے ہیں ان کے لئے اسے ایک قانونی ڈھانچہ اور خاطر خواہ رقم کی ضرورت ہے۔کمیشن کو پارلیمنٹ کے ایکٹ کے ذریعہ ۱۹۹۲ء میں قائم کیا گیا تھا۔اس کا کام ملک کی پانچ تسلیم شدہ اقلیتوں عیسائیوں، مسلمانوں، بودھوں، سکھوں اور زرتشتوں کے مفادات پر نظر رکھتا ہے۔کمیشن کی ذمہ داریوں میں مرکز اور ریاستوں کے بنائے ہوئے قوانین کے ذریعہ فراہم کردہ اقلیتوں کو دیئے گئے حقوق کی نگرانی کرنا، اقلیتوں کی حفاظت نہ ہونے اور حقوق سے محرومی کی شکایات پر نظر رکھنا، ان معاملاتوں کو متعلقہ حکام کے ساتھ اٹھانا اور سرکار کو سفارشات پیش کرنا ہے۔کمیشن کو مذکورہ فرائض انجام دینے کے علاوہ مقدمات کیلئے سول عدالت کے مساوی اختیارات ہونگے۔کمیشن کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اقلیتوں کی سماجی و معاشی بہبود اور تعلیمی ترقی سے متعلق امور کا مطالعہ، تحقیق اور تجزیہ کرے۔مسٹر حبیب اللہ نے افسوس کے ساتھ کہا کہ مناسب فنڈ نہ ہونے کی وجہ سے یہ تمام کام مناسب طریقہ سے نہیں کئے جاسکتے۔سال ۱۹۹۲ء میں پارلیمنٹ کے قانون کے ذریعہ تشکیل دیئے گئے کمیشن کا کام پانچوں تسلیم شدہ اقلیتوں کے مفادات کا خیال رکھنا ہے مگر وہ اپنا یہ فرض ادا کرنے سے قاصر ہے۔

(مضمون نگار صحافی اور روزنامہ انقلاب کے نیوز ایڈیٹر ہیں)

☆☆

خاص طبقے کونشانہ بنانے کیلئے میڈیا کا استعمال

● ڈاکٹر افضل مصباحی

پچھلے کچھ برسوں سے تسلسل کے ساتھ میڈیا کا استعمال کسی خاص طبقے کونشانہ بنانے کے لئے کیا جارہا ہے۔اس کی وجہ سے میڈیا کے تعلق سے بہت سی غلط فہمیاں بھی پائی جانے لگی ہیں،ظاہر ہے اس کا ذمہ دار بھی خود میڈیا ہی ہے۔ چنانچہ ابھی حال ہی میں قومی اقلیتی کمیشن کے چیرمین وجاہت حبیب اللہ نے پریس کونسل آف انڈیا کو خط لکھ کر اس کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی ہے کہ دہشت گردی کی کسی بھی واردات کو ایک خاص فرقہ سے جوڑ دیا جاتا ہے اور میڈیا اسی کونشانہ بنانے میں مصروف ہوجاتا ہے۔یعنی میڈیا کی طرف سے ہرممکن یہ پیغام دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اگر کہیں دہشت گردی ہے تو اس کا تعلق مسلمانوں سے ہے،اوراگر وہ مسلمان ہے تو اس کا تعلق انڈین مجاہدین ہے اوراگر وہ انڈین مجاہدین سے وابستہ ہے تو اسے پاکستانی آئی ایس آئی کی پشت پناہی حاصل ہے۔اس کی وجہ سے ہم نے یہ محسوس کیا کہ تعمیری صحافت کے موضوع پر ایک تفصیلی مضمون قارئین کی خدمت میں پیش کیا جائے،تاکہ صحافت کا اصل مقصد اور تعمیری وتخریبی صحافت کا فرق بھی واضح ہوجائے۔

صحافت ایک ایسا عظیم اور باوقار پیشہ ہے،جس میں دستیاب وسائل ابلاغ کے ذریعہ ہرروز رونما ہونے والے حادثات و واقعات،نت نئی معلومات،رائے عامہ اورنفوس انسانی

کی تفریحات کے باضابطہ فرائض انجام دئے جاتے ہیں۔یہ ایک ایسا پیشہ ہے جس سے پوری دنیا کے لوگوں کا کسی نہ کسی طور پر روز سابقہ پڑتا ہے۔کچھ لوگ تو اسے پیشہ کے طور پراپناتے ہیں لیکن دوسرے لوگوں کی وابستگی دیکھنے، پڑھنے اور سننے سے ہوتی ہے۔اس کی وجہ سے بڑے پیمانے پرتبدیلی بھی رونما ہوتی ہے۔آج کا زمانہ جدید ٹیکنالوجی کا زمانہ ہے،سائنس کی نت نئی ایجادات کی وجہ سے میڈیا میں بھی انقلابی تبدیلی رونما ہوئی ہے۔اس لئے اس وقت پرنٹ اورالیکٹرانک میڈیا کی ایسی ایسی شاخیں وجود میں آچکی ہیں،جن کا تصور آج سے نصف صدی قبل کیا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ پرنٹ میڈیا میں روزنامہ، سہ روزہ اورہفت روزہ اخبارات، پندرہ روزہ میگزین، ماہنامہ،ادبی مجلّے، ڈائی جسٹ، پیشہ ورانہ یا خاص گروپوں کے رسالے اور سالنامے وغیرہ کا شمار ہوتا ہے، جب کہ ریڈیو، ٹیلی ویژن، فلم اورانٹرنیٹ وغیرہ الیکٹرانک میڈیا کی اہم شاخیں ہیں۔

میں نے لفظ 'عظیم' کا استعمال جان بوجھ کر کیا ہے۔اس لئے کہ صحافت کا اصل مقصد اسی وقت پورا ہوسکتا ہے، جب اس کے فرائض مثبت انداز میں ادا کئے جائیں اور یہ پیشہ اسی وقت 'عظیم' اور مؤقر ہوگا جب تعمیری پہلو کو دھیان میں رکھتے ہوئے نیک مقاصد کے لئے متعینہ اصول وضوابط اور اخلاقیات کے اعلیٰ معیار کے مطابق اس کو انجام دیا جائے، یعنی نصب العین اخلاقاً درست اور قانوناً جائز ہو، اگر ذرہ برابر بھی تعمیر کی بجائے تخریب کا گزر ہوا تو ہم اسے 'تعمیری صحافت' کی بجائے 'زرد صحافت' (Yellow Journalism) کا نام دیتے ہیں۔اس طرح کی صحافت کو تخریبی صحافت کے زمرے میں رکھا جاتا ہے۔ایک دور ایسا بھی تھا جب عریاں یا نیم عریاں تصاویر کی اشاعت کو 'زرد صحافت' کہتے تھے۔ زرد صحافت کا مطلب تھا ایسی صحافت جو مہذب معاشرے کے لئے ناقابل قبول ہو۔اسی لئے جب وسیع تناظر میں ہم دیکھتے ہیں تو ہر وہ صحافت جو اخلاقاً درست اور قانوناً جائز نہ ہو وہ زرد صحافت ہے۔ایسی صحافت تعمیر کی بجائے تخریب کا کردار ادا کرتی ہے۔خواہ وہ عریاں یا نیم

عریاں تصاویر ہوں یا کسی مذہب ، مذہبی رہنما، سماج، قوم، طبقہ، ذات، نسل اور گروہ کی کردارکشی ہو، اس طرح کی تمام صحافت کا شمار ’منفی صحافت‘ میں ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ تخریب پر منتج ہونے کی وجہ سے اس طرح کی صحافت کو بھی زرد صحافت کہہ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صحافتی پیشے کی لاج رکھنے کے لئے صداقت، امانت، دیانت، شرافت اور نفاست کو لازم قرار دیا گیا ہے۔ تعمیری پہلو اس کا لازمی جزو ہے۔ ہمارے ملک میں صحافت کے ضابطۂ اخلاق میں یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ ’’صحافی اپنے پیشہ کو ایک مقدس امانت سمجھے اور ہمیشہ انسانی فلاح و بہبود کی خاطر انسانیت کی بقا اور امن کی ہر ممکن کوشش میں مصروف رہے، بنیادی انسانی حقوق اور سماجی جواب دہی کا خصوصی لحاظ رکھے، جملہ پیشہ ورانہ فرائض اور اخلاقی پابندیوں کا پاس ولحاظ رکھے، ایسے معاملات میں غیر معمولی احتیاط برتے جن میں رپورٹوں اور تبصروں کی وجہ سے بدامنی پھیل جانے کا خدشہ ہو، کوئی بھی تحریر ایسی نہ ہو جس سے ماحول میں منافرت اور کشیدگی بڑھے‘‘۔ برطانیہ، امریکہ اور دیگر ملکوں میں بھی صحافیوں کے لئے اخلاق کے ضوابط متعین کئے گئے ہیں، تاکہ صحافت کا اصل مقصد یعنی سماج کی خدمت کا لازمی جزو متاثر نہ ہو اور اس کی وجہ سے معاشرے میں بدامنی نہ پھیلے۔

موجودہ دور میں صحافت کا کینوس بے حد وسیع وعریض ہو چکا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی کی وجہ سے عصر حاضر میں پوری دنیا سمٹ کر ایک چھوٹے سے ڈبے میں ہمارے سامنے آچکی ہے۔ اس وقت کا عالم یہ ہے کہ دنیا کے کسی بھی کونے میں بیٹھ کر ایک انسان وسائل ابلاغ کے ذریعہ اپنی بات دنیا کے کونے کونے تک پہنچا سکتا ہے، اتنا ہی نہیں لوگ اسے بولتے ہوئے، حرکت کرتے ہوئے، سمجھاتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں، اس کی کہی گئی باتوں کو سن سکتے ہیں، بار بار اسے پڑھ کر، سن کر اسے سمجھ سکتے ہیں۔ اس کا دائرۂ کار اس قدر پھیلا ہوا ہے کہ اس کی سماجی، سیاسی، معاشرتی، تہذیبی، تمدنی، اخلاقی ہمہ گیری، وسعت اور معنویت کا ہم روز مشاہدہ کرتے ہیں۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا جب صحافت سرکاری اعلانات تک محدود تھی،

چند لوگوں تک اطلاعات محدود تھیں، اس کے فیض سے وہی لوگ مستفیض ہو پاتے تھے جو حکمرانوں کے قریب تھے، آج یہ ترقی کے منازل طے کرتی ہوئی حکومتوں، قوموں اور سیاستدانوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں لگی ہے۔ کل تک جو صحافت چند راجاؤں، مہاراجاؤں کے ہاتھوں تک محدود تھی وہ آج پوری دنیا پر اپنا سکہ جما چکی ہے اور قلمی اخبار سے آن لائن اخبار تک کا لمبا سفر طے کر کے اپنے وجود، اہمیت اور افادیت منوانے پر مجبور کر چکی ہے۔ موجودہ صحافت اپنے اندر اس قدر وسعت، طاقت اور اثر رکھتی ہے کہ پل بھر میں یہ دنیا کے امن وامان کو پامال کر سکتی ہے، اس کے توسط سے دیکھتے ہی دیکھتے پرامن ماحول میں آگ لگائی جاسکتی ہے، دوملکوں میں کشیدگی بڑھ سکتی ہے، یہاں تک کہ جنگ کی نوبت بھی آسکتی ہے۔ اس کی ایک دو نہیں سیکڑوں مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ پچھلے دنوں امریکی پادری ٹیری جونس کی سرپرستی میں بنائی گئی فلم ’انوسنس آف مسلم‘ ہی کو آپ دیکھ لیں، محض ۱۳؍منٹوں کی یہ ڈاکومنٹری فلم ایک محدود ذریعہ ابلاغ ’یوٹیوب‘ پر اپ لوڈ کی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کا بیشتر خطہ احتجاج اور مظاہروں کی زد میں آگیا۔ لیبیا میں امریکی سفیر اور دیگر لوگوں کو اپنی جان گنوانی پڑی، حالات اس قدر خراب ہوئے کہ امریکہ کو معذرت تک مانگنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اگر یہ معاملہ اور طول پکڑتا تو ذرا تصور کریں کیا سے کیا ہو جاتا! یہ سب کچھ الیکٹرانک میڈیا کی ایک اہم شاخ انٹرنیٹ کی ایک شق ’یوٹیوب‘ کے توسط سے ہوا، جس پر کسی بھی ویڈیو کو اپ لوڈ کیا جاسکتا ہے، اس پر لوگ پوری کی پوری فلم دیکھ سکتے ہیں اور آواز کو سن سکتے ہیں۔ ’یوٹیوب‘ کو میں نے ایک محدود ذریعہ ابلاغ اس لئے کہا ہے کہ اس کا دائرہ گرچہ دنیا کا کونہ کونہ ہے، لیکن اس وقت یہاں تک رسائی کم لوگوں کی ہے، بالخصوص ہندوستان میں تو بہت کم لوگ اسے استعمال کرتے ہیں، اس کے باوجود اس نے ایسا گل کھلایا کہ سرکار دوعالم ﷺ کی شان میں بنائی گئی گستاخانہ فلم کی کہانی آن واحد میں دنیا کے کونے کونے میں پہنچ گئی اور پھر دنیا کا کیا حال ہوا، اس کے بارے میں سب واقف ہیں۔

یہ سب کچھ صرف اور صرف میڈیا کی وجہ سے ہوا۔ آپ دیکھتے ہیں آئے دن متنازعہ خاکوں کی وجہ سے پوری دنیا میں کس طرح بے چینی پائی جاتی ہے۔ یہ اور اس طرح کی سیکڑوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

یوٹیوب کے علاوہ انٹرنیٹ کی اور بھی کئی شاخیں ہیں جن کے ذریعہ ابلاغ وترسیل کا کام لیا جاتا ہے۔ سچ کہیں تو میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس وقت مؤثر ترین ذریعۂ ابلاغ انٹرنیٹ ہے۔ انٹرنیٹ نے اپنے اندر اخبارات، میگزین، رسالے، ریڈیو، ٹیلی ویزن اور فلم وغیرہ سب کو سمیٹ لیا ہے۔ دنیا کی کون سی ایسی چیز ہے جو انٹرنیٹ پر نہیں ہے؟ انٹرنیٹ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے ذریعہ آن واحد میں آپ اپنا پیغام خواہ وہ تحریری ہو یا تقریری دنیا کے کونے کونے تک پہنچا سکتے ہیں۔ انٹرنیٹ پر عام طور پر ای میل، ویب سائٹ، بلاگ، فیس بک، یوٹیوب اور ٹویٹر وغیرہ کے ذریعہ لوگوں تک رسائی حاصل کی جاتی ہے۔ اس وقت ای میل، ویب سائٹ، بلاگ اور فیس بک کے استعمال کا رواج کافی عام ہو چکا ہے۔ یوٹیوب اور ٹویٹر کا استعمال کرنے والوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ انٹرنیٹ کی وجہ سے میڈیا کی دنیا میں ایک عظیم انقلاب برپا ہوا ہے، لیکن اب اس کا استعمال غلط کاموں کے لئے بھی بڑے پیمانے پر کیا جارہا ہے۔ ای میل کے ذریعہ ڈیٹا ارسال کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔ دنیا کے کونے کونے تک کوئی بھی پیغام پلک جھپکتے ہی ای میل کے ذریعہ ارسال کیا جاسکتا ہے، لیکن اب ای میل کے ذریعہ گمراہ کرنے کا سلسلہ بھی زور وشور سے جاری ہے، ویب سائٹ پر جہاں دنیا کی تمام طرح کی اچھی معلومات دستیاب ہیں، تو وہیں مخرب اخلاق تصاویر، مناظر اور گمراہ کن مواد کی بھی کمی نہیں ہے۔ بلاگ پر اچھے اچھے قلم کاروں کے مضامین اور نت نئی معلومات آپ کو پڑھنے ملیں گی، تو وہیں غلط راہ پر لے جانی والی اطلاعات بھی دیکھنے کو ملیں گی۔ فیس بک پر اچھی تصاویر اور سبق آموز پیغامات کا ایک سلسلہ جاری ہے تو وہیں پراگندگی سے پر مواد کی بھی کمی نہیں ہے۔ یوٹیوب اور ٹویٹر کا بھی یہی حال

ہے۔ اب تو حالت یہ ہے کہ طرح طرح کی افواہیں پھیلانے کے لئے بھی انٹرنیٹ کی مذکورہ شاخوں کا زور وشور سے استعمال ہو رہا ہے۔ انٹرنیٹ پر سرکشی کی وجہ سے آئے دن ماحول بگڑتے ہوئے ہم نے دیکھا ہے۔ کبھی کبھی تو حالات قابو سے باہر ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے اب سائبر کرائم پر قابو پانے کے لئے قوانین بنائے جاچکے ہیں، لہٰذا انٹرنیٹ کی مذکورہ شاخوں کا استعمال کرتے وقت دیکھنا ہوگا کہ اس کا کس طرح استعمال کیا جائے۔ اب یہ استعمال کرنے والوں پر منحصر ہے کہ وہ تعمیری کاموں کے لئے اس کا استعمال کرتے ہیں یا پھر تخریب کاری کے لئے۔ ظاہر ہے اس کا مثبت استعمال ہی سماج اور معاشرے کے لئے سودمند ہے۔ ویب سائٹ، بلاگ، فیس بک، یوٹیوب اور ٹویٹر پر ایسی باتیں نشر کرنی چاہئیں جو اہم معلومات پر مبنی ہوں، کسی مذہب یا مذہبی پیشوا کے خلاف زہر افشانی تو ہرگز نہ ہو، اسی طرح ایسا کوئی بھی قابل اعتراض مواد اپ لوڈ کرنے سے قبل سو بار غور کرلیں کہ کہیں اس سے کسی کی دل شکنی تو نہیں ہوگی یا قانون کی گرفت میں آنے کا اندیشہ تو نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر انٹرنیٹ پر نشر مواد سے ماحول بگڑتا ہے تو اس کا ذمہ دار وہی شخص ہوگا ہے، جس نے اسے اپ لوڈ کیا ہے۔ خاص طور پر کمسن نوجوانوں کو از حد محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ گمراہ کرنے والوں کا بہت بڑا گروپ انٹرنیٹ پر سرگرم ہے، جو طرح طرح کے لالچ دے کر ناتجربہ کار نوجوانوں کو آسانی سے اپنا شکار بنا لیتے ہیں۔ اس لئے وہ لوگ جو انٹرنیٹ کے نفع ونقصان سے باخبر ہیں، وہ اپنے طور پر اپنے حلقے میں اس کے فوائد ونقصانات سے لوگوں کو باخبر کرتے ہیں تو عین ممکن ہے کہ اس کے اچھے نتائج مرتب ہوں، ورنہ جس طرح سازشوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے، ایسے میں عام لوگوں کا بچ نکل پانا بے حد مشکل ہے۔ انٹرنیٹ کا استعمال کرتے وقت ان پہلوؤں پر ہر حال میں دھیان دینا چاہئے۔ جو فائدہ مند چیزیں ہیں، ان سے استفادہ عین دانشمندی ہے اور جو نقصاندہ عناصر ہیں، ان سے احتراز وقت کا تقاضہ ہے۔ انٹرنیٹ قلم کاروں کے لئے بھی بہت بڑا تحفہ ہے۔ وہ اپنی باتیں آسانی

کے ساتھ قارئین تک پہنچا سکتے ہیں۔ اگر وہ اچھا لکھنے میں کامیاب ہیں تو لوگوں کو ان کی تخلیقات کا انتظار رہے گا۔

اس وقت کا بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ عالمی طاقتیں پورے شدومد کے ساتھ میڈیا کو اپنے جائز و ناجائز مقاصد کے لئے استعمال کررہی ہیں۔ مسلمانوں کو دہشت گرد بنا کر مطعون کرنے کے لئے میڈیا کا منظّم طریقے سے استعمال کیا گیا، جس کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ صورت حال اس قدر خراب ہوچکی ہے کہ کسی بھی ملک کو نشانہ بنانے کے لئے سب سے پہلے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا سے اس ملک کے خلاف جھوٹا پروپگنڈہ شروع کیا جاتا ہے اور جھوٹ کو اتنی شدت کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا ہے کہ لوگ آنکھ بند کرکے اسے سچ سمجھنے لگتے ہیں۔ عراق کے پاس عام تباہی کے اسلحے ہونے کا الزام اور پھر اس صریح جھوٹ کے خلاف میڈیا کے ذریعہ پروپگنڈہ کی مہم، دنیا کو اس کا یقین دلانے کے بعد اس ملک کو تباہ و برباد کرنے کا پورا واقعہ ہم سب کے سامنے ہے۔ جب عراق پوری طرح تباہ ہوگیا، صدام حسین اور ان کے گھر والے مارے گئے، دشمن کا مقصد پورا ہوا، تب جاکر اس جھوٹ کا انکشاف ہوا، بلکہ سچائی یہ ہے کہ اس جھوٹ کو میڈیا کے ذریعہ ہی دنیا کے سامنے پیش کیا گیا، جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کرنے کے لئے بھی میڈیا کا سہارا لیا گیا اور جھوٹ کے انکشاف کے لئے بھی اسی کا استعمال کیا گیا۔ اس سے میڈیا کی طاقت کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ افسوسناک صورت حال یہی ہے کہ جو طاقتیں میڈیا کے لئے ضابطۂ اخلاق بناتی ہیں، وہی اسے پامال کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ مذکورہ تفصیل کی روشنی میں اب میڈیا کے لئے اس امریکی ضابطۂ اخلاق کو دیکھیں تو اپنے آپ قول وفعل کا تضاد صاف نظر آئے گا۔ امریکی ضابطۂ اخلاق میں کہا گیا ہے:

’’عام فلاح و بہبود سے ہٹ کر جو بھی کوشش کسی ذاتی مفاد کے حصول کی خاطر کی جاتی ہے، وہ صحت مند صحافت کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے۔ رازدارانہ طور پر نجی اثر ورسوخ سے حاصل کی ہوئی خبروں کی اشاعت اس وقت تک نہ کی جائے جب تک کہ اعلانیہ طور پر

خبریں حاصل کرنے کے وسیلہ کو ظاہر نہ کیا جائے۔ اخلاق، راست گوئی، درستی، قارئین کی خوشنودی اور مکمل اعتماد حاصل کرنا اصولی صحافت کے لئے بنیادی طور پر اہم اور ضروری ہے۔‘‘

اس ضابطۂ اخلاق کی دھجیاں آئے دن انہی طاقتوں کے زیر اثر اڑائی جاتی ہیں، جو اس کا دم بھرتے ہوئے نہیں تھکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ طاقتیں جب چاہتی ہیں کہ دنیا میں بے چینی پھیلے تو کبھی وہ پادری ٹیری جونس کو سامنے لاتی ہیں، کبھی رشدی اور تسلیمہ نسرین جیسے لوگ سامنے آجاتے ہیں، کبھی کوئی کارٹونسٹ مہذب دنیا کو چیلنج کرنے لگتا ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کیا سے کیا ہوجاتا ہے۔ ایسا کرتے وقت ’اظہار خیال کی آزادی‘ کا پرزور حوالہ دیا جاتا ہے، لیکن ایسے لوگ ایسا کرتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ اظہار خیال کی آزادی کا مطلب کسی کو گزند پہنچانا ہرگز نہیں ہے۔ اظہار خیال کی آزادی اسی وقت تک ہے جب وہ تعمیری ہو، تخریب کی ہوا لگتے ہی یہ آزادی اپنے آپ چھن جاتی ہے۔ اس حقیقت کو جو لوگ سمجھتے ہیں وہ کبھی بھی ایسے موقع پر اظہار خیال کی آزادی کا حوالہ نہیں دیتے ہیں۔ اس ہتھیار کا استعمال وہی کرتے ہیں جنہیں اپنا الو سیدھا کرنا ہوتا ہے۔

سچائی یہ ہے کہ صحافت تو ایک خدمت خلق کا وسیلہ ہے۔ یہ خدمت کامل طور پر اسی وقت ہوسکتی ہے، جب وہ تعمیری ہو اور موجودہ سماج کے مزاج سے پوری طرح میل کھائے۔ معاشرتی اخلاقیات اور اقدار سے ہٹ کر یا سماج کے مروّجہ اصولوں کی خلاف ورزی کرکے کوئی صحافت حقیقی صحافت اور ایماندارانہ صحافت کا کردار ادا نہیں کرسکتی۔ اس لئے ایک ذمہ دار صحافی کے لئے ضروری ہے کہ منفی سے زیادہ مثبت اور تعمیری خبروں کو عام کرنے کی کوشش کرے۔ ہر معاشرے میں اچھائیاں بھی ہوتی ہیں اور برائیاں بھی۔ ہر سماج میں بدعنوانی، قتل وغارت گری، شراب نوشی، جوابازی، زنا بالجبر، چوری، ڈکیتی، غیبت اور اغوا وغیرہ کی واردات ہوتی رہتی ہیں۔ اگر صحافی ان جرائم کی خبروں کو اہمیت دیکر سماج کی صرف تاریک تصویریں پیش کرنے میں مصروف ہوجائے تو پھر اس کا معاشرہ اور سماج پر غلط اثر ہوگا۔ ایسی

صورت میں ایک طرف عوام ان سے بدظن ہوں گے تو دوسری طرف اس کے برے نتائج بھی برآمد ہوں گے۔ اس لئے صالح معاشرے کی تشکیل کے لئے صحافی کی ذمہ داری ہے کہ وہ تعلیم، تدریس، کھیل کود، ایجادات اور تحریکات و ثقافت کی خبروں اور سرگرمیوں کو خصوصیت کے ساتھ عام کرے۔ یقیناً ہر روز معاشرے میں ایسے واقعات ضرور رونما ہوتے ہیں جن سے انسانی شرافت کی بو آتی ہے۔ اگر حوصلہ افزا باتوں سے معاشرے میں خوشگوار ماحول بنایا جائے تو یہ یقیناً ہر اعتبار سے کافی سودمند ہوگا۔ چنانچہ معاشرے اور سماج کو ذہن میں رکھتے ہوئے صحافیوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اعتدال کی راہ اپنائیں۔ ہم عصر سماج کی صحیح عکاسی میں ہی اس کی بھلائی ہے۔ صحافت کا سماج پر چونکہ کافی اثر ہوتا ہے، اس لئے جرائم کی خبریں ایسے انداز میں ہرگز شائع نہ کی جائیں کہ قارئین کے ذہن و دماغ میں ان جرائم کے ارتکاب کی خواہش انگڑائیاں لینے لگے، بلکہ جرائم کی خبروں کو کچھ اس طرح پیش کیا جائے کہ قارئین جرم اور مجرم دونوں سے نفرت کرنے لگیں۔ دنیا کی سماجی اور معاشرتی زندگی میں صحافت کے اندر مثبت کردار ادا کرنے کی صلاحیت کا ہونا ضروری ہے، تب جا کر وہ تعمیری صحافت کہلائے گی اور خدمت خلق کے زمرے میں اسے رکھا جاسکتا ہے۔

آئے دن کے تجربات کی روشنی میں اس حقیقت سے سبھی واقف ہیں کہ صحافت میں سیاسی قوت بھی ہوتی ہے۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ میڈیا کی اہمیت قانون ساز اسمبلیوں، حکومتوں اور عدالتوں سے کم نہیں ہے۔ جمہوری نظام کے اہم ترین ارکان پارلیمانی ادارے اور اخبارات ہیں۔ جمہوریت کو تقویت بخشنے اور صحیح سمت پر رواں دواں رکھنے میں میڈیا کا اہم مقام ہے۔ اس کے ذریعہ جمہوری اداروں کو صحیح سمت پر رکھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ مشہور خطیب اور پارلیمانی ماہر ایڈمنڈ برک نے اخبارات کے لئے 'چوتھے طبقہ' کا معزز لفظ استعمال کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اخبارات کو جمہوریت کا چوتھا ستون قرار دیا جاتا ہے۔ کسی بھی جمہوری حکومت میں قانون ساز ادارے یعنی پارلیمنٹ یا مقنّنہ

(Legislature)، حکومت کا صیغۂ راز یعنی Executive اور حکام بحیثیت مجموعی یا عدلیہ یعنی Judiciary کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ موجودہ دور میں مقنّنہ، انتظامیہ اور عدلیہ ہی کی طرح 'پریس' کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے۔ جمہوری نظام میں تو اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے، لیکن ایک بڑا المیہ یہ بھی ہے کہ جمہوری حکومتوں میں بھی سماج کے کسی طبقے کو نشانہ بنانے کے لئے میڈیا کا استعمال زور وشور سے ہوتا ہے۔ کسی طبقے کا نام لئے بغیر یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ کچھ طاقتیں مخصوص مذاہب اور ان کے ماننے والوں کو آئے دن طعن وتشنیع کا نشانہ بناتی ہیں، بلکہ کبھی کبھی تو غلط سے غلط کردار کو بھی ان سے موسوم کردیا جاتا ہے، جس سے سماج میں کشیدگی بڑھتی ہے اور معاشرے میں بسنے والوں میں دوریاں بڑھنے لگتی ہیں۔ ظاہر ہے اس کا اثر پورے سماج پر ہوتا ہے۔ ۹/۱۱ کے بعد ان حالات کو اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔ 'مائی نیم از خان اینڈ آئی ایم ناٹ اے ٹیررسٹ' فلم کو دیکھ کر اس کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے، اتنا ہی نہیں آئے دن ریلوے اسٹیشنوں، ہوائی اڈوں اور دیگر مقامات پر اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔

ہندوستانی ضابطۂ اخلاق میں صاف لفظوں میں یہ کہا گیا ہے کہ:

''صحافی ہمیشہ اس کوشش میں لگے رہیں کہ ملک کے اتحاد اور سالمیت کو کوئی دھکا نہ پہنچے، عوام میں وطن سے محبت کے احساسات پرورش پاتے رہیں، ثقافتی اور تہذیبی تفاوت کے باوجود ہندوستانیوں میں اتحاد اور اتفاق کے جذبات مستحکم ہوتے رہیں۔ صحافی ایسے خیالات، نظریات اور مصروفیات کی حوصلہ افزائی ہرگز نہ کریں، جن سے قومی یگانگت کی قیمت پر تنگ نظر علاقائی دلچسپیاں بڑھنے کا احتمال ہو''۔

اس ضابطے کی روشنی میں ہم جب موجودہ صحافت کا تجزیہ کرتے ہیں تو بے حد مایوسی ہوتی ہے، خواہ وہ پرنٹ میڈیا ہو یا الیکٹرانک میڈیا۔ مذکورہ ضابطے کو نگاہ میں رکھتے ہوئے قومی اقلیتی کمیشن کے اعتراض پر غور کریں تو پوری سچائی سامنے آجائے گی۔ کمیشن کے

چیرمین وجاہت حبیب اللہ نے پریس کونسل آف انڈیا سے اپیل بھی کی ہے کہ میڈیا کے ذمہ داروں کو مشورہ دیا جائے کہ وہ خبروں کو جاری کرنے میں احتیاط سے کام لیں، اور اس طرح کی حساس خبروں کی نگرانی کی جائے جو ملک کے ایک بڑے طبقہ کے لئے غم وغصہ کا باعث بنتی ہیں۔ انہوں نے پریس کونسل آف انڈیا کو مشورۃً کہا ہے کہ جب تک قصوروار کی درست شناخت نہ کرلی جائے، اس وقت تک اس کو مجرم قرار نہ دیا جائے، کیونکہ ان کے نظریہ میں اکثر بے قصور مسلم نوجوانوں کو گرفتار کرلیا جاتا ہے اور پھر وہ برسوں جیلوں میں قید رہتے ہیں۔ واضح رہے کہ پریس کونسل آف انڈیا کی جانب سے بار بار تنبیہ کے باوجود صورت حال جوں کا توں برقرار ہے، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ کونسل کے پاس ایسے میڈیا گھرانوں کے خلاف سخت اقدامات کے اختیارات نہیں ہیں۔ کونسل کے چیرمین جسٹس کاٹجو نے کونسل کو بااختیار بنائے جانے کا مطالبہ بھی کیا ہے، لیکن ابھی ارباب اقتدار کی توجہ اس طرف مبذول نہیں ہوسکی ہے۔ میرا ماننا ہے کہ جس طرح کسی ملک میں اتحاد وسالمیت کے لئے صحافیوں کو مذکورہ امور کا دھیان رکھنے کی ضرورت ہے، اسی طرح امن عالم کے لئے بھی وہی اصول وضوابط ہیں۔ اگر کوئی سپر پاور اپنے مفادات کے حصول کے لئے اس کا غلط استعمال نہ کرے تو عالمی امن کو آئے دن جس طرح کے خطرات رہتے ہیں، وہ کسی حد تک کم ہوسکتے ہیں۔ تعمیری صحافت میں امن عالم کا راز مضمر ہے۔ اس پیشے سے وابستہ تمام صحافیوں کو اس کا ہر حال میں خیال رکھنے کی ضرورت ہے، ساتھ ہی جو میڈیا گھرانے ہیں، وہ صحافت کے تعمیری پہلو سے کسی بھی حال میں سمجھوتہ نہ کریں، اس کے علاوہ وہ طاقتیں جو صحافت کے لئے ضابطۂ اخلاق تو بناتی ہیں لیکن خود عمل نہیں کرتیں، وہ بھی امن عالم کے وسیع مقاصد کے پیش نظر اس کا ضرور خیال رکھیں۔ اس لئے کہ اب میڈیا کا دائرہ کافی وسیع ہوچکا ہے، پل بھر میں کیا سے کیا ہوسکتا ہے۔

(مضمون نگار صحافی اور روزنامہ انقلاب دہلی کے ایڈیٹ انچارج ہیں)

☆☆

الیکٹرانک میڈیا اور مسلمانوں کی ذمہ داری

● محمد جاوید

میڈیا کے متعلق یہ بات مسلمانوں کے ذہن میں بہت ہی عام ہے کہ یہ اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے میں بڑے کارآمد ثابت ہوئے ہیں اور ان کا سوتیلا رویہ اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ آج بھی جاری وساری ہے۔ جس میں مسلمان حق بجانب بھی ہیں، لیکن دوسری طرف میڈیا جب اسلام کے خلاف کوئی بات نہ کہے تب بھی دنیا میں بدعقیدگی اور گمراہی کو عام ہی کر رہا ہے، کیونکہ ٹی وی اور ریڈیو پر نشر کی جانے والی فحاشیاں اور گمراہیاں ہر گھر میں انہی کے ذریعہ عام ہورہی ہیں۔ کہیں سننے میں آتا ہے کہ فلاں لڑکا کسی لڑکی کو لے کر بھاگ گیا۔ کہیں یہ سننے میں آتا ہے کہ پچپن سال کے بوڑھے نے ایک کمسن بچی کی عصمت دری کی۔ آخر یہ سب کیوں ہورہا ہے؟ وجہ صرف یہ ہے کہ ٹی وی وغیرہ پر دیکھ اور سن کر ہی ایک انسان یہ سب سیکھتا اور کرنے کی کوشش کرتا ہے اور گرچہ یہ دکھنے میں مسلمانوں کے خلاف سازش نہیں لیکن اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے اس لئے زیادہ ضروری ہے کہ مسلمان اس کی روک تھام کے لئے کچھ اسی طرح کا سہارا لیں۔ اس لئے کہ جس سطح پر دشمن فحاشی پھیلا رہا ہے اس سے کہیں زیادہ اس کی روک تھام ہو اور مسلمان تو خیر امت ہے اور اس عہدہ کا پہلا فریضہ **امر بالمعروف و نہی عن المنکر** ہے۔

اس مختصر سی تمہید میں ہم نے تین نکات دیکھے:

(۱) میڈیا کا اسلام کو بدنام کرنے میں بہت ہی اہم رول رہا ہے۔

(۲) میڈیا بدعقیدگی اور فحاشی کو عام کر رہا ہے۔

(۳) ضروری ہے کہ مسلمان میڈیا کو اپنے استعمال میں لائیں۔

اول الذکر پر بے شمار لوگوں نے باتیں کی اور لکھا ہے کہ میڈیا کا رویہ اسلام کے ساتھ کیسا رہا ہے، لیکن الیکٹرانک میڈیا جس طرح سے فحاشی اور بدعقیدگیوں کو پھیلا رہا ہے۔ اسے بھی دور کرنا اشد ضروری ہو گیا ہے کیونکہ میڈیا کی ضرورت آج ہر انسان کو ہے۔ اس کے ذریعہ دلچسپ اور آسان انداز سے معلومات میں اضافہ بھی ہوتا ہے جو کہ بچوں اور بڑوں کے ذہن نشین ہو جاتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ فحاشی بھی ہوتی ہے جسے دیکھنا بھی مشکل ہے بالخصوص ایک مسلمان جو کہ خیر امت کا دعوے دار اور مستحق ہے تو وہ اپنے اس عہدہ کی ذمہ داری اسی وقت پوری کر سکتا ہے جب کہ وہ فحاشی پر خاموشی نہ اختیار کرے بلکہ اس کی روک تھام کرے اور اسلام پر ہونے والی تہمت تراشیوں کا کھل کر جواب دے لیکن روک تھام اور جواب کے لئے خود اس کے پاس کوئی ایسا ذریعہ یا طاقت ہونی چاہئے جو کارآمد ثابت ہو اور وہ طاقت یقیناً میڈیا ہی ہے بالخصوص الیکٹرانک میڈیا۔

یہاں یہ بھی جاننے کی ضرورت ہے کہ آخر الیکٹرانک میڈیا میں کیا چیز ہے جس بنیاد پر ہر انسان اسی کی بات کو صحیح اور درست سمجھتا ہے اور اسی کے فیصلہ کو حتمی اور آخری جانتا ہے۔ یہ جاننے اور مسلمانوں میں الیکٹرانک میڈیا کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے ہمیں الیکٹرانک میڈیا کے اصلی چہرہ کو دیکھنا ہوگا جس کے بغیر ہم نہ اس کی اصلیت کو جان سکتے ہیں اور نہ ہی اس کی ضرورت کو محسوس کر سکتے ہیں۔

میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا:

و یکی پیڈیا کے مطابق معلومات کو جمع کرنا اور ان کی ترسیل کے ذرائع کو میڈیا کہا جاتا ہے، جس میں کئی ساری چیزیں آجاتی ہیں مثلا: صحافت، خطابت، اشتہارات اور خبریں

پہنچانے کے ذرائع اور یہ تمام چیزیں موجودہ دور میں کئی طریقوں سے استعمال کی جا رہی ہیں۔ مثلاً: پرنٹ میڈیا جس میں روزنامے، ماہنامے اور دیگر طباعتی کتب اور کتابچہ شامل ہو جاتے ہیں تو وہیں موجودہ دور کا سب سے کارگذار اور سودمند ذریعہ ترسیل واشاعت الیکٹرانک میڈیا ہے جس میں شامل ہیں ریڈیو، ٹی وی، انٹرنیٹ اور سی، ڈی، ڈی وی ڈیز وغیرہ۔

ایک آدمی جو پڑھنا لکھنا جانتا ہو اس کے لئے تو پرنٹ میڈیا بہت ہی فائدہ مند ہوتا ہے، لیکن دیگر افراد جنہیں پڑھائی اور لکھائی سے کوئی شغف اور واسطہ نہیں پرنٹ میڈیا ان کے لئے صفر برابر فائدہ مند ہوتا ہے، وہیں الیکٹرانک میڈیا دونوں طرح کے افراد کے لئے بہت ہی سودمند اور کارآمد ثابت ہوتا ہے اور وہ کئی طرح سے عوام کے لئے فائدہ مند ثابت ہوتا ہے:

جیسے ایک انسان جو پڑھنا لکھنا نہیں جانتا وہ خبروں کو سن اور دیکھ کر سمجھ جاتا ہے کہ کیا ماحول ہے اور دنیا میں کیا چل رہا ہے۔ ساتھ ساتھ لوگوں کے لئے الیکٹرانک میڈیا نے کئی آسانیاں بھی کر دی ہیں: مثلا وہ شخص جو پڑھنا لکھنا جانتا ہے لیکن اس کے پاس اتنا موقع نہیں ہوتا کہ وہ کسی کتاب کو پڑھے اور اکثر لوگوں کے سامنے سفر کی دشواریاں درپیش ہوتی ہیں جس میں وہ کسی کتاب کا مطالعہ تک نہیں کر سکتے۔ لہذا ایسے وقت میں الیکٹرانک میڈیا مثلاً: ٹی وی (جو کہ جگہ جگہ بس اور اسٹیشنوں پر نصب کی جا چکی ہیں) ریڈیو، ایف ایم، سی ڈیز، ڈی وی ڈیز اور ایم پی تھری زان تک خبریں پہنچانے، دنیا کے حالات سے باخبر کرنے اور علم میں اضافہ کا ذریعہ بنتے ہیں۔

آج کا ماحول بھی یہی بن گیا ہے کہ لوگ پڑھنے سے زیادہ سننے اور دیکھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس طرح ان کا اپنا ذاتی کام بھی انجام پذیر رہتا ہے اور دنیا کی خبریں اور لطف اندوزی کے سامان بھی ان کے لئے ریڈیو اور ٹی وی مہیا کرتے رہتے ہیں، چونکہ اخبارات اور مجلّات پر بہت ہی کم افراد نظر ڈالتے ہیں اسی وجہ سے اکثر لوگ الیکٹرانک میڈیا جو کچھ

کہتا ہے اسی پر بھروسہ کر کے بیٹھ رہتے ہیں۔ اور لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ جو کچھ میڈیا میں سنایا اور دکھایا جارہا ہے وہی سچ اور حقیقت ہے۔

قارئین کرام! الیکٹرانک میڈیا یعنی وہ آواز جس کی ہر پکار پر دنیا والے لبیک کہہ اٹھتے ہیں اس کی عام مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں ہر انسان کو اپنائیت محسوس ہوتی ہے۔ ایک عام آدمی بھی بات کرتا ہے بولتا ہے اور الیکٹرانک میڈیا بھی بولتا ہے۔ اور اسی اپنائیت کی وجہ سے یہ لوگوں کو حق بجانب بھی لگتا ہے۔ اس وجہ سے بھی اسلام نے بولنے اور زبان کی حفاظت کی سخت تاکید کی ہے اور اس کی حفاظت نہ کرنے کی بنیاد پر سخت عذاب کی دھمکی دی ہے۔ جب کہ پرنٹ میڈیا یعنی کتابت اور قرات (پڑھنے) ہر کسی کو نہیں آتی اور جن لوگوں کو آتی ہے ان میں سے بھی ہر ایک کو ان سے دلچسپی نہیں ہوتی بلکہ کئی افراد صرف سننے اور دیکھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ وجہ صرف یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے دو کام ایک ساتھ ہوجاتا ہے۔ پہلا جو ذاتی کام ہو وہ بھی اپنے انجام تک بآسانی پہنچ جاتا ہے اور دوسرا الیکٹرانک میڈیا علم اور خبروں سے بھی نواز دیتا ہے۔

اور اسی چیز کو مدنظر رکھتے ہوئے غیر قوموں نے اس کے اندر قدم رکھا اور ترقی حاصل کی اور جس چیز سے ان کے ذاتی مفاد اور ان کے آبائی دین کو خطرہ نظر آیا اسے ان لوگوں نے بدنام کرنا شروع کیا اور یقیناً ان کے لئے خطرہ اسلام ہی تھا کیونکہ اسلام دیگر مصنوعی اور تحریف شدہ ادیان کی طرح کسی سے گناہ اور برائی میں سمجھوتہ کرتا ہے اور نہ ہی اپنے ماننے والوں کو اس کی اجازت دیتا ہے۔

ہندوستانی الیکٹرانک میڈیا

آج ہندوستانی الیکٹرانک میڈیا میں ہر مذہب اور دین کے ماننے والے موجود ہیں اور وہ اپنی تعلیمات کو الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ عام بھی کر رہے ہیں۔ آپ کو ہندوستانی

میڈیا میں ہر مذہب کا چینل نظر آئے گا، لیکن سب سے سچا اور حق مذہب اسلام کی تشہیر کے لئے کوئی چینل اب سے تقریباً پانچ سال پہلے تک نظر نہیں آتا تھا اب نظر آنا شروع بھی ہوا تو کہیں اپنوں نے بند کرادیا کہیں غیروں نے۔

چونکہ موضوع الیکٹرانک میڈیا اور ہندوستانی مسلمانوں میں دعوت سے متعلق ہے اس لئے ہماری زیادہ تر نظر ہندوستانی میڈیا پر ہوگی۔ ہم ہندوستانی میڈیا پر نظر دوڑائیں کہ اس میں دکھایا کیا جاتا ہے۔

ا: کہیں اسلام کو بدنام کرنے کی خاطر الگ الگ حربہ اپنائے جارہے ہیں، مثلاً: اگر کہیں بم بلاسٹ ہوتو فوراً اسلامی تنظیموں کی فہرست سے نیوز چینلوں کو مزین کردیا جاتا ہے، لیکن جیسے ہی یہ انکشاف ہوتا ہے کہ کام کسی ہندو تنظیم کا ہے تو فورا "مائی نیم از خان" کی نیوز ''بریکنگ نیوز'' بن جاتی ہے۔ اگر کوئی عام مسلمان چار شادی کرے تو بطور عیب اسے دکھایا جاتا ہے، لیکن جب کوئی مشہور غیر مسلم نامور شخصیت دس دس رکھیل رکھے تو اس کا کوئی چرچا نہیں ہوتا بلکہ کبھی کبھار تو رکھیلوں کے لئے وہ باعث فخر بنا دیا جاتا ہے۔ جب کسی مسلمان کو بڑے جرم کے تحت گرفتار کیا جاتا ہے تو اسے سبھی دہشت گرد تنظیموں کا دوست اور رشتہ دار بنا دیا جاتا ہے لیکن جب دو یا تین دنوں بعد یہ انکشاف ہوتا ہے کہ سب جھوٹ تھا اور اس کی برات کا حکومت اعلان کر دیتی ہے تو اسے بریکنگ نیوز نہیں بلکہ یا تو دکھایا ہی نہیں جاتا یا پھر فٹ لائن نیوز (footlinenews) میں دو یا تین مرتبہ دکھا کر معاملہ کو ختم کر دیا جاتا ہے، بلکہ کبھی کبھار تو مجرم اور بم بلاسٹ کرنے والا غیر مسلم نکلتا ہے، لیکن اس خبر کو ختم کر دیا جاتا ہے یا اس شخص کو مسلمان بنا دیا جاتا ہے گرچہ وہ ہندو ہی ہو۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ساری دنیا یہی سمجھتی ہے کہ ہمیشہ مسلمان ہی ایسے کام کرتے ہیں اور وہی دہشت گرد ہوتے ہیں۔ مسلمان اسی طاقت سے جواب نہیں دیتے اور خود کے گلے میں بدنامی کا طوق ڈال لیتے ہیں۔ اگر جواب دیا بھی جاتا ہے تو اردو اخبارات اور مجلوں میں جسے ایک مسلمان

کے علاوہ کوئی اور نہیں پڑھتا اور مسلمان جواب دے کر اور خود ہی پڑھ کر خوش ہوتے ہیں۔

۲: تو کہیں گھریلو ماحول پر منحصر پروگرام بنائے جاتے ہیں جس میں عورتوں کی آپسی لڑائی جھگڑے اور میاں بیوی کے درمیان اختلاف کیسے بڑھے؟ دکھائے جاتے ہیں

حالانکہ ظاہری مقصد روک تھام ہوتا ہے، لیکن جس انداز سے دکھایا جاتا ہے لوگ سدھرنے کے بجائے اور زیادہ بگڑ جاتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ آپ زنا کے روک تھام کے لئے زنا کر کے لوگوں کو دکھائیں لیکن موجودہ الیکٹرانک میڈیا کا طریقہ یہی بن گیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ دیکھیں، ہماری ٹی آر پی بڑھے، اس لئے مرچ مسالہ بھی لگا دیا جاتا ہے کیونکہ موجودہ میڈیا کا مقصد برائی کو روکنا اور فحاشی کو ختم کرنا نہیں بلکہ فحاشی کو بڑھانا اور پیسہ کمانا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو یہ آیت موجودہ میڈیا پر کھری اترتی ہے کہ

"انّمَا جَزَاءُ الّذِينَ يُحَارِبُونَ اللهَ وَرَسُولَهُ"

میں میڈیا کا پہلا چہرہ داخل ہوجاتا ہے جو اسلام یعنی اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور

" وَيَسعَونَ فِى الارضِ فَسَادًا "

میں میڈیا کا یہ چہرہ اور آگے ذکر ہونے والا چہرہ شامل ہوجاتا ہے۔ اور ان کے لئے سزا بھی اللہ نے سخت متعین کر دی کہ انہیں قتل کر دیا جائے یا سولی دے دی جائے یا پھر ان کے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹ دیئے جائیں یا پھر شہر بدر کر دیا جائے۔ یہ تو ان کے لئے دنیاوی سزا اور رسوائی ہوئی،'' لیکن آخرت میں بھی اللہ نے ان کے لئے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ جیسا کہ اگلا ٹکڑا اسی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

"وَلَهم فِي الآخِرَةِ عَذَاب عَظِيم " (سورہ مائدہ: ۳۳)

اس میں وہ پروگرام اور سیریلس بھی آجاتے ہیں جن میں فحاشی اور ننگے پن کو کھلے طور سے دکھایا جاتا ہے جسے بچے اور والدین ایک ساتھ مل کر دیکھتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچی

بڑی ہو کر اپنے بوائے فرینڈ کو اپنے ساتھ گھر میں لے آتی ہے جسے کئی والدین فیشن اور آزادی کا نام دیتے ہیں تو کئی بول نہیں پاتے کیونکہ یہ تربیت بچوں نے اپنے والدین کے ساتھ دیکھ کر ہی پائی ہے۔ تو وہیں غریبوں کی عزت کو سربازار ریلیٹی شو کے نام پر خریدا اور بیچا جاتا ہے۔ ان کی نجی زندگی میں جھانک کر میاں اور بیوی میں طلاق کرانا اور کسی کو پھانسی پر چڑھا دینا یہ ریلیٹی شو کی خصوصیات رہی ہیں۔ '' آپ کی کچہری'' کے نام پر خاندانی فسادات اور جھگڑوں کو انصاف دلانے کے نام پر ساری دنیا کے سامنے ان کی عزت کو نیلام کر دیا جاتا ہے۔ کیا ضروری ہے کہ انصاف دنیا کے سامنے ذلیل کر کے اور دنیا کے سامنے لڑا کر دلایا جائے؟

۳: الیکٹرانک میڈیا یہ بدعقیدگی کو پھیلانے اور بچوں کے ذہن کو کفر وشرک سے بھرنے کا آسان ذریعہ ہے۔ ہم بچوں کے لئے آنے والے کارٹونز اور پروگرامس پر غور کریں کہ ان میں دکھایا کیا جاتا ہے؟ ہنومان، رام اور کرشن کی اسٹوری کارٹونز میں دکھائی جاتی ہیں اور کارٹون کے نام پر فحاشی بچوں کو دکھائی جاتی ہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

''کہ ہر بچہ کی پیدائش فطرت یعنی اسلام پر ہوتی ہے لیکن اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ (بخاری، مسلم)

اس حدیث کا معنی محدثین اور شارحین حدیث نے یہ بیان کیا ہے کہ مثلاً اگر یہودی کے گھر بچہ پیدا ہو تو وہ فطرت اسلام پر ہی رہتا ہے اس کے اندر ابتداءً اسلامی تعلیمات ہی اللہ رب العالمین کی طرف سے داخل کی جاتی ہیں، لیکن جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا جاتا ہے اور اس کے یہودی والدین اسے یہودیت کی تعلیم دیتے رہتے ہیں اور جب وہ بڑا ہوتا ہے تو بالآخر وہ یہودی بن جاتا ہے، لیکن موجودہ دور میں ٹی وی اور ریڈیو کے ذریعہ مسلمانوں کے بچے بھی ہندو، یہودی اور نصرانی بنتے جارہے ہیں وجہ صرف یہ ہے کہ والدین اپنے بچوں پر دھیان نہیں دیتے کہ ان کا بچہ کیا دیکھ اور سن رہا ہے۔ اور نتیجۃً بچہ بڑا ہونے کے بعد اگر کبھی مشکل

میں آجاتا ہے تو وہی شرکیہ کام کرتا ہے جو اس نے بچپن میں دیکھا اور سنا تھا۔اس طرح کی بد عقیدگیاں دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں انڈین چینلز میں زیادہ پائی جاتی ہیں۔

''پچھلے جنم کا راز'' کہہ کر کس طرح سے پنر جنم کو سچ ثابت کرنے پر لگا ہوا ہے اور یہ سیریلس ہندو اور مسلمان سبھی دیکھتے ہیں کئی ایسے مسلمان بھی دیکھتے ہیں جو اسلام کی تعلیمات سے دور اور غیر مسلم ماحول سے قریب ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جب بات آئے گی تو اس پروگرام کو بطور دلیل پیش کر کے ایک غیر مسلم کم علم مسلمان کے سامنے پنر جنم کو سچ ثابت کر دے گا۔

وہیں ہم کرشچین اور ہندو چینلز کو دیکھیں کہ وہ ہیلینگ (Healing) اور ذہنی سکون کے نام پر اپنی گمراہ تعلیمات لوگوں میں عام کر رہے ہیں۔

یہ تھی الیکٹرانک میڈیا کی ایک مختصر سی زہریلی تصویر کہ کس طرح سے میڈیا اسلام کو بدنام، بدعقیدگی اور فحاشی کو عام کر رہا ہے۔اسی کے ذریعہ بڑھائی گئی آزادی نے آج یہ ماحول بنا دیا ہے کہ آپ کو دس میں سے ایک رکشہ ایسا بھی نظر آئے گا جس میں ایک دیہاتی ڈرائیور جو کہ گھر والوں سے دور کمانے آیا ہے شیشہ میں سے کسٹمر سیٹ پر ہو رہے آزادی کے نام پر ہو رہی زناکاری کو دیکھ کر خود بھی فحاشی کے اڈوں اور طوائف خانوں پر جا کر اپنی محنت سے کمائی ہوئی رقم کو برباد کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور گاؤں میں بیٹھا اس کا مقروض کسان باپ قرض نہ ادا کر پانے کی بنیاد پر خودکشی کر لیتا ہے۔ہم نے اب تک دیکھا کہ کس طرح سے میڈیا بدعقیدگی پھیلا رہا ہے، آزادی کے نام پر زناکاری اور ایڈس عام کر رہا ہے۔گھریلو اختلافات کے حل کی بجائے گھریلو مشکلات کو بڑھاوا دے رہا ہے اور یہی میڈیا ہے جو ایک طرف کسانوں پر ہو رہے ظلم کے خلاف آواز اٹھاتا ہے تو دوسری طرف کسانوں کو خودکشی پر مجبور کر رہا ہے۔ان سب کے علاوہ ہم ہمیشہ جو کچھ سنتے اور پڑھتے ہیں کہ میڈیا اسلام کی غلط تصویر عوام میں پہنچا رہا ہے وہ تو ایک واضح چیز ہے۔

اسی طرح ٹی وی پر آنے والے پروگرامز کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب کوئی بچہ ٹی وی پر بچپن سے بتوں کی پوجا ہوتے دیکھتے آتا ہے تو مکلّف ہونے کے بعد اسے بت پرستی دیکھ کر دل میں معمولی حرکت تک پیدا نہیں ہوتی، کوئی برائی محسوس نہیں کرتا اور یہی وجہ ہے کہ بیشتر مسلمان اپنی دعوتی ذمہ داری کو بھول چکے ہیں اور برائیوں کو دیکھ دیکھ کر سود اور شراب جیسی لعنت میں پڑے ہوئے ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کی دعوتی سرگرمیاں کیا ہیں اور کیا ہونی چاہئے؟

اب ایسے ماحول میں ضرورت ہے کہ مسلمان بھی اپنی دعوت عام کریں۔اپنی حقیقی اور صاف وشفاف تصویر دنیا کے سامنے پیش کریں اور ہو رہی بہتان تراشیوں کا کھل کر جواب دیں۔آپ کے ذہن میں آئے گا کہ ہم تو یہ سب کر رہی رہے ہیں...

ہاں! ہم جواب بھی دے رہے ہیں، اسلام کی سچی تصویر پیش بھی کر رہے ہیں اور دعوت الی اللہ کا کام بھی جاری ہے۔لیکن، کہاں...؟ جمعہ کی تقریروں میں جہاں سامعین صرف مسلمان ہی ہوتے ہیں، جلسہ اور اجتماعات میں جہاں مسلمانوں کے علاوہ کوئی نہیں آتا، اردو، اخباروں اور مجلّات میں جنھیں ہر انسان تو درکنار ہر مسلمان بھی نہیں پڑھ سکتا۔ ہماری مثال ایسی ہی ہے کہ انگریزی کے سوالیہ پرچہ کا جواب کوئی طالب علم دوسرے روز اردو کے جوابیہ پرچہ میں لکھ آئے، گرچہ اس نے انگریزی کے پرچہ میں کئے گئے سارے سوالات کا صحیح صحیح جواب لکھا ہو، لیکن اس نے جہاں جواب دینا چاہئے تھا وہاں جواب نہیں دیا تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہوگا۔الزام ہم پر الیکٹرانک میڈیا لگاتا ہے اور ہم جواب اپنے اسلامی جلسوں اور اردو میگزین اور اردو مجلوں میں دیتے ہیں۔

اس بات سے مجھے کوئی انکار نہیں کہ جلسہ اور جلوس کا یقیناً فائدہ ہوتا ہے اور جو جوابات ابھی جس طرح سے دیئے جا رہے ہیں ان سے مسلمانوں کو ضرور فائدہ ہوتا ہے اور کئی لوگ تو اپنے سے ملنے جلنے والے غیر مسلموں تک وہ جوابات پہنچا کر انھیں مطمئن بھی کر دیتے ہیں

لیکن وہیں لاتعداد افراد ایسے بھی ہیں جن کا کوئی ملاقاتی مسلمان نہیں اور کئی ایسے مسلمان ہیں جن کا تعلق کئی غیر مسلموں سے ہیں لیکن ان مسلمانوں کا تعلق اسلام سے نہیں بلکہ وہ اسلامی تعلیمات سے کوسوں دور ہیں۔ ایسے افراد تک اسلام کا پیغام پہنچانے کے لئے ہم نے کیا کیا جن کے ذریعہ اسلام کی غلط تصویر ٹی وی اور ریڈیو کے ذریعہ پہنچائی جارہی ہے۔ جسے دیکھنے اور سننے کے بعد تو کئی لوگ مسلمانوں سے ملنا جلنا بھی پسند نہیں کرتے۔ یہ سب باتیں واضح کررہی ہیں کہ مسلمانوں کو الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ اپنی دعوت کو عام کرنا ہوگا تب ہی جاکر اسلام کی سچی تصویر دنیا والوں کے سامنے نکھر کر آئے گی۔

ٹی وی:

الیکٹرانک میڈیا کا سب سے کارآمد جز ٹی وی ہے اور جب الیکٹرانک میڈیا کہا جائے تو سب سے پہلے لوگوں کے ذہن میں ٹی وی ہی آتی ہے۔ لہذا مسلمانوں کو اپنی دعوت عام کرنے کی خاطر مجلوں اور تقریروں سے آگے بڑھ کر اپنے کئی ٹی وی چینلز دنیا والوں کے سامنے پیش کرنے ہوں گے گرچہ کچھ گنے چنے چینلز آ بھی گئے ہیں جو حقیقت میں اردو چینلز ہیں، لیکن لوگ اسے اسلامی چینل سمجھتے ہیں اور وہ اسلام کے نام پر چلائے بھی جارہے ہیں، لیکن ان میں بھی بدعقیدگی اور فحاشی ہے۔ ایک دو چینلز ہے جو حق پرست اور حق شناس ہیں لیکن ان کی بھی کافی اصلاح کی ضرورت ہے اور جو چینلز صحیح تعلیم دے رہے ہیں تو اسے اپنے ہی بند کرادیتے ہیں، کیونکہ اس سے فرقہ پرست مولویوں اور درویشوں کے ذاتی مفاد اثر انداز ہوتے ہیں۔

ہمیں ایسے اسلامک چینلز تیار کرنے ہوں گے جن میں بچوں کے لئے پروگرامس ہوں جو انھیں لطف اندوز کریں اور ان کے علم میں اضافہ کا سبب بھی بنے۔ ورنہ بچے موجودہ کارٹون چینلز میں ہنومان اور رام کرشن کا ہی کارٹون دیکھیں گے جس کا نتیجہ کیا ہو رہا ہے ہم

نے دیکھ لیا۔ اسی طرح بڑی عمر والوں کے لئے اسلامی حدود میں رہتے ہوئے ایسے پروگرام تیار کئے جائیں جن میں اخلاقی، عبادتی اور معاملاتی طور طریقوں کو سکھایا گیا ہو۔ مثلاً: یوٹیوب پر شیخ ربیع بن ہادی المدخلی کی ویڈیو ہے جس میں دو کردار ہیں ایک شیخ خود ہیں اور دوسرا اونٹ کا چرواہا، اور ایک اونٹ۔ اونٹ کا چرواہا بتاتا ہے کہ اونٹ بیٹھتے وقت پہلے اپنا پیر رکھتا ہے پھر ہاتھ، اس کے بعد شیخ اونٹ کو بٹھانے کا حکم دیتے ہیں اور یہی سین میں یہی دکھائی دیتا ہے کہ اونٹ پہلے اپنا پیر رکھتا ہے پھر ہاتھ۔ اس کے بعد شیخ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پڑھ کر بتاتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا ہے کہ:

''جب تم میں سے کوئی سجدہ میں جائے تو اس طرح نہ بیٹھے جس طرح اونٹ بیٹھتا ہے۔''(ابوداؤد)

اور پھر شیخ خود سجدہ کرنے کا صحیح طریقہ کرکے دکھاتے ہیں کہ جب سجدہ میں جاؤ تو اس طرح سے سجدہ میں جاؤ۔ غرضیکہ دعوت کے لئے مسلمانوں کے کئی اسلامی چینلز ہونے چاہئے جس کے ذریعہ اسلام کی تعلیم عام ہو اور اسلام کی صحیح تصویر دنیا والوں کے سامنے جائے۔ اور اس کے تعاون کی خاطر الیکٹرانک میڈیا میں موجود جو مسلمان ہیں ان کی بھی ضرورت پڑے گی اور سب سے اہم اس کے چلانے کے لئے روپیوں کی ضرورت ہوگی جس کی خاطر قوم کے مالدار افراد کو حصہ لینا ہوگا تاکہ دعوتی کام میں جہاد بالاموال کا اجر انھیں بھی ملے اور کام بھی آسان ہو۔

ریڈیو:

الیکٹرانک میڈیا کا ایک حصہ FM اور ریڈیو بھی ہے جسے آدمی چلتے پھرتے استعمال کرتا ہے۔ یہ اسلام کو اتنا تو بدنام نہیں کرتے لیکن ہاں، مسلمانوں کے ذہن کو ذکر اللہ سے ضرور غافل کردیتے ہیں اور کافروں کو انہیں کی دھن میں رکھتے ہیں لہذا ان تک پیغام پہنچانا

ہو اور مسلمانوں کو دین پر ثابت رہنا ہو تو ہمیں ریڈیو چینلز بھی شروع کرنے چاہئے جس میں قرات کا مقابلہ، اسلامی سوال وجواب یعنی فقہ وفتاوی اور تقاریر کا سلسلہ شروع ہونا چاہئے۔ تاکہ غیر مسلم عوام اسلام کو راہ میں چلتے وقت بھی سمجھ سکے اور مسلمان اپنے آپ کو ذکر الٰہی میں مشغول رکھیں کیونکہ آج بچہ بچہ راہ میں FM اور ریڈیو ہی سنتا ہے جس میں گانے اور لو اسٹوری کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اسلامی ریڈیو چینلز تو کئی ملکوں میں ہے لیکن اس کی سخت ضرورت ہندوستان میں ہے تاکہ جو لوگ ریڈیو سنتے ہیں ان تک بھی اسلام کا پیغام پہنچے اور جو گانے اور غزلوں میں گم ہوکر ذکر اللہ سے غافل ہیں اور وقت گذاری کے لئے ریڈیو سنتے ہیں وہ بھی اپنے وقت کو شرعی حدود میں رہتے ہوئے گذاریں۔

سی ڈی، ڈی وی ڈی، موبائل اور ایم پی تھریز:

یہ الیکٹرانک میڈیا کا بہت ہی آسان اور سستا پہلو ہے جن کے ذریعہ آپ اسلام کی تعلیمات کو اپنے مسلم بعید از اسلام دوستوں کو اسلام سے قریب کر سکتے ہو اور غیر مسلموں تک اسلام کی دعوت پہنچا سکتے ہو کیونکہ ان کا استعمال تو ہر انسان کرتا ہی ہے اور اکثر لوگ اپنے غیر مسلم ساتھیوں کو سننے اور دیکھنے کے لئے کچھ نہ کچھ دیتے رہتے ہیں جس سے ان تک اسلام کی صحیح تصویر اور شکل پہنچتی ہے لیکن ابھی جتنا ہو رہا ہے بہت ہی کم ہے اسے اور عام کرنے کی ضرورت ہے۔

ٹی ایف ایل الف، ملٹی میڈیا کا آڈیو میگزین، اذان، بھی الحمد للہ اسی میڈیا کا ایک حصہ ہے اس کا ذکر میں نے اس لئے کیا کیونکہ یہ ایک انوکھے اور نئے انداز میں ہے اور میری سمجھ کے مطابق اسے کامیاب بنانا ایک چیلنج ہے کیونکہ عوام ہر ایک کی آواز کو پسند نہیں کرتی لہذا اس کے لئے مواد جمع کرنا بھی اس کے اراکین کے لئے ایک چیلنج ہوگا۔ اللہ انھیں اشاعت اسلام کی خاطر کئے جانے والے اور ہر جائز مقصد میں کامیاب کرے۔

مجموعہ القاسم: جلد پنجم
مسلم مسائل اور اس کا حل

اسی طرح اگر آپ کے پاس موبائیل ہے جس میں ویڈیو اور آڈیو کا فنکشن ہو تو جس طرح ٹرینوں اور بسوں میں لوگ گانے باجے بجائے بجا کر اپنے ساتھیوں کو محظوظ کرتے ہیں آپ اپنے غیر مسلم اور اسلامی بھائی کو کوئی قرات یا اسلامی بیان سنائیں یا پھر کوئی ایسا ویڈیو دکھائیں جو تخلیق الٰہی کی تعریف کے گن گاتا ہو۔ اس طرح آپ اپنے غیر مسلم اور اسلام سے دور مسلمان ساتھیوں تک اسلام کا پیغام سنا کر اور دکھا کر عام کر سکتے ہو، ورنہ Bluetooth کا فنکشن تو آج ہر موبائل میں عام ہو چکا ہے جس کے ذریعہ آپ کے پاس موجود کوئی اسلامی آڈیو یا ویڈیو کلپ اپنے دوست کو دے دیں تاکہ وہ بھی اسلام کی دو باتیں سن کر اس پر عمل کرنے لگے۔ یا اگر آپ کے پاس کمپیوٹر ہو تو اس کے ذریعہ آپ علماء کی تقاریر اور بیانات اپنے دوستوں کو MP3 / 4 / 5 یا Memory Card میں ڈاؤن لوڈ کر کے دے سکتے ہو۔ موبائل کے ذریعہ ایس ایم ایس اور آپ کے پاس بات کے لئے وقت ہو تو کم از کم دس بیس منٹ تک کسی غیر مسلم دوست سے اسلام کے متعلق باتیں کر لینا بھی دعوت الی اللہ کا بہترین ذریعہ ہے۔

انٹرنیٹ:

الیکٹرانک میڈیا کا یہ پہلو بہت ہی زیادہ مشہور اور اس کی بات دیگر الیکٹرانک میڈیا کے مقابلہ میں بہت ہی مقبول ہے۔ کئی مرتبہ تو مقررین اور مصنّفین اسی کا حوالہ دیتے ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا کے اس پہلو میں ہر چیز آجاتی ہے اگر آپ پڑھنا چاہتے ہیں تو آپ کے لئے انٹرنیٹ کافی ہے، اگر آپ سننا یا دیکھنا چاہتے ہیں تو بھی آپ کے لئے انٹرنیٹ کافی ہے۔ اگر آپ کسی سے بات کرنا چاہتے ہیں تو بھی آپ کے لئے انٹرنیٹ کافی ہے۔ اس پر بے شمار اسلامی ویب سائٹ موجود ہیں لیکن جو ہیں وہ کافی نہیں کیونکہ ان سے کئی گنا زیادہ ایسی ویب سائٹس ہیں جو اسلام کے خلاف کام کر رہی ہیں اور نہیں تو اکثر ویب سائٹ میں فحاشی بالکل عام ہے۔

یہ سب سے سستے (صرف ای میلس اور چیٹنگ کے ذریعہ) اور مہنگے (اسلامی ویب سائٹ تیار کر کے جس میں اسلامی آڈیو، ویڈیو اور اسلامی کتابیں ہر زبان میں اپلوڈ کر دی جائیں) ہر طرح سے ہم اس میں آ کر دعوت کا کام انجام دے سکتے ہیں۔ مثلاً: پال ٹالک میسنجر میں اپنا اسلامی روم بنا کر اور دیگر میسنجرس میں بات چیت (چیٹنگ) کے ذریعہ دعوت و تبلیغ کا کام کیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ مراٹھی یا کسی ہندوستانی زبان میں دعوت کا کام انجام دینے کے لئے اپنے آپ کو خاص کر لیں تو آپ کی دعوت ہندوستان میں ہوگی۔ ورنہ اس کے ذریعہ آپ پوری دنیا میں اپنا کام انجام دے سکتے ہو۔

اب تو کتابیں اور آڈیو، ویڈیو اپلوڈ مفت میں بھی ہوتے ہیں جن کے ذریعہ آپ اسلام کے پیغام کو بالکل آسانی کے ساتھ دنیا والوں تک پہنچا سکتے ہو۔ Orkut اور Facebook وغیرہ پر آپ اپنا ایک گروپ بنا کر ان میں دعوت وتبلیغ کا کام کر سکتے ہیں اور ہو بھی رہا ہے لیکن جتنا ہے وہ بہت ہی کم ہے اور جو ہے اس میں بھی کئی ایسے ہیں جو قرآن وحدیث سے کم یا نہ کے برابر باتیں کرتے ہیں، جس وجہ سے وہ ناقابل اعتماد سمجھے جاتے ہیں۔

غرضیکہ الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ دعوت کا کام بہت ہی آسانی اور شائستگی کے ساتھ انجام پا سکتا ہے ضرورت ہے صرف دعوت الی اللہ کا جذبہ رکھنے اور ساتھ ساتھ ہندوستانی عوام کی خیر خواہی کی سوچ رکھنے والوں کی۔

☆☆

میڈیا میں حقائق سے چشم پوشی کا رجحان!

● ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب

تفتیشی ایجنسیوں اور میڈیا کے طریقہ کار پر ملک کے انصاف پسند لوگوں کے ذریعہ اعتراضات کوئی نہیں بات نہیں ہے۔ بارہا اپنے فرائض کی تکمیل میں جانب دارانہ رویہ اختیار کرنے پر میڈیا کو منہ کی کھانی پڑی ہے۔ ماہرین، سماجی کارکن اور دانشوران نے بھی اس قسم کی اوچھی حرکت سے باز آنے کی میڈیا کو نصیحت کی ہے، مگر سنسنی پھیلانے اور عوام کی توجہ صرف اپنی جانب مبذول کرانے کی ہوڑ میں وہ اپنے فرائض کو طاق پر رکھ دیتے ہیں۔ تل کو تار بنا کر پیش کرنے میں ماہر الیکٹرانک میڈیا سے وابستہ افراد کا یہ رجحان خطرناک شکل اختیار کرتا جا رہا ہے کہ وہ سچائی کا سامنا نہیں کرنے سے ہچکچاتے ہیں، جب کبھی کوئی اہم واقعہ ان کی نظروں کے سامنے پیش آتا ہے تو بڑی چالاکی سے اپنی آنکھ موند لیتے ہیں، چونکہ وہ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایمانداری پر انہیں اپنے مالکوں کا انعام نہیں ملنے والا ہے تو پھر کیوں نہ وہ کام کیا جائے جس پر اس کی واہ واہی بھی ہو اور انعام بھی ملے، لیکن وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ اس کی پیش کش اور خبروں کی صداقت پر نہ جانے کتنے لوگوں کی نگاہیں ٹکی ہوئی ہیں اور وہ یہ آس لگائیں بیٹھے ہیں کہ شاید ان کی رپورٹ کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہو۔ مظلوم اور پریشان حال افراد کا کچھ بھلا ہو جائے اور ایسا چمتکار ہو کہ، قوم، سماج اور ملک کی تقدیر بدل جائے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا بھی ہے کہ برسوں سے دربدر کی ٹھوکریں کھاتے آرہے انسان کو میڈیا کے توسط سے مضبوط سہارا ملا ہے اور ان کی راہ میں

حائل مشکلات دور ہوئی ہیں۔ہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ ذرائع ابلاغ کی ترقی نے بدعنوانی اور کرپشن کے خاتمہ میں اہم رول ادا کیا ہے۔تاہم اس کے توسط سے در آنے والی فحاشی اور بے حیائی سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔گزشتہ دنوں ایک رپورٹ شائع ہوئی تھی جس میں ماہرین نے برملا یہ اعتراف کیا تھا کہ ٹی وی چینلوں کے توسط سے کھلے عام سیکس اور فحاشی کو دعوت دی جارہی ہے۔ پہلے جنسی جرائم کم ہوا کرتے تھے مگر ٹی وی چینلوں اور انٹرنیٹ وغیرہ نے جنسی مجرم تیار کرنے شروع کر دئے ہیں۔ٹی وی پر چلنے والے اشتہارات میں کنڈوم، جنٹس اسپرے اور مقوی دواؤں کو ان ذرائع کے ذریعہ لوگوں تک پہنچایا جارہا ہے وغیرہ۔

یہ ایک الگ موضوع ہے ہم یہاں میڈیا کے ان معاندانہ رویہ کا ذکر رہے ہیں جس کی وجہ سے ملک کے بیس کروڑ مسلمانوں کو ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے مسلمانوں کو جہاں ایک طرف نظر انداز کیا جارہا ہے وہیں دوسری طرف انہیں بدنام اور تشدد پسند ثابت کرنے کی مسلسل کوششیں جاری ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جب بھی کوئی ناگہانی واقع پیش آتا ہے تو میڈیا کی سب سے پہلے یہی کوشش ہوتی ہے کہ اس کا رخ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کی طرف موڑ دیا جائے۔گزشتہ ماہ جب دہلی ہائی کورٹ میں بم دھماکہ ہوا تو ایک ٹی وی کا صحافی بڑی شرمی سے خفیہ ایجنسی کے افسران سے یہ پوچھ رہا تھا کہ کہیں اس میں 'انڈین مجاہدین' کا تو ہاتھ نہیں ہے؟ یعنی میڈیا خبریں نشر کرنے کے بجائے باضابطہ کسی معاملے میں فریق بننے کوشش کرتا ہے۔جیسا کہ گزشتہ سال انا ہزارے کے انشن کے موقع پر دہلی میں دیکھنے کو ملا تھا۔رام لیلا میدان میں انا کے انشن کے دوران پرنٹ سے لیکر الیکٹرانک میڈیا کے ادنی سے لے کر اعلی صحافی، رپورٹر اور اینکر براجمان تھے۔رام لیلا میدان کے کس باتھ روم میں گندگی ہے، کہاں پانی کی کمی ہے، دوائیں اور کھانے وغیرہ میں کیا دشواری ہورہی ہے، احتجاج کاروں کونسی سہولیات دستیاب نہیں ہے۔انا کی ٹوپی، بنیائن، شرٹ، لڑکیوں کے جسم پر تحریر سلوگن وغیرہ

کو خوب دیکھایا گیا۔ایسی چیزیں وہ بریکنگ نیوز میں بھی دیکھا رہے تھے۔ملک میں اور کیا ہو رہا ہے اس سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔چنانچہ ہوا بھی یہی انا کے انشن نے کئی اہم مسائل کو دبا دیا۔مانسون اجلاس میں اقلیت سے متعلق ایشوز پر بحث نہیں ہوئی اس کے پیچھے بھی انشن کا جادو ہی رہا۔

بہت اچھی بات یہ ہے کہ اب حکومت اور ملک کا باوقار طبقہ اس بات کو سمجھنے لگا ہے کہ و اقعی مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے۔بم دھماکے اور کسی بھی دہشت گردانہ واقعے کے بعد پولیس اور خفیہ ایجنسیاں سب سے پہلے مسلمانوں کو اپنا نشانہ بناتی ہیں۔بغیر کسی ثبوت کے دن کے اجالے اور رات کے اندھیروں میں ان کے گھروں میں دبش دی جاتی ہے اور انہیں طرح طرح سے پریشان کیا جاتا ہے۔پہلے وزیر داخلہ پی چدمبرم نے اس طرف توجہ دیتے ہوئے پولیس اور تفتیشی ایجنسیوں کو باور کرایا کہ ایجنسیاں جانچ کا رخ صرف ایک فرقہ کی طرف نہ موڑیں۔اس لئے کہ ملک کے اندر کئی بم دھماکوں میں بھگوا دہشت گردی کا پردہ فاش ہو چکا ہے۔یہاں اس حقیقت کا تذکرہ بھی ناگزیر ہے کہ اس سمت میں سب سے پہلے اگر کسی افسر نے توجہ دی اور اس ٹریڈ کو بدلا جو پولیس افسران اور تفتیشی ایجنسیوں کا تھا تو اس کا سہرا مہاراشٹراے ٹی ایس کے چیف شہید ہیمنت کرکرے کے سر جاتا ہے۔بھگوا دہشت گردی کا جس جواں مردی سے انہوں نے انکشاف کیا آزاد ہندوستان کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔آج جو ملک کی مختلف جیلوں میں سادھوی پرگیا سنگھ، کرنل پروہت اور سوامی اسیمانند سمیت درجنوں ہندو انتہا پسند بند ہیں یہ سب مرحوم کرکرے کی دین ہیں۔بہت کم مدت میں ایمانداری سے اپنے فرض منصبی کو نبھاتے ہوئے انہوں نے بھگوا خیمے میں ہلچل مچادی، یہی وجہ ہے کہ انہیں اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ان سے قبل صرف مہاراشٹر میں نہ جانے کتنے بے قصور مسلم نوجوان بم دھماکوں کی وجہ سے جیل کی سلاخوں میں بھیجے جا چکے تھے، اور یہ سلسلہ ہنوز

جاری تھا۔ آفتاب عالم انصاری کو مسلسل 22 دنوں تک سی آئی ڈی اور ایس ٹی ایف کے افسران الٹا لٹکا کر پیٹتے رہے، کئی کئی دنوں تک سونے نہیں دیا گیا اور جب انہوں نیا پنا قصور جاننے کی کوشش کی تو یہ کہا گیا کہ بس ایک بار اتنا کہ دے کہ تو 'ہو جی' کا ایریا کمانڈر مختار عرف راجو بنگالی ہے۔ اتنا ہی نہیں پولس نے آفتاب عالم پر یہ بھی الزام لگایا تھا کہ اس نے بنگلہ دیش سے دہشت گردی کی ٹریننگ لی تھی اور اس کے بینک کے کھاتہ میں 6 کروڑ روپئے تھے۔ پولس تحویل میں اذیتیوں کی طویل داستان ہے۔ 2002 میں ممبئ کے گھاٹ کوپر علاقہ میں ایک بس میں ہوئے دھماکے کے بعد سافٹ وئر انجینئر خواجہ یونس کو اس کے گھر سے گرفتار کرلیا بعد میں پولس تحویل میں تشدد کے سبب اس کی موت واقع ہوگئی۔ جبکہ عدالت میں سماعت کے دوران انسپکٹر سچن وازے نے یہ بتایا کہ یونس اس کی تحویل سے فرار ہوگیا تھا۔ یہ اور بات ہے بعد میں حکومت نے اس کا اعتراف کرلیا کہ خواجہ کی پولس تحویل میں موت ہوئی تھی۔

پولس اور خفیہ ایجنسی کے افسران کو اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کو چھپانے کے لئے اس سے آسان کوئی راستہ نظر نہیں آتا کہ وہ چند بے قصور مسلم نو جوانوں کو پکڑ کر میڈیا کے روبرو دہشت گرد کی شکل میں پیش کردے، یا یہ کہہ کر اپنا پلہ جھاڑ لے کہ اس کے پیچھے پاکستان کی خفیہ ایجنسی آئی ایس آئی یا کسی دوسرے ملک کا ہاتھ ہے، لیکن یہ کھیل کب تک جاری رہتا۔ حکومت کی کافی فضیحت ہورہی تھی اس لئے جانچ کا طریقہ کار تبدیل کرنے کیلئے ایجنسیوں پر دباؤ ڈالا گیا اور کسی ایک فرقہ کو ٹارگیٹ بنانے پر سخت سرزنش کی گئی۔ گزشتہ ماہ قومی یکجہتی کی کانفرنس میں وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن نے بھی مسلمانوں کو ہراساں کئے جانے پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا اور تفتیشی ایجنسیوں کو متنبہ کیا کہ اپنے کام میں شفافیت برتیں اور بغیر ثبوت کے کسی کو پریشان نہ کیا جائے۔ وزیر داخلہ پی چدمبرم، وزیر اعظم کے بعد اب پریس کونسل آف انڈیا کے نئے چیئر مین جسٹس (ریٹائرڈ) مارکنڈے کاٹجو نے بھی اس امر کا

اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے کہ کہیں بھی دھماکہ ہوتا ہے تو بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے چند منٹوں میں اس کی ذمہ داری کسی مسلم تنظیم پر ڈال دی جاتی ہے، یہ کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے۔ انہوں نے میڈیا سے بیجا سنسنی پھیلانے سے اجتناب برتنے، اپنا احتساب کرنے اور ذمہ داری کے ساتھ کام کرنے کی اپیل کی۔ مختلف اخبارات و نیوز چینلوں کے مدیران ونمائندوں سے ایک غیر رسمی ملاقات کے دوران جسٹس کاٹجو نے کہا کہ بہت سارے لوگ، جن میں نہ صرف بااختیار لوگ بلکہ عام آدمی بھی شامل ہیں، یہ کہنے لگے ہیں کہ میڈیا غیر ذمہ دار ہو چکا ہے لہذا اس کو قابو میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا کہ آئین کے آرٹیکل (اے) (ا)۹۱ کے مطابق میڈیا کو اپنی بات کہنے کی آزادی حاصل ہے لیکن کوئی بھی آزادی مطلق نہیں ہوسکتی لہذا مناسب پابندیاں لگنی ہی چاہئے، کیوں کہ عوام تک سچی اور بامقصد باتیں پہنچانا میڈیا کا فریضہ ہے۔ میڈیا کے چند نقائص کی نشاندہی کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ میڈیا اکثر حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا کرتا ہے۔ جب کہیں کوئی دھماکہ ہوتا ہے تو محض چند گھنٹوں کے اندر بہت سارے ٹی وی چینل کسی مسلم تنظیم کا نام لے کر یہ کہنے لگتے ہیں کہ اس نے دھماکہ کی ذمہ داری قبول کی ہے۔ ای میل کوئی شرانگیز شخص بھی بھیج سکتا ہے۔ کیا اس طرح ٹی وی چینلوں اور اخبارات میں کسی ایک مخصوص فرقہ کو بلاتفتیش موردالزام ٹھہرانا مناسب ہے؟ میڈیا اکثر اصل مسائل سے پہلوتہی کر کے غیر ضروری مسائل پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔ ملک کے اصل مسائل میں غریبی، بے روزگاری، مکانات کی قلت اور طبی سہولیات کی عدم دستیابی ہے لیکن میڈیا ایسے معاملات کو اجاگر کرتا ہے جس سے عوام کا کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔ مثلا لیکمے فیشن ویک کے کوریج کیلئے 512 منظور شدہ صحافی موجود تھے۔ انا کے انشن کے دوران پوری میڈیا سمٹ کر رام لیلا میدان میں براجمان تھی۔ 24 گھنٹے صرف اور صرف ایک ہی خبر نشر کی جاتی رہی۔ میدان میں موجود چند ہزار افراد کو اس طرح پیش کیا گیا جیسے پورا ملک انا کے ساتھ ہو۔

میڈیا کا ایک پہلو تو یہ تھا جو رام لیلا میدان میں انا کے انشن کے موقع پر دیکھنے کو ملا اب اس کے دوسرے پہلو پر غور کریں جو انتہائی متعصّبانہ اور صحافت حقائق سے چشم پوشی کے مترادف ہے۔12 اکتوبر 2012 کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی کشن گنج شاخ کے جلد قیام میں ٹال مٹول کا مظاہرہ کرنے پر بہار کی نتیش حکومت کے خلاف تقریبا دو لاکھ سے زائد بہار، بنگال اور ملک کی دوسری ریاستوں کے عوام نے زبردست احتجاج کیا۔ بتایا جاتا ہے کہ ’اے ایم یو سینٹر نہیں تو حکومت نہیں، نتیش کمار زمین دو‘ جیسے نعروں سے پورا خطہ گونج رہا تھا۔احتجاج میں شامل جم غفیر سے ارریا، پورنیہ، کشن گنج اور کٹیہار کا پورا منظر بدلا ہوا تھا، قومی شاہراہ پر ٹریفک جام اور ریلوے سیکشن پوری طرح ٹھپ تھا۔صبح کے سات بجے سے رات کے گیارہ بجے تک انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر روئی دھاسہ کے تاریخی میدان میں موجود تھا، مگر افسوس صد افسوس کہ اتنے بڑے احتجاج اور نہایت ہی حساس موضوع کو قومی الیکٹرانک میڈیا نے یکسر نظر انداز کردیا۔اگر ذرائع ابلاغ نے خالص عوامی مفاد سے متعلق اس احتجاج کو بھرپور کوریج دیا ہوتا تو اس مظلوم قوم کا بھی کچھ بھلا ہوسکتا تھا، لیکن میڈیا کے اس دوہرے معیار کو کیا نام دیا جائے کہ ایک طرف تو انا جیسے لوگوں کیلئے ہر جگہ پلکیں بچھائے رہتا ہے اور دوسری طرف اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کے اہم ترین مسائل سے بھی چشم پوشی کی جاتی ہے۔

☆☆

میڈیا اور مسلمانوں کو درپیش چیلنج

● محمد علم اللہ اصلاحی

گزشتہ دو عشروں سے پوری دنیا پر الیکٹرانک میڈیا کی یلغار ہے، جس نے معاشرتی واخلاقی اقدار کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ اگرچہ اخبارات ورسائل میں بھی روز افزوں ترقی کا عمل جاری رہا لیکن نجی ٹی وی چینلوں نے اسلامی ثقافت پر گہری ضرب لگانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔اس سلسلہ میں ہم یہاں پر ایک انگریزی جریدہ میں شائع مضمون کا ایک اقتباس نقل کرتے ہیں۔

’’اسلام کے خلاف جنگ صرف فوجی میدان میں نہیں ہوگی بلکہ ثقافتی اور تہذیبی میدان میں بھی معرکہ آرائی ہوگی۔ امریکی فلمی مرکز ہالی ووڈ اسلام مخالف سازشوں کا مرکز گردانا جاتا ہے۔ ایک صدی سے زائد مدت سے یہاں فلموں کے ذریعے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت وکدورت، بغض وکینہ پوری دنیا میں پھیلایا جارہا ہے۔ بیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں میں ہالی ووڈ نے مسلم دشمنی پر مبنی فلمیں ’ڈیلٹا فورس‘، ’انتقام‘، ’آسمان کی چوری‘ بنائیں، جب کہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کا تجرباتی ڈراما اسٹیج کرنے کے لیے ۱۹۹۲ء میں ’حقیقی جھوٹ‘ اور ’حصار‘ وغیرہ نامی فلمیں تیار کی گئیں، ان فلموں میں اسلام اور مسلمانوں کا تشخص بری طرح مجروح کیا گیا ہے۔‘‘

باطل نے دنیا بھر کی معیشت اور میڈیا پر اپنا قبضہ جما رکھا ہے، اسلام کے خلاف پروپیگنڈا مہم اس میڈیا کا مستقل موضوع ہے، کبھی مغربی ممالک کے اخبارات میں توہین

آمیز خاکے شائع کیے جاتے ہیں اور کبھی ہالینڈ میں قرآن اور اسلامی شعائر کے خلاف فلمیں بنائی جاتی ہیں۔ مغربی میڈیا وقتاً فوقتاً مسلمانوں کو 'دہشت گرد'، 'جہادی' اور 'بنیاد پرست' ثابت کرنے کے لیے اپنی مہم چلائے رکھتا ہے۔

حق کے خلاف باطل کا ایکا کوئی نئی چیز نہیں لیکن آج یہ اتنا نمایاں اتنا اس لیے ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کے فروغ نے دنیا کو 'عالمی گاؤں' بنادیا ہے۔ کسی کے دل میں یہ خیال آسکتا ہے کہ جس دنیا کو ہم اسلام مخالف بتارہے ہیں وہ تو حقوق انسانی کی پرچم بردار، فکر وعمل کی آزادی کی حامی، عالمی بھائی چارے اور جمہوریت کی داعی ہے، ہم اسے اسلام مخالف کیسے کہہ سکتے ہیں؟ جواب اس کا یہ ہے کہ نئی تہذیب کے خود فریب ترقی یافتہ انسان نے کائنات کے مرکز (نیوکلیس) سے خالق اور رب العالمین اللہ جل شانہٗ کو ہٹا کر اس کی جگہ 'مادہ' کو بٹھا رکھا ہے، وہ کہتا ہے کہ اول بھی مادہ تھا اور آخر بھی مادہ ہے، درمیان میں ترقی کے مختلف مراحل ہیں، انسان اس ترقی کا نقطۂ آخر ہے، جنت اور دوزخ جو کچھ ہے وہ انسان کی اسی زندگی میں ہے، زندگی ختم تو سب کچھ ختم، اب جتنی بھی اچھی کارآمد اور مثبت قدریں مثلاً وقت اور عہد کی پابندی وغیرہ ہمیں جدید مادی تہذیب میں نظر آتی ہیں وہ اس لئے نہیں کہ وہ بذات خود اچھی ہیں بلکہ صرف اس لئے کہ وہ فائدہ اور منافع میں اضافے کا باعث ہوتی ہیں، کسی غیر پیداواری سرگرمی، نیکی یا ہستی کی اس کمرشیل تہذیب میں کوئی گنجائش نہیں، اس تہذیب میں انسان کی حیثیت اس کے 'صارف' ہونے کی صلاحیت متعین کرتی ہے، جو جتنا بڑا صارف ہے یا جتنا زیادہ صرف کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے وہ اتنا ہی بڑا ہے، جو قوت خرید ہی نہیں رکھتا اس کی کوئی ضرورت نہیں اسے مرنے کے لئے چھوڑ دیا جائے گا، انفاق اور ایثار کی اس تہذیب میں اس لئے کوئی ضرورت نہیں کہ یہ دونوں غیر پیداواری سرگرمیاں ہیں، لہٰذا اس تہذیب میں حقوق انسانی، اخوت اور آزادی کا جو تصور ہے اس پر کوئی کنٹرول نہیں رکھا گیا ہے وہ مادر پدر آزاد اور بے لگام ہے، چوں کہ دنیا ایک بازار ہے اور انسان

محض ایک صارف، لہٰذا ہر چیز کو 'بازار' کی قوتوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا گیا ہے، یہ جو آج ہر طرف 'عالمی اقتصادی بحران' کا چرچا ہے یہ بھی دراصل ان ہی بازار کی قوتوں کا لایا ہوا ہے او رفی الواقع یہ اخلاقی اقدار کا بحران ہے اور میڈیا کی تشہیری جنگ اس کا سب سے بڑا اور مؤثر ہتھیار ہے، غالب کا یہ شعر:

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

موجودہ ذرائع ابلاغ پر پوری طرح صادق آتا ہے، ہمیں کتابوں میں پڑھایا جاتا ہے کہ ''میڈیا کا کام لوگوں کو سچ بتانا اور حقائق سے آگاہ کرنا ہے''، یہ بیان اس معنی میں غلط ہے کہ آج میڈیا کا استعمال حقائق کو آشکار کرنے سے زیادہ حقائق کو چھپانے یا توڑ مروڑ کر پیش کرنے یا جھوٹ کو پھیلانے کے لئے کیا جاتا ہے موجودہ میڈیا ہماری معلومات میں اضافہ کرنے سے زیادہ ہمیں بہکانے، ورغلانے اور مشتعل کرنے کے کام کرتا ہے۔ اور فی الواقع کمپین چلاتا ہے، آج پورا میڈیا اور اسے استعمال کرنے والی تمام سیاسی، سماجی اور اقتصادی طاقتیں ''اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ فِی الَّذِیْنَ آمَنُوْا'' (اہل ایمان کے اندر بداخلاقیاں پھیلیں) کے کام پر یعنی فواحش اور منکرات کے پھیلانے پر مامور ہیں، مادّہ کو اِلٰہ بنا لینے والی طاقتیں ہی آج میڈیا کو اخلاقی انارکی پھیلانے کا ہتھیار بنائے ہوئے ہیں، وہ ہمیں وہی بتاتے اور دکھاتے ہیں جتنا ان کی اسکیم میں فٹ بیٹھتا ہے، ہم اس پورے رویے کو اسلام مخالف یا غیر اسلامی اس لئے کہتے ہیں کہ اسلام ایمان بالغیب سے شروع ہوتا ہے، جب کہ وہ ہم سے کہتے ہیں کہ جتنا آنکھوں سے دیکھو بس اتنے ہی پر یقین کرو، دنیا کو سماجی اور اخلاقی کنٹرول سے آزاد کرنے کے لئے میڈیا کا کنٹرول انہوں نے اپنے ہاتھوں میں لے رکھا ہے۔

جب کہ اسلام انسان کے جذبات وخواہشات کو آزاد چھوڑتا ہے اور نہ عقل کو بے لگام

چھوڑ دینے کا قائل ہے، وہ نفس اور قلب کا تزکیہ کرتا ہے اور عقل کے سرکش گھوڑے کے منہ میں حکمت کی لگام دیتا ہے، لیکن مادی تہذیب حاضر نے عقل اور خواہشات کو بے لگام چھوڑ کر انسان کی مادر پدر آزادی کا تصور دے کر وسائل حیات اور وسائل ابلاغ دونوں کو اپنے قبضے میں کرلیا ہے اور اب اس کا ہدف خود 'حیات' پر کنٹرول حاصل کرنا ہے تاکہ موت کے خوف سے نجات مل سکے، مادی انسان آخرت پر یقین نہ رکھنے کے باوجود موت سے صرف اس لئے ڈرتا ہے کہ آخرت کا تصور موت کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے سے ہی وابستہ ہے، لہٰذا اس کا خیال ہے کہ جب وہ موت پر قابو پا جائے گا تو زندگی اپنے آپ اس کے 'اختیار' میں آجائے گی، چوں کہ یوم آخرت کا مالک وہی ہے جو زندگی اور موت کا مالک ہے، لہٰذا ان کا خیال ہے کہ آخرت کی پکڑ سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے وہ موت اور حیات کو پوری طرح اپنے قابو میں کرلیں، ایک طرف تو وہ زندگی کے راز کو جاننے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں اور دوسری طرف انہوں نے اس نظام فکر کے خلاف ہر طرح کی جنگ چھیڑ رکھی ہے جو ان کی شیطانی کوششوں میں رکاوٹ ڈال سکتا ہے، دنیا اسلام کی حقانیت سے باخبر نہ ہوسکے، اسی لئے انہوں نے 'لہوالحدیث' کا نظام رائج کر کے دنیا کو مجبور کردیا ہے کہ وہ پیسے خرچ کر کے گمراہی خریدے، اس مہم پر اتنا زور صرف اس لئے ہے کہ مسلمان پیسے خرچ کر کے کہیں قوت کا حصول نہ شروع کردے، کہیں وہ اپنی گاڑھی محنت کی کمائی رباط الخیل میں نہ لگادے، رباط الخیل اور قوت کے حصول کا معاملہ ان کے نزدیک اتنا اہم ہے کہ انہوں نے صرف لہوالحدیث ہی کے خریدنے کا انتظام نہیں کیا ہے بلکہ کوشش یہ کی ہے کہ انسان رزق حلال ہی سے پوری طرح محروم ہوجائے، کیوں کہ نہ رزق حلال ہوگا نہ مسلمان قوت اور رباط الخیل کے حصول کی طرف توجہ کرے گا، حرام مال کا مصرف اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتا ہے کہ صرف 'لہوالحدیث' کی خریداری کی جائے، جس کے متعلق اللہ تعالی اپنی مقدس کتاب قران مجید میں فرماتا ہے۔

''وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ.'' (انفال: ٦٠)

(اور تم جہاں تک تمہارا بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلے کے لئے مہیا رکھو، اس کے ذریعے سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعدا کو خوف زدہ کروگے جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔)

اس کی تفسیر میں مفسر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی اس کا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ اس تیاری کا مقصد بیان ہوا ہے کہ اللہ کے اور تمہارے دشمنوں پر تمہاری دھاک اور ہیبت قائم رہے کہ تمہیں نرم چارہ سمجھ کر کے وہ تم پر حملہ کرنے کی جرات نہ کریں۔ یہاں مسلمانوں کے تمام دشمنوں کو اللہ کا دشمن ٹھہرایا ہے اس لئے کہ مسلمانوں کی جنگ جس سے بھی تھی اللہ کے دین کے لئے تھی اس میں کسی اور چیز کا کوئی دخل نہ تھا۔''

مولانا مزید لکھتے ہیں:

''قرآن نے یہاں مزید مسلمانوں کو حاضر سے متعلق ہدایت دیتے ہوئے ان دشمنوں کی طرف بھی ایک اشارہ کردیا جو مستقبل قریب یا مستقبل بعید کے پردوں میں چھپے ہوئے ہیں تاکہ مسلمان دور تک نگاہ رکھ کر منصوبہ بندی کریں''۔

اس روشنی میں ہم کہ سکتے ہیں کہ آج کل میڈیا جو سامراجی حکمرانوں کا آلۂ کار ہو چکا ہے عوام الناس کے لئے مفید کم اور مضرت رساں زیادہ ہے بلکہ محض نقصان دہ ہے، مسلمانوں کے لیے تو موجودہ میڈیا کسی زہر ہلاہل سے کم نہیں، میڈیا پر حق و باطل اور مثبت ومنفی عناصر کا تناسب دس (١٠) اور نوے (٩٠) کے بقدر ہے، لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کی اس جانب سے غفلت کسی خوفناک مستقبل کا پتہ دیتی ہے۔

ایسے حالات میں مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ میڈیا کی اس انسانیت مخالف

تشہیری جنگ کے خلاف اقدام کرنے کی کوشش کریں، کیوں کہ اس کے ذریعہ ان کا مقصد ہی اسلام کو بدنام کرنے کی خاطر حربہ اپنانا، معاشرے میں بدتمیزی اور انارکی کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ بدعقیدگی اور کفر وشرک پھیلا کر اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنا ہے، یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں مختصراً میڈیا کی ایک جھلک قارئین سامنے پیش کردیں تاکہ اس کی تصویر مزید واضح ہوسکے۔

ا۔اگر کہیں بم بلاسٹ ہوتو فوراً اسلامی تنظیموں کی فہرست سے نیوز چینلوں کو مزین کردیا جاتا ہے، لیکن جیسے ہی یہ انکشاف ہوتا ہے کہ کام کسی ہندو تنظیم کا ہے تو فورا ''مائی نیم از خان'' کی نیوز ''بریکنگ نیوز'' بن جاتی ہے۔ اگر کوئی عام مسلمان چار شادی کرے تو بطور عیب اسے دکھایا جاتا ہے لیکن جب کوئی مشہور غیر مسلم نامور شخصیت دس دس رکھیل رکھے تو اس کا کوئی چرچا نہیں ہوتا بلکہ کبھی کبھار تو رکھیلوں کے لئے وہ باعث فخر بنادیا جاتا ہے۔ جب کسی مسلمان کو بڑے جرم کے تحت گرفتار کیا جاتا ہے تو اسے سبھی دہشت گرد تنظیموں کا دوست اور رشتہ دار بنادیا جاتا ہے لیکن جب دو یا تین دنوں بعد یہ انکشاف ہوتا ہے کہ سب جھوٹ تھا اور اس کی براءت کا حکومت اعلان کردیتی ہے تو اسے بریکنگ نیوز نہیں بلکہ یا تو دکھایا ہی نہیں جاتا یا پھر فٹ لائن نیوز میں دو یا تین مرتبہ دکھا کر معاملہ کو ختم کردیا جاتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھار تو مجرم اور بم بلاسٹ کرنے والا غیر مسلم نکلتا ہے لیکن اس خبر کو ختم کردیا جاتا ہے یا اس شخص کو مسلمان بنادیا جاتا ہے گرچہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہو۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ساری دنیا یہی سمجھتی ہے کہ ہمیشہ مسلمان ہی ایسے کام کرتے ہیں اور وہی دہشت گرد ہوتے ہیں، مسلمان اسی طاقت سے جواب نہیں دیتے اور خود اپنے گلے میں بدنامی کا طوق ڈال لیتے ہیں، اگر جواب دیا بھی جاتا ہے تو اردو اخبارات اور مجلوں میں جسے ایک مسلمان کے علاوہ کوئی اور نہیں پڑھتا اور مسلمان جواب دے کر اور خود ہی پڑھ کر خوش ہوتے ہیں۔

۲۔ کہیں گھریلو ماحول پر مبنی پروگرام بنائے جاتے ہیں جس میں عورتوں کی آپسی لڑائی

جھگڑے اور میاں بیوی کے درمیان اختلاف کیسے بڑھے؟ دکھائے جاتے ہیں، حالانکہ ظاہری مقصد ان مفاسد کی روک تھام ہوتا ہے لیکن جس انداز سے دکھایا جاتا ہے اس سے لوگ سدھرنے کے بجائے اور زیادہ بگڑ جاتے ہیں، ضروری نہیں کہ آپ زنا کے روک تھام کے لئے زنا کر کے لوگوں کو دکھائیں لیکن موجودہ الیکٹرانک میڈیا کا طریقہ یہی بن گیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ دیکھیں، ہماری ٹی آر پی بڑھے، اس لئے مرچ مسالہ بھی لگادیا جاتا ہے کیونکہ موجودہ میڈیا کا مقصد برائی کو روکنا اور فحاشی کو ختم کرنا نہیں بلکہ فحاشی کو بڑھانا اور پیسہ کمانا ہے، اگر غور کیا جائے تو یہ آیت موجودہ میڈیا پر کھری اترتی ہے:

''اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ'' (المائدہ: 33) ان کی سزا جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں،

میں میڈیا کا پہلا چہرہ داخل ہوجاتا ہے جو اسلام یعنی اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات کو بدنام کرنے کی کوشش کررہا ہے۔اور

''وَ یَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا'' (المائدہ: 33) اور زمین میں فساد مچاتے پھرتے ہیں۔

میں میڈیا کا یہ چہرہ اور آگے ذکر ہونے والا چہرہ شامل ہوجاتا ہے۔اور ان کے لئے سزا بھی اللہ نے سخت متعین کردی کہ

''اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ذٰلِکَ لَهُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ'' (المائدۃ: 33) یہ ہے کہ وہ قتل کردیے جائیں یا پھانسی چڑھادیے جائیں یا ان کے ہاتھ پیر مخالف سمتوں سے کاٹ دیے جائیں یا وہ ملک بدر کردیے جائیں، یہ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور ان کے لیے آخرت میں بڑا عذاب ہے۔

اس میں وہ پروگرام اور سیریلس بھی آجاتے ہیں جن میں فحاشی اور ننگے پن کو کھلے طور

سے دکھایا جاتا ہے جسے بچے اور والدین ایک ساتھ مل کر دیکھتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچی بڑی ہوکر اپنے بوائے فرینڈ کو اپنے ساتھ گھر میں لے آتی ہے جسے کئی والدین فیشن اور آزادی کا نام دیتے ہیں تو کوئی بول نہیں پاتے کیونکہ یہ تربیت بچوں نے اپنے والدین کے ساتھ دیکھ کر ہی پائی ہے۔

تو وہیں غریبوں کی عزت کو سر بازار ریلٹی شو کے نام پر خریدا اور بیچا جاتا ہے، ان کی نجی زندگی میں جھانک کر میاں اور بیوی میں طلاق کرانا اور کسی کو پھانسی پر چڑھا دینا یہ ریلٹی شو کی خصوصیات رہی ہیں، ''آپ کی کچہری'' کے نام پر خاندانی فسادات اور جھگڑوں کو انصاف دلانے کے نام پر ساری دنیا کے سامنے ان کی عزت کو نیلام کر دیا جاتا ہے، کیا ضروری ہے کہ انصاف دنیا کے سامنے ذلیل کر کے اور دنیا کے سامنے لڑا کر دلایا جائے؟

۳۔ میڈیا نے اس بدعقیدگی کو پھیلانے اور بچوں کے ذہن کو کفر و شرک سے بھرنے نمایاں کردار ادا کیا ہے، ہم بچوں کے لئے آنے والے کارٹونز اور پروگرامس پر غور کریں کہ ان میں دکھایا کیا جاتا ہے؟ ہنومان، رام اور کرشن کی اسٹوری کارٹونز میں دکھائی جاتی ہے اور کارٹون کے نام پر فحاشی بچوں کو دکھائی جاتی ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''ما من مولود الا یولد علی الفطرہ فابواہ یھودانه أو ینصرانه أو یمجسانه'' (بخاری: ۰۷۲۱، مسلم)

''ہر بچہ کی پیدائش فطرت یعنی اسلام پر ہوتی ہے لیکن اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں''۔

اس حدیث کا معنی محدثین اور شارحین حدیث نے یہ بیان کیا ہے کہ مثلاً اگر یہودی کے گھر بچہ پیدا ہو تو وہ فطرت اسلام پر ہی رہتا ہے اس کے اندر ابتداءً اسلامی تعلیمات ہی اللہ رب العالمین کی طرف سے داخل کی جاتی ہیں، لیکن جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا جاتا ہے اور اس

کے یہودی والدین اسے یہودیت کی تعلیم دیتے رہتے ہیں تو بالآخر وہ بڑا ہوکر یہودی بن جاتا ہے، لیکن موجودہ دور میں ٹی وی اور ریڈیو کے ذریعہ مسلمانوں کے بچے بھی ہندو، یہودی اور نصرانی بنتے جارہے ہیں وجہ صرف یہ ہے کہ والدین اپنے بچوں پر دھیان نہیں دیتے کہ ان کا بچہ کیا دیکھ اور سن رہا ہے اور بچہ بڑا ہونے کے بعد اگر کبھی مشکل میں آجاتا ہے تو وہی شرکیہ کام کرتا ہے جو اس نے بچپن میں دیکھا اور سنا تھا۔

ہم نے اب تک دیکھا کہ کس طرح سے میڈیا بدعقیدگی پھیلا رہا ہے، آزادی کے نام پر زنا کاری اور ایڈس عام کر رہا ہے، گھریلو اختلافات کے حل کی بجائے گھریلو مشکلات کو بڑھاوا دے رہا ہے اور یہی میڈیا ہے جو ایک طرف کسانوں پر ہو رہے ظلم کے خلاف آواز اٹھاتا ہے تو دوسری طرف کسانوں کو خودکشی پر مجبور کر رہا ہے۔ ان سب کے علاوہ ہم ہمیشہ جو کچھ سنتے اور پڑھتے ہیں کہ میڈیا اسلام کی غلط تصویر عوام میں پہنچا رہا ہے تو وہ ایک واضح چیز ہے۔

اسی طرح ٹی وی پر آنے والے پروگرامز کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب کوئی بچہ ٹی وی پر بچپن سے بتوں کی پوجا ہوتے دیکھتے آتا ہے تو مکلّف ہونے کے بعد اسے بت پرستی دیکھ کر دل میں معمولی حرکت تک پیدا نہیں ہوتی، کوئی برائی محسوس نہیں کرتا اور یہی وجہ ہے کہ بیشتر مسلمان اپنی دعوتی ذمہ داری کو بھول چکے ہیں اور برائیوں کو دیکھ دیکھ کر سود اور شراب جیسی لعنت میں پڑے ہوئے ہیں۔

اب ایسے ماحول میں ضرورت ہے کہ مسلمان بھی اپنی دعوت عام کریں، اپنی حقیقی اور صاف وشفاف تصویر دنیا کے سامنے پیش کریں اور ہو رہی بہتان تراشیوں کا کھل کر جواب دیں، آپ کے ذہن میں آئے گا کہ ہم تو یہ سب کر ہی رہے ہیں... ہاں! ہم جواب بھی دے رہے ہیں، اسلام کی سچی تصویر پیش بھی کر رہے ہیں اور دعوت الی اللہ کا کام بھی جاری ہے۔ لیکن، کہاں...؟ جمعہ کی تقریروں میں جہاں سامعین صرف مسلمان ہی ہوتے ہیں، جلسہ اور اجتماعات میں جہاں مسلمانوں کے علاوہ کوئی نہیں آتا، اردو اخباروں اور مجلّات

میں جنہیں ہر انسان تو درکنار ہر مسلمان بھی نہیں پڑھ سکتا، ہماری مثال ایسی ہی ہے کہ انگریزی کے سوالیہ پرچہ کا جواب کوئی طالب علم دوسرے روز اردو کے جوابیہ پرچہ میں لکھ آئے گرچہ اس نے انگریزی کے پرچہ میں کیئے گئے سارے سوالات کا صحیح صحیح جواب لکھا ہو، لیکن اس نے جہاں جواب دینا چاہیے تھا وہاں جواب نہیں دیا تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہوگا، الزام ہم پر الیکٹرانک میڈیا لگاتا ہے اور ہم جواب اپنے اسلامی جلسوں اور اردو میگزینس اور اردو مجلوں میں دیتے ہیں۔

اس بات سے مجھے کوئی انکار نہیں کہ جلسہ اور جلوس کا یقیناً فائدہ ہوتا ہے اور جو جوابات ابھی جس طرح سے دیئے جارہے ہیں ان سے مسلمانوں کو ضرور فائدہ ہوتا ہے اور کئی لوگ تو اپنے سے ملنے جلنے والے غیر مسلموں تک وہ جوابات پہنچا کر انھیں مطمئن بھی کردیتے ہیں لیکن وہیں لاتعداد افراد ایسے بھی ہیں جن کا کوئی ملاقاتی مسلمان نہیں اور کئی ایسے مسلمان ہیں جن کا تعلق کئی غیر مسلموں سے ہے لیکن ان مسلمانوں کا تعلق اسلام سے نہیں بلکہ وہ اسلامی تعلیمات سے کوسوں سے ہیں، ایسے افراد تک اسلام کا پیغام پہنچانے کے لئے ہم نے کیا کیا؟ جن کے ذریعہ اسلام کی غلط تصویر ٹی وی اور ریڈیو کے ذریعہ پہنچائی جارہی ہے، جسے دیکھنے اور سننے کے بعد تو کئی لوگ مسلمانوں سے ملنا جلنا بھی پسند نہیں کرتے، ایسے میں مسلمانوں کے اوپر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ میڈیا کی یلغار کا مقابلہ کرنے کے لیے جامع پالیسی تشکیل دیں، دنیا میں میڈیا سے وابستہ افراد کی فنی تربیت اور میڈیا کو عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ایسے معیاری 'میڈیا انسٹی ٹیوٹ' قائم کرنے بھی ضرورت ہے جو ایسے افراد تیار کرسکیں جو اسلامی تہذیب وثقافت کو پروان چڑھانے میں اپنا کردار ادا کرسکیں، الیکٹرانک میڈیا کے میدان میں پیش رفت کے لیے مؤثر اور جامع حکمتِ عملی کی ضرورت ہے، اسلامی تحریکیں، میڈیا، ادارے اور مسلم تنظیمیں ہر سطح پر اس کے لیے بھرپور کردار ادا کرسکتے ہیں، مسلم دنیا اگر مجوزہ سفارشات اور خطوط پر

منظّم اور احسن انداز میں اقدامات اُٹھائے تو امت مسلمہ میڈیا کے محاذ پر درپیش چیلنج کا بھرپور اور مؤثر جواب دے سکے گی، مسلمانوں کو مغرب کی اندھی تقلید اور نقالی نہیں کرنی چاہیے، ٹی وی ڈراموں میں اسلامی تاریخ وثقافت کو پروان چڑھانا چاہیے، اگر احساس زندہ ہوتو آج بھی مثبت اور تعمیری تفریح کو مسلم ممالک میں فروغ دیا جاسکتا ہے، تعمیری، اصلاحی، تاریخی اور معلوماتی پروگرام تیار کرنے کی ضرورت ہے، فلم کے میدان میں ایران نے خاصی ترقی کی ہے اور عالمی ایوارڈ بھی حاصل کیے ہیں، ایسی فلمیں جو اصلاح وتطہیر کا فریضہ انجام دیں اور جن کے ذریعے اسلامی معاشرے میں تعلیم وتربیت کا عمل بڑھ سکے ان کو مسلم ممالک میں رواج دینے کی ضرورت ہے۔

مغرب کی یہ حکمت عملی رہی ہے کہ وہ امتِ مسلمہ کے جذبات کو جانچنے کے لیے پرنٹ والیکٹرانک میڈیا میں ایشوز اٹھاتا رہتا ہے، اسلامی شعائر کی توہین کی جاتی ہے، تو مسلم دنیا میں احتجاجی مظاہروں کے ذریعے ہی ردِعمل سامنے آتا ہے، لیکن میڈیا کے ذریعے اس کا جواب نہیں دیا جاتا، مسلم دنیا کو الیکٹرانک میڈیا اور انٹرنیٹ پر اسلامی تشخص کو عام کرنے اور مغربی پروپیگنڈے کا مؤثر جواب دینے کے لیے اپنے دائرہ کار اور کاوشوں کو مؤثر اور منظّم انداز میں بڑھانے کی ضرورت ہے۔

مسلم ممالک اور مغرب میں موجود مسلم تنظیمیں بڑے محدود دائرے میں میڈیا کا کام کررہی ہیں، مغرب نے جس سطح پر میڈیا سے کام لیا ہے، وہ مغربی ایجنڈا دنیا پر مسلط کرنے کے لیے خاصا کارگر ثابت ہوا ہے، مسلم تنظیموں، اداروں اور تحریکوں کے لیے بے حد ضروری ہے کہ میڈیا کے لیے مناسب بجٹ مختص کریں، الیکٹرانک میڈیا بالخصوص ٹی وی چینلوں کو ہدف بنا کر کام کیا جائے، 'پروڈکشن ہاؤس' کے ذریعے اینکر پرسنز اور پروڈیوسرز کی تربیت کا بندوبست کیا جائے، آئندہ ۱۰ سال کا منظرنامہ سامنے رکھا جائے تو مسلم دنیا میں الیکٹرانک میڈیا میں ایسے افراد بڑی تعداد میں دستیاب ہوسکیں گے جو قومی اور دینی سوچ اور

نظریاتی شناخت کے حامل ہوں گے۔

مسلم ممالک میں تنظیموں اور اداروں کو 'میڈیا تھنک ٹینک' کا قیام عمل میں لانا چاہیے، ایسے 'میڈیا تھنک ٹینک' جو مغرب سے مکالمہ کرسکیں، امریکا اور یورپ کے 'میڈیا تھنک ٹینک' اسلام مخالف پروپیگنڈے میں پیش پیش ہیں، میڈیا تھنک ٹینک کے ذریعے مغربی پروپیگنڈے کا توڑ کیا جاسکتا ہے اور حالات وواقعات کی اصل تصویر دنیا کے سامنے پیش کی جاسکتی ہے۔

مسلم دنیا کے ذرائع ابلاغ کے منتظمین اپنی سطح پر محدود دائرے میں کام کررہے ہیں، مکمل ادراک (وژن) نہ ہونے اور مؤثر حکمتِ عملی سے تہی دامن ہونے کی وجہ سے اس کے اثرات صحیح طور پر مرتب نہیں ہورہے، مسلم ممالک کی تنظیموں، اداروں اور تحریکوں کے میڈیا سے متعلق افراد کے نیٹ ورک کو منظّم اور مربوط کرنے کی اشد ضرورت ہے جس کے لیے انٹرنیشنل میڈیا کانفرنس کا انعقاد کیا جائے، اگر عالم اسلام کی 'میڈیا کانفرنس' کا انعقاد ایک تسلسل سے ہو تو نہ صرف میڈیا کے میدان میں پیش رفت کا جائزہ لیا جاسکتا ہے بلکہ درپیش چیلنجوں کے لیے مؤثر حکمتِ عملی بھی تشکیل دی جاسکے گی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں الیکٹرانک میڈیا اور انٹرنیٹ کی ٹکنالوجی پھیلنے سے مطالعے کا رجحان کم ہوگیا ہے، اب لوگ ٹی وی چینلوں اور انٹرنیٹ کے ذریعے معلومات اور تفریح حاصل کرتے ہیں، ہندوستان سمیت مسلم دنیا کے لیے ناگزیر ہے کہ جدید ٹکنالوجی کے ذریعے دنیا بھر میں اسلام کے حقیقی پیغام کو عام کریں، اس مقصد کے حصول کے لیے جدید خطوط پر پروگراموں کی تیاری کے لیے 'پروڈکشن ہاؤس' بنانے چاہئیں۔ اس کی ایک کامیاب مثال TV Peace کی ہے، جہاں سے نشر ہونے والے پروگرام ہندوستان سمیت دنیا بھر میں بڑے پیمانے پر پھیل چکے ہیں، مختلف ممالک میں ایسے ٹی وی چینلوں کو قائم کرنے کی طرف توجہ دینے کی بھی ضرورت ہے جو معاشرے کی تعلیم و تربیت

اور شعور وآگہی کو پروان چڑھا سکیں۔

اسلامی دنیا میں میڈیا سے وابستہ افراد کی فنی تربیت اور میڈیا کو عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ایسے معیاری 'میڈیا انسٹی ٹیوٹ' قائم کرنے بھی ضرورت ہے جو ایسے افراد تیار کرسکیں جو اسلامی تہذیب وثقافت کو پروان چڑھانے میں اپنا کردار ادا کرسکیں۔

امریکا اور یورپ میں الیکٹرانک میڈیا کے میدان میں جدید ٹکنالوجی کا استعمال بڑھتا جارہا ہے، اب تو امریکا اور یورپ میں شہروں کی سطح پر حکومت اور این جی اوز کی سرپرستی میں پبلک براڈکاسٹنگ سنٹر بنائے جارہے ہیں، ان ٹریننگ سنٹروں میں میڈیا سے دلچسپی رکھنے والے افراد کو اینکر پرسنز، پروڈیوسرز، اسکرپٹ رائٹرز اور کیمرہ اور ایڈیٹنگ کی تربیت دی جاتی ہے، اس تناظر میں ہندوستان سمیت مسلم ممالک میں بھی ایسے پبلک براڈکاسٹنگ سنٹرز کا قیام ضروری ہے، ان نشری تربیتی مراکز سے بہترین اینکر پرسنز، پروڈیوسر اور دیگر باصلاحیت افراد تیار کیے جاسکتے ہیں جو مسلم دنیا میں گہرے شعور وادراک کے فروغ کے لیے کام کرسکیں۔

مغربی میڈیا کی جدید ٹکنالوجی کے جواب میں اگرچہ عالم اسلام میں بھرپور پیش رفت نہیں ہوسکی ہے، لیکن سعودی عرب، کویت، قطر اور ترکی نے میڈیا کے میدان میں پیش رفت کی ہے، انٹرنیٹ اور ٹی وی چینلوں کے ذریعے اسلام کی دعوت احسن انداز میں پیش کی جارہی ہے۔ تاہم مسلم ممالک میں جدید میڈیا ٹکنالوجی سے ابھی تک خاطر خواہ استفادہ نہیں کیا جاسکا، الیکٹرانک میڈیا کے میدان میں پیش رفت کے لیے مؤثر اور جامع حکمتِ عملی کی ضرورت ہے، اسلامی تحریکیں، میڈیا ادارے اور مسلم تنظیمیں ہر سطح پر اس کے لیے بھرپور کردار ادا کرسکتے ہیں۔ مسلم دنیا اگر مجوزہ سفارشات اور خطوط پر منظّم اور احسن انداز میں اقدامات اُٹھائے تو اُمت مسلمہ میڈیا کے محاذ پر درپیش چیلنج کا بھرپور اور مؤثر جواب دے سکے گی۔

☆☆

حکومت بھگوا دہشت گردوں کو گرفتار کرے

● مولانا سید ارشد مدنی

ملک کے ۲۵رکروڑ مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافی اور ظلم وزیادتی کے خلاف صدر جمعیۃ علماء ہند مولانا سید ارشد مدنی نے وارانسی میں ۱۹راپریل ۲۰۱۳ء کو ایک تاریخ ساز کانفرنس میں مرکزی اور یوپی صوبائی حکومتوں کو متنبہ کرتے ہوئے کہا کہ ملک کی سلامتی کے لیے اصل دہشت گردوں کی گرفتاری اور بے گناہوں کی رہائی ضروری ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ ملک کی فرقہ پرست طاقتیں دہشت گردی کو فروغ دے رہی ہیں اور حکومتیں سب کچھ جانتے ہوئے بھی بے گناہ مسلم نوجوانوں کو گرفتار کررہی ہیں جس کی وجہ سے ملک کا امن وامان خطرے میں پڑ گیا ہے، میں پورے یقین سے یہ بات کہتا رہا ہوں اور اب بھی کہہ رہا ہوں کہ ملک کا مسلمان دہشت گرد نہیں ہے، بلکہ دہشت گرد وہ طاقتیں ہیں جو ملک کو ہندو راشٹر بنانے کا خواب دیکھ رہی ہیں، اس لیے ایسی فسطائی طاقتوں کے خلاف سخت کارروائی کی جائے۔ ملک کے وزیر داخلہ سشیل کمار شندے کانگریس کے جے پور شیور میں بھگوا دہشت گردوں کو بے نقاب کر چکے ہیں اور ان کی اس بات میں صداقت بھی ہے کہ بی جے پی اور آر ایس ایس بھگوا دہشت گردی کو فروغ دینے کے لیے دہشت گردی کے کیمپ چلاتی ہیں۔ اس کے بعد وزارت داخلہ کے سکریٹری نے بھگوا دہشت گردوں کی ایک پوری فہرست جاری کی، لیکن نہ جانے کیوں ملک میں جہاں بھی دہشت گردانہ دھماکے ہوتے ہیں، بے گناہ مسلمانوں کو گرفتار کیا جاتا ہے جس کے سبب اصل گناہ

گار کھلے عام گھومتے رہتے ہیں اور نئے نئے منصوبے بناتے ہیں۔ میں بار بار یہ بات کہتا رہا ہوں کہ حکومتیں خوف سے نہیں بلکہ عدل وانصاف سے چلتی ہیں اور جو حکومتیں عدل وانصاف سے کام نہیں لیتیں وہ مٹ جایا کرتی ہیں۔ ۲۰۱۴ء میں ہونے والے عام انتخابات میں ملک کے مسلمان حکومتوں کے عدل وانصاف کو رائے دہی کا پیمانہ بنائیں گے، اس لیے میں یوپی کی سماجوادی حکومت اور مرکز کی یوپی اے حکومت سے کہنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنے انتخابی منشور میں کیے گئے وعدوں پر عمل کرتے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ انصاف کرے۔ یہ سچ ہے کہ کانگریس اور سماجوادی پارٹی کی حکومتوں کے ذریعہ مسلمانوں کو کچھ راحت پہنچائی جارہی ہے، کچھ مثبت اقدامات کیے جارہے ہیں، لیکن مسلمانوں میں پائے جانے والے خوف ودہشت کو دور کرنے کے لیے کوئی عملی اقدامات نہیں کیے جارہے ہیں جس کی وجہ سے ملت اسلامیہ ہند میں غم وغصہ کے ساتھ ساتھ بے چینی بھی پائی جارہی ہے۔ جمعیۃ علماء ہند کا مطالبہ ہے کہ بے گناہ مسلمانوں کو جلد از جلد رہا کیا جائے اور بے گناہ مسلمانوں کی ہونے والی گرفتاریوں پر قدغن لگائی جائے۔ دس دس پندرہ پندرہ سال سے بے گناہ مسلم نوجوان جیلوں میں بند ہیں جن کے خلاف اب تک نہ تو چارج شیٹ داخل کی گئی ہے اور نہ ہی ان کے مقدمات شروع ہوسکے ہیں۔ یہی نہیں نوجوانوں کو ۷رفٹ لمبے اور ۴رفٹ چوڑے قید خانے میں رکھا جاتا ہے، جہاں سورج کی روشنی کا گزر نہیں۔ ایسی قید وبند کی زندگی کے سبب نوجوانوں کا دماغی توازن بگڑ رہا ہے اور ان کی زندگیاں تباہ ہورہی ہیں۔ یوپی کی سماجوادی پارٹی کی حکومت نے اپنے منشور میں وعدہ کیا تھا کہ وہ اقتدار میں آنے کے بعد دہشت گردی کے الزام میں جیلوں میں بند بے قصور مسلم نوجوانوں کو رہا کرے گی، لیکن اب تک ایک بھی نوجوان رہا نہیں ہوسکا اور نہ ہی بے قصور نوجوانوں کو پھنسانے والے پولیس افسران کے خلاف کوئی کارروائی کی گئی۔ جب بھی پولیس کے خلاف کارروائی کی بات آتی ہے تو حکومت یہ کہتی ہے کہ اس سے پولیس کا مورل ڈاؤن ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ حکومت کو

پولیس کے مورل کی فکر ہے،لیکن ملک کے ۲۵ رکروڑ مسلمانوں کی زندگی کی فکرنہیں ہے، جبکہ اقتدار میں بیٹھے سیاست دانوں کواس بات کا اندازہ ہے کہ ملک کے مسلمانوں کونظر انداز کرکے ملک کی ترقی ممکن نہیں۔ سماجوادی پارٹی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ڈسٹرکٹ اتھارٹی کو فسادات کا ذمہ دار بنانے کا قانون بنائے گی، لیکن اقتدار میں آنے کے ایک سال مکمل ہونے کے باوجوداس پرعمل نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے صوبہ میں فرقہ پرستوں کے حوصلہ بلند ہیں۔ یوپی حکومت نے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ مسلمانوں کو ۱۸ رفیصد ریزرویشن دیا جائے گا،لیکن ابھی تک ایک فیصد ریزرویشن بھی نہیں دیا گیا۔ گویا یہ حکومت بھی مرکز کی طرح ریاستی حکومت بھی اپنے وعدے پرعمل نہیں کررہی ہے۔حکومتوں کے اس رویہ سے جمعیۃ علماء ہند یہ مطلب نکالنے پرمجبور ہے کہ مسلمانوں کا خون ناحق بہتا رہے گا، دکانیں لٹتی اور جلتی رہیں گی، جائدادیں برباد ہوتی رہیں گی، ظالم آزاد گھومتے رہیں گے اور قانون نہیں بنایا جائے گا۔فرقہ پرستوں کی طرف سے پوری مسلم قوم کو دہشت گرد بنا کر پیش کیا جاتا رہے گا اور اصل دہشت گردارباب سیاست کی چادر میں چھپ کر ملک کی چولیں ڈھیلی کرتے رہیں گے، امن کوآگ لگاتے رہیں گے، مسلم نوجوان جیلوں میں سڑتے رہیں گے، ماں باپ روتے اور اندھے ہوتے رہیں گے اور حکومت خاموش تماشائی بنی رہے گی، لیکن یہ صورت حال ملک کی سلامتی کے لیے نہایت خطرناک ہے اس لیے حکومتوں کو ظالموں اور ملک دشمنوں کے خلاف کاروائی کرنی ہوگی۔ جمعیۃ علما کے حکومت سے جو مطالبات ہیں ان کو بھی ہم جانتے ہیں یہ مطالبے تمام مسلمانان ہند کے ہیں ورمختلف جماعتی اورملی تنظیمیں ارباب حکومت سے بار بار ان مطالبوں کو دہراتی رہی ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ حکومت ان مطالبات کو پورا کرے اوراس راستے کی تمام رکاوٹوں کو دور کرے تا کہ مظلوموں کوانصاف ملے اور ملک کی ترقی کا جو قافلہ رواں دواں ہے مسلم نوجوانوں اس قافلے کا حصہ بن کر بلاخوف وخطراپنی خدمت ملک کی ترقی کے لیے پیش کرسکیں۔

جمعیۃ علماء شہر بنارس کی پروانچل تاریخ ساز کانفرنس سے ایک بار پھر حکومت اتر پردیش اور حکومت ہند سے مطالبہ کیا گیا کہ فرقہ وارانہ فسادات کو روکنے کے لیے جلد از جلد انسداد فرقہ وارانہ فسادات بل پارلیمنٹ میں پیش کیا جائے اور فسادات کے لیے ضلع انتظامیہ کو جواب دہ بنایا جائے نیز دہشت گردی کے الزام میں گرفتار بے گناہ مسلم نوجوانوں کو جلد از جلد رہا کر کے خاطی پولیس افسران کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے اور مسلمانوں کی ترقی کے لیے انھیں تعلیم، تجارت اور سرکاری نوکریوں میں آبادی کے تناسب سے ریزرویشن دیا جائے۔

(مضمون نگار جمعیۃ علماء ہند کے صدر ہیں)

☆☆

اقلیتوں کے حقوق

(دستور ہند کی روشنی میں)

● محمد عبدالرحیم قریشی

ہندوستان میں بنیادی حقوق اور اقلیتوں کے حقوق:

دستور ہند کی تدوین کے وقت دنیا کے کئی ممالک کے دساتیر کو سامنے رکھا گیا اور ان میں جو خوبیاں ہیں ان کو چن لیا گیا۔ دستور ہند کا تیسرا حصہ شہریوں کے بنیادی حقوق کے بارے میں ہے جو (۲۴) آرٹیکلس یا دفعات (دفعہ ۱۲ تا دفعہ ۳۵) پر مشتمل ہے۔ ان میں سے اہم دفعات کا یہاں تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

دفعہ (۱۴) میں قانون کی نظر میں مساوات کی بات کہی گئی اور دفعہ (۱۵) میں مذہب، نسل، جاتی، جنس یا مقام پیدائش کی بنیاد پر امتیاز کی ممانعت ہے۔ اس میں خواتین اور بچوں کے لئے اور سماجی و تعلیمی لحاظ سے پس ماندہ طبقات (بیاک ورڈ کلاس) اور شیڈ ولڈ کاسٹس اور شیڈ ولڈ ٹرائبس کی ترقی کے لئے خصوصی قوانین بنانے اور اقدامات کرنے کے لئے استثنیٰ فراہم کیا گیا ہے۔

دفعہ (۱۶) میں عوامی ملازمت یا روزگار کے معاملات میں مواقع کی مساوات کو لازم قرار دیا گیا ہے اس میں بھی استثنیٰ کی شکل میں ان بیاک ورڈ کلاس کے لئے جن کی ملازمتوں میں مناسب نمائندگی نہ ہو اور اسی طرح شیڈ ولڈ کاسٹس اور شیڈ ولڈ ٹرائبس کی ملازمتوں میں ترقی کے لئے تحفظات (Reservations) کی راہ نکالی گئی ہے۔

دفعہ (۱۷) چھوت چھات کے خاتمہ اور دفعہ (۱۸) خطابات (TITLES) کے طریقہ کو ختم کرنے سے متعلق ہے۔

دفعہ (۱۹) کا عنوان ''آزادیوں کا حق'' ہے اور اس میں ان بنیادی آزادیوں کو بیان کیا گیا ہے جو دستور ہند، ہندوستان کے شہریوں کو عطا کرتا ہے اور یہ ہیں:

(الف) آزادی اظہار و بیان

(ب) پر امن طریقہ پر اور اسلحہ کے بغیر جمع ہونے کی آزادی۔

(ج) انجمنیں (ASSOCIATIONS) اور یونین بنانے کی آزادی

(د) سارے ملک میں آزادانہ نقل و حرکت کی آزادی

(ھ) ملک کے کسی بھی حصہ میں بسنے اور رہائش اختیار کرنے کی آزادی

(ز) کسی پیشہ کو اختیار کرنے یا کسی ذریعہ آمدنی، ہنر یا تجارت کو اختیار کرنے کی آزادی ان آزادیوں کو چند شرائط کا تابع کیا ہے جو معقول اور مناسب ہیں۔

دفعہ (۲۰) میں جرائم پر سزا کے بارے میں اہم اصول بیان کئے گئے ہیں

(۱) صرف کسی قانون کی خلاف ورزی پر ہی سزا دی جا سکے گی اور قانون میں درج سزا سے زائد سزا نہیں دی جائے گی۔

(۲) کسی جرم کے تعلق سے ایک سے زائد مرتبہ استغاثہ نہیں ہوگا اور ایک سے زائد مرتبہ سزا نہیں دی جائے گی۔

(۳) کسی کو اپنے ہی خلاف گواہی دینے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ (۲۱) میں زندگی اور شخصی آزادی کے تحفظ کو بنیادی حق قرار دیا گیا ہے۔ اس دفعہ کے تعلق سے عدالتی فیصلوں سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ زندگی کے حق میں عمدہ زندگی (DECENT LIFE) کا خلوت (PRIVACY) کا اور محنت (WORK) کے حقوق شامل ہیں۔

دفعہ (۲۲) میں گرفتاریوں اور نظر بندیوں (DETENTIONS) کے تعلق سے اصول بیان کئے گئے ہیں۔ دفعہ (۲۳) میں انسانوں و بھیک منگوں کی تجارت اور منتقلی اور جبری محنت کی ممانعت ہے اور دفعہ (۲۴) کے ذریعہ بچوں سے فیکٹریز وغیرہ میں سخت محنت کروانے سے منع کیا گیا ہے۔

مذہبی آزادی کے حقوق:

دفعہ (۲۵) مذہب وضمیر کی آزادی کے بارے میں ہے اور یہ آزادی صرف اقلیتوں کے لئے نہیں بلکہ تمام شہریوں کے لئے ہے ہندوستان کے ہر شہری کو ضمیر کی آزادی اور مذہب یعنی مذہبی عقیدہ رکھنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ و پرچار کی آزادی حاصل ہے یہ آزادی البتہ نظم عامہ، اخلاق، صحت اور دیگر بنیادی حقوق کے تابع ہے۔ یہ دفعہ ریاست کو کسی مذہبی عمل سے وابستہ کسی معاشی مالیاتی، سیاسی یا دیگر سیکولر سرگرمیوں کو منضبط کرنے سے نہیں روکتا اور اس طرح کے موجود قوانین کو متاثر نہیں کرتا۔ نیز سماجی بھلائی (معاشرتی فلاح SOCIAL WELFARE) اصلاحات اور عوامی نوعیت کے ہندو مذہبی اداروں کو ہندوؤں کے تمام طبقات کے لئے کھولنے کی غرض سے ریاست کو قانون بنانے کا حق حاصل ہے۔ اس دفعہ کے ساتھ دو توضیحات منسلک ہیں، ایک یہ کہ کرپان رکھنا سکھ مذہب کے عقیدہ میں شامل ہے اور دوسرے یہ کہ اس دفعہ میں مستعملہ لفظ ہندو میں سکھ، جینی اور بدھ دھرم کو ماننے والے شامل ہیں۔

دفعہ (۲۶) میں نظم عامہ، اخلاق وصحت کے تابع ہر مذہبی فرقہ یا ذیلی فرقہ کو مذہبی امور کی آزادی کی بات کہی گئی ہے کہ وہ

(الف) مذہبی اور خیراتی مقاصد کے لئے ادارے قائم کرسکتے ہیں اور چلاسکتے ہیں۔

(ب) مذہبی معاملات میں اپنے امور کا خود انتظام کرسکتے ہیں۔

(ج) منقولہ یا غیر منقولہ جائیداد حاصل کرسکتے ہیں اور اپنی ملکیت میں رکھ سکتے ہیں

(د) ایسی جائیدادوں کا انتظام قانون کے مطابق کرسکتے ہیں۔

دفعہ (۲۷) میں کہا گیا ہے کہ کسی مذہب کے فروغ کے لئے ٹیکس وصول نہیں کیا جائے گا۔ دفعہ (۲۸) میں کہا گیا ہے کہ ریاست کے زیر انتظام یا ریاست کے فنڈ سے چلنے والے تعلیمی اداروں میں مذہبی تعلیم نہیں دی جائے گی البتہ اس ممانعت سے ریاست کے زیر انتظام وہ تعلیمی ادارے مستثنیٰ ہیں جنھیں کسی انڈومنٹ یا ٹرسٹ نے قائم کیا تھا اور جن کے قیام کی غرض وغایت میں مذہبی تعلیم داخل ہے، اس دفعہ میں یہ شق بھی ہے کہ ریاست کی جانب سے مسلمہ یا ریاست کی جانب سے رقمی امداد پانے والے تعلیمی ادارے میں کسی کو مذہبی تعلیم میں شریک ہونے یا مذہبی عبادت میں حصہ لینے کا پابند نہیں کیا جائے گا بجز اس کے کہ وہ شخص یا اس کا سرپرست اس کے لئے رضامندی دے۔

اقلیتوں کے حقوق:

اس کے بعد کی دو دفعات ثقافتی اور تعلیمی حقوق سے متعلق ہیں، ان میں لفظ اقلیت (مائنارٹی) استعمال ہوا ہے اور عموماً ان کو ہی اقلیتوں کے حقوق کی دفعات سمجھا جاتا ہے جو پوری طرح صحیح نہیں ہے، مذہبی اقلیتوں کے لئے دفعہ ۲۵، ۲۶ اور ۲۸ کی بڑی اہمیت ہے جو تمام شہریوں کے لئے مذہبی آزادی سے متعلق ہیں۔ اس سے پہلے یہ بات بھی واضح کی جاچکی ہے کہ زندگی کے حق اور مساوات کے حق اور ان دونوں پر مبنی دیگر حقوق بھی اقلیتوں کے لئے بڑی اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ ان کے بغیر اقلیتوں کے حقوق کوئی معنی نہیں رکھتے۔

دفعہ (۲۹) میں کسی زبان، رسم خط یا ثقافت کی بنیاد پر اقلیت قرار پانے والے گروہ کو اپنی زبان، رسم خط یا ثقافت کے تحفظ وبرقراری کا حق دیا گیا ہے۔ اس دفعہ میں کہا گیا ہے کہ ریاست کے زیر انتظام یا ریاستی فنڈ سے امداد پانے والے تعلیمی ادارے میں صرف

مذہب، نسل، جاتی، زبان کی بنیاد پر داخلہ دینے سے انکار نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ (۳۰) میں اقلیتوں کو تعلیمی ادارے قائم کرنے اور چلانے کا حق دیا گیا ہے کہ ہر مذہبی ولسانی اقلیت کو اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کا انتظام کرنے کا حق ہوگا اور ریاست امداد دینے کے معاملہ میں اقلیت کے زیر انتظام تعلیمی اداروں سے امتیاز نہیں برتے گی۔

دستور ہند کے اس حصہ میں بیان کردہ ان بنیادی حقوق کی اہمیت اتنی ہے کہ اگر ان حقوق کا اخلاف یا ان حقوق پر پابندیاں عائد کی جائیں تو دفعہ 32 کی رو سے سپریم کورٹ سے رجوع ہوکر ان حقوق کی بحالی کے احکامات حاصل کئے جاسکتے ہیں، قانون کے اس جز کو جس میں کسی بنیادی حق کو ختم یا کم یا غیر ضروری شرائط کا پابند کیا گیا ہے، سپریم کورٹ بے اثر اور کالعدم قرار دے سکتا ہے۔ اس نوعیت کے کسی بھی حکمنامہ کو بے اثر اور مسترد کرسکتا ہے، دستور ہند کی دفعہ (۲۲۶) کے ذریعہ بنیادی حقوق کے تعلق سے ایسے ہی اختیارات ملک کے تمام ہائیکورٹس کو دیے گئے ہیں۔

جہاں تک آئین وقوانین کا تعلق ہے، بلاخوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ہندوستان میں اقلیتوں کو وہ تمام تحفظات حاصل ہیں جنھیں عالمی سطح پر اور بین الاقوامی اداروں کی جانب سے مہذب معاشرہ کے لئے اور اقلیتوں کو اپنی انفرادیت اور خصوصیات کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری قرار دیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں اقلیتوں کی حقیقی صورتحال:

ہندوستان کے دستور کا جائزہ لیا جاتا ہے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اقلیتوں کو وہ سب کچھ حاصل ہے جن کی وہ توقع کرسکتے ہیں اور جن پر بین الاقوامی اعلانات میں زور دیا گیا ہے مگر جب زمینی صورتحال کا جائزہ لیتے ہیں تو صورت حال بالکل مختلف نظر آتی

ہے۔ پہلے ہم ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت یعنی مسلمانوں کا جائزہ لیں گے۔

ہندوستان میں آزادی کا سورج مسلمانوں کے خون کی سرخی میں طلوع ہوا۔ دارالحکومت دہلی میں مسلمانوں پر حملے ہوتے رہے، ان کو قتل کیا جاتا رہا مگر حکومت اور اس کے ذمہ داروں میں سے کسی نے اس کو فوری روکنے اور قاتلوں اور غارت گروں کو قانون کی گرفت میں لانے کی کوشش نہیں کی۔ دہلی کی کہانی ملک کے کئی علاقوں اور مقامات پر دہرائی گئی۔ سوچا گیا کہ ملک کی تقسیم کے ذریعہ پاکستان بنانے کا ردعمل ہے جس کے لئے ہندو، مسلمانوں کو ذمہ دار سمجھتے ہیں اور جیسے جیسے دن گزرتے جائیں گے، تقسیم کا زخم مندمل ہوگا اور مسلمانوں کو امن وچین نصیب ہوگا۔ ۱۳/سال بعد ہوئے جبل پور کے خوں ریز بھیانک فسادات نے اس سوچ کے کھوکھلے پن کو ظاہر کردیا۔ مسلم کش فسادات کا حال یہ ہے کہ کسی نے بڑا صحیح ریمارک کیا کہ ہم ہندوستان کے جغرافیہ سے فسادات کے ذریعہ واقف ہوتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ کونسا مقام اور کونسا شہر کہاں ہے۔ ہر مسلم کش فساد کے بعد اس کے اسباب وعلل پر لکھا اور کہا جاتا ہے، بڑے فسادات کے سلسلہ میں تحقیقاتی کمیشنوں کے ذریعہ چھان بین بھی کروائی گئیں۔ ان کمیشنوں نے اپنی رپورٹس بھی حکومتوں کے حوالے کیں۔ ان سب کے باوجود مسلم کشی کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ آج بھی معمولی معمولی باتوں اور چھوٹے چھوٹے واقعات پر مسلمانوں کا خون بہایا جاتا ہے، ان کی دکانیں نذر آتش کردی جاتی ہیں، ان کے مکانات اور ان کی املاک کو مسمار کیا جاتا ہے۔

فسادات کے اس سلسلہ میں سب سے زیادہ خوں ریز اور تباہ کن گجرات کے ۲۰۰۲ء کے فسادات ہیں، جن کو مسلمانوں کی نسل کشی کہا جانا چاہیے۔ گجرات کی اس مسلم نسل کشی میں ریاستی حکومت، ریاستی انتظامیہ اور بالخصوص پولیس کا رول انتہائی قابل اعتراض رہا۔ یہ ریاستی ادارے مسلمانوں کی نسل کشی اور قتل عام میں ملوث رہے۔ ریاستی حکومت سے تو کوئی توقع نہیں رکھی جاسکتی تھی کہ اس کے ہاتھ مسلمانوں کے خون میں رنگے ہوئے تھے، اس

وقت کی مرکزی حکومت کی ذمہ داری تھی مگر این۔ڈی۔اے کی حکومت نے کچھ نہیں کیا، اس کے بعد برسراقتدار آئی یو۔پی۔اے کی حکومت نے بھی چپ سادھ رکھی۔ اب کچھ عرصہ سے سپریم کورٹ کے احکامات کی وجہ سے یہ امید بندھ رہی ہے کہ گجرات کے قاتلوں اور غارت گروں کے چہرے بے نقاب ہوں گے۔ گجرات کی یہ مسلم کشی ہر پہلو سے نسل کشی (GENOCIDE) ہے جس کو بین الاقوامی قانون سنگین جرم قرار دیتا ہے اور اس میں ملوث مجرم چاہے دستوری حکمراں اور سرکاری عہدیدار ہی کیوں نہ ہوں، ان کو سزا دینے کی ذمہ داری ریاست پر عائد کرتا ہے۔ گجرات کی اس مسلم کشی کو نسل کش قرار دے کر ریاستی حکومت کو برخاست کرنے اور اس کے ذمہ داروں کو قانون کی گرفت میں لاکر سزا دلانے میں کوئی دشواری نہیں تھی۔ ان اقدامات کیلئے جس سیاسی قوت ارادی کی ضرورت ہے وہ یو پی اے کی اس حکومت میں بھی نظر نہیں آئی جو ۲۰۰۴ء کے الیکشن کے بعد برسراقتدار آئی۔

مسلم کش فسادات کے تعلق سے بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے مگر طوالت کے خوف سے کئی پہلوؤں کو چھوڑتے ہوئے چند اہم پہلو پر اکتفا کروں گا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ فساد سے پہلے فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا کی جاتی ہے، تقریروں اور تحریر کے ذریعہ، افواہوں اور جھوٹے الزامات کے ذریعہ مسلمانوں کے خلاف ہندو برادران وطن کو مشتعل کیا جاتا ہے اور ایسی فرقہ وارانہ کشیدہ فضا میں ایک بہت ہی معمولی سا واقعہ فسادات کی آگ بھڑکا دیتا ہے۔ فسادات کے انسداد کے لئے ضروری ہے ایسی تحریروں اور تقریروں اور افواہ بازیوں کے خلاف سخت کارروائی کی جائے قانون تعزیرات ہند (INDIAN PENAL CODE) میں ان کو جرم قرار دیا گیا ہے اور اس میں ملوث افراد کو سزا دلائی جا سکتی ہے۔ مگر ریاستی حکومتیں، عہدیدار اور پولیس آنکھیں بند کئے رہتے ہیں اور آج تک ایسے نا فرض شناس عہدیداروں کے خلاف کسی حکومت نے کوئی کارروائی نہیں کی۔

دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ آر۔ایس۔ایس اور اس کی محاذی تنظیمیں اور ادارے، ہندو

مجموعہ القاسم: جلد پنجم
مسلم مسائل اور اس کا حل

راشٹر کے نظریے کے تحت مسلمانوں کے خلاف مسلسل نفرت پھیلاتے ہیں۔ یہ کہہ کر کہ یہ ملک صرف ہندوؤں کا ہے' مسلمان یا تو ہندو دھرم قبول کریں یا پھر ملک چھوڑ کر چلے جائیں، کسی غیر ہندو کو ملک میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے، مسلمانوں کے خلاف عدم رواداری کی فضا پیدا کرتے ہیں۔ راوڑکیلا کے فسادات کی چھان بین کے بعد گاندھی پیس فاونڈیشن نے ''بھیونڈی'' جلگاؤں اور مہاراشٹر کے فسادات کی تحقیقات کے بعد جسٹس ڈی۔پی۔ مادن نے اور کئی فسادات کے تحقیقاتی کمیشن نے اپنی رپورٹس میں آر۔ایس۔ایس، سیوک سنگھیوں کی بنائی گئیں مقامی تنظیموں اور ان کی مخالف مسلم اشتعال انگیزیوں کو ذمہ دار قرار دیا مگر آر۔ایس۔ایس یا اس کے مخالف مسلم نظریات کو غیر آئینی اور غیر قانونی قرار دینے کی کوئی کوشش نہیں ہوئی۔

تیسرا اہم پہلو یہ ہے کہ اگر پولیس فرض شناس ہو، فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا نہ ہونے دے تو مسلم کشی کے واقعات رونما نہیں ہو سکتے ہیں۔ مگر ہر فساد میں دیکھا گیا کہ پولیس نہ صرف فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا کرنے والوں کی طرف آنکھیں پھیر لیتی ہیں بلکہ فساد پھوٹ پڑنے کے بعد فسادیوں کو کھلی چھوٹ فراہم کرتی ہے بلکہ خود مسلمانوں کے قتل اور ان کی املاک کی تباہی میں شریک ہو جاتی ہے۔ کئی تحقیقاتی کمیشن نے جن میں ممبئی میں ۱۹۹۳ء میں ہوئے فسادات کی تحقیقات کرنے والا جسٹس بی۔سری کرشنا کمیشن بھی شامل ہے، ایسے پولیس عہدیداروں کی نشاندہی کی جن کے ہاتھ مسلمانوں کے خون سے رنگین تھے۔ ان پولیس آفیسرس کے خلاف ایسی سخت کارروائی ضروری ہے جس سے دوسرے عبرت حاصل کریں۔ عموماً تو ان کے خلاف کوئی قابل ذکر کارروائی نہیں کی گئی اور اگر کی گئی تو تنخواہ کے ایک تدریجی اضافہ کو رکنے یا سنیاریٹی کی فہرست میں نام کو نیچے کرنے کی حد تک۔ ایسی کارروائیاں دوسروں کے لئے عبرت کا سامان قطعاً فراہم نہیں کرسکتیں۔ پولیس اور انٹلی جنس میں ایسے عہدیداروں کی کمی نہیں ہے جو ذہنی طور پر ہندو راشٹر کے نظریے سے وابستہ ہیں،

اس لئے خاطی پولیس ملازمین کو عبرتناک سزائیں دینے کے ساتھ پولیس اور عہدیداران پولیس کی وقفہ وقفہ سے ذہنی تربیت ضروری ہے اور دستور، ہندوستانی قومیت کے جس تمدنی تعدد کے نظریے کو پیش کرتا ہے اس کو ان کے ذہن میں اتارنا ضروری ہے۔

عدم رواداری، تنگ نظری، مذہب، زبان یا علاقہ کی بنیاد پر دوسرے شہریوں کے خلاف نفرت پیدا کرنے والی پارٹیز بڑے منظم طریقہ پر عوام کو متاثر کرنے کی کوشش کررہی ہیں۔سیکولرزم کی دعویدار سیاسی جماعتوں کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ عوام کے ذہن وفکر کو اپنے نظریات کے مطابق بنانے کی کوشش کریں۔ گجرات کی مسلم نسل کشی کے واقعات اتنے دردناک ہیں کہ سنگ دل سے سنگ دل بھی دل میں درد محسوس کرتا ہے۔مگر کسی سیکولرزم کی دعویدار سیاسی پارٹی نے گجرات کے عوام میں جاکر ان کے انسانیت کے جذبات کو ابھارنے اور ہندوستانی قومیت کے حقیقی تصور کو پیش کرنے اور فرقہ وارانہ قتل وغارت گری سے ملک کے کمزور ہونے کو پیش نہیں کیا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں کی عوام میں اپنے کئے پر ندامت کا احساس پیدا نہیں ہوا، اس کے برخلاف کئی طبقات میں اپنی درندگی پر فخر کے جذبات پائے جاتے ہیں۔۱۹۷۰ء۔۱۹۸۰ء کے دہے میں سامپردائکتا ورودھی سمیتی نامی تنظیم کو مسز سبھدرا جوشی نے آگے بڑھایا تھا جس نے ہندوراشٹر کے فسطائی نظریے کے خلاف کئی کتابچے شائع کئے، اخبارات میں مضامین چھپوائے ملک کے مختلف مقامات پر مباحثوں، تقاریر اور سمینارس کا انتظام کیا جس کی وجہ سے ہندوتوا کی فسطائیت کے خلاف ذہن بننے لگا۔آج ایسی کوششوں کی زیادہ ضرورت ہے۔مگر سیکولرزم کی دعویدار پارٹیز الیکشن کے موسم میں ہی سرگرم ہوتی ہیں۔جبکہ ان کو عوام کے ذہن وفکر کو بنانے کے لئے ہر وقت میدان میں رہنا چاہئے اور جارحانہ فرقہ پرستی کے خلاف عوام کو خبردار کرنا اور ان میں اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا عزم اور ارادہ پیدا کرنا چاہئے۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ملک میں صرف مسلمانوں ہی کی جان ومال کی

آزمائش ہوتی ہے، دوسری اقلیتوں کو کوئی نہیں چھیڑتا، لیکن اس کی تردید دہلی میں سکھ بھائیوں کے قتل عام سے اور اڑیسہ وکرناٹک میں عیسائیوں پر خوں آشام حملوں سے ہوگئی۔ ان واقعات کے بعد سکھ برادری بھی اور عیسائی اقلیت بھی یہ محسوس کرنے لگی کہ صرف مسلمانوں ہی پر قاتلانہ اور غارت گرانہ حملوں کا خطرہ نہیں منڈلاتا ہے اب وہ بھی محسوس کرنے لگے ہیں کہ ملک کی اکثریتی جارحانہ فرقہ پرستی ان کے وجود کو بھی چیلنج کرنے لگی ہے۔ بہرحال جب اولین بنیادی حق یعنی جان ومال وآبرو کے حق کی بات آتی ہے تو افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہندوستان میں اقلیتوں کے اس اہم اور بنیادی حق کو پامال کیا جاتا رہا۔

مسلم اقلیت کے تعلق سے ایک اور مسئلہ کو میں یہاں پیش کرنا چاہوں گا۔وہ ہے بابری مسجد کا مسئلہ، اس مسئلہ کے تعلق سے یہ قطعاً نہ سمجھا جائے کہ صرف یہ ایک مسجد کا مسئلہ ہے۔ یہ دراصل مسلمانوں کی تمام مساجد اور دیگر اقلیتوں کی تمام عبادت گاہوں کا مسئلہ ہے۔آر ایس ایس ودیگر ہندوراشٹروادی اس بنیاد پر بابری مسجد کو شری رام کی جائے پیدائش بتارہے ہیں کہ ان کے بقول شری رام کی مورتی نے اس جگہ سے برآمد ہوکر اپنی جائے پیدائش کی نشاندہی کردی ہندو برادران وطن کے کروڑوں دیویوں دیوتاؤں میں ہر ایک اس طرح اپنی جنم بھومی کو بتانے لگے تو پھر کونسی مسجد، کونسا گرودوارہ اور کونسی چرچ بچ سکے گی زمین سے مورتی برآمد کرنا، صحیح الفاظ میں وہاں لے جاکر رکھنا اور برآمد ہونے کا اعلان کرنا کوئی دشوار اور ناممکن کام نہیں ہے۔دوسری اہم بات یہ ہے کہ ہندوراشٹروادی کی حکمت عملی یہ ہے کہ اقلیتوں میں بالعموم اور مسلمانوں میں بالخصوص خوف کا احساس گہرا کیا جائے کہ وہ یہ محسوس کرنے لگیں کہ اگر ہم اپنے مذہب سے وابستہ رہتے ہیں تو اس کو ملک میں نہ ان کی جان سلامت رہے گی اور نہ ان کا مال محفوظ رہے گا اور جیسے جیسے یہ احساس گہرا ہوتا جائے گا ان کا ذہن اپنے مذہب کو چھوڑ کر ہندو دھرم کو قبول کرنے پر مائل ہوتا جائے گا یہ ہندوراشٹروادی

اب اس خوف میں ایک اور خوف کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ تمہاری عبادت گاہیں بھی محفوظ نہیں رہیں گی، جس وقت اور جب چاہیں تمہاری عبادتگاہوں کو مسمار کیا جاسکتا ہے، پولیس اور حکومت بھی رکاوٹ نہیں بنے گی۔ اگر تم اپنی عبادت گاہوں کی حفاظت چاہتے ہو تو اس کی بھیک ہم سے مانگو، ہم چند عبادت گاہیں تم سے لے کر چند تمہارے لئے چھوڑ سکتے ہیں۔ یہ ہے مسلمانوں کے اندر خوف کو گہرا اور خوف میں اضافہ کرنے کی اسٹریٹجی۔ اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے، لیکن ہم ہندو راشٹروادیوں سے دوٹوک انداز میں کہنا چاہتے ہیں کہ انھوں نے مسلمانوں کی نفسیات کو نہیں سمجھا ہے۔ ان پر مصیبت آتی ہے تو ان کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے۔ یہ مصائب سے ڈر کر، جان ومال کے نقصان سے گھبرا کر اپنے دین اور اپنے ایماں سے دستبردار ہونے والے نہیں ہیں۔ بلکہ ان واقعات نے ان میں اپنے دین وایمان پر مضبوطی سے قائم رہنے کے ارادے اور عزم کو بڑھا دیا ہے۔ اے ہندو راشٹروادیو، تم نے ملک میں سینکڑوں قتل وغارت گری کے ہنگامے برپا کئے اور ان میں ایک بھی بدبخت مسلمان ایسا نہیں نکلا جو یہ کہے کہ مجھ پر خنجر نہ چلاؤ، میرے گھر کو نہ جلاؤ، میری دکان کو نہ لوٹو میں اپنے دین وایمان کو چھوڑنے کیلئے تیار ہوں۔ مسلمان نیک عمل کے اس معیار پر جو اسلام پیش کرتا ہے نہ اترتا ہو مگر جہاں تک اس کے دل کے اندر ایمان کا تعلق ہے ایک مومن کی مضبوطی اور استقامت موجود ہے۔

بابری مسجد کا مسئلہ حکومت کی ناکامی کی داستان ہے۔ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ موجودہ ایودھیا، شری رام چندر جی کی افسانوی ایودھیا نگری نہیں ہے اور یہ کہ بابری مسجد، ایسی جگہ پر جہاں کوئی مندر واقع نہیں تھا، بابر نے نہیں بلکہ بابر کے مقرر کردہ عامل میر باقی تاشقندی نے بنائی۔ ان تاریخی مقام کے برعکس کئی جھوٹی کہانیاں گھڑی گئیں اور ان کا زبردست پرچار کیا گیا اور ایسی افواہوں کے ذریعہ بابری مسجد اور مسلمانوں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکائی گئی۔ نفرت انگیز افواہوں کا پھیلانا قانون تعزیرات ہند کے تحت جرم ہے مگر ارباب

حکومت نے نفرت کے ان بیوپاریوں کے خلاف آج تک کوئی کارروائی نہیں کی۔

بابری مسجد کے معاملے میں شری لال کرشن اڈوانی کی رتھ یاترا سے لے کر اس تاریخی مسجد کی عمارت کے انہدام تک اور انہدام سے لے کر آج تک مسلمانوں کو بجا طور پر اتنی شکایتیں ہیں کہ ان کے بیان سے یہ مضمون طویل اور منہ کا مزہ خراب ہوجائے گا۔ مسجد کے انہدام کی تحقیقات کے لئے تشکیل دیئے گئے کمیشن نے ۱۷/سال بعد ۳۰/جون ۲۰۰۹ء کو رپورٹ پیش کی ہے، انہدام کے ملزمین کے خلاف فوجداری کارروائی ایک عدالت میں معرض التوا میں ہے کب شروع ہوسکے گی کہا نہیں جاسکتا، دوسری عدالت میں بڑی سست رفتاری سے کچھ عرصہ پہلے شروع ہوئی ہے بہرحال اس مسئلہ میں حکومت کے طرز عمل کی وجہ سے ہندوستانی جمہوریت پر سے مسلمانوں کا اعتماد اٹھتا جارہا ہے۔ جمہوریت نام ہے قانون کی عمل داری اور حکمرانی کا اور یہ اصول مسلسل پامال ہوتا جارہا ہے۔

مسلمانوں کے ایک اور مسئلہ کا ذکر میں یہاں کرنا چاہوں گا۔ مسلم پرسنل لا یعنی مسلم فیملی لا مسلمانوں کے دین اور ایمان کا جز ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے میں برادران وطن کو دشواری محسوس ہوتی ہے اس لئے کہ ہندو برادران وطن کے پاس ان معاملات میں ان کے دھارمک قانون کی اہمیت بس اتنی ہے کہ اگر ان کے علاقے میں یا ان کے کسی طبقہ میں کوئی رواج ہے جو قانون کے مطابق نہیں ہے تو برتری رواج کو حاصل ہوگی اور دھارمک قانون پس پشت ڈال دیا جائے گا۔

عیسائیوں میں پروٹسٹنٹ فرقہ تو لا آف دی لینڈ (Law of the Land) کا قائل ہوگیا ہے اس لئے ان کے پاس مذہبی قانون کی خاص اہمیت نہیں ہے۔ برادران وطن مسلمانوں کی اپنے پرسنل لا سے وابستگی کے جذبہ کو سمجھیں یا نہ سمجھیں، انہیں اور ملک کو اتنی بات تو سمجھ لینا چاہئے کہ جب دستور کی دفعہ (۲۵) میں عقیدہ کے مطابق عمل کی آزادی کو بنیادی حق تسلیم کرلیا گیا ہے اور مسلمان اپنے پرسنل لا کو مذہب وعقیدہ کا اہم حصہ سمجھتے ہیں تو

ان کو یہ حق دیا جانا چاہئے۔ دفعہ (۲۹) میں اقلیتوں کو اپنے کلچر کے تحفظ اور اس کی برقراری وفروغ کا حق دیا گیا ہے اور اس حق کی رو سے بھی مسلمانوں کے مسلم پرسنل لا میں کوئی مداخلت نہیں ہونی چاہئے۔

مسلمانوں کے حقوق اور ان کے مسائل کے اور بھی کئی پہلو ہیں، اردو بہر حال اب مسلمانوں کی زبان اور ان کا کلچر بن گئی ہے اور اس زبان کے تعلق سے جو رویہ حکومتوں کا رہا ہے اس کے لئے حق تلفی اور ظلم کے الفاظ بھی ہلکے معلوم ہوتے ہیں مسلمانوں کی عوامی خدمات اور سرکاری ملازمتوں میں نمائندگی کی بات آتی ہے تو انگریزی کا یہ محاورہ منطبق ہوتا ہے کہ مسلمان (LAST TO BE HIRED, FIRST TO BE FIRED) شہری ہے جسٹس راجندر سچر کمیٹی کی رپورٹ سے کئی حقیقتیں سامنے آئی ہیں۔ ریزرویشن کی بات نکلتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ دستور میں مذہب کی بنیاد پر ریزرویشن نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ دستور کی تدوین کے وقت دستور ساز اسمبلی میں سکھوں کے نمائندہ سردار اجل سنگھ نے اقلیتوں کیلئے ریزرویشن کی تجویز پیش کی تھی جس کو منظور کرلیا گیا، مگر بعد میں لفظ مائنارٹیز، کو بیک ورڈ کلاس سے بدل دیا گیا اور اس دفعہ کی دستور ساز اسمبلی میں یہ وضاحت کی گئی کہ لفظ کی اس تبدیلی سے اقلیتیں ریزرویشن کے حق سے محروم نہیں ہوں گی۔ آج ریزرویشن کی اس تاریخ کو بالکل فراموش کردیا گیا ہے۔ آج کل مسلمانوں پر سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ان کو دہشت گرد قرار دے کر مصائب میں مبتلا کرنے اور ان کے خلاف ہندو برادران وطن میں نفرت کو ابھارنے کی سازش کارفرما ہے کہیں کوئی دھما کہ ہوتا ہے یا پٹاخہ پھٹتا ہے تو فوری ہی مسلمانوں کی طرف انگلی اٹھادی جاتی ہے جس کے بعد ان کی بے تحاشا گرفتاریوں اور ان کو ٹارچر کرنے کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ ان گرفتاریوں سے پہلے کسی نوعیت کی شہادت پولیس کے پاس نہیں ہوتی اور سپریم کورٹ نے گرفتاریوں کے لئے جو اصول وضوابط بنائے ہیں، ان کو نظر انداز کردیا جاتا ہے اور اس طرح کا دردناک

ٹارچر کیا جاتا ہے کہ اس کے بیان ہی سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ دہشت گردی کے جھوٹے الزام کے تحت مسلمانوں کی داروگیر پر پوری کتاب مرتب ہوسکتی ہے، اس لئے میں اس مختصر تبصرہ پر اکتفا کرتا ہوں۔ یہ بھی یاد رہے کہ بین الاقوامی میثاقات کے تحت ٹارچر ممنوع ہے۔

الحاصل یہ کہ ہندوستان میں مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کو دستوری اور قانونی اعتبار سے وہ حقوق حاصل ہیں جو ان کی باعزت، پروقار اور عمدہ زندگی کی ضمانت دیتے ہیں۔ لیکن ان حقوق کی عملی صورت گری کے لئے رواداری، بقائے باہم اور عدل وانصاف کا ماحول نہیں بنایا گیا جس کے نتیجہ میں اقلیتیں اور بالخصوص مسلم اقلیت، خوف کے سایہ میں زندگی گزار رہی ہے۔

(مضمون نگار آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اسسٹنٹ جنرل سکریٹری ہیں)

☆☆

اقلیتوں کے حقوق اور مسلمانوں کی صورتحال

● مولانا انیس الرحمٰن قاسمی

ہندوستان میں مسلمان تاریخی اعتبار سے تیرہ سوسال سے رہ رہے ہیں،انہوں نے اس ملک میں تہذیب وثقافت ،علم اورتمدن کوفروغ دیا۔ یہاں کی زراعت،صنعت اور سڑکوں کو ترقی دی۔ یہاں کے رہنے والوں کے درمیان محبت وخلوص،انسانی وحدت، انصاف ومساوات کوبڑھاوادیااورمذاہب کے احترام کے ساتھ جبر کے بغیر دین کی تبلیغ کی۔ جولوگ دین اسلام سے دور تھےاوراس کونہیں مانتے تھےان کے بارے میں اعلان کیا ”لکم دینکم ولی دین“ تمہارے لیےتمہارادین اور ہمارے لیے ہمارادین۔اس پورے عرصہ میں انہوں نےعقیدہ اورعبادت میں اختلاف کے باوجود خدمت وتعاون میں کوئی کمی نہیں کی بلکہ ملک کےتمام باشندوں کے ساتھ ہمدردی ومحبت کی شاندارروایتیں قائم کیں۔ ماضی کی خانقاہیں اورمدارس اس کی علامت ہیں۔اس مبارک کوشش کے نتیجہ میں یہاں کے باشندوں میں آپسی محبت وبھائی چارگی نے اپنی جڑیں گہری کیں اورمسلم بادشاہوں کی مضبوط سلطنت اورمختلف مذاہب کے ماننے والوں کے باوجودایک ایسی محبت بھری تہذیب وجودمیں آئی جسے گنگا جمنی تہذیب کا نام دیا گیا۔انگریزوں کے عہد سے پہلے ہندومسلم منافرت نہیں تھی اورنہیں انسانیت کش فسادات ہوتے تھے،عام لوگوں میں انسانی جان ومال کے احترام کاتصورزیادہ تھااورسلاطین ونواب بھی اسی تصور کے پروردہ تھے،علماء وصوفیاء ودیگرخواص کا مسلک بھی یہی تھا،اس لیے ملک میں امن وامان تھا اورلوگوں میں

ایک دوسرے سے آپس میں قومی سطح پرخوف وہراس نہیں تھا بلکہ محبت ویگانگت تھی۔

مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان طویل صدیوں میں مسلمان بحیثیت ایک ملت عددی اعتبار سے اکثریت میں نہیں رہے،مگراس کے باوجود مسلمانوں کی حیثیت سماجی اورسیاسی طور پرایک مضبوط اورغالب ومنصف ملت کی رہی۔اس عرصہ میں دینی اعتبار سے مسلمانوں کی مساجداورمدارس کی تعمیر وسرپرستی زیادہ ترمسلم بادشاہوں اورنوابوں نے کی۔ البتہ انگریزوں کے غلبے کے بعداس ملک کے مسلمانوں کی حیثیت ایک مجبورومغلوب اورمظلوم طبقہ کی ہوگئی۔ڈیڑھ سوسال کے اندرہی ان کی صنعتیں، مدارس اورتعلیم گاہیں اجڑ گئیں۔ انگریزوں نے تاریخی طور پرایسی کتابیں لکھوائیں جن میں مسلم حکومتوں کے بارے میں ظلم اور جبر کی بے سروپا کہانیاں پھیلائیں،اس نے یہاں کے ہندومسلم فرقے کے آپسی محبت اور بھائی چارے کونقصان پہنچایااورفرقہ وارانہ تشددوتصادم کوایسا بڑھایا کہ اس نے ایک بھیانک شکل اختیارکی جس کے بعد بالآخرملک تقسیم ہوگیا۔

دستوری حقوق:

آزادی کے بعد ہندوستان کاایک ایسادستورمرتب کیا گیاجس میں بنیادی طورپراس ملک کوسیکولر ملک قرار دیا گیااور یہ سیکولرزم ہمارے دستورکاایک ایسااصولی اوراساسی حصہ قرار پایاجس کوکبھی بدلانہیں جاسکتاہے۔دستورکی ابتدائیہ میں یہ کہا گیاہے:

”ہم ہندوستان کےعوام ہندوستان کوایک خودمختارسوشلسٹ،سیکولرعوامی جمہوریہ کے طور پرقائم کرنے کامقدس عہد کرتے ہیں اوراس کےتمام شہریوں کوسماجی،معاشی اورسیاسی انصاف حاصل ہوگا،تمام شہریوں کوخیال اوراظہارعقیدہ ایمان اورعبادت کی آزادی حاصل ہوگی سبھوں کومنصب اورمواقع کی برابری حاصل ہوگی اوران کے درمیان بھائی چارہ بڑھایا جائے گا،ہرفرد کی عزت کی ضمانت دی جائے گی اورملک کےاتحادوسالمیت کو برقرار

رکھا جائے گا‘‘۔

دستور ہند کے ابتدائیہ کے علاوہ بنیادی حقوق کے دفعات ۱۴/۔۱۵۔۱۶۔۱۹۔۲۱۔ ۲۵۔۲۶۔۲۷۔۲۸ میں برابری عدم امتیاز، اظہار رائے اور مذہبی آزادی، اقلیتوں کو ان کے اپنے مذہبی ورفاہی ادارے قائم کرنے کا حق دیا گیا ہے۔اسی طرح دفعہ ۲۹۔۳۰ میں زبان، رسم الخط اور ثقافتی اداروں کے قیام اوراس کی حفاظت کی ضمانت دی گئی ہے اور سیکولزم کو یہاں کی مختلف لسانی، مذہبی اور علاقائی گروہوں کی دینی، مذہبی، لسانی اور ثقافتی تنوع کی بنیاد پر ملک کی لازمی ضرورت سمجھتے ہوئے اختیار کیا گیا ہے۔

اقلیت واکثریت:

آزادی کے بعد سے اقلیت واکثریت پر بحث ہوتی رہی ہے۔ یہاں اقلیت کی اصطلاح میں وہ تمام غیر دستاویزی گروہ شامل ہیں جو ملک کے کسی بھی ریاست میں اپنی مستقل شناخت رکھتے ہیں اور جو اپنی نسلی، مذہبی یا لسانی روایات وخصوصیات میں باقی ماندہ آبادی سے مختلف ہیں، ہندوستان میں عام طور پر مذہبی اقلیتوں میں مسلم، سکھ، عیسائی، پارسی، بودھ، جین وغیرہ شامل ہیں۔

اقلیتوں کے حالات پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ کسی بھی ملک میں جہاں اقلیتیں آباد ہیں انہیں مختلف طرح کے خطرات ومشکلات درپیش ہوتے ہیں، خاص طور پر معاشی ترقی، سماجی مساوات، زندگی واملاک، سلامتی اور ثقافتی ومذہبی شناخت کے بارے میں وہ عدم تحفظ کے شکار ہوتے ہیں، اکثریت کی طرف سے عملی طور پر اگر انصاف میں کوتاہی ہوتی ہے تو نہ صرف مذہبی ولسانی اقلیتیں عدم تحفظ میں مبتلا ہوتی ہیں، بلکہ اس کے ساتھ احساس محرومی کا بھی شکار ہوجاتی ہیں اوراس طرح کے ماحول میں سماجی طور پر پچھڑے ہوئے دیگر طبقہ کے افراد بھی مذہبی اعتبار سے ایک ہونے کے باوجود اس کا شکار ہوجاتے ہیں جیسا کہ

ہندوستان میں آج بھی مذہبی اعتبار سے ہندو ہونے کے باوجود شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب اس کے شکار ہیں۔اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ صرف اقلیتیں ہی ناانصافی کا شکار ہوتی ہیں بلکہ درج فہرست ذات وقبائل کے افراد عددی اکثریت کے باوجود سماجی ناانصافی کا شکار ہیں، اس لیے یہ لازمی نہیں ہے کہ کوئی اقلیت احساس محرومی کا ہمیشہ شکار ہو بلکہ مواقع ملنے پر وہ ترقی کی اونچی منزل پر بھی پہونچتے ہیں۔

ہندوستانی مسلمان:

آزادی کے بعد دستوری تحفظ کے باوجود ملت اسلامیہ ہندیہ پسماندگی کی شکار ہوئی، اس بارے میں مختلف کمیٹیوں اور افراد نے جو جائزے لیے ہیں وہ تشویش کا اظہار کرتے ہیں۔ یہاں چند تأثرات درج کیے جاتے ہیں:

گوپال سنگھ پینل نے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے مسلمانوں کی محرومی کا ان الفاظ میں اظہار کیا ہے:

’’مسلمان بطور ایک گروہ ہر معاملہ میں قومی اوسط کے لحاظ سے غریب وپس ماندہ ہیں، ان کی سماجی کامیابی ملکی معاملات میں ان کی شرکت، ان کی آمدنی کی سطح، ان کی بچت کی سطح، ان کی تعلیمی کامیابی بالعموم بہت کم ہے۔ان کے درمیان اسکول چھوڑنے والوں کی تعداد زیادہ ہے اور کامیابی کی شرح نیچی ہے اور یہ چیزیں بلا استثنی ہر علاقے اور ہر سطح کے لوگوں کے درمیان ہیں‘‘۔

ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی دہلی کے زیر اہتمام سید شمیم شاہ نے مسلمانوں کے ذریعہ چلائے جانے والے تعلیمی اداروں کا ایک سروے کیا تھا جس کی رپورٹ میں انہوں نے مسلمانوں کی محرومی کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

’’ماضی قریب کے بعض سیاسی اور تاریخی واقعات کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں کی

زندگی کے تمام میدانوں میں تعلیم کی کمی اور ملکی سطح پر ہر جانب ہونے والی ترقی سے عدم واقفیت اور خود کی معاشی پستی کی وجہ سے وہ دائمی طور پر ظلم ومحرومی کے شکار ہیں۔جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کی بڑی جماعت پیچھے چھوٹ گئی ہے۔دراصل یہ برادری دھیرے دھیرے فائن آرٹ، سائنس وٹکنالوجی اور زبان وثقافت میں ہونے والی تمام ترقیات سے محروم رکھی گئی ہے"۔

۲۰۰۴ء میں لندن اسکول آف اکونومکس کے مشہور ماہر معاشیات لارڈ بھیکو پارکھ نے اپنے مطالعہ میں کہا ہے:

"اگرچہ انہوں نے آزادی کے بعد بالخصوص ۱۹۸۰ء کی دہائی کے بعد ترقی کی ہے مگر وہ زندگی کے ہر دائرہ میں قومی اوسط سے بہت نیچے ہیں۔ان کے اندر جہالت اور اسکول چھوڑنے والوں کی شرح بہت زیادہ ہے، ان کی بہت چھوٹی تعداد ہی کالج تک کی تعلیم پوری کرپاتی ہے، ان کی اوسط آمدنی ہندوؤں سے کم ہے اور معاشی طور پر خوشحال اور دولت مند مسلمانوں کی تعداد کا تناسب بہت ہی کم ہے، ان کی معاشی طاقت کی کمی خود ان کی معاشی حیثیت سے جھلکتی ہے جس کے نتیجے میں وہ نسبتا کم سماجی قوت رکھتے ہیں"۔

۲۰۰۶ء میں سچر کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں یہ لکھا ہے:

"ہمارے تجزیہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف ریاستوں کے حالات میں (اور ان مسلمانوں کے حالات میں جو اپنے آپ کو او بی سی اور دیگر طبقوں میں شمار کرتے ہیں) قابل لحاظ فرق پایا جاتا ہے اور یہ کہ مسلم فرقہ ترقی کے عملا تمام مظاہر میں خسارے اور محرومیوں سے دوچار ہے۔درحقیقت زیر غور تمام اشاریوں کے لحاظ سے مسلمانوں کی حالت کم وبیش ایس سی، ایس ٹی سے کچھ بہتر مگر ہندو او بی سی، دیگر اقلیتوں اور عام ہندوؤں (بیشتر اعلی ذات والے) سے بدتر ہے، کثیر مسلم آبادی والی ریاست مغربی بنگال، بہار، اترپردیش اور آسام میں یہ صورت حال بطور خاص سنگین ہے، لیکن توجہ طلب بات یہ ہے کہ ان خساروں

اور محرومیوں کے باوجود مسلمانوں میں نوزائدوں کی شرح اموات اور صنفی تناسب کم ہے، ترقیاتی خسارے کے علاوہ مسلمانوں میں بڑے پیمانے پر یہ احساس موجود ہے کہ ان کے خلاف امتیاز برتا جاتا ہے اور انہیں الگ تھلگ رکھا جارہا ہے، اس سے مسئلہ سنگین تر ہوجاتا ہے"۔(سچر کمیٹی رپورٹ/۲۳۱)

آزادی کے بعد مسلمانوں کی سماجی، معاشی، سیاسی، تعلیمی اور دینی صورتحال کے تفصیلی جائزہ اور اس پر بحث کی ضرورت ہے۔

سماجی اور اخلاقی حالت:

جہاں تک سماجی صورتحال کا تعلق ہے تو یہ کہنا درست ہوگا کہ سماجی طور پر ہندوستانی مسلمان کئی طرح کی مشکلات میں مبتلاء ہیں۔پہلا یہ کہ ان کے رہائشی علاقے ترقیاتی مواقع سے محروم ہیں تشویشناک حد تک غربت نے اکثریت کو گھر کے لیے زمینوں سے محروم کررکھا ہے، ان کے اپنے گھر کے لیے زمین پچاس فیصد کے پاس بھی نہیں ہے غربت نے کئی طرح کے سماجی ومعاشرتی خرابیوں کو جنم دیا ہے، ان کے گھروں کا ماحول دینی تعلیم کے فقدان کی وجہ سے اسلامی نہیں رہا، رہن سہن، تہذیب وثقافت اور شادی بیاہ کے رسوم میں وہ مقامی معاشرہ کے اثرات قبول کرتے جارہے ہیں، ان کے اندر ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی، شریعت کے مطابق موروثی جائدادوں کی تقسیم اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کے جذبات میں کمی کا واقع ہونا قابل توجہ ہے۔ان میں اخلاقی خرابیاں جیسے شراب نوشی، کاروبار میں سچائی سے دوری، انصاف اور ہمدردی کی کمی صاف دکھائی دیتی ہے گرچہ بہت حدتک یہاں کے بسنے والے دیگر طبقات کے مقابلے میں اچھے اخلاق کے حامل دکھائی دیتے ہیں۔

گھریلو اعتبار سے بعض حساس علاقوں میں پینے کے صاف پانی اور صفائی کی عدم موجودگی نے صحت کے علاوہ انہیں کئی طرح کے سماجی، نفسیاتی مسائل جیسے ذہنی تناؤ، ڈپریشن

وغیرہ میں مبتلا کردیا ہے۔بعض علاقوں میں ان کی حالت ایسی ہے جیسی جانوروں کی ہوتی ہے۔ یہ سب امور انتہائی تشویشناک ہے۔ خاص طور پر ایسی آبادیاں جہاں یہ تھوڑی تعداد میں ہیں اور غربت میں مبتلاء ہیں ان کی معاشرتی زندگی بھی ویسے ہی ہے جیسی ایس سی اور ایس ٹی کی زندگی ہے۔

سماجی صورتحال کی بیشتر خرابیاں بدتر معاشی حالت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں اور ان کی معاشی حالت مختلف میدانوں میں انتہائی تشویشناک ہیں۔

معاشی حالت:

مسلم معیشت کا جہاں تک تعلق ہے تو معاشرہ کا یہ پہلو بہت اہمیت رکھتا ہے، ان کی آمدنی قومی سطح کی آمدنی سے کافی کم ہے، وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ سرکاری اور پرائیویٹ ایجنسیاں مسلمانوں کو تعاون دیں تاکہ وہ اپنی حالت کو بہتر بنا سکیں۔شہریوں کے اقتصادی اور تجارتی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لیے قرضے ایک اہم ذریعہ ہو سکتے ہیں لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے تو ملازمتوں میں ان کی حصہ داری چاہے وہ سرکاری سیکٹر میں ہو یا غیر سرکاری سیکٹر میں بہت کم ہے۔اسی طرح بینکوں سے ملنے والے قرضوں کی صورت حال کچھ زیادہ امید افزاء نہیں ہے۔مختلف رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف چار فیصد افراد کو بینک قرضوں تک رسائی ہے، بلکہ قابل لحاظ مسلم آبادی والے بیشتر علاقوں کو بینکوں نے منفی علاقہ قرار دے دیا ہے وہاں کے رہنے والوں کو بینک قرض نہیں دیتے۔یہی حال وزیراعظم کے پندرہ نکاتی پروگرام کے تحت قرضوں کی سہولتوں کا ہے وہاں بھی مسلمان فائدہ نہیں اٹھاتے ہیں اسی طرح قومی اقلیتی مالیاتی کارپوریشن نیشنل بیک وارڈ کلاس فینانس اینڈ ڈیولپمنٹ کارپوریشن اور دیگر مالیاتی اداروں کی طرف سے دیئے جانے والے قرضوں کا جہاں تک تعلق ہے تو یہاں بھی بالعموم مسلمانوں کو محرومی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

تعلیمی حالت:

جہاں تک مسلمانوں کی عمومی تعلیم کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں مختلف رپورٹوں سے یہ بات واضح ہوگئی ہیں کہ مسلم طلبہ اور عام مسلمانوں کی خواندگی کی شرح قومی شرح خواندگی سے کم ہے یہ فرق دیہی علاقوں کے مقابلے میں شہری علاقوں میں زیادہ ہے، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ۶/سال سے ۱۴/سال کی درمیانی عمر والے ۲۵/فیصد مسلم بچے یا تو کبھی اسکول جاتے ہی نہیں اور جاتے ہیں تو درمیان میں ہی تعلیم ترک کردیتے ہیں، یہی حال اعلی تعلیم کا ہے۔ دیگر تمام طبقوں کے مقابلے خاص طور پر شہری علاقوں کے مردوں میں گریجویشن مکمل کرنے کا امکان ایس سی اور ایس ٹی سے بھی کم ہوتا ہے اور جو گریجویٹ ہوتے ہیں ان میں دیگر طبقوں کے مقابلے مسلم طبقے میں بے روزگاری کی شرح زیادہ ہے۔

جہاں تک خواتین کی تعلیم کا تعلق ہے شہری علاقوں میں یہ فرق کافی نمایاں ہے، شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب کے مقابلے مسلم خواتین کی شرح خواندگی کافی کم ہے اس کی ایک وجہ مسلم علاقوں میں لڑکیوں کے لیے اسکولوں کی عدم موجودگی ہے، کالج تو اور بھی کم ہیں۔ اسی لیے مسلمان طلبا و طالبات ہائر سکنڈری اور کالج کی سطح پر نسبتاً زیادہ نقصان میں ہیں۔

تحفظ اور شناخت:

مسلمان مذہبی اور ثقافتی طور پر اپنی ایک الگ شناخت رکھتے ہیں لباس میں عورتیں پردہ کے لیے نقاب استعمال کرتی ہیں اور مرد داڑھی رکھتے ہیں اور ٹوپی استعمال کرتے ہیں، مگر یہ اپنی شناخت کی وجہ سے بہت سی جگہوں پر تحفظ کے مسائل سے دوچار ہیں، بعض ریاستوں میں یہ شکایت ملتی ہے کہ کسی داڑھی اور ٹوپی والے کو بازاروں، ریلوے اسٹیشنوں اور عوامی جگہوں سے انکوئری کے بہانے پولیس اٹھا کرلے گئی ہے۔اسی طرح نقاب پوش مسلم عورتوں کو شکایت ہے کہ بازاروں، اسپتالوں اور اسکولوں میں ان کے ساتھ سخت اور

نازیبا سلوک کیا جاتا ہے یہاں تک کہ پبلک سیکٹر ٹرانسپورٹ بھی محفوظ نہیں ہے۔اس تناظر میں مسلمانوں کے لیے اپنے سے باہر کی دنیا بعض علاقوں میں انتہائی غیر محفوظ بنادی گئی ہے،ان کے خلاف ہر سطح پر آوازیں کسی جاتی ہیں اور انہیں شک کے دائرہ میں رکھا جاتا ہے، یہاں تک کہ کسی داڑھی والے مسلمان کو برملا آئی ایس آئی کا ایجنٹ قرار دینے میں بھی تامل نہیں ہوتا۔دہشت گردی سے متعلق کسی بھی سانحہ کے بعد پولیس کے ذریعہ مسلم نوجوانوں کا اغوا عام بات ہے۔مسلم خواتین کی عزت وعصمت خاص طور پر فسادات کے موقع سے مسلم خواتین کو تلاش تلاش کرنشانہ بنایا جاتا ہے۔

دینی حالت:

ہندوستان میں مسلمانوں کی دینی حالت کو بھی کسی طرح قابل اطمینان نہیں کہا جاسکتا، ان کی رہائش ہندوستان کے ایسے شہری اور دیہی گاؤں اور محلوں میں ہے جہاں عام طور پر نہ مساجد ہیں،نہیں مکاتب،نہیں اس میں علماء و مبلغین کی آمدورفت ہے۔بہت سی آبادیوں میں یہ تھوڑی تعداد میں موجود ہیں وہ اپنی غربت وجہالت کی وجہ سے دین سے ناآشنا ہیں اور ان کے ایمان کو خطرات لاحق ہیں۔بعض جگہوں پر تو صرف ختنہ یا نکاح کی حد تک ہی مسلمان ہیں وہ حلال وحرام اور پاکی وناپاکی یا نماز،روزے سے بھی ناآشنا ہیں۔اگر ہم جمعہ اور عیدین میں شریک ہونے والوں کی بات کریں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ کل مسلم آبادی کے نصف حصے سے کم اس میں شریک ہوتی ہے اس کی وجہ یہ کہ ان نمازوں میں مسلمان مرد ہی شریک ہوتے ہیں خواتین جمعہ اور عیدین سے بھی محروم ہوتی ہیں۔پنجگانہ نمازوں میں دس ہی فیصد مردوں اور عورتوں پر مشتمل اس کی پابند ہیں۔رمضان کے روزے البتہ نوے فیصد سے زیادہ افراد رکھتے ہیں جس میں مرد اور خواتین دونوں شامل ہیں۔جن لوگوں پر زکوۃ فرض ہے پورے ملک میں غالبًا چالیس فیصد افراد ہی اس فریضہ کی ادائیگی پر عمل کرتے ہیں۔یہی حالت دیگر احکام شریعت اور ان کی اخلاقیات کا ہے۔ہمارا خیال یہ ہے کہ دس فیصد افراد میں جو دینی پختگی ہے۔

ان میں سے پانچ فیصد تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے باضابطہ دینی مدارس میں تعلیم پائی ہے۔

مسلمانوں کی دینی تعلیم:

انگریزوں کے غلبے کے بعد انیسوی صدی میں برصغیر ہند کے مسلمان جن سنگین مسائل سے دوچار ہوئے تھے ان میں دینی مدارس اور تعلیم کے نظام کا خاتمہ بھی تھا۔اس لیے علماء کے سامنے ایک بڑا مسئلہ دین اور تعلیم دین کی حفاظت وفروغ اور دینی شناخت کی بقاء کا تھا۔ چونکہ پہلے سے جس مدارس میں علماء خدمت انجام دے رہے تھے نظام حکومت بدلنے سے وہ مدارس زوال کے شکار ہوگئے یا انگریزوں نے ان علماء کو قید وبند کی صعوبتیں دے کر مدارس پر روک لگانے کوشش کی،مدارس کی جاگیریں اور اوقاف کو ضبط کرکے ذرائع آمدنی کو مسدود کردیا جس کی وجہ سے بڑی تعداد میں اس ملک کے مدارس بند ہوگئے۔

اس کے بعد علماء نے محسوس کیا کہ مدارس کو عوامی شکل دی جائے اور اسے سرکاری سرپرستی سے الگ رکھا جائے،چنانچہ علماء نے ۱۸۵۷ء کے بعد دینی مدارس قائم کرنے کی تحریک شروع کی اور اس کی بنیاد عوامی چندے پر رکھی۔خاص طور پر حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ نے ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم دیوبند قائم کیا۔اور دیگر اکابر علماء نے اس تحریک کو آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا اور اس کے ذریعہ مسلمانوں میں نشأۃ ثانیہ پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی۔یہ کوشش انیسوی صدی سے لے کر بیسویں صدی تک جاری رہی اور اکیسوی صدی میں بھی یہ تحریک جاری ہے۔اس مدت میں جو مدرسے قائم کیے گئے اس کے اثرات مسلمانوں میں دوررس ہوئے اور مسلمانوں میں نسل درنسل علم دین سے وابستگی کا علماء کا منصوبہ کامیاب رہا اس کی وجہ سے انیسوی اور بیسوی صدی میں یہاں کے مسلمان اپنی دینی شناخت کو برقرار رکھنے میں نہ صرف کامیاب ہوئے بلکہ اس تحریک کو دنیا کے ان دیگر ملکوں میں بھی پہنچایا جہاں کے مسلمان بے دینی کے شکار ہوگئے تھے اور جہاں کے

مسلمان مدارس کی حکومتی سرپرستی کے ختم ہونے کے بعد دینی تعلیم کا نظام ختم ہونے سے مشکلات میں مبتلاء ہوگئے تھے۔علماء نے صرف مدارس ہی قائم نہیں کیے بلکہ اسی کے ساتھ ان کی ذات مسلسل طور پر علم اور تعلیم کا مرجع بنی رہی، ان کا گھر لوگوں کے لیے تعلیم گاہ کا کام کرنے لگا۔اور اس تعلیمی تحریک سے اسلامی معاشرہ کے ہر طبقہ نے فیض اٹھایا۔

ہندوستان میں اس وقت مسلمانوں کی دینی ضرورتیں انہی سے پوری ہوتی رہی ہیں۔ مدارس ہی سے مساجد کے امام، مکاتب کے معلم، مفتی، قاضی اور دعوت وتبلیغ کے کام کرنے والے افراد ملتے ہیں بلکہ مدارس سے صحافی، اسلامی اسٹیڈیز کے اسکالر دنیاوی کاموں میں بھی یہاں کے افراد ملتے ہیں جیسے سفارت خانے، ریڈیو، برآمدی تجارت، امور خارجہ اور ثقافتی اداروں کے لیے اردو اور عربی کے افراد مدارس ہی سے آتے ہیں بلکہ کمپوٹر جاننے کی بنیاد پر اردو اور عربی کے کمپوزر بھی یہی سے ملتے ہیں۔ملک کے اندر کی دینی ضرورتیں اسی سے پوری ہوتی ہیں اس تعلیم وتربیت کے نظام کو اور زیادہ مفید بنایا جاسکتا ہے۔امکانات سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لیے مسلسل مشترکہ غور وفکر کی ضرورت ہے، تاکہ ان مدارس کے طلبہ اور اساتذہ کا علمی معیار اور بلند ہو اور مدارس سے ایسے فقہاء ملت تیار ہوں جو موجودہ دور کے نئے مسائل پر مجتہدانہ نگاہ ڈالیں اور شریعت اسلامی کی ابدیت کو دنیا کے سامنے علمی وعملی طور پر پیش کریں۔اس سمت میں جو کام ہونا چاہیے اسس میں ابھی بہت کمی ہے۔اسی طرح ہندوستانی مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے دینی تعلیم کے اس نظام کو اور پھیلائیں اور ان تمام قصبات اور محلوں میں دینی مکاتب کے نظام کو قائم کریں تاکہ وہاں کی نئی نسل دین کی بنیادی تعلیم سے آراستہ ہوں۔

ہندوستانی مدرسوں کو درپیش مشکلات:

مدارس اسلامیہ نے بڑی خدمات انجام دی ہیں یہ نظام اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ

اس کی آئندہ نسلیں اسلامی تعلیمات سے آراستہ رہیں، یہ ہندوستان میں مسلمانوں کے اسلامی تشخص کی علامت بن گئے ہیں اس وجہ سے معاشرہ میں اکثر انہیں شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔مدارس کو دہشت گردی کا اڈہ قرار دیا جانا مسلمانوں کے لیے حد درجہ تشویش کا باعث ہے باوجودیکہ ابھی تک اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا ہے۔یہ مسلم فرقہ خاص طور پر اس میں حاصل کرنے والے بچوں کے لیے تباہ کن ہے۔

چند مشورے:

مسلمانوں بلکہ عام انسانوں کی جان ومال، عقل، نسب، عزت وآبرو کی حفاظت اور معاش ومعاد کے مصالح کی رعایت اسلام کے مقاصد میں ہے۔موجودہ حالات میں ہندستانی مسلمان جس طرح کے دینی، جانی، مالی، عزت وآبرو وغیرہ کے بارے میں عدم تحفظ کے شکار ہیں اس میں ہم سب کی ذمہ داری بنتی ہے کہ درپیش مسائل ومشکلات کا نہ صرف حل پیش کریں بلکہ عملی طور پر اس میں شریک ہوں۔

(۱) جو مسائل اوپر مذکور ہوئے ان میں سے زیادہ تر کا تعلق عام انسانوں سے بھی ہے۔اس لیے ملک میں امن وامان کی فضاء کو برقرار رکھنا اور اس کے لیے کوشش کرنا انتہائی ضروری ہے۔جب تک امن وامان مکمل طور پر سماج کے ہر طبقہ میں قائم نہیں ہوگا اور آپسی نفرت دور نہیں ہوگی اس وقت تک انصاف کا حصول مشکل ہوگا۔

(۲) مسلمانوں کے سماجی، معاشی، سیاسی اور تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے مرکزی وریاستی حکومتوں پر دباؤ دینا اور ان کے ذریعہ نئی اسکیموں کو نافذ کرانا ضروری ہوگا۔

(۳) چوں کہ ہندستانی مسلمان اپنی تعلیمی، معاشی اور سماجی پسماندگی کے ساتھ آپس میں متحد نہیں ہیں بلکہ مختلف گروہ اور ٹولیوں میں منقسم ہیں۔اس لیے وہ اپنے حالات کی اصلاح کے لیے منظم کوشش نہیں کرپاتے ہیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ذاتی اغراض

ومنافع سے گریز کرتے ہوئے آپس کے اتحاد میں کسی طرح کا رخنہ نہ آنے دیں اور مسلک ومشرب کے اختلافات کو فرقہ کی شکل میں نہ بدلیں۔

(۴) دینی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے دینی تعلیم کے نظام کو استوار کرنا اور چھوٹے چھوٹے محلے اور قریوں میں مکاتب ومدارس کو قائم کرنا اور معاشرتی اصلاح کے لیے منظّم کوشش کرنا انتہائی ضروری ہے۔ زکوۃ کے نظام کو بھی اجتماعی طور پر شریعت کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق جاری کرنے کی ضرورت ہے۔

(۵) مسلمانوں سے متعلق مختلف طرح کی سرکاری وغیر سرکاری جو رپورٹیں آئی ہیں ان کا مطالعہ کر کے ان کے اٹھائے ہوئے نکات پر بحث کرنا اور مسلمانوں میں اپنے حالت کو سدھارنے کے لیے عمومی تحریک چلانا ضروری ہے۔

(مضمون نگار امارت شرعیہ پٹنہ کے ناظم ہیں)

☆☆

مسلم مسائل-غور وفکر کے چند گوشے

● مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی

مسلم مسائل، اسباب وحل کے تجزیہ کے لیے جو سوالات اٹھائے جا رہے ہیں، وہ نئے نہیں ہیں، پرانے ہیں، ان مسائل کے حل کے لیے سب سے مضبوط حصہ داری خود مسلمانوں کو ادا کرنی ہوگی، زندہ قومیں کاندھے چڑھ کر منزل تک نہیں جاتیں، کاندھے تو مُردوں کے لیے ہوتے ہیں، اس حصہ داری کی ادائیگی اور فرض کو نبھانے کے لیے ہماری توجہ مسلم نوجوانوں تک جاتی ہے۔ یہ نوجوان ملت کی قوت وطاقت ہیں، وہ مستقبل کی امید ہیں، اس لیے ملکی اور عالمی سطح پر مختلف عنوانات سے انہیں بدنام کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے؛ تاکہ وہ مایوس ہو کر بیٹھ جائیں اور ان کی جھوٹی بدنامی کا چرچا اسقدر کیا جائے کہ لوگوں کا اعتماد ان پر سے اٹھ جائے، ان حالات کو بدلنے میں سیاسی حضرات کلیدی رول ادا کر سکتے ہیں، خصوصا بڑے عہدے پر فائز نامور مسلم سیاست داں، لیکن وہ ملت سے کم اور اپنی پارٹی کی وفاداری سے زیادہ بندھے ہوئے ہیں، ان کے اپنے مفادات ہیں، وہ مسلم سے زیادہ اپنی سیکولر تصویر اجاگر کرنا چاہتے ہیں، انہیں ہر وقت یہ خوف رہتا ہے کہ ہمیں فرقہ پرست نہ سمجھا جائے، جس سے ووٹ بینک پر اثر پڑے، اس لیے ان کی آواز مظالم کے خلاف حلق میں گھٹ کر رہ جاتی ہے، رہ گئیں ملی تنظیمیں تو وہ متحد ہو کر آواز اٹھاتی رہی ہیں، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، امارت شرعیہ بہار اڑیسہ وجھارکھنڈ اور آل انڈیا ملی کونسل نے متحدہ طور پر آواز اٹھائی ہے، اور اس کے اثرات کلی نہیں تو جزوی طور پر محسوس کیے جا رہے ہیں، ابھی ۲۲رتا

۲۴/مارچ ۲۰۱۳ء کے اجلاس اُجین میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے بھی یہ آواز پُر زور انداز میں اٹھائی ہے، رہا ہونے والے مسلمانوں کی باز آبادکاری اور مناسب معاوضہ کی ادائیگی کا مطالبہ بھی کیا گیا ہے، البتہ اس کام کے لیے عدالت کا سہارا کم لیا جا رہا ہے، بعض تنظیمیں اس کے لیے کام کر رہی ہیں، اور مؤثر انداز میں کر رہی ہیں؛ لیکن کام کی تشہیر کبھی کبھی مضر ہوجاتی ہے، اس لیے اس میں احتیاط برتا جا رہا ہے، پر پیگنڈہ کی حد تک لوگوں کے پاس اطلاعات نہیں ہیں، ایسے میں ان کی یہ سوچ حق بجانب ہے کہ عدالت کا سہارا کیوں نہیں لیا جاتا ہے؟

مسلم مسائل کے حل کی کوشش کے لیے پارلیامنٹ اور اسمبلیاں مناسب جگہ ہیں، وہاں کی صورت حال یہ ہے کہ دن بدن مسلمانوں کی نمائندگی ان میں کم ہوتی جا رہی ہے، اس کمی کو دور کرنے کے لئے علاحدہ سیاسی پارٹی کے قیام کا خیال صحیح نہیں ہے، مسلم امیدوار، مسلم اکثریت والے حلقہ میں ہار جاتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ مسلم امیدوار آپس میں لڑ جاتے ہیں اور کم ووٹ لے کر دوسری فرقہ پرست پارٹی جیت جاتی ہے، اس لیے مسلم مسائل کے حل کے لیے حکمت عملی کی ضرورت ہے، علاحدہ سیاسی پارٹی کی نہیں۔

جمہوریت کا اہم ستون قومی میڈیا ہے، یہ کہنا کہ مسلم مسائل کے سلسلے میں میڈیا کا کردار ہمیشہ معاندانہ رہا ہے، صحیح نہیں ہے، گجرات فساد، آسام المیہ، برما میں مسلمانوں کی نسل کشی کو عوام تک پہونچانے میں میڈیا نے اپنی ذمہ داری نبھائی ہے، اور ان کا کردار قابل تعریف رہا ہے، البتہ ہر جگہ کچھ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں، جو ہندوستانی کے بجائے مسلم اور غیر مسلم کی عینک سے مسائل کو دیکھتے ہیں، جس کی وجہ سے بات بگڑ جاتی ہے۔ ہمارا اپنا کوئی میڈیا نہیں ہے، ایجنسیاں خبریں دیتی ہیں اور ہمارا کام ان میں صرف انتخاب کا رہ گیا ہے۔

ان حالات کے باوجود ہماری پس ماندگی دور ہوسکتی ہے اگر ہم تعلیم، اتحاد اور سیاسی

شعور کے حوالے سے اپنی جگہ سماج میں بنا سکیں، یہ امت جو تعلیم کے نام پر برپا کی گئی؛ جس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنا تعارف معلم کی حیثیت سے کرایا، اور جن کے کار نبوت میں تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ کو بنیاد اور اساس بنایا گیا، وہ امت آج جہالت میں نامور ہو رہی ہے، مسلم اکثریت والے علاقے (بہار کے تناظر میں) خواندگی کے تناسب میں دوسروں سے پیچھے ہیں، یہ افسوس کی بات ہے، یہ معاملہ بے کسی اور بے بسی کا نہیں، بے حسی کا ہے اور پس ماندگی دور کرنے کے لیے اس بے حسی کا ہر سطح پر ہمیں خاتمہ کرنا ہوگا۔

تعلیم کو سماجی سطح پر مؤثر بنانے کے لیے مدارس اسلامیہ کے نصاب میں عصر حاضر کے علوم کی شمولیت کی آواز دانشوروں کی طرف سے اٹھتی رہی ہے، میری رائے میں وسائل کے طور پر جن عصری علوم کی ضرورت ہے اس میں شمولیت تو ٹھیک ہے؛ مثلاً کمپیوٹر کی تعلیم، زبان کی حیثیت سے انگری اور ہندی کی تعلیم، روزمرہ کی ضروریات اور ترکہ کی تقسیم کے لیے حساب کی تعلیم، یہ علوم داخل کیے جاسکتے ہیں، لیکن بقدر ضرورت، اتنا نہیں کہ مدرسہ کی تعلیم کا مزاج بدل جائے، آخر انجینئرنگ کالج سے ڈاکٹر اور میڈیکل کالج سے انجینئر اور سافٹ ویر، ہارڈ ویر کے ماہرین پیدا کرنے کی مانگ پاگل پن ہے تو مدارس ہی سے کیوں چاہا جاتا ہے کہ اس سے ماہر انجینئر، ڈاکٹر، قانون داں سبھی کچھ نکلیں، علم دین و دنیا کی تقسیم حقیقی نہیں، عملی اور انتظامی ہے، اس لیے عصری علوم کے مضامین کی شمولیت سے مدرسہ کی تعلیم کا مزاج بدل کر رہ جائے گا، ہم تو مدارس اسلامیہ کی جدید کاری کے نام پر حکومت کو بھی اس کی اجازت نہیں دے سکتے؛ اس سلسلے میں مناسب مشورہ یہ ہے کہ حکومت کوئی ماڈل مدرسہ جدید کاری کے تناظر میں قائم کر کے دکھائے کہ ہم جو جدید کاری چاہتے ہیں، اس کی تجربہ گاہ یہ ہے، اگر وہ تجربہ سے مفید ثابت ہوگا تو مسلمان اس سلسلے میں ضروری اقدام کریں گے، جدید کاری کا صرف نعرہ اور اس کے لیے ہمارے موجودہ وسائل کا ہی استعمال، حکومت کی

نیک نیتی پر سوالیہ نشان لگا رہا ہے۔

یہ اور اس طرح کے دیگر مسلم مسائل کو اقتدار اعلیٰ تک لے جانے اور متحدہ کوشش کے لیے حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے آل انڈیا ملی کونسل قائم کیا تھا، یہ اب بھی قائم ہے، اگر وہ مضبوط اور مستحکم انداز میں سرگرم ہو جائے تو الگ سے متحدہ ملی فورم کی ضرورت نہیں ہے، آل انڈیا ملی کونسل کے جو تشکیلی عناصر ہیں، وہ مکمل ہیں اور تجربات کی کسوٹی پر وہ مفید ثابت ہو چکے ہیں، اس لیے پوری قوت وطاقت کے ساتھ قاضی صاحبؒ کے مقرر کردہ خطوط پر ملی کونسل کو سرگرم کرنے کی ضرورت ہے، ملی کونسل کے پاس قیادت بھی ہے اور وسائل بھی۔ ضرورت توازن کے ساتھ اس کے استعمال کی ہے اور بس۔

(مضمون نگار امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ کے نائب ناظم ہیں)

☆☆

2012 میں مضطرب رہے مسلمان

● عبدالقادر شمس

ہندوستان سمیت دنیا بھر کے افراد سن 2013 کا استقبال کرتے ہوئے اس امید کا اظہار کر رہے ہیں کہ آنے والا برس ماضی سے زیادہ خوشگوار، ترقی وخوشحالی سے بھرپور اور امن وعافیت سے معمور ہوگا، نیز یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ تیز رفتار ترقی کرنے والا ملک ہندوستان کئی اعتبار سے عالمی سطح پر اپنے امتیازات کا سکہ جمائے گا لیکن اس ابدی حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ مستقبل کی کامیابی کا ہر عنوان ماضی کی مثبت سرگذشت اور حال کی جدوجہد میں مخفی ہوتا ہے۔ اگر اس تھیوری کو تسلیم کر لیا جائے تو سال گذشتہ کے بارہ مہینے کی جملہ سرگرمیاں ایسی نہیں کہ اس کی بنیاد پر ہم کسی روشن مستقبل کی توقع کر سکتے ہیں۔ بلاشبہ ہندوستان جملہ بڑی طاقتوں کے لیے پرکشش اور محور کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اس سچائی سے ہم روبرو ہوئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے کہ افرادی قوت سے مالا مال ہندوستان اس وقت تک دنیا کے سامنے سپر پاور نہیں بن سکتا جب تک یہاں کی سبھی طبقاتی اکائیاں اپنے حقوق ووقار کے ساتھ ترقی میں اپنا کردار نہ ادا کریں۔ خاص طور پر ہندوستان کی دوسری سب سے بڑی اکثریت یعنی مسلمانوں کو تحفظ، قدم سے قدم ملا کر ترقی کے جملہ امکانات میں اہم رول ادا کرنے کے مواقع اور ان کے خلاف ہونے والی سازشوں کا خاتمہ جب تک نہیں ہو جاتا اس وقت تک ہم ایک مضبوط اور ترقی یافتہ ہندوستان کا تصور نہیں کر سکتے۔ اس حوالے سے اگر ہم 2012 کا جائزہ لیں تو خوشیاں کم اور مایوسی وحرماں نصیبی زیادہ نظر آتی ہے۔

2012 میں مسلمانوں کے تعلق سے جتنے معاملے سامنے آئے ان میں تعمیر وترقی کی بجائے مسائل ومشکلات، وعدۂ فردا اور ظلم وناانصافی زیادہ دیکھنے کو ملی۔

دہشت گردی اور مسلمان:

2012 کے دوران مسلمانوں کے تعلق سے جس معاملے نے پورے ملک کو جھنجھوڑ دیا، وہ تھا دہشت گردی کے الزامات میں مسلم نوجوانوں کی گرفتاری۔ کشمیر کی وادیوں سے لے کر گجرات اور مہاراشٹر کے سمندری ساحل تک اور جنوب ہند سے لے کر یوپی، بہار اور شمال مشرق کی ریاستوں تک، دہشت گردی کے عنوان سے مسلم نوجوانوں کی اندھادھند گرفتاری نے پورے ملک کے مسلمانوں کو نہ صرف خوف وہراس میں مبتلا کردیا بلکہ والدین اپنی اعلیٰ تعلیم یافتہ اولادوں کو دوسری ریاست برائے ملازمت بھیجنے میں ہچکچانے لگے۔ شمالی بہار سے چند مسلم نوجوانوں کو جب گرفتار کیا گیا تو اعظم گڑھ کو دہشت گردی کا ہب بتانے والے پولیس محکمہ اور متعصب میڈیا نے شمالی بہار کو نئے اعظم گڑھ سے تعبیر کرتے ہوئے یہ لکھا کہ اب دہشت گردوں کی نئی پناہ گاہ شمالی بہار ہوگیا ہے جہاں نیپال کی کھلی سرحد سے پاکستانی دہشت گرد یہاں آکر نئے دہشت گردوں کی بھرتی کررہے ہیں۔ شمالی بہار سے محمد قتیل صدیقی، حافظ آفتاب عالم، محمد طارق انجم حسن، غیور احمد جمالی، گوہر عزیز خمینی کو دہلی پولس نے انڈین مجاہدین کے دہشت گرد ہونے کے الزام میں گرفتار کیا تو کمال حسن اور محمد کفیل اختر کو بنگلور پولیس نے اپنی حراست میں لیا۔ ان تمام گرفتاری کو بنگلور کے چنا سوامی اسٹیڈیم کے باہر بم دھماکہ اور دہلی جامع مسجد میں ہونے والی فائرنگ کی وجہ سے ضروری باور کراتے ہوئے پولیس کا کہنا تھا کہ ہندوستان بھر میں انڈین مجاہدین کا ایک نیٹ ورک ہے جس سے یہ تمام افراد جڑے ہوئے ہیں اور ملک بھر میں کسی وقت بھی دھماکہ کرسکنے کی اہلیت رکھتے ہیں، جب کہ دہلی پولس نے سعودی عرب سے حوالگی کے بعد فصیح محمود کو یہ کہہ کر گرفتار

کیا کہ وہ انڈین مجاہدین کے تمام کارندوں کا ماسٹر مائنڈ ہے۔

دوسری طرف اسد خان، عمران خان اور سید فیروز کو پولیس نے گرفتار کرکے ان پر یہ الزام لگایا کہ وہ بہار کے بودھ گیا اور دہلی کے کئی مقامات پر دھماکہ کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ اسی طرح سید مقبول عرف زبیر کے تعلق سے بھی پولیس کا دعویٰ ہے کہ وہ بودھ گیا میں خودکش دھماکہ کی منصوبہ بندی کررہا تھا اور اس کا تعلق پنے بیسٹ بیکری دھماکہ کے ملزموں سے بھی تھا۔ 2012 میں ہی ابوجندال کو گرفتار کیا گیا جن کے بارے میں پولیس کا کہنا ہے کہ وہ ممبئی حملوں کا کلیدی ملزم ہے۔ پولیس نے اس پر الزام لگایا ہے کہ وہ ممبئی حملوں کے دوران پاکستان میں موجود تھا اور ممبئی حملہ کو انجام دینے والے سبھی دہشت گردوں کی رہنمائی کررہا تھا۔ دوسری طرف بے گناہ مسلم نوجوانوں کی گرفتاری بھی 2012 میں اہم عنوان بنی رہی۔ محمد عامر کو چودہ برس بعد جب باعزت بری کیا گیا اور کئی اور مسلم نوجوانوں کو ثبوت وشواہد نہ ہونے کی وجہ سے عدالتوں کو رہا کرنا پڑا تو دانشوروں، حقوق انسانی کے لیے کام کرنے والی تنظیموں اور مسلم جماعتوں کا فکرمند ہوجانا فطری امر تھا، چنانچہ یہ مطالبہ بار بار کیا جاتا رہا کہ بے گناہوں کو جیل سے رہا کیا جائے۔

نمیش کمیشن کی رپورٹ:

یوپی کے اعظم گڑھ اور جونپور سے مولانا طارق قاسمی اور خالد مجاہد کو پولیس نے گرفتار کیا اور یہ باور کرایا کہ یہ دونوں بم دھماکوں میں ملوث تھے لیکن پولیس کی اس تھیوری کو کبھی کسی نے قبول نہیں کیا چنانچہ میڈیا اور دانشوروں کے شدید دباؤ کی بنا پر مایاوتی حکومت نے جسٹس نمیش کی سربراہی میں ایک کمیشن قائم کیا تاکہ اس معاملہ کی حقیقت سامنے آسکے۔ جسٹس نمیش نے اپنی رپورٹ سونپ بھی دی لیکن مایاوتی حکومت نے اس رپورٹ کی کاپی متعلقہ ضلع مجسٹریٹ کو بھیج دی جس کی وجہ سے اس کے مشمولات منکشف ہوگئے جس سے یہ

ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ مشتبہ دہشت گردوں کو پولیس نے ناجائز طور پر گرفتار کیا تھا۔ چنانچہ 2012 کا یہ اہم انکشاف ثابت ہوا اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ 2012 میں سماجوادی پارٹی کی حکومت نے مذکورہ کمیشن کی رپورٹ کو اسمبلی میں نہیں پیش کیا جس کی وجہ سے مذکورہ دونوں بے گناہ اب بھی جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہیں۔

آسام مسلم کش فسادات:

جس طرح 2002 گجرات مسلم نسل کشی کے لیے پوری دنیا میں مشہور ہے اسی طرح 2012 کو آسام مسلم کش فسادات کے لیے یاد کیا جائے گا۔ آسام میں بوڈو قبائلیوں نے پوری منصوبہ بندی کے ساتھ مسلمانوں کے پانچ سو سے زائد گاؤں کو جلا کر راکھ کر دیا اور مسلم آبادیوں کو اس طرح تاراج کیا کہ اکثر مسلمانوں کو پناہ گزینی کی زندگی جینے پر مجبور ہونا پڑا۔ غیر سرکاری اطلاع کے مطابق آسام فساد کے دوران دو سو سے زائد لوگوں کی موت ہوئی جب کہ پانچ لاکھ سے زائد افراد پناہ گزیں ہوئے۔ اس فساد میں جہاں بوڈو قبائلی علاحدہ اسٹیٹ کے قیام کے لیے مسلمانوں پر ظلم کر رہے تھے وہیں ریاستی حکومت اور پولیس انتظامیہ مجرمانہ عدم فعالیت کا ثبوت پیش کر رہی تھی۔ شروع میں تو اس فساد کی ذمہ داری مسلمانوں خاص طور پر آل انڈیا یونائیٹڈ ڈیموکریٹک فرنٹ پر ڈالنے کی کوشش کی گئی لیکن مختلف تحقیقاتی رپورٹ اور پناہ گزیں کیمپوں میں مسلمانوں کی اکثریت کو دیکھ کر اندازہ ہوگیا کہ اس فساد کے پیچھے بوڈو لینڈ کا مطالبہ کرنے والوں کا ہاتھ تھا اور حکومت فساد کو روکنے میں ناکامی کا ذمہ دار تھی۔

فرقہ وارانہ فسادات:

ہندوستان کی آزادی کے بعد سے ہی مسلمانوں کو فسادات کی مار جھیلنی پڑ رہی ہے، 2012 میں بھی کئی فسادات ہوئے جو مسلمانان ہند کی تشویش کا باعث بنے۔ متھرا کے کوسی

مجموعہ القاسم: جلد پنجم مسلم مسائل اور اس کا حل

کلاں میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان تو تو میں میں ہوئی جو بعد میں فساد کی شکل اختیار کر گئی۔ تین افراد کی موت واقع ہوگئی اور کئی دنوں تک حالات کشیدہ رہے۔ اسی طرح پرتاپ گڑھ میں ہندو مسلم فساد ہوا جس کے بعد کافی دنوں تک کشیدگی رہی۔ ڈاسنہ ضلع غازی آباد میں احتجاج کر رہے مسلمانوں پر جب پولیس نے فائرنگ کر دی تو یہاں بھی فرقہ وارانہ تشدد کی شکل پیدا ہوگئی جس پر بعد میں قابو پالیا گیا۔ حیدرآباد کے چار مینار کے قریب مندر کی تعمیر کو لے کر فساد برپا ہوگیا اور تشدد کی وجہ سے حکومت کو کرفیو نافذ کرنا پڑا۔ ناندیڑ مہاراشٹر میں بھی مجلس اتحاد المسلمین اور شیو سینا کے کارکنوں کے درمیان کشیدگی ہوئی۔ کل ملا کر 2012 بھی فرقہ وارانہ فسادات سے پاک نہ رہ سکا۔

مسلم ریزرویشن:

کہتے ہیں کہ جب غربت انسان کے سامنے منھ کھولے کھڑی رہتی ہے تو پھر ترقی کی ساری امنگیں خود کے قدموں تلے روندی چلی جاتی ہیں اور صلاحیتیں خود پر ماتم کناں ہوتی ہیں۔ اس سچائی کا ادراک راجندر سچر سے زیادہ کسی اور کو نہیں ہوا ہوگا، شاید اسی لیے جسٹس راجندر سچر نے اپنی معرکۃ الآرا رپورٹ میں بڑی دردمندی کے ساتھ یہ بات لکھی ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت دلتوں سے بھی بدتر ہوگئی ہے، نیز انہوں نے اس بات کی بھی سفارش کی تھی کہ ریزرویشن کے ذریعے پسماندگی کے دلدل میں ہاتھ پاؤں مار رہے مسلمانوں کو مین اسٹریم میں لایا جاسکتا ہے۔

2012 میں مسلم ریزرویشن کی سیاست بھی خوب ہوئی، اتر پردیش اسمبلی انتخابات کے دوران کانگریس نے اقلیتوں کے لیے 4.5 فیصد ریزرویشن کا اعلان کیا تو سماجوادی پارٹی نے وعدہ کیا کہ اس کی حکومت آئے گی تو وہ مسلمانوں کی آبادی کے تناسب سے ریزرویشن پالیسی نافذ کریں گے۔ دوسری طرف اس پر آگ بگولہ ہونے والے وشو ہندو

پریشد اور بی جے پی کے لیڈران نے ’صلاحیت‘ کے خوشنما نعروں کی گونج میں خوب سیاست کی اور ان کی ہر ممکن کوشش رہی کہ ریزرویشن کی تمام راہوں میں روڑے اٹکا دیے جائیں، اس کے لیے ملک گیر مہم چلائی گئی اور پورے ملک میں ایسی افراتفری مچائی کہ الامان والحفیظ۔ مسلمانوں کو ریزرویشن تو نہیں ملا لیکن اس پر سیاست خوب ہوئی، اب بھی کانگریس اس اعلان کے نفاذ کی بات کر رہی ہے لیکن مسلم ریزرویشن کا خواب کب شرمندۂ تعبیر ہوگا یہ کسی کو نہیں معلوم۔

یوپی اسمبلی انتخابی نتائج اور مسلمان:

2012 میں پورے ملک میں یوپی اسمبلی انتخابات کی گونج سنائی دیتی رہی اور شمال سے لے کر جنوب تک اور مشرق سے لے کر مغرب تک سیاست دانوں کے بیانات میں یوپی انتخابات کا نفع ونقصان پوری طرح نظر آیا۔ یہ خوش آئند بات ہے کہ پہلی بار مسلمانوں کی اجتماعی قوت کا اعتراف کیا گیا اور مسلمانوں کی پذیرائی کی گئی کہ انہوں نے ٹیکٹیکل ووٹنگ کی اور انتشار سے بچنے کی حتی الامکان کوشش کی۔ چنانچہ اتر پردیش میں برسراقتدار بہوجن سماج پارٹی کی سپریمو مایاوتی نے صاف طور پر یہ اعتراف کیا کہ مسلمانوں کی ناراضگی ان کی شکست کا سبب بنی۔ چنانچہ 2012 کو یوپی انتخابی نتائج کے حوالے سے مسلمانوں کو ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔

اقلیتی وزارت کی ناقص کارکردگی:

یوپی اے حکومت نے جب پہلی بار مرکزی کابینہ میں اقلیتوں کے امور کی راست دیکھ ریکھ کے لیے اقلیتی وزارت کی تشکیل کی تھی تو اس کی بڑی پذیرائی ہوئی تھی لیکن اس وزارت کی ناقص کارکردگی 2012 میں صحافتی حلقوں میں موضوع بحث رہی، کیونکہ پارلیمانی کمیٹی نے یہ انکشاف کیا کہ اقلیتی وزارت فنڈ خرچ کرنے میں نہ صرف ناکام رہی بلکہ اس کی

کارکردگی صفر سے کچھ ہی زیادہ رہی۔ اس ناکامی کی ذمہ داری محکمہ کے وزیر سلمان خورشید پر ڈالی گئی جس پر مسلمانوں کو بڑی مایوسی ہوئی۔ حکومت سچر کمیٹی کی سفارشات کے نفاذ کا بار بار اعلان کرتی رہی لیکن کثیر مسلم آبادی والے نوے اضلاع کے لیے مختص ترقیاتی فنڈ استعمال نہیں ہوسکا، چنانچہ اس لحاظ سے 2012 مسلمانوں کے لیے مایوس کن سال رہا۔

حج فنڈ:

سابق ڈپٹی اسپیکر راجیہ سبھا، کے رحمٰن خان جو بعد میں اقلیتی محکمہ کے وزیر بنائے گئے، کی کوششوں سے 2012 میں ہی ایک کانفرنس منعقد کی گئی جس میں خاص طور ملیشیا کے ’تبونگ حاجی‘ کے ذمہ داروں کو مدعو کیا گیا۔ اس کانفرنس کا مقصد ہندوستان میں بھی تبونگ حاجی کے طرز پر حج کمیٹی کی تشکیل کرنا تھا، اس پہل کو مسلمانان ہند نے سراہا اور امید ظاہر کی کہ آئندہ حج کمیٹی کی تصویر بدلے گی اور عازمین حجاج کو ہونے والی طرح طرح کی پریشانیوں سے نجات ملے گی۔ اسی کے ساتھ ساتھ سپریم کورٹ نے حج سبسڈی کو ختم کرنے کا مشورہ دیا اور وی آئی پی کوٹہ کے خاتمہ کی بات کہی۔

(مضمون نگار صحافی اور ہفت روزہ عالمی سہارا سے وابستہ ہیں)

☆☆

ہندوستانی مسلمانوں کو درپیش چیلنج اور مسائل

”بات نکلے گی تو پھر دور تلک جائے گی“

● ابومحمد مفتی احمد نادر القاسمی

مسلم نوجوان کی منصوبہ بند گرفتاریاں:

میں یہ نہیں کہتا کہ اگر کوئی مجرم ہے تو اسے گرفتار نہ کیا جائے اس کا تعلق خواہ کسی بھی مذہب اور جماعت سے ہو، مجرم تو مجرم ہے۔ یا اس کو ملک کے دستور اور قانون کے مطابق سزا نہ دی جائے۔ مگر ادھر ۱۹۹۲ء کے بعد جو بم دھماکے ہوئے، ان دھماکوں کے بعد مشتبہ حالت میں بعض بھگوا تنظیم کے کارکنان دیکھے گئے، اسی طرح دوسری جگہوں پر بھی وہ کھلے عام نظر آئے، اس کے باوجود بڑی خوبصورتی سے اس کو دبایا گیا اور ان تمام دہشت گردانہ، کاروائیوں کے بعد منصوبہ بند طریقے سے صرف مسلم نوجوانوں کی گرفتاریاں ہوئیں، سوچنے کی بات یہ ہے کہ ملک کی تفتیشی ایجنسیوں کی طرف سے آنکھیں بند کرکے یکطرفہ کاروائیاں کیوں ہوئیں، اور دوسرے احکامات پر غور کیوں نہیں کیا گیا؟ اور آج بھی کبھی لشکر طیبہ، تو کبھی لشکر جھنگوی، تو کبھی انڈین مجاہدین اور کبھی اسلامی جہاد کے نام پر کبھی اعظم گڑھ سے تو کبھی مہاراشٹرا سے، تو کبھی دربھنگہ اور مدھوبنی سے مسلم نوجوانوں کو بالخصوص وہ نوجوان جو تعلیم میں آگے بڑھنے کی جدوجہد کررہے ہیں ان کو مختلف بہانوں سے اٹھایا، بلکہ اغوا اور کڈنیپنگ کی طرح گرفتار کیا جارہا ہے اور بڑی ہوشیاری اور حکمت عملی سے ڈنڈے کے زور پر ان سے من چاہا بیان لے کر ان کی قیمتی زندگی کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے برف کی طرح

پگھلایا جارہا ہے۔ ان تمام ظالمانہ کارروائیوں کے پس پردہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں صرف اور صرف ملک کی مسلم دشمنانہ اور متعصّبانہ ذہنیت اور پالیسی کارفرما ہے۔ اس کو ہم نہ بی جے پی کی ذہنیت سے جوڑتے ہیں اور نہ ہی آر ایس ایس اور کانگریس کی پالیسی قرار دیتے ہیں، بلکہ یہ من جملہ بھارت میں مسلم دشمنی کے تحت طے شدہ، منصوبہ بند اور متفقہ سازش کا نتیجہ ہے۔ اس میں کسی بھی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے اور ایسا بھی نہیں کہ یہ سلسلہ بند ہوجائے گا، بلکہ یہ چلتا رہے گا، کیونکہ یہ دراصل اس ایجنڈے کا حصہ ہے، جس میں یہ طے کیا گیا ہے کہ بھارت کا مسلمان یا تو کفر اور شرک کے تابع ہوکر زندگی گزارے اور کفریہ قومی دھارے میں شامل ہوجائے، یا پھر چوتھے درجہ کا شہری ہوجائے جو ہندوؤں کے رحم وکرم پر ان کے غلام کی حیثیت سے اس ملک میں زندہ رہے۔ مسلمانوں کو اس مقام پر لانے کے لئے ان کا سب سے پہلا ایجنڈا پورے بھارت میں فرقہ وارانہ فسادات کرانا تھا اور انہوں نے سب مل کر اس پر خوب عمل کیا۔ یہاں پر ملک میں ہوئے فسادات کی داستان دہرانے کی شاید کوئی ضرورت نہ ہو اور اب فسادات سے انہوں نے دیکھا کہ دنیا میں بدنامی ہوجارہی ہے، لہٰذا دہشت گردی بڑا خوبصورت پلیٹ فارم ہے اور دنیا کو خوب سمجھ بھی میں آتا ہے اور سب نے دہشت کے خلاف اتفاقی مہر بھی لگادی ہے۔ اب کوئی دہشت گرد ہو یا نہ ہو دہشت گرد بنانا اور طے کرنا تو ان کا کام ہے، کسی بھی شخص کو اور کسی بھی نوجوان کو پکڑنا ہے، اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈالنا اور اسے پس زنداں کرنا ہے، اس میں کیا حرج ہے، پکڑلیں گے، میڈیا اور اخبارات کو پہلے ہی سے تیار کررکھا ہے۔ پولیس نے خبر بھیجی فلاں دہشت گرد تنظیم کا دہشت گرد فلاں جگہ اے ٹی ایس کے ہاتھوں دبوچا گیا، تمام اخبارات میں خبر چھپ گئی اور ٹی وی میں خبر کی ریل چلنے لگی۔ اب کسی کو کیا مطلب ہے کہ وہ جاننے کی کوشش کرے کہ پکڑا جانے والا کیسا آدمی تھا، کیا کرتا تھا، بےقصور تھا، مسافر تھا، بس یہ دیکھ رہا ہے کہ اسے دہشت گرد کہا گیا ہے تو دہشت گرد ہے اور بس۔ بیچارا جیل

میں دس سال سڑتا رہے اور ثابت کرتا رہے کہ وہ بے قصور ہے اور جب تک ثابت کرے گا، تب تک تو دس سال ہو چکے ہوں گے، اس کی ذہنی اور جسمانی صلاحیت ختم ہو چکی ہوگی اور یہی چاہتا ہے بھارت کا مسلم دشمن طبقہ اور یہی ہے ان کا متعصّبانہ اور ہندوانہ نظریہ۔

غرض یہ کہ اس ملک سے مسلمانوں کو ختم کرنے یا اپنے میں ضم کر لینے کی پہلی قسط ''فرقہ وارانہ فسادات'' تھی اور دوسری قسط مسلمانوں کی طاقت کو ختم کرنے کے لئے نوجوانوں کی گرفتاریاں ہیں، جیسے آپ اس کھیل کی دوسری اننگ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ورنہ تو دنیا جانتی ہے کہ بھارت میں مسلمانوں کو آخر دہشت گردی کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ اس کی کوئی معقولیت تو ہونی چاہئے، بھارت میں وہ نہ تو حکومت کا خواہاں ہے اور نہ اقتدار کا، آزادی کے بعد سے آج تک بھارت کا مسلمان تو صرف یکساں حقوق اور اپنے مذہب پر آزادی سے عمل کرنے کا مطالبہ کرتا رہا ہے۔ اپنے اس ملی تشخص کے علاوہ اس مظلوم قوم نے اور کیا مانگا، حقوق تو آج تک ملے نہیں، الٹے دہشت گرد ہونے کا خطاب ضرور مل گیا۔ سوچنے کی بات ہے کہ آخر یہ دہشت گردی کی راہ پر کیوں جائیں گے؟ اس کو بھی تو سامنے رکھنا چاہئے، اس نے تو کبھی نہیں کہا کہ ہم بھارت کو دارالاسلام بنانا چاہتے ہیں، ملک کے متعصب ہندو اور فرقہ پرست جماعتوں نے ضرور ہمیشہ اس کو ہندو راشٹر بنانے کی بات کہی ہے، تو دیش دشمن اور دہشت گرد تو وہ ہوں گے۔ اس لئے ان ساری گرفتاریوں کا ڈرامہ مسلمانوں اور مسلم نوجوانوں کو مٹانے کی منصوبہ بند سازش اور بہانے بازی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور اس کو عدالت کی منصفانہ کارروائیوں نے ثابت کر دیا ہے، ملک کے انسانیت پسند لوگوں کیلئے لمحہ فکریہ ہے، یہ ملک کا مسئلہ صرف مسلمانوں کا نہیں ہے۔ آپ کا سوال بالکل مناسب اور درست ہے کہ یہ مسلمانوں کو ہر سطح پر کمزور کرنے کی منصوبہ بند سازش ہے۔

مسلمان وارباب سیاست:

بات دراصل یہ ہے کہ وہ مسلم سیاست داں جن کی رسائی ایوان بالا تک ہو جاتی ہے

اور وہ پارلیمنٹ یا اسمبلی کے ممبر منتخب ہو جاتے ہیں تو بحیثیت مسلم قوم کے نمائندہ ہونے کے وہاں نہیں جاتے، بلکہ منتخب ہونے کے بعد بحیثیت سیاسی لیڈر وہاں جاتے ہیں۔ وہاں پارلیمنٹ اور اسمبلی کا دستور اور پروٹوکول چلتا ہے، وہاں قومی رہنما اور ملی رہنما کی حیثیت نہیں چلتی، بڑی مشکل سے یہ موقعہ ان کے ہاتھ آتا ہے، بھلا اس کو وہ انصاف اور قوم کی بات کر کے کیوں ضائع کریں گے؟ ان کی سیاسی مجبوری ہوتی ہے، جب ان کو وہاں تک پہنچنا ہوتا ہے تو چونکہ ان کو معلوم ہے کہ اگر الیکشن اور اس سے پہلے جذباتی اور قومی باتیں نہیں کریں گے تو ووٹر ان کے گرویدہ نہیں ہوں گے، جب منتخب ہو جاتے ہیں تو ان کے ہاتھ پاؤں بندھ جاتے ہیں، اس لئے وہ مظالم کے خلاف بول نہیں پاتے اور بول بھی نہیں سکتے، اور کسی مسلمان کو اس بات کی منتخب نمائندگان سے یا وہ افراد جو حکومتی مناصب پر ہوتے ہیں ان سے اس کی توقع بھی نہیں کرنی چاہتے۔ ان کا منصب خود آواز بلند نہ کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، حقیقت یہی ہے، خواہ اس کا آپ جو بھی نام دیجئے۔ آپ اگر اس کا اندازہ لگانا چاہیں تو اس بات سے لگا سکتے ہیں، جب بابری مسجد شہید ہوئی تو غیر مسلم ایمپیز نے پارلیمنٹ سے استعفے دئے، مگر کتنے مسلم ایم پی تھے جنہوں نے اس بات پر پارلیمنٹ میں استعفیٰ پیش کیا؟ آپ کو اچھی طرح یاد ہوگا۔ تو عرض کرنا یہ ہے کہ سیاست اور مناصب کی یہ الگ دنیا ہے۔ ان سب معاملات میں مسلمانوں کا کسی طرح کی توقع ان سے رکھنا یہ مسلمانوں کی بھول ہوگی، بس چلنے دیجئے، اور مسائل حل کرنے میں تو کوئی اور متحدہ حل تلاش کرنے کی کوشش کیجئے۔

ملی تنظیموں کا اتحاد:

یہ سوال بہت اچھا ہے اور اس وقت ملت جس انتشار کا شکار ہے اور اس کا فائدہ اٹھا کر مسلم دشمن عناصر اپنے مقاصد میں کامیاب ہو رہے ہیں، اس لحاظ سے بھی قابل قدر ہے۔

اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ اس وقت ملت کے وہ مسائل جن کا تعلق حکومت اور عدالت سے ہے، جیسے مسلم ریزرویشن کا مسئلہ، بار بار مسلم پرسنل لاء میں مداخلت کئے جانے کا مسئلہ، فرقہ وارانہ فسادات کا مسئلہ، مسلم نوجوانوں کی گرفتاری کا مسئلہ، کوئی بھی مسئلہ ہو ان مسائل کے حل نہ ہونے کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ بھارت کی تمام مسلم تنظیمیں اپنے اپنے طور پر علاحدہ علاحدہ کام کرتی ہیں اور الگ الگ آوازیں اٹھاتی ہیں۔ مجھے ایسا یاد آتا ہے کہ ماضی میں اس طرح کی کوئی کوشش ہوئی تھی اور خود احمد بخاری صاحب نے ایک تنظیم کا اعلان ’’متحدہ مجلس عمل‘‘ کے نام سے کیا تھا، اس کا اجلاس بھی جامع مسجد کے پارک میں ہوا تھا، مگر اس کے بعد کبھی اس کی آواز ہمیں نہیں سنائی دی، بہر حال میرا مقصد تنقید نہیں ہے، بلکہ علی سبیل التذکرہ یہاں اس کا ذکر کر دیا کہ ایسی کوشش ماضی میں ہوئی تھی، نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔

تمام ملی تنظیموں کا مشترکہ محاذ ملی مفاد میں یقیناً بننا چاہئے اور مل کر نہ صرف نوجوانوں کی گرفتاری کے خلاف، بلکہ دیگر مسائل میں بھی آواز اٹھانی چاہئے۔ اس کام کے لئے جب تمام تنظیموں کا کوئی فیڈرل بنے گا، متحدہ محاذ بنے گا، اور اس محاذ کا ظاہر ہے کوئی نہ کوئی امیر انہیں میں سے منتخب ہوگا، سب سے بڑی رکاوٹ اس راہ میں یہ ہے کہ مسلم تنظیموں کے قائدین ایک دوسرے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تو ہیں، مگر اپنے میں سے کسی کو قائد اور رہنما اور امیر ماننے کو تیار نہیں ہیں اور یہ کام بغیر کسی کو متحدہ امیر بنائے اور مانے ممکن نہیں ہے۔ ملک میں مسلم ایشوز پر الگ الگ آواز تو ہمیشہ اٹھتی رہی ہے اور اسی الگ الگ آواز اور بیان کا یہ نام دیا جاتا رہا ہے کہ تمام تنظیموں نے مشترکہ آواز بلند کیا، متحدہ آواز اور مستحکم لائحہ عمل کے فقدان کی بنیادی وجہ یہی ہے اور بظاہر اس کی توقع بھی نظر نہیں آتی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ آج مسلم تنظیموں میں اخلاص کی کمی ہے، آج کام کم اور تشہیر زیادہ ہے، بلکہ کام ہو نہ ہو اخبارات و رسائل میں خبریں خوب آتی ہیں، بلکہ خبریں بھی اب تو

اشتہارات کی شکل میں آتی ہیں، آج ملک کو ساٹھ سال آزاد ہوئے ہو گئے، کوئی بھی مسلم تنظیم اپنی کریڈٹ پر یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ اس نے کسی اجتماعی اور فلاحی کام کے لئے آواز اٹھائی، میمورنڈم پیش کیا اور وہ کام ہو گیا، اب تک تو ایسا ہی دیکھنے میں آیا ہے، اگر ہماری تنظیمیں مخلص ہیں تو نام ونمود سے اوپر اٹھ کر اس بات کو دیکھیں کہ کام ہونا چاہئے، کام خواہ ساتھ ہو کر ہو یا الگ الگ، مگر ہماری ملی تنظیموں نے ایسا کبھی نہیں سوچا، سب نے اپنی اپنی الگ الگ آواز اٹھائی، جلسے کئے، ریلیاں کیں، کنونشن کئے، نتیجہ کچھ نہیں، وجہ اتحاد کا فقدان ہے، متحد ہو کر اس لئے بھی آواز نہیں اٹھاتے کہ متحد ہو کر آواز اٹھائیں گے تو ہماری تنظیم کا نام نہیں ہوگا۔ اور اس نام ونمود کی چکی میں ساری تنظیمیں پس رہی ہیں، مسلم قوم کی نوجوان نسل اور کمزور ملت۔ دن بدن اور پستی اور محرومی کی طرف جارہی ہے، اس لئے یہ بات مسلم ہے کہ جب تک اس ملک میں ’’متحدہ ملی فورم‘‘ وجود پذیر نہیں ہوتا ہے، الگ الگ بات کرنے سے بات بننے والی نہیں ہے۔ مرتے رہیں گے اور شور مچاتے رہیں گے۔ اور بس

ہر کام میں شہرت اور سیاسی مقاصد:

دیکھئے سیاسی لوگ جب کوئی بات کرتے ہیں تو ان کے مقاصد تو سیاسی ہوتے ہی ہیں، اس کی مثال دیتا ہوں میں، ہمارے یہاں اوکھلا اسمبلی حلقہ میں جب الیکشن کا وقت تھا تو الیکشن سے پہلے ہر لیڈر جو جیتا اس کے بھی اور جو ہارا اس کے بھی آصف اور ساجد اور بٹلہ ہاؤس انکاؤنٹر کے علاوہ اور کوئی بات زبان پہ ہوتی ہی نہیں تھی، اور جب الیکشن ختم ہو گیا تو کہاں کا آصف اور کہاں کا ساجد اور کاہے کا بٹلہ ہاؤس انکاؤنٹر، کبھی کوئی نام بھی نہیں لیتا تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سیاسی مقاصد تو سیاسی لیڈران کے ہر بیان میں ہوتے ہی ہیں۔ البتہ بعض بعض سیاسی لیڈران قومی جذبہ سے تو نہیں، لیکن سیکولرازم کی آڑ میں کچھ کہہ لیتے ہیں، جس کی حیثیت صرف اتنی ہوتی ہے۔ مصرع:

خوش رہے بھگوان اور راضی رہے شیطان بھی

کبھی کبھی شر میں بھی خیر نکل آتا ہے اور کسی کا بھلا ہوجاتا ہے۔ ملک کی انٹلی جنس مکمل طور پر اپنے ایجنڈے پر عمل پیرا ہے، وہ ہر پنج سالہ منصوبہ کے تحت قسطوں میں مسلم نوجوانوں کو گرفتار کرتی ہے، تاکہ لوگ پچھلے کو بھول جائیں اور تازہ گرفتاریوں کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول ہوجائے، آپ خود دیکھئے، ٹاڈا، اور پوٹا، اور پھر پوٹو اور فسادات میں کتنے مسلم نوجوان گرفتار ہوئے اور آج تک رہا نہیں ہوئے، مگر پوری ملت اور ملی تنظیموں کو تازہ گرفتاریوں کے مسائل میں الجھادیا گیا، اب اس پر کوئی سیاسی لیڈر بولتا ہے تو اس میں سیاسی لوگ تو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے بولتے ہی ہیں، مگر ملی لوگوں کی مجرمانہ خاموشی کو کیا کہئے گا؟ اس بات کو دھیان میں رکھنا چاہئے کہ اس مجرمانہ ملی غفلت سے اس ملک میں باوقار ملت باقی نہیں رہ سکتی، اس لئے اپنی سوچ اور حکمت عملی دونوں میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔

معاوضہ کا مسئلہ:

وہ مسلم نوجوان جن کی ظالمانہ طریقہ پر گرفتاریاں ہوئی ہیں، سب سے پہلے ان کو بلاتاخیر جیلوں سے رہا کرایا جانا چاہئے اور جن کو رہا کیا جاچکا ہے اور وہ بے قصور تھے، ان کو مناسب معاوضہ ادا کیا جانا سرکار کی اخلاقی ذمہ داری ہے، تاکہ ان کی زندگی کا جو قیمتی وقت جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزر گیا اور اس کی وجہ سے وہ پسماندہ ہوگئے، ان کی بازآبادکاری ہوسکے اور ان کے گھر اور خاندان کے لوگ ملک کے دوسرے لوگوں کی طرح یکساں شہری زندگی گزار سکیں، اگر سرکار اس میں سرد مہری کا مظاہرہ کرتی ہے تو یقیناً کورٹ کا سہارا لیا جانا چاہئے شاید کوئی خیر نکل آئے، حالانکہ کورٹ سے بھی کسی خیر کی توقع تو نہیں ہے۔ البتہ اتمام حجت ضرور ہوجائے گا۔ کیونکہ اگر سرکار مخلص ہوتی تو پھر بے چارے بے قصور مسلم نوجوانوں کو گرفتار ہی کیوں کیا جاتا، اور وہ اتنے لمبے عرصے تک کورٹ سے انصاف نہ ملنے کی وجہ سے

جیل ہی میں کیوں رہتے، ان کا تو مقصد ہی ان کو معاشی اور سماجی طور پر کچل دینا تھا۔ اور سرکار، عدالت اور ایجنسی نے وہ کام کیا اور کرتے ہی جارہے ہیں، البتہ اس بارے میں بجائے عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹانے کے تمام مسلم ایمپیز کو چاہئے کہ پارلیمنٹ سے اس سلسلہ میں کوئی بل منظور کرائے ممکن ہے اس کا کوئی نتیجہ سامنے آئے۔

سیاسی پارٹی کا قیام:

اس وقت کئی علاحدہ سیاسی جماعت ہندوستان میں موجود ہیں، جیسے مسلم لیگ، مسلم مجلس، مسلم انڈپینڈنٹ پارٹی، انصاف پارٹی آف انڈیا، علماء کونسل، پیس پارٹی آف انڈیا، ویلفیئر پارٹی آف انڈیا، پرچم پارٹی آف انڈیا (سلیم پیرزادہ) نیشنل لوک تانترک پارٹی ان کے علاوہ بھی بہت سی پارٹیاں ہیں جن کے نام لوگوں کو معلوم نہیں، پہلے اس بات کا تجزیہ کیا جانا ضروری ہے کہ جو پارٹیاں پہلے سے موجود ہیں ان کا سیاسی اثر ورسوخ کیا رہا اور اس پارٹی سے مسلمانوں کو کیا فوائد حاصل ہوئے اور ان پارٹیوں کے علاحدہ قیام سے سیاسی، سماجی اور معاشی طور پر اس ملک میں کیا نقصانات مسلمانوں کو اٹھانے پڑے، ہمیں اس کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے۔ اب تک کا تجربہ تو یہی رہا کہ خاص طور سے شمالی ہندوستان میں علاحدہ مسلم پارٹیوں سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوا، بلکہ نقصان اور اٹھانا پڑا، دوسرے سیاسی پارٹیوں سے دشمنی مول لی، جن علاقوں کے مسلمانوں نے ان پارٹیوں کو ووٹ دیا اور وہ پارٹیاں ہار بھی گئیں بعد میں ان انتخابی حلقوں کے مسلمانوں کو زندگی کے ہر میدان میں ہر طرح کا خسارہ برداشت کرنا پڑا اور کہیں کہیں تو فرقہ وارانہ فسادات تک کرا کر ان لیڈروں نے بے چارے کمزور مسلمانوں کی جانیں تک لیں۔ اس لئے اس بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ صوبائی طور پر انتخابات میں حصہ لینے کے لئے جن صوبوں میں مسلم اکثریت میں ہیں یا اضلاع میں اکثریت میں ہیں، صوبائی پارٹی علاحدہ ہونی چاہئے اور پارلیمانی انتخابات میں جو پارٹیاں

پہلے سے موجود ہیں، انہیں کو طاقتور بنایا جانا چاہئے اور جس ایم پی کی سیٹ پر مسلمان اکثریت میں ہیں اور میرے خیال میں پورے بھارت میں تقریباً 30 کے آس پاس ہیں اور مسلمان اپنا ایم پی جتا سکتے ہیں اور پارلیمنٹ میں رول ادا کر سکتے ہیں، اس پر محنت کی ضرورت ہے۔ مگر اس میں اس بات کا اندیشہ ہے کہ جیسا کہ الیکشن کمیشن آف انڈیا، ہمیشہ ان سیٹوں پر ایسی ردوبدل اور کاٹ چھانٹ کرتے رہتے ہیں کہ مسلمان اکثریت میں رہ ہی نہیں سکتے، یہ بھی نظر میں رہے۔ آپ کے علم میں یہ بات ہوگی کہ وہ انتخابی حلقہ جہاں مسلمانوں کا کوئی رول ہو سکتا تھا، ان حلقوں کو یا تو خواتین کے لئے خاص کر دیا گیا یا اسے او بی سی وغیرہ کی کٹیگری میں ڈال دیا۔ تو اس طرح کی پریشانی ہمارے ملک میں ہیں، چین سے ملک کی اکثریت مسلمانوں کو نہ سیاسی طور پر جینے دے گی اور نہ معاشی اور سماجی طور پر اس کو روکنے کی کوئی تدبیر ہو سکتی ہے تو کرنی چاہئے، بہر حال اس سے مایوس ہو کر بیٹھ جانا بھی بزدلی ہے اس پر غور کیا جا سکتا ہے۔

قومی میڈیا کا رول:

مسلم مسائل پر قومی میڈیا کا رول کس طرح کا ہے، معاندانہ ہے یا موافقانہ اس کا اندازہ تو اس بات سے اچھی طرح لگایا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی ایسی خبر ہو جس سے مسلمانوں کی شبیہ خراب ہوتی ہو تو میڈیا کے لوگ اچھل اچھل کر اسے نشر کرتے ہیں اور اگر کوئی ایسی خبر ہو جس میں مدح سرائی کا پہلو ہو، یا مسلمانوں کے مفادات سے متعلق ہو تو جان بوجھ کر اسے نشر ہی نہیں کیا جاتا اور یہ رویہ الیکٹرانک میڈیا ہی کا نہیں ہے، بلکہ پرنٹ میڈیا بھی مکمل اس کے نقش قدم پر ہے۔ آپ دیکھئے انگلش اور ہندی میڈیا کو ان میں مسلمانوں کی کوئی خبریں چھپتی ہی نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہندی اور انگلش میڈیا ہندوستانی مسلمانوں کو بھارت کی اکائی تسلیم ہی نہیں کرتے۔ ہاں مسلمانوں کی وہ خبریں جن کا تعلق کسی کرائم سے ہو، یا فلم انڈسٹری سے ہو اور وہاں مسلم نام نظر آ جائے تو اسے ضرور شامل اشاعت کرتے ہیں، یا کسی مسئلہ میں

توہین وتحقیر کا پہلو، جس سے مسلمانوں کی دل آزاری ہوتی ہو اسے چھاپنے میں بڑی دلچسپی دکھائی جاتی ہے۔ وہ تو خیر ہے کہ آج ملک میں بڑی تعداد میں اردو زبان میں اخبارات نکلنے لگے ہیں تو کچھ خبریں عام مسلمانوں تک پہنچ جاتی ہیں۔ آج بھارت میں زندگی کے ہر شعبہ میں تعصب اپنی انتہا کو چھو رہا ہے اور انسانیت کی ساری حدیں پار ہو رہی ہیں اور مسلمان دن بدن غربت ومزدوری کی طرف بدستور جا رہا ہے جو بہر حال ہمارے لئے تشویش کی بات ہے۔ قانون اور دستور کے نام پر سارے ترقی کے راستے بند کر دئے گئے ہیں۔ بس اسی حد تک آزادی دی جا رہی ہے جتنا سے ان کا کام چل سکے اور بس۔

مسلمانوں کی پسماندگی کے اسباب:

اس ملک میں جب تک مسلمانوں کو آبادی کے تناسب سے زندگی کے ہر میدان میں ریزرویشن نہیں ملے گا، یہ قوم اس ملک میں ترقی نہیں کر سکتی۔ آج لوگ مسلمانوں کو یکساں ترقی کی راہ پر لانے کے لئے سچر کمیٹی کے نفاذ کی بات کر رہے ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ بھارت میں آج تک جتنے بھی کمیشن مسلمانوں کے تعلق سے بنائے گئے ان کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ان کی خامیوں کو دور کیا جائے، بلکہ اس کا مقصد صرف اس بات کا اطمینان کرنا تھا کہ دیکھو پچاس ساٹھ سالوں میں ہم نے مسلمانوں کو کہاں پہنچا دیا، سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے، پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اگر واقعی ان کمیشنوں کا مقصد مسلمانوں کی پسماندگی دور کرنا ہوتا تو چاہے رنگا ناتھ مشرا کمیشن ہو یا سچر کمیٹی کی رپورٹ اسے پارلیمنٹ میں پیش کیا جاتا اور اسے نافذ کیا جاتا اور مسلمانوں کی پسماندگی کو دیکھتے ہوئے ان کے حقوق دئے جاتے۔ رنگا ناتھ مشرا کمیشن اور سچر کمیٹی کی رپورٹ کے عدم نفاذ نے سب کو واضح کر دیا ہے اور میں صاف لفظوں میں یہ بتا دوں کہ آج تک مسلم ملکوں میں آباد غیر مسلم اقلیتوں کی بہ نسبت جمہوری اور غیر مسلم ملکوں میں مسلم اقلیتوں کے حقوق زیادہ پامال ہوئے

ہیں، اور ہو رہے ہیں، جن میں فرانس اور بھارت سب سے آگے ہے۔ بہر حال مسلمانوں کو ترقی کرنا ہے تو حکومت کا منھ دیکھنے کے بجائے اپنے پاؤں پہ کھڑا ہونا ہوگا اور اس کے لئے دو باتوں کی جدوجہد ضروری ہے: نمبر۱- یہ کہ مسلمان تعلیم میں آگے بڑھیں، تعلیم وتربیت میں کسی سے پیچھے نہ رہیں، خواہ اس کے لئے انہیں جو بھی کرنا پڑے۔ نمبر۲- یہ کہ اس ملک میں ہزار تعصب کے باوجود ہمارے ملک کا دستوری نظام جمہوری ہے اور جمہوریت میں حقوق جمہوری طریقہ پر ہی ملتے ہیں۔ مسلمانوں کو اور خاص طور سے مسلم تنظیموں کو چاہئے کہ متحد ہو کر ذات پات کی بنیاد پر نہیں، بلکہ پوری مسلم قوم کی بنیاد پر بحیثیت مسلم قوم ریزرویشن کا مطالبہ پوری قوت کے ساتھ کریں، ملک گیر تحریکات چلائیں اور ریزرویشن تحریک منظّم کریں۔ پورے ملک میں کارواں نکالیں، میں نے اب تک مسلمانوں کی پسماندگی کے اسباب پر غور کیا تو صرف ایک چیز نظر آئی وہ ہے اس ملک میں ریزرویشن کے ذریعہ مسلمانوں کے حقوق کو یقینی نہ بنایا جانا، اگر انصاف کے ساتھ ہر میدان میں ریزرویشن دے دیا جائے اور مسلمان اپنے مقام پر پہنچ جائیں تو ترقی بھی کرے گا اور قومی دھارے پر بھی ہوگا، اس کے بغیر خواہ کتنا ہی چیختا اور شور مچاتا رہے اور بلکہ کتنا ہی تعلیم یافتہ ہو جائے، بغیر ریزرویشن کے دوسرے لوگوں کے مدمقابل نہیں آسکتا۔ صاف بات ہے ایک شخص انجینئر اور ڈاکٹر بن جائے اگر اس کو وہ مقام نہ ملے تو اس کا ڈاکٹر اور انجینئر بننا کسی کام نہیں، صرف اسے تعلیم یافتہ کہا جائے گا اور کچھ نہیں۔

مدارس میں عصری علوم کی شمولیت:

دیکھئے تعلیم انسان کے لئے ناگزیر ہے اور مسلمانوں کے لئے اپنے دین وایمان کی بقا اور ملی تشخص کے تحفظ کے لئے خالص دینی تعلیم ضروری ہے اور زندگی کی بقا اور دوسری اقوام کے شانہ بشانہ یکساں ترقی کرنے اور خوش حال زندگی بسر کرنے کیلئے موجودہ دور میں عصری

تعلیم بھی لازمی ہے۔ مگر سیدھی بات یہ ہے کہ حالات اور زمانہ کی رفتار کو مدنظر رکھتے ہوئے صرف اس حد تک عصری مواد کی شمولیت جتنا کہ ضروری ہے اور اس کی وجہ سے دینی مواد جو رائج ہے وہ اپنی جگہ مسلم ہے اس سے بالکل تعرض نہ کیا جائے، اس میں اگر کسی طرح کا کوئی خلل واقع نہ ہوتا ہو تو اس حد تک عصری مواد داخل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ مثلاً بقدر ضرورت انگریزی اور کمپیوٹر سائنس اور ریاضی۔ اس سے آگے نہ بڑھا جائے، ورنہ ہمارے مدارس کے قیام کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا اور پھر مدرسہ سے فارغ ہونے والے طلبہ عالم کم اور اپٹوڈیٹ زیادہ ہو کر نکلیں گے۔ جو ہمارے دینی مقاصد کے سراسر مغائر ہے، عصری تعلیم کیلئے، مدارس کے علاوہ اور ابھی مواقع ہیں، اگر مدرسہ کے دینی مواد کو متاثر کرکے جدید کاری کی جاتی ہے تو پھر یہ نہ مدرسہ ہی رہے گا اور نہ اسکول، بلکہ نامعقول ہیولی ہو کر رہ جائے گا اور نتیجہ ''نہ خدا ہی ملا، نہ وصال صنم''۔

مدرسہ جدید کاری پروگرام:

میں یہی سمجھتا ہوں کہ اصل میں مسئلہ یہ ہے کہ حکومت ہماری تعلیم کے لئے سنجیدہ نہیں ہے، ورنہ مدرسوں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کی تعداد صرف ۲-۴ فیصد ہے، جبکہ ملک کے 96% مسلمان بچوں کی تعداد یا تو اسکول جاتی ہے یا پھر اسکول بھی نہیں جاتی۔ اگر سرکار مخلص ہوتی تو اسے 96% کی فکر ہوتی کہ اس کی تعلیم ہو رہی ہے یا نہیں، اسے نوکریاں مل رہی ہیں یا نہیں۔ ہمارے بچوں کی تعلیم کے لئے اسکول ہیں یا نہیں، ہمارے مدرسوں اور ۴ رفیصد کی اتنی فکر کیوں ہے؟ سرکار تو بس ہمارے مدرسوں کی جدید کاری کے نام پر رفتہ رفتہ ہمارے اسلامی روح میں باطل روح ڈالنا چاہتی ہے اور پھر فکر اسلامی کی آماجگاہ ہمارے مدارس کو ختم کر کے اسے اسکول اور سیکولر ادارے میں تبدیل کر دینا چاہتی ہے، جس کا خوبصورت نام ''مدرسہ جدید کاری'' دیا جارہا ہے۔ یہ حقیقت میں مدارس اسلامیہ کو

دوسرے رخ کی طرف پھیر دینے کا لونگ ٹرم ایجنڈا ہے۔اس کو سرکار کی نیک نیتی نہیں، بلکہ بدنیتی کہا جائے گا۔اس ملک میں غالباً آرٹیکل ۲۹ اور ۳۴ کی رو سے چونکہ ملک کی ہر اقلیت کو دستور کے مطابق اپنے تعلیمی ادارے چلانے کا اختیار ہے، اس لئے حکومت کے اس خوبصورت اور دل فریب ''مدرسہ جدید کاری'' نعرہ کو تسلیم نہیں کرنا چاہئے۔ ہمارے مدارس خالص ہماری ملی اور دینی ضرورت کی تکمیل کے لئے ہمارے ملک کے مسلمانوں نے قائم کئے ہیں اور خود اپنی اور اپنے بچوں کی روٹی کاٹ کر زکوٰۃ، صدقات، چرم قربانی اور اپنی گاڑھی کمائی سے مدارس ومساجد کو قائم کئے ہوئے ہیں اور چلا رہے ہیں اور صرف اللہ کی رضا اور اپنی آخرت کی کامیابی کے لئے یہ سب کر رہے ہیں۔ یہ مکمل مسلمانوں کا مذہبی معاملہ ہے، اس میں سرکار کو کوئی مداخلت نہیں کرنی چاہئے اور ہمارے ملک کے تازہ پسند دانشوروں کو بھی اس میں سرکار کی ہاں میں ہاں نہیں ملانا چاہئے۔

متحدہ ملی فورم:

جناب مدیر محترم آپ نے ہمارے دل کی بات کہی ہے، شریعت اسلامی میں اتحاد اور اتفاق کا راستہ اختیار کرنے کی جو ترغیب دی گئی ہے اور اس کے فوائد بتائے گئے ان کو یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سر دست اتنا سمجھنا ضروری ہے کہ اگر اس ملک میں ملی امور کی انجام دہی میں اتحاد کا راستہ اختیار کیا جاتا تو پھر ناکامیوں کا شکوہ ہماری زبانوں پر نہ ہوتا اور سو فیصد کام تو کبھی نہیں ہوتا، کچھ تو ہوتا، اس لئے ''متحدہ ملی فورم'' کی ترجیحی ضرورت ہے اور صرف کاغذی نہیں، عملی فورم ہونا چاہئے، جہاں تک ملی فورم کے تشکیلی عناصر کی بات ہے تو میں اس معاملہ میں بہت زیادہ پھیلاؤ کا قائل نہیں ہوں، میں نے اس سے پہلے اس کو واضح کر دیا ہے۔ ملک میں جتنی تنظیمیں ہیں ان کے ذمہ داروں پر مشتمل ایک فورم بنالیا جائے جو غیر رجسٹرڈ ہو اور جب بھی کوئی ایسا ایشو جو متحدہ رول کا متقاضی ہو ان ایشوز کو ''متحدہ ملی

فورم'' کے بینر سے اٹھایا جائے اور باقی تنظیمیں اپنی اپنی جگہ کام کرتی رہیں۔

اخیر میں میں بس اتنا عرض کروں گا کہ اس وقت پورے بھارت میں ملکی اور صوبائی سطح کی بہت سی ملی تنظیمیں ہیں جو مسلمانوں کے فلاح و بہبود کیلئے کام کر رہی ہیں، کسی تنظیم نے اب تک کیا کیا ہے، اور کیا کر رہی ہے اس تفصیل میں جائے بغیر اتنی بات ضرور عرض کروں گا کہ جو مسائل ہندوستانی مسلمانوں کی اجتماعیت سے متعلق ہیں ان اجتماعی مسائل کو انفرادی طریقہ کار کے ذریعہ کبھی حل نہیں کیا جاسکتا ہے، ان کو حل کرنے کیلئے اجتماعی طریقہ ہی کارگر ثابت ہوسکتا ہے، اس وقت جو ملی اور قومی تنظیمیں الگ الگ آواز بلند کر رہی ہیں، ان کی حیثیت انفرادی طریقہ کار کی ہے، اجتماعیت کی نہیں ہے، ان کو اجتماعی حیثیت تک رسائی حاصل کرنے کیلئے تمام تنظیموں کا فیڈریشن اور اجتماعی فورم ہونا ضروری ہے، جتنی مسلم تنظیمیں ہیں، وہ اپنی اپنی جگہ کام کرتی رہیں، اور یہ طے کرلیں کہ جو بھی ملت کا اجتماعی مسئلہ ہوگا اس کو فیڈریشن کے پلیٹ فارم سے ہی اٹھایا جائے گا، تب ہی ہماری آواز اجتماعی اور طاقتور اور موثر ہوگی، جیسے ریزرویشن کا مسئلہ، مسلم پرسنل لاء میں مداخلت کا مسئلہ، ملک میں تشویش کی حد تک پیدا ہونے والے مذہبی اور گروہی و نسلی عصبیت اور مسلمانوں کو زندگی کے ہر میدان میں نظر انداز کئے جانے کا مسئلہ، دہشت گردی کے نام پر مسلمانوں کو الگ تھلگ کئے جانے اور نوجوانوں کی گرفتاری کا مسئلہ وغیرہ، یہ سب ہماری اجتماعیت اور فیڈریشن کے قیام کے متقاضی ہیں، ورنہ حالات دن بدن ابتر ہوتے جائیں گے اور ہم اسٹیجوں سے سوائے چیخنے کے اور کچھ نہیں کر پائیں گے اللہ خیر فرمائے اور زعماء قوم کو توفیق اور سمجھ عطا فرمائے، اور اللہ تعالیٰ امت کے ذمہ داران کو موجودہ حالات کی سنگینی کے ادراک کی توفیق دے، اور اپنے فضل خاص سے ہمت وحوصلہ اور وسائل واسباب مہیا فرمائے۔ آمین۔

☆☆

حکومت بے قصور نوجوانوں کو جلد انصاف دیئے جانے کے حق میں

● کے۔رحمٰن خان

مرکزی وزیر برائے اقلیتی اموراور سرکردہ مسلم رہنما جناب کے رحمٰن خاں نے گذشتہ دنوں روزنامہ انقلاب دہلی کے ایڈیٹر نارتھ شکیل شمسی کے ساتھ ایک خاص ملاقات میں کہا ہے کہ ان کی حکومت بے گناہ مسلمانوں کو رہا کئے جانے کی پابند ہے، مرکزی وزیر داخلہ سشیل کمار شنڈے نے انہیں ایک خط لکھ کر اس سلسلے میں یقین دہانی کروائی ہے کہ حکومت کسی بھی بے گناہ مسلمان کو جیل میں بند رہنے نہیں دے گی۔ جب ان کی توجہ ایک نمائندہ وفد کے ذریعہ مرکزی وزیر داخلہ سے ملاقات کے دوران فاسٹ ٹریک کورٹس کے قیام کا کوئی وعدہ نہ کئے جانے کی بات کہنے کی جانب مبذول کروائی تو وزیر اقلیتی امور نے کہا کہ نہیں ایسا نہیں ہے۔۲۲؍مارچ کو وزیر داخلہ نے ان کے خط کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ حکومت فاسٹ ٹریک کورٹس کے قیام کے لئے بہت سنجیدہ ہے۔

انھوں نے یہ بھی کہا کہ مرکزی حکومت کے تحت کام کرنے والی قومی تفتیشی ایجنسی این آئی اے نے ۵۹؍فاسٹ ٹریک کورٹس قائم کئے ہیں اور ہوم منسٹری نے تمام صوبائی سرکاروں کو بھی اس سلسلے میں خط بھیجا ہے کہ وہ فاسٹ ٹریک کورٹس کے قیام کا بندوبست کریں تاکہ مقدمات کی سنوائی سرعت کے ساتھ ہو، البتہ انھوں نے اس مجبوری کا اظہار کیا کہ مرکزی حکومت صوبائی سرکاروں پر دباؤ نہیں ڈال سکتی ہے صرف ان سے کہہ سکتی ہے کہ

وہ سریع السماعت عدالتوں کا قیام کریں۔انھوں نے کہا کہ اس سلسلے میں علما، مسلم تنظیموں اور قائدین کے وفود ان سے مل کر برابر اس بات کا مطالبہ کررہے ہیں کہ بے گناہ مسلمانوں کی گرفتاریوں کا سلسلہ بند ہو۔ کے رحمٰن خاں نے کہا کہ وزارت داخلہ کی جانب سے لگاتار پولیس کے محکموں کو لکھا جارہا ہے کہ وہ جب کسی کو گرفتار کریں تو اس کے خلاف فوری طور پر چارج شیٹ داخل کریں اور ہر کیس کا اسپیڈ ٹرائیل ہو۔ جانچ سے پہلے ہی پولیس کی جانب مقدمے کی پبلسٹی کئے جانے کا جو رجحان پیدا ہوا ہے اس پر وزیر محترم نے کہا کہ ایسے معاملات کی تفتیش بہت تیزی کے ساتھ ہونا چاہئے۔

انھوں نے بے گناہوں کو پھنسانے والے پولیس افسروں کے خلاف تادیبی کارروائی کے بارے میں کہا کہ ملک کے قانون میں پہلے ہی سے آئی پی سی کی دفعہ ۲۱۱؍کے تحت اس بات کی گنجائش موجود ہے کہ جھوٹے مقدمے قائم کرنے والے افسروں کو سزایاب کرنے کے لئے عدالت سے رجوع کیا جائے۔انھوں نے بے گناہوں کو معاوضہ دینے کے بارے میں پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ اس معاملے میں کوئی واحد معیار نہیں بنایا جا سکتا بلکہ ہر کیس پر الگ الگ انداز سے غور کرنا ہوگا۔انھوں نے یہ بھی کہا کہ ملک کے قانون میں اس بات کی گنجائش پہلے سے موجود ہے کہ جھوٹے الزام میں پھنسایا گیا شخص عدالت کے ذریعہ حکومت سے معاوضہ طلب کرے۔

انسداد فرقہ ورانہ تشدد بل کے بارے میں پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ اس سلسلے میں انھوں نے وزیر داخلہ سے دوبار ملاقات کی ہے اور مسلمانوں میں اس بل کے نہ آنے سے پھیلی بے چینی کے بارے میں مطلع کیا ہے۔رحمٰن صاحب نے پورے یقین کے ساتھ کہا کہ مرکزی حکومت اس بل کو پارلیمنٹ میں پیش کرنے کا پکا ارادہ رکھتی ہے اور وہاں سے پاس ہونے کے بعد اس کو قانون کی شکل مل جائے گی۔انھوں نے کہا کہ اس بل پر پارلیمنٹ کی اسٹینڈنگ کمیٹی نے کچھ اعتراضات کئے تھے اور کچھ صوبائی سرکاروں نے چند خدشات کا اظہار کیا تھا، لیکن اب ان کا ازالہ ہورہا ہے۔

سچر کمیٹی کی سفارشات کے نفاذ کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا یو پی اے سرکار نے سچر کمیٹی کی زیادہ تر سفارشات نافذ کردی ہیں، لیکن مرکز نے اقلیتوں کے لئے جو فلاحی اسکیمیں بنائی ہیں ان پر کئی صوبائی سرکاریں عمل درآمد نہیں کر رہی ہیں۔ جب ان سے کہا کہ کیا ایسا بھارتیہ جنتا پارٹی کے زیر اختیار صوبوں میں ہو رہا ہے تو انھوں نے صاف طور پر تو نہیں کہا کہ بھارتیہ جنتا پارٹی کی صوبائی سرکاریں ایسا کر رہی ہیں، لیکن انھوں نے گجرات کے مسلم دشمن وزیر اعلیٰ نریندر مودی کا نام لے کر کہا کہ انھوں نے تو پری میٹرک کے طلبا کو اسکالرشپ تک دینے سے انکار کر دیا تھا، جس کے بعد کورٹ نے اس معاملے میں مداخلت کی اور پری میٹرک اسکالرشپ کا راستہ ہموار کیا۔ کے رحمٰن خاں نے کہا کہ مساوی حقوق کمیشن، نیشنل ڈاٹا بینک اور ڈائیورسٹی انڈیکس کے قیام کے لئے کام چل رہا اس کے علاوہ مرکزی سرکار نے سچر کمیٹی کی تمام سفارشیں نافذ کر دی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اندرا آواس یوجنا کے تحت اقلیتوں کے ۴/لاکھ ۵۷/ ہزار کنبوں کو گھر دئے گئے ہیں جن میں سے چار لاکھ گھر مسلمانوں کو ملے ہیں۔ انھوں نے کہا ۹۰/مسلم اکثریتی شہروں کے سات سو اکھتر بلاکس میں پانی، بجلی سڑک اور تعلیمی سہولتوں کا انتظام کیا جا رہا ہے۔

انھوں نے کہا کہ ہم اسکول کھول رہے ہیں۔ اسکالرشپ دے رہے ہیں، تعلیم کے لئے قرض فراہم کروا رہے ہیں اور کاروبار کے لئے بھی آسانی سے قرض فراہم کئے جانے کے سلسلے میں بینکوں کو ہدایت دے دی گئی ہے۔ جب ان سے کہا کہ بینکوں نے مسلم اکثریتی علاقوں کو نیگیٹیو (منفی) ایریا قرار دے دیا ہے تو انھوں نے کہا کہ کوئی بھی بینک اگر ایسا کرتا ہے تو اس کی شکایت ان کی وزارت کو بھیجی جانا چاہئے۔ انھوں نے کہا مرکزی حکومت کی جانب سے ایک لاکھ پچھتّر ہزار روپئے کی رقم میں سے مسلمانوں کے لئے ۷ا/ رفیصد کی رقم مختص ہے جس میں سے ۵۶/رفیصد رقم مل چکی ہے۔ انھوں نے عوام سے یہ بھی اپیل کی کہ وہ سچر کمیٹی کی ان سفارشات کی نشان دہی کریں جس پر ان کو لگتا ہے کہ مرکزی حکومت نے کوئی کارروائی نہ کی ہے۔

(بشکریہ روزنامہ انقلاب دہلی)

مسلمانوں پر زیادتی کرنے میں کانگریس سب سے آگے

● مولانا محمود اسعد مدنی

ملک کی مختلف جیلوں میں قید بے گناہوں کی رہائی کے لیے جمعیۃ علماء ہند کے انصاف مارچ میں شرکت کرتے ہوئے ہزاروں مسلمانوں نے گرفتاریاں دیں۔ دہلی کے تال کٹورا انڈور اسٹیڈیم میں جمعیۃ علماء ہند کے جنرل سکریٹری وسابق رکن پارلیمنٹ مولانا محمود مدنی کی قیادت میں منعقدہ انصاف مارچ کے بعد ہزاروں فرزندان توحید نے پارلیمنٹ اسٹریٹ کی طرف انصاف کے لیے پیدل مارچ شروع کیا، حالانکہ انصاف مارچ کو روکنے کے لیے پولیس نے پہلے سے ہی اسٹیڈیم کے باہر جنتر منتر کی طرف جانے والی سڑک پارک اسٹریٹ پر بیریکیٹنگ کر رکھی تھی اور بڑی تعداد میں پولیس فورس تعینات کیا ہوا تھا جیسے ہی یہ قافلہ پارک اسٹریٹ پر پہنچا پولیس نے اسے آگے جانے سے روکتے ہوئے علامتی گرفتاری اور چند منٹ بعد رہائی کا اعلان کیا۔ مولانا محمود مدنی کی قیادت میں گرفتاری دینے والوں میں صدر جمعیۃ علماء ہند مولانا قاری محمد عثمان منصور پوری، سوامی اگنی ویش، سماجوادی پارٹی کے قومی سکریٹری کمال فاروقی، جماعت اسلامی ہند کے جنرل سکریٹری مولانا محمد احمد، ایڈوکیٹ نیاز فاروقی، جمعیۃ علماء ہند کے ترجمان مولانا عبدالحمید نعمانی کے علاوہ ملک کے مختلف صوبوں سے آئے نمائندگان اور کارکنان شامل تھے۔ انصاف مارچ کے بعد جمعیۃ کے ایک وفد نے وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ کو ایک مطالباتی میمورینڈم بھی پیش کیا۔ اس

موقع پر مرکزی وزیر برائے اقلیتی امور کے رحمٰن خان نے بھی شرکت کی اور جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ کانگریس نے جو بھی وعدے کئے ہیں ان کو پورا کرانے کے لیے ہم حکومت کو قائل کر رہے ہیں، نتیجہ جلد برآمد ہوگا۔ اس تعلق سے جمعیۃ علماء ہند کی جدوجہد بہت مثبت ہے۔

انصاف مارچ کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے مولانا محمود مدنی نے کہا کہ ملک میں مسلمانوں کے ساتھ ظلم وزیادتی کرنے میں کانگریس حکومت کئی بار فرقہ پرست طاقتوں سے دو قدم آگے نکل جاتی ہے۔ یہ پارٹی ہمیں اپنا سیکولر چہرہ دکھا کر اور فرقہ پرست بھیڑیوں سے ڈرا کر اپنی طرف کر لیتی ہے لیکن اب یہ اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ ہم خود بھیڑیئے سے نمٹ لیں گے، ہمیں خوفزدہ کرنے کی کوشش کی نہ جائے، ملک کا مسلمان کسی پارٹی کا بندھوا مزدور نہیں ہے۔ کانگریس کی صدر سونیا گاندھی نے کچھ اچھے وعدے کیے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ عملی طور پر مسلمانوں کے لیے کچھ بھی نہیں کیا گیا۔ مولانا محمود مدنی نے کہا کہ ہمارا مطالبہ ہے کہ دہشت گردی کے الزام میں قید بے گناہ مسلمانوں کو جلد از جلد رہا کیا جائے، جن کی زندگیاں تباہ ہوگئی ہیں انھیں معاوضہ دیا جائے، بے گناہوں کو جھوٹے الزام میں گرفتار کرنے والے پولیس افسران کے خلاف مقدمات چلائے جائیں۔ دوسرا یہ کہ انسداد فرقہ وارانہ فساد بل لایا جائے ضلع انتظامیہ کو جوابدہ بنایا جائے اور مسلمانوں کو پسماندگی کے تناسب سے ریزرویشن دیا جائے، آرٹیکل ۳۴۱ر میں مسلمانوں کے اوپر جو مذہبی قید لگی ہے وہ ہٹائی جائے۔ انھوں نے کہا کہ ہم ریزرویشن مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ ملک کی سالمیت اور یکجہتی کے لیے مانگ رہے ہیں کیونکہ ملک کی دوسری بڑی اکثریت کو نظر انداز کر کے ملک ترقی نہیں کر سکتا۔

مولانا محمود مدنی نے کہا کہ دہشت گرد کرنل پروہت کو ابھی تک تنخواہ دی جا رہی ہے، جبکہ مسلمان اگر بے قصور رہا بھی ہو جاتے ہیں تو انھیں بحال نہیں کیا جاتا، یہ دوہرا معیار

کیوں ہے؟ انھوں نے یوپی حکومت پر سخت تنقید کرتے ہوئے سوال کیا کہ ڈی ایس پی کے قاتل راجہ بھیا کو اب تک گرفتار کیوں نہیں کیا گیا؟ یوپی میں مسلمانوں کو اپنی زمین پر مسجد تعمیر کرنے کی اجازت کیوں نہیں ہے؟ سوامی اگنی ویش نے کہا کہ ہاشم پورہ معاملہ میں ۲۵ر سال بعد بھی مسلمانوں کو انصاف نہیں ملا لہٰذا ہم ایک بار پھر میرٹھ سے لال قلعہ تک مارچ کریں گے کیونکہ پولیس نے لائن میں کھڑا کر کے جس طرح سے ۴۲ر مسلم نوجوانوں کو مارا تھا وہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ انھوں نے کہا کہ اس معاملہ میں گیان پرکاش گپتا کی رپورٹ شائع کی جائے اور گنہگاروں کے ناموں کا اعلان کیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ افضل گرو کے اہل خانہ کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے، پھانسی سے پہلے گھر والوں سے ملنے نہ دینا قانون کی خلاف ورزی ہے۔

(یہ رپورٹ دہلی کے بیشتر اردو اخبارات میں شائع ہوئی تھی)

☆☆

گرفتاری کیلئے حالات پیدا کئے جاتے ہیں!

● ظفر عدیم

ا: یوں تو ہر گرفتاری قانون کے دائرے میں، قانون کے جواز پر، قومی وسماجی نظم وضبط کے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر یا ان ساری دلیلوں اور تاویلوں کی بنیاد پر عمل میں لائی جاتی ہے جس کی آگے عدالتی تنقیح ہوتی ہے تو پھر دفعات کے مطابق کارروائی آگے بڑھتی ہے۔ حال میں مسلم نوجوانوں کی بڑے پیمانے پر گرفتاریاں ہوئی ہیں اور ہنوز ہورہی ہیں اور کئی گرفتاریاں ایسی بھی ہوئیں جن کے معاملات عدالتوں میں قائم نہیں رہ پائے۔ یہاں آکر اکثر اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گرفتاری کے لئے حالات پیدا کئے جاتے ہیں اور ایسی ہی حالات سازی کو منصوبہ بندی کہتے ہیں اور منصوبہ بندی کے جب چیدہ چیدہ اہداف ہوتے ہیں تو حالات سازی یا منصوبہ بندی پر سازش کا شبہ ہوتا ہے۔ سازش میں بغض وعناد کے عوامل زیادہ ہوتے ہیں اور سازش ناکام اس لئے ہوتی ہے کہ حقائق کے اجزاء وعناصر متحمل نہیں ہوپاتی۔ ہندوستان کے بیدار سیکولر معاشرے کی طرف سے ان گرفتاریوں کی نشاندہی کی جارہی ہے۔ یہ ملک کے اتحاد واخوت کے ماحول کے لئے ایک اچھی علامت ہے۔ حکومت کو غور کرنا چاہئے کہ جو اختیارات، قوم، ملت، بالعموم ملک کے تانے بانے کو بنائے رکھنے کے لئے تفویض کئے گئے ہیں کہیں ان اختیارات کا بے جا استعمال کرتے ہوئے بگاڑ اور نفاق پیدا کرنے کی کوشش تو نہیں کی جارہی ہے۔

۲: اس وقت پوری دنیا جسے ہم انٹرنیٹ کی اصلاح میں ''گلوبل ولیج'' کہتے ہیں۔ وہ

دراصل یک قطبی دنیا ہے، اس کی تخلیق کی شروعات انفارمیشن ٹیکنالوجی کی مشتہریت سے پہلے ہوچکی تھی، جب دنیا کا ایک مضبوط اور بالقوۃ اور مستحکم مسابقت کار ''بلاک'' سقوط کا شکار ہوگیا تھا اور بدقسمتی سے اس بلاک کے کمزور ہوجانے اور خود اس بلاک کے یک قطبی دنیا میں تقریباً ضم ہوجانے سے ''یک قطبی دنیا'' کی ''سامراجیت'' کا دور دورہ شروع ہوا تو سب سے پہلے ''معیشت'' کی گرفت شروع ہوئی اس کے لئے ترقی پذیر دنیا کو ناراست طور پر محکوم بنانے کے لئے اس یک قطبی دنیا متنوع الاقسام منصوبے بنائے تاکہ اس کی دھاک بیٹھی رہے......اس یک قطبی دنیا سے باقی دنیا کے ان حلقوں کو بڑی تقویت ملی جن کی زد پر ہمیشہ سے اسلام رہا ہے...... یہ تاریخی حقیقت ہے۔ فی الوقت جو کچھ سامنے نظر آرہا ہے وہ اسی یک قطبی دنیا کی منصوبہ بندی ہے......اور ابھی میں نے عرض کیا کہ منصوبہ بندی کب اور کیسے سازش میں تبدیلی ہوتی ہے۔ معیشت اور مارکیٹ کے فیکٹرز بھی بعض ممالک کو اس ڈھکے ہوئے گڑھے (Pitfall) تک جانے پر مجبور کررہے ہیں۔

۳: کہتے ہوئے ہچک رہا ہوں کہ سیاست وہ پروفیشن ہے جہاں حرص وطمع اور مکرو فریب کا انوسٹمنٹ ہوتا ہے اور اسی سے دنیاوی پرافٹ اور ڈیویڈنڈ حاصل ہوتے ہیں تو بتائے کہ کوئی پروفیشنل، کوئی بزنس مین اپنا نقصان کرسکتا ہے؟ اکثر سیاست میں وہی آتا ہے جو انسانی جذبات سے بالاتر ہوکر دنیاوی مفادات کے حصول کو اپنا نصب العین بنا کر غیرت نفس سے بے نیاز ہوجاتا ہے......اور دنیاوی مفادات میں حق بینی، حق رسی اور حق گزاری کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

۴: ''اتحاد''......! کیا یہ لفظ تقریر وخطابت کا جز وفصاحت اور سیاسی ومذہبی منبروں کا درفش بن کر نہیں رہ گیا ہے؟ ملی تنظیموں میں اتحاد تو کجا، دین اسلام کے تضرعاتی مسالک میں بھی اب تک اعتماد نہیں ہوا تو جہاں ''تنظیموں'' کے لاحقہ وسابقہ کا اضافہ ہوجاتا ہے تو پھر بات سیاست تک بھی پہنچتی ہے، خواہ وہ سیاست ''ملی'' راستوں سے مسلکی برتری کے لئے

کی جائے یا وہ سیاست دادودہش لپیٹنے یا سمیٹنے کے لئے کی جائے یا پھر کاروبار اور دھندے کے طور پر کی جائے۔ ملی تنظیمیں بھی (معذرت کے ساتھ) بزنس کر رہی ہیں اور کسی بھی ملک میں بزنس کے لئے دہلی کے حکمراں طبقے کی خوشنودی حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے...... ملی تنظیمیں اول تو متحد نہیں ہوسکتی ہیں کیونکہ یہاں ان کے مفادات Clash ہوتے ہیں، بکھراؤ اور مسلکی خانہ بندی میں ہی ان کی بقا ہے۔ آواز اس لئے نہیں اٹھا سکیں گے کہ کاروباری مصالح پیش نظر ہیں۔ ملی تنظیموں کو سیاست اور تجارت کرنے کا حق ہے، البتہ انہیں دھیان رکھنا ہوگا کہ ان کے فائدے اور منافع میں منافقت اور ریاکاری کا سودمرکب تو شامل نہیں ہو رہا ہے۔

۵: جب غیرت سے لے کر ذلت تک، نہضت ومسافت کے تمام مراحل میں سیاست فرش راہ ہو، تو اس راستے کا مسافر فکر عقبیٰ کرنے لگے تو پھر دنیاداری کی گٹھریاں اٹھانے کون آئے گا؟ ہم ملی مخلوقات ہیں، لفاظی بھی نستعلیق کرتے ہیں اور خیال رکھتے ہیں کہ جب ہم بولیں تو قرأت کی شان قائم رہے، بھلے ہی ملت کے پرواز بگڑ جائیں ایک خالص سیاست داں بھی وہی اہتمام کرتا ہے جو ہم ملی قائدین کرتے ہیں۔

۶: اس طرح کے معاملات میں لیڈر شپ کی ضرورت ہوتی ہے۔ عدالت ہمارے لئے کھلی ہوئی ہے۔ مسلمانوں پر عدلیہ کے دروازے کبھی بند نہیں ہوئے بلکہ عدلیہ مسلمانوں کے لئے کئی معنوں میں ملی قائدین سے زیادہ معاون اور انصاف پسند ثابت ہوتی ہے۔ ایسے جتنے بھی معاملات اونچی عدالتوں میں آئے ہیں، کم وبیش سب میں مسلمانوں کے ساتھ انصاف ہوا ہے۔ ملزم کو عدالت بری کرتی ہے اور ایک ملزم کے حالات کا علم عدالت کو زیادہ ہوتا ہے۔ عدالت ملزم کی ذہنی کیفیت کو بھی محسوس کرتی ہے، لیکن جوڈیشری کوئی آٹومیٹک سسٹم نہیں ہے...... اس مشین کو استعمال کرنا پڑتا ہے، جن مسلم نوجوانوں کو خود عدالتوں نے رہا یا بری بتائے، وہ عدالتیں ان کی بازآبادکاری اور اعانت اور کفاف کا یقیناً

نوٹس لیں گی۔ بلاشبہ تنظیمیں اس جانب پہل کر رہی ہیں اور ضرورت ہے اس پہل کو تحریک کی شکل دینے کی یعنی پہل کو مسلسل اور باقاعدہ بنانے کی۔ ہمارے پاس لیڈرشپ ہو تو یہ کام زیادہ آسان ہوسکتا ہے۔

۷: بالعموم مسلمانوں کو اپنے لئے ایک اپنی سیاسی پارٹی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور کچھ جگہوں پر اس کی کوشش بھی کی گئی لیکن دوری زیادہ طے نہیں ہو پائی، مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ اگر کوئی ایسی سیاسی جماعت بنتی ہے تو پہلے مرحلے میں وہ مسلکی ملّی قبضے سے دوچار ہو جائے گی اور دوسرے مرحلے میں اس کے عہدیداروں کی مسلکی پہچان اسے ملّی اختلاف سے دوچار کر دے گی، اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ ایسی کسی بھی سیاسی جماعت سے مسلمانوں کے مسائل کے حل کی سبیل شاید ہماری رسائی سے بہت دور ہو۔ ہم ایک سیکولر ملک میں ہیں، لوگ رام مندر کی سیاست کو بھی آگے چل کر مسترد کر دیتے ہیں کہ وہ مذہبی اور دھارمک ہوتے ہوئے بھی ملے جلے معاشرے میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو ملک کب کا آر ایس ایس یا اس کی سیاسی جماعتوں کے ہتھے چڑھ چکا ہوتا۔ ملک کی سیکولر اکثریت کسی ''چھاپ'' کو بہت دن تک برداشت نہیں کرتی۔ مسلمانوں کی کوئی بھی سیاسی جماعت تیسرے مرحلے میں عوامی دائرہ نظر میں آنے سے چوک جائے گی اس لئے جماعت سازی ایک بیکاری کی مشق ہوسکتی ہے لیکن افادیت بخش نہیں ہوسکتی۔ ہندوستان میں کثیر تعداد میں مسلمان پارلیمنٹ اور صوبائی مجالس قانون ساز میں موجود ہیں، اگر وہ مسلمانوں کے تئیں سنجیدہ ہو جائیں، مفاد پرستی چھوڑ دیں، عاقبت کی فکر کرتے ہوئے حق کے لئے چیلنجوں کا سامنا کرنے کا حوصلہ پیدا کر لیں تو ایسا کون سے مسئلہ ہے جو حل نہیں ہوسکتا۔ یہ سارے مسلمان مل کر مسلم مسائل کے حل کے لئے ایک غائبانہ گروپ تشکیل دے سکتے ہیں۔

۸: ہم مسلمانوں کی ٹریجڈی یہ ہے کہ ہم اپنی شہرت سے زیادہ دوسروں کا کردار ٹٹولتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ قومی میڈیا ہمارا ہمدرد کیوں ہو؟ آج میڈیا سے مراد الیکٹرانک میڈیا ہے جو

دراصل ایک کمرشیل بنچ (Bunch) اور پیکیج ہے۔ یہاں خبر یا رپورٹ بھی سیل ایبل آئٹم ہے۔ ہمارے اردو کے مسلم اساتذہ، پروفیسران، حاکمان تو ایک اردو کا اخبار نہیں خریدتے تو میڈیا مسلم مسالہ کیوں بیچے؟ یقیناً قومی میڈیا سنجیدہ ہے، وہ اپنے بزنس میں پرفیکٹ ہے، ہم ہی غیر سنجیدہ ہیں نہ دنیا میں خود کو سنبھال رہے ہیں، نہ گوشۂ آخرت کا انتظام کررہے ہیں۔

۹: آگے بڑھتی ہوئی دنیا کو اپنی تنگ نظری سے ہدفِ ملامت بتاتے ہوئے پیچھے رہنے کو باعثِ برکت تصور کرنا، بس یہی ایک سبب ہے، ہمیں دنیا کے ساتھ چلنا ہوگا ایمان ویقین کو ساتھ لے کر۔

۱۰: سب سے پہلے تو مدارس اسلامیہ کی منتظم برادری مدارس کو اپنی عملداری اور قلم رو سمجھنا ترک کرے اور یہ سوچے کہ وہ ملت کی خدمت گزار ہے اور ''مدرسہ'' ملت کی نئی نسل کے ارتقاکے لئے ہے۔ اس کے بعد وہ نئی نسل کی ضروریات زندگی اور اس کے ماڈل تقاضوں کو سمجھے اور اسے ایک نیک، صالح مسلمان بتاتے ہوئے عصر دوراں کے روح رواں کے ساتھ آگے بڑھانے کا اپنا ملی فریضہ ادا کرے۔ کیا کوئی علم مضر ہے؟ یہ فیصلہ کرنا منتظم برادری کا کام ہے۔

۱۱: پہلے تو ہمیں ''جدیدکاری'' کی اصطلاح کو سمجھنا ہوگا، ہم اپنا لیڈر ہیڈ جو کمپیوٹرائز کرتے ہیں، کمپیوٹرائزیشن کا یہ عمل تحریر ونگارش اور خطاطی وکتابت کا جدید ورژن نہیں ہے؟ لیپ ٹاپ رکھنا ہمارے لئے معیوب نہیں ہے تو پھر ہم مدارس کے لئے جدیدکاری کو عیب کیوں سمجھتے ہیں؟ اور یہ کہ ہم پہلے نیت کو کیوں نہیں دیکھتے کہ اس میں نیکی ہے یا کھوٹ ہے۔

۱۲: بس بھی کیجئے! ملی تکرار بوریت کا سبب بن سکتی ہے، جو فورم موجود ہیں، ان کے اعمال نامے کا جائزہ تو لیا جائے پھر حرکت میں برکت کے قائل ہوں۔

(مضمون نگار کئی کتابوں کے مصنف، ادیب اور صحافی ہیں)

☆☆

حق کیلئے آواز اٹھانے والوں کے ساتھ بے اعتنائی

● ذکاء سید

ہندوستان میں تضادات، اختلافات اور متعدد گوناگوں مسائل کو دیکھتے ہوئے جب جب مجھے ناامیدی کے سائے نے گھیرا تب تب کچھ ایسی شخصیات کی یادیں مجھ میں نئی امید جگا گئیں جن کے کردار کو کسی ہیرو کے کردار سے مشابہت دینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ جب جب مجھے اپنی قوم اور دیگر کمزور طبقات کے عدم تحفظ کی صورتحال پر تشویش ہوئی تب تب مجھے اپنے ای میل پر دوستوں کے ڈھیر سارے تسلی بھرے پیغامات موصول ہوئے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس ملک میں صرف فرقہ پرست طاقتوں کا غلبہ ودبدبہ ہے۔ یہاں بڑی تعداد میں انصاف پسند بھی حق کیلئے آواز اٹھانے سے پیچھے نہیں ہٹتے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو دوسروں کا درد سمجھتے ہیں اور سرعام حق کی حمایت کرتے ہیں اور ان کی آواز کو کبھی دبایا نہیں جاسکتا۔ میرے ایک ساتھی ششانک شرما کا نام انہی افراد کی فہرست میں شامل ہے۔ وہ ایک بڑی ملٹی نیشنل آئی ٹی کمپنی کے سربراہ ہیں۔ ملک میں اپنی قوم کی حالت پر نظر ڈال کر جب بھی میرے جذبات برانگیختہ ہوگئے، ششانک شرما نے ہمدردی اور انسانی بنیادوں پر میری حمایت کی۔ میری تحریروں کے جواب میں انہوں نے جو کچھ لکھا وہ صرف ردعمل نہیں تھا، بلکہ اس میں تسلی اور ہمدردی کا ایک ایسا احساس چھپا ہوتا تھا جس کی ایک پریشان اور جذباتی دل کو ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں ہمدردی بھرے دو بول اور وہاں 'ہاں' میں ہلائے گئے سر کیلئے کوئی بہت زیادہ قیمت تو نہیں ہوتی لیکن اس عمل سیزخم بھرے

جاسکتے ہیں اوردلوں کو جیتا جاسکتا ہے۔

ششا نک کے علاوہ کئی ایسے افراد ہیں جو بے خوف ہوکر مسلمانوں کے حق میں آواز اٹھا رہے ہیں اور قابل ذکر وقابل ستائش ہے کہ وہ سبھی غیر مسلم ہیں یا ان کا تعلق ہندو دھرم سے ہے۔ تیستا سیتلواڈ، مکل سنہا، ہرش مندر، راہل شرما، آر بی شری کمار، سنجیو بھٹ، آشش کھیتان تو وہ چند نام ہیں جو گجرات فسادات کے متاثرین کو انصاف دلانے کی جدو جہد میں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ جسٹس ہوسبیٹ سریش، جسٹس راجندر سچر، اروندھتی رائے، امریش مشرا، پروفیسر ہرگوپال، ڈاکٹر منیش سیٹھی، ترون تیج پال، جیوتی پنوانی، رام پنیانی اور کئی دیگر غیر مسلم اس طویل فہرست میں شامل ہیں جنہیں اس بات کا احساس ہے کہ کہیں نہ کہیں مسلمانوں کے ساتھ زیادتی وناانصافی ہوئی ہے۔ ان حالات میں جبکہ شر پسند اور فرقہ پرست اس ملک کی وحدت اور سالمیت کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ ہندوستان اور یہاں بسنے والی قوم مسلم کو اگر کسی طبقے سے امید رکھنی چاہئے تو وہ بیباک افراد پر مشتمل یہی طبقہ ہے جو انصاف پسندی کی ڈگر سے منحرف ہونا گوارا نہیں کرتا۔ دہشت گردی کے الزامات کے تحت صرف مسلمانوں کو نشانہ بنانے کے خلاف اس ہفتے ایک مرتبہ پھر پریس کونسل آف انڈیا کے سربراہ اور سابق چیف جسٹس مرکنڈے کاٹجو نے آواز بلند کی۔ اس قابل مذمت طرز عمل کیلئے انہوں نے ذرائع ابلاغ کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ حیدر آباد میں انگریزی روزنامہ 'دی ہندو' کے ایڈیٹر سدھارتھ وردراجن کی صدارت میں منعقدہ ایک کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے مرکنڈے کاٹجو نے مسلمانوں کو شیطان صفت بنا کر پیش کرنے اور ان میں ناانصافی اور علاحدگی کا احساس پیدا کرنے کی میڈیا کی کوششوں کی مخالفت کی۔ جسٹس کاٹجو نے میڈیا پر برہم ہوتے ہوئے کہا کہ ''جہاں کہیں بھی بم دھماکہ ہوتا ہے، ٹی وی چینلز کچھ ای میل اور ایس ایم ایس کی بنیاد پر انڈین مجاہدین، جیش محمد اور دیگر مسلم تنظیموں پر الزام لگانا شروع کر دیتے ہیں۔ ایس ایم ایس اور

ای میل تو کوئی بھی شرانگیز بھیج سکتا ہے۔ ان بنیادوں پر ٹی وی چینل یہ پیغام دیتے ہیں کہ ہر مسلمان دہشت گرد ہے اور انہیں بم اندازی کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔'' کاٹجو ناانصافی، تفریق وامتیاز اور غربت کو دہشت گردی کے اہم اسباب قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں ''ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں اقلیتوں کیخلاف امتیاز برتا جارہا ہے جس سے ان میں ناانصافی کا شدید احساس پیدا ہوتا ہے اور نتیجے میں دہشت گردی فروغ پاتی ہے۔'' بہر حال کاٹجو کی اس راست گوئی اور بے باکی کو میڈیا نے کوئی بھی رنگ دے کر پیش کیا ہو لیکن عوام میں وہ اپنا ایک مقام بنانے میں ضرور کامیاب ہوئے ہیں۔

کاٹجو ان سیکڑوں افراد کی خاموش دعاؤں میں شامل ہیں دہشت گردی کے جھوٹے الزامات کی بنیاد پر حراست میں لے کر جن کی زندگیوں کو برباد کر دیا گیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ملک بھر میں ہزاروں مسلمانوں کو دہشت گردی کے بے بنیاد الزامات میں پھنسایا گیا ہے اور وہ بے قصور جیلوں میں اپنے دن کاٹ رہے ہیں۔ ان میں سے اگر کچھ خوش قسمت افراد کو رہائی نصیب بھی ہوگئی تو ان کا کریئر برباد ہوکر رہ گیا۔ ڈیکن ہیرالڈ سے وابستہ صحافی صدیقی اور ڈی آر ڈی او کے سائنسداں اعجاز مرزا کو اب تک اس بات کا احساس بھی ہوگیا ہوگا۔ رضوان بیگ کی کہانی بھی کس سے پوشیدہ ہے؟ ۲۱۰۲ء کے پونے بم دھماکوں کے مقدمہ میں پولیس کی مسلسل اذیت کے سبب انہوں نے اپنے ہی ہاتھوں اپنی جان لے لی۔ پونے کے ہی ڈاکٹر انور علی کا بھی ایک معاملہ ہے۔ ۲۰۰۳ء کے ممبئی بلاسٹ کے مقدمہ میں ۸؍سال قید میں گزار کر جب انہیں ضمانت پر رہائی ملی تب ایک وقت نیشنل ڈیفنس اکیڈمی کے ممتاز پروفیسر رہنے والے انور علی کو سڑک کنارے کتابوں کا اسٹال لگانے پر مجبور ہونا پڑا اور اب یہی ان کا ذریعہ معاش بن چکا ہے۔

محمد عامر کا بھی ایک منفرد نوعیت کا کیس ہے۔ دہلی سے جب اسے گرفتار کیا گیا تھا تب وہ صرف ۱۸؍سال کا تھا۔ اس کے بعد اس نے ۱۴؍برس جیل کی صعوبتیں برداشت کیں

اورگزشتہ سال ہی اس کی رہائی عمل میں آئی لیکن پولیس اب تک اس کی گرفتاری کی وضاحت نہیں کرسکی۔گزشتہ ۱۰/سال کے اندر کئی حکومتیں تبدیل ہوئیں۔کچھ تبدیل نہیں ہوئی تو مسلمانوں کی صورتحال۔ وزیر اعظم منموہن سنگھ اور وزیر داخلہ سشیل کمار شندے حراست میں لئے گئے بےقصور مسلم نوجوانوں کے مقدمات کی سماعت کیلئے فاسٹ ٹریک عدالتوں کے قیام کی بات کرر ہے ہیں۔ بلاشبہ اس تجویز کا خیر مقدم کیا جانا چاہئے ،لیکن کیا ایسا کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ابتدائی مراحل میں ہی مسلم نوجوانوں کو پھنسانے کی کارروائی پر قدغن لگائی جاسکے؟۔ملک میں بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان گہری ہوتی ہوئی خلیج سے فکر مند کلدیپ نیر لکھتے ہیں کہ اس (فرقہ پرستی کی لعنت) کے آگے تقسیم ہند سے پہلے کا جنون اور پاگل پن بھی کم معلوم ہوتا ہے۔ملک کی سیکولر بنیادوں کیلئے خطرہ بننے والے عناصر کوسزا دینے کا مطالبہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ’’جنہوں نے بابری مسجد کوز میں دوز کردیا انہیں اب بھی سزادی جانی باقی ہے۔قانون کے ہاتھ گجرات میں ہزاروں مسلمانوں کے قتل میں ملوث مودی تک اب بھی نہیں پہنچے ہیں۔میں بےچین ہوں کہ فرقہ پرستی کو قانونی حیثیت ملتی جارہی ہے۔تکثیریت کو الگ کرکے جمہوریت کے کوئی معنی نہیں رہ جاتے۔‘‘

کیا انصاف پسندوں کی ان آوازوں پر کوئی توجہ دے رہا ہے یا فرقہ پرست طاقتوں نے اپنے کان بند کررکھے ہیں؟

☆☆

مسلمانوں کی معاشی تنگ دستی اور اس کے ازالہ کے طریقے

● پروفیسر ریاض عمر

کیا یہ آج کی بات ہے کہ ہندوستانی مسلمان تنگ دست ہیں؟ یا یہ تقسیم وطن کی بات ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد سے ہندستانی مسلمان تنگ دست ہیں؟ دراصل حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے بھی عام مسلمان معاشی طور سے کچھ اونچی سطح پر نہیں تھے۔زمینداروں کی زمینداری تھی اور جاگیرداروں کی جاگیرداری۔سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا حصہ بہت محدود تھا کاروباری حلقوں میں مصروف مسلمانوں کی اکثریت خردہ کاروبار کرتی تھی اور اس سے بہت کم مختلف اشیاء کے تھوک کے بیوپاری تھے۔اس سے کچھ تھوڑے ہی زیادہ فیصد لوگ دستکاری میں مشغول تھے۔وہ تمام ہنرمند تھے لیکن اپنی تیار کی ہوئی بہترین اور خوبصورت اشیاء کی فروخت کے طریقوں سے ناواقف تھے۔وہ بہت ہی معمولی اجرت پر یا تو اہل وطن کے کارخانوں میں کام کرتے تھے یا پھر بہت معمولی قیمتوں پر اپنی تیار کی ہوئی اشیاء بہت ہی کم منافع پر ان کو فروخت کردیتے تھے۔ان قسمت کے ماروں کو مارکٹنگ کے اصولوں سے اور بازار کے داؤ پیچ سے بھی واقفیت نہیں تھی۔نتیجہ میں ان کی محنت سے بنائے ہوئے مال کی طلب کے باوجود ان کو منافع میں سے آٹے میں نمک کے برابر بھی حصہ نہیں پہنچ پاتا تھا۔

آج بھی صورتحال کچھ اس سے ملتی جلتی ہی ہے صرف اتنا فرق ہوگیا ہے کہ اپنے بل

پر کام کرنے والے دستکار آہستہ آہستہ بہت کم ہو گئے ہیں کیونکہ ایک تو ان کاموں کے قدرداں کم ہو گئے دوسرے مشینوں نے چابکدست ہنرمندوں کی جگہ لے لی۔ لیکن یہ چھوٹی چھوٹی مشینوں پر کام کر کے مختلف گھریلو اور صنعتی ضروریات کی اشیاء بنانے والے آج بھی جدید مارکیٹنگ کے طریقوں سے ناواقف ہیں۔ آج بھی وہ بڑے پیمانے پر پیداوار اور اس کی فروخت کے فائدوں سے دور ہیں۔ چھوٹے چھوٹے کارخانے داروں، خوردہ دکانداروں اور تھوک فروشوں کی تعداد میں اضافہ تو ہوا لیکن فیصد کے اعتبار سے کم تر ہوئے ہیں کیونکہ بڑھتی ہوئی آبادی اور غریبی کی سطح سے نیچے درجے والوں کی تعداد میں نسبتاً بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے جس کے نتیجے میں تنگدست مسلمانوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

مسلمانوں کی معاشی پسماندگی کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ درمیانہ درجے اور اس سے کچھ اوپر درجے والے مسلمانوں کی بچت کا روپیہ یا تو گھروں میں نقد اور زیورات کی صورت میں بچا ہوا رکھا ہے یا پھر بینکوں میں سودی یا غیر سودی کھاتوں میں جمع ہے۔ یعنی دراصل اس تمام مجموعی رقم سے کوئی پیداواری فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا ہے۔ شہروں اور قصبات میں جو بڑے بڑے شاپنگ سینٹر اور سینکڑوں کی تعداد میں ملازم رکھنے والے کارخانے اور صنعتیں ملک کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں ان میں مسلمانوں کا کتنا حصہ ہے! صرف سرکاری نوکریوں کے لئے احتجاج کرنے اور ان کی کمی پر ماتم پرسی کرنے سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہو پائیگا۔ ضرورت ہے کہ اس غیر پیداواری بچت کو پیداواری سرمایہ میں تبدیل کرنے کے طریقے ڈھونڈے جائیں۔ آیئے دیکھیں یہ کس طرح ممکن ہوسکتا ہے۔

۱- ہمارے ملک میں جوائنٹ اسٹاک لمیٹیڈ کمپنیز (Joint Stock Limited Comp.) کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ مختلف اسٹاک ایکسچینج میں کم و بیش تین ہزار کمپنیاں رجسٹرڈ ہیں۔ اس میں مسلمانوں کے کنٹرول اور انتظام میں کتنی! ایک فیصد بھی نہیں۔ نئی کمپنیاں قائم کرنے کی ضرورت ہے اور شیئرز کی صورت میں جملہ مسلمانوں کے

غیر پیداواری سرمایے کو باہر لانے کی ضرورت ہے۔ یہ جمع شدہ سرمایہ بڑے پیمانے پر فیکٹریاں، کارخانے اور انڈسٹری لگانے کے کام میں لایا جائے۔ یہاں اس بات کی ضرورت ہے کہ ایسے کاروباری لوگ سامنے آئیں جن کے نام اور کام سے عوام میں اطمینان پیدا ہو اور پھر وہ اپنی چھوٹی چھوٹی بچتیں اچھے منافع کی امید میں ان کاروباری لوگوں کے ہاتھوں میں سونپ سکیں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ گذشتہ کچھ سالوں میں ایسے حضرات نے اس کام میں ہاتھ ڈالا اور سبز باغ دکھا کر سرمایہ تو جمع کیا مگر اسے بیدردی سے اڑا کر کمپنی کو دیوالیہ قرار دلوا دیا۔

ایک پائدار انڈسٹری سے ایک طرف تو بڑی تعداد میں ہنرمندوں کو اچھی ملازمت ملتی ہے اور دوسری طرف شیئرز ہولڈرس کو سرمایہ کاری پر بہتر منافع ملتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کارخانے ملکی اثاثے کا اہم حصہ بن جاتے ہیں۔ جن کی حفاظت اور بہبودی سرکار کی ذمہ داری کا جزء بنتی ہے۔

۲- اس کے علاوہ کوآپریٹیو سوسائٹیز قوانین کے تحت مارکیٹنگ کیلئے کوآپریٹیو سوسائٹیز کی بنیاد ڈالنی چاہئے۔ چھوٹے چھوٹے کارخانوں میں بننے والے مال کو ان سوسائٹیز کے ذریعہ فروخت کیا جائے۔ کاریگروں کو ان سوسائٹیز کا حصہ دار بنایا جائے۔ ایک طرف تو کاریگروں کو ان کے مال کی مناسب قیمت ملے گی اور دوسری طرف منافع میں حصہ بھی ملے گا۔ یہاں بھی مارکیٹنگ کے جدید اصولوں سے واقف لوگوں کے ہاتھوں میں انتظام وانصرام ہونا چاہئے۔

۳- بینکنگ اور انشورنس کے میدانوں میں مسلمانوں کا حصہ ساحل سمندر کے سامنے پڑی ہوئی ریت کے چند ذروں کے برابر بھی نہیں ہے۔ ان اداروں کے ذریعہ سرمایہ کو اکٹھا کر کے سرمایہ کاری میں استعمال کرنے کے بہت مواقع ہیں۔

۴- ایک بہت وسیع میدان میں انفارمیشن ٹیکنالوجی اور کمپیوٹر سائینسیز کا کھل گیا ہے۔

اس کی وسعتیں لامحدود ہیں اور روزگار کے بے انتہا مواقع۔ بلا مبالغہ سیکڑوں کی تعداد میں آسامیوں کی جگہیں خالی ہیں۔آئے دن اخبارات میں ملازمتوں کے اشتہارات ان ممکنہ خالی آسامیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ بلا تذکیر وتانیث کے فرق کے ہزاروں کی تعداد میں معقول مشاہرہ پر لوگ ان جگہوں پر کام کررہے ہیں اور اپنی تنگدستی کو ختم کر کے معیاری طریقہ زندگی کو حاصل کررہے ہیں۔ خال خال مسلمان لڑکے لڑکیاں بھی نظر آتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہر چھوٹے بڑے شہر میں رئیس مسلم افراد کی وساطت سے فنڈ قائم کئے جائیں اور پھر اس فنڈ سے کم استطاعت والے مسلم طلباء وطالبات کو اطلاعاتی ٹیکنالوجی کی تعلیم کے لئے معقول وظائف دیئے جائیں۔ایک بار اطلاعاتی ٹیکنالوجی کے اداروں سے فارغ ہوکر نکلنے والوں کے لئے معقول ملازمتوں کی کوئی کمی نہیں اور پھر اس یافت کے اثرات خاندان کے دیگر حضرات وخواتین تک پہنچیں گے۔

ہمیں زمینی حقیقتوں کو سمجھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ وسائل کو اجتماعی فائدے کے لئے استعمال کرنے سے اکثریت کو فائدہ پہنچے گا۔ بیشک قدرت نے کچھ کو کچھ پر فضیلت دی ہے لیکن جن کو فضیلت دی گئی ہے ان کا فرض ہے کہ دوراندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے انفرادی فائدہ پر گروہی فائدہ کو ترجیح دیں۔ اسلام کے ملکیتی تصور کو تبلیغ کا ایک جزء بنانا چاہیے کیونکہ یہ بھی اسلام میں معاشی اور معاشرتی ترقی کا بنیادی ستون ہے۔

☆☆

مسلم مسائل کے حل کیلئے علماء کی جدوجہد

● یوگیندر سکند

ہندوستان میں گزشتہ کئی برسوں سے تشدد اور بم دھماکوں کا سلسلہ جاری ہے ان میں ایک مالیگاؤں بم دھماکہ بھی ہے۔ اس طرح کے متعدد تشدد کے واقعات سے ملک کے مدارس اور مسلم تنظیمیں دفاعی رخ اختیار کرنے پر مجبور ہوگئی ہیں۔ حالانکہ بیشتر دھماکوں کے متعلق آج تک یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ ان کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے، لیکن ذرائع ابلاغ بلاسوچے سمجھے اس کی ذمہ داری مسلمانوں پر عائد کرتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ مدرسوں میں شدت پسندی یا ہتھیاروں کی ٹریننگ جیسی کسی چیز کا کوئی ثبوت نہیں ملا ہے، لیکن ہندو نظریاتی تنظیموں کی طرح میڈیا بھی ان دھماکوں کے لئے مدارس کو ذمّہ دار ٹھہراتا ہے اور مدرسوں کو 'دہشت گردی کی فیکٹری' بتاتا ہے۔ نتیجہ کے طور پر ہندو نظریاتی تنظیموں کی طرف سے مدارس پر پابندی لگانے یا ان پر سرکاری نگرانی بڑھانے کا مطالبہ دن بدن زور پکڑتا جارہا ہے۔ اپنے خلاف اس طرح کی شدید مہم دیکھ کر مسلم علماء، مدارس اور تنظیمیں یہ صفائی دینے پر مجبور ہیں کہ شدت پسندانہ کارروائیوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اپنے موقف کو واضح کرنے کے لیئے کئی تنظیموں نے سمینار اور کانفرنسیں بھی کی ہیں۔

میں نے بھی ایسی بعض کانفرنسوں میں شرکت کی ہے، ان میں 'جمعیت اہل حدیث' اور 'آل انڈیا ملی کونسل' کی کانفرنسیں قابلِ ذکر ہیں، لیکن ان میں سب سے اہم علماء کی وہ

کانفرنس ہے جس میں وزیر اعظم کے ساتھ ساتھ، سرکردہ صحافی اور بیوریکریٹس بھی شامل تھے۔اس کنونشن کا مقصد یہ بتانا تھا کہ میڈیا کی خبروں کے برعکس مدرسوں کا شدت پسندی سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔اس کنونشن میں علماء نے حکومت سے اپیل کی کہ وہ بے قصور مسلمانوں کو دہشت گردی کے نام پر بے وجہ نہ ستائیں۔مدارس پر اس طرح کے دباؤ سے سیمینار اور کانفرنسوں سے پتہ چلتا ہے کہ علماء بھی اب اسلام اور اپنے اوپر عائد الزامات کے دفاع کے لیئے مجبور ہیں۔ان کی کوششوں سے بعض علماء اور غیر مسلم سماج کے درمیان ایک بامعنی ڈائیلاگ شروع ہوگا۔اس سے مدارس بھی اثر انداز ہوں گے اور ممکن ہے کہ وہ اپنی سوچ میں بھی تبدیلی لائیں، اس سے نہ صرف مدارس کی ایک مثبت شبیہ ابھر سکتی ہے بلکہ اسلام کا وہ معتدل مفہوم بھی سامنے آئے گا جو بھارت کی گنگا جمنی تہذیب کا عکاس ہو۔اس سے غیر مسلم سماج کو بھی مدارس کی اس اہمیت کا احساس ہوگا کہ کس طرح مدرسے غریبوں کے لئے مفت تعلیم مہیا کرتے ہیں۔

یہ سیمینار اور کنونشن اہم تو ہیں لیکن صرف یہی کافی نہیں ہیں۔ہم نے جن کانفرنسوں میں شرکت کی اس سے لگا کہ علماء ہی اپنے آپ کو مسلم سماج کا نمائندہ پیش کرتے ہیں لیکن یہ پوری طرح درست نہیں ہے۔یہ سچ ہے کہ علماء عام طور مسلمانوں کے مسائل کو اٹھاتے ہیں اور اس لئے ایسا لگتا ہے کہ وہی ان کے نمائندے ہیں۔اس سے مسلمانوں میں ان جدید مسلم دانشوروں کی کوششیں اور کمزور ہوجائیں گی جو موجودہ ترقی کی رفتار، اسلام، مسلمانوں کی معاشی حالات اور خواتین کے مسائل کو علماء سے زیادہ بہتر سمجھتے ہیں اور مسلم سماج کی امیدوں پر کھرے اتر سکتے ہیں۔

علماء کی مدارس اور مسلم تنظیموں کے دفاع کے لئے ان کوششوں کو مسلم سماج میں حاکمیت کے سوال پر جاری کشمکش کے پس منظر میں بھی دیکھنا ضروری ہے۔تعلیم یافتہ ماڈرن مسلمانوں اور علماء کے درمیان اس بات پر کشمکش جاری ہے کہ آخر مسلمانوں کا اصل خیر خواہ

کون ہے اور اسلام کے دفاع کے لئے سب سے بہتر آواز کس کی ہے۔

دہلی میں اہل حدیث کنونشن اور بعد میں آل انڈیا ملی کونسل کی کانفرنس میں بھی مجھے یہی دیکھنے کو ملا کہ اعتدال پسند مسلم دانشوروں اور سخت گیروں کے درمیان یہ کشمکش کس طرح جاری ہے۔جولائی میں ملی کونسل کے اجلاس میں بہت سے علماء اور مدرسے کے سیکڑوں طلبہ اکٹھا ہوئے تھے، لیکن غیر علماء دانشور چند تھے اور وہ بھی بغیر داڑھی کے مغربی لباس میں بھرے ہوئے اسٹیڈیم کی گیلری میں کھڑے تھے۔صاف ظاہر تھا کہ جلسے کے منتظمین اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ علماء ہی مسلمانوں کے رہنما ہیں وہی ان کے مسائل پر بولنے کے مجاز ہیں اور ان کے لیئے وہی حکومت کو مطالبات پیش کر سکتے ہیں۔

مدارس اور اسلامک تنظیموں سے زیادہ تر علماء ہی وابستہ ہیں اور کوئی حیرت کی بات نہیں کہ دہشت گردی کے متعلق وہی مسلمانوں کے دفاع میں آگے آگے ہیں۔

شمالی ہندوستان میں بعض مسلم تنظیمیں غیر علماء کے ہاتھوں میں ہیں جو مسلم سماج خاص کر غریبوں کی فلاح کا کام کر رہی ہیں اور مسلمانوں کے مسائل کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش میں ہیں، لیکن مدارس کی تعداد ان تنظیموں سے کہیں زیادہ ہے۔مسلمانوں کی جدید تعلیم یا معاشی حالت بہتر کرنے کے لئے بھی جو تنظیمیں کام کر رہی ہیں وہ بھی ان تنظیموں سے بہت کم ہیں جو مذہبی تعلیم یا مذہبی بیداری مہم میں مصروف ہیں۔اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مسلم سماج پر غیر علماء کی تنظیموں سے کہیں زیادہ مدارس اور علماء کا اثر ورسوخ ہے، یہی وجہ ہے کہ علماء نہ صرف اپنے آپ کو مسلمانوں کا قائد بتاتے ہیں بلکہ وہی مسلم سماج کے دفاع کا حق جتاتے ہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ مسلم سیاسی رہنماؤں یا غیر مسلم تنظیموں کے بجائے علماء کی باتوں پر زیادہ توجہ دیتا ہے۔

بظاہر علماء ہی مسلمانوں اور ان کی تنظیموں کو بچانے کا کام کر رہے ہیں اور غیر علماء ان کے مقابلے میں بہت کم متحرک ہیں۔اس سے اس حقیقت کا بھی پتہ چلتا ہے کہ شمالی

ہندوستان میں عوام سے جڑی بیشتر تنظیمیں ایسی ہیں جو علماء کے ہاتھوں میں ہیں اور وہ بیشتر مذہبی کاموں میں مصروف ہیں۔ حال ہی میں دہلی سے مسلم تنظیموں پر ایک ڈائریکٹری شائع ہوئی ہے جس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ بیشتر مسلم تنظیمیں علماء کے ہاتھوں میں ہیں اور وہ فلاحی کاموں میں بھی مذہب کی تبلیغ کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔ سماجی علوم کے ماہر ڈاکٹر امتیاز احمد کے ایک حالیہ سروے سے انکشاف ہوا ہے کہ، زکوٰۃ اور صدقہ کا زیادہ تر پیسہ مدارس کو ملتا ہے جو غریب طلباء کی تعلیم، رہائش اور کھانے پینے پر خرچ کیا جاتا ہے۔

عام طور پر امیر مسلمان اپنے بچوں کو اچھے انگلش میڈیم اسکولوں میں تعلیم دیتے ہیں جبکہ سماج میں مذہبی تعلیم دینے، مدرسوں کو اساتذہ مہیا کرنے اور مساجد میں امامت و خطابت کی ذمہ داری اس غریب طبقے پر ہے جن کے بچے مدارس میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ایک عام تاثر یہ بھی ہے کہ زکوٰۃ وخیرات صرف مدارس اور مذہبی امور کے لئے ہے اور اسے عصری تعلیم کے لئے نہیں خرچ کرنا چاہیے۔ یہ بات بھی علماء کی طرف سے پھیلائی گئی ہے تا کہ ان کے مدرسے کے کاموں میں کوئی خلل نہ پڑے۔ بعض دانشوروں نے علماء کے اس رویے پر نکتہ چینی کی ہے اور اسے صحیح نہیں بتایا ہے، لیکن اس سے دین اور دنیا کے درمیان کے فرق کو مزید وسعت ملی ہے۔ چونکہ زکوٰۃ ایک دینی کام ہے اس لئے متوسط طبقے کے مسلمان ان تنظیموں کو نظر انداز کرتے ہیں جو ترقیاتی کاموں میں مصروف ہیں اور علماء یا مساجد کو چندہ دینے کو زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔

اس سے ایک بات یہ بھی صاف ہوجاتی ہے کہ متوسط درجے کے مسلمانوں کا ربط عام مسلمانوں سے نہ ہونے کے برابر ہے اور علماء کی رسائی عوام تک ان سے کہیں زیادہ ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ علماء ہی کیوں مدارس اور مسلم تنظیموں کے دفاع میں آگے آگے ہیں۔

مالدار طبقہ اپنے بچوں کو مدرسے میں تعلیم کے لیئے بہت کم بھیجتا ہے اور اس سے دونوں

طبقوں کے میں قائم خلیج وسیع ہوئی ہے۔ دونوں طبقوں کے درمیان موجودہ مسائل کو سمجھنے اور دیکھنے میں بھی بہت فرق ہے جس سے دونوں طبقوں میں دوہرے معیار تعلیم کا فرق بھی با آسانی سمجھ میں آتا ہے۔ دنیاوی مسائل کو دیکھنے کے دونوں کے نظریات بھی مختلف ہیں۔ ایک مولویوں کا گروہ اور دوسرا انگریزی داں طبقہ اور دونوں میں نظریات کے تبادلے کا فقدان ہے۔

بیشتر متوسط درجے کے مسلمان اپنے غیر مسلم ہم منصبوں کی طرح اپنی انفرادی زندگی میں مگن رہتے ہیں اور اقتصادی ترقی پر توجہ دیتے ہیں۔ انہیں غریب مسلمانوں سے کوئی سروکار نہیں ہے جو جہالت وتاریکی میں زندگی جینے پر مجبور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مدارس اور مذہبی تنظیوں کی نسبت غیر علماء کی تنظمیں بہت کم ہیں جو مسلمانوں کی فلاح کا کام کرتی ہوں۔ دونوں کی سوچ میں یہی فرق ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ کیوں علماء مسلمانوں کے دفاع میں آگے آگے ہیں اور دوسرا طبقہ پوری طرح خاموش ہے۔

عام طور متوسط طبقے کے مسلمان ملک کے قومی دھارے میں شامل ہونے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ وہ اعلیٰ طبقے کے غیر مسلموں سے اچھے تعلقات چاہتے ہیں اور شعوری یا غیر شعوری طور پر انہیں ناخوش نہیں کرنا چاہتے۔ اپنے آپ کو اعلیٰ اور مہذب ثابت کرنے کے لیئے وہ پسماندہ مسلم سماج سے اپنے آپ کو الگ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنے آس پاس کے غیر مسلموں کو یہ تاثر دیتے ہیں کہ بعض رسم رواج کے علاوہ ان میں اور غیروں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ حالیہ برسوں میں اسلام کی تشدد آمیز شبیہ پیش کیے جانے کے بعد اس رجحان میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ اس طبقے کے مسلمان اس بات سے خوف زدہ ہیں کہ اگر وہ پسماندہ مسلم سماج کے مسائل کو اٹھائیں گے تو انہیں غیر سیکولر، ملک دشمن، یا دہشت گرد کہا جاسکتا ہے، اس لئے مسلم سماج کے مسائل اور ان کی پریشانیوں کو اجاگر کرنے کی ذمہ داری علماء پر چھوڑ دی گئی ہے۔

اس سلسلے میں علماء کی کوششیں اگرچہ محدود ہیں لیکن مسلم سماج کے مسائل کو حکومت یا غیر مسلم سماج کے سامنے اجاگر کرنے کے لئے ان کی ان مختصر کوششوں کو سراہا جانا چاہئے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انہوں نے اس کے لئے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ پوری طرح درست اور بہت موثر ہے۔

مدارس میں دہشت گردی کے الزمات کو غلط ثابت کرنے کے لئے جن پروگراموں میں میں نے شرکت کی اس میں زیادہ تر شرکاء مسلم تھے اور بیشتر مقررین نے سخت اردو میں جو تقریریں کیں وہ غیر مسلموں کو بہت کم سمجھ میں آئی ہوں گی۔ اگر ان کانفرنسوں اور سیمیناروں کا مطلب یہ تھا کہ وہ غیر مسلموں کو مدرسے کی درست شبیہ سے آگاہ کریں تو اس میں کامیابی نہیں ملی ہوگی۔ یہ مقصد اس صورت میں حل ہوسکتا تھا کہ ان سیمیناروں میں، میڈیا، حقوق انسانی کی تنظیمیں، غیر مسلموں اور ان تنظیموں کے لیڈروں کو دعوت دی جاتی جنہوں نے مدرسوں کے خلاف مہم چھیڑ رکھی ہے تاکہ وہ علماء کی باتیں سن سکتے۔ مزید یہ کہ علماء اور ان کے نکتہ چینوں کے درمیان مذاکرات ہوتے تاکہ دونوں فریق ایک دوسرے کے نکتہ نظر سے واقف ہوتے نا کہ یکطرفہ مدارس اور اسلامک گروپ کے دفاع میں معذرت بھری تقریریں۔ چونکہ غیر مسلم تنظیموں سے علماء کے تعلقات بہت کم ہیں اس لئے یہ کام ان کے لئے اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ بعض علماء کے غیر مسلم رہنماؤں سے تعلقات ہیں اور دیکھنے میں آیا کہ وہی محدود لوگ ہی وہاں موجود تھے اس لئے غیر مسلموں پر اس کے اثرات نہ ہونے کے برابر مرتب ہوئے ہیں۔ بیشتر علماء ہندی یا انگریز زبان سے بھی ناواقف ہیں اور میڈیا آرگنائزیشن سے بھی تعلقات بہت کم ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کنونشنوں سے مدارس کے متعلق عام مسلم طبقے کے ذہن پر بھی کوئی خاص اثر نہیں پڑا ہوگا۔

ان جلسوں میں ایک خاص موضوع 'اسلام دہشت گردی کا مخالف ہے' پر بیشتر تقریریں ہوئیں۔ مقررین نے اس بات پر زور دیا کہ شرعی اسلامی جہاد اور دہشت گردی دو

مجموعه القاسم: جلد پنجم — مسلم مسائل اور اس کا حل

مختلف چیزیں ہیں۔ ممبئی میں ایسے ہی ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی نے کہا کہ اسلام میں دہشت گردی کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ دہلی میں جمعیت اہل حدیث نے بھی اپنے سیمینار 'دہشت گردی انسانیت کے لئے ایک لعنت ہے' میں دہشت گردی کی مذمت کی اور اس کے خلاف فتوٰی جاری کیا۔

اس طرح کے جلسوں میں اس بات پر زور دیا گیا کہ اسلام میں دہشت گردی ناقابل برداشت ہے اور مسلمانوں کو اس کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جانا چاہیے۔ کئی مقررین نے اس بات پر بھی زور دیا کہ ہندو نظریاتی تنظیمیں دہشت گردی میں ملوث ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ عراق اور فلسطین جیسی جگہوں پر جب مسلمان اپنے دفاع کے لئے ایسا کرتے ہیں تو وہ درست ہے۔

کچھ بھی ہو مدارس کے دفاع میں علماء نے بہت کم ذرائع سے تھوڑی بہت جو کوششیں شروع کی ہیں وہ کچھ نہ ہونے سے تو کہیں زیادہ بہتر ہیں۔

اس طرح کے فتوے اور علماء کے اعلانات خوش آئند بات ہے۔ اس سے مسلم اور غیر مسلم دونوں کے ذہنوں میں دہشت گردی کے متعلق ایک نئی سوچ جنم لے گی۔ اس سے کچھ حد تک اسلام اور جہاد کے متعلق غیر مسلموں کے نظریے میں بھی تبدیلی آنے کی توقع ہے، لیکن یہ دفاع کافی نہیں ہے کیونکہ علماء ایک طرف یہ کہتے ہیں کہ اسلام میں دہشت گردی کی کوئی جگہ نہیں ہے اور دوسری طرف بعض گروپ اسلام کے نام پر دہشت گردی کرتے ہیں۔ تو یہ زیادہ اچھا تبھی ہوگا جب ایسی کاروائیوں کی بھی شدت سے مذمت کی جائے گی اور دہشت گردی کے خلاف فتووں کو تنظیم کے نام سے تشہیر بھی ملے، لیکن اب تک علماء اس میں ناکام رہے ہیں۔ کچھ بھی ہو مدارس کے دفاع میں علماء نے بہت کم ذرائع سے تھوڑی بہت جو کوششیں شروع کی ہیں وہ کچھ نہ ہونے سے تو کہیں زیادہ بہتر ہیں۔ اس سلسلے میں علماء کی کارروائیاں اعلٰی طبقے کے مسلمانوں سے کہیں زیادہ بہتر ہیں جو بظاہر کچھ بھی نہیں

کررہے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ علماء کا اس میں اہم رول ہے، لیکن بعض مسائل کے سبب وہ تنہا اس کام کو پورا بھی نہیں کرسکتے اس لئے ضروری ہے کہ جدید تعلیم سے آراستہ دانشور بھی اس کام میں آگے آئیں۔ ممکن ہے کہ علماء یہ سوچ کر اس کی مخالفت کریں کہیں مسلم سماج پر ان کی گرفت کمزور نہ پڑ جائے۔ سیاسی جماعتیں اور سرکار بھی اس طرح کے مسلمانوں کے بڑھتے مطالبات کو شاید پسند نہ کریں۔

اب تک علماء حکومت سے، مسلم پرسنل لاء بورڈ، بابری مسجد کی بازیابی اور ملازم کی داڑھی بڑھانے جیسے بعض مذہبی امور کے مطالبات ہی کرتے رہے ہیں اور ان کی معاشی ترقیاتی کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی ہے، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا جدید تعلیم سے آراستہ دانشور مسلمانوں کے مسائل کے لیئے آگے آئیں گے۔

☆☆

کیا مسلم تنظیمیں قصوروار نہیں؟

● ایم ودود ساجد

ہندوستانی مسلمانوں کی نوجوان نسل کے لئے آنے والا ہندوستان کیسا ہوگا؟ کیا مسلمانوں کے مذہبی اور سیاسی قائدین کو اس کا اندازہ ہے؟ بلاشبہ ان کو اس کا اندازہ ضرور ہوگا، لیکن وہ اپنے سیاسی مفادات کی خاطر اس نکتہ سے مجرمانہ غفلت برت رہے ہیں۔ گزشتہ دو ماہ سے کم سے کم دو ایسی خبریں گشت کررہی ہیں کہ جن کی بنیاد پر ہمارے مسلم قائدین کی نیند حرام ہوجانی چاہئے تھی، لیکن تمام ثبوت وشواہد اس کی غمازی کرتے ہیں کہ مسلم قائدین کو ان خبروں نے ہرگز پریشان نہیں کیا۔ انہیں ان سیکڑوں بے گناہ مسلم نوجوانوں کی چیخیں سنائی نہیں دیں جن کو مودی نواز سونیا گاندھی کی سیکولر حکومت اور مختلف ریاستوں نے ان دھماکوں کے جرم میں جیلوں میں ڈال رکھا ہے جو سادھوی پرگیا اور اس کے چیلوں نے کئے تھے۔

مجھے سونیا گاندھی کو مودی نواز کہنے میں کوئی تکلف نہیں۔ مسلمانوں کے پاس اس امر کی ٹھوس دلیل موجود ہے کہ سونیا گاندھی کو گجرات کا وزیر اعلی نریندر مودی بہت پسند ہے۔ گجرات میں 2002 کے بھیانک مسلم کش فسادات کے چند ماہ بعد ہی راجیو گاندھی فاؤنڈیشن نے نریندر مودی کو بہترین وزیر اعلی کا ایوارڈ دیا تھا۔ اس فاؤنڈیشن کی سربراہ خود سونیا گاندھی ہیں۔ ایک طرف جب پورا ملک بلکہ پوری دنیا نریندر مودی کی مسلم کشی کے خلاف اظہار تاسف کررہی تھی، راجیو گاندھی فاؤنڈیشن کے ذریعہ اسے بہترین وزیر اعلی

ہونے کا سرٹیفکٹ دینے کے کیا معنی تھے؟ اگر گجرات میں اقتصادی محاذ پر ترقی ہوئی بھی تھی تب بھی گجرات کے بے گناہ مسلمانوں کے عدیم المثال قتل عام کے تناظر میں مودی کو سال کا سب سے بہترین وزیر اعلیٰ قرار دینے کا کوئی جواز موجود نہیں تھا۔ سونیا گاندھی کی سربراہی والے متحدہ محاذ کو مسلم بیزار اور مودی نواز قرار دینے کے اور بھی کئی ثبوت وشواہد موجود ہیں لیکن زیر بحث موضوع میں اس پہلو پر تفصیلی کلام مقصود نہیں ہے۔

اجمیر کی درگاہ، حیدرآباد کی مکہ مسجد اور مالیگاؤں کی مسجد اور قبرستان میں بم دھماکے کرکے بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتارنے والے کون تھے؟ سوامی اسیمانند کا حالیائی اقبالیہ بیان اور مختلف تفتیشی ایجنسیوں کی متعدد رپورٹیں ان مکرہ چہروں پر سے نقاب نوچ کر پھینک چکی ہیں، لیکن ان تمام دھماکوں کے الزام میں ابھی تک مسلم نوجوان ہی جیلوں میں سڑ رہے ہیں۔ حیرت ہے کہ نئے حالات سامنے آنے اور حقیقت آشکارا ہوجانے کے باوجود ہماری انصاف گاہوں سے ان بے گناہ مسلم نوجوانوں کو ضمانت نہیں مل رہی ہے جبکہ اجمیر، حیدرآباد اور مالیگاؤں کے دھماکوں کے اصل مجرمین کو ضمانتیں بھی مل رہی ہیں اور مختلف شرپسند تنظیمیں ان کے دفاع کے لئے موٹی موٹی رقمیں جمع بھی کر رہی ہیں۔ بڑے بڑے وکیل بھی کھڑے کئے جارہے ہیں اور سیاسی مہمیں بھی چلائی جارہی ہیں۔ جبکہ دوسری طرف ان سیکڑوں بے گناہ مسلم نوجوانوں کے لئے نہ کوئی بیان دے رہا ہے اور نہ کوئی چندہ جمع ہو رہا ہے۔ نہ کوئی اچھا وکیل ان کی قانونی مدد کے لئے فراہم کرایا جارہا ہے اور نہ کوئی ان کے لئے سیاسی مہم چلا رہا ہے۔ اس لئے کہ ان بے چارے لٹے پٹے نوجوانوں سے انہیں کیا ملے گا؟ چند بوڑھے اور کانپتے ہاتھوں کی دعائیں اور بس! بھلا کنویں اور تالاب سے بھی بڑا شکم کہیں مظلوم ماؤں کی دعاؤں سے بھرا کرتا ہے؟ بے گناہوں کے حق میں آواز اٹھائیں گے تو اخبارات میں بڑی بڑی خبریں نہیں چھپیں گی، حکومت کا محکمہ داخلہ ناراض ہوجائے گا اور وہاں سے برسنے والا من وسلویٰ ٹھہر جائے گا۔ پھر سیاسی آقاؤں کی ناراضگی کا بھی خوف

ہے۔ مظلوم مسلم نوجوانوں کی رہائی کا سوال اٹھایا تو برسر اقتدار پارٹی کے حق میں اچھا پیغام نہیں جائے گا۔

کیا بے گناہ مسلم نوجوانوں کو ضمانت نہ دئے جانے کی خبر امام حرم کے آنے سے بڑی خبر نہیں ہے؟ مجھے امام حرم کے احترام اور تقدس کا پورا خیال ہے اور یہ کہ میں اس کی جرات ہی نہیں کر سکتا کہ امام حرم کی شان میں کوئی چھوٹا جملہ لکھنے کے بارے میں سوچنے کی بھی جرات کروں۔ واقعہ یہ ہے کہ امام حرم نے ایک ادارہ میں جب ظہر کی نماز کی چاروں رکعتیں پڑھادیں اور کسی خود ساختہ مفتی نے اسی وقت لوگوں سے یہ کہنا شروع کر دیا کہ آپ اپنی نماز دوہرالیں تو مجھے بے حد تکلیف ہوئی۔ میں نے لوگوں سے حتی المقدور یہ کہا کہ امام حرم کو زیادہ علم وبصیرت ہے یا ہمیں اور اس خود ساختہ مفتی کو میں نے کہا کہ امام حرم نے جو کیا صحیح کیا۔ ہماری نماز ہوگئی اور اگر اس میں کوئی سقم ہے بھی تو امام حرم اس کے ذمہ دار ہیں عام مسلمان نہیں اور آخر کار وہی ہوا کہ امام حرم کو اس تکلیف دہ واقعہ کی اطلاع ہوگئی۔ مجھے بعد میں علم ہوا کہ امام حرم کو اس پر افسوس ہوا۔ مختصر یہ کہ میں امام حرم کے تقدس کا اتنا قائل ہوں کہ میں ان کا نام بار بار احترام کے جذبہ کے تحت لکھنے سے گریزاں ہوں لیکن اس کے باوجود کیا ہمارے اس جذبے کے آگے ان مسلم نوجوانوں کی مصیبت زیادہ بڑی نہیں ہے جو عرصہ سے ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت رہے ہیں۔

پچھلی ایک دہائی میں جتنے مسلم نوجوانوں کو دہشت گردی کے الزام میں گرفتار کرکے جیلوں میں ٹھونسا گیا ہے اتنے ہی واقعات ایسے بھی رونما ہوئے ہیں جن کی رو سے وہ بے گناہ ثابت ہوگئے ہیں۔ متعدد معاملات میں پولس اور انٹلیجنس ایجنسیوں کو عدالتوں نے پھٹکار بھی لگائی ہے۔ بعض نوجوانوں کو باعزت چھوڑ بھی دیا گیا ہے۔ بعض تفتیشی ایجنسیوں اور انگریزی کے بعض اخبارات کے جانباز رپورٹروں کی مختلف رپورٹوں سے یہ بھی واضح ہوگیا ہے کہ پردہ کے پیچھے اصل مجرمین کون ہیں۔ اس کے باوجود مسلم نوجوانوں پر پورے

ملک میں عتاب جاری ہے۔ ہمارے لئے یہ کوئی انوکھی خبر نہیں کہ ہندوستان کی جانباز پولس نے ایک بے گناہ کو پکڑا اور اس کو اتنا بڑا دہشت گرد بنا کر پیش کر دیا کہ جیسے اس جیسا دہشت گرد آج تک پولس کے ہاتھ لگا ہی نہیں تھا۔ اس آزاد مادر وطن میں یہی ہوتا آیا ہے، مگر اب میڈیا کی عنایت سے اس کا جلدی پتہ چل جاتا ہے۔ بے گناہوں پر اتنا ظلم تو جابر و غاصب انگریزوں نے بھی نہیں ڈھایا تھا۔ ظلمت کی انتہا یہ ہے کہ نہ 100 کروڑ سے زیادہ ہندوستانیوں کا وزیر اعظم اس ظلم کے خلاف کچھ بولتا ہے اور نہ 20 کروڑ سے زیادہ مظلوم فرقہ کے نام نہاد ٹھیکہ داروں کے لبوں کو جنبش ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر کلکتہ کے آفتاب انصاری کا واقعہ لیا جا سکتا ہے جو 22 دنوں تک یو پی پولس کی بہادری جھیلنے کے بعد چھوٹ کر اپنے گھر تو چلا گیا تھا مگر اس کی بے کس و بے بس ماں محض اپنی ممتا کی طاقت سے اپنے واحد سہارے کو پولس کے آہنی شکنجہ سے چھڑا کر ایک بار پھر ہندوستان بھر کی ان ڈھیروں مسلم تنظیموں کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ رسید کر گئی تھی جو اسی بدنصیب قوم کے نام پر مختلف محاذوں سے لاکھوں کروڑوں کا چندہ وصول کرتی ہیں اور پھر غائب ہو جاتی ہیں۔ افغانستان کا سابق بددین حکمراں مغرب اور یورپ کے قحبہ خانوں میں برسوں گزار کر اپنی فطری موت مر جائے تو اس کے لئے دینی مدارس میں بڑی بڑی تعزیتی مجلسیں منعقد ہوں، ایصال ثواب کے لئے قرآن خوانیوں کا اہتمام کیا جائے، اس کی خبر اخبارات کو جاری کی جائے، مدارس کے مہتمم تعزیتی بیانات جاری کریں، اس لٹی پٹی قوم سے اس کے لئے دعائے مغفرت کی اپیلیں کریں۔ پیٹرو ڈالر سے مالا مال ایک سلطنت کے شاہ کو چھینک آ جائے تو اس کے لئے مسجدوں میں اجتماعی دعاؤں کا اہتمام کرایا جائے، اس کی دائمی صحت اور درازی عمر کے لئے رو رو کر لمبی لمبی دعائیں کی جائیں۔ یا پھر کوئی سر پھرا ہندو کامن سول کوڈ کا مطالبہ کر دے تو اس کے خلاف پروفیشنل علما کے بیانات کی جھڑی لگ جائے۔ کوئی کاروباری ہندو خاندان ملعون سلمان رشدی کو اپنے گھر پر دعوت دیدے تو اس کے گھر کے

باہر دھرنا دے دیا جائے۔ مسلمانوں سے اس صنعتی میزبان کی مصنوعات کے بائیکاٹ کی اپیل کر دی جائے لیکن جب عملی اور حقیقی کام کرنے کا لمحہ آن کھڑا ہوا اور کسی آفتاب انصاری پر کوئی افتاد آ جائے تو پھر ان کے لبوں پر تالے لگ جاتے ہیں۔ ان کی زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں۔ ان کی آنکھوں کی بینائی چلی جاتی ہے۔ پھر نہ دعا کے لئے ان کے ہاتھ اٹھتے ہیں اور نہ ایک غریب کی مدد کے لئے ان کے قدم۔ پھر تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے ساری مسلم تنظیمیں اجتماعی چھٹی لے کر سات سمندر پار چلی گئی ہیں۔ جیسے ان کے دفاتر ہندوستان سے باہر منتقل ہو گئے ہیں اور جیسے وہ یہاں کے تھے ہی نہیں۔

کلکتہ کا آفتاب انصاری تو اس وقت پولس کی گرفت سے آزاد ہے لیکن پورے ملک میں ایسے مزید سیکڑوں آفتاب انصاری جیلوں میں ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت رہے ہیں۔ حال ہی میں اجمیر دھماکوں کے ایک ہندو ملزم کو عدالت نے ضمانت دیدی ہے لیکن سوامی اسیمانند کے اقبالیہ بیان اور تفتیشی ایجنسیوں کی مثبت رپورٹوں کے باوجود وہ مسلم نوجوان ابھی تک ضمانت کے لئے ایڑیاں رگڑ رہے ہیں جنہیں ان دھماکوں کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ آخر ایک ہی ملک میں ایک ہی وقت میں قانون کے دو پیمانے کیوں اختیار کئے جا رہے ہیں؟ اگر اجمیر دھماکہ کے اصل ملزم بلکہ مجرم کو ضمانت مل سکتی ہے تو جھوٹے الزام میں گرفتار مسلم نوجوانوں کو کیوں ضمانت نہیں دی جا سکتی؟ کیا اس کا انتظار کیا جا رہا تھا کہ سوامی اسیمانندا اپنے مبنی بر صداقت بیان سے پھر جائے؟ جی ہاں سوامی اپنے اس بیان سے پھر گیا ہے اور اس نے کہا ہے کہ مجھ پر دباؤ ڈال کر وہ بیان دلوایا گیا تھا۔ ہمیں اس پر ذرہ برابر یقین نہیں ہے کہ پولس سوامی اسیمانند سے ایسا بیان دباؤ ڈال کر دلوائے گی جو بے گناہ مسلم نوجوانوں کی رہائی کے لئے جواز پیدا کر دے۔

مسلم تنظیموں کا حال تو یہ ہے کہ گجرات فسادات کے دوران بھی انہیں کاروبار کرتے ہوئے شرم نہیں آئی۔ اسلامک ریلیف کمیٹی نامی ایک تنظیم نے 2002 کے فسادات میں

اجڑنے والے خاندانوں کے لئے چندہ جمع کر کے مکانات تعمیر کرائے۔ظاہر ہوجانے والے معاملات میں بدنصیب ظہیرہ شیخ سے زیادہ اجڑا ہوا خاندان کس کا ہوگا؟لہذا جب وہ شہر میں ایک چھت کا سایہ تلاش کرتی پھر رہی تھی تو اسے کسی نے اسلامک ریلیف کمیٹی کا پتہ بتا دیا۔اس کمیٹی کے ذمہ داروں نے اس سے ایک کمرہ کے فلیٹ کے لئے 50 ہزار روپیہ طلب کئے۔انڈین ایکسپریس اوراین ڈی ٹی وی کے ہندو نامہ نگار تو اجڑی ہوئی ظہیرہ شیخ کی حمایت میں اتنا آگے بڑھ جائیں کہ ہندو شدت پسندوں کی دھمکیاں انہیں اپنے انسانی فرائض کی ادائیگی سے ایک انچ پیچھے نہ ہٹا سکیں لیکن مسلمانوں سے چندہ کر کے فساد زدہ مسلمانوں کے لئے مکانات تعمیر کرنے والے مسلمان ادارے اجڑی ہوئی ظہیرہ شیخ سے سر چھپانے کی قیمت طلب کریں۔ایک ایسی نابالغ مسلمان لڑکی سے 50 ہزار روپیہ طلب کریں جو اپنی آنکھوں سے اپنے بھرے پڑے مکان اور بیکری کو اپنے باپ سمیت نذر آتش ہوتا ہوا دیکھ کر آرہی ہے۔جس کی معصوم آنکھوں نے 14 لوگوں کو زندہ جلتے ہوئے دیکھا ہے اور جو تن تنہا غنڈوں کے خلاف کھڑی ہوگئی ہے۔واضح رہے کہ یہ ظہیرہ شیخ ہی تھی جو بیسٹ بیکری کی آگ ٹھنڈی ہونے سے بھی پہلے پولس تھانے پہنچ گئی تھی اور جس نے ان غنڈوں کے خلاف نامزد رپورٹ درج کرائی تھی۔اسی کی بنیاد پر مقدمہ چلا اور اسی کی بنیاد پر بعد میں چند مجرموں کو سزائیں بھی ہوئیں۔یہ الگ بات ہے کہ مقدمہ کی کمر توڑ سماعت کے دوران ظہیرہ شیخ کو شر پسندوں نے اس قدر اپنے خوف میں جکڑ لیا تھا کہ عدالت نے تمام 21 ملزموں کو بادل ناخواستہ چھوڑ دیا تھا۔اس کی مجرم بھی یہ مسلم جماعتیں ہی تھیں جن میں سے کوئی ایک بھی سماعت کے دوران اس بے کس کی مدد کے لئے کوئی نہیں پہنچا۔وہ تنہا آخر کب تک ان غنڈوں کا سامنا کرتی؟ بعد میں جو کچھ ہوا وہ اس بدنصیب قوم کی روداد رنج و الم کی تاریخ کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ظہیرہ کو تیستا سیتلواڈ جیسی غیر مسلم رضا کار نے پناہ دی اور اسی نے سپریم کورٹ میں رٹ دائر کر کے اس کا مقدمہ گجرات سے باہر منتقل کرایا۔اس

دوران کوئی مسلم تنظیم سامنے آکر تیستا سے یہ کہنے کی اخلاقی جرات نہ کر سکی کہ آپ کا یہی احسان بہت ہے کہ آپ لٹے پٹے مسلمانوں کے ساتھ کھڑی ہوگئی ہیں،لائیے ظہیرہ کو ہمیں دیجئے وہ ہماری بیٹی ہے ہم اس کی کفالت کریں گے اور آپ اس کے لئے جو مقدمات لڑ رہی ہیں ان کے اخراجات بھی ہم ہی ادا کریں گے۔

ظہیرہ ایک لڑکی نہیں تھی۔وہ اس مظلوم اور لٹی پٹی مسلم ملت کی ایک علامت اور ایک امانت تھی۔اس جیسی نہ جانے کتنی ظہیرائیں گجرات اور ملک کے طول وعرض میں ایڑیاں رگڑ رہی تھیں مگر مسلم تنظیموں نے ایک تیستا پر ساری ذمہ داری ڈال کر جو شرمناک پیغام دیا تھا اس کی شدت کبھی ختم نہیں ہوگی۔اس ملک کی بیوروکریسی کو،سیاستدانوں اور سیاسی پارٹیوں کو اور اس ملک کی عدلیہ اور انتظامیہ کو یہ پیغام پہنچ گیا کہ ایک نہیں چاہے ایک ہزار گجرات ہوجائیں اور ایک ظہیرہ اور بلقیس نہیں چاہے ہزاروں ظہیرائیں اور بلقیسیں درندگی کا شکار ہوجائیں کوئی مسلمان ان کی مدد کو آنے والا نہیں ہے۔گلے پھاڑ پھاڑ کر مسلمانوں کے مسائل پر تقریریں کرنے والے ایک ظہیرہ اور ایک بلقیس کی خبر نہیں لے پائے تو بھلا وہ ایک 'دہشت گرد' آفتاب انصاری کی بوڑھی ماں کی خبر گیری کیسے کرتے؟ وہ ان سیکڑوں بے گناہ مسلم نوجوانوں کو کیسے چھڑاتے جو سوامی اسیمانند اور سادھوی پرگیا کے کارناموں کی سزا جھیل رہے ہیں؟ کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ تمام مسلمان تنظیمیں سر جوڑ کر بیٹھیں اور ملک گیر پیمانے پر ایک ایسا ادارہ تشکیل دے ڈالیں جو ایسے معاملات میں متاثرین کی نہ صرف قانونی مدد کرے بلکہ ان کا مادی اور اخلاقی تعاون بھی کرے۔جرم ثابت ہونے سے پہلے کسی کو مجرم نہیں کہا جا سکتا اور اس دور میں تو بالکل بھی نہیں کہا جا سکتا جب ایسے ایک دو نہیں ہزاروں آفتاب انصاری پورے ملک میں پولس کی شیطانی ذہنیت کا شکار ہوکر اپنی زندگیاں برباد کر چکے ہوں۔میں جانتا ہوں کہ ہمارے کچھ نام نہاد سیکولر مسلم دانشور یہ کہتے ہیں کہ مسلم نوجوان شدت پسندی کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔میرا سوال یہ ہے کہ آفتاب

انصاری یا اس جیسے سیکڑوں تباہ حال نوجوانوں سے اب آپ کیا توقع رکھتے ہیں؟ کیا انہیں ان جابر درندوں کے اوپر پھولوں کی بارش کرنی چاہیے؟ اگر نہیں تو پھر آپ کا یہ فرض بنتا ہے کہ اب جبکہ آفتاب پوری طرح بے گناہ ثابت ہو چکا ہے اس پر درندگی آزمانے والوں کے خلاف مقدمات قائم کرائیے۔ ان کو آستانۂ انصاف پر گھسیٹ کر لائیے۔ ان کی اخلاقی مدد کیجئے اور ان کی پشت پر مضبوط دیوار بن کر کھڑے ہو جائیے۔ ان لٹے پٹے نوجوانوں کو 'گمراہی' سے بچانا ہے تو وہ 'انٹی' ڈھیلی کرنی پڑے گی جس میں اسی ملت کی امانتیں آپ نے ہضم کر رکھی ہیں اور جس پر آپ ناگ بن کر بیٹھ گئے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دیر ہو جائے اور یہ ظلم رسیدہ نسل ایسا اژدہا بن جائے جو سب سے پہلے آپ کو ہی نگل ڈالے۔

(مضمون نگار صحافی اور تجزیہ نگار ہیں)

☆☆

مسلمانوں سے سوتیلا برتاؤ

ملک اور جمہوریت دونوں کیلئے شدید خطرہ!

● ڈاکٹر منیش کمار

ہندوستان کے مسلمان ملک کے سب سے پسماندہ اور استحصال زدہ طبقے کا حصہ بن چکے ہیں۔ سیاست میں مسلمان حاشیہ پر ہیں۔ انتظامیہ، فوج اور پولس میں مسلمانوں کی تعداد شرمناک حد تک کم ہے، عدلیہ میں مسلمانوں کی موجودگی بہت کم ہے اور رہی سہی کسر لبرل ازم، نجکاری اور گلوبلائزیشن کی اقتصادی پالیسی نے پوری کردی ہے، جس کا خمیازہ سب سے زیادہ مسلمانوں کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر نے سماجی عدم مساوات کو جمہوریت کے لئے تباہ کن بتایا تھا۔ مسلمان سماجی مساوات سے کوسوں دور ہیں اور نہ ہی ان کی سیاسی جمہوریت میں قابل ذکر حصہ داری ہے۔ مسلمانوں کی پسماندگی کی وجہ سے آج ہندوستان کے ویلفیئر اسٹیٹ ہونے پر سوالیہ نشان لگ رہا ہے۔ یہ جمہوریت پر ایک بدنما داغ بن کر ابھر رہا ہے۔ ایک کامیاب سیاسی جمہوریت کے لئے سماجی جمہوریت ضروری ہے۔ جب تک معاشرتی جمہوریت کی بنیاد نہ ملے سیاسی جمہوریت چل نہیں سکتی۔ آزادی کو مساوات سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی مساوات کو آزادی سے الگ کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح آزادی اور مساوات کو بھائی چارگی سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ ہندوستان ایک ایسے دور میں داخل ہو چکا ہے، جہاں سیاسی مساوات کو ایک شخص-ایک ووٹ کا اصول سمجھ لیا گیا ہے، جبکہ معاشرہ میں اقتصادی اور سماجی عدم مساوات ہے۔ ہندوستان کا سب سے بڑا

اقلیتی طبقہ پہلے سے زیادہ استحصال زدہ، پہلے سے کہیں زیادہ پسماندہ اور اقتدار سے دور چلا گیا ہے۔ یہ ملک میں جمہوریت کے لئے خطرے کی گھنٹی ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ملک پر حکمرانی کرنے والے اس خطرے سے بالکل نابلد ہیں۔

1947 میں جب ہندوستان تقسیم ہوا تو کچھ لوگوں نے ہندوستان کو اپنا ملک مان کر پاکستان جانے سے انکار کر دیا۔ ان لوگوں نے ہندوستان کو ہی اپنا وطن مانا اور مسلم لیگ کی باتوں پر بھروسہ نہیں کیا۔ ان لوگوں نے ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ اپنی مرضی سے کیا تھا۔ انہیں یہاں کی گنگا جمنی تہذیب زیادہ پسند آئی۔ ساٹھ سال سے زیادہ گزر گئے۔ اس ملک سے محبت کرنے کا انعام یہ ملا ہے کہ آج ہندوستان کا مسلمان ملک کے سب سے زیادہ پسماندہ سماج میں تبدیل ہو گیا ہے۔ مسلم نوجوانوں کو بیروزگاری کے ساتھ ساتھ طعن وتشنیع کا بھی سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ملک کی سیاسی جماعتوں کو مسلمانوں کا ووٹ تو چاہئے، لیکن جب ان کے مسائل کو حل کرنے کا وقت آتا ہے تو وہ خاموشی اختیار کر لیتی ہیں۔ حکومت کے اسی سوتیلے رویہ کی وجہ سے مسلمانوں کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔

آزادی کی لڑائی کے دوران ہی یہ طے ہو گیا تھا کہ آزاد ہندوستان ایک ری پریزنٹیٹو ڈیموکریسی اور ویلفیئر اسٹیٹ ہوگا۔ یہ ہندوستان کے سماجی خاکہ کے حساب سے سب سے مناسب نظام حکومت تھا۔ گاندھی، نہرو اور دیگر تمام لیڈروں نے یہی سوچا تھا کہ انگریزوں کی حکومت سے آزادی کے بعد حکومت غریب عوام کی ترقی کے لئے کام کرے گی۔ دنیا بھر میں موجود تمام طرز حکومت میں جمہوریت کو سب سے بہتر اس لئے تسلیم کیا گیا ہے، کیوں کہ اس نظام کے تحت انتظامیہ میں ہر طبقہ اور کمیونٹی کے حقوق محفوظ رہتے ہیں اور ان کی حکومت میں یکساں حصہ داری ہوتی ہے۔ اقلیتوں کے ساتھ ساتھ غریب اور پسماندہ طبقات کی بھی حکومت چلانے میں حصہ داری، جمہوریت کو دوسری تمام طرز حکومت میں ممتاز بناتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے دستور سازوں میں اس بات پر اتفاق تھا کہ آزادی کے بعد

جمہوری حکومت بنے گی، جس میں چھوٹے بڑے تمام طبقوں کی یکساں حصہ داری ہوگی۔ آج ہمارے سامنے ہندوستان میں جمہوریت کے خاتمے کے خطرات نظر آنے لگے ہیں۔ جمہوری طرز حکومت کے بارے میں کئی لوگوں کو یہ بھرم ہے کہ اس کی بنیاد اکثریت پر ہے۔ جب یوروپ میں جمہوریت کا فروغ ہوا، اس وقت جمہوریت کی شکل مختلف تھی۔ اس وقت اکثریت کے اصول جمہوریت کا مول منتر تھا، مگر دنیا کے حالات میں نمایاں تبدیلی ہوئی۔ سرمایہ داری اور لبرل جمہوریت کی آندھی میں کثیر رائے کے نام پر حکومت بے قابو ہوتی چلی گئی۔ غریب کسان اور مزدور اقتدار سے دور چلے گئے۔ اس کی مخالفت میں مارکسوادی سلسلہ خیال کا پھیلاؤ ہوا۔ نتیجہ میں پورے یوروپ میں جمہوریت کا چہرہ تبدیل ہونے لگا۔ لیجے فیئر اسٹیٹ کا اخلاق بدلا، ویلفیئر اسٹیٹ کا قیام ہوا۔ جس میں اقلیتوں کو بھی ترجیح ملنے کا نظام نافذ ہوا۔ ہندوستان کے دستور سازوں نے غریبوں، کسانوں اور مزدوروں کی ترقی کے لئے جمہوریت اور ویلفیئر اسٹیٹ قائم کی۔ مسلمانوں کی حالت ذرا اس بات کی گواہ ہے کہ ہندوستانی جمہوریت اور ویلفیئر اسٹیٹ اپنے ایجنڈے سے ہٹ چکا ہے۔ جس مقصد سے آئینی معماروں نے اسے اپنایا تھا، اس میں ہندوستان ناکام ہو گیا ہے۔

غریب مسلمانوں کے بارے میں جو حقیقت ہے، وہ دل دہلا دینے والی ہے۔ دیہی علاقوں میں خط افلاس سے نیچے بسر کرنے والے مسلمانوں کو مفت اناج نہیں مل رہا ہے۔ صرف 3.2 فیصدی مسلمانوں کو سبسڈائزڈ لون کا فائدہ مل رہا ہے۔ صرف 2.1 فیصدی دیہی مسلمانوں کے پاس ٹریکٹر ہیں اور صرف 1 فیصدی کے پاس ہینڈ پمپ کی سہولت ہے۔ تعلیمی نظام کی حالت اور بھی خراب ہے۔ گاؤں میں 54.6 فیصدی اور شہروں میں 60 فیصدی مسلمان کبھی کسی اسکول میں نہیں گئے۔ مغربی بنگال میں مسلمانوں کی تعداد 25 فیصدی سے زیادہ ہے، مگر سرکاری نوکری میں ان کی موجودگی 4.2 فیصد ہے، جبکہ یہاں کمیونسٹوں کی حکومت ہے، پھر بھی ریاست کی سرکاری کمپنیوں میں کام کرنے والے

مسلمانوں کی تعداد صفر ہے۔فوج، پولس اور نیم فوجی دستوں میں مسلمانوں کی تعداد بہت ہی قلیل ہے۔مسلمانوں کی لاچاری کے اعداد وشمار جیلوں میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔حیرانی کی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی تعداد جیل میں زیادہ ہے۔مہاراشٹر میں 10.6 فیصدی مسلمان ہیں، مگر یہاں کی جیلوں میں مسلمانوں کی تعداد 4.32 فیصدی ہے۔ دہلی میں 11.7 فیصدی مسلمان ہیں، مگر جیل میں بند 9.27 فیصدی قیدی مسلمان ہیں۔مسلمانوں پر ہوئی تمام تحقیق کا نتیجہ ایک ہی ہے۔اسے بدقسمتی ہی کہیں گے کہ حکومت کے کسی بھی محکمہ میں مسلمانوں کی حصہ داری آبادی کے تناسب سے نہیں ہے۔انتظامی سروسز میں مسلمانوں کی تعداد قابل رحم ہے۔ ملک میں صرف 3.22 فیصدی آئی اے ایس، 2.64 فیصدی آئی پی ایس اور 3.14 فیصدی آئی ایف ایس مسلمان ہیں۔اس سے بھی زیادہ حیران کرنے والی بات کیا ہوگی کہ سکھوں اور عیسائیوں کی آبادی مسلمانوں سے کم ہے، مگر ان خدمات میں دونوں کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ ہے۔ ملک کے سرکاری محکموں کی حالت بھی ایسی ہی ہے۔عدلیہ میں مسلمانوں کی حصہ داری صرف 6 فیصدی ہے۔ جہاں تک بات سیاست میں حصہ داری کی ہے تو یہاں بھی حیرت انگیز حقائق سامنے آتے ہیں۔آزادی کے 65 سال بعد بھی اب تک صرف 7 ریاستوں میں مسلم وزیر اعلیٰ بن پائے ہیں۔حیران کن بات یہ ہے کہ جموں وکشمیر کے فاروق عبداللہ کے علاوہ ملک میں ایک بھی ایسا مسلم وزیر اعلیٰ نہیں بن پایا، جو پانچ سال تک حکمرانی کرسکا ہو۔سیاست میں مسلمان حاشیہ پر ہیں، اس بات کی گواہ پارلیمنٹ میں ممبران کی موجودہ تعداد ہے۔فی الوقت پارلیمنٹ میں 543 سیٹوں میں صرف 29 ممبران پارلیمنٹ مسلم ہیں۔یہی نہیں سماجی پسماندگی کے ساتھ ساتھ جمہوریت کے مختلف ستونوں میں بھی مسلمان حاشیہ پر کھڑے ہیں۔جس ملک کا سب سے بڑا اقلیتی طبقہ پسماندہ، ناخواندہ، کمزور اور غریب رہ جائے تو اس کی کبھی بھی ترقی نہیں ہوسکتی۔حکومت کسی بھی پارٹی کی ہو اگر وہ ہندوستان کی ترقی چاہتی ہے تو ہر غریب اور پسماندہ طبقوں کو

ترقی سے جوڑنا اس کی ذمہ داری بن جاتی ہے۔ناخواندگی مسلم سماج کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔حیرانی کی بات یہ ہے کہ آزادی کے اتنے سال گزر جانے کے باوجود مسلم لیڈران اور حکومت کو اس کمزوری کا احساس تک نہیں ہوا ہے۔مدرسوں کو بہتر بنانے کی بات ہوتی ہے تو ہندو اور مسلم شدت پسند تنظیم ایک ساتھ اس کی مخالفت کرتے ہیں اور جو سیکولر اور پروگریسیو کہلانے والی پارٹیاں ہیں، انہیں یہ لگتا ہے کہ جب تک مسلمان غیر تعلیم یافتہ رہیں گے، تب تک انہیں ووٹ بینک کی طرح استعمال کیا جاسکتا ہے۔اب اس بات پر تو صرف افسوس کا اظہار ہی کیا جاسکتا ہے کہ آزادی کے 65 سال بعد بھی ہماری سرکار اس نتیجے پر نہیں پہنچ پائی ہے کہ مسلمانوں کو کیسے تعلیم یافتہ بنایا جائے اور مدرسوں کو کیسے بہتر بنایا جائے۔اب انتظار آئندہ 60 برس کا ہے، جس میں دنیا کہاں سے کہاں نکل جائے گی اور تب تک ہندوستان میں اس موضوع پر ہم بحث ہی کرتے رہ جائیں گے۔

نجکاری، گلوبلائزیشن اور اقتصادی لبرل ازم کا ملک کے غریب مسلمانوں پر سب سے برا اثر ہوا ہے۔گزشتہ دو دہائیوں سے ہندوستان نئی لبرلائزیشن کی اقتصادی پالیسی کی زد میں ہے۔اس کا سب سے برا اثر مسلمانوں پر پڑا ہے۔خاص کر بنکر، دستکار، کاریگر اور کڑھائی۔ رنگائی وغیرہ کرنے والے لوگ اس اقتصادی پالیسی کی وجہ سے حاشیہ پر آ گئے ہیں، وہ بیروزگار ہوگئے ہیں۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ غریبی کی وجہ سے ان کے بچے اسکول سے دور چلے گئے ہیں۔ اب تعلیم کی نجکاری سے غریب اقلیت تعلیم حاصل کرنے سے محروم رہ جائیں گے۔حکومت ایک طرف سرکاری نوکریوں میں تخفیف کر رہی ہے۔اس کی پالیسیاں اور تبدیل ہوتے اقتصادی نظام میں ملک کے تعلیم یافتہ لوگ سرکاری نوکری چھوڑ کر زیادہ پیسے اور کامیابی کے لیے پرائیویٹ نوکری کی جانب بھاگ رہے ہیں۔غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ایسے میں اگر 10 برس کے بعد مسلمانوں کو ریزرویشن دے بھی دیا جاتا ہے تو بھی اقلیت پسماندہ ہی بنے رہیں گے اور ملک کا دوسرا طبقہ آگے نکل جائے گا۔

ہم جب بھی مسلمانوں کی بات کرتے ہیں تو انہیں ایک 'پین انڈین سماج' مان لیتے ہیں۔ یہ سچ نہیں ہے، بلکہ یہ خطرناک بھی ہے۔ ہندوستان کا مسلم سماج کسی دوسرے مذہب کی طرح کثیر الذات نہیں ہے۔ مسلم سماج بھی دوسروں کی طرح اقتصادی، سماجی، علاقائی اور زبان کے اعتبار سے منقسم ہے۔ ہندوستان میں جیسے ہندو سماج ہے، ویسے ہی مسلم سماج بھی ہے۔ دوسرے مذاہب کے غریب اور پسماندہ لوگوں کو جس طرح سے سرکاری اسکیموں کا فائدہ مل رہا ہے، وہ فائدہ مسلمانوں کو بھی ملنا چاہیے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت درج فہرست ذات اور درج فہرست قبائل سے بھی خراب ہے۔ اس کی وجہ واضح ہے کہ غریبی کی مار دونوں پر ہے، لیکن ایک کے لیے سرکار کی مدد موجود ہے اور مسلمانوں کو ان کی قسمت کے سہارے چھوڑ دیا گیا ہے۔ اب ملک کا اقتدار سنبھالنے والوں اور مسلم سماج کے رہنماؤں کے سامنے یہ سوال ہے کہ غریبوں کے درمیان بھی مذہب کے نام پر تفریق کیوں کی جا رہی ہے۔

مسلمانوں کی پسماندگی میں مسلم رہنماؤں کا بھی کردار رہا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ سماجی و اقتصادی ترقی کے ایشوز کے بجائے زیادہ تر مسلم رہنما مذہبی اور ثقافتی جیسے جذباتی ایشوز کو آگے رکھتے ہیں۔ آج بھی ہم مسلمانوں کے حالات کے بارے میں بات کرتے ہیں تو مسئلہ مسلم پرسنل لا، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کردار اور اردو زبان پر آ کر ختم ہو جاتا ہے۔ مسلم لیڈروں کے درمیان سماجی اور اقتصادی ترقی بحث کا مسئلہ نہیں ہے۔ ابتدا سے ہی مسلمان اپنے حق سے زیادہ سیکورٹی کے سلسلہ میں فکرمند رہے ہے، لیکن اسے تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اگر حقوق ہوں گے تو سیکورٹی خود بخود ہو جائے گی۔ جب تک مسلمان بیروزگار، غریب اور اقتدار میں حصہ داری سے دور رہیں گے، تب تک کوئی حکومت، کوئی پارٹی اور کوئی لیڈر انہیں سیکورٹی نہیں دے سکتا۔ اس لیے حقوق کی لڑائی ہی وقت کا مطالبہ ہے، ورنہ دیر ہو جائے گی۔

جتنی بھی سیکولر پارٹیاں ہیں، وہ سب اپنے انتخابی منشور میں مسلمانوں کے ریزرویشن

کی بات دہراتی ہیں اور حکومت بنتے ہی اسے ٹھنڈے بستے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ چوتھی دنیا اخبار نے جب دو برس سے پارلیمنٹ کی الماری میں سڑ رہی رنگناتھ مشرا کمیشن کی رپورٹ شائع کی تو لوک سبھا اور راجیہ سبھا میں ہنگامہ مچ گیا، لیکن حکومت نے اس کے باوجود اسے پیش نہیں کیا۔ اس کے بعد جب چیف ایڈیٹر سنتوش بھارتیہ نے یہ کہہ کر للکارا کہ راجیہ سبھا نامردوں کا کلب بن گئی ہے تو چوتھی دنیا کے چیف ایڈیٹر کو پری ویلیج نوٹس تھما دیا گیا۔ اس کے بعد جب ملائم سنگھ نے لوک سبھا میں آواز اٹھائی اور ایوان کی کارروائی نہ چلنے دینے کی دھمکی دی تب حکومت نے رنگناتھ مشرا کمیشن کی رپورٹ پارلیمنٹ میں پیش کی۔ صرف پیش کی، کوئی کارروائی نہیں کی۔ رپورٹ نافذ کرنے کی اب تک کوئی حکمت عملی نہیں ہے۔ یہ حکومت وہی ہے جس کے سربراہ ڈاکٹر منموہن سنگھ نے کچھ برس قبل یہ کہا تھا کہ ملک کے وسائل پر اقلیتوں کا زیادہ حق ہے۔ حکومت کی یہ کیسی مجبوری ہے کہ وہ وعدہ خلافی پر آمادہ ہے۔ مسلمان کس پر بھروسہ کریں۔ یہ کیوں نہیں مان لیا جائے کہ سیاسی جماعتیں چاہے وہ کسی بھی نظریہ سے تعلق رکھتی ہوں، مسلمانوں کی ترقی کے لیے باتیں تو کرتی ہیں، لیکن عمل نہیں۔

حکومت کہتی ہے کہ مسلمانوں کو ریزرویشن دینے کے لیے پارلیمنٹ میں اکثریت کی ضرورت ہے، تو کیا حکومت جو بھی بل پاس کراتی ہے، اس میں سبھی جماعتوں کی رضامندی ہوتی ہے؟ کیا ہند-امریکہ ایٹمی معاہدہ میں تمام جماعتوں کی رضامندی شامل تھی؟ کیا خواتین ریزرویشن بل کے حوالے سے سبھی جماعتیں متحد ہیں؟ پھر بھی حکومت نے قدم اٹھایا، بل کو پیش کیا، لیکن جب بات غریب اور پسماندہ مسلمانوں کی ترقی کی ہوتی ہے تو ہر حکومت بہانہ ڈھونڈنے لگ جاتی ہے۔ غور کرنے والی بات یہ ہے کہ جب مسلمانوں سے وابستہ جذباتی معاملہ آتا ہے تو ملک میں زبردست تحریک شروع ہو جاتی ہے، یہ اچھی بات ہے، لیکن جب انہی مسلمانوں کے لیے روزگار، تعلیم اور ترقی کی بات کی جاتی ہے تو پتہ نہیں کیوں لوگوں کو سانپ سونگھ جاتا ہے۔ بابری مسجد کی شہادت کی بات کو ہی لے لیجئے، ملک کی

تمام سیاسی جماعتیں ایک ہوگئیں، ہندو ہوں یا مسلمان سماج کے رہنما سڑکوں پر اتر آئیں۔ بی جے پی اور آر ایس ایس کے خلاف ملک گیر تحریک شروع ہوگئی، لیکن یہی لوگ سچر کمیٹی اور رنگناتھ مشرا کمیشن کی رپورٹ پر خاموش بیٹھ گئے ہیں۔

ملک کے سامنے ایک سنگین خطرہ ہے۔ جمہوریت خطرے میں ہے، لیکن اس خطرے کا احساس نہ تو حکومت کو ہے اور نہ ہی سیاسی جماعتوں کو۔ سماج میں پھیلے عدم مساوات کو نشان زد کرنے اور اس کا حل تلاش کرنے کے بجائے ملک چلانے والے خاموش ہیں یا پھر اس مسئلے کو ٹالنے کا فیصلہ کرلیا گیا ہے، اس خطرے کی وجوہات مسلمانوں کی پسماندگی، ان کی بیروزگاری اور تعلیم کی کمی ہے۔ مسلمانوں کی حالت سال بہ سال بدتر ہوتی جارہی ہے۔ ایک طرف آر ایس ایس اور بی جے پی جیسی جماعتوں سے خطرہ ہے تو دوسری جانب وہ جماعتیں ہیں جو مسلمانوں کو ووٹ بینک سمجھ کر استعمال تو کرتی ہیں لیکن ان کے روزمرہ کے مسائل کو حل کرنے کے بجائے ٹال مٹول کا کھیل کھیلتی ہیں۔ ایک طرف امریکہ اور یوروپ کی حکومتیں مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دینے میں سرگرداں ہیں تو دوسری جانب اقتصادی پالیسی اور مہنگائی نے مسلمانوں کے حوصلے کو توڑ کر رکھ دیا ہے۔ ایک طرف سچر کمیٹی اور رنگناتھ مشرا کمیشن کی رپورٹ ہے جو مسلمانوں کے لیے امید کی کرن بن کر سامنے آتی ہے تو دوسری طرف ان رپورٹوں کو ٹھنڈے بستے میں ڈالنے والی حکومت۔ مسلمان ہر طرف سے نقصان ہی جھیل رہا ہے۔ یہ نقصان صرف مسلمانوں کا نہیں ہے۔ یہ ملک کے جمہوری نظام کی بنیاد اور نظریہ کو چیلنج دے رہا ہے۔ یہ چیلنج ہندوستان میں جمہوریت کو ختم کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ سمجھنے والی بات یہ ہے کہ جس نظام میں اقلیتوں کے حقوق، اقتدار میں ان کی حصہ داری اور ترقی متعین نہیں ہے، وہ جمہوریت کے نام پر دھوکہ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آج صرف مسلمان ہی نہیں، ہماری جمہوریت بھی خطرے میں ہے۔

☆☆

باب دوم

مسلمان اور دہشت گردی

ملک میں ہندوتوا کے نفرت آمیز نظریہ پر تنقید کی جاسکتی ہے؟

● ادارہ

میری پرورش کشادہ ذہن رکھنے والے ہندوؤں کے ایک خاندان میں ہوئی ہے۔ میرے والد حالانکہ برہمن تھے لیکن انہوں نے اپنے ہاتھوں پر کبھی دھاگا نہیں باندھا۔ میرے دادا کے بھائی بھی ذات پات کے سخت مخالف تھے۔انہوں نے دلتوں کیلئے ایک ہاسٹل کھولا تھا جو بنگلور میں آج بھی چل رہا ہے۔میری والدہ اکثر اوقات مندر جایا کرتی تھیں لیکن انہیں کسی بھی دوسرے مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے ساتھ کھانا کھانے یا ان کیلئے کھانا پکانے میں کوئی اعتراض نہیں تھا۔میری والدہ کے ۲ر بھائیوں کی شادی دوسرے مذہب سے تعلق رکھنے والی لڑکیوں سے ہوئی جبکہ تیسرے نے ایک جرمن خاتون سے شادی کی۔۱۹۴۸ر کے دوران کولکاتا کے سینٹر فور سوشل اسٹڈیز نامی ادارے میں مجھے پہلی ملازمت ملی۔یہاں مجھے ایک فارم پُر کرنا پڑا جس میں دیگر سوالوں کے ساتھ میرے مذہب کے تعلق سے بھی پوچھا گیا تھا۔اس سوال کے آگے میں نے ’ہندو‘ لکھا جس پر اسی ادارے میں کام کرنے والا میرا ایک ساتھی فوراً ناراض ہوگیا۔اس کا خیال تھا کہ ایک سیکولر ملک میں کسی فرد سے اس کے مذہب کے بارے میں سوال کرنے کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ مجھے اس سوال کا خانہ خالی ہی چھوڑ دینا چاہئے تھا۔میرا یہ ساتھی مارکسسٹ

نظریہ کا حامل تھا، لیکن وہ نہ ہی کبھی اس بات کو ظاہر کرتا تھا اور نہ ہی کبھی اس کا اعتراف کرتا تھا۔ بہر حال اس کا اپنا الگ ہی نظریہ اور عقیدہ تھا۔

میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ ’’میں ہندو روایتوں کے درمیان پلا بڑھا ہوں اور اس بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ شخص بھی ہندو ہو سکتا ہے جو ذات پات پر یقین نہ کرے اور خواتین کے ساتھ ظلم و زیادتی کے خلاف آواز اٹھائے۔ وہ شخص بھی ہندو ہو سکتا ہے اور یقیناً ہوتا ہے جو دیگر عقائد و روایات کا احترام کرے۔ یہی وہ باتیں ہیں جو میں نے گاندھی جی کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہوئے سیکھی ہیں۔ گاندھی جی جوانی کے دور میں کبھی مندر کی سیڑھیاں نہیں چڑھے تھے اور جن کے خلاف سنتوں اور شنکراچاریوں نے منفی پروپیگنڈا کیا تھا، جب اپنے آپ کو ہندو کہتے تھے تو میں کیوں نہیں کہہ سکتا۔‘‘ ایک مارکسسٹ کے ساتھ ہونے والی اس بحث کے ۵؍ برسوں بعد مجھے اپنے ہندو عقیدہ کے خلاف ایک براہ راست چیلنج کا سامنا کرنا پڑا۔ بھاگلپور شہر میں پھوٹ پڑنے والے فرقہ وارانہ فسادات کی تحقیقات کرنے کیلئے ایک ٹیم بہار گئی ہوئی تھی۔ میں بھی اس ٹیم کے ساتھ تھا۔ ایودھیا میں بابری مسجد کے مقام پر رام مندر کی تعمیر کے سلسلے میں ہونے والی پوجا کی ایک تقریب کے دوران فسادات پھوٹ پڑے تھے۔ پوجا کی یہ تقریب اس روز منعقد کی گئی تھی جس روز مسلمانوں کا تہوار بھی تھا۔ فریقین کے نوجوانوں کے درمیان ہونے والی لڑائی کی وجہ سے تشدد بہار کے دیہاتوں تک بھی پھیل گیا۔ بھاگلپور کے فسادات میں تقریباً ۲؍ ہزار افراد مارے گئے تھے اور سیکڑوں بے گھر ہوئے تھے۔ یہاں مسلمانوں کی آبادی ۲۰؍ فیصد سے بھی کم تھی لیکن فسادات میں مارے جانے والے اور بے گھر ہونے والے ۷۰ فیصد مسلمان ہی تھے۔ فسادات میں جو لوگ بچ گئے تھے، انہیں بھاگلپور کے ایک خوشحال مسلمان نے پناہ دی تھی جس کے لئے اس نے اپنے باغ میں متاثرین کی رہائش کیلئے عارضی خیمے لگائے تھے۔ یہ دیکھ کر میرا دل دہل اٹھا کہ میرے اپنے ہندو بھائی اس طرح کے مظالم میں ملوث ہوئے اور حکومت نے فساد

متاثرین کی کوئی ذمہ داری نہیں لی۔

۱۹۰۹ء کے بعد جب ملک بھر میں مذہبی حقوق کو تحفظ ملنے لگا تھا اور انہیں اہمیت بھی دی جانے لگی تھی تب میں بھی اپنے تعلیمی سلسلے کو چھوڑ کر ایک کل وقتی مصنف بننے کے مرحلے میں داخل ہو گیا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب ۲؍ الگ الگ اخبارات میں میرے کالم شائع ہونے لگے تھے۔ گزشتہ ۲؍ دہائیوں کے دوران میرے کم و بیش ۴۰؍ مضامین شائع ہوئے ہیں جن میں میں نے بی جے پی اور راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کی سیاست اور پالیسیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ میں نے ان مضامین میں یہ بھی بتانے کی کوشش کی کہ مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی پالیسیوں پر بی جے پی اور آر ایس ایس کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ میں نے اپنے جن مضامین میں ہندوتوا کے فلسفے پر کچھ لکھنے کی جراءت کی تو اس پر توجہ بھی دی گئی اور ناراضگی بھی ظاہر کی گئی۔ جب میں نے ایسے مضامین لکھے تو میرا سابقہ کچھ اس قسم کے ہندوستانی سے پڑا جو سورج طلوع ہونے سے پہلے اٹھتا ہے، ایک گلاس دودھ پیتا ہے، پوجا کرتا ہے اور پھر انٹرنیٹ پر ایسے مواد کی تلاش میں لگ جاتا ہے جس میں سیکولرازم کی حمایت کی گئی ہو۔ اخبارات میں جب میرے وہ مضامین شائع ہوئے جن میں مَیں نے ہندوتوا اَور ایودھیا کے موضوعات کو چھیڑنے کی کوشش کی تو صبح تک میرے اکاؤنٹ کے ’’اِن باکس‘‘ میں یا انہی اخبارات کے تبصرہ کے کالم میں تنقیدی اور نفرت آمیز پیغامات جمع ہو جاتے تھے اور ان میں گالیاں تک لکھی جاتی تھیں۔ مثال کے طور پر یہ ای میل ملاحظہ کیجئے:

’’میرا خیال ہے کہ تم کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہو، ایسے وقت میں جبکہ ہندوستان کی سالمیت ’شیطان پاکستان‘ کی وجہ سے داؤ پر لگی ہوئی ہے، ایک مورخ ہونے کی حیثیت سے تم چھوٹے چھوٹے معاملات پر بے مطلب بحث کر رہے ہو۔ تم جیسے نیم مورخ ہی مغربی میڈیا میں ہندوستان کو بدنام کرتے ہیں اور وہاں سے تمہیں رائلٹی ملتی ہے۔ رام چندر ایک ہندو نام ہے۔ برائے مہربانی اس نام کی توہین مت کرو اور اگر تمہیں اپنا سیکولرازم ظاہر

ہی کرنا ہے تو اپنا نام بدل کر 'رحمٰن' یا 'رحیم' رکھ لو۔''

کبھی کبھی 'لیٹرس ٹو دی ایڈیٹر' کے زمرے میں ان رسالوں کو ای میل بھیجے جاتے تھے جن میں میرے مضامین شائع ہوتے تھے۔ ایسے ای میل پیغامات کی ایک کاپی مجھے بھی ارسال کی جاتی۔ ان ای میل پیغامات میں اور سخت باتیں ہوتی تھیں۔ ان پیغامات میں مجھے 'نکسلیوں کا ہمدرد' اور 'نہرو گاندھی خاندان کا وفادار' کہا گیا۔ اخبار کے 'سیلس ایجنٹ' کے لقب سے بھی نوازا گیا اور عیسائیت کا خفیہ مبلغ بھی قرار دیا گیا۔ ایک یہ ای میل پیغام ملاحظہ کریں:

''ہندوستان ہزار ہا برس سے ایک 'دھارمک' ملک رہا ہے۔ لگتا ہے کہ مضمون نگار نے ادی سنکارا کے بارے میں نہیں سنا جنھوں نے ہندوستان کے چاروں کونوں میں مٹھ قائم کئے تھے۔ مضمون نگار کیلئے ہندوستان کے روحانی اتحاد کا کبھی وجود ہی نہیں تھا۔ گو وہ نکسلیوں کے ہمدرد ہیں اور انہیں سونیا گاندھی نے اجازت دی ہے کہ وہ اپنی کتاب لکھنے کیلئے نہرو میوزیم کے آرکائیو کا استعمال کر سکتے ہیں۔''

مجھے موصول ہونے والے تمام ای میل اور خطوط ناراضگی اور برہمی کے حامل نہیں ہوتے۔ کچھ تحریروں میں نرمی اور شائستگی بھی ہوتی ہے۔ میرے مضامین کے جواب میں موصول ہونے والا یہ ای میل ملاحظہ کریں:

''برائے مہربانی، میری باتوں پر ذرا توجہ دیجئے، آپ کو جو مواقع ملتے ہیں ان کا استعمال ہر مرتبہ ہندوؤں کے حق میں آواز اٹھانے والوں پر تنقید کرنے کیلئے مت کیجئے۔ ہم اپنی اس سرزمین کے سوا اور کہیں نہیں جا سکتے۔ یہی ہماری مادر وطن ہے۔ یہی ہماری روحانی زمین ہے۔ یہ ہمارے دیوتاؤں کی زمین ہے۔ ہم نے ہر ذات اور نسل سے تعلق رکھنے والوں کا اس دھرتی پر خیر مقدم کیا ہے اور انہیں یہاں رہنے کیلئے جگہ دی ہے۔ ہم نے اس دھرتی پر انہیں پروان چڑھنے کا موقع دیا اور آج ہم اس کی قیمت بھی چکا رہے ہیں۔ آپ اپنی توانائی ان لوگوں کے خلاف لڑنے میں صرف کیجئے جو ہمارے لئے خطرہ ہیں۔ ان

لوگوں کے خلاف لڑنے کیلئے ہمیں آپ جیسے ماہرین اور دانشوروں کی ضرورت ہے۔ ہندو تہذیب ہی ہماری قوم کو متحد رکھ سکتی ہے۔ اگر اس تہذیب نے اپنی شناخت کھو دی تو ہندوستان کا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔''

میرا اپنے بارے میں خیال ہے کہ میں ایک دیش بھگت ہوں جو اپنے وطن سے محبت کرتا ہے، وطن میں ہی رہتا ہے اور وطن میں ہی روزگار سے جڑا ہوا ہے۔ میں خود کو اعتدال پسند سمجھتا ہوں اور میرا خیال یہ ہے کہ میں آزاد خیال جمہوریت کا حامی ہوں لیکن دائیں بازو کے لوگوں کیلئے میں کچھ اور ہی ہوں۔ جب مجھے ہندوتوا کا نظریہ غلط نظر آنے لگا تو مجھے خود احساس ہونے لگا کہ اب مجھے دیش بھگت نہیں مانا جائے گا۔ جب سے میں نے ہندو انتہا پسند جماعتوں پر تنقید کرنا شروع کیا تب سے مجھے شدت پسند اور کمیونسٹ قرار دیا جانے لگا۔ اس تنقید کی بنیاد پر مجھ پر یہ بھی الزام لگایا جانے لگا کہ بیرونی عناصر مجھے رقم فراہم کرتے ہیں۔ اپنے مضامین پر ہونے والی تنقیدوں کا میں خیر مقدم کرتا ہوں لیکن کیا ایسی تحریروں کے ذریعے میں اس بات کا ثبوت دیتا ہوں کہ میں ذہنی طور پر بیمار ہوں؟

☆☆

دہشت گردی کا یہ کھیل آخر کب تک؟

● شاہد الاسلام

کیا ہندوستان دہشت گردی کے خلاف جنگ لڑنے کا متحمل ہے؟ کیا ملک کی خفیہ ایجنسیوں کا نظام پوری طرح چست اور درست ہے؟ کیا دہشت گردی کا قلعہ قمع کرنے میں ایمانداری مانع و حارج ہو رہی ہے؟ کیا اس عفریت کو کچلنے کے حوالے سے ارباب اقتدار اور صاحبان سیاست مخلص ہیں؟ کیا دہشت گردی کو کچلنے اور اس لعنت کو ختم کرنے والی کارروائیاں صرف مخصوص طبقہ کو ہی بار بار کٹہرے میں کھڑا نہیں کرتیں؟ کیا دہشت گردی کے خاتمہ کے نام پر فرقہ پرستی کا کھل کر مظاہرہ نہیں ہو رہا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جو حیدرآباد کے دل سکھ نگر میں ہونے والے دو طاقتور بم دھماکوں کے بعد ایک بار پھر مختلف گوشوں سے اٹھائے جا رہے ہیں اور یہ بات زور و شور سے پھر کہی جا رہی ہے کہ دہشت گردوں کے تعاقب میں کی جانی والی کارروائیاں قبل سے ہی طے شدہ ذہنیت کے ساتھ کی جاتی ہیں اور انجام کار حقیقی دہشت گردوں کو کلین چٹ مل جاتی ہے۔ یہ دریافت کرنے والے عام لوگ ہی نہیں ہیں بلکہ وہ خواص بھی پیش پیش ہیں، جو ہندوستانی ایوان نمائندگان کے رکن بھی ہیں اور سیاست کا خاصا تجربہ بھی رکھتے ہیں۔ حیدرآباد کے حالیہ بم دھماکوں کے بعد ایک بار پھر ایسے سوالات کا اُٹھنا اور مختلف گوشوں سے اندیشہ ہائے دراز کا اظہار کیا

جانا بے سبب بھی نہیں، کیونکہ یہ شہر ہندوستان کے ان چند ترقی یافتہ شہروں میں سے ایک ہے، جہاں ماضی کے دنوں میں بھی دہشت گردی کے بڑے واقعات رونما ہوتے رہے ہیں اور ان میں سے بعض سانحات میں یک رخی کارروائیاں انصاف کے اعلیٰ معیاروں کا قسطوں میں خون بھی کرتی رہی ہیں۔ غالبًا اسی تاریخی پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے حالیہ دھماکوں کے فوراً بعد بعض سیاسی جماعتوں کے قائدین نے حکومت کو متنبہ کیا کہ وہ ماضی کی غلطیوں کی تجدید سے بچنے اور گنہگاروں کو کیفر کردار تک پہنچانے میں ایماندارانہ ذہنیت کا مظاہرہ کرے۔ حیدرآباد کے دو مقامات پر ہونے والے خوفناک دھماکوں کے بعد دوسرے ہی دن بائیں بازو کی جماعتوں نے امکانی خاطیوں کے خلاف کارروائی میں پہلے سے طے شدہ طریقہ کار اختیار کرنے یا پھر اِس واقعہ کو فرقہ وارانہ رنگ دینے کے خلاف سخت لب و لہجہ اختیار کیا اور کہا کہ ماضی میں اسی طرح کے واقعات میں کئی بے قصور افراد کو گرفتار کیا گیا تھا جنہیں عدالتوں کی جانب سے رہا کر دیا گیا۔ سی پی ایم کے جنرل سکریٹری مسٹر پرکاش کرات نے فکرمندی ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ ”ماضی کے کچھ واقعات بشمول حیدرآباد میں ہوئے دھماکوں میں بے قصور افراد کو گرفتار کر کے کئی برس تک جیل میں قید رکھا گیا تھا اور بعد میں عدالتوں نے انہیں رہا کر دیا“۔ دوسری جانب پارٹی کی پولیٹ بیورو نے بھی ایک علیحدہ بیان جاری کرتے ہوئے کہا کہ ”ماضی کے تجربات کو دیکھتے ہوئے امکانی مجرمین کی گرفتاریوں کے سلسلہ میں پہلے سے طے شدہ ذہنیت کے مطابق کام نہیں کرنا چاہئے“۔ پارٹی نے کہا کہ ان دھماکوں کے ذمہ داروں کا پتہ چلانے اور ان کے خلاف مقدمات کے اندراج میں پوری احتیاط کے ساتھ تحقیقات کروائی جانی چاہئے۔ ان دھماکوں کو غیر انسانی بہیمانہ کارروائی قرار دیتے ہوئے سی پی آئی سنٹرل سکریٹریٹ نے اس واقعہ کو کچھ تنگ نظر حلقوں کی جانب سے فرقہ وارانہ اور سیاسی نوعیت دیئے جانے پر بھی اظہار تشویش کیا۔ نہ صرف یہ کہ بائیں بازو کی جماعتوں نے ہی اس طرح کی فکرمندی ظاہر کی ہے، بلکہ بجٹ

اجلاس کے دوسرے دن جب پارلیمنٹ میں دہشت گردی کے مسئلہ کو سیاسی اعتبار سے تختۂ مشق بنایا گیا تو ایوان میں بھی بعض دیگر جماعتوں کے اراکین پارلیمنٹ نے بھی انسداد دہشت گردی کے طریقۂ کار کو ہدف تنقید بنایا اور حکومت کو متنبہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ ماضی کی غلطیوں سے سبق لے، اہلکاروں اور متعلقہ افراد کی جواب دہی طے کرے اور دہشت گردی کی سرکوبی میں مضبوط قوت ارادی کا مظاہرہ کرے۔

بعض اراکین پارلیمنٹ اور صاحبان سیاست کی جانب سے ظاہر کردہ فکرمندیاں بڑی حد تک درست کہلا سکتی ہیں کیونکہ بار بار مشاہدے میں یہ بات آتی بھی رہی ہے کہ دہشت گردی کے واقعات میں بسا اوقات یک رخی کارروائیاں انجام پاتی ہیں اور اس کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کرتا ہے کہ اگر ایک طرف ان واقعات کو انجام دینے والے برسہا برس تک قانون کے سامنے جواب دہ نہیں ہو پاتے ہیں تو دوسری جانب مشکوک طور پر گرفتار ہونے والے بے قصور افراد کو سالوں ناکردہ گناہوں کی سزا بھی جھیلنی پڑ جاتی ہے۔ خود حیدرآباد کا مکہ مسجد سانحہ اس حقیقت کا گواہ ہے جہاں 18 مئی 2007 کو ہونے والے دھماکوں کیلئے بڑے پیمانے پر مسلم نوجوانوں کو گرفتار کیا گیا اور ایک لمبی مدت تک حقیقی دہشت گرد آزاد گھومتے رہے مگر بعد کی تفتیش سے نہ صرف یہ کہ پکڑے گئے، مسلم نوجوانوں کی باعزت رہائی عمل میں آگئی بلکہ انہیں خود ریاستی حکومت نے بھی بے قصور ہونے کے باوجود اذیت جھیلنے کے عوض معاوضہ ادا کرنا واجب سمجھا۔ دہشت گری کا تعاقب کرتے ہوئے غلط سمت میں سرپٹ دوڑنے اور غیر منصفانہ نتیجہ اخذ کرنے کی یہ واحد مثال نہیں جس سے فرقہ پرستی کی بو آتی ہے بلکہ نصف درجن دیگر معاملات بھی ہمارے سامنے موجود ہیں جن میں پہلے تو بہ عجلت تمام یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ مذکورہ واقعات میں ''مسلم تنظیمیں'' ملوث ہیں مگر خود سرکاری اہلکاروں اور تفتیشی ایجنسیوں کے ذمہ داروں نے بھی آگے چل کر یہ تسلیم کیا کہ ان واقعات میں ''زعفرانی دہشت گردی'' کا عمل دخل تھا۔ مکہ مسجد سانحہ کے علاوہ مالیگاؤں

دھماکہ، اجمیر شریف بلاسٹ اور سمجھوتہ ایکسپریس کی دہشت گردی کے واقعات کا قدرے مشترک پہلو یہ بھی ہے کہ مذکورہ تمام واقعات کی تفتیش میں ابتداً جو نتائج تفتیش کاروں نے اخذ کئے بعد کو انہیں خود ہی جھٹلایا گیا اور حکام نے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا کہ ان دھماکوں میں قوم پرست کہلانے والی وہ ''ہندو تنظیمیں'' ملوث ہیں جنہیں آر ایس ایس اور اس کی ہم خیال انجمنوں کی دانستہ یا نادانستہ سرپرستی وحمایت حاصل ہے۔

''بھگوا دہشت گردی'' کے سلسلے میں ہونے والی گرفتاریوں اور پکڑے گئے متعلقہ ملزمان کے اقبالیہ بیانات تاریخ کا وہ حصہ ہیں، جنہیں نہ تو جھٹلایا جا سکتا ہے اور نہ ہی فراموش کیا جا سکتا ہے۔ ایسے میں اگر سیکولر ذہن کے حامل سیاسی قائدین حکومت ہند سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ ماضی کی غلطیوں کی پھر تجدید سے بچا جائے اور دوران تفتیش آنکھوں پر مخصوص قسم کے چشمے نہ لگائے جائیں تو اسے غیر عقلی بھی نہیں کہا جا سکتا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ حیدرآباد کے تازہ واقعات کو انجام دینے میں کس کا ہاتھ ہے؟ ہمیں کیا خود تفتیشی ایجنسیوں کے ذمہ داران اور ارباب اقتدار بھی اس ذیل میں لاعلم ہیں کہ دہشت گردی کا یہ کھیل کس نے کھیلا مگر دوسری جانب ہم یہ بھی دیکھے اور محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ تفتیشی ایجنسیوں کے بعض نامعلوم ذرائع کا حوالہ دیتے ہوئے قومی میڈیا میں کیا کچھ ''خلاصہ'' کیا جا رہا ہے۔ اس ''خلاصہ'' کا اگر ہم یہاں خلاصہ بیان کرنا چاہیں تو محض یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ قومی ذرائع ابلاغ میں ''میڈیا ٹرائل'' کے ذریعہ امکانی صورتحال کا یک طرفہ طور پر جائزہ لینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ حیدرآباد کے دھماکوں میں کون کون لوگ یا عناصر ملوث ہو سکتے ہیں، اس کا تجزیہ کرتے ہوئے کوئی افضل گرو کی پھانسی کا ردعمل ہونے کا شبہ ظاہر کر رہا ہے تو کسی کو اکبر الدین اویسی کی تقریر کا اثر اس میں جھلک رہا ہے۔ بعض گوشوں سے اُٹھنے والی آوازوں میں لشکر طیبہ یا حرکت المجاہدین سے اس واقعہ کا امکانی رشتہ جوڑا جا رہا ہے تو کچھ لوگ اسے بھٹکل برادران کی کارستانیاں بھی قرار دے رہے ہیں۔ غرض کہ حیدرآباد کے

حالیہ دھماکوں کے بعد قومی ذرائع ابلاغ میں بالعموم اور الیکٹرونک میڈیا میں بالخصوص قیاس آرائیوں کا ایک مخصوص انداز میں نہ تھمنے والا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔حقیقت تو یہ بھی ہے کہ یہ پہلا موقع نہیں جب دھماکوں کے فوراً بعد شک کی سوئی مخصوص سمت میں گھمائی گئی ہو اور موقع گنوائے بغیر میڈیا ''خلاصوں پر خلاصہ'' کرتا چلا جا رہا ہو۔نہایت غیر ذمہ داری کے ساتھ کس کس طرح کی کہانیاں گڑھی جا رہی ہیں اور قیاس آرائیوں کے سلسلے کو کس طرح یک رُخی طور پر طول دیا جا رہا ہے، یہ سب ہماری نگاہوں کے سامنے ہے مگر ہم اس پر کسی تبصرہ سے قطع نظر صرف یہ کہنا چاہیں گے کہ جب تک اس سچ کو عملاً تسلیم نہیں کیا جائے گا کہ دہشت گردوں کا کوئی دین ودھرم نہیں ہوا کرتا، دہشت گردی کو کچلنے میں خاطر خواہ کامیابی کی امید نہیں کی جاسکتی۔اس حقیقت سے بہرطور انکار کی گنجائش نہیں کہ دہشت گرد خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، وہ ملک وقوم کے ہی دشمن نہیں بلکہ پوری عالم انسانیت کے دشمن ہیں، مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ دہشت گردی کو دیکھنے کیلئے مختلف قسم کے چشموں کا استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

حیدرآباد میں ہونے والے بم دھماکوں کے بعد پارلیمنٹ سے سڑک تک ایک بار پھر ''دہشت گردی'' اور ''انسداد دہشت گردی'' دونوں موضوع بحث بن گئی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اگر اپوزیشن نے ایوان میں حکومت کی قوت ارادی پر سوالات کھڑے کئے ہیں تو دوسری جانب عوام وخواص دونوں کی جانب سے ایسے سوالات بھی کھڑے کئے جارہے ہیں جو سیکورٹی نظام کی خامیوں کی جانب اشارے کرتے ہیں۔برگشتگی اور ناراضگی کا اظہار کرنے والا طبقہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ اگر واقعی مرکز کی جانب سے الرٹ جاری کیا گیا تھا تو ریاست نے اس پر توجہ کیوں نہیں دی۔حیدرآباد سے آمدہ اطلاعات میں یہ انکشاف بھی ہوا ہے کہ مشتبہ سرگرمیوں پر نگاہ رکھنے کیلئے جو کیمرے مختلف مقامات پر نصب کئے گئے تھے، ان میں سے کئی ناکارہ پائے گئے ہیں۔اسی طرح ایک مقامی اخبار نے یہ سوال بھی کیا ہے کہ دل سکھ

نگر میں بم دھماکوں کے فوری بعد مقامِ حادثہ پر اے بی وی پی، بی جے پی، وی ایچ پی، ہندو واہنی اور بجرنگ دل تنظیموں کے کارکن کیوں جمع ہوگئے اور تحقیقاتی ایجنسیوں کے عہدیداروں کو جائے واردات کا برسرموقع جائزہ لینے اور شواہد اکٹھا کرنے میں رکاوٹیں کیوں پیدا کی گئیں؟ ایک مقامی روزنامہ کی اطلاع کہتی ہے کہ ''اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ ایسے حادثات میں بھی پولیس اہلکار اس بات کا خیال نہیں رکھتے کہ مقام حادثہ کو اس وقت تک محفوظ کردیا جائے تاوقتیکہ تحقیقاتی ٹیمیں اس کا مشاہدہ کرتے ہوئے شواہد اکٹھا نہ کرلیں۔ دل سکھ نگر میں بم دھماکوں کے واقعات میں بھی پولیس نے مقام حادثہ کو محفوظ رکھنے کی سعی نہیں کی۔ ہندوتوا تنظیموں کے ان کارکنوں نے فارنسک ماہرین پر مشتمل کلوز ٹیموں، آکٹوپس اور دیگر تحقیقاتی عہدیداروں کو مقام حادثہ پر پہنچنے سے دیر تک روکے رکھا''۔سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں کیا گیا؟

یہ بھی عجب اتفاق ہی ہے کہ کانگریس کے جے پور اجلاس میں زعفرانی طبقہ پر حملہ آور ہونے والے وزیر داخلہ کی جانب سے اپنے سابقہ موقف کیلئے اظہار ندامت کے ٹھیک دوسرے ہی دن حیدرآباد دھماکوں سے دہل گیا اور ایک درجن سے زائد افراد اس کی زد میں آگئے۔ بہرحال تفتیش کاروں کی ابتدائی رپورٹ چونکہ وزارت داخلہ میں باضابطہ طور پر سپرد کی جاچکی ہے، لہٰذا اگر اس رپورٹ کو ہی معیار تصور کرتے ہوئے ہم کوئی نتیجہ اخذ کرنا چاہیں تو بلا مبالغہ یہی کہنا پڑے گا کہ تادمِ تحریر ہماری ایجنسیاں اندھیرے میں ہی ہاتھ پاؤں مار رہی ہیں اور انہیں ہنوز دہشت گردوں کا سراغ حاصل کرنے میں ناکامی ہاتھ آئی ہے۔

ویسے ہم اس سچائی کا اظہار بھی واجب ہی سمجھتے ہیں کہ حیدرآباد کے حالیہ بم دھماکوں کے بعد مجرمین کے تعاقب کی کوششیں پھر اُسی سمت میں آگے بڑھتی دکھائی دے رہی ہیں، جن خطوط پر آگے بڑھنے کی وجہ سے ماضی کے کم از کم نصف درجن دہشت گردانہ

واقعات میں بلاوجہ مسلم نوجوانوں کو گھسیٹنے کی کوشش ہوئی اور انجام کار کچھ لوگوں کو عدالتوں نے بے قصور قرار دے کر رہا کر دیا تو کچھ کو طویل اسیری کے بعد رہائی مل گئی۔ ساتھ ہی ساتھ تفتیش کاروں کی بھی تھوتھو ہو گئی۔

کہنے کا ماحصل یہ ہے کہ حیدرآباد کے دھماکوں کی تفتیش و تحقیق کے عوامل سے گزرتے ہوئے جس طرح ایک بار پھر مسلم نوجوانوں سے پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع کر دیا گیا ہے، اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ تفتیش کاروں نے ذہنی طور پر پہلے ہی یہ مفروضہ ترتیب دے رکھا ہے کہ حالیہ دھماکوں میں کون کون لوگ ملوث ہو سکتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تمام کے تمام مشکوک عناصر کو ایک ہی نگاہ سے دیکھنے کی کوشش ہوتی اور جس طرح انڈین مجاہدین جیسے نام سے مسلم ظاہر ہونے والی بعض تنظیموں کے مبینہ اراکین سے حقائق جاننے کیلئے باز پرس ہو رہی ہے، ٹھیک اُسی طرح بھگوا دہشت گردی میں ملوث قرار پانے والے ان عناصر سے سوالات کئے جاتے جن کی ملک دشمن سرگرمیاں ماضی میں جگ ظاہر ہو چکی ہیں۔ سوال یہ بھی ہے کہ اگر دہشت گردوں کے تعاقب میں پولس اہلکار مدھوبنی، دربھنگہ اور بیگوسرائے سے ہوتے ہوئے بھٹکل تک اِدھر اُدھر کی خاک چھان سکتے ہیں (مسلم نوجوانوں کو پکڑ پکڑ کر یہ دریافت کر سکتے ہیں کہ ان دھماکوں وہ ملوث تو نہیں) تو بھولے بھٹکے بھی وہ ناگپور کی شاکھاوؤں کا رُخ کیوں نہیں کرتے یا جیلوں میں مقید بھگوا برادری سے دھماکوں کی بابت سوالات کیوں نہیں کرتے، جن کی افزائش میں براہ راست سنگھ پریوار کے ملوث ہونے کی باتیں خود ارباب اقتدار نے مختلف مواقع پر کہی ہیں۔ ایسے مرحلے پر اندیشہ ہائے دراز کا جنم لینا فطری بھی ہے کہ کیا دہشت گردی کے تعاقب کی یہ کوششیں کہیں مخصوص طبقہ کو اذیت تو نہیں پہنچا رہی ہیں؟

ہر چند کہ جب چند دنوں قبل سیکولر کہی جانے والی مختلف سیاسی جماعتوں کے قائدین نے بے قصور مسلم نوجوانوں کی بار بار دہشت گردانہ معاملات میں گرفتاری پر پارلیمنٹ میں

انگشت نمائی کی تو سرکار کی جانب سے امور داخلہ کے وزیر مملکت آر پی این سنگھ نے یہ کہہ کر برگشتہ اراکین کے اضطراب کی چنگاریوں کو دبانے کوشش کی کہ ”قانون رنگ، نسل اور مذہب کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہیں کرتا“ مگر سوال قانون کے امتیاز برتنے کا تو ہے ہی نہیں جس کی آڑ میں ہمارے وزیر با تدبیر نے اپنی یا سرکار کی جان چھڑانے کی کوشش کی کیونکہ ہندوستان کا قانون واقعی مذہبی امتیازات سے تقریباً پوری طرح پاک ہے۔ اصل سوال تو ہے کہ کیا قانون نافذ کرنے والے اداروں کی جانب سے امتیازات اور مذہبی تعصّبات کا عملی اظہار ہو رہا ہے آیا نہیں؟ گوکہ مصلحت کی چادر میں لپٹی ہوئی ہماری حکومت اس ایشو پر کلیتًا خاموش ہے مگر ہمارے اس دعوے کو جھٹلانے کا قطعاً سرکار میں بھی حوصلہ نہیں کہ قانون نافذ کرنے والی ایجنسیاں نہایت متعصب اور بے ایمان ہیں! قانون نافذ کرنے والے اداروں کی یہی وہ بے ایمانی اور تعصب پسندی ہے جو کبھی قتیل کے قتل کی راہ ہموار کر دیتی ہے تو کبھی فصیح محمود کو دیارِ غیر میں گرفتار کر کے مہینوں غائب رکھتی ہے اور شور مچنے اور حبس بے جا کی درخواست عدالت عظمٰی میں داخل ہو جانے کے بعد گرفتاری ظاہر کرتی ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ دہشت گردی کی سرکوبی کی یہ کوششیں خود ہندوستانی قانون کا مذاق اُڑا رہی ہیں اور بدقسمتی یہ بھی ہے کہ قانون مجبور محض بنا ہوا ہے۔ حقیقت تو یہ بھی ہے کہ حکومت کی بے حسی ایسے حالات کیلئے ہی پوری طرح ذمہ دار ہے۔ اگر آج حکومت ایماندار ہو جائے اور افسر شاہی پر نکیل درست طریقے سے کسی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ متعلقہ افراد اپنی ذمہ داریاں بہ حسن وخوبی نہ نبھائیں۔ یوں بھی ہمارے سامنے ایماندار اہلکاروں کے ذریعہ دہشت گردی کے تعاقب کی ایسی پرخلوص کارروائیوں کی مثالیں موجود ہیں، جنہیں آب زر سے نہ لکھنا بھی بڑی بے ایمانی ہوگی۔ آنجہانی ہیمنت کرکرے اس کی بہترین مثال ہیں، جنہوں نے پورے ملک اور قوم کو بھگوا دہشت گردی کے خوفناک منصوبوں سے واقف کرایا اور غیر جانبدارانہ تحقیق کی ایسی نظیر قائم کی جو قابل قدر ہی نہیں بلکہ لائق تقلید بھی ہے۔

بہر حال قومی تفتیشی ایجنسی نے حقائق کی بازیافت کا عمل شروع کردیا ہے، جس نے کبھی ''بھگوا دہشت گردی'' پر شکنجہ کسا تھا۔ ایسے میں دیکھنے کی بات یہ ہوگی کہ ممکنہ ثبوت و شواہد کی روشنی میں خطاواروں کو گرفت میں لینے کی یقینی کوشش کس حد تک کی جاتی ہے اور یہ کہ دہشت گردی کے خلاف جو جنگ ہم اب تک ہارتے چلے آئے تھے، اسے جیتنے میں ہمیں کب کامیابی مل پاتی ہے؟۔

(مضمون نگار روزنامہ ''ہندوستان ایکسپریس'' نئی دہلی کے نیوز ایڈیٹر ہیں)

☆☆

سنگھ کھودرہا ہے سیکولر ہندوستان کی جڑیں

● سیتارام یچوری

گودھرا میں ٹرین کی خوفناک آتشزدگی اور اس کے بعد پورے گجرات میں پھیل جانے والے فرقہ وارانہ خون آشامی' جس میں ہزاروں لوگوں کا بے رحمانہ قتل کیا گیا' کو اب دس سال پورے ہوگئے ہیں۔ اس درمیان سیکولر، ڈیموکریٹک اصولوں کی جن پر جدید ہندوستان کی بنیاد رکھی گئی ہے' جس طرح درگت بنائی گئی' اس سے صرف یہی اندازہ ہوتا ہے کہ انصاف مہیا کرانے کا جو سسٹم ہمارے یہاں نافذ ہے، اس کی کیا کیا مجبوریاں ہیں۔ دراصل عدلیہ کی کارکردگی کو سامنے رکھ کر ہی اس جدید جمہوریہ کے کردار کی پیمائش کی جاسکتی ہے، لیکن جب اس نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں' تو پھر ہندوستان کی حالت تشویشناک نظر آتی ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ اس سلسلے میں صرف وہی لوگ متاثر نہیں ہیں' جنہیں گجرات کی فرقہ وارانہ نسل کشی میں تباہ و برباد کیا گیا' بلکہ دوسری خوں ریزیوں کے شکار لوگوں کے ساتھ مستقل جاری ناانصافی بھی اس کا ثبوت ہے۔ پرانی کہاوت ہے کہ انصاف دینے میں دیر کرنا دراصل انصاف دینے سے انکار کرنا ہے۔ پورا مظاہرہ اس وقت گجرات کے قتل عام میں مارے جانے والے لوگوں کے سلسلہ میں ہونے والی کارروائیوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ حالانکہ اپیکس کورٹ نے یہ حکم دیا ہے کہ انکاؤنٹر میں مارے جانے والے تمام لوگوں کے کیسوں کو دوبارہ کھولا جائے اور اکتوبر 2002 سے لے کر دسمبر 2004 تک گجرات پولس کے ہاتھوں انکاؤنٹر کے نام پر جتنی کارروائیاں ہوئی ہیں' ان کی سپریم کورٹ کے ایک

ریٹائرڈ جج کی نگرانی میں باضابطہ انکوائری کرائی جائے۔اس کے باوجود ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انصاف مہیا کرانے کی کارروائی مطمئن کرنے والی نہیں ہے۔ جب بار بار یہ الزام لگایا گیا کہ عدلیہ بھی انصاف مہیا کرانے میں ایمانداری نہیں دکھا رہی ہے، تو عدالت عالیہ نے یہ حکم دیا کہ ان کیس کی سماعت ریاست گجرات کے باہر کی عدالتوں میں کرائی جائے۔اس سلسلے میں 2000 سے زائد ایسے کیسوں کو دوبارہ کھولنے کی بات ہوئی، جنہیں گجرات پولس نے بند کر دیا تھا۔اس معاملے میں اسپیشل انویسٹی گیشن ٹیم تشکیل دی گئی، جسے یہ کام سونپا گیا کہ وہ بڑے قتل عام کے واقعات کی تفتیش کرے اور سی بی آئی کو حکم دیا گیا کہ وہ بعض مشہور فرضی انکاؤنٹر کے معاملات کی تفتیش وتحقیق کر کے اپنی رپورٹ پیش کرے۔سی بی آئی نے اپنی جو مہر بند رپورٹ عدالت کو پیش کی ہے، اس کے بارے میں طرح طرح قیاس آرائیاں کی جارہی ہیں، ایک طرف تو اس رپورٹ پر کافی سنجیدہ قسم کے الزامات لگائے جارہے ہیں کہ اس رپورٹ کو کافی مبہم بنانے کی کوشش کی گئی ہے، تو دوسری طرف وزیراعلیٰ نریندر مودی کا دعویٰ ہے کہ یہ رپورٹ بری الذمہ کرتی ہے ہماری ان انتظامی کارروائیوں کی، جو ہم نے انصاف فراہم کرنے کے لئے کی تھیں۔ حالانکہ یہ رپورٹ ابھی تک عوام کے سامنے پیش نہیں کی گئی ہے، لیکن جو اندازہ ہو رہا ہے، اس سے یہی لگتا ہے کہ انصاف مہیا کرانے کی یہ کوشش بھی اطمینان بخش ثابت نہیں ہوگی۔

آر ایس ایس اور اس کا سیاسی ونگ بھارتیہ جنتا پارٹی اس بات پر فخر کا اظہار کر رہی ہے کہ گجرات کو ہندوتوا کی تجربہ گاہ بنانے کا جو کام شروع کیا گیا تھا، وہ بیحد کامیاب ثابت ہوا ہے اور اس نے فرقہ وارانہ منافرت کا جو بیج بویا تھا، اس کی شاخیں کافی تیزی سے مختلف سمتوں میں آگے بڑھ رہی ہے۔مرکز میں چھ سالوں تک اقتدار پر قبضہ جمانے کی وجہ سے انہیں اپنے کمیونل ایجنڈے کو آگے بڑھانے کا کافی موقع ملا۔رام مندر کی ایودھیا میں تعمیر، آرٹیکل 370 کو ختم کرنے اور یونیفارم سول کوڈ کے نفاذ کی بات کو انہوں نے تھوڑی دیر

کے لئے پس پشت ڈال دیا تھا، کیونکہ انہیں اپنے این ڈی اے کے دوسرے دوستوں کو برانگیختہ نہیں کرنا تھا۔حکومت کے ذریعہ فرقہ وارانہ عصبیت پھیلا کر ہندوؤں کو یکجا کرنے کی ان کی کوشش، ان کے سیاسی حلیفوں کی وجہ سے دبی دبی رہی، لیکن اس کے لے انہوں نے دوسرے ذرائع استعمال کئے اور اس کے لئے کافی جارحانہ کوشش کی گئی۔

آج ان تمام موضوعات کو دوبارہ زندہ کرنے کی پوری کوشش شروع ہوگئی ہے۔ گئوتحفظ کا پرانا نعرہ پھر زور وشور سے لگایا جارہا ہے اور اسے نہایت جارحانہ انداز سے پیش کیا جارہا ہے۔1995 میں آر ایس ایس کی تشکیل عمل میں آئی تھی، تو اس نے گئوتحفظ کے نام پر ہی اپنی تحریک کو آگے بڑھایا تھا اور جگہ جگہ گئو رکشا سمیتی قائم کر کے ہندوؤں کو مجتمع کرنے کی کوشش کی تھی۔2010 میں وشو ہندو پریشد نے پھر اسی نعرے کے تحت ملک کے مختلف حصوں میں یاتراؤں کا سلسلہ شروع کیا۔مدھیہ پردیش کی بی جے پی حکومت نے اس سلسلے میں ایک نئے قانون کا نفاذ کیا، جس کو گئوکشی پر پابندی لگانے کے قانون سے معنون کیا جاتا ہے۔اس قانون کے ذریعہ مدھیہ پردیش ملک کی وہ پہلی اور واحد ریاست ہوگئی، جہاں گائے کے گوشت کا کھانا بھی غیر قانونی قرار دیا گیا۔ایسا قانون خود بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت والی دوسری ریاستوں میں بھی نافذ نہیں ہے۔اس قانون کے تحت ملزم کو اپنی صفائی دیئے بغیر ہی سزا کا مرتکب قرار دیا جائے گا۔

گجرات میں اس سے بھی آگے بڑھتے ہوئے ایک ایسا قانون بنایا جارہا ہے، جس کے ذریعہ کسی بھی کمیونٹی کا شخص اس علاقے میں اپنی پراپرٹی کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت نہیں کرسکتا ہے، جس علاقے میں کوئی دوسری کمیونٹی اکثریت میں موجود ہو۔یعنی کوئی مسلمان اگر کسی ہندو اکثریتی محلے میں رہ رہا ہے، تو وہ اپنی پراپرٹی کسی باہر کے غیر ہندو شخص کے ہاتھ نہیں بیچ سکتا ہے۔ یہ دراصل ایک طرف تو مسلمانوں کو ہندو اکثریتی علاقوں سے نکالنے، تو دوسری طرف مسلمانوں کو مسلم اکثریتی علاقوں تک ہی محدود کردینے کی ایک

کوشش ہے۔مسلمانوں کا ایک گھیٹو بنا کر رکھ دینا' جہاں وہ محصور ہوکر رہ جائیں۔ دوسری طرف آبادی کو ہندو مسلم علاقوں میں تقسیم کر دینا' یعنی فرقہ وارانہ سطح پر آبادی کا پولرائزیشن۔ وزیراعلیٰ نے مرکز کی جانب سے دی گئی مسلمان طلباء کو اسکالرشپ کی اسکیم کو بھی نافذ کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ مذہبی بنیاد پر کسی مذہبی اقلیت کو خصوصی مراعات دینے کے قائل نہیں ہیں۔مرکز کی جانب سے یہ اسکیم سچر کمیٹی کی رپورٹ آنے کے بعد 2008 میں شروع کی گئی تھی' جس میں مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کی وجہ سے اسکالرشپ دینے کی سفارش کی گئی تھی ۔ گجرات میں صرف 26 فیصد مسلمان میٹرک تک پہنچ پاتے ہیں۔ گجرات میں مسلمانوں کی غربت اونچے طبقے کے ہندوؤں کے مقابلے میں 80 فیصد اور او بی سی کے مقابلے میں 50 فیصد زیادہ ہے۔ اس کے مقابلے میں تمام بی جے پی حکومت والی ریاستوں میں آر ایس ایس نے متوازی نظام تعلیم کا ایک جال بچھا دیا ہے۔ 1977 میں ودھیا بھارتی کا قیام عمل میں آیا تھا۔اس کی اس وقت تقریباً 30 ہزار شاخیں موجود ہیں' جس میں 32 لاکھ 50 ہزار طلباء تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور ایک لاکھ ساٹھ ہزار اساتذہ مقرر ہیں۔اس تعلیمی ادارے میں طلباء کی ہندوتو فکر کے ذریعہ ذہن سازی کی جارہی ہے۔ان کے اندر حب الوطنی کے نام پر عصبیت کا زہر انڈیلا جارہا ہے۔ 1994 میں این سی آر ٹی نے ودھیا بھارتی میں پڑھائی جانے والی کتابوں کا سروے کرنے کے بعد رپورٹ پیش کی تھی کہ کس طرح کتابوں میں شامل مضامین کے ذریعہ طلباء میں مذہبی عصبیت' نفرت اور فرقہ وارانہ مزاج پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور جس کو نہایت ڈھٹائی سے نالج آف کلچر کا نام دیا جارہا ہے۔

لیکن ان خطرناک کوششوں سے کہیں زیادہ خطرناک وہ منصوبے ہیں، جواب تفتیشی ایجنسیوں کے ذریعہ دہشت گردی کے الزام میں پکڑے گئے آر ایس ایس کے کارکنوں کی وجہ سے سامنے آئے ہیں۔سمجھوتہ ایکسپریس بم دھماکہ میں ان کے ہاتھ ہونے کی بات

سامنے آگئی ہے۔اس کے علاوہ مکہ مسجد' اجمیر درگاہ اور مالیگاؤں وغیرہ میں بم دھماکوں میں ان کے ہاتھ ہونے کا معاملہ ثابت ہو چکا ہے۔ یہ دہشت گردی کس قدر ملک کو تباہ کرنے والی ہے، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور اس کو کسی حالت میں بھی برداشت نہیں کیا جانا چاہئے۔ یہ تمام معاملات اشارہ کرتے ہیں کہ آر ایس ایس اور ان سے منسلک تنظیمیں فرقہ وارانہ منافرت پیدا کر کے کس طرح فرقہ پرستی کو مضبوط کر رہی ہیں اور جدید ہندوستان کی جمہوری قدروں کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔

(مضمون نگار کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (ایم) کے سینئر رہنما ہیں)

☆☆

ایک پراسرار تنظیم ہے بجرنگ دل؟

● غوث سیوانی

ایک الجھی ہوئی پہیلی، ایک ان سلجھی گتھی، ایک لاینحل مسئلہ، ایک پر تجسس داستان یا ایک پراسرار تنظیم ہے بجرنگ دل؟ بالکل اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد کی طرح، جو کچھ وقوع پذیر ہوا کس نے کیا؟ جو ہو رہا ہے اس کے لئے کون ذمہ دار ہوگا؟ اس قسم کے سوالات گردش کرتے رہتے ہیں، مگر کبھی ان کے جواب نہیں ملتے اور جو جواب ملتے ہیں، وہ بھی کسی پہیلی سے کم نہیں ہوتے، اس لئے کہ دنیا کی ایسی ہر داستان کے پیچھے کہیں نہ کہیں موساد کا ذہن کارفرما ہوتا ہے۔ آج ہندوستان میں بھی مسلسل ایسے حادثات وواقعات رونما ہو رہے ہیں، جن کی گتھیاں اسی قدر الجھتی جارہی ہیں جس قدر انہیں سلجھانے کی کوشش ہوتی ہیں۔ سنہ 1993 میں ہندوستان کی صنعتی راجدھانی ممبئی میں سلسلے وار بم دھماکے ہوئے، جن میں سینکڑوں افراد لقمہ اجل بن گئے۔ حکومت کے مطابق ذمہ داروں کی شناخت کی گئی اور انہیں کیفر کردار تک پہنچایا گیا، لیکن کئی سوال کا جواب ڈھونڈنے کی زحمت نہیں کی۔

ممبئی کے سلسلہ وار بم دھماکوں کے بعد سے احمد آباد کے سلسلے وار بم دھماکوں تک ملک میں دہشت گردوں کے درجنوں بڑے واقعات رونما ہوئے۔ حکومت ہند نے ان کے لئے بھی آئی ایس آئی تو کبھی لشکر طیبہ، کبھی حزب الجہاد اسلامی تو کبھی سیمی کو ذمہ دار قرار دیا۔ مسلم نوجوانوں کو دہشت گردی اور ملک دشمنی کے الزام میں گرفتار کیا۔ ظلم وستم کے پہاڑ توڑے، مگر ان میں سے بیشتر پر یہ الزامات ثابت نہ ہو سکے۔ اب سوال یہ تھا کہ جب دہشت گردی

کے واقعات ہوئے اور حکومت و پولیس نے جنہیں ملزم قرار دیا تھا، وہ کورٹ میں مجرم نہیں ثابت ہوئے تو پھر ان واقعات کا ذمہ دار کون تھا؟ وہ کونسی طاقت ہے جو بہت خاموشی سے موت اور دہشت کی کہانی رقم کر رہی ہے اور انتہائی شاطرانہ طور پر اپنے سیاہ کرتوتوں کی ذمہ داری مسلمانوں کے سر منڈھ رہی ہے؟

کانپور دھماکے نے حکومت کے کان کھڑے کئے:

آج ان سوالوں کے جواب قدرت خود ہمیں دے رہی ہے۔ کئی ایسے واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ جو ان پوشیدہ رازوں کو بے نقاب کرتے جارہے ہیں، جو عوام کی نظروں سے اب تک دور تھے۔ کانپور کا حادثاتی دھماکہ بھی ایسے ہی لاینحل سوالوں کے جواب کے طور پر سامنے آیا ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ گذشتہ دنوں اتر پردیش کے معروف شہر کانپور میں ونائک نگر کے ایک پرائیویٹ پاسٹل میں بم بناتے ہوئے دو افراد ہلاک ہوگئے۔ بم بنانے کے دوران دھماکا ہوگیا تھا۔ دھماکہ اتنا زبردست تھا کہ مکان کی دیواروں اور چھتوں کو زبردست نقصان پہنچا۔ پلاسٹر اکھڑ گئے، دیواروں میں شگاف پڑ گئے، اور پورا علاقہ دہل گیا۔ اس دھماکے میں جو دو افراد ہلاک ہوئے، ان کے نام سردار بھوپندر سنگھ اور راجیو مشرا ہیں۔ راجیو مالک مکان شیبوسورین مشرا کا بیٹا تھا۔ دونوں ہلاک شدگان کا تعلق ہندوتو وادی جماعت بجرنگ دل سے تھا۔ دھماکہ کے بعد جب پولیس نے جائے حادثہ کا جائزہ لیا تو مکان کے مختلف کمروں سے بم سازی میں کام آنے والی اشیاء کافی مقدار میں برآمد ہوئیں۔ جن میں کنٹینر اور بوری سے تقریبا 8/کلو پوٹاشیم پرمیگنٹ برآمد ہوا۔ لوہے کے دو شیل اور دیگر چیزیں برآمد ہوئیں۔ کثیر مقدار میں دھماکہ خیز مادے دیکھ کر پولیس کے بھی ہوش اڑ گئے۔

جب فیروز آباد موت آباد نہ بن سکا:

یہ بم آخر کس لئے بنائے جارہے تھے؟ کیا مقصد تھا اتنی بڑی مقدار میں دھماکہ خیز مادہ

جمع کرنے کا؟ ان سوالوں کے جواب بھی یہاں ملنے والے ایک نقشے نے دے دیئے، یہ نقشہ فیروز آباد شہر کا تھا۔ اور اس میں ریلوے اسٹیشن وتحصیل کو نشان زد کیا گیا تھا۔ گویا یہ دونوں مقامات بجرنگ دل کے ان دہشت گردوں کے نشانے پر تھے۔ ظاہر ہے اس پورے معاملے میں صرف یہی دو افراد ملوث نہیں ہونگے، بلکہ کچھ اور بھی لوگ ہوں گے اور اس سازش کے پیچھے کوئی بڑا ذہن کام کر رہا ہوگا، یہ تو حکومت اور پولیس کی ذمہ داری ہے کہ اس پورے معاملہ کے پیچھے کام کرنے والے ذہن کو ڈھونڈے۔ ہم تو صرف یہ سمجھتے ہیں کہ کسی دن اچانک سہاگ کی چوڑیوں کے لئے مشہور فیروز آباد میں سلسلے وار بم دھماکے ہوتے اور دیکھتے ہی دیکھتے سینکڑوں سہاگنیں اپنی چوڑیوں سے محروم ہو چکی ہوتیں۔ فیروز آباد موت آباد میں تبدیل ہو چکا ہوتا اور پھر تفتیش کے نام پر مسلمانوں کی گرفتاری کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ ریاستی سرکار سے مرکزی سرکار تک کی زبان پر سیمی، انڈین مجاہدین اور آئی ایس آئی کے نام ہوتے۔

بجرنگ دل یا شیطان دل:

بجرنگ دل کی ایسی حرکتیں پہلی بار سامنے نہیں آئی ہیں، اس سے قبل بھی اس کے مختلف دہشت گردانہ اور مجرمانہ واقعات میں شامل ہونے کی باتیں سامنے آتی رہیں ہیں۔ گذشتہ سال مہاراشٹر کے ناندیڑ میں بھی اسی طرح بم بناتے ہوئے بجرنگ دل کے دو کارکن ہلاک ہو گئے تھے، جس کی تفتیش سی بی آئی کر رہی ہے۔ اتر پردیش کے شہر رائے بریلی کی عدالت کے احاطے میں بھی سائیکل بم رکھتے ہوئے بجرنگ دل کے ایک شخص کو پولیس نے گرفتار کیا تھا۔ مہاراشٹر کی ایک ٹھیٹر اور معروف مصور ایم ایف حسین کی پینٹنگز کی ایک نمائش میں بم رکھتے ہوئے کچھ لوگوں کو پولیس نے پکڑا تھا، جن کے بارے میں رپورٹ آئی تھی کہ یہ بجرنگ دل کے کارکن ہیں۔ ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کے دوران بھی بجرنگ دل کا مکروہ چہرہ سامنے آتا رہا ہے۔ گجرات کے مسلم کش فسادات میں مسلمانوں کو زندہ جلانے کا کام

بڑے سلیقہ سے بجرنگ دل والوں نے کیا تھا اور اڑیسہ کے کندھمال میں عیسائی ننوں کو انہیں لوگوں نے زندہ جلا کر اپنی باطنی خباثت کا ثبوت پیش کیا۔ اس سے قبل اسی اڑیسہ میں پادری گراہم اسٹینس کو اس کے دو معصوم بچوں سمیت بجرنگ دل کے دارا سنگھ اور کچھ دوسرے ورکروں نے زندہ جلا دیا تھا۔ فسادات کرانا، مذہبی مقامات کی بے حرمتی کرنا، عورتوں کی عزتیں لوٹنا، دکانوں کو لوٹنا اور مکانوں کو جلانا بجرنگ دل والوں کے پسندیدہ مشغلے ہیں۔ بجرنگ دل کے ہی وہ بھی کارکن تھے، جنہوں نے گجرات میں حاملہ خواتین کے پیٹ چاک کر کے بچوں کو باہر نکالا تھا اور پھر انہیں ذبح کر کے اپنی درندگی کا مظاہرہ کیا تھا۔

منموہن حکومت میں ہمت ہے تو!:

کانپور واقعہ کے بعد ایک بار پھر بجرنگ دل پر پابندی کا مطالبہ شروع ہو گیا ہے۔ ملک کی اقلیتیں تو ہمیشہ ہی ایسی جماعتوں کے نشانے پر رہی ہیں، لہذا ان کی طرف سے ایسے مطالبے پہلے بھی ہوتے رہے ہیں، مگر اس بار حکومت کے اندر سے بھی ایسی آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ رام ولاس پاسوان نے جو کہ مرکز میں وزیر ہیں۔ ہندوتوادی دہشت گرد تنظیموں پر پابندی کا مطالبہ کیا ہے، اس کے بعد سے وہ اور ان کی پارٹی کے ورکر فرقہ پرستوں کی زد پر ہیں۔ وزیر مملکت برائے داخلہ سری پرکاش جیسوال نے بھی بجرنگ دل اور ہندو فرقہ پرست تنظیموں کی حرکتوں پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔ وزیر کابینہ کپل سبل نے بھی ان جماعتوں پر پابندی کو ممکن بتایا ہے، مگر سوال یہ ہے کہ منموھن سنگھ حکومت میں اتنی ہمت ہے کہ وہ بجرنگ دل اور دیگر ہندوتوادی طاقتوں پر لگام کس سکیں؟ منموھن کی کابینہ کے وزراء جو کچھ کہہ رہے ہیں، ان کی باتیں بھی ایسی نہیں کہ ان پر کان دھرا جائے، کیونکہ کانگریس کی تاریخ دوہری پالیسیوں اور دوغلی چاپلوسیوں سے بھری ہوئی ہے۔ کانگریس ہمیشہ حق وانصاف کی بات کہتی ہے اور عمل اس کے برخلاف کرتی ہے۔ اس نے ہمیشہ زبان پر رام اور بغل میں چھری رکھی۔ مسلمانوں کو اس ملک میں جتنا

نقصان پہنچا ہے، وہ کانگریس سے پہنچا ہے۔ جواہر لال نہرو سے لے کر منموھن سنگھ تک کانگریس کی مسلم دشمنی کی ایک تاریخ ہے۔اس لئے مرکزی وزراء کا بجرنگ دل پر پابندی کا بیان محض انتخابی ہتھکنڈا ہے۔ وہ اس طرح کی چکنی چپڑی باتوں سے مسلمانوں کو بہلا کر آئندہ اسمبلی ولوک سبھا انتخابات میں ان کے ووٹ حاصل کرنا چاہتی ہیں۔مسلمانوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ جو کانگریس جارج ڈبلیو بش، اسرائیل اور تسلیمہ نسرین کی دوست ہے وہ مسلمانوں کی دوست، ہرگز نہیں ہوسکتی۔مرکزی وزراء جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ محض ان کی منافقت ہے۔

کانپور پر سیاست:

مرکزی وزیر مملکت برائے داخلہ سری پرکاش جیسوال جو کہ کانپور سے متصل اناؤ سے انتخاب جیت کر آتے ہیں، انہوں نے اتنے اہم معاملے میں سیاست بازی شروع کردی ہے۔ بجرنگ دل پر پابندی کے لئے حکومت کے پاس کافی شواہد موجود ہیں۔ وہ چاہے تو پابندی عائد کرسکتی ہے، مگر وہ دانستہ طور پر ایسا نہیں کر رہی ہے۔ سری پرکاش جیسوال نے ریاستی حکومت سے کہا ہے کہ وہ مرکزی سرکار کو سی بی آئی تفتیش کے لئے خط لکھے، جبکہ ریاستی حکومت خود اس معاملے کی تفتیش کرانا چاہتی ہے۔ اس معاملے پر ریاست اور مرکز کے درمیان لفظی جنگ بھی جاری ہے۔ ظاہر ہے اس کی تفتیش کا سہرا اپنے سر لے کر دونوں حکومتیں اقلیتوں کو خوش کر کے آئندہ انتخابات میں ان کے ووٹ لینا چاہتی ہیں، مگر کسی کی بھی نظر ملک کے مفاد پر نہیں ہے۔

سیمی نہیں بجرنگ دل:

اب جب کہ تفتیش کی بات چل رہی ہے تو اس کا دائرہ صرف اسی واقعہ تک محدود رکھنا درست نہیں۔ تفتیش کا دائرہ پھیلنا چاہئے، اس معاملہ کے تار اتر پردیش کی عدالتوں میں ہونے والے سلسلے وار بم دھماکوں، بنارس، بنگلور، جے پور، احمد آباد، حیدر آباد، مالیگاؤں،

ممبئی اور دہلی کے سلسلے وار بم دھماکوں سے بھی مل سکتے ہیں۔ 27 / اگست سنہ 2008 کے ٹائمز آف انڈیا (دہلی) کی ایک خبر میں بھی اس طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ٹائمز آف انڈیا کی رپورٹ کے مطابق گجرات اور بنگلور کے بم دھماکوں میں جس قسم کے مادے کا استعمال کیا گیا، ٹھیک اسی قسم کی چیزیں کانپور دھماکہ کے بعد یہاں سے برآمد ہوئی ہیں۔لہذا بہت حد تک ممکن ہے کہ وہ بم دھماکے جن کا الزام سیمی اور انڈین مجاہدین کے سر ڈالا گیا ہے، وہ انہیں بجرنگ دل والوں کی کارستانی ہو، لیکن اس بات کا کم ہی امکان ہے کہ دہشت گردی کا الزام مسلمانوں کے سر تھوپنے والی ہماری تفتیشی ایجنسیاں کبھی اس نہج پر بھی غور کریں گی۔

بجرنگ دل، موساد:

ابھی چند روز قبل کلکتہ میں ایک غیر مسلم شخص کو گرفتار کیا گیا، جو کہ اپنے کمپیوٹر سے مسلم تنظیموں جیسے نام لکھ کر ای میل کیا کرتا تھا، اور مختلف قسم کے پیغامات پولیس، حکومت اور دیگر جگہوں پر بھیجا کرتا تھا۔ یہ پراسرار شخص کون تھا؟ اس کا تعلق کس تنظیم سے تھا؟ اس کا مقصد کیا تھا؟ ان تمام سوالوں کے جواب پر پردہ پڑا ہوا ہے۔میڈیا نے بھی اس میں ایسی دلچسپی نہیں دکھائی جیسی کہ وہ داڑھی اور ٹوپی والوں میں دکھایا کرتی ہے۔حکومت اور پولیس بھی خاموش تماشائی ہے۔ اب کیا حکومت بتائے گی کہ اس پراسرار شخص کا تعلق بجرنگ دل یا اس جیسی کسی جماعت سے ہے؟

اس سے قبل جے پور دھماکوں کے سلسلے میں انڈین مجاہدین کے نام سے جو ای میل بھیجے گئے تھے۔ یہ امریکی بعد میں اعلیٰ حکام کی مدد سے ملک سے باہر چلا گیا۔ کینتھ ہیوڈ نامی اس شخص کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا تھا کہ اس کی اصلیت کیا ہے؟ وہ ہندوستان میں کس مقصد سے ٹھہرا ہوا تھا؟ وہ جس چرچ کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا، وہاں آنے جانے والی پراسرار شخصیتوں کی حقیقت کیا ہے؟

کیا یہ شخص اسرائیل کی خفیہ تنظیم موساد کا ایجنٹ تھا۔ وہ موساد جو ساری دنیا میں سازشوں

کے لئے مشہور ہے، جو سینکڑوں سال کے پروگرام لے کر چلتی ہے، جس کا نام راجیو گاندھی کے قتل سے لے کر 9/11 کے واقعہ تک میں آچکا ہے۔ کیا ہیوڈ جیسے ایجنٹ ہندوستان میں بیٹھ کر بجرنگ دل جیسی تنظیموں سے کام لے رہے ہیں، اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لئے انڈین مجاہدین جیسے ناموں کا استعمال کررہے ہیں؟ یہ وہ سوالات ہیں جو جواب طلب ہیں۔ حکومت اگر ملک کا بھلا چاہتی ہے تو اسے ان سوالوں کے جوابات ڈھونڈنا چاہئیں۔ اگر اس معاملے میں لاپرواہی برتی گئی تو ملک دشمن طاقتیں ملک کے اتحاد کو پارہ پارہ کردیں گی۔

کانگریس و آر ایس ایس:

اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں ہونی چاہئے اگر آر ایس ایس کے زمرے سے تعلق رکھنے لوگ دہشت گردی میں ملوث پائے گئے ہیں۔ اجمیر بم دھماکہ، مالے گاؤں بم دھماکہ، مکہ مسجد بم دھماکہ، ان بم دھماکوں میں جن لوگوں کے نام واضح طور پر آئے ہیں وہ آر ایس ایس سے ہی تعلق رکھتے ہیں تو ان کی یہ پرانی روش ہے اور یہ روش انہوں نے اسرائیل سے سیکھی ہے۔ جب ملک آزاد ہوا تھا تب دہشت گردی نہیں تھی۔ فرقہ وارانہ فسادات ہوتے تھے اور اسی گروپ کے لوگ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے لیکن آزادی کے بعد کانگریس کو اقتدار ملا۔ کانگریس نے ان کے خلاف کچھ نہیں کیا کانگریس کی مجبوری یہ تھی کہ خود اس میں اس ذہنیت کے لوگ موجود تھے جو کھل کر سامنے نہیں آسکتے تھے، مگر پس پردہ سب کچھ کیا کرتے تھے۔ ملک کی آزادی اور ملک کی تقسیم ان دونوں باتوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو بہت سی حقیقتیں سامنے آسکتی ہیں۔ بہرحال ملک کی تقسیم تو ایک بہت ہی خراب عمل تھا جس کے بہت خراب نتائج نکلے اور آج بھی نکل رہے ہیں لیکن اس میں بھی کانگریس کی مجبوری تھی کہ اس زمانے میں اگر یہ نہ کیا جاتا تو برطانوی سامراج آسانی سے ہندوستان کو نہ چھوڑتا کانگریس سے جو لوگ الگ ہوئے تھے ان کے الگ ہونے میں بھی برطانوی سامراج کا

ہاتھ تو تھا ہی ان لوگوں کا ہاتھ بھی جو یہ نظریہ رکھتے تھے کہ ہندوستان کو ایک ہندو ریاست ہونا چاہئے، اسی نظریاتی اختلاف پر کانگریس کے اندر کشیدگی بڑھی تھی اور اس کشیدگی کو برطانوی سامراج نے ہوا دی تھی گویا اس سے فائدہ اٹھایا تھا۔ کانگریس کے سامنے یہ اہم سوال تھا کہ اگر وہ اس اختلاف کو سلجھانے بیٹھ جاتی تو پارٹی کمزور ہوجاتی۔ آزادی کی تحریک بھی کمزور پڑجاتی اور ملک آزاد نہ ہوپاتا چنانچہ خاموشی سے سب کچھ برداشت کیا گیا اور صرف برداشت ہی نہیں کیا گیا بلکہ آر ایس ایس کی پرورش بھی کی گئی لیکن دنیا میں اپنے حقوق کے لئے لڑنے والوں نے جب اس طرح کی روش اختیار کی کہ مارو اور بھاگو یا کہ بم دھماکے کرو ظاہر ہے کہ اس میں اسرائیل پیش پیش تھا در پردہ آر ایس ایس اور اس کی سیاسی شاخ بھارتیہ جنتا پارٹی نے اسرائیل سے یہ سب کچھ سیکھا حالانکہ اسرائیل اپنے حق کے حصول کے لئے ایسا نہیں کرتا تھا بلکہ یہ اس کا غاصبانہ رویہ تھا ہاں یہ ضرور ہے کہ فلسطینی اپنے وجود کو بچانے کے لئے کچھ اس طرح کی حرکتیں کرتے تھے اور اپنا حق حاصل کرنا چاہتے تھے کیونکہ ان کی زمینوں پر اسرائیل نے قبضہ کررکھا تھا لیکن شدت پسند ہندو تنظیموں نے یہ روش سیکھی اور اسے اپنے ہی ملک میں استعمال کیا اور ان کے لئے استعمال کیا جو ہندوستانی تھے کیونکہ مقصد یہ تھا کہ وہ ملک چھوڑ کر چلے جائیں باقاعدہ تمام معاملات کی جانچ کرائی جانی چاہئے۔ اگر سچائی سے جانچ ہوتو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ جس اقلیت کو بدنام کیا جاتا ہے اس کا اس میں کوئی کردار نہیں ہے حالانکہ اکثریتی طبقے میں سب کا مزاج ایسا نہیں ہے ہاں بس وہی جو آر ایس ایس سے تعلق رکھتے ہیں یا اس نظریے کو مانتے ہیں کہ ہندوستان میں صرف ہندو رہیں اور کسی بھی قوم کے کوئی لوگ نہ رہیں وہی یہ سب کچھ کرتے ہیں لیکن یہ مشکل یہ آپڑی ہے کہ ان تمام باتوں کی جانچ کون کرائے۔

☆☆

بابری مسجد...
پھر زخم ہرا ہوگیا دل کا

● محمد عبدالرحیم قریشی

6/دسمبر کی تاریخ آتی ہے تو کیفیت عجیب ہو جاتی ہے ہندوستان کے باضمیر مسلمان کو بابری مسجد کی یاد ستاتی ہے ہاں بے ضمیروں کو یہ احساس بے چین نہیں کرتا اور ضمیر فروش اس خلش میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ کیوں بابری مسجد کو یاد رکھا جا رہا ہے۔

6/دسمبر کو بھلائیں تو کیسے بھلائیں۔ کیا یہ بھول جائیں کہ اس تاریخ کو دن کی پوری روشنی میں اس ہجوم نے جس میں جھوٹ کی بنیاد پر مذہبی جنون جگایا گیا تھا چارسو سالہ قدیم تاریخی مسجد کو ڈھا دیا چوری چھپے نہیں، ریاستی پولیس، ریاستی مسلح پولیس، سی آر پی، ریاپڈ ایکشن فورس، خصوصی تربیت یافتہ اور قریب ہی فوج کی مستعد حالت میں موجودگی اور ان کے بیچوں بیچ یہ غارت گری ہوئی۔ کیا یہ بھول جائیں کہ پارلیمنٹ میں بابری مسجد کی حفاظت کا تیقن دینے والے وزیر داخلہ چار دن عین اس وقت پوجا کمرے میں بند اور لال قلعہ سے اور قومی یکجہتی کونسل میں اس تاریخی یادگار کی حفاظت کے عزم کا اعلان کرنیوالے وزیر اعظم نرسمہا راؤ ٹی وی پر بابری مسجد پر یلغار کا نظارہ کرتے رہے! کیا یہ بھلا دیں کہ جب تک بابری مسجد کے مسمار شدہ محراب و منبر کے پاس مضبوط چبوترے کی تعمیر نہیں ہوگئی اور اس پر لاکر مورتی نصب نہیں کر دی گئی اس وقت تک غارت گر ہجوم کو اس مقام سے منتشر کرنے کے احکامات جاری نہیں کئے گئے۔! کیا یہ بھلا دیں کہ بی جے پی اور اس کی ساری قیادت نے

کیسا طوفان کھڑا کیا تھا اور شیوسینا کے بال ٹھاکرے نے کس طرح سینہ ٹھونک کر اس مجرمانہ حرکت پر فخر کا اظہار کیا تھا۔

پھر سوال یہ ہے کہ بھلائیں تو کیوں کہ بھلائیں! کیا پی۔ وی نرسمہا راؤ نے (جن کی لاش کو آگ نے بھی قبول نہیں کیا، دوسرے دن ان کی لاش کو کتے چیرنے اور بھنبھوڑنے لگے) فرائض کے انجام دہی سے مجرمانہ غفلت پر شرمندگی کا اظہار کیا اور عوام سے معافی چاہی؟ کیا ملک کے وہ قوانین جن میں عبادت گاہ کا انہدام اور اس کی بے حرمتی تو بڑی بات ہے کسی کی جائیداد کو ڈھا دینا سخت جرم ہے' فوری حرکت میں آئے اور غارت گر اور غارت گروں کے سرغنے، اڈوانی، سنگھل، اوما بھارتی سلاخوں کے پیچھے نظر آئے۔۔؟ کیا آر ایس ایس، بی جے پی، وی ایچ پی، بجرنگ دل وغیرہ نے پچھتاوے کا اظہار کیا اور آئندہ کے لئے توبہ کر لی۔! آخر بھلائیں تو کیسے بھلائیں اور کیوں کر بھلائیں

یاد ماضی عذاب بھی ہے اور مہمیز بھی

بہت سے خیر خواہی کا دعوی یہ کہہ کر کرتے ہیں کہ بابری مسجد منہدم نہیں ہونا چاہیئے تھا مگر منہدم ہوگئی اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔ بس سمجھو کہ ایک ڈراونا خواب تھا۔ ڈراونا خواب یاد نہیں رکھا جاتا بھول جاؤ۔ ارے متقبل کی طرف دیکھو۔ مستقبل کی فکر کرو۔ (۱۵) سال ہوگئے بات پرانی ہوگئی' ماضی کو بھول جاؤ کہ یاد ماضی عذاب ہوتا ہے۔

ان سے ہم یہی کہیں گے کہ آپ کا مشورہ اپنی جگہ' آپ کے اس مشورہ کے پیچھے آپ کے اپنے مفادات' عہدہ ترقی' اور عہدے کے امکانات یا سیاسی ذہن کارفرما ہے یا واقعی خیر خواہی ہے۔ اس پر بھی کوئی تبصرہ اس وقت ہم کرنا نہیں چاہتے۔ 6/دسمبر کو بھلانا ہمارے لئے آسان ہو جاتا اگر مسجد کی جگہ مسجد بن جاتی 'مجرم۔ چھوٹے ہوں کہ بڑے' سزا پاتے اور سازشیوں کی گردنیں شرم سے جھک جاتیں۔ اس سے قطع نظر یہ بات پوری طرح صحیح نہیں ہے کہ مستقبل کی فکر کے لئے ماضی کو بھلانا ضروری ہے یہ بات صحیح ہے کہ اگر ماضی کی تلخیاں

مایوسی کی کیفیت پیدا کردیں اور حرکت وعمل کے لئے رکاوٹ بن جائیں تو واقعی یہ یادیں پاؤں کی زنجیریں اور ہاتھوں کی ہتھکڑیاں ہیں جن کی جکڑ مستقبل کی سمت میں گام زن ہونے سے روکتی ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ کسی چیز کے چھن جانے اور کھوجانے کی یاد ہمیشہ مایوسی کی کیفیت پیدانہیں کرتی بلکہ ایسی یادتو اکساتی رہتی ہے کہ جو چھن گئی اس کو پھر حاصل کروجو کھوگیا ہے اس کی تلاش کرو۔ ماضی کی ایسی یادیں ارادوں کو کمزور نہیں بلکہ مضبوط اور طاقتور بناتی ہیں اور ماضی کی ایسی یادیں حرکت وعمل کا پیام ہوتی ہیں اور مہمیز کا کام دیتی ہیں۔ ایسی یادوں کو گلے سے لگائے رکھنا ضروری ہے بلکہ جو قوم ایسی یادوں کو دبایا بھلادیتی ہے وہ عزت نفس کھودیتی ہے۔

کیا کیا ہم نے کھویا ہے:

یہ تو دیکھو کہ ہم نے 6ردسمبر کو کیا کیا کھویا اور کیا کیا چیزیں چھین لی گئیں۔ اس دن بابری مسجد کو ڈھانے کے ساتھ غارت گروں نے کیا کیا نقصان پہنچایا اس کو یاد کرو۔ ہندوستان کے سیکولر مملکت ہونے کا امتیاز ختم ہوگیا۔ غور کیجئے اب کس کو اس کا بھروسہ ہے یہ ملک ایک سیکولر ریاست ہے حکومت کا مقصد ہی قانون کی برتری و بالا دستی کو قائم رکھنا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتو ہر طاقتور ہر غنڈہ اور ہر دادا بے پروا ہوکر جو چاہے کرے گا۔ کسی مجرم کی ہمت نہیں ٹوٹے گی۔ 6ردسمبر کو دنیا نے دیکھ لیا ہندوستان میں قانون کی برتری، مکڑی کے جالے کی طرح ہے جو کمزوروں کو پکڑ لیتا ہے اور طاقتور ظالم کے آگے ٹوٹ جاتا ہے۔ قانون کی برتری مجروح ہوگئی عدلیہ اوراعدلت کا احترام معاشرہ میں قانون کے احترام کی بقا کی ضمانت ہوتا ہے۔ ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کے وقار کو ملیا میٹ اس طرح کیا گیا کہ ذراسی توہین پر چونک پڑنے والی سپریم کورٹ بھی اس توہین کے جرم کو عرصہ تک ٹالتی رہی عدلیہ اور عدالت کا احترام خاک میں مل گیا۔ بات پھیلایا جائے تو اور بہت سے نکات سامنے

آئیں گے لیکن ہم اس پر اکتفا کریں گے۔ یہ سمجھنا کہ بابری مسجد کے انہدام سے صرف مسلمانوں کی عبادت گاہ چھن گئی غلط ہے مسجد کے ساتھ، ملک کا وقار، اس کا سیکولر کردار، قانون کا احترام، تہذیب وتمدن سب کچھ ڈھادیا گیا۔

تازہ رہے یہ زخم دل اپنا:

بابری مسجد کی یاد کو تازہ رکھنا اس لئے ہے کہ ہندوتوا کا مکروہ چہرہ دکھائی دیتا رہے، ہندوستان کو واقعی سیکولر ریاست بنانے کا عزم پیدا ہو اور فرقہ وارانہ جارحیت سے پنجہ آزمائی کا حوصلہ بڑھے دستور، قانون اور عدلیہ کا احترام بحال ہو اور جو محض عددی طاقت پر من مانی کرنا چاہتے ہیں ان کی ہمتیں توڑنے کا جذبہ پروان چڑھے اور ملک میں عدل وانصاف کا دور دورہ ہو، بابری مسجد کی یاد کے ساتھ اس کی دوبارہ تعمیر کے عزم وارادے کو پروان چڑھایئے جو ملک کے تابناک مستقبل کا ضامن بن سکتے ہیں۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا تھا:

چمکاؤ تم اتنا داغوں کو، مہکاؤ تم اتنا زخموں کو
ہوجائے پشیماں چارہ گری شرمندہ مسیحا ہوجائے

وطن عزیز ہندوستان سے محبت کرنے والو! یاد رکھو بابری مسجد کی یاد ہی عدل وانصاف کو فروغ دینے کا جذبہ جگائے گی اور اس کے لئے کچھ کرنے پر اکسائے گی۔

مسلمانو! یاد رکھو! بابری مسجد کی یاد کو تازہ رکھ کر ہی تم عزت ووقار کا مقام پاسکتے ہو۔

☆☆

بم دھماکے اور بھگوا دہشت گردی

● ڈاکٹر ابو حمنہ شہاب

بٹلہ ہاؤس انکاؤنٹر کی تیسری برسی کے موقع پر یک لخت مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ۱۸ر ستمبر ۲۰۰۸ء کو جامعہ نگر میں پولیس کی زیادتی کا شکار بنے عاطف اور ساجد کا لہو بولنے لگا ہے، کیوں کہ اس دن ایک طرف جہاں مختلف سماجی تنظیموں، سیاسی رہنماؤں اور طلبہ برادری کی جانب سے احتجاج اور دھرنے کا اہتمام، انکاؤنٹر کی سپریم کورٹ کے سبکدوش جسٹس کے ذریعہ تحقیقات کے مطالبہ کا اعادہ اور مظلومین کیلئے انصاف کی گہار لگائی جا رہی تھی وہیں دوسری طرف مہاراشٹر پولیس ہندو دہشت گرد تنظیموں پر پابندی عائد کرنے کیلئے ریاستی حکومت سے سفارش کر رہی تھی۔ مہاراشٹر پولیس نے حکومت سے بھگوا تنظیم سناتن سنستھا اور ابھینو بھارت کو ممنوعہ دہشت گرد تنظیم کی فہرست میں شامل کئے جانے کی پرزور سفارش کی تو مرکزی حکومت نے مہاراشٹر سرکار سے ان تنظیموں کی سرگرمیوں کی مزید تفصیلات طلب کی۔ یہ سب اچانک نہیں ہوگیا، اس کیلئے برسوں سے کوششیں ہو رہی تھیں، سرکار کو مسلسل جگایا جا رہا تھا، پولیس اور انتظامیہ کو بھگوا دہشت گردوں کی جانب سنجیدگی سے توجہ مبذول کرنے کی درخواستیں کی جاتی رہی ہیں، یہی وجہ ہے کہ دیر سے ہی سہی حکومت اور انتظامیہ نے اپنی سوچ تبدیل کی، تفتیش کاروں نے اپنا رخ بدلا۔ اب جو حقیقتیں سامنے آرہی ہیں وہ نہ صرف چونکا دینے والی ہیں بلکہ پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ دراصل یہ ان بے گناہوں اور شہیدوں کا لہو ہی جواب بولنے لگا ہے۔ عاطف اور ساجد بھی دہلی میں ہوئے بم دھماکوں کے جرم میں پولیس کے شکار بنے تھے۔

قابل استعجاب امر یہ ہے کہ بھگوا دہشت گردی کا دائرہ جتنا تصور کیا جا رہا ہے اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ تحقیقاتی ایجنسیوں کو ایک دو نہیں بلکہ ملک میں ہونے والے ۱۶ر بم دھماکوں میں بھگوا دہشت گردی کے ملوث ہونے کا شبہ ہے، مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ ان میں صرف کچھ میں ہی ان کے رول کی جانچ کی جا رہی ہے۔

ڈیکن ہیرالڈ کی ایک خبر کے مطابق گزشتہ دنوں ریاستی پولیس سربراہان کی میٹنگ میں انٹیلی جنس بیورو (آئی بی) کے ایک اسپیشل ڈائریکٹر نے بتایا کہ ملک میں ہونے والے کم از کم ۱۶ر بم دھماکوں میں یا تو بھگوا دہشت گردی کے رول کی جانچ ہو رہی ہے یا بم دھماکوں میں ان کے ملوث ہونے کا شبہ ہے۔ اس انکشاف سے واضح ہوتا ہے کہ بھگوا دہشت گردی کا نیٹ ورک روز بروز پھیلتا جا رہا ہے جو ملک کی سالمیت کیلئے زبردست چیلنج ہے۔ آزادی کے بعد سے مسلسل ظلم و زیادتی کا شکار بن رہے مسلمانوں کیلئے یہ کوئی معمولی انکشاف نہیں ہے۔ ۶۵ر سالوں سے انصاف اور حقوق کی لڑائی لڑ رہی مسلم اقلیت کو اس پر بہت زیادہ خوش ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ یہ تو ابھی آغاز ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ اگر پولیس کی سفارشات پر مہاراشٹر اور مرکزی حکومت توجہ دھیان دیتی ہے تو یہ ہندوستا کی تاریخ کا اہم باب ثابت ہوگا۔ ہندو دہشت گردوں کے ذریعہ انجام دئے گئے دہشت گردانہ واقعات میں ملک کی مختلف جیلوں میں قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہے ہزاروں بے گناہوں کو رہائی کا پروانہ مل جائیگا۔ ان کی پرخار راہیں آسان ہو جائیں گی اور وہ جیلوں سے رہا ہو کر دوبارہ اپنی زندگی کی شروعات کر سکتے ہیں۔

توجہ طلب بات یہ ہے کہ ان انکشافات کے بعد ملک میں امن و سلامتی کیلئے ہر ممکن اقدامات کا راگ الاپنے والی حکومتیں اس مسئلہ پر کس قدر سنجیدہ ہیں۔ اپنے شہریوں کے تحفظ کی اسے واقعی فکر ہے یا محض دکھاوا۔ ملک کے پریشان حال مسلمانوں کے مسائل سے بھی انہیں کتنی دلچسپی ہے یہ سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ چونکہ وطن عزیز کیلئے دہشت گردی

جتنا بڑا چیلنج ہے اس سے کہیں زیادہ یہ مسلمانوں کیلئے ناسور! کیوں کہ ہر واقعہ کا الزام مسلمانوں کے سر منڈھ دیا جاتا ہے۔ اگر بھگوا دہشت گردی پر شکنجہ کسا جاتا ہے تو مسلمانوں کو اس ناسور سے چھٹکارا حاصل ہونے کی امید ہے۔ اس لئے مرکزی اور ریاستی حکومتوں کو پولیس کی سفارش پر انتہائی سنجیدگی سے بنا کسی تاخیر کے توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سناتن سنستھا اور ابھینو بھارت وہ خطرناک بھگوا جماعت ہے جس نے گزشتہ چند سالوں میں مہاراشٹر کے کئی علاقوں میں پے در پے بم دھماکے کئے ہیں، پولیس کے پاس اس کے پختہ ثبوت وشواہد موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پولیس ان دونوں جماعتوں پر پابندی عائد کئے جانے کے معاملے میں از حد سنجیدہ ہے۔

مہاراشٹر پولیس نے دہشت گردی مخالف قانون اور غیر قانونی سرگرمیاں (پریوینشن ایکٹ) کے تحت ہندو تنظیم، سناتن سنستھا اور بھینو بھارت کو ممنوعہ دہشت گرد تنظیموں کی فہرست میں شامل کرنے کی مہاراشٹر حکومت سے سفارش کی ہے۔ سناتن سنستھا کا نام ۲۰۰۹ء کے گوا بم دھماکے میں سامنے آیا تھا جبکہ ۲۰۰۶ء کے مالیگاؤں بم دھماکے میں ابھینو بھارت کے ممبران ملوث پائے گئے تھے۔ اس سلسلہ میں اے ٹی ایس اور سی بی آئی نے ابھینو بھارت کے اراکین لیفٹیننٹ کرنل سری کانت پروہت، اجے راہیر کر، رمیش اپادھیائے اور سمیر کلکرنی سمیت دیگر کئی لوگوں کے خلاف معاملہ درج کیا تھا۔ اسی طرح قومی تحقیقاتی ایجنسی (این آئی اے) نے گوا بم دھماکے میں سناتن سنستھا کے ۱۱ر ممبران کے خلاف معاملہ درج کیا تھا۔

قابل ذکر ہے کہ مالیگاؤں بم دھماکہ میں گرفتار سالوں سے قید وبند کی صعوبتیں برداشت کر رہے ۹ر مسلم ملزمین کو قومی تفتیشی ایجنسی بے قصور قرار دے چکی ہے۔ این آئی اے اس بات کو تسلیم کر چکی ہے کہ مالیگاؤں بم دھماکوں میں اے ٹی ایس نے جن مسلم نوجوانوں کو گرفتار کیا تھا وہ سب بے قصور ہیں۔ اس حقیقت کے پیش نظر قومی تفتیشی ایجنسی نے ان ملزین کی درخواست ضمانت کی مخالفت نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مالیگاؤں کے بے قصوروں کی رہائی کے

امکانات پہلی بار اس وقت روشن ہوئے تھے جب حیدرآباد مکہ مسجد بم دھماکوں کے الزام میں گرفتار بھگوا دہشت گرد سوامی اسیمانند نے اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہوئے بتایا تھا کہ مکہ مسجد، اجمیر شریف اور مالیگاؤں کے دھماکوں کے علاوہ سمجھوتہ ایکسپریس دھماکے بھگوا دہشت گردی کی کارستانی تھے۔ پارلیمنٹ کے حالیہ مانسون اجلاس میں ایک سوال کے جواب میں وزیر مملکت برائے داخلہ جتیندر سنگھ نے بتایا تھا کہ بم دھماکوں کی تحقیقات جاری ہیں لیکن سناتن سنستھا اور ابھینو بھارت کے تعلق سے جو معلومات حاصل ہوئیں ہیں اس کے مدنظر مہاراشٹر پولیس نے ریاستی حکومت سے ان تنظیموں کی فہرست میں شامل کرنے کی سفارش کی ہے۔ پارلیمنٹ میں یہ سوال اس ضمن میں اٹھایا گیا تھا کہ ان تنظیموں کے بم دھماکوں میں ملوث ہونے کے بعد حکومت نے ان کے خلاف کیا کارروائی کی ہے اور یہ کہ کیا ان تنظیموں پر پابندی عائد کی جائے گی؟ اس پر جتیندر سنگھ نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ مالیگاؤں، سمجھوتہ ایکسپریس دھماکہ، مکہ مسجد اور اجمیر درگاہ بم دھماکوں میں ابھی تک کسی مخصوص تنظیم کا نام حتمی طور پر سامنے نہیں آیا ہے، لیکن ان معاملات میں گرفتار ملزمین سوامی اسیمانند، دیویندر گپتا اور لوکیش شرما کے بارے میں جانکاری ملی ہے کہ یہ لوگ پہلے آر ایس ایس کی سرگرمیوں میں ملوث رہے ہیں۔

اگر حکومت، پولیس اور تفتیش کار سنجیدگی اور غیر جانبدارانہ اپنے فرائض کو انجام دیں تو بہت جلد یہ بات سامنے آجائے گی کہ ملک کے امن وسکون کو غارت کرنے میں آر ایس ایس کا رول سب سے اہم رہا ہے۔ سنگھ نے جب سے اسرائیل سے دوستی بڑھائی ہے اور اس کے نقش وقدم پر چلنا شروع کیا ہے ملک میں شر وفساد کے واقعات میں اضافہ ہوا ہے، نفرتیں بڑھی ہیں، اس لئے وقت آگیا ہے کہ ان واقعات کی گہرائی سے ایماندارانہ تفتیش کی جائے تاکہ آر ایس ایس کے ذریعہ وقوع پذیر ہونے والے دہشت گردانہ واقعات پر قدغن لگے، بصورت دیگر بھگوا دہشت گردی کا دائرہ مزید وسیع ہوتا جائے گا۔

☆☆

گریش کرناڈ کی حق گوئی

● ادارہ

ہندستان کے خودساختہ دانشوروں نے اظہار رائے کی آزادی کے حوالے سے ادھر مسلسل اسلام اور مسلمانوں کے مذہبی عقائد اوران کے رسوم ورواج کے خلاف ایک تحریک سی چلا رکھی ہے۔ادب وثقافت یا حقوق انسانی کے نام پر منعقد کئے جانے والے پروگرام کے پلیٹ فارم کواس کے لئے نہایت بیباکی سے استعمال کیا جارہا ہے اور جب بھی ایسی حرکتوں کے خلاف آواز بلند کی جاتی ہے تو اس کوفکری انتہا پسندی کا نام دے کر باضابطہ اس کے خلاف لفظی جنگ کا آغاز کردیا جاتا ہے۔

ایک پوری قوم کے مذہبی جذبات کوٹھیس پہنچانے کواظہار رائے کی آزادی کے تحت تو دانشورانہ عمل قرار دیا جاسکتا ہے لیکن جب اس کے بارے میں اپنا احتجاج پیش کیا جاتا ہے تو اس کوانتہا پسندی اور کٹھ ملاّئیت قرار دے کراس کی نکیر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ہندوستان جیسے ایک روایتی معاشرے میں جہاں مذہبی اقدار کواب بھی پوری اہمیت حاصل ہے اور تہذیبی رنگارنگی کوقدروں کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے وہاں دانشوری کے نام پر ایسی دل آزار کوششیں، کیا اسی طرح جاری رہیں گی یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب ہندوستانی اقدار سے محبت کرنے والوں کو دینا ہی ہوگا اور مشہور فلمساز اور تھیٹر کی ایک بااعتبار اور قدآور شخصیت گریش کرناڈ نے گذشتہ دنوں ممبئی کے اہم ادبی تقریب میں اس فریضے کو نہایت ہی دیانت داری کے ساتھ نبھانے کا آغاز کیا ہے جس کی کم ازکم مسلمانوں کی جانب سے تو بھرپور تائید اور شاندار تحسین کی جانی چاہئے۔خوشی کی بات یہ ہے کہ ملک کے بہت سارے دانشوروں اور مختلف فنون سے تعلق

رکھنے والے اہل فکر نے بھی گریش کرناڈ کے اس حوصلے اور جذبے کی کھلے دل سے تائید کی ہے اور ان کی اس بیباکی پرخراج تحسین پیش کیا ہے لیکن خودساختہ دانشوروں کا ایک پورا طبقہ اس پر تلملایا ہوا ہے اور گریش کرناڈ کے خلاف صف آرائی کرنے کی کوشش کررہا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ گذشتہ دنوں ممبئی میں ممبئی لٹریری فیسٹول کا انعقاد کیا گیا تھا، جس میں ہندوستانی نژاد برطانوی قلم کار وی ایس نائپال کو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔نائپال مختلف کتابوں کے مصنف ہیں اوران کوادب کا نوبل پرائز بھی دیا جاچکا ہے، لیکن نائپال اپنی ان تحریروں کی وجہ سے کافی مشہور ہیں، جن میں مسلمانوں اور اسلامی اقدار کوسخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ان کی مشہور کتاب ’انڈیا: ایک زخمی تمدن‘ ہندوستان میں فرقہ وارانہ ذہنیت رکھنے والے لوگوں اور عالمی سطح پر اسلام مخالفوں کے درمیان بہت مقبول ہوئی ہے اوراس کے اب تک کئی ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔ان کے علاوہ بھی دیگر دوکتابوں میں نائپال نے اسی طرح مسلمانوں اور اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی کی ہے اوران کے یہی خیالات ان کی مقبولیت کی وجہ بنے ہیں۔جس لٹریری فیسٹول میں نائپال کو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا گیا اسی فیسٹول میں تھیٹر اور فلم کی مشہور اور قدآور شخصیت گریش کرناڈ کوبھی ہندوستانی تھیٹر کی روایت پر اظہار خیال کرنے کے لئے بلایا گیا تھا، لیکن گریش کرناڈ مسلمانوں کے جذبات کومسلسل زخم پہنچانے والے مصنف نائپال کو ہندوستان میں اس طرح اعزاز دیئے جانے سے اس قدر غم وغصہ میں تھے کہ انہوں نے اپنی تقریر میں تھیٹر کی ہندوستانی روایت پر اظہار خیال کرنے کے بجائے اس فیسٹول کے ان منتظمین کواپنی تنقید کا نشانہ بنانا شروع کیا جنہوں نے نائپال جیسے سخت اسلام اور مسلم مخالف کو یہاں بلاکر اتنے بڑے ایوارڈ سے نوازنے کی کوشش کی ہے۔

گریش کرناڈ کو نائپال کے اس خیال سے شدید اختلاف تھا کہ مسلم حملہ آوروں نے ہندوستان کی روایتی مذہبی قدروں کو بڑی بے دردی سے تباہ وبرباد کیا ہے۔نائپال مسلسل کہتے

اور لکھتے رہے ہیں کہ اسلام کی اس ملک میں آمد نے یہاں کی اصل قدروں کو تباہ کیا ہے اور یہاں کی تہذیب کو ملیا میٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ گریش کرناڈ نے بہت ہی سخت لہجے میں کہا کہ اس پروگرام کے آرگنائزروں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ ایک ایسے شخص کو اتنا بڑا اعزاز دے رہے ہیں، جو اس ملک کا رہنے والا بھی نہیں ہے اور جو اپنی تحریروں کے ذریعہ مسلسل اس ملک میں فرقہ وارانہ منافرت پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ نائپال انگریزی زبان کے بہت ہی مقبول قلم کار ہیں اور ان کی تحریریں بڑے ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہیں، لیکن ہندوستانی مسلمانوں اور اسلام کے سلسلے میں ان کے خیالات جس طرح منافرت پیدا کرتے رہے ہیں اور ان کی متعصّبانہ فکر کی نمائندگی کرتے رہے ہیں، ان کا ہندوستان کی سرزمین پر اس طرح معزز کیا جانا انتہائی افسوسناک اور ناقابل قبول ہے۔ گریش کرناڈ نے ان کی مشہور کتابوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ نائپال نے اپنی کتابوں میں مسلمانوں کو وحشی حملہ آور، جنہوں نے ہندوستانی قدروں کو تباہ و برباد کیا ہے، ہی قرار نہیں دیا ہے، بلکہ اس ملک کی عظیم مسلم وراثتوں کی بھی توہین وتضحیک کی ہے اور اس پر اپنے افسوس کا اظہار کیا ہے کہ آخر ہندوستانی سرزمین پر ایسی مسلم وراثتیں اب تک موجود کیوں ہیں۔

نائپال نے تاج محل کو نہایت ہی متعصّبانہ عینک سے دیکھا ہے اور اس کے اب تک موجود رہنے کو افسوسناک قرار دیا جاسکتا ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ تاج محل ہندوستان کی سب سے زیادہ پسند کی جانے والی ہماری وہ وراثت ہے، جس پر ہم پوری دنیا میں فخر سے اپنا سر اونچا کئے پھرتے ہیں۔ نائپال نے تاج محل کے بارے میں لکھا ہے کہ ''تاج محل کی تعمیر ہندوستانی دولت کی سراسر بربادی تھی۔ اس قدر واہیات اور اس قدر ظالمانہ طرز عمل کا اظہار کہ اس سے صرف ظلم وستم کی تکلیف دہ یاد ہی وابستہ ہے، آج بھی اس کو دیکھنے سے ظلم وستم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ لوگوں کے خون سے سنی ہوئی یہ عمارت اب تک کس طرح موجود ہے۔ گریش کرناڈ نے کہا کہ شاید ہی دنیا کے کسی منفی اور متعصّبانہ فکر رکھنے والے شخص نے بھی

تاج محل کے سلسلے میں اتنی افسوسناک رائے کا اظہار کیا ہو۔ انہوں نے کہا کہ نائپال کی یہ تکلیف دہ تصنیف ''انڈیا: ایک زخمی تمدن'' 1977 میں شائع ہوئی تھی اور اس میں تاریخی حقائق کو اس متعصّبانہ انداز میں افسوسناک طریقے سے پیش کیا گیا تھا کہ این آئی ڈی کے سابق ڈائریکٹر اشوک چٹرجی نے خود نائپال سے کہا تھا کہ اس کتاب کو کوئی تاریخی مطالعہ کہنے کے بجائے ایک فکشن کہا جانا چاہئے اور اسے اسی فکشن عنوان سے کلاسیفائڈ کیا جانا چاہیئے، ورنہ تاریخ کے ساتھ یہ سخت ناانصافی ہوگی۔ گریش کرناڈ نے طنزیہ لہجے میں کہا کہ شاید اس کتاب کو اس لئے نوبل پرائز سے نوازا گیا تھا۔

گریش کرناڈ نے کہا کہ لوگ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ نائپال کی سیاسی وابستگی کس طرح کی رہی ہے۔ نائپال کچھ سال پہلے جب ہندوستان آئے تھے، تو انہوں نے بڑے اہتمام کے ساتھ دہلی میں بھارتیہ جنتا پارٹی کے مرکزی دفتر کا دورہ کیا تھا اور وہاں جاکر انہوں نے بابری مسجد کے سلسلے میں بہت ہی دل آزار اور متنازعہ قسم کے بیانات جاری کئے تھے۔ اسی سے ان کی فکر اور ان کی پسند وناپسند کا بخوبی اظہار ہوتا ہے۔ نائپال نے بھاجپا کے دفتر میں جاکر بابری مسجد اور ایودھیا کی تاریخ کے سلسلے میں جو متنازعہ اور دل آزار بیان دیا تھا، اس کا وہ دیگر مختلف جگہوں پر بھی بارہا اظہار کرتے رہے ہیں۔ بھلا کسی ایسے منافرت پھیلانے والے شخص کو اتنے معتبر پلیٹ فارم سے کس طرح اعزاز دیا جاسکتا ہے۔ گریش کرناڈ نے کہا کہ ویسے بھی اب تک یہ ایوارڈ کسی ہندوستانی کو دیا جاتا رہا ہے اور نائپال ایک ہندوستانی نہیں، بلکہ غیر ملکی مصنف ہیں اور کیسے ایک ایسے غیر ملکی مصنف کو اتنا معتبر ایوارڈ یا جاسکتا ہے، جو ہندوستانی مسلمانوں کو وحشی، حملہ آور اور قاتل وغارت گر قرار دیتا ہے۔ میرے بے شمار مسلم دوست اور میرے پڑوسی ہیں۔ ہماری نظر میں تو یہ سراسر ان پر ظلم اور بے ہودہ الزام ہے، جس نے مجھے سخت تکلیف پہنچائی ہے۔ (بشکریہ نئی دنیا)

☆☆

سنگھ پریوار کا ماسٹر پلان
ہندوستان کو ہندوراشٹر بنانے کا نقشہ تیار

● ادارہ

اگلے دس پندرہ برسوں میں سیکولر ہندوستان کو ایک ہندوراشٹر بنانے کا آرایس ایس نے مکمل نقشہ تیار کرلیا ہے اور اس نقشہ کے مطابق پوری منصوبہ بندی کے تحت کام کیا جارہا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس ماسٹر پلان کا کسی کو اندازہ نہیں ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بالواسطہ یا بلاواسطہ وہ تمام ادارے اور افراد اس نقشہ میں رنگ بھرنے میں لگے ہوئے ہیں، جو بظاہر خود کو سیکولر قرار دیتے ہیں اور اسٹیج پر کھڑے ہوکر فرقہ پرستی کے خلاف نعرے لگاتے رہتے ہیں۔ گذشتہ چند برسوں میں جس طرح منصوبہ بند طریقے سے آرایس ایس نے اپنے کیڈر، انتظامیہ، عدلیہ، تعلیمی اداروں اور حفاظتی دستوں میں داخل کرائے ہیں اور باضابطہ ہندو دہشت گردوں کی ٹیم کو ترتیب وتشکیل دے کر میدان کار میں اتارا ہے، اس کی تفصیلات اب سامنے آنے لگی ہیں۔

آرایس ایس نے مختلف الجہت سرگرمیوں کو کافی منظم کیا ہے اور اپنے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے ان تمام سرگرمیوں پر بڑی خاموشی سے اپنے کام کو آگے بڑھایا ہے۔ اس وقت آرایس ایس کے ذریعہ قائم کئے گئے مختلف ادارے اور ان اداروں میں پہنچے ہوئے ان کے افراد اپنے منصوبے کے مطابق سرگرمیوں میں منہمک ہیں اور وہ مختلف موضوعات پر ہندوؤں کو مجتمع کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ ایک طرف اگر وہ ہندو بنیاد

پرستی کے نعروں کے ذریعہ جذبات کو برانگیختہ کرنے کی کوشش کررہے ہیں، تو دوسری طرف اپنے سیاسی ونگ کے ذریعہ ملک کے اکثریتی طبقے کے مفاد کے قانونی حق کی دہائی دے کر ہندوؤں کی ذہن سازی کرنے میں مصروف ہیں۔ اس وقت پوری کوشش یہ ہے کہ ہندوستان کی سماجی اور تہذیبی روایت کی بات کرکے ایک سیاسی موضوع کو اس طرح تہذیبی موضوع کا رنگ دے دیا جائے کہ اس پر راست فرقہ پرستی کا لیبل لگا کر کوئی آسانی سے تنقید نہ کرسکے۔ مختلف ریاستوں، جہاں بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت قائم ہے، وہ ہندوستانی تہذیب اور روایت کے نام پر ایسے ایسے اقدامات کررہے ہیں، جن سے نہ صرف مذہبی منافرت میں اضافہ ہورہا ہے، بلکہ ہندوؤں کو اس حوالے سے لام بند کرنے کی بھی کوشش کی جارہی ہے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی سیاسی حقوق کے نام پر وہ تمام اقدامات کررہی ہے یا منصوبوں کو زیر عمل لارہی ہے، جسے اب تک سنگھ پریوار کے دوسرے ادارے، مثلاً وشوہندو پریشد یا ہندومہاسبھا وغیرہ اپنے پروگرام کا حصہ بنائے ہوئے تھے۔ مدھیہ پردیش میں جس طرح وہاں کی بھاجپا حکومت نے ایک بار پھر تحفظ گئو کے نام پر پوری ایک تحریک شروع کررکھی ہے اور اس کے لئے اس نے باضابطہ قانون بنایا ہے، اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کس منظم انداز سے اپنے منصوبے کو آگے بڑھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

تحفظ گئو کا مسئلہ بہت پرانا ہے اور اس موضوع پر ہندومہاسبھا اور وشوہندو پریشد وغیرہ جیسی تنظیمیں پہلے ہی کافی ہنگامہ خیزی کرچکی ہیں اور مذہبی منافرت پھیلانے کیلئے اس موضوع کو کافی اچھالا جاتا رہا ہے، لیکن جب کئی ریاستوں میں گئوکشی کے خلاف قانون بنائے گئے، تو پھر یہ نعرے خود بخود دم توڑنے لگے، لیکن گذشتہ دنوں جس طرح نئی منصوبہ بندی کے تحت اس موضوع کو پھر سے بڑے پیمانے پر اٹھایا گیا ہے اور مدھیہ پردیش میں اس سلسلے میں باضابطہ نہایت ہی سخت قسم کا قانون بنایا گیا ہے، اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستانی تہذیب اور ثقافت کے نام پر مسلمانوں کو ہراساں کرنے کے لئے ایک بار پھر

تمام پرانے فارمولے شروع کر دیئے گئے ہیں۔اس وقت وشو ہندو پریشد، وشو منگلا گئو گریما یاترا کے تحت پورے ملک میں یاتراؤں کا سلسلہ شروع کر کے ہندو آبادی کو یکمشت کرنے کی کوششوں میں لگی ہوئی ہیں۔ دوسری طرف بی جے پی نے پھر زور وشور سے رام مندر بنانے کا راگ الاپنا شروع کر دیا ہے۔اس کے علاوہ آرٹیکل 370 کو ہٹائے جانے اور یونیفارم سول کوڈ نافذ کئے جانے کی تحریک باضابطہ شروع کی گئی ہے، تاکہ ایک خاص سمت میں ذہن سازی کرنے کے لئے ہندو مزاج کو نئے انداز میں تیار کیا جاسکے۔اس وقت کوشش یہ ہے کہ جہاں ایک طرف عام ہندوؤں کو فکری سطح پر ایک پلیٹ فارم پر لایا جائے، وہیں مسلمانوں میں انتشار پیدا کر کے اور ان کے اندر خوف وہراس پیدا کر کے ان کو ناکارہ اور خوف زدہ بنا کر عضو معطل بنا کر رکھ دیا جائے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کی قیادت پر آر ایس ایس کے لوگوں کی گرفتاری کو مضبوط بنایا جائے اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں اپنی فکر کے لوگوں کو دوسری سیاسی پارٹیوں کے انتظامی سطح کے عہدوں تک پہنچایا جائے۔ ہندو آتنک وادیوں کی گرفتاری اور ان سے حاصل شدہ معلومات کے بعد یہ بات بھی بالکل صاف ہوگئی ہے کہ اس فرنٹ پر بھی کس قدر خاموشی اور سنجیدگی سے کام ہوتا رہا ہے اور اب اس کو اور کتنا منظم اور وسیع کیا جارہا ہے۔

آر ایس ایس کو اچھی طرح معلوم ہے کہ تعلیمی اداروں، شہری انتظامی اداروں اور حفاظتی دستوں میں اگر اچھی طرح پیٹھ بن جاتی ہے، تو پھر کام بہت آسان ہوجائے گا اور اسی وجہ سے انہوں نے نہایت منصوبہ بند انداز میں ان اداروں میں اپنے افراد کو کافی بڑی تعداد میں داخل کیا ہے۔ جہاں جہاں ریاستی سطح پر ان کی حکومت قائم ہے، وہاں تو باضابطہ سرکاری طور پر یہ کام انجام دیا گیا ہے اور جہاں ان کی حکومت نہیں ہے، وہاں بھی اس پروجیکٹ پر پوری سنجیدگی سے لوگوں کو لگایا گیا، مرکز میں جس وقت بھاجپا کی حکومت تھی، اسی وقت اس پروجیکٹ پر کام شروع کر دیا گیا تھا اور اسی وجہ سے آج نہایت اہم پوسٹوں پر

ایسے سنگھی مزاج کے لوگ موجود ہیں، جو نچلی سطح پر اپنے ہم مزاج لوگوں کو داخل کرتے رہتے ہیں۔اس وقت جن جن ریاستوں میں بھاجپا کی حکومت قائم ہے، ان تمام ریاستوں میں تعلیمی اداروں کو خاص ہدف بنایا گیا ہے اور بہت تیزی سے نصابی کتابوں میں تحریف کر کے اپنا پسندیدہ موضوع شامل کرایا گیا ہے۔ علاوہ ازیں تعلیمی اداروں میں پرانی ہندوستانی تہذیبی اور حب الوطنی کے نام پر ایک ایسا ماحول تیار کر دیا گیا ہے، جہاں دوسرے مذاہب اور بالخصوص مسلمانوں کے لئے اطمینان سے تعلیم حاصل کرنا ممکن ہی نہیں رہ گیا ہے۔گزشتہ دنوں جس طرح مدھیہ پردیش میں گیتا کی تعلیم کو لازمی بنانے، وندے ماترم اور یوگا وغیرہ کو تمام طلباء کے لئے ضروری قرار دینے کے احکام صادر کئے گئے ہیں، اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ پورے ماحول کو کیا رخ دینے کی کوشش کی جارہی ہے۔

اسی طرح سماجی اور فلاحی کاموں کے نام پر بجرنگ دل، سیوا بھارتی اور وشو ہندو پریشد وغیرہ باضابطہ معاشرے میں یہ فکر پیدا کرنے کے لئے پروگرام کرتی پھر رہی ہیں کہ اگر انہوں نے مسلمانوں سے کاروباری اور دیگر معاشرتی سطح پر تعلق رکھا، تو وہ بالکل پچھڑ کر رہ جائیں گے اور چونکہ مسلمانوں کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے، لہٰذا وہ اپنے ہی ملک میں اقلیت میں آکر مجبور ومقہور ہو کر رہ جائیں گے۔ گجرات اور مدھیہ پردیش ریاستوں سے جو رپورٹیں آرہی ہیں، جہاں بھاجپا 1998 اور 2003 سے باضابطہ اقتدار میں ہے، وہ بہت ہی بھیانک تصویر پیش کرتی ہیں۔ان ریاستوں میں مسلمانوں کو باضابطہ اپنے مخصوص گھیٹو میں سکڑنے اور بند ہوجانے پر مجبور کیا جارہا ہے۔ اسی طرح گجرات، راجستھان، مدھیہ پردیش اور دیگر کئی ریاستوں میں اس وقت شدھی کرن کی تحریک بڑے زور وشور سے چلائی جارہی ہے۔اس سلسلے میں کئی بڑے بڑے میلے لگائے جاچکے ہیں۔ دسمبر 2011 میں اتر پردیش کے شاہجہاں پور میں ایسے ہی ایک شدھی کرن میلے کا انعقاد کیا گیا تھا، جہاں وشو ہندو پریشد کے مطابق تقریباً ڈیڑھ ہزار لوگوں نے اپنا مذہب چھوڑ کر دوبارہ ہندو مذہب

اختیار کرلیا، گذشتہ سال ایسے شدھی کرن میلے ہریانہ اور جھارکھنڈ میں بھی لگائے گئے تھے۔

اب تک ظاہری سطح پر ہی صحیح، لیکن ملک میں دو فکر رکھنے والی سیاسی پارٹیاں پائی جاتی تھیں۔ ایک ہندو احیاء کی فکر رکھنے والی پارٹیاں، دوسری سیکولر کہی جانے والی پارٹیاں، جو فرقہ پرستی پر مخالفانہ رویہ دکھاتی رہتی ہیں۔ اس وقت سنگھ پریوار کو پوری کوشش ہے کہ تمام سیاسی پارٹیوں میں اپنے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دخل کرایا جائے، تاکہ ان کے خلاف ظاہری مخالفت دم توڑ سکے اور یہ بہرحال ایک خطرناک رجحان ہے، لیکن اس پر بھی پوری سنجیدگی سے کام ہو رہا ہے اور سب سے زیادہ اس سلسلے میں کانگریس کو ہی اپنا ہدف بنایا گیا ہے۔ آرایس ایس کا ماسٹر پلان کتنا کامیاب ہوتا ہے، یہ دیکھنے والی بات ہوگی۔

☆☆

ایک اور دہشت گرد شکنجے میں
مگر آج بھی معصوم مسلمان سلاخوں کے پیچھے

● ادارہ

2005 کے بعد اچانک ہندوستان میں خطرناک قسم کے بم دھماکوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ مالیگاؤں، ناندیڑ، اجمیر، حیدرآباد، سمجھوتہ ایکسپریس، جے پور و دہلی وغیرہ میں انتہائی ہلاکت خیز دھماکے کئے گئے، جس میں کافی جانی و مالی نقصان ہوا اور ان تمام بم دھماکوں میں ملک کی تفتیشی ایجنسیوں، پولس انتظامیہ، قومی میڈیا اور فرقہ پرست تنظیموں نے ایک زبان ہوکر ''مسلم دہشت گردوں'' کو موردالزام ٹھہرایا اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری مسلم قوم کو شبہات کے گھیرے میں لاکر کھڑا کردیا۔

حکومت کے اعلیٰ ذمہ داروں سے لے کر تفتیشی ایجنسیوں کے اہلکاروں نے ایک منٹ کے لئے بھی یہ سوچنے کی زحمت گوارہ نہیں کی کہ ان دہشت گردانہ کارروائیوں کے پیچھے کسی اور گروہ یا غیر مسلم تنظیموں کا بھی ہاتھ ہوسکتا ہے اور جن دھماکوں میں خود مسلمانوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے، آخر مسلمان ''تخریب پسندوں'' کا یہ کھیل کیسے ہوسکتا ہے۔ ایسا لگا جیسے بالکل منصوبہ بند طریقے سے مسلمانوں کے خلاف ہلّہ بول دیا گیا اور ان بم دھماکوں کی آڑ میں بڑے پیمانے پر مسلم نوجوانوں کی اذیت ناک گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کردیا گیا۔ باضابطہ خود ساختہ قسم کی مسلم انتہاپسند تنظیمیں گڑھی گئیں اور سیمی وغیرہ جیسی مسلم تنظیموں کے نام سے ان کو جوڑ کر پورے ملک میں مسلمانوں کے خلاف ایک طوفان برپا کردیا گیا۔

مالیگاؤں کے قبرستان اور مسجد میں بم دھماکے ہوئے' اس الزام میں بھی مسلم نوجوان ہی پکڑے گئے۔ اجمیر شریف کی خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ اور حیدرآباد کی مکہ مسجد میں افطار کرتے ہوئے مسلمانوں کو بم دھماکوں کا شکار بنایا گیا' اس میں بھی بڑی تعداد میں مسلمانوں کی گرفتاری کا سلسلہ شروع ہوا۔ پاکستان جاتی ہوئی سمجھوتہ ایکسپریس جس میں بھی بھاری اکثریت میں ہندستانی، پاکستانی مسلمان ہی سوار تھے' اس کو بھی نہایت ہولناک طریقے سے بم دھماکے کا شکار بنایا گیا، اس الزام میں بھی مسلم نوجوانوں کو ہی نشانہ بنایا گیا۔ اس کے ساتھ جہاں کہیں بھی اس قسم کے واقعات ہوئے، ان سب کا بھی الزام مسلم نوجوانوں پر ہی عائد کیا گیا اور بغیر کسی ثبوت اور شواہد کے ان کو نہایت بے دردی سے بڑی تعداد میں داخل زندان کرنے کی کارروائی جاری رکھی گئی۔ برسوں بغیر مقدمہ چلائے ان کو جیل کی کوٹھریوں میں بند کرکے سخت اذیت کا نشانہ بنایا گیا اور پوری قوم میں خوف ودہشت پیدا کرکے ان کو حاشیہ پر لاکر کھڑا کردینے کا کھیل جاری رہا اور آج بھی یہ کھیل جاری ہے۔

یہ سب کچھ اس لئے روا رکھا گیا' کیونکہ یہ بات بالکل ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ ملک میں مسلم نوجوانوں نے دہشت گردی کو اپنا ہتھیار بنالیا ہے اور یہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہندوستان کو تباہ وبرباد کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ جب مسلمانوں کی طرف سے یہ بات کہی گئی کہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ کوئی اور گروہ یہ سب کارروائی کرکے مسلمانوں کو پھنسانے اور ان کو چاروں طرف سے گھیرنے کی کوشش کررہا ہے' تو ایک زبان ہوکر اس خیال کی تردید کی گئی اور کہا گیا کہ مسلمانوں کے سوا اس قسم کی ملک دشمن کارروائی کوئی دوسرا کیسے کرسکتا ہے اور ہندو تو اس قسم کی دہشت گردانہ کارروائیوں میں شریک ہو ہی نہیں سکتے ہیں، کیونکہ کوئی ہندو خود اپنے ہی ملک میں اس قسم کی تباہی وبربادی کیسے پھیلا سکتا ہے۔ گویا یہ ثابت کردیا گیا کہ اس ملک سے اگر کسی کو دشمنی ہوسکتی ہے' تو بس وہ صرف

مسلمان ہی ہوسکتے ہیں' لیکن 2008 میں مالیگاؤں میں ہوئے دوسرے بم دھماکے کی تفتیش شروع ہوئی اور ہیمنت کرکرے جیسے بعض فرض شناس افسروں نے اس میں غیر جانب داری سے کام لیتے ہوئے تفتیش شروع کی' تو پہلے ہی مرحلے میں یہ بات سامنے آگئی کہ ہندو دہشت گردوں کا ایک منظّم گروہ کافی دنوں سے ملک کے مختلف علاقوں میں سرگرم عمل ہے اور وہ آر ایس ایس کے ایک وسیع تر منصوبے کے تحت پورے ملک میں خطرناک قسم کے ہلاکت خیز دھماکے کرتا پھر رہا ہے۔ تفتیش جب ذرا اور آگے بڑھی تو بہت سارے ہندو دہشت گردوں کے چہرے سامنے آگئے اور پورے ثبوت وشواہد کی موجودگی کی وجہ سے ان میں سے دسیوں لوگوں کو گرفتار کرکے ان سے تفتیش کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ پھر تو جو حقیقت سامنے آئی' اس نے ان تمام لوگوں کو حواس باختہ کردیئے' جو اب تک صرف مسلم دہشت گردوں کا راگ الاپ رہے تھے۔ گرفتار شدہ ہندو دہشت گردوں نے خود اعتراف جرم کیا اور انہوں نے نہایت ڈھٹائی سے یہ بات قبول کی کہ وہ مسلمانوں کو سبق سکھانے کیلئے ایک منصوبے کے تحت یہ سب کچھ کررہے تھے' جن لوگوں کو گرفتار کیا گیا' ان میں فوج کے افسران بھی تھے۔ ہندو تنظیموں سے وابستہ ارکان بھی تھے اور سادھو سنت اور پرچارک کہے جانے والے سوامی اسیمانند جیسے بدھی مان بھی تھے۔

یہ بھی ثابت ہوا کہ یہ سبھی لوگ جو گرفتار کئے گئے ہیں اور جو اب تک گرفتار نہیں ہوسکے ہیں، ان سبھی کا تعلق سنگھ پریوار سے بہت قریبی ہے اور آر ایس ایس کے اعلیٰ ذمہ داران ان کے لئے منصوبہ سازی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ یہ بھی ثابت ہوگیا اور ان گرفتار شدگان نے خود قبول کیا کہ چاہے مالیگاؤں کے دونوں دھماکے ہوں یا اجمیر شریف کی درگاہ اور حیدرآباد کی مکہ مسجد یا پھر سمجھوتہ ایکسپریس کے ہلاکت خیز دھماکے' سب انہوں نے ہی انجام دیئے ہیں اور ممکن ہے کہ آنے والے دنوں میں اور بھی دھماکوں سے ان کے جڑے ہونے کی بات ثابت ہوجائے' لیکن آج بھی مسلم نوجوانوں کی گرفتاریوں کا سلسلہ شروع

ہے اور آج بھی یہی مان کر چلا جا رہا ہے کہ دہشت گردی یا تخریب کاری کے کام میں اگر کوئی شامل ہوسکتا ہے، تو یقیناً وہ مسلم نوجوان ہی ہوسکتا ہے۔ بدنیتی اور منصوبہ بندی کا اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جن دھماکوں کا جرم خود ہندو دہشت گردوں نے قبول کرلیا ہے اور سارے ثبوت وشواہد سامنے آچکے ہیں، ان بم دھماکوں کے الزام میں گرفتار کئے گئے بہت سارے مسلم نوجوان آج بھی جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہیں اور کسی کو ان کی بے گناہی کا کوئی احساس نہیں ہے اور جو لوگ عدالت کے فیصلے پر رہا کئے گئے ہیں' ان کو بھی ہراساں کرنے کی کارروائیوں کی خبریں آتی رہتی ہیں۔

مالیگاؤں بم دھماکے کے الزام میں جو لوگ گرفتار کئے گئے تھے، ان سے ملنے والی جانکاری کی روشنی میں ایسے بھی کئی اور لوگ ان بم دھماکوں کے مجرم قرار پائے تھے، جو اب تک گرفت میں نہیں آسکے تھے اور جو مفرور بتائے جارہے تھے، ان کو مرکزی تفتیشی ایجنسی این آئی اے تلاش کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ گذشتہ دنوں اجین اور چترکوٹ سے ان میں سے دو نامزد مفرور مجرموں کو گرفتار کرلیا گیا ہے اور انہوں نے بھی ان بم دھماکوں میں شریک ہونے کا جرم قبول کرلیا ہے۔ ان میں راجندر چودھری نے بہت تفصیل سے یہ بتایا ہے کہ سمجھوتہ ایکسپریس اور دوسرے بم دھماکوں میں اس نے کس طرح اور کس کی رہنمائی میں یہ کارروائی انجام دی تھی۔ اس نے یہ بھی قبول کیا کہ 2006 میں شب برات کی شام مالیگاؤں کے قبرستان کی مسجد میں جو بم دھماکہ کیا گیا تھا اور جس میں 40 افراد مارے گئے تھے اور درجنوں اپاہج ہوگئے تھے' اس میں بھی وہ شریک تھا۔ اسی بم دھماکے کے الزام میں مہاراشٹرا اے ٹی ایس نے بے گناہ مسلم نوجوانوں کو گرفتار کرکے ان کو بے حد اذیت دے کر ان سے اعترافی بیان پر دستخط کرائے تھے۔ 5 سال بعد ان میں سے 7 نوجوانوں کو ضمانت پر رہا تو کیا گیا ہے، لیکن ان پر مقدمہ اب بھی چل رہا ہے۔ 2011 میں آر ایس ایس کے پرچارک سوامی اسیما نند نے گرفتاری کے بعد اپنے اعترافی بیان میں بہت تفصیل سے

مذکورہ بالا اور دیگر بم دھماکوں میں ہندو دہشت گردوں کے ملوث ہونے کی بات قبول کی تھی۔ گذشتہ دنوں اجین سے گرفتار ہونے والے چودھری نے بھی اسیما نند کے اعترافی بیان کی تصدیق کی ہے اور قبول کیا ہے کہ وہ سمجھوتہ ایکسپریس اور مالیگاؤں بم دھماکے میں شریک تھا۔ اس نے یہ بھی قبول کیا ہے کہ دھان سنگھ' رام جی کلسنگرا اور اشونی چوہان بھی مالیگاؤں بم دھماکے میں اس کے شریک کار تھے۔ دھان سنگھ کو بھی گذشتہ دنوں ستنا میں این آئی اے نے گرفتار کرلیا ہے' جس نے 2008 کے مالیگاؤں بم دھماکے میں شامل ہونے کی بات قبول کرلی ہے۔ رام جی کلسنگرا اور امیت عرف اشونی چوہان ابھی بھی گرفت سے باہر ہیں۔ راجندر چودھری نے یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ ان دونوں بم دھماکوں کو انجام دینے کے لئے حیرت انگیز انداز میں قتل کردیئے جانے والے آر ایس ایس پرچارک سنیل جوشی اور سندیپ ڈانگے نے ہر طرح کی مدد فراہم کی تھی۔ یہ بات بھی سامنے آچکی ہے کہ سنیل جوشی کو خود ان کے اپنے ہی گروہ کے لوگوں نے ہی قتل کردیا تھا' کیونکہ ان کی سرگرمیوں کا پولس کو اچھی طرح سے اندازہ ہوگیا تھا اور عام لوگوں میں بھی ان کی مجرمانہ کارروائیوں کا تذکرہ ہونے لگا تھا۔ یہ جتنے بھی بم دھماکے ہوئے ہیں' ان سبھی میں رام جی کلسنگرا اور امیت عرف اشونی چوہان شریک تھا' اس کے بارے میں سبھی گرفتار شدہ دہشت گردوں نے اقبالی بیان دیا ہے۔ ممکن ہے وہ دونوں بھی جلد یا بدیر گرفتار ہوجائیں۔ یہ سب کچھ سامنے آنے کے باوجود معصوم مسلم نوجوان دھماکوں کے الزام میں اب بھی سلاخوں کے پیچھے کیوں ہیں، اس کا کوئی جواب ہمارے سیاسی قائدین، وزیر داخلہ، حکومت کے ذمہ داران، تفتیشی ایجنسیوں کے افسران اور میڈیا کے مبصرین کے پاس کیوں نہیں ہے؟ اس پر اب بھی سوالیہ نشان لگا ہوا ہے۔

☆☆

پھندے میں پھنسے چدمبرم

● ادارہ

ہندوستان کی پولس اور خفیہ ایجنسیاں مسلم دشمنی کا اس طرح شکار رہی ہیں کہ انہوں نے ہمیشہ بغیر ثبوت کے جھوٹی کہانیاں گڑھ کر مسلمانوں اور بالخصوص مسلم نوجوانوں کو متعدد معاملات میں پھنسا کر ان پر مقدمہ چلاتی رہی ہیں۔ آج بھی نہ جانے کتنے مسلم نوجوان پولس اور خفیہ ایجنسیوں کی اس مسلم دشمنی کے شکار بن کر جیل کی سلاخوں کے پیچھے زندگی گزار رہے ہیں۔ اس سلسلے میں یہاں کی مسلم مخالف سیاسی پارٹیاں اور میڈیا بھی خفیہ ایجنسی کے جھوٹ کے پلندے کو مسلمانوں کے گلے کا پھندا بنانے کی پوری کوشش میں مصروف رہتا ہے۔ میڈیا میں ہر روز کوئی نہ کوئی نئی کہانی گڑھی جاتی ہے اور نئے رابطے تلاش کئے جاتے ہیں اور ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ فلاں مسلم نوجوان یا مسلم نوجوانوں کا ایک گروہ، جو دہشت گردانہ کارروائیوں کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے، وہ کس کس طرح کی کارروائیوں میں مبتلا رہا ہے۔ کہاں کہاں سے اس نے تربیت حاصل کی اور کن کن ذرائع سے ان کو فنڈ حاصل ہوتا ہے۔ ہماری خفیہ ایجنسیوں نے بعض مرتبہ تو ایسی ایسی تنظیمیں اپنے ذہن سے تخلیق کرلیں، جن کا نہ پہلے کسی نے نام سنا تھا اور نہ پھر کسی نے نام سنا، لیکن ان کی پوری حرکتوں اور کارروائیوں کی پوری تفصیل ترتیب دے کر پوری کہانی پیش کردی گئی اور میڈیا پر اس کو مشتہر کرنے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ جب یہ عادت، فطرت میں تبدیل ہوجائے، تو اس کا وہی انجام ہوتا ہے، جو پاکستان کو پیش کی گئی 50 موسٹ وانٹیڈ افراد کی

لسٹ کا ہوا پاکستان ویسے بھی ہماری ہر ڈوزیئر اور ثبوت پر مختلف قسم کے سوالات اور اشکالات پیش کرکے ممبئی پر ہونے والی دہشت گردانہ کارروائی کے خاطیوں کو بچانے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ اب اس موسٹ وانٹیڈ لسٹ کے اتنے بے اعتبار ہونے کے بعد تو اس کے حوصلے اور بھی بڑھ جائیں گے اور وہ کسی بھی الزام یا لسٹ کو بے اعتبار قرار دے کر آسانی سے اپنا دامن جھاڑ سکتا ہے اور ہمیں سوائے خاموشی کے کچھ سجھائی نہیں دے گا۔

پھندے میں پھنسے چدمبرم:

اس مسلم دشمنی نے خود سابق وزیر داخلہ چدمبرم کو آج بین الاقوامی سطح پر اپنے ہی پھندے کا شکار بنا دیا ہے۔ یہ معمولی بات نہیں ہے کہ ایک ایسی لسٹ تیار کرکے پاکستان اور پوری عالمی برادری کو پیش کی جائے، جس میں ہندوستان کو اپنی تباہ کن کارروائی سے نقصان پہنچانے والوں کے نام دیئے گئے ہوں اور ان لوگوں کے بارے میں یہ الزام لگایا جارہا ہو کہ ان سبھوں کو پاکستان نے اپنے یہاں پناہ دے رکھی ہے اور یہ تمام لوگ پاکستان کے اشارے اور مدد کے بل بوتے پر ہی ہندوستان میں تباہی مچاتے رہے ہیں، لیکن اس لسٹ میں ایسے لوگوں کا بھی نام موجود ہو، جو اب بھی ہندوستان میں موجود ہیں اور کھلے عام گھوم رہے ہیں، وہ نہ کبھی پاکستان گئے اور نہ ہی پاکستان میں ان کا کسی طرح کا رابطہ ہے۔ وجہ القمر کے واقعہ نے آج پورے ہندوستان کی خفیہ ایجنسیوں وزارت داخلہ، وزارت خارجہ اور عام پولس انتظامیہ کی سنجیدگی اور کام کرنے کی مہارت پر سوال کھڑا کردیا ہے۔ وزیر داخلہ چدمبرم آج کہہ رہے ہیں کہ یہ انسانی خامیاں ہیں اور آئی بی اور لوکل پولس کی غلطی کی وجہ سے موسٹ وانٹیڈ والی لسٹ میں ایک غلط شخص کا نام آگیا ہے۔ یہ نہ معمولی خامی ہے اور نہ ہی ہیومن ایرر کے زمرے میں یہ غلطی آتی ہے۔ یہ تو اس مجرمانہ ذہن کی پیداوار ہے، جس میں جرائم کا نام آتے ہی بے چارے مسلمانوں کی شبیہ ابھر جاتی ہے اور اسے فوراً ماخوذ کرکے کال کوٹھری کے حوالے کردیا جاتا ہے۔

وجیہ القمر 2003 میں ممبئی میں ہونے والے بم دھماکوں کے الزام میں ماخوذ ہے اور اس سلسلے میں اس پر اب بھی مقدمہ چل رہا ہے۔ مقدمے کی نوعیت کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اس مقدمے میں بھی ضمانت پر رہا کر دیا گیا ہے اور تاریخ پڑنے پر عدالت میں حاضری لگاتا ہے۔ تھانے میں رہتا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ چونکہ پولس اس پر عدالت میں الزام ثابت نہیں کر سکی ہے، اس لئے جلد ہی اس کی رہائی کا حکم آجائے گا۔ اس کیس اور اپنی دیگر سابقہ مصروفیات کی وجہ سے وہ نہ صرف ہمیشہ پولس کی نگاہ میں رہتا ہے، بلکہ شہر میں بھی اس کی شخصیت کافی جانی پہچانی ہے۔ اس لئے ہر شخص وجیہ القمر کی اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ وہ یہاں سے کبھی غائب نہیں ہوا۔ کل بھی یہیں تھا اور آج بھی یہیں ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ اس نہایت اہم موسٹ وانٹیڈ لسٹ میں وجیہ القمر کا نام شامل ہو گیا، جس لسٹ میں شامل لوگوں کے بارے میں وزارت داخلہ کا دعویٰ ہے کہ یہ سب لوگ پاکستان میں چھپے بیٹھے ہوئے ہیں اور حکومت پاکستان نے ان کو اسامہ بن لادن کی طرح پناہ دے رکھی ہے۔

لسٹ کے غیر معتبر ہونے کا عالم:

اس نہایت اہم لسٹ، جس کی بنیاد پر حکومت ہند نے پاکستان کے خلاف اپنا دعویٰ دائر کر رکھا ہے، اس کے غیر معتبر ہونے کے اور بھی کئی ثبوت سامنے آئے ہیں۔ صرف وجیہ القمر اور فیروز عبدالرشید خان کا نام اس میں غلطی سے شامل نہیں تھا بلکہ ہماری خفیہ ایجنسیوں کے ہی بعض افراد اور دہشت گردوں کی ''چلت پھرت'' پر نظر رکھنے والے بعض لوگوں نے ایک اور بہت ہی اہم غلطی کی طرف نشاندہی کی ہے۔ اگر اس طرح کی دوچار باتیں اور آگئیں، تو پھر حکومت ہند کے دعوے بین الاقوامی سطح پر کہاں کھڑے ہو پائیں گے، اس پر اب تشویش ہونے لگی ہے۔

رپورٹ کے مطابق خود حفاظتی ایجنسیوں اور خفیہ ایجنسیوں کے لوگوں نے اس پر سوال اٹھائے ہیں کہ پچاس موسٹ وانٹیڈ افراد کی اس لسٹ میں 43 ویں نمبر پر سیمی کے سابق صدر سی اے ایم بشیر کا نام بھی درج ہے۔ کیرالہ کے رہنے والے سی اے ایم بشیر ایرونوٹیکل انجینئر

تھے اور 90 کی دہائی کے وسط میں سیمی کے صدر تھے۔ وہ اس وقت ملنڈ ریلوے اسٹیشن پر دھماکہ کے مجرم کے طور پر پولس کو مطلوب ہیں، لیکن ان کے بارے میں خفیہ ایجنسیوں کو معلوم ہے کہ وہ ملک چھوڑ کر بھاگ چکے ہیں اور اس وقت سعودی عرب میں مقیم ہیں۔ ان کے بارے میں ہماری ایجنسیوں کے پاس کوئی ایسی مصدقہ رپورٹ نہیں ہے کہ وہ پاکستان میں موجود ہیں۔ پولس کے دفتر میں رپورٹ موجود ہے کہ بشیر ملک چھوڑ کر بھاگ چکا ہے اور وہ پہلے سنگاپور میں چھپا رہا اور اب سعودی عرب میں مقیم ہے۔ اتنی تمام تفصیلات کے موجود ہونے کے باوجود آخر کس ذہانت کا ثبوت پیش کرتے ہوئے اس لسٹ میں سی اے ایم بشیر کا نام لکھا گیا، اس پر خود انٹلی جنس کے لوگوں کو بھی حیرت ہے۔

سابق وزیر داخلہ چدمبرم اس کو آئی بی اور پولس انتظامیہ کی غلطی قرار دے رہے ہیں۔ حکومت کے دیگر ارکان اس پر حیرت کے مارے ایک دوسرے کا منہ تک رہے ہیں اور حکمراں جماعت کانگریس کے ترجمان کی صفائی پیش کرتے کرتے اب زبان لڑکھڑانے لگی ہے، لیکن اس سے پورے ملک کے مقدمے کا جو ستیاناس ہوا ہے، اس کا حساب کون دے گا اور اس کا خمیازہ کون بھگتے گا۔ اسامہ کے مارے جانے کے بعد پاکستان پر جارحانہ رخ اختیار کرنے کی جو بات بڑے زور وشور سے شروع کی گئی تھی، ایسا لگتا ہے جیسے، اس ایک بہت بڑی غلطی نے، سارے جذبات کی ہوا نکال کر رکھ دی ہے۔ نئی دنیا بار بار یہ بات کہتا رہا ہے کہ جب تک مسلمانوں پر اعتماد کرنے کے بجائے اسی طرح ان کو غیر معتبر قرار دینے کی کوشش کی جاتی رہے گی، اس وقت تک دہشت گردی کے خلاف ایمانداری سے کوئی جنگ نہیں لڑی جا سکے گی اور کسی جنگ کا بھی امید افزاء نتیجہ سامنے نہیں آسکے گا۔ حکومت کے جھوٹ کو مسلمانوں کے گلے کا پھندہ بنانے والے لوگ خود اپنی کرتوتوں کی وجہ سے آج اس پھندہ کا شکار ہوئے ہیں اور نہ جانے کب تک ہوتے رہیں گے۔

☆☆

دہشت گردی کی آڑ میں بہاری مسلمانوں پر نشانہ

● ادارہ

مسلم اکثریتی آبادی والے ملک کے وہ مقامات، جہاں مسلمان معاشی طور پر کچھ بہتر زندگی گزار رہے ہیں اور جہاں تعلیم وترقی کی طرف رغبت نے بہتر صورت حال پیدا کی ہے، وہ حسب روایت فرقہ پرست شرپسندوں اور ہماری خفیہ ایجنسیوں کے نشانے پر ہیں۔ پہلے فرقہ وارانہ فسادات کے ذریعہ تباہی مچانے کی کوشش کی جاتی تھی، لیکن اب دہشت گردی کے نام پر ہماری تفتیشی ایجنسیاں اور پولس انتظامیہ ان علاقوں کو اس طرح ہراساں کرنے پر تلی ہوئی ہیں کہ لوگ واقعی دہشت زدہ ہوکر اپنے آپ کو بے یار ومددگار اور ہر وقت نشانے کی زد پر سمجھنے لگے ہیں۔ کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ پولس آتی ہے اور دہشت گردی میں ملوث ہونے کا الزام لگا کر کسی نوجوان کو اٹھا کر لے جاتی ہے اور پھر شروع ہوتا ہے اس نوجوان کے اہل خاندان پر گزرنے والی قیامت کا سلسلہ۔ پہلے بھٹکل، مالیگاؤں پھر اعظم گڑھ، جامعہ نگر، بنگال کے مسلم آبادی والے علاقے اور اب خاص نشانہ پر بہار کا دربھنگہ، ان دنوں نام نہاد انڈین مجاہدین کے دربھنگہ ماڈیول کا بڑا زور وشور سے چرچا کیا جارہا ہے۔ آئے دن کسی نہ کسی دربھنگہ کے نوجوان کے گرفتار کئے جانے اور پھر اس کے کسی نامعلوم مقام تک پہنچا دیئے جانے کی خبر اخبارات میں شائع ہوتی ہے اور کوئی یہ بتانے کیلئے تیار نہیں ہوتا کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ ان دنوں دربھنگہ کے ایک گاؤں باڑھ سمائلہ کا تذکرہ زور وشور سے کیا جارہا ہے، جہاں سے کئی مسلم نوجوانوں کو اب تک گرفتار کیا جاچکا ہے۔ حالت یہ ہے کہ ان

دنوں باڑھ سمائلہ میں کوئی گاڑی آکر رکتی ہے، تو لوگ خوف زدہ ہوکر کسی نئی مصیبت کی دستک کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ حالات یہ ہوگئے ہیں کہ لوگوں نے اور بالخصوص نوجوانوں نے یا تو موبائل فون رکھنا ہی چھوڑ دیا ہے یا پھر اپنے موبائل نمبر بدلنے شروع کردیئے ہیں۔ کیونکہ نہ جانے کب ان کے فون پر کوئی مشتبہ کال آئے اور اس کال کی پاداش میں فوراً پولس آکر ان کو اٹھا کر لے جائے۔ دربھنگہ کے کیوٹی بلاک کا چھ ہزار آبادی والا یہ گاؤں اس وقت پورے طور پر اس لئے سہا اور ڈرا ہوا ہے کہ نومبر سے اب تک یہاں کے چار نوجوانوں کی گرفتاری دہشت گردی کے الزام میں ہوچکی ہے اور دسیوں سے باضابطہ تفتیش کی جاچکی ہے، جس طرح حالیہ دنوں میں گاؤں کے دو نوجوانوں اور بالخصوص کفیل اختر کی گرفتاری ہوئی ہے، اس نے علاقے کے مسلمانوں میں سخت سراسیمگی پیدا کردی ہے۔ گاؤں کے ایک بزرگ کے مطابق کفیل اپنی بیوی کے ساتھ اپنے کمرے میں سویا ہوا تھا کہ عام لباس میں ملبوس پولس والے صبح چھ بجے اس کے گھر میں داخل ہوئے اور اسے کھینچتے ہوئے اٹھا کر لے گئے۔ نہ کوئی بات سنی اور نہ کوئی وجہ بتائی۔

کفیل کو کرناٹک اور آندھرا پردیش پولس کی جوائنٹ ٹیم نے گرفتار کیا ہے اور اس پر الزام لگایا ہے کہ یہ چنا سوامی اسٹیڈیم میں ہونے والے بم دھماکے کا مجرم ہے۔ اس کے بعد ہی سعودی عرب سے ایک دوسرے نوجوان کی گرفتاری کی خبر آئی۔ سعودی عرب کے الجبیل سے 13 مئی کو گرفتار کیا گیا ہے اور اس پر الزام لگایا گیا ہے کہ اس کا انڈین مجاہدین سے تعلق ہے۔ باڑھ سمائلہ کے پہلے دو نوجوانوں کی گرفتاری گزشتہ نومبر کی 22 تاریخ کو دہلی سے ہوئی تھی۔ قتیل احمد صدیقی اور گوہر عزیز کو بھی انڈین مجاہدین سے تعلق رکھنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر فیروز احمد پوچھتے ہیں کہ اچانک اس گاؤں کے نوجوان انڈین مجاہدین کے کارکن کیسے ہوگئے، جبکہ یہاں لوگ اس انڈین مجاہدین جیسی کسی تنظیم کے نام سے بھی

واقف نہیں ہیں۔ڈاکٹر فیروز احمد بنی پٹی پرائمری ہیلتھ سینٹر کے انچارج ہیں اور ان کا گھرانہ پورے علاقے میں کافی عزت سے دیکھا جاتا ہے۔وہاں پہنچے اخباروں کے نمائندوں سے بات کرتے ہوئے گاؤں کے لوگ کہتے ہیں کہ پولس کی حالیہ کارروائی نے حالات اتنے خوفناک بنادیئے ہیں کہ اب ہمیں اپنے گاؤں کا نام لیتے ہوئے بھی خوف محسوس ہونے لگا ہے اور نوجوان تو خاص طور پر بہت ہی سہمے ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ کوئی نوجوان اپنا نام بتانے کے لئے تیار نہیں ہوتا کہ کہیں اس کی باری نہ آجائے۔

وزیر اعلیٰ نتیش کمار نے باہر سے آئی ہوئی پولس کے ذریعہ اس قسم کی گرفتاری پر اعتراض جتایا ہے، لیکن اس سے کوئی فرق پڑتا دکھائی نہیں دیتا، کیونکہ ریاستی حکومت نے اب تک اس سلسلے میں کوئی سنجیدہ کارروائی نہیں کی ہے اور گرفتار شدہ نوجوانوں کے اہل خاندان بس یہاں وہاں مدد کی امید میں بھاگتے پھر رہے ہیں۔لوگ کہتے ہیں کہ خوف کا یہ عالم ہے کہ کوئی بھی ان گرفتاریوں پر کچھ بولنے کیلئے تیار نہیں ہے، کیونکہ اسے خوف ہے کہ اگر اس نے کچھ کہا، تو کیا عجب کہ اس کو اس کا شریک کار کہہ کر گرفتار نہ کرلیا جائے۔سعودی عرب سے فصیح احمد کی گرفتاری کے بعد علاقے کے وہ تمام والدین پریشان ہیں، جن کے بچے ملک سے باہر کام کررہے ہیں۔

باڑھ سمائلہ کے لوگوں کی معاشی حالت کچھ بہتر ہے، کیونکہ یہاں کے کافی نوجوان اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ملک سے باہر کام کررہے ہیں اور وہاں سے اپنی کمائی بھیج رہے ہیں۔سرکاری سطح کی سہولیات کافی کم ہے اور اس کا اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہائی اسکول اس گاؤں سے سات کلومیٹر دور کیوٹی میں ہے۔گاؤں کا اپرج روڈ آج بھی نہایت خستہ حالی کا شکار ہے اور گاؤں کے بیشتر لوگ اب بھی کھیتی باڑی پر ہی انحصار کرتے ہیں۔

گرفتار شدہ گوہر کے والد 75 سالہ محمد لقمان ہزاری باغ میں محکمہ زراعت میں ایگزیکیٹو انجینئر تھے۔ان کے مطابق جب وہ ظہر کی نماز کے لئے مسجد گئے ہیں، اس وقت تک سارے

معاملات بالکل نارمل تھے کہ اچانک گوہر کی گرفتاری کی خبر ملی، لیکن جب تک واقعی اس کا جرم ثابت نہیں ہوجاتا، ہم کیسے اس کو مجرم قبول کرلیں؟ محمد لقمان کا ایک لڑکا دبئی کی ایک کمپنی میں پرسنل افسر ہے، دوسرا بیٹا سعودی عرب میں انجینئر ہے اور تیسرا بیٹا امریکا میں سائنٹسٹ ہے۔لقمان کہتے ہیں کہ گوہر میرا سب سے چھوٹا بیٹا ہے۔ وہ سعودی عرب میں کام کررہا تھا، لیکن میری بیماری اور ضعیفی کو دیکھتے ہوئے وہ وہاں سے کام چھوڑ کر میرے ساتھ رہنے آگیا۔ جب میری صحت کچھ ٹھیک ہوگئی، تو وہ دہلی جاکر ایک کنسٹرکشن کمپنی چلانے لگا۔ اچانک اس کو گرفتار کرلیا گیا اور اس پر انڈین مجاہدین سے وابستہ ہونے کا الزام لگادیا گیا۔ گرفتار کئے جانے والے نوجوان میں قتیل سب سے غریب گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے والد محمد ظفر ایک کسان ہیں۔ بیٹے کی اچانک گرفتاری نے اس کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ اگر ان کا بیٹا مجرم ہے، تو اس کو ضرور سزا دی جائے، لیکن اس پر فرد جرم ثابت تو کیا جائے۔کفیل احمد کے والد بھی ایک کسان ہیں اور کفیل احمد ایم اے کرنے کے بعد دربھنگہ کے ایک اسکول میں پڑھا رہا تھا۔

گاؤں کے لوگ کہتے ہیں کہ گزرنے والا یہ ایک مہینہ بہت ہی پریشانی اور خوف ودہشت کے ماحول میں گزرا ہے۔ چند مہینے پہلے پڑوس کے گاؤں بابو سلیم پور سے محمد دلکش رحمان کو دہلی ہائی کورٹ میں ہونے والے بم دھماکے کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔اس سے پہلے قریب کے ایک گاؤں دیورا بندھولی کے محمد تقی اور ندیم اختر کو دہلی سے گرفتار کرلیا گیا تھا اور ان پر بھی انڈین مجاہدین سے تعلق رکھنے اور چنا سوامی اسٹیڈیم، جرمن بیکری پونہ اور جامع مسجد دہلی کے بم دھماکے میں ملوث ہونے کا الزام لگایا گیا تھا۔ یہ ساری گرفتاریاں اس خفیہ انداز سے کی گئی ہیں کہ دربھنگہ زون کے آئی جی سودھانسو کمار بھی کہتے ہیں کہ یہ تو بڑی حیرت کی بات ہے کہ باہری پولس آتی ہے اور مقامی پولس کو مطلع کئے بغیر وہاں کے نوجوانوں کو اٹھا کر لے جاتی ہے اور گرفتاری کے سلسلے میں

ڈسٹرکٹ پولس کو کچھ بتانا بھی ضروری نہیں سمجھتی ہے، لیکن اس قسم کی گرفتاری پر اب مسلمانوں کو کوئی حیرت نہیں ہوتی ہے، کیونکہ یہ اتنے تواتر سے ہو رہی ہیں کہ اب جیسے معمول کی بات لگنے لگی ہے، لیکن اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا' تو پھر حالات کوئی نہایت قبیح منظر بھی پیش کر سکتے ہیں۔ لوگوں کے جذبات کو اس طرح لہولہان کرنا کافی برے نتائج پیدا کر سکتا ہے۔

(بشکریہ نئی دنیا)

☆☆

ہندوستانی ریاستیں، مسلمان اور شکوک وشبہات

● شکیل اختر

ہندوستان میں مسلمان ملک کی سب سے بڑی مذہبی اقلیت ہی نہیں، آبادی کے اعتبار سے انڈیا میں مسلمانوں کی تعداد دنیا میں تیسرے نمبر پر ہے۔ جمہوری ہندوستان میں آئین کی رو سے انہیں مساوی حقوق اور مواقع حاصل ہیں، لیکن ہندوستان کی ریاست، حکومت اور ملک کے مسلمانوں کے درمیان جو اعتماد کا رشتہ قائم ہونا چاہئے تھا وہ قائم نہیں ہوسکا ہے۔

ہندوستان تیزی سے ترقی کے راستے پر گامزن ہے اور مسلمانوں کا ایک طبقہ تیزی سے بدلتے ہوئے ہندوستان میں اپنا مقام حاصل کر رہا ہے، لیکن ساتھ ہی مسلمانوں میں حکومتوں کے تئیں بے اعتمادی کے جذبات بھی نمایاں ہیں۔

مسلم پرسنل لاء بورڈ کے ایک سرکردہ رکن اور ترجمان سید محمد قاسم رسول الیاس کہتے ہیں کہ بے اعتمادی کا یہ عالم تو آزادی کے بعد سے ہی قائم ہے۔ 'مسلمانوں کو حکومتوں سے جو جائز توقعات ہوتی تھیں وہ کبھی پوری نہیں ہوئیں جس کے نتیجے میں بے اعتمادی بڑھی ہے۔ ملک کی تمام سیکولر جماعتوں نے مسلمانوں کو مایوس کیا ہے۔ مسلمان یہ محسوس کر رہے ہیں کہ انہیں اب سیاسی طاقت حاصل کرنی چاہئے۔'

مسلمانوں کو حکومتوں سے جو جائز توقعات ہوتی تھیں وہ کبھی پوری نہیں ہوئیں جس کے نتیجے میں بے اعتمادی بڑھی ہے۔ ملک کی تمام سیکولر جماعتوں نے مسلمانوں کو مایوس کیا ہے۔ مسلمان یہ محسوس کر رہے ہیں کہ انہیں اب سیاسی طاقت حاصل کرنی چاہئے۔

ڈاکٹر عمر خالدی امریکہ کے تعلیمی ادارے ایم آئی ٹی سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے

'مسلمز ان انڈین اکونومی' نامی کتاب لکھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں جو عدم تحفظ اور عدم اعتماد کا احساس ہے اس کا اہم سبب یہ ہے کہ خود حکومت میں مسلمانوں کے متعلق سوچ واضح نہیں ہے سیاست کا بڑا طبقہ ایسا ہے جو مسلمانوں کو اب بھی اجنبی سمجھتا ہے۔ ۶۰/ برس گزرنے کے بعد بھی وہ مسلمانوں کو ہی ملک کی تقسیم کا ذمہ دار سمجھتا ہے۔ مسلم کش فسادات کا ایک لامتناہی سلسلہ رہا ہے جو مسلمانوں کے لیے عدم تحفظ کا شدید مسئلہ بنا رہا ہے۔'

ڈاکٹر خالدی نے ہندوستان میں پولیس اور فوج میں مسلمانوں کی نمائندگی کی بھی تحقیق کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ سیکورٹی فورسز میں بقول ان کے مسلمانوں کی 'دانستہ طور پر کمی' تشویش کا باعث ہے۔

'کچھ تو مسلمانوں کی اپنی تعلیمی پسماندگی اور کچھ تعصب کے سبب فوج پولیس اور خفیہ اداروں میں ان کی نمائندگی بہت کم ہے۔ پندرہ لاکھ کی فوج میں مسلمان صرف ڈیڑھ فی صد ہیں۔'

مشکل یہ ہے کہ ہمارے ملک کے مسلمان، جو مذہبی رہنما کہے جاتے ہیں، سوائے اس طبقے کے اور کسی کی سننے کے لیے تیار نہیں ہے اور علما کا یہ طبقہ یہ چاہتا ہے کہ حکومت وقت مسلمانوں کے لیے سب کچھ کرے اور ان کی شرط پر کرے۔

حالیہ برسوں میں ہندوستان کے مسلمانوں کو اگر کسی ایک واحد مسئلے نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے تو وہ ہے دہشت گردی۔ دہشت گردی کے واقعات کی ذمہ داری عموماً مسلم 'شدت پسندوں' پر ڈالی جاتی ہے۔ مختلف واقعات میں سینکڑوں مسلم نوجوانوں کو گرفتار کیا گیا ہے، لیکن تفتیش کے عمل میں خرابی اور بعض واقعات غلط ثابت ہونے کے سبب ملک کے مسلمان ان خفیہ ایجنسیوں اور پولیس کے بارے میں مکمل طور پر شک وشبہات میں مبتلا ہیں۔ دہشت گردی کے واقعات پر کتاب لکھنے والے مہاراشٹر پولیس کے ایک سابق انسپکٹر جنرل شمس الدین مشرف کا خیال ہے کہ 'دہشت گردی کے سبھی واقعات مسلمانوں کے خلاف خفیہ ایجنسیوں کی سازش ہیں۔'

اقلیتی کمیشن کے سابق چیرمین اور ماہر قانون طاہر محمود کہتے ہیں کہ ملک میں مرکز سمیت ۳۱/ ریاستی اور مقامی حکوتیں ہیں اور مسلمانون کے بارے میں ضروری نہیں ہے کہ ہر حکومت کی سوچ ایک جیسی ہو، لیکن یہ سوچنا کہ ان کے خلاف کوئی سازش کی جا رہی بالکل غلط ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں بے اعتمادی کے لیے صرف حکومت کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ 'مشکل یہ ہے کہ ہمارے ملک کے مسلمان جو مذہبی رہنما کہے جاتے ہیں، سوائے اس طبقے کے اور کسی کی سننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اور علماء کا یہ طبقہ یہ چاہتا ہے کہ حکومت وقت مسلمانوں کے لیے سب کچھ کرے اور ان کی شرط پر کرے۔'

سیاست میں عدم اعتماد کا مسئلہ آزادی کے وقت سے ہی رہا ہے۔

جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے سابق پروفیسر اور اقلیتی امور کے ماہر ڈاکٹر امتیاز احمد کہتے ہیں کہ سیاست میں عدم اعتماد کا مسئلہ آزادی کے وقت سے ہی رہا ہے۔ آزادی کے وقت یہ تصور تھا کہ اگر پاکستان بن گیا تو ملک میں جو حکومت بنے گی وہ ہندوؤں کی ہوگی۔ مسلمانوں نے ہر چیز کو اسی ایک نظریے سے دیکھا۔ 'اس نے حکومت کو ہندو سماج سے الگ کر کے نہیں دیکھا۔ اس کا پورا تصور ہی یہی ہے کہ ہندوستان کی ریاست ایک ہندو ریاست ہے۔'

اس میں دو رائے نہیں کہ ہندوستان کے جمہوری نظام میں بہت سی خامیاں موجود ہیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ملک کے جمہوری نظام میں پختگی آ رہی ہے۔ ہندوستان کا مسلمان جمہوریت کا حامی اس لیے رہا ہے تا کہ اسے بھی ہندوؤں کے مساوی حق حاصل ہو سکیں۔ مبصرین کا کہنا ہے کہ وہ خود اپنے معاشرے میں جمہوریت نہیں لانا چاہتا۔ ریاست اور حکومت سے عدم تحفظ اور عدم اعتماد کا احساس اس وقت جائے گا جب خود مسلمان اپنے معاشرے میں جمہوری احساس کو ابھار سکیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ مسلم معاشرے میں پسماندہ مسلمانوں کے لیے رزرویشن کی مانگ، خواتین کی حالت بہتر کرنے کے لیے تحریکیں اور شادی وطلاق کے سلسلے میں بڑھتی بیداری اسی اندرونی جمہوریت کے آغاز کا اشارہ ہیں۔

☆☆

فسادات کی روک تھام
انسداد فرقہ وارانہ تشدد بل ضروری

● ادارہ

ہندوستان کی آزادی کو 65 سال ہو رہے ہیں، اس عرصہ میں ہمارے ملک نے ہر میدان میں بے پناہ ترقی کی ہے۔ یہ ہم سب کے لئے خوشی کا مقام ہے۔ آج ہندوستان کا جمہوری نظام دنیا میں ایک مثال ہے، ہندوستان کی تاریخ کے اوراق کو اگر پلٹا جائے تو یہاں کی خوبیوں میں سیکولرزم اور بھائی چارہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہاں کی گنگا جمنی تہذیب جس کا اہم رول آپسی میل وملاپ ہے یہاں کی مٹی کے ذرات میں دیکھا جا سکتا ہے، لیکن اس پیارے ہندوستان میں فرقہ پرستی اور تعصب کے بیج کچھ مٹھی بھر لوگ بو دیتے ہیں جو کہ ملک اور عوام دونوں کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتا ہے، اور اس پرامن ماحول میں پراگندگی اور تفرقہ اندازی جنم لے لیتی ہے جس کے نتیجے میں فسادات بھڑک اٹھتے ہیں۔

دو فرقوں میں معمولی کہاسنی سے بات شروع ہوتی ہے اور پھر ایک جوالا مکھی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ نتیجے میں ظلم وزیادتی کا وہ برہنہ رقص ہوتا ہے کہ انسانیت سرنگوں ہو جاتی ہے اور اس سے متاثر لوگ رحم کی بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔ ایسے میں انسانیت لاچار اور مجبور دکھائی دیتی ہے۔ انسانی زندگی کی بربادی کے ساتھ فسادات ایسے زخم چھوڑ جاتے ہیں جو کبھی نہیں بھرتے اور چھوڑ جاتے ہیں کچھ ان سلجھے سوالات۔ یہ عمل صرف اقلیتوں کے لئے ہی نہیں بلکہ عوام اور ملک سبھی کے لئے نقصان دہ ہے۔ ہندوستان میں فسادات رک گئے

تھے اور چونکہ یہ صدی تعلیم کے فروغ کی صدی کے نام سے جانی جا رہی ہے اور دنیا نے ترقی کی نئی منزلیں طے کی ہیں۔ ابھی چند روز قبل ناسا کے ’کیوروسٹی‘ روور نے مریخ پر پہنچ کر وہاں کی تصویریں بھیج دی ہیں جو آج موضوع گفتگو ہے۔ آج کے دور کا انسان ترقی کی ان بلندیوں پر ہے جس کا کبھی تصور بھی نہیں تھا۔

ایسے میں جب فسادات کی خبر ملتی ہے چاہے آسام ہو، یوپی یا راجستھان ہو تو کہیں نہ کہیں یہ سوال اٹھتا ہے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ اور کیوں ہو رہا ہے؟ کس کی غلطی اور کمزوری ہے اور اسے کیسے روکا جا سکتا ہے؟ بار بار یہ سوال اٹھتا رہا ہے کہ فسادات کو روکنے کے لئے موثر قانون کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں کئی بار کوششیں بھی ہوئیں۔ بل بھی پارلیمنٹ میں پیش ہوا، لیکن ایکٹ نہیں بن سکا۔ مسلم تنظیمیں بھی سرگرم رہیں اور چاہتی رہیں کہ قانون بن جائے۔ تقریباً سبھی جماعتیں بشمول جمعیۃ علماء ہند اور آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت بھی چاہتی ہیں کہ فسادات کو روکنے کے لئے ایسا قانون بنے جس سے فسادات رکیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی زمین پر فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ابھی ہوئے آسام کے فساد پر وزیر اعظم نے بھی اسے بدنما داغ کہا۔ اب ایسی صورت میں اگر انسداد فرقہ وارانہ تشدد بل پارلیمنٹ سے پاس ہو کر قانون کی شکل لے لے تو فسادات پر یقیناً قدغن لگے گا۔ مسلم تنظیموں کی مانگ ہمیشہ سے رہی ہے کہ انتظامیہ کو چست ودرست بنایا جائے۔ اس کے لئے انتظامیہ کو ذمہ دار بنانا ضروری ہے اور جو مانگیں ہیں ان میں فساد ہونے کی صورت میں معاوضہ کی رقم سب کی برابر ہونی چاہئے۔ ریلیف کی مہم رسانی میں کسی بھی طبقہ کے ساتھ امتیاز نہ ہو۔ قصورواروں پر سخت قانونی کارروائی ہو۔ گرفتاریوں کے سلسلہ میں اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ بے قصور اس کی زد میں نہ آئیں۔ فساد زدہ لوگوں کو جلد از جلد دوبارہ بسایا جائے۔ اس کے ساتھ ہی اس بات کا مطالبہ بھی ملی تنظیموں اور دانشوروں کی طرف سے وقتاً فوقتاً سامنے آتا رہا ہے کہ پولس اور پی اے سی میں اقلیتی فرقہ کو نمائندگی آبادی کے تناسب سے دی جائے۔ حال میں

ہوئے یو پی کے الیکشن میں سماج وادی پارٹی نے 18 فیصد ریزرویشن کی بات مسلم اقلیت کے لئے کی ہے۔اب یو پی میں سماج وادی پارٹی کی حکومت بننے کے بعد مختلف مسلم تنظیموں کی طرف سے یہ مطالبہ شروع ہوگیا ہے کہ اگر یو پی پولس اور پی اے سی میں سماج وادی پارٹی کی حکومت مسلم نمائندگی بڑھا کر 18 فیصد کردے تو فسادات میں کافی حد تک کمی آئے گی اور دوسرے صوبوں کے لئے ایک نظیر بھی بنے گی۔

حکومت کسی بھی پارٹی کی ہو فرقہ وارانہ فسادات ملک اور ملک میں رہنے والے عوام بالخصوص اقلیتی طبقہ کے لئے ایک بڑا مسئلہ ہیں۔ان کو رکنا چاہئے، اس میں حکومت کے ساتھ عوام کو بھی آگے آنا ہوگا۔کوئی بھی مذہب فساد کی تعلیم نہیں دیتا، کہیں بھی فساد ہو جائے گجرات ہو، آسام ہو، یو پی ہو، راجستھان ہو یا کہیں اور سب ہندوستان ہے اور اس میں جن کے جان و مال کا نقصان ہوتا ہے وہ ہندوستانی ہیں، انسان ہیں۔کسی انسان کو دوسرے انسان کی جان لینے کا حق نہیں ہے، آزادی کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ ہمارے ملک کو آزادی بڑی قربانیوں سے ملی ہے۔سب نے مل کر آزادی کی لڑائی لڑی ہے۔اس میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی اور دوسرے سبھی مذاہب کے لوگ تھے۔جس اخوت اور اتحاد کی طاقت سے ملک آزاد ہوا وہ اب بھی برقرار رہنا چاہئے۔ یہاں آئین کی رو سے سبھی کو برابری کا حق حاصل ہے۔تبھی تو ہم کہتے ہیں کہ

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

☆☆

انسداد فرقہ وارانہ تشدد بل بے سود؟

● وصی احمد نعمانی

انسدا فرقہ وارانہ اور نشان زد تشدد (انصاف تک رسائی اور باز آبادکاری) بل 2011 میں بین الاقوامی اور ہندوستانی، بہت سے قوانین کا ساتھ لیا گیا ہے اور اس بات کی یقین دہانی کرائی گئی ہے کہ فرقہ وارانہ فساد بل کے ذریعہ پوری طرح کنٹرول کیا جا سکتا ہے اور فساد کے نتیجہ میں ہونے والے جانی و مالی نقصان کی تلافی کی جا سکتی ہے، مگر اس سے جو نتیجہ حاصل ہونے کی امید لگا رکھی ہے وہ صرف ایک وہم و گمان کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔خدا کرے میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہو اور یہ بل قانون کی شکل لے کر اپنے پورے آب وتاب کے ساتھ ملک کی سلامتی، بھائی چارہ، مذہبی غیر جانبداری کے جذبات کو فروغ دینے میں کامیاب ہو (آمین) اور یہی بل کا اہم مقصد بھی ہے۔

اس بل کے صرف سات دفعات ہی اگر نیک نیتی سے لاگو کر دیے جائیں تو مقاصد کا خاطر خواہ حصہ پورا کر لیا جا سکتا ہے۔ان سات دفعات میں سے الگ الگ پیرایہ میں کچھ کا ذکر کرنے کی کوشش کریں گے۔مثال کے طور پر ’’قومی اتھارٹی‘‘ کی تشکیل، کمانڈ کرنے والے حکام کی ذمہ داری کا تعین، تفتیشی کمیٹی کو مجرمین کے خلاف رپورٹ درج کرانے کی ہدایت جاری کرنے کا اختیار، کیمپوں میں جا کر پولس حکام کے ذریعہ ایف آئی آر درج کرنے، مظلومین کا بیان درج کرنے، کیمپ میں ہی مظلومین کا ڈاکٹری معائنہ کرانے، متفق نہ ہونے پر مدعی کو اس بات کا اختیار دینا کہ وہ خود تحریری طور پر ’’قومی اتھارٹی‘‘ کو حالات کی

اطلاع دے، اور اس پر رپورٹ کی طرح ہی کارروائی وغیرہ کرنے کی دفعات نے اس بل کو زیادہ وسیع، بااختیار اور باوقار بنا دیا ہے۔ ہم عام شہریوں کی جانکاری کے لیے چند دفعات اور بل کے چند مضامین کا تذکرہ کرنا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔ مثال کے طور پر 'دفعہ 2' کے حساب سے کوئی شخص ہندوستان کے کسی قانون بشمول موجودہ بل کے خلاف کوئی جرم کرتا ہے اور چاہے وہ جرم ہندوستان کے باہر رہ کر ہی کیوں نہ کیا گیا ہو، اس کی سماعت اس شخص کے خلاف ہندوستان ہی میں اسی طرح ہوگی گویا کہ اس شخص نے ہندوستان کے باہر نہیں بلکہ ہندوستان کے اندر رہ کر مخصوص جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ اسی طرح کسی تنظیم کی اگر ہندوستان کے باہر رہ کر کوئی آدمی مدد کرتا ہے، یا وہاں سے ٹیلی فون، گروپ یا 'ٹولی' کی مدد کرکے کوئی جرم کرتا ہے، تو اس کے خلاف ہندوستان میں مقدمہ چلے گا۔ اس کے ہندوستان آنے کا انتظار نہیں کیا جائے گا۔ اس بل کو قانون کی شکل لیتے ہی ایک سال کے اندر لاگو کر دیا جائے گا تاکہ اصل مقصد فوت نہ ہونے پائے۔

اس بل میں دفعہ 2(c) میں Communal and Targeted Violence یا 'فرقہ وارانہ نشان زد تشدد' کی شمولیت نے، مخصوص قسم کے جرم اور مجرم کا محاصرہ کیا ہے، جس کا مطلب خاص گروپ، طبقہ، علاقہ کے خلاف اچانک یا لگاتار کوئی عمل منصوبہ بند ہو، یا کسی شخص یا اس کی ملکیت کو مجروح کرنے یا نقصان پہنچانے کی غرض سے تشدد کیا گیا ہو، یا کسی آدمی کو دانستہ طور پر ایسی ہدایت دی گئی ہو جس سے ملک کے سیکولر تانے بانے کو نقصان پہنچے، اسے 'نشان زد' یا 'ٹارگیٹیڈ تشدد' سمجھا جائے گا۔ دفعہ 2(e) میں 'گروپ' کی تعریف کی گئی ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ اس گروپ سے مراد مذہبی، لسانی گروپ لیا جائے گا۔ اس کی تعریف میں ہندوستان کے دستور کے آرٹیکل 366 کے ذیلی کلاز 24، 25 میں مذکورہ شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب بھی شامل سمجھے جائیں گے۔ اس طرح مذہبی، لسانی اقلیت کے دائرہ کو وسیع کرکے ایس سی اور ایس ٹی کو بھی اس بل کا فائدہ پہنچانے

کا منصوبہ ہے۔ یوں بل کی افادیت بڑھا کر اسے کافی پھیلا دیا گیا ہے۔

اسی طرح دفعہ 2(f) کسی گروپ کے خلاف مکدر فضا (Hostile Environment Against a Group) پیدا کرنے کو بھی جرم کے طور پر لیا گیا ہے، اور مکدر فضا کی حد بندی کے ساتھ تعریف کی گئی ہے، یعنی اگر 'مجوزہ' گروپ کے خلاف ایسی فضا یا ایسا ماحول پیدا کر دیا جائے، جس سے وہ گروپ یا اس کا کوئی آدمی مجبور ہو کر، اپنا گھر بار چھوڑ کر جہاں وہ عام بود و باش رکھتا ہے، کہیں اور پناہ کی غرض سے یا حفاظت کے لیے چلا جائے، جس کی وجہ سے وہ اپنی روزی روٹی سے بے دخل ہو جائے یا کوئی ایسا عمل اس گروپ یا اس گروپ کے کسی آدمی کے خلاف کرے جو بظاہر جرم تو نہ ہو لیکن ایسے عمل کا مقصد اسے خوفزدہ کرنا ہو، یا ناموافق فضا پیدا کرنا ہو، تو یہ سمجھا جائے گا کہ ''ہوسٹائل ماحول'' یا مکدر فضا پیدا کی جا رہی ہے۔ اسی طرح اگر اس گروپ کے خلاف ''کاروباری بائیکاٹ'' کیا جاتا ہے، یا ایسی حالت پیدا کی جاتی ہے جس سے وہ اپنی روزی روٹی کو بحال نہیں کر پاتا ہے، یا کسی طرح کی توہین کی جاتی ہے، تعلیم یا صحت سے متعلق یا کسی طرح کی نقل و حمل، یا عوامی خدمات کا بائیکاٹ کیا جاتا ہے یا اس کی کسی طرح کی تضحیک کرتا ہے یا اس کو کسی بھی بنیادی حق سے محروم کرنے کی دھمکی دی جاتی ہے، تو یہ سب کے سب جرم کے دائرے میں آتے ہیں اور اب اس بل کے مطابق مجرمین کو سزا دی جائے گی۔ اسی طرح گروپ کے کسی بھی فرد کو جسمانی، ذہنی، نفسیاتی، مالی نقصان پہنچایا گیا ہے، یہاں تک کہ اگر ان کے کسی رشتہ دار کو بھی اس نیت سے نقصان پہنچایا گیا ہے کہ جس سے گروپ کی تضحیک، حوصلہ شکنی، بے عزتی وغیرہ ہو، تو یہ سب عمل جرم کے خانے میں آتے ہیں اور ایسے شخص یا گروپ کو victim یا مظلوم مانا جائے گا، اور قانون اپنا عمل پورا کرکے ضابطہ کے مطابق اس ایکٹ کے تحت سزا دی جائے گی۔

دنگا فساد میں عام طور پر عورتوں اور بچوں کے ساتھ ''صنفی'' یا sexualassault

ہوتا ہے۔ ایسے ناپسندیدہ عمل کو اس بل میں شامل کر کے جرم کے خانہ میں رکھا گیا ہے، یعنی اگر کوئی آدمی کسی ایسے فرد کے خلاف کوئی مندرجہ ذیل جرم کرتا ہے جو اس مخصوص مذہبی، لسانی اقلیتی گروپ کا فرد ہے، تو وہ شخص ''جنسی جرم'' کا مرتکب ہوگا جیسے زنا، اجتماعی زنا یا اس شخص کی مرضی کے خلاف جسم کا کوئی حصہ بشمول اعضاء رئیسہ کو کھولنے کے لیے مجبور کرنا، کوئی چیز شرم گاہ، منھ، مقعد وغیرہ میں کسی حد تک داخل کرنا، اس کے اعضاء رئیسہ کو کسی بھی حد تک نقصان پہنچانا، اس کے جسم کے کپڑوں کو پورا یا کم سے کم بھی ہٹانا یا بے لباس ہونے کے لیے مجبور کرنا، عوام میں یا کسی بھی جگہ بے لباس ہوکر پریڈ کرنے کے لیے کہنا وغیرہ، یہ سب اہم جرم ہیں جس کی سزا سخت سے سخت تجویز ہے۔ اس طرح کے واقعات لگ بھگ ہر چھوٹے بڑے دنگوں میں دیکھنے اور سننے کو ملتے رہے ہیں اور ان تمام جرائم کی دیدہ و دانستہ پردہ پوشی کردی جاتی تھی، لیکن اب یہ ممکن نہیں ہوگا۔

اس بل کو قانون بنا کر نہایت مؤثر طریقے سے لاگو کرنے کے لیے ایک نہایت طاقتور ادارہ کا قیام کرنے کی بات کہی گئی ہے اور اس ادارہ کو کافی اختیارات دیے گئے ہیں، بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ خود مختار اداروں کی طرح ہی اس کے مراتب طے کیے گئے ہیں۔ اس کی تشکیل کے طریقے اور مجوزہ اختیارات کو غور سے پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ سپریم کورٹ، ہائی کورٹ، الیکشن کمیشن جیسے خود مختار اداروں کی طرز پر اس کی تشکیل کا منصوبہ ہے۔ اس ادارہ کا نام ہوگا National Authority for Communal Harmony, Justice and Reparation یا شارٹ میں ''قومی اتھارٹی'' کہہ سکتے ہیں۔ اس کی تشکیل کے طریقے اور افراد کی شمولیت کی طرز سے لگتا ہے کہ اسے کافی اہمیت حاصل ہوگی اور یہ ادارہ خاطر خواہ نتائج برآمد کر کے ہندوستان کے سیکولر کردار کو بچانے میں کامیاب ہوگا۔

قومی اتھارٹی کی تشکیل:

اس اتھارٹی میں ایک چیئرمین، ایک وائس چیئرمین اور پانچ عدد دیگر ممبران ہوں گے، مگر اس میں لازم ہوگا کہ کم سے کم چار ممبران بشمول چیئرمین، وائس چیئرمین کا تعلق اس گروپ سے ہوگا جو مذہبی، لسانی اقلیت سے تعلق رکھتے ہوں۔ اسی طرح بے حد اہم بات یہ ہے کہ ہمیشہ اور ہر حالت میں چار خواتین بشمول چیئرمین، وائس چیئرمین ہوں گی۔ ایک ممبر ہر حال میں شیڈولڈ کاسٹ یا شیڈولڈ ٹرائب سے ہوگا بشرطیکہ ہمیشہ صرف دو ممبران بشمول چیئرمین، وائس چیئرمین ریٹائرڈ پبلک سرونٹ ہوں گے۔ اس تشکیل کے طریقہ پر بہت سارے شبہات پیدا ہوتے ہیں جس سے اس تشکیل کا اصلی مقصد فوت ہونے کا خدشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ فی الحال اس پر بحث کا موقع نہیں ہے، مگر بات اہم ہے۔ چلئے اس کا ذکر بعد میں کریں گے۔

قومی اتھارٹی کے ممبران کی تقرری:

صدرِ جمہوریہ وارنٹ کے ذریعہ، جیسے سپریم کورٹ، ہائی کورٹ کے ججوں، الیکشن کمیشن کے ممبران کا تقرر کرتے ہیں، اسی طرح ان کا بھی تقرر ہوگا۔ مگر ہر ایک ممبر یا چیئرمین، وائس چیئرمین کی تقرری کے لیے سفارش ایک کمیٹی کرے گی۔ اس کمیٹی کی تشکیل میں کافی شفافیت لگتی ہے۔ اس لیے امید ہے کہ ''قومی اتھارٹی'' کی تشکیل بھی نہایت شفافیت سے ہو سکے گی۔ اس لیے کارکردگی میں بھی کافی ستھراپن ہوسکتا ہے۔

تقرری کمیٹی:

اس کمیٹی میں وزیر اعظم چیئرمین ہوں گے، لوک سبھا میں حزب اختلاف کے لیڈر، وزیر داخلہ، لوک سبھا میں تسلیم شدہ سیاسی جماعتوں کے لیڈران، ممبران ہوں گے۔ قومی اتھارٹی کے ممبران کی تقرری چھ سال کے لیے ہوگی۔

اس بل کی دفعہ 25 کے تحت چیئر مین، وائس چیئر مین، ممبران کو صرف صدر جمہوریہ ہی ان کے عہدہ سے ہٹا سکتا ہے، بشرطیکہ صدر جمہوریہ نے ریفرنس کے ذریعہ سپریم کورٹ سے مشورہ طلب کیا ہو اور سپریم کورٹ ثبوت و دستاویز کی بنیاد پر ممبران یا چیئر مین یا وائس چیئر مین کو غلطیوں کا مرتکب مانتی ہے۔ اس طرح ان سب کا عہدہ نہایت معتبر اور باوقار و خود مختار ہے۔ اس لیے بغیر کسی دباؤ اور اثر کے ''قومی اتھارٹی'' کو کام کرنے کا موقع مل سکتا ہے، مگر حالات، سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے ججوں کے خلاف بھی ہوتے رہے ہیں، ان کے خلاف الزامات عائد ہوتے رہے ہیں، یہاں تک کہ سپریم کورٹ کے جج کو استعفیٰ تک دینا پڑا ہے۔ اس لیے تقرری میں شفافیت اور ان کو عہدوں سے ہٹانے کے سخت ضابطہ کے ساتھ کارکردگی کے لیے نہایت نیک نیتی کی ضرورت ہے جو صرف وقت پر ہی پرکھی جا سکتی ہے۔ ابھی تو صرف بل پاس ہونے کا مرحلہ ہی ہے۔

''قومی اتھارٹی'' کے فرائض:

فرقہ وارانہ فساد یا نشان زد تشدد کو روکنا، تشدد پھوٹنے، بڑھنے، بھڑکنے یا بھڑکانے کے اقدام کو روکنا، منصوبہ بند، نشان زد یا منظّم فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام کرنا، ریلیف، بازآبادکاری، نقصان کی تلافی کرنا، اس ایکٹ کے ضوابط کے پیش نظر، رسائی برائے انصاف کے مقاصد کو حاصل کرنا، اور یہ سب کچھ بے لوث ہو کر کرنا ہوگا۔

خود بخود جرائم کی تفتیش کرنا، پبلک سرونٹ کی جانب سے فرقہ وارانہ تشدد کی روک تھام میں تساہلی یا کوتاہی کرنا، عدم دلچسپی کا اظہار کرنا، ان سب کے خلاف خود کارروائی کرنا قومی اتھارٹی کا فرض ہے۔

اسی طرح خود بخود اطلاعات حاصل کرنا، صوبائی اتھارٹی کے فیصلوں کے خلاف اپیلوں کی سماعت کرنا، مضروب، مہلوک کی لسٹوں کا ریکارڈ تیار کرنا، فساد دوبارہ نہ پھوٹے،

سازش کار کامیاب نہ ہوں، پھر سے کوئی ٹارگیٹ نہ بنایا جائے، ان سب پر مستقل نگاہ رکھنا اور رپورٹ سہ ماہی کم سے کم تیار کرنا۔

صوبائی ریلیف کیمپوں میں جانا اور حالات کا جائزہ لینا، عدالتوں کی سماعتوں کی نگرانی کرنا، فرقہ وارانہ فسادات میں یا ٹارگیٹ بنائے گئے لوگوں کی بنیاد پر چاہے تمام مقدموں یا ضرورت کے مطابق مقدموں میں فریق بن کر مظلومین کے لیے انصاف حاصل کرنا - اگر صوبائی اتھارٹی کی تفتیش سے مطمئن نہیں ہے تو یہ ''قومی اتھارٹی'' کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ خود تفتیش کرے اور مجرم کو سزا دینے کے لیے اقدام کرے۔

قومی اتھارٹی کے اہم اختیارات:

فرائض کے ساتھ قومی اتھارٹی کو بے پناہ اختیارات حاصل ہیں۔ مجوزہ بل 2011 ''رسائی برائے انصاف'' کے تحت مندرجہ ذیل اختیارات حاصل ہوں گے جس سے استعمال سے بل کے مقاصد کے حصول میں کامیابی کے دروازے کھلنے کی امید ہے:

(1) قومی اتھارٹی اپنے اختیارات کے تحت مرکزی وصوبائی حکومتوں سے یا یونین ٹیری ٹوری سے یا کسی بھی افسر یا حاکم یا شعبہ سے مطلوبہ اطلاع حاصل کرے گی۔

(2) کسی بھی فرد، حاکم، افسر، عملہ کو کسی بھی تفتیش کے لیے کسی خاص مدت کے لیے تقرر کرے گی۔

(3) کسی بھی صوبائی اتھارٹی کو ہدایت جاری کر کے کسی بھی تفتیش کے بارے میں اطلاع حاصل کرے گی بشرطیکہ مرکزی اتھارٹی کے ذریعہ جاری کسی بھی حکم نامہ کی پابندی صوبائی اتھارٹی کے لیے ضروری ہوگی۔

(4) 33(2) کے تحت قومی اتھارٹی کو ملے اختیارات کے پیش نظر سمن جاری کرنا، دستاویز طلب کرنا، اطلاع اور گواہی حاصل کرنا شامل ہے، اگر چہ یہ عام سوال عدالتوں جیسے

اختیارات ہیں مگر 33(1) کے تحت ان اختیارات میں مضبوطی ملتی ہے۔

(5) اگر مرکزی اتھارٹی صوبائی اتھارٹی کی کسی تفتیش سے مطمئن نہیں ہے تو خود اپنی تفتیش کرے گی، ایسا کرنا اس کے فرائض اور اختیارات دونوں میں شامل ہے۔

(6) اگر قومی اتھارٹی رپورٹ کی بنیاد پر اس نتیجہ پر پہنچتی ہے کہ اسے ثبوت کے ساتھ یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ کسی پبلک سرونٹ نے اس ایکٹ کی کسی دفعہ کے خلاف تساہلی، طرفداری، بے توجہی، تعاون بے جا، یا کسی طرح سے بھی اپنے فرض منصبی کے خلاف کام کیا ہے، تو قومی اتھارٹی ایسے پبلک سرونٹس کے خلاف کارروائی کی شروعات کرے گی، یہاں تک کہ سپریم کورٹ، ہائی کورٹ سے رجوع کرے گی کہ ایسے نااہل اور فرض ناشناس پبلک سرونٹس کے خلاف ضروری قانونی کارروائی کی جائے اور ایک ماہ کے اندر متعلقہ حکومت کو ایسے پبلک سرونٹس کے خلاف رپورٹ پیش کردے اور تفتیش کی ایک نقل مدعی کو بھی دے دے گی وغیرہ وغیرہ۔ مگر یہ سب بے سود ہوگا اگر قانون بننے کے بعد اس کی تمام دفعات کو ان کے صحیح تناظر میں لاگو نہیں کیا جاتا ہے۔

☆☆

انسداد فرقہ وارانہ بل
نظر ثانی مسودہ بھی خامیوں سے پاک نہیں

● عبدالباری مسعود

گرچہ سونیا گاندھی کی زیر قیادت قومی مشاورتی کونسل یا این اے سی نے متعدد حلقوں کی طرف سے سخت اعتراضات کے بعد فرقہ وارانہ تشدد کے متعلق مجوزہ خصوصی قانون کے مسودہ سے اقلیتوں کے خلاف منظّم اور منصوبہ بند تشدد کو ’ملک کے سیکولر تانے بانے کو تباہ کرنے‘ (destroys the secular fabric) کی تعریف سے مشروط کرنے والی شق کو حذف کر دیا ہے، تاہم اب بھی اس نظر ثانی شدہ مسودہ سے سول سوسائٹی کی تنظیمیں اور اقلیتیں، بالخصوص مسلمان مطمئن نہیں ہیں۔ ان کی یہ مدلل رائے ہے کہ اس سے وہ مقصد ہی فوت ہو جائے گا جس کے لیے یہ قانون وضع کیا جا رہا ہے، کیونکہ اس میں کئی ایسی قابل تشویش دفعات ہیں جو بل کی منشاء کے عین مغائر ہے۔ بہرحال، یہ خوش آئند بات ہے کہ فرقہ پرست قوتوں کے دباؤ کے باوجود بل میں ’اقلیت‘ کی تعریف کو جوں کا توں برقرار رکھا گیا ہے۔

کونسل نے مجوزہ قانون کے مسودہ یا Prevention of Communal and Targeted Violence (Access to Justice and Reparations) Bill,2011 کو حتمی شکل دے دی ہے، مگر نظر ثانی شدہ مسودہ میں صرف 49 تبدیلیاں کی گئیں۔ بتایا جاتا ہے کہ ورکنگ گروپ میں اقلیتی گروہ کی تعریف

کے سوال پر طویل بحث ہوئی اور یہ طے پایا کہ اس تعریف کو بل کا جز بنا رہنا چاہیے۔ اس بارے میں ہر رکن کا یہ احساس تھا کہ اخلاقی و استدلالی بنیاد پر اس بل کا مرکزی محور اقلیتیں ہی ہونا چاہیے، کیونکہ وہی اصل میں محکمہ جاتی تعصب کا نشانہ بنتی ہیں۔ بہر حال بعض ارکان نے متنبہ کیا کہ اقلیت کی یہ تعریف سیاسی مشکلات کا باعث بن سکتی ہیں اور بل پارلیمنٹ میں پاس کرانے میں مشکل پیش آسکتی ہے۔ باور کیا جاتا ہے کہ سونیا گاندھی نے بھی اس کے حق میں رائے دی۔

فرح نقوی نے جو ورکنگ گروپ کی سربراہ ہیں، بتایا کہ مسودہ کے اصل نکات کو برقرار رکھتے ہوئے کونسل نے مجوزہ بل میں 49 ترمیمات کرنے پر اتفاق کیا ہے۔ اس میں ملک کے وفاقی ڈھانچہ کو متاثر کرنے والی دفعہ کا ہٹایا جانا بھی شامل ہے۔ واضح رہے کہ مشاورتی کونسل کے ورکنگ گروپ برائے کمیونل وائلنس بل نے جولائی 2010 میں اس موضوع پر مسودہ تیار کرنے کے لیے ایک ایڈوائزری گروپ اور ڈرافٹنگ کمیٹی تشکیل دی تھی۔ اس سے قبل مئی 2010 میں سول سوسائٹی کے ارکان نے اس وقت کے مرکزی وزیر قانون ویرپا موئلی کو اس مجوزہ قانون کا ایک خاکہ پیش کیا تھا۔

مذہبی اقلیتوں کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے خصوصی قانون سازی کی مہم سول سوسائٹی گروپس نے چلائی تھی، اس کے نتیجہ میں یو پی اے کی اولین حکومت نے 2005 میں کمیونل وائلنس بل پارلیمنٹ میں پیش کیا تھا، مگر اسے سول سوسائٹی نے یکسر مسترد کر دیا تھا، کیونکہ یہ الٹے مظلوموں کو ہی تختہ مشق بنانے والا تھا۔ مسودہ کی تیاری کے سلسلہ میں قومی سطح پر دو مشاورتی اجلاس منعقد کیے گئے تھے جن میں فرقہ وارانہ تشدد کے متاثرین اور حقوق انسانی اور سماجی کارکنوں کے احساسات و تجربات، نیز قانونی ماہرین کی آراء، تبادلہ خیالات نیز طویل بحث و مباحثہ کی روشنی میں اس قانون کے کلیدی نکات اور اس کا خاکہ تیار کیا گیا تھا۔ ان اجلاسوں میں اس امر پر مکمل اتفاق تھا کہ اس نئے قانون کی ضرورت ہے جو اقلیتوں کے

علاوہ مندرج فہرست اقوام و قبائل کی جان، مال و آبرو کے تحفظ کا موجب ہو، جو منظّم تشدد کا نشانہ بنتے ہیں۔ اس قانون کا اصل مقصد یا فوکس (جس پر سب متفق تھے)، یہ تھا کہ وہ جو اپنے سرکاری اختیارات اور طاقت کا استعمال کرتے ہیں ان کو قانون کا جوابدہ بنایا جائے، ان سرکاری افسران کو جن کا مفوضہ کام عوام کی جان و مال کی حفاظت کرنا ہے، تشدد کے برپا کرنے والوں کو قصوروار ٹھہرا کر انہیں سزا دینا اور ان کو حاصل قانونی تحفظات کو ختم کرنا شامل تھا۔ علاوہ ازیں اس میں تشدد کے متاثر نیز عینی شاہد کو دادرسی کی سہولت، مقدمہ میں انصاف کے تقاضوں کا خیال رکھنے کی شقیں شامل کرنے کی تجویز تھی۔ اس میں یہ بھی تجویز تھی کہ متاثرہ فرد کی بازآبادکاری ریاست (حکومت) کے ذمہ ہوگی۔ فرقہ وارانہ فسادات اور منصوبہ بند تشدد کے واقعات کے تجزیہ کی روشنی میں سماجی کارکنوں کی یہ واضح رائے تھی کہ نئے قانون میں ریاست کے اختیارات کو مزید وسعت نہیں دی جانی چاہیے۔

اتنی ساری تگ و دو کے بعد جب کونسل کی طرف سے اس بل کا مسودہ منظر عام پر آیا تو توقع تھی کہ اس میں ان تمام پہلوؤں کا احاطہ ہوگا جو اس قانون سازی کا مقصد ہے، جس کے لیے تجاویزات تمام متعلقہ گروپوں سے حاصل کی گئی ہیں۔ گرچہ یہ بل حکومت کی طرف سے 2005 میں پیش کردہ بل سے بہت بہتر ہے لیکن یہ فرقہ وارانہ تشدد کے تدارک اور مظلوموں کو انصاف دلانے کے مقاصد کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔ مسودہ پر سول سوسائٹی گروپس نے جو اعتراضات کیے ہیں وہ معقول اور کافی وزن رکھتے ہیں۔

نظر ثانی سے قبل بل میں منصوبہ بند تشدد (Targeted Violence) کی جو تعریف متعین کی گئی تھی وہ اس پورے قانون کو ہی 'بے معنیٰ' بنا دیتی تھی۔ دارالحکومت دہلی میں منعقدہ ایک مشاورتی اجلاس میں عیسائی رہنماؤں نے بھی اس پر سخت اعتراض کیا تھا۔ انہوں نے خبردار کیا تھا کہ اس سے قانون سازی کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا اور یہ ایک بغیر دانت کا قانون ہوگا۔ ان کی بنیادی شکایت یہ ہے کہ بل میں communal and

targeted violence کی یہ تعریف بیان کی گئی ہے کہ ایسا متشدد فعل جس سے ملک کے سیکولر تانے بانے کو نقصان پہنچتا ہے۔ نیز اس میں یہ بھی صراحت ہے کہ متاثرین کو اسی صورت میں انصاف، معاوضہ اور باز آبادکاری کا حق ہے، اگر ان کی جان و مال پر ہوئے حملے اس مجوزہ قانون کی متعین کردہ تعریف کے ذیل میں آتے ہوں۔ فرقہ وارانہ تشدد کی یہ تعریف نہایت ہی محدود اور ناقص ہے۔ ان کی یہ دلیل تھی کہ اس تعریف کے تحت جو فرقے سب سے زیادہ فرقہ پرستوں کے حملوں کا نشانہ بنتے ہیں وہ قانونی تحفظ سے محروم ہو جائیں گے۔ بہرحال، اب تعریف کو ختم کر دیا گیا ہے۔

خود اس مسودہ کی ایڈوائزری کمیٹی کی رکن سومیا اوما نے بھی اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ اس تعریف کے تحت فرقہ وارانہ تشدد کے واقعات منظّم و منصوبہ بند واقعہ کو ثابت کرنا ایک مشکل امر بن جاتا، جس کے نتیجہ میں ایسے واقعات اس قانون کے دائرہ میں آنے سے رہیں گے۔ انہوں نے اسے حذف کروانے کی زوردار کوشش کی تھی۔ سومیا کا یہ انکشاف قابل غور ہے کہ مسودہ کمیٹی کا تدوین کیا ہوا بل ایڈوائزری کمیٹی کے سامنے رکھا گیا اور اس پر بحث و مباحثہ بھی ہوا ہے۔ یہ سب کچھ کرنے کے باوجود جو مسودہ کونسل کی ویب سائٹس پر ڈالا گیا اس میں کچھ ایسی نئی شقیں شامل کی گئیں جو سنگین نوعیت کی ہیں، ان پر اس سے قبل ورکنگ گروپ کے اجلاسوں میں کبھی بحث نہیں ہوئی تھی۔

سرکاری افسروں کی جوابدہی اور مواخذہ کے تعلق سے بل میں کوئی ربط اور تسلسل نہیں ہے۔ کئی شقیں ایک دوسرے سے متصادم نظر آتی ہیں۔ اس سے قبل 2005 کا بل اس لیے مسترد کر دیا گیا تھا کہ اس میں فرائض میں کوتاہی برتنے والے افسران کی کوئی پکڑ نہیں کی گئی تھی۔ فسادات کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ انتظامیہ اور پولس کے افسران میں ایک تعصب پایا جاتا ہے۔ اسی تجربہ کی روشنی میں موجودہ بل میں کئی دفعات شامل کی گئیں جو ایسے افسران کی گرفت کرتی ہیں، مگر وہیں پر انہیں مزید اختیارات بھی عطا کیے گئے ہیں، بالخصوص بل کی

دفعہ 67 انتہائی خطرناک اور رجعت پسندانہ ہے جس میں پولس افسران کو پیغامات کو انٹر سیپٹ یا ٹیپ کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔ مسودہ کی اس دفعہ میں کہا گیا: ’کسی ایک فرد یا گروہ کی طرف سے کوئی پیغام یا پیغامات رسانی کی، چاہے وہ کسی بھی معاملہ پر کیوں نہ ہو، ترسیل روکی یا انٹرسیپٹ (سنی) جائے گی۔ اس دفعہ کو متاثرین جو مصیبت کا شکار ہوں گے، کے خلاف استعمال کیا جاسکتا ہے، انہیں اپنی مشکلات سے دوسروں کو آگاہ کرنے سے روکا جاسکتا ہے۔ سومیا نے کہا کہ یہ پہلی دفعہ سامنے آئی ہے، ہم نے ورکنگ گروپ کی میٹنگوں میں نہ کبھی یہ تجویز پیش کی تھی نہ اس پر کبھی تبادلہ خیال ہوا تھا۔

اسی طرح دفعہ 20 کے تحت ’داخلی شورش‘ (internaldisturbances) کے عنوان سے فسادزدہ علاقہ قرار دینے کی شق کو دوبارہ شامل کیا گیا ہے۔ اس سے قبل سرکاری بل 2005 میں بھی اس کو شامل کیا گیا تھا۔ اس دفعہ کے نفاذ کی صورت میں سرکاری افسران کے ہاتھ میں بے پناہ اختیارات آجاتے ہیں جو بڑے پیمانے پر حقوق انسانی کی پامالی کا باعث بنتے ہیں، جس کی نمایاں مثال اور مظاہرہ پنجاب، منی پور، ناگالینڈ، کشمیر اور دیگر علاقوں میں دیکھنے کو ملا ہے۔ ایک اور دفعہ 130 ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ ایک ایماندار افسر کو اپنے فرائض انجام دینے میں کوئی مشکلات پیش نہیں آتیں، مگر فرقہ وارانہ فسادات کے تناظر میں یہ بات درجنوں عدالتی تحقیقاتی کمیشنوں کے ذریعہ ثابت ہو چکی ہے کہ افسران تعصب کے زیر اثر کام کرتے ہیں اور انصاف اور آئینی تقاضوں کا لحاظ نہیں کرتے۔ اس حقیقت کو کون نہیں جانتا کہ فرقہ وارانہ فسادات کے مختلف واقعات میں سرکاری اداروں اور پولس نے مرکزی رول ادا کیا ہے، چاہے وہ تشدد کو ہوا دینے کا معاملہ ہو یا قاتل حملہ آور ہجوم کی پشت پناہی اور تحفظ فراہم کرنے کا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ افسران بشمول پولس، بیورو کریٹس اور سیاسی حکام اگر اس سلسلہ میں سخت موقف اختیار کریں تو فرقہ وارانہ تشدد زیادہ دیر تک برپا نہیں رہ سکتا۔ حقوق انسانی کے کارکنوں نے اس بات کی پوری کوشش کی کہ فرقہ

وارانہ تشدد میں ملوث افسران کو انتہائی سخت سزا ملے مگر اس میں انہیں خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی۔اسی طرح بل میں لوگوں کو غائب کردینے کے حوالے سے بھی کوئی دفعہ یا شق نہیں ہے حالانکہ ہندوستان اقوام متحدہ کے میثاق Convention Against Enforced and Involuntary Disappearances پر دستخط کرنے والا ملک ہے،اور حال ہی میں اس نے ہیومن رائٹس کونسل میں اس عہد کی تجدید کی ہے کہ وہ اس معاہدہ کی توثیق پر عمل کرے گا۔

بل میں فسادات میں خواتین کی بے حرمتی اوران پر تشدد کے واقعات کے سلسلہ میں ایک خصوصی طریقہ کار اور گواہی کے اصول کا کوئی ذکر نہیں ہے جس کا مطالبہ ایک عرصہ سے کیا جارہا تھا۔ گو جنسی تشدد بل کا ایک جز ہے لیکن اس سے فسادیوں کو سزا دلانا آسان کام نہیں ہوگا۔بل کی شق 78 فوجداری نظام کی ناقص فہم کی دلالت کرتی ہے۔فوجداری مقدمہ میں خصوصی سرکاری وکیل حکومت (ریاست) کی نمائندگی کرتا ہے نہ کہ مظلوم، گواہ یا فسادیوں کی خبر پہنچانے والے کی۔فوجداری مقدمہ میں سرکاری وکیل ریاست کے مفاد کا تحفظ کرتا ہے نہ کہ مظلوم کو انصاف دلانے کے لیے۔چنانچہ سرکاری وکیل کا تقرر یا اس کی برطرفی کا فیصلہ عوامی آراء سے نہیں کیا جاسکتا۔مقدمہ کی منصفانہ سماعت کے لیے ضروری ہے کہ سرکاری وکیل اپنے فرائض صاف ذہن سے انجام دے۔

بل میں نیشنل اتھارٹی اور ریاستی سطح پر اتھارٹی قائم کرنے کی بات شامل ہے۔ ملک میں پہلے ہی سے حقوق انسانی کے 178 ادارے موجود ہیں۔ان نئے اداروں کے قیام میں پوری سنجیدگی اور متانت کی ضرورت ہے۔اس نیشنل اتھارٹی کا صرف یہ مقصد ہونا چاہیے کہ وہ خاطی افسران کو سزا دے سکے۔اسی طرح بل کی دفعہ 12 میں ٹارچر یا تعذیب کی جو تعریف متعین کی گی ہے وہ ناکافی ہے۔ راجیہ سبھا کی سلیکٹ کمیٹی نے ٹارچر کے انسداد کے بل میں ٹارچر کی جو تعریف متعین کی ہے وہ اس سے کمتر ہے۔ علاوہ ازیں

دفعات 14-15 میں کمانڈر یا اس سے اوپر کے افسر (سپیریر) کی جواب دہی نیز دفعہ 13 میں افسران کی خلاف ورزیوں کی جو تعریف متعین کی گئی ہے وہ مبہم، قانونی گرفت سے خالی ہے۔

حقوق انسانی کے کارکنوں کا کہنا ہے کہ انہیں اس نئے مسودہ سے کافی مایوسی ہوئی ہے جس میں بڑے پیمانے پر تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔اس کے باوجود فرقہ پرست جماعتوں کو یہ بل پسند نہیں ہے۔توقع کے مطابق بی جے پی نے اس بل کو 'خطرناک'، 'سخت'، 'امتیازی' اور ملک کے وفاقی ڈھانچہ کو 'نقصان' پہنچانے والا قرار دیا۔اپنی خو کے مطابق اس میں بھی پارٹی کو 'اقلیت نوازی' کا عکس نظر آیا۔ پارٹی لیڈر ارون جیٹلی نے کہا کہ یہ بل امتیازی نوعیت کا ہے جس میں خالصتاً اقلیت کو تشدد کا نشانہ بنانے کا احاطہ کیا گیا ہے۔اس میں اقلیتی فرقہ کی طرف سے اکثریتی طبقہ کو نشانہ بنانے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ایک مبصر نے کہا کہ بی جے پی کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ملک کی 28 ریاستوں میں سے سات ریاستوں میں ہندو اقلیت میں ہیں۔ نیز دلتوں اور قبائلیوں کی ایک بڑی آبادی خود کو ہندو نہیں تصور کرتی ہے۔ علاوہ ازیں اس میں لسانی اقلیتوں کا بھی شمول ہے، تمل ناڈو، مہاراشٹر اور کرناٹک میں اقلیت ہیں اسی طرح بہار اور اترپردیش کے باشندے جو آسام یا دیگر ریاستوں میں روزگار کی غرض سے جا بسے وہ بھی لسانی اقلیت کے زمرے میں آتے ہیں۔آسام میں بہاری مزدور اور کرناٹک میں تمل منظّم تشدد کا نشانہ بن چکے ہیں۔

جمہوری ملک میں طاقتور کو سزا دینے یا کمزور کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے کسی خصوصی قانون بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی مگر ہندوستان میں جان کے تحفظ کا معاملہ کوئی سیدھا سادہ مسئلہ نہیں ہے، یہاں سینکڑوں بلکہ ہزاروں افراد کے قتل عام یا اربوں روپے مالیت کی لوٹ مار جیسے بھیانک جرائم انجام دیے جاسکتے ہیں لیکن یہاں قانون اپنا کام نہیں کرتا یا اکثر وبیشتر وہ خاموش تماشائی کا رول ادا کرتا ہے۔سکھوں کا 1984 میں قتل عام، 2002 میں

گجرات میں مسلمانوں کی نسل کشی، 1983 میں آسام کے نیلی میں پانچ ہزار سے زیادہ مسلمانوں کا قتل عام، اڑیسہ اور کرناٹک میں عیسائی فرقے پر حملے کے واقعات، بے شمار مسلم کش فسادات اس کی واضح مثالیں ہیں۔ اسی طرح مظلوموں اور بے گناہوں کو سزا دینے میں عدل وانصاف کی مشینری کس مستعدی سے کام کرتی ہے اس کی تازہ مثال گودھرا ٹرین آتش زدگی حادثہ ہے۔ جسٹس بنرجی کمیشن اور دیگر محکموں بشمول فارنسیک نے سابرمتی ٹرین کے ڈبہ میں لگی آگ کو ایک حادثہ قرار دیا، لیکن اس واقعہ میں ایک سو سے زائد بے گناہ مسلمانوں کو نو سال تک جیل کی اندھیری کوٹھریوں میں رہنا پڑا۔ ان میں سے 31 کو پھانسی اور عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ اس تناظر اور تجربات کے بعد بھی مرکز کی یو پی اے حکومت اس مجوزہ قانون کے تئیں سنجیدہ اور مخلص نظر نہیں آتی اور اسے بھی اس کو سیاسی مصلحت کی نذر کر دیا ہے۔

☆☆

انسداد فرقہ وارانہ تشدد قانون

● انور علی ایڈووکیٹ

کانگریس نے اپنے انتخابی مینی فیسٹو 2002 میں فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام، فرقہ وارانہ تشدد میں ملوث لوگوں اور تنظیموں کی سرکوبی اور سزایابی کے لیے موثر قانون بنانے کا وعدہ کیا تھا۔ یو پی اے کی پہلی ٹرم میں اس پر غور وخوض ہی ہوتا رہا اور بس اب حال ہی میں مرکزی کابینہ نے فرقہ وارانہ فسادات بل Communal Voilence Bill مرتب کر دیا ہے۔ اس قانون کی کچھ مجوزہ دفعات پر یہ کمنٹ پیش ہیں۔

اس قانون میں اہم بات یہ ہے کہ ریاستی سرکار کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ریاست کے کسی بھی علاقہ کو 'فرقہ وارانہ تشدد زدہ علاقہ Disturbed Area ' Communally قرار دے۔ یہ اختیار ریاستی حکومت کو غیر متعین پاور دیتا ہے۔ اس کا استعمال ناجائزہ طور پر کسی بھی علاقہ کے لیے کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے یہ قانون ایک گندہ اور واہیات قانون ہے جس سے اقلیتی فرقہ کو (مذہبی، لسانی اقلیت کے کسی بھی علاقہ کو) ہراساں اور پریشان کیے جانے کا پورا امکان ہے۔ دکھاوے کے لیے ریاستی سرکار یہ دعویٰ کرے گی کہ 'فرقہ وارانہ تشدد زدہ علاقہ' قرار دیے جانے کا مقصد اقلیت کی حفاظت کرنا ہے لیکن پولس، پی اے سی اور بہار ملٹری پولس جیسی ریاستی پولس فورس (جس کے تعصب وتشدد کا نشانہ اقلیتی فرقہ 1947 سے برابر بنا رہا ہے، جیسے مرادآباد، ہاشم پورہ، ملیانہ، جمشید پور، بھاگلپور، بڑودہ) کے رحم وکرم پر یہ فرقہ وارانہ تشدد کے علاقے ہوں گے، جہاں قانون کی

حکومت نہیں بلکہ جنگل راج ہوگا۔ (بریلی میں فرقہ وارانہ تشدد کی حالیہ مثال سامنے ہے)۔ 1947 سے اب تک کے ان گنت فرقہ وارانہ فسادات، قتل و غارت گری میں ریاستی ایجنسیوں State Agencies، سول ایڈمنسٹریشن، پولس اور نیتاؤں کا رول ہوتا ہے۔ ان تینوں کا ناپاک اتحاد کمزور فرقہ کے جانی و مالی نقصان کا ذریعہ ہوتا ہے۔ مجوزہ قانون میں اس پہلو کو قطعی نظر انداز کیا گیا ہے۔ مجوزہ قانون میں 'فرقہ وارانہ فسادات' کو محض ایک لا اینڈ آرڈر کی سمسیا مان کر قانون سازی کی گئی ہے۔ گویا کہ فرقہ وارانہ فسادات محض دو فرقوں کے درمیان دنگا و فساد ہے۔ اس میں ریاستی سرکار، ایڈمنسٹریشن یا پولس کی ذمہ داری اور جواب دہی کے پہلو کو قطعی نظر انداز کردیا گیا ہے۔ ریاست سے براہِ راست متعلقہ محکمہ جات (پولس اور مقامی ایڈمنسٹریشن) کی نہ تو کوئی ذمہ داری رکھی گئی ہے اور نہ ہی جواب دہی کے اصول کو قانون میں رکھ کر مسودہ بنایا گیا ہے۔ ایک بڑی خامی مجوزہ قانون میں Command superio and Responsibility یعنی اعلیٰ ریاستی اداروں کی ذمہ داری کے اصول کو قطعی نظر انداز کردیا گیا ہے۔ واضح الفاظ میں کسی بھی ریاست کا 'نریندر مودی' نسل کش فسادات کا ذمہ دار نہیں ہوگا۔ (گجرات کے نسل کش فسادات میں ممبر پارلیمنٹ احسان جعفری نے کمشنر پولس کو برابر ٹیلی فون کر کے گلبرگ کالونی میں قتل عام کی اطلاع دے کر مدد مانگی، لیکن یہ اتھارٹی ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ پولس کو امداد کا کوئی حکم نہیں دیا۔ آخر پولس کمشنر کو گلبرک کالونی میں احسان جعفری اور دوسرے شہریوں کے قتل کا مجرم کیوں نہ قرار دیا جائے اور محض موقع پر عام دنگا کرنے والوں کو ہی مجرم قرار دیا جائے؟

ایک اور اہم بات خامی مجوزہ قانون کی یہ ہے کہ اس میں فرقہ وارانہ تشدد و فسادات کو ایک علیحدہ مجرمانہ فعل نہیں قرار دیا گیا، حالاں کہ پچھلے پچاس ساٹھ سال کے فرقہ وارانہ فسادات، ان کی سازش، تیاری، پلاننگ اور اس سب پر عمل درآمد 'سائنٹفک جرم' کے زمرہ ہیں۔ 'منظّم جرم'، کے زمرہ میں فرقہ وارانہ تشدد و فساد آتا ہے، لیکن مجوزہ قانون میں اس کو

ایک صدی سے زائد قبل لکھی کتاب 'انڈین پینل کوڈ'، تعزیرات ہند' میں لکھے جرائم کو اختیار کیا گیا ہے۔ حالاں کہ 1860 میں جب تعزیرات ہند مرتب کی گئی تھی۔ تب فرقہ وارانہ تشدد نام سے ہی ہندستانی عوام کو واقفیت نہیں تھی۔ پوری آبادی کو علاقہ سے تشدد برپا کر کے نکال دینا، نسلی صفائی، فرقہ وارانہ تشدد میں عورتوں کی اجتماعی عصمت دری، حاملہ عورتوں کی عصمت دری اور پھر رحم مادر چاک کر کے بچہ کو تلوار کی نوک پر رکھ کر ہوا میں لہرانا، تشدد کے شکار معصوم لوگوں کو چونے کے ڈھیر میں دفن کردینا اور ایسے ہی جرائم جو انٹرنیشنل قانون میں انسانیت کے خلاف جرائم Crime gaints Huminity قرار دیے گئے ہیں۔ ایسے جرائم کو مخصوص جرائم قرار دے کر الگ زمرے میں نہیں رکھا گیا ہے۔ فسادات میں سرزد کیے گئے متشدد جنسی جرائم کو عام جنسی جرم Sexual Sape Rape رکھا گیا ہے۔ پھر ان خوفناک جرائم کے ارتکاب کے بعد متشدد جرائم کے شکار افراد کے حقوق کا کوئی پراودھان اس قانون میں نہیں ہے۔ یہ تو ریاست کا فرض ہے کہ وہ ایسے سنگین جرائم کے شکار لوگوں کی راحت رسانی کا کام کرے۔ اس قانون میں فرقہ وارانہ تشدد کو محض دو فرقوں میں تصادم سمجھا گیا ہے اور اس طرح ریاست کو اپنی ذمہ داری سے پلہ جھاڑ کر الگ کردیا گیا ہے۔

فکرمندی کی صورت حال یہ ہے کہ غیر مسلم سیکولر سول سوسائٹی نے اس واہیات بے شرم قانون کو ایک ایسا کتا بتایا ہے جس کے دانت خوفناک دکھانے کے ہیں۔ اس قانون کے دانت کاٹنے والے نہیں ہیں، لیکن مسلم سماج میں کوئی فکرمند سول سوسائٹی ہے ہی نہیں۔ جذبات بھڑکانے والی تقریریں کرنے والے مسلم لیڈر ہیں، تنظیمیں ہیں، لیکن حالات اور قانون سازی کی مانیٹرنگ کرنے والا کوئی ادارہ یا شخصیت نہیں۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ، جس کا فرض اور ذمہ داری مسلم قانونی معاملات میں کام کرنا ہے، کروڑوں روپے کا بجٹ ہوتے ہوئے بھی قانون سازی اور جوڈیشل نظائر کی کوئی مانیٹرنگ نہیں کرتا۔

☆☆

راشٹریہ سیوک سنگھ کی دہشت گردی

● محسن فارانی

کوئی تیس برس پہلے نیوز ویک یا ٹائم میں ایک تصویر دیکھی تھی، یہ بھارت کے کسی شہر میں راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (RSS) کے ایک تربیتی کیمپ کا منظر تھا جس میں نیکر پوش ہندو نوجوان ہاتھوں میں چھرے لہراتے، قطاروں میں ''دشمن'' کو تہ تیغ کرنے کی تربیت لے رہے تھے۔ یہ ''دشمن'' کون تھا؟ ظاہر ہے بھارت کی مسلمان اقلیت تھی۔ پھر جب میرٹھ اور مراد آباد میں مسلم کش فسادات ہوئے، آسام کے شہر نیلی میں مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا، احمد آباد اور بھیونڈی میں مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیلی گئی، بھاگل پور میں مسلمانوں پر ہندو دہشت گردی کا عذاب ٹوٹا، بابری مسجد شہید کر دی گئی اور ردعمل میں بھارتی مسلمانوں کے احتجاج کو خون کی ندیاں بہا کر دبا دیا گیا، پھر فروری مارچ 2002ء میں گجرات میں ہندو دہشت گردوں نے جس طرح شرف انسانی کی تذلیل کی اور مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہایا تو ہر بار ان مظالم کی خبریں پڑھ کر RSS کے خنجر بدست ہندو بلوائیوں کے خونخوار چہرے نظروں میں گھوم جاتے رہے اور گزشتہ عشرے میں تو ہندوؤں نے مسلمانوں کی مساجد و مقابر اور نماز کے اجتماعات کو بم دھماکوں کا نشانہ بنا کر ان کا الزام مسلمانوں ہی پر لگانا شروع کر دیا اور پولیس جس میں آر ایس ایس کے تربیت یافتہ ہندو بھرے پڑے ہیں فوراً حرکت میں آ جاتی اور مسلم نوجوانوں کی پکڑ دھکڑ شروع کر دیتی۔ ان مقدمات میں سینکڑوں مسلم نوجوان جیلوں میں سڑتے رہے۔ ان کی بے گناہی ہر کسی پر

واضح تھی سوائے بھارتی پولیس اور بھارتی عدالتوں کے جن میں متعصب ہندو جج انصاف کا خون کرنے کے لیے موجود تھے۔

اب اسے بھارت کی انتخابی سیاست کا شاخسانہ کہیے یا کچھ اور، خود حکمران جماعت کانگریس کے وزراء نے یہ واویلا کرنا شروع کر دیا ہے کہ بی جے پی (بھارتیہ جنتا پارٹی) کا عسکری ونگ آر ایس ایس ہندو دہشت گردوں کے تربیتی کیمپ چلا رہا ہے۔ گویا بھارت میں دہشت گردوں کے جن تربیتی کیمپوں کی تصاویر عالمی پریس میں 1980ء کے لگ بھگ شائع ہو رہی تھیں، وزراء اور حکام کو ان کا اب پتہ چلا ہے جبکہ اس دوران میں زیادہ تر کانگریس کے وزرائے اعظم اندرا گاندھی، راجیو گاندھی، نرسمہا راؤ، اندر کمار گجرال اور من موہن سنگھ ہی برسر اقتدار رہے ہیں۔ بہر حال دیر آید درست آید! وزیر داخلہ سُشیل کمار شنڈے کے انکشافات کے بعد سیکرٹری داخلہ آر کے سنگھ نے سمجھوتا ایکسپریس جیسی وارداتوں میں ملوث آر ایس ایس کے دس مسلمہ دہشت گردوں کے نام بھی بتائے ہیں۔ سنیل جوشی، سندیپ ڈنگے، لوکیش شرما، سوامی اسیمانند، راجندر سمندر، مکیش وانی، دیوندر گپتا، چندر شیکھر، کمل چوہان، رام جی کلسنگدا، ان میں سے سنیل جوشی مر چکا ہے جبکہ سندیپ ڈنگے اور کمل چوہان مفرور ہیں۔ باقی سات افراد پولیس کی حراست میں ہیں۔ یہ سب دہشت گرد تنظیم آر ایس ایس کے مختلف عہدوں پر فائز تھے۔ ان میں سے سوامی اسیمانند نے سال ڈیڑھ سال پہلے دہشت گردی میں شرکت کا اعتراف کیا تھا مگر پھر آر ایس ایس کے نیٹ ورک کی دھمکیوں میں آ کر اس نے اپنی زبان بند کر لی اور عدالت میں جا کر اپنے پہلے بیان سے مکر گیا اور سنگین تر بات یہ کہ ان دہشت گردوں کا سرپرست فوج کا سروِنگ کرنل پروہت تھا جسے انسداد دہشت گردی سکواڈ کے اعلیٰ افسر ہیمنت کرکرے نے گرفتار کیا تھا۔ پھر کرکرے اور ان کے معاون سالسکر کی غیر جانبدارانہ تفتیش سے انکشاف ہوا تھا کہ سمجھوتا ایکسپریس، مکہ مسجد حیدر آباد، مالیگاؤں (مہاراشٹر) اور اجمیر درگاہ کے بم

دھماکے دراصل ہندو دہشت گردوں کی خونریز کارروائیاں تھیں۔ افسوس کہ سالسکر اور کرکرے جیسے باضمیر بھارتی افسر مشہور ممبئی دہشت گردی میں مارے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی ہلاکت آر ایس ایس کے دہشت گردوں کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی تا کہ ان کے ساتھی دہشت گردوں کے خلاف مقدمات آگے نہ بڑھ سکیں۔

بھارت میں آر ایس ایس کے علاوہ وشوا ہندو پریشد (ورلڈ ہندو کونسل)، شیوسینا اور ابھینو بھارت جیسی مسلم دشمن تنظیمیں بھی دہشت گردی میں ملوث ہیں جنہیں بھارتی فوج، پولیس، خفیہ تنظیم ''را'' اور بی جے پی کی حمایت حاصل ہے۔ رہی آر ایس ایس تو اس کا قیام تو تقریباً 90 سال پہلے 1925ء میں عمل میں آیا تھا اور پھر ہندوستان کی آزادی کے دن قریب آنے تک یہ تنظیم اپنے تربیتی کیمپوں میں ہزاروں دہشت گرد تیار کر چکی تھی جنہوں نے قیام پاکستان پر مشرقی پنجاب میں دہلی تک اور جموں میں لاکھوں مسلمانوں کا خون بہانے میں سرگرم حصہ لیا۔ پھر وہ آر ایس ایس کا نتھورام گوڈسے ہی تھا جس نے گاندھی جی کو صرف اس لیے گولی ماردی کہ اس نے مسلمانوں کے قتل عام روکنے لیے برت رکھنے کا اعلان کیا تھا اور اس دہشت گرد گوڈسے کی خاک اب تک ان کے ہاں محفوظ ہے تا کہ اس کی وصیت کے مطابق اس وقت دریائے سندھ کے بالائی دھارے میں بہا دی جائے جب خاکم بدہن پاکستان دوبارہ اکھنڈ بھارت کا حصہ بن جائے تا کہ اس حصے کو ''پوتر'' کیا جا سکے۔ آر ایس ایس کے دہشت گردی کے تربیتی کیمپ آزاد بھارت میں بھی قائم رہے اور کانگریس حکومتوں نے انہیں بند کرنے کا تکلف نہ کیا۔ اس کی تصدیق 1972ء میں آنجہانی جے پرکاش نرائن نے آر ایس ایس کے تربیتی کیمپ (پٹنہ) کے اختتامی اجلاس سے خطاب میں یہ کہتے ہوئے کی تھی کہ ''اگر کوئی طاقت پاکستان اور بنگلہ دیش کو بھارت کے ساتھ ملا کر اکھنڈ بھارت بنا سکتی ہے تو وہ صرف اور صرف آر ایس ایس ہی ہے''۔

8 ستمبر 2006ء کو ریاست مہاراشٹر کے ضلع ناشک میں ہندو دہشت گردوں نے

بھاری مسلم آبادی کے قصبے مالیگاؤں میں نماز جمعہ کی ادائیگی کے بعد مسجد سے ملحقہ قبرستان میں یکے بعد دیگرے کئی بم دھماکے کیے تھے جن سے 37 مسلمان شہید اور 125 سے زائد زخمی ہو گئے تھے۔ پھر 18 مئی 2007ء کو آندھرا پردیش میں حیدر آباد کی مکہ مسجد کے نماز جمعہ کے اجتماع میں بم دھماکے سے ہندو دہشت گردوں نے 16 نمازی شہید اور سو کے قریب زخمی کر دیے تھے، نیز اس دوران میں 19 فروری 2007ء کو پانی پت کے قریب سمجھوتا ایکسپریس کو جو لاہور آ رہی تھی، دہشت گردی کا نشانہ بنایا گیا جس میں ساٹھ سے زائد پاکستانی زندہ جل گئے تھے۔

☆☆

مغویہ نوجوان
اچانک دہشت گرد کیسے بن گیا؟

●افروز عالم ساحل

۲۳؍نومبر ۲۰۰۷ کو ریاست اُتر پردیش کے ۳؍شہروں لکھنؤ، فیض آباد اور بنارس میں ۲۵ منٹ کے اندر سلسلہ وار دھماکے ہوئے۔ ان دھماکوں میں ۱۸؍افراد ہلاک اور ۲۱؍زخمی ہوئے۔ اتر پردیش میں ہونے والے ان دھماکوں سے دہلی تک دہل گئی۔ دہشت کے سائے سے نکل کر زندگی دھیرے دھیرے معمولی پر آنے لگی۔ اس دوران ۱۲؍دسمبر ۲۰۰۷ کو اپنے یونانی دواخانے سے لوٹنے والے ایک ڈاکٹر کو ٹاٹا سومو میں سوار کچھ نامعلوم افراد اٹھا کر لے گئے۔ ۱۶؍دسمبر ۲۰۰۷ کو ایسے ہی ایک واقعہ میں ایک اُستاذ کو ٹاٹا سومو میں لے جایا گیا۔

اچانک لاپتہ ہونے پر ان کے گھر کے لوگ پریشان ہو گئے اور پولیس اسٹیشن کے چکر کاٹنے لگے۔ اخبارات میں ان کی گمشدگی کی خبریں شائع ہوئیں۔ کچھ مقامی سیاستدانوں نے بڑے بڑے افسران کو میمورنڈم دیا، مظاہرے ہوئے۔ اچانک اغوا کئے جانے والے ان نوجوانوں کے اہل خانہ نے ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

۱۴؍دسمبر ۲۰۰۷ کو ڈاکٹر کے اہل خانہ نے مقامی تھانے رانی سرائے میں گمشدگی کی رپورٹ درج کروائی۔ مقامی لیڈروں نے اغوا کئے گئے ڈاکٹر کے بارے میں معلومات

حاصل کرنے کیلئے ضلع ہیڈ کوارٹرز پر دھرنا بھی دیا اور وزیر اعلیٰ کے نام میمورنڈم بھی دیا۔ اہل خانہ نے ڈاکٹر کے 'بی ایس این ایل' موبائل کو بھی 'سرولانس' پر لگا کر لوکیشن کا پتہ لگانے کی بات کی ہے۔

۱۶؍دسمبر ۲۰۰۷ کو قومی حقوق انسانی کمیشن (نئی دہلی) اور ڈی جی پی اتر پردیش کو اُستاذ کی گرفتاری کے بارے میں فیکس کیا گیا۔ ۱۷؍دسمبر ۲۰۰۷ کو اخباروں میں ان کی گرفتاری کی خبر شائع ہوئی۔ مقامی افراد کا وفد تھانے گیا۔ اسی دن اُتر پردیش کی وزیر اعلی، جونپور ضلع کے ڈی ایم، ریاست کے گورنر اور چیف سیکریٹری کو فیکس کے ذریعے گرفتاری کی اطلاع دی گئی۔ اسی دوران ۱۹-۱۸؍دسمبر کی رات کچھ نامعلوم لوگ استاذ کے گھر پہنچے اور کچھ کتابیں لے گئے۔ ۱۹؍دسمبر کو ہی ایک بار پھر وزیر اعلیٰ، ڈی ایم اور قومی انسانی حقوق کمیشن کو فیکس کر کے واقعہ کی اطلاع دی گئی۔ ۲۳؍دسمبر ۲۰۰۷ کو اُتر پردیش پولیس نے سنسنی خیز انکشاف کرتے ہوئے ۲؍دہشت گردوں کی گرفتاری کا اعلان کیا۔ گرفتار کئے جانے والے دہشت گردوں میں سے ایک کے پاس سے جلیٹن کی چھڑیں، کلر ڈیٹونیٹر، نوکیا موبائل، سم کارڈ جب کہ دوسرے کے پاس سے ۳؍ڈیٹونیٹر، پالیتھین میں لپٹا ہوا آر ڈی ایکس، نوکیا موبائل اور سم کارڈ کا برآمد ہونا دکھایا گیا۔ پولیس نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ ان دہشت گردوں کو ۲۲؍دسمبر کو اتر پردیش کے بارہ بنکی ضلع سے گرفتار کیا گیا۔

پولیس کی پریس کانفرنس کے بعد اخبارات کی شہ سرخیوں میں ۲؍دہشت گردوں کے چہرے چھپے۔ ان میں سے ایک کا نام محمد طارق قاسمی اور دوسرے کا نام خالد مجاہد بتایا گیا۔ اتفاق سے یہ وہی لوگ تھے، جن کے ٹاٹا سومو کے ذریعے اغوا کئے جانے کا الزام ان کے متعلقین لگا رہے تھے۔ ۱۲ اور ۱۶؍دسمبر کو اغوا کئے گئے طارق قاسمی اور خالد مجاہد کو ۲۲؍دسمبر ۲۰۰۷ کو بارہ بنکی کے ریلوے اسٹیشن سے گرفتار کرنے کا دعویٰ کیا گیا۔ واقعہ کے بعد مقامی لوگوں نے غصے کا اظہار کیا۔ فروری ۲۰۰۸ میں نیشنل جمہوری پارٹی کے چودھری

چرن پال سنگھ اور مظہر آزاد نے لکھنؤ میں اسمبلی کے باہر ’آمرن انشن‘ کیا۔ پولیس نے ۶/ دن کے اندر ہی جبراً ’انشن‘ ختم کروادیا۔اسی درمیان طارق قاسمی اور خالد مجاہد کی گرفتاری کی عدالتی تفتیش کا مطالبہ مسلسل جاری رہا۔۱۴/مارچ ۲۰۰۸ کو اُتر پردیش کے اس وقت کے ڈی جی پی وکرم سنگھ نے چیف سیکریٹری اُتر پردیش حکومت کو خط لکھ کر عدالتی تحقیقات کی درخواست کی،جس کے بعد اسی دن اُتر پردیش حکومت نے نوٹیفکیشن جاری کرکے ریٹائرڈ جج آرڈی برمن نمیش کمیشن کا قیام کیا۔اس ایک رُکنی کمیشن کو ۶/ماہ کے اندر رپورٹ پیش کرنے کیلئے کہا گیا۔نمیش کمیشن نے پورے واقعات اور حقائق کی جانچ کی اور ۳۱/اگست ۲۰۱۲ءکو جانچ رپورٹ ریاستی حکومت کو پیش بھی کردی،لیکن کمیشن کی رپورٹ اسمبلی میں پیش نہیں کی گئی۔واضح رہے کہ بار بار کے مطالبے کے باوجود اس رپورٹ کو اسمبلی میں اب تک پیش نہیں کیا گیا ہے۔

’بیانڈ ہیڈ لائن‘ (BeyondHeadlines) کو نمیش کمیشن کی رپورٹ کی کاپی سب سے پہلے ذرائع سے حاصل ہوئی ہے۔کمیشن نے اپنی رپورٹ میں خالد مجاہد اور طارق قاسمی کی گرفتاری اور ان کے دہشت گردانہ واقعات میں ملوث ہونے کو مشتبہ قرار دیا ہے۔ ساتھ ہی کمیشن نے انہیں اغوا کرنے والے افسران کی شناخت کرنے اور ان کے خلاف قانون کے مطابق کارروائی کرنے کی سفارش بھی کی ہے۔معاملہ فی الحال عدالت میں ہے، اس لئے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا جاسکتا،لیکن نمیش کمیشن کی رپورٹ اُتر پردیش حکومت اور پولیس نظام پر کئی بڑے سوال کھڑے کرتی ہے۔اس رپورٹ میں پیش کئے گئے حقائق پولیس اور سیکورٹی نظام کو ہی کٹہرے میں کھڑا کردیتے ہیں۔یہ رپورٹ بتاتی ہے کہ کمیشن کے سامنے آنے والے حقائق سے یہ واضح ہے کہ ملزم طارق قاسمی کو مبینہ طور پر ۱۲/دسمبر ۲۰۰۷ کو دوپہر ۱۲۔۰۰ بجے، جب وہ سرائے میر سے اپنی موٹر سائیکل سے اجتماع کیلئے جارہا تھا،شنکر پور چیک پوسٹ تھانہ رانی کی سرائے سے کچھ افراد نے اٹھایا اور ٹاٹا سومو میں ڈال

کرلے گئے،ان میں سے ۲/افراد اس کی موٹر سائیکل لے کر چلے گئے۔اسی طرح مندرجہ بالا تمام حقائق سے یہ واضح ہے کہ ۱۶/دسمبر ۲۰۰۷/کو شام ۶۔۱۵/بجے ملزم خالد مجاہد کو مبینہ طور پر مہتوانا محلّہ تھانہ مڑیاہوں ضلع جونپور سے ٹاٹا سومو میں سوار لوگوں نے اُٹھالیا اور اسے وہاں سے لے گئے۔دونوں ملزمین کو پریشان کیا گیا،برہنہ کرکے پیٹا گیا۔

۱۲/دسمبر ۲۰۰۷/کے بعد وہ ۲۲/دسمبر ۲۰۰۷/کے پہلے کے واقعات میں ایس ٹی ایف کے علاوہ دیگر پولیس دستہ کا شامل رہنا معلوم ہوتا ہے،لیکن شواہد سے یہ واضح نہیں ہے کہ مبینہ ملزمین خالد مجاہد اور طارق قاسمی کو جن لوگوں نے اٹھایا اور پریشان کیا،وہ کون تھے، اُن کا تعلق کس دستے سے تھا اور اُن کا مقصد کیا تھا؟لہٰذا ان افراد کی شناخت کے بعد ہی ان کی ذمہ داری کا تعین کیا جاسکتا ہے۔

مذکورہ سطور میں ہم نے نمیش کمیشن رپورٹ کی اہم باتوں کا ذکر کیا تھا۔اس رپورٹ میں جسٹس آرڈی نمیش صاحب نے واضح طور پر کہا ہے کہ طارق قاسمی اور خالد مجاہد کا دہشت گردانہ واقعات میں ملوث ہونا شک وشبہ کے دائرے میں ہے،کیونکہ یہ کیس ضلع عدالت بارہ بنکی میں زیر غور ہے،لہٰذا اس سطح پر مذکورہ واقعہ کے سلسلے میں کسی شخص کے خلاف ذمہ داری کا تعین نہیں کیا جاسکتا ہے۔نمیش کمیشن کی رپورٹ نے اس پورے معاملے میں کئی سوال بھی کھڑے کئے ہیں،اس کے کچھ اہم اقتباسات مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) جب ۱۲/دسمبر ۲۰۰۷ کو طارق قاسمی کو دوپہر ۱۲۔۰۰/بجے رانی کی سرائے چیک پوسٹ سے سرائے میر اجتماع میں جاتے وقت چیک پوسٹ کے قریب لکھنؤ بلیا راہ پر مقیم گرام محمود پور سے پکڑا جانا کہا جاتا ہے اور جس کی خبر بھی روزنامہ ہندوستان،امر اُجالا اور دینک جاگرن میں مختلف تاریخوں میں ۲۲/دسمبر ۲۰۰۷ تک چھپی ہے،ان خبروں کی تصدیق کرکے تفتیش کیوں نہیں کی گئی؟

(۲) اظہر علی نے ۱۴/دسمبر ۲۰۰۷ کو طارق کے اغوا کی اطلاع تھانہ رانی کی سرائے ضلع

اعظم گڑھ کو دی جس کو تھانے پر حاصل کیا، اپنی مہر بھی لگائی۔ اس رپورٹ پر کیوں کارروائی نہیں کی گئی؟

(۳) اظہر علی کی طرف سے داخل ایف آئی آر میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ طارق کے پاس موبائل 9450047342 تھا جو کبھی بند ہو جاتا تھا تو کبھی چالو ہو جاتا تھا، اس کے لوکیشن کا پتہ کیوں نہیں لگایا گیا؟

(۴) کال ڈیٹیلس میں ۱۲؍دسمبر ۲۰۰۷ کو آخری بار تقریباً ۱۲؍بج کر ۲۳؍منٹ پر کال کی گئی۔ اس وقت ٹاور کا لوکیشن واقع سرائے رانی پور یوپی مشرق دکھایا ہے۔ اس کے بعد اس کا موبائل ۱۳؍دسمبر ۲۰۰۷ کو شام ۷؍بج کر ۱۰؍منٹ پر وشواس کھنڈ لکھنؤ، اس کے بعد وجے کھنڈ لکھنؤ، تیلی باغ یوپی مشرق اور دوبارہ ۱۷؍دسمبر ۲۰۰۷ کو وشواس کھنڈ، ناکہ ہنڈولا، ۱۸؍دسمبر ۲۰۰۷ کو ناکہ ہنڈولا، ۱۹؍دسمبر ۲۰۰۷ کو وجے کھنڈ، میڈیکل کالج لکھنؤ، ٹی ڈی ایم آفس یوپی مشرق لکھنؤ دکھایا گیا ہے تو مذکورہ بالا حقیقت کی بھی جانچ کیوں نہیں کی گئی؟

(۵) قومی جمہوری پارٹی نے ۱۵؍دسمبر ۲۰۰۷ کو ضلع مجسٹریٹ اعظم گڑھ کو میمورنڈم دیا کہ محمد طارق کو موٹر سائیکل نمبر N50UP / 2943 سمیت اُٹھا لیا گیا اور اس کے موبائل 9450047342 کا سوئچ آف ہے تو اس پر کارروائی کیوں نہیں کی گئی؟

(۶) طارق قاسمی کے اغوا کی مخالفت میں سیاسی پارٹی 'این ایل پی' کا مظاہرہ ۱۶؍دسمبر ۲۰۰۷ سے جاری رہا، جس میں مقررین اور سامعین کی تصویر بھی ہے جو کہ روزنامہ ہندوستان میں ۱۷؍دسمبر ۲۰۰۷ کو چھپی ہے تو اس کے بعد طارق قاسمی کے اغوا کی تحقیقات کیوں نہیں کی گئیں؟

(۷) بے سبب کوئی بھی نہ تو اس طرح رپورٹ کرے گا اور نہ ہی دھرنا و مظاہرہ کرے گا۔ لہٰذا مندرجہ بالا حقائق پر بھی کارروائی نہ کرنے کی کوئی وجہ کیوں نہیں ظاہر کی گئی؟

(۸) 'نیشنل لوکتانترک پارٹی' نے ۲۰؍دسمبر ۲۰۰۷ کو دوبارہ وزیر اعلیٰ کو میمورنڈم دیا

کہ مولانا محمد طارق قاسمی کی فوری واپسی کی جائے اور اس کی تلاش کی جائے۔ تو اس میمورنڈم پر بھی کیوں کارروائی نہیں کی گئی؟

(۹) 'نیشنل لوکتانترک پارٹی' کے نوجوان ریاستی صدر چودھری چرن پال نے گورنر کو میمورنڈم دیا جس میں کہا ہے کہ طارق قاسمی کی ۱۲؍دسمبر ۲۰۰۷ء کو ۱۲۔۰۰؍بجے دن میں ٹاٹا سومو کے ذریعے زبردستی اغوا کر لیا گیا ہے اور اگر ۲۲؍دسمبر ۲۰۰۷ء کو بقرعید کے دن تک مولانا ڈاکٹر محمد طارق قاسمی کو برآمد کر کے پولیس ان کے خاندان کو نہیں سونپ دیتی ہے تو چودھری چرن پال ۲۲؍دسمبر ۲۰۰۷ء کو ۲۔۰۰؍بجے دن میں کوٹلہ مدرسہ کے سامنے خود کو آگ لگالیں گے، لیکن اس میمورنڈم کے دوسرے ہی دن جس طرح سے قاسمی کو بارہ بنکی ریلوے اسٹیشن کے قریب سے گرفتار دکھایا گیا اور اس کے پاس سے قابل اعتراض اشیاء کے برآمد ہونے کا ذکر کیا گیا۔ مندرجہ بالا حقائق کی تفتیش کیوں نہیں کی گئی؟

(۱۰) اسی طرح خالد مجاہد کو جب ۱۶؍دسمبر ۲۰۰۷ء کو مئو چاٹ والے کی دکان کے پاس قصبہ مڑیاہوں ضلع جونپور سے اُٹھانا کہا جاتا تو اس واقعہ کے بعد کی اطلاعات دوسرے دن ۱۷؍دسمبر ۲۰۰۷ کو اخباروں میں چھپی ہے۔ مندرجہ بالا معلومات کا نوٹس کیوں نہیں لیا گیا اور اس پر کارروائی کیوں نہیں کی گئی؟ اسی طرح ۲۰؍دسمبر ۲۰۰۷ کو اخبار میں یہ چھپا ہے کہ ''ایس ٹی ایف نے نوجوان کو اٹھایا'' مذکورہ اطلاع پر کوئی کارروائی کیوں نہیں کی گئی اور یہ جاننے کی کوشش کیوں نہیں کی گئی کہ اسے کس طرح اور کس نے اٹھایا؟ اور یہ معلومات غلط چھپی ہے یا درست؟

(۱۱) ۱۸؍دسمبر ۲۰۰۷ء کو اخبار میں چھپا ہے کہ ایس ٹی ایف نے پوروانچل کے جون پور اور الہ آباد میں چھاپہ مار کر ہو جی کے ۲؍ارکان کو حراست میں لیا اور مڑیاہوں میں بھی چھاپہ مارنے والی بات شائع ہوئی ہے۔ ۲۱؍دسمبر ۲۰۰۷ کو یہ بھی لکھا ہے کہ ''مڑیاہوں کا خالد جا چکا ہے ۳؍بار پاکستان''۔ اگر خالد پولیس کے پاس نہیں تھا تو اس طرح کی خبریں

کہاں سے چھپیں؟ اس پر بھی نہ کوئی نوٹس لی گئی اور نہ ہی کوئی کارروائی کی گئی ہے۔ کیوں؟

(۱۲) اخبار ہندوستان نے ۲۱/دسمبر ۲۰۰۷ء کو یہ بھی لکھا ہے کہ ''کافی دنوں سے خفیہ نگاہ میں تھا خالد'' اور یہ بھی لکھا ہے کہ ۱۶/دسمبر ۲۰۰۷ء کو جب خالد ٹاؤن میں ایک چاٹ کی دکان پر چاٹ کھا رہا تھا، تبھی ٹاٹا سومو میں سوار کچھ نامعلوم لوگ آئے اور اسے لے گئے۔ جس کی اطلاع چچا ظہیر نے تھانہ مڑیاہوں کو دی۔ مندرجہ بالا حقائق سے جب عوام کو بھی واقفیت تھی تو اس بات کی کوئی نوٹس کیوں نہیں لی گئی اور مقامی تھانہ انچارج نے اس پر کارروائی کیوں نہیں کی کہ کس طرح سے یہ خبر اخبار میں چھپی اور کس طرح سے پبلک میں آئی؟

(۱۳) دینک جاگرن میں ۲۲/دسمبر ۲۰۰۷ء کو چھپا ہے کہ ''ایس ٹی ایف کے ذریعہ اٹھائے گئے خالد کو لے کر متعلقین میں ہلکان اور خالد پر ۶/ماہ سے تھی آئی بی کی نظر۔'' اگر خالد کو ۲۲/دسمبر ۲۰۰۷ء پہلے نامعلوم افراد نے نہیں اُٹھایا تو مذکورہ بالا خبر کس طرح سے روشنی میں آئی؟

(۴۱) خالد کے چچا ظہیر عالم فلاحی کے ذریعے قومی حقوق انسانی کمیشن، نئی دہلی، انچارج انسپکٹر کوتوالی مڑیاہوں، پولس ڈائریکٹر جنرل لکھنؤ، ضلع مجسٹریٹ جونپور کو فیکس دیئے گئے اور مطلع کیا گیا کہ ۱۶/دسمبر ۲۰۰۷ کی شام تقریباً ۳۰۔۶/بجے فتح محمد بلڈنگ کے پاس محلّہ صدر گنج، مڑیاہوں چاٹ کی دُکان کے پاس سے اس کے بھتیجے محمد خالد کو زبردستی اُٹھا کر لے گئے، جو ایس ٹی ایف کے لوگ تھے تو اس کا کوئی نوٹس کیوں نہیں لیا گیا اور اس پر کارروائی کیوں نہیں کی گئی؟

اس طرح مندرجہ بالا تمام حقائق سے مبینہ ملزم خالد مجاہد اور طارق قاسمی کی ۲۲/دسمبر ۲۰۰۷ء کی صبح ۲۰۔۶/بجے قابل اعتراض چیزوں کے ساتھ گرفتاری مشتبہ معلوم ہوتی ہے اور استغاثہ کی مذکورہ بالا چشم دید کے بیانات پر مکمل طور پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔ یہی نہیں، کمیشن

نے کچھ تجویزیں بھی پیش کیں، جنہیں ہم سب کو جاننا بہت ضروری ہے۔

(۱) دہشت گردی کے واقعہ میں پولیس سے الگ محکمہ کے افسر کو برآمدگی کا گواہ بنانا چاہئے۔

(۲) مبینہ ملزمان سے پوچھ گچھ کی ویڈیو ریکارڈنگ ہونی چاہئے۔

(۳) جائزہ پولیس کی کسی دوسری شاخ کے راج پترت افسر کی طرف سے ہی کیا جانا چاہئے۔

(۴) ایسے واقعات کے نپٹارے کیلئے خصوصی عدالتوں کا قیام ہونا چاہئے۔

(۵) ایسے عدالتوں کے مجاز افسر کو کیسوں کی یکسوئی میں مقررہ کوٹہ دینے کی مجبوری نہیں ہونی چاہئے۔

(۶) استغاثہ کی طرف سے اہل اور مستند وکیل/سرکاری افسران کی طرف سے ہی ریاستی حکومت کی طرف سے پیروی کی جانی چاہئے۔

(۷) ان کیسوں کیلئے الگ سے استغاثہ سیل تشکیل ہونی چاہیے، جو مقدموں کے فیصل کرنے میں تعاون کرے۔

(۸) ایسے مقدمات کا فیصلہ زیادہ سے زیادہ ۲/سال میں ہونے کا انتظام ہونا چاہئے اور ہر سطح کی کارروائی کے وقت کی حد مقرر کی جانی چاہئے۔ کیس وقت پر فیصل نہ ہونے پر اس کا جائزہ لیا جانا چاہئے اور متعلقہ شخص کے خلاف کارروائی ہونی چاہئے۔

(۹) متاثرہ فریقین کو مناسب معاوضہ دینے کا بھی انتظام ہونا چاہئے۔

(۱۱) اچھے کام کیلئے افسران اور سرکاری ملازمین کو اعزازات سے نوازے جانے کا بھی انتظام ہونا چاہئے۔

(۱۱) بے گناہ لوگوں کو جھوٹے کیس میں پھنسانے کے ذمہ داروں کا تعین کر کے سزا دیئے جانے کا بھی انتظام ہونا چاہئے۔

(۲۱) ایسے کیسوں سے وابستہ افسران، ملازمین، عدالت کے مجاز حکام کو مکمل سیکورٹی فراہم کی جانی چاہئے۔

'نمیش کمیشن' کی یہ رپورٹ پڑھنے کے بعد ہم صرف ایک ہی بات کہنا چاہیں گے کہ لوگ کہتے ہیں ''تمام مسلمان دہشت گرد نہیں ہوتے، لیکن تمام دہشت گرد مسلمان کیوں ہوتے ہیں؟'' ہم پوچھتے ہیں کہ ''دہشت گرد بنا کر گرفتار کئے جانے کے بعد بے گناہ ثابت ہونے والے مسلمان ہی کیوں ہوتے ہیں؟''۔

(مضمون نگار صحافی اور آر ٹی آئی کارکن ہیں)

☆☆

مسلم نوجوانوں کی گرفتاری کا سلسلہ آخر کب تک؟

●وسیم راشد

یہ ہمارا ملک ہندوستان ہے۔ جی ہاں! ہمارا اپنا ملک، ہمارے آباء واجداد کا ملک جس کی آزادی کے لئے ہمارے بزرگوں نے اپنی جانیں قربان کردیں۔ ہمارا ملک ہندوستان کہ جب بٹوارہ ہوا تو کہا گیا کہ اب تمہارا ملک 'پاکستان' بن گیا ہے۔ وہاں جاؤ۔ لیکن ہمارے آباء واجداد نے کہا کہ نہیں، یہ ہی ہمارا وطن ہے۔ ہم یہیں پیدا ہوئے ہیں اور یہیں کی مٹی میں ملنا چاہتے ہیں۔ ہمارے پرکھوں کی قبریں یہیں پر ہیں۔ ہم ان کو چھوڑ کر کہاں جائیں۔ میں اور آپ اور ہندوستان کا ہر مسلمان اسی جذبے سے اس ملک میں رہ گیا کہ یہاں سے ہم کو کہیں نہیں جانا۔ ہم غیروں کے ملک میں کیوں جائیں اور اس طرح ہم نے 65 سال گزار دیے۔ مگر افسوس کہ آج تک ہماری وفاداری کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ اس طویل عرصہ میں بار بار ہمیں اپنی وفاداری کا ثبوت دینا پڑا۔ بار بار ہمارے بزرگوں کو یہ جتانا اور بتانا پڑا کہ ہم اس ملک کے وفادار ہیں۔ ہم اپنی وفاداری دکھانے میں لگے رہے اور ہماری نسلوں پر مظالم کے پہاڑ ڈھائے جاتے رہے۔ یہ مظالم دہشت گردی کے نام پر روا رکھے گئے۔

ہمارے نوجوانوں کو چلتے چلتے اٹھایا جانے لگا اور بغیر کوئی اطلاع دیے انہیں دہشت گرد قرار دے کر جیلوں میں ٹھونسا جانے لگا اور اب ہماری حالت یہ کردی گئی ہے کہ گھروں میں لڑکوں کو جوان ہوتے دیکھ کر مسلمان مائیں خوف سے کانپنے لگتی ہیں کہ کہیں ان کے بچے

کو پولیس بنا کسی وجہ کے اٹھا نہ لے، باپ فکر مند رہنے لگے جب تک جوان بیٹا سلامت گھر نہ لوٹ آئے۔اس وقت ہم مسلمان خوف و دہشت میں جی رہے ہیں۔ ہمارے بچوں کو بنا کسی اطلاع کے اسکولوں، مدرسوں اور ٹرینوں سے اٹھالیا جاتا ہے اور ہم کو اطلاع تک نہیں دی جاتی۔

حالانکہ دہشت گردی صرف ہندوستان کا مسئلہ نہیں تھا اور نہ ہے بلکہ دہشت گردی کی اذیت سے آج پوری دنیا پریشان ہے اور ہر طبقے میں دہشت گردانہ مزاج رکھنے والے لوگ موجود ہیں مگر شک کے دائرے میں رکھ کر معتوب کیے گئے صرف ہمارے مسلم نوجوان۔ معاملہ صرف دہشت گردی کی حدوں میں سمٹا ہوا نہیں ہے بلکہ جب بھی موقع ملا، جہاں بھی ملا اور جس طرح بھی ملا متعصب ذہن رکھنے والوں نے مسلمانوں کو اذیت پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ میرٹھ، ملیانہ، ہاشم پورہ، گجرات، فاربس گنج جیسی لمبی فہرست ہے جن میں قومی فسادات کو ہوا دی گئی اور پھر بے رحمی کے ساتھ مسلمانوں کا قتل عام ہوا، عورتوں کی عصمت دری ہوئی اور معصوم شیر خوار بچوں کو ماں کی گود سے چھین کر جلا دیا گیا۔ سب کچھ ہوا مگر ہم نے خاموشی برتی کہ شاید ظلم کرنے والوں میں انسانیت جاگ جائے، مسلم قائدین ہمارے نام پر ہمارا سودا کرتے رہے، کوئی پرسان حال نہیں اور نوبت یہاں تک آگئی کہ ہمارے نوجوانوں کو چلتے چلتے اٹھایا جانے لگا اور بغیر کسی اطلاع دیے انہیں دہشت گرد قرار دے کر جیلوں میں ٹھونسا جانے لگا اور اب ہماری حالت یہ کر دی گئی ہے کہ گھروں میں لڑکوں کو جوان ہوتے دیکھ کر مسلمان مائیں خوف سے کانپنے لگتی ہیں کہ کہیں ان کے بچے کو پولیس بنا کسی وجہ کے اٹھا نہ لے، باپ فکر مند رہنے لگے جب تک جوان بیٹا سلامت گھر نہ لوٹ آئے۔اس وقت ہم مسلمان خوف و دہشت میں جی رہے ہیں۔ ہمارے بچوں کو بنا کسی اطلاع کے اسکولوں، مدرسوں اور ٹرینوں سے اٹھالیا جاتا ہے اور ہم کو اطلاع تک نہیں دی جاتی۔ تازہ ترین واقعہ سے اگر شروع کریں تو جامعۃ الفلاح کے دو

طالب علم جن کی عمریں صرف 15,14 سال ہیں، ان کو جس طرح ٹرین سے اتارا گیا اور پھر کئی دنوں تک ان کا کوئی سراغ نہیں ملا اور جب دونوں ملے تو پتہ چلا کہ نامعلوم افراد نے حراست میں لیا تھا اور پھر دونوں کو کشمیر پولیس کی تحویل میں دیا گیا۔تحویل میں دینے والی ایجنسی کا کچھ پتہ نہیں چل پایا کہ وہ کون تھی۔ حیرت کی بات ہے کہ اس دور میں جبکہ سائنس و ٹکنالوجی چاند کی سطح پر کتنے گڑھے ہیں، اس کا پتہ لگالیتی ہے، وہاں یہ پتہ نہیں لگایا جاسکا کہ چلتے پھرتے دونو جوانوں کو دن دہاڑے اغوا کرلیا جاتا ہے 6دن تک ان کا پتہ نہیں چل پایا۔

دراصل اعظم گڑھ کو اس وقت پورے ملک میں نشانہ بنایا جارہا ہے اور یہاں کے مدرسوں کو دہشت گردی کا اڈہ سمجھا جارہا ہے۔ یہ دونوں بچے بھی ضلع اعظم گڑھ میں تعلیم حاصل کررہے تھے، غالباً ان کا یہی قصور تھا جس کی وجہ سے انہیں بلا جواز گرفتار کیا گیا۔اگر مدرسہ کے مہتمم کوشش نہ کرتے اور ریاستی حکومت سے لے کر مرکزی حکومت تک اپنی آواز بلند نہیں کرتے تو شاید ان دونوں لڑکوں کی لاشیں ہی ملتیں۔ یہ دونوں لڑکے صرف اور صرف اس لئے واپس ملے کہ پہلی بار لکھنؤ، اعظم گڑھ اور دہلی میں مسلم تنظیموں نے متحد ہوکر احتجاج درج کرایا اور مدرسہ انتظامیہ نے بھی ریاستی حکومت کو پانچ روز کی مہلت دی کہ اگر یہ لڑکے نہ ملے تو ریاستی سطح پر مظاہرہ کیا جائے گا۔اس دھمکی کے بعد ان لڑکوں کے ساتھ کھیل کھیلا گیا اور ان میں سے ایک 'وسیم بٹ' کو حزب المجاہدین کا جنگجو بتایا۔ دونوں لڑکے جو بالکل کم عمر ہیں، مدرسے میں پڑھتے ہیں، کہیں آتے جاتے نہیں، باہر کے لوگ ان سے ملنے نہیں آتے۔ ایسے میں یہ معصوم کیسے دہشت گرد بن گئے۔ جنوری میں سوپور تھانہ پر حملہ کرنے کا جو الزام ان پر لگایا گیا ہے، اس وقت دونوں بھائی چھٹی میں اپنے گھر پر موجود تھے۔ یہ ایک ایسی گتھی ہے جو سلجھنے میں ہی نہیں آتی کہ کب کسی مدرسے کے بچے کو دہشت گرد قرار دے دیا جائے۔ نہ ان کے حرکات وسکنات سے پتہ چلتا ہے، نہ ہی ان کی سرگرمیوں سے، مگر اچانک وہ دہشت گرد بن کر سامنے لے آئے جاتے ہیں۔کوئی آواز نہیں اٹھاتا، کوئی نہیں

بولتا یہ سوچ کر کہ جانے سچائی کیا ہے؟ اگر یہ نوجوان دہشت گرد ہیں تو کم سے کم اتنا تو قانون کا لحاظ رکھا ہی جائے کہ ان کو گرفتار کرنے سے پہلے گرفتاری کا جواز بتایا جائے اور اس کی اطلاع گھر والوں کو دی جائے۔ اس طرح بہار کے انجینئر فصیح الدین محمود کو سعودی عرب سے اٹھالیا جاتا ہے۔ فصیح محمود کا تعلق دربھنگہ ضلع سے ہے اور اسی کے گاؤں سے تین اور لڑکے گرفتار کیے گئے ہیں اور ان سب پر ایک ہی طرح کا الزام ہے کہ تینوں انڈین مجاہدین سے وابستہ ہیں۔ یہ گرفتاریاں بہار پولیس کو بتائے بغیر دوسری ریاستو کی پولیس نے کی ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ نوجوان واقعی کسی دہشت گردانہ سرگرمیوں میں ملوث ہیں تو انہیں اس طرح سے خفیہ طریقے پر کیوں اٹھایا جاتا ہے۔ اگر واقعی پولیس کے دعوے میں سچائی ہے تو انہیں ڈنکے کی چوٹ پر گرفتار کرنا چاہئے۔ ایسے چپ چپاتے گرفتار کرنا اس بات کی علامت ہے کہ ان معصوموں کو انتہائی خفیہ طریقے پر اس لئے پکڑا جاتا ہے کہ جب تک ان کی گرفتاریاں منظر عام پر آئیں، تب تک ان کو ٹارچر کر کے ان کے ذہن کو اپنے قبضے میں کر کے ان کو اگلوانے کے لئے تیار کرلیا جائے۔ ورنہ اے ٹی ایس کسی بھی لڑکے کو دہشت گرد سمجھ کر گرفتار کرتی ہے تو پہلے مقامی پولیس کو اطلاع کیوں نہیں دیتی۔

اگر یہی حال رہا تو پھر کچھ مافیا گروپ اور اغوا کرنے والوں کی تو چاندی ہوجائے گی۔ کسی کو بھی اغوا کرتے وقت یہ کہہ دیا جائے گا کہ دہشت گرد سمجھ کر اٹھایا ہے۔ اٹھانے والا چاہے کسی مافیا گروپ کا ہی کیوں نہ ہو۔ اس سے جرائم میں اور بھی اضافہ ہوگا اور ساتھ ہی مسلم نوجوانوں کی زندگیاں مزید خطرے میں پڑ جائیں گی۔ ظاہر ہے ملک میں امن کے لئے یہ ایک خطرناک پہلو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہار کے وزیر اعلیٰ نتیش کمار نے اے ٹی ایس کے اس طرز گرفتاری کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور کہا کہ یہ ایک غیر قانونی عمل ہے۔ بہار سے ان بچوں کو کرناٹک اے ٹی ایس نے گرفتار کیا تھا اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ کرناٹک کے وزیر اعلیٰ اس طرح سے گرفتار کرنے کو جائز ٹھہرانے کی کوشش کرتے ہوئے جو دلیل

دے رہے ہیں وہ انتہائی بچکانہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسا کرنے کی وجہ یہ ہے کہ خفیہ کارروائی کہیں فاش نہ ہوجائے اسی لئے احتیاط برتی گئی۔ ان کے اس بیان پر بہار کے پولیس ڈائریکٹر جنرل نے بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ریاستوں میں اعتماد ہونا چاہئے ورنہ یہ عدم اعتمادی خطرناک ثابت ہوگی۔ اس واقعہ کے بعد لوگ بری طرح سہمے ہوئے ہیں۔ دربھنگہ اور مدھوبنی ضلع کے لوگوں کا کہنا ہے کہ جس گاؤں کا کوئی ایک مسلمان اس طرح کے الزام میں پکڑا جاتا ہے تو اس پورے گاؤں کے مسلمانوں کو دہشت گردوں کا مددگار مان لیا جاتا ہے، یہی نہیں پورے خاندان کے لوگ اس سے کنارہ کر لیتے ہیں۔ گاؤں کے لوگ اس سے کتراتے ہیں۔ شہروں میں بھی ایسے نوجوانوں کی زندگی آسان نہیں ہوتی۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے دہلی کے ایک نوجوان محمد عامر کو 14 سال تک بغیر کسی گناہ کے جیل میں رکھا گیا۔ جب وہ جیل سے باہر آیا تو اس کی ماں اندھی ہوچکی تھی اور باپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ یہ لڑکا آج بھی بے یار و مددگار زندگی گزار رہا ہے۔ یہی حال ہوتا ہے ان تمام مسلم لڑکوں کا جن کو بلا کسی وجہ کے دہشت گردی کے الزام میں پھنسا کر سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا جاتا ہے۔ خدارا! اس کھیل کو بند کرو۔ اگر مسلم لڑکے گناہگار ہیں تو قانونی طریقے سے گرفتار کرو، ہم سب ان کی سزا میں شامل رہیں گے مگر جو ظلم ہے۔ اس میں ہم کسی طرح بھی ہتھار نہیں ڈالیں گے اور لڑیں گے اپنے حق کے لئے۔

(مضمون نگار چوتھی دنیا کی ایڈیٹر ہیں)

☆☆

مسلم نوجوان کی گرفتاری
یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا؟

● ادارہ

دہشت گردانہ کارروائیوں میں ملوث ہونے کے الزام میں چند برسوں قبل بڑی تعداد میں مسلم نوجوانوں کی گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا۔ پورے ہندوستان سے پڑھے لکھے نوجوانوں کو مختلف دھماکوں اور ہندوؤں کے خلاف جہاد کرنے کے الزام میں ماخوذ کیا گیا اور ان پر بغیر مقدمہ چلائے ان کو برسوں جیل کی کالی کوٹھریوں میں اذیت ناک زندگی گزارنے پر مجبور کیا گیا۔ ان میں اب بھی کافی نوجوان سلاخوں کے پیچھے اذیت ناک زندگی گزار رہے ہیں۔

مسلمانوں پر عتاب:

مسلم تنظیموں کو مشتبہ قرار دے کر ان سے وابستہ لوگوں کو مستقل ہراساں کرنے کا سلسلہ شروع ہوا اور ملک میں یہاں بھی تخریبی کارروائیاں یا بم دھماکے ہوئے، ان سب کو مسلم نوجوانوں کی کارستانی قرار دی گئی۔ بعض ایسی تنظیمیں گڑھی گئیں، جن کا عملی سطح پر کوئی وجود نہیں تھا، پھر بھی ان سے الزامات وابستہ کر کے مسلمانوں پر عتاب جاری کرنے کا ایک نہایت مکروہ کھیل شروع کیا گیا۔ گرفتار کیے گئے نوجوانوں کے سلسلے میں ان کے اہل خاندان، مسلم تنظیمیں اور ملک کے انصاف پسند افراد مسلسل آواز اٹھاتے رہے، ان کے

ساتھ انصاف کرنے کی دہائی دیتے رہے، لیکن سرکاری تفتیشی ایجنسیوں، پولس انتظامیہ، حتی کہ مرکزی حکومت کے ذمہ داران نے کبھی بھی نہ ان پر کان دھرنے کی ضرورت سمجھی اور نہ ہی ان مطالبات کو سنجیدگی سے قبول کیا گیا۔ سرکاری کہانیوں کو ہمارے میڈیا نے بھی مرچ مسالہ لگا کر خوب اچھالا اور پوری قوم کو شبہات کے گھیرے میں لاکر کھڑا کردیا، لیکن مالیگاؤں بم دھماکے کے بعد چند فرض شناس پولس افسران کی تفتیش سے یہ بات سامنے آئی کہ ملک میں ہندو دہشت گردوں کی بھی کئی تنظیمیں سرگرم عمل ہیں اور اب تک ہونے والے بیشتر تباہ کن بم دھماکوں میں ان کے ملوث ہونے کے واضح ثبوت موجود ہیں اور اس سلسلہ میں آر ایس ایس اور اس کی ذیلی تنظیموں کے کئی دہشت گردوں کی گرفتاری عمل میں آئی اور انہوں نے اپنے اعترافی بیانات میں اپنے خوفناک کرتوتوں اور تباہ کن ارادوں کی تفصیلات پیش کیں، تو سرکاری سطح سے لے کر فرقہ پرستوں اور میڈیا تک کی زبان لڑکھڑانے لگی اور اب یک طرفہ الزامات کو کسی قدر نرم لہجے میں پیش کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ آہستہ آہستہ جب ہندو دہشت گرد تنظیموں کی دہشت گردانہ کارروائیوں پر سے پردہ ہٹنا شروع ہوا، تو بادل نخواستہ حکومت تک نے یہ بات قبول کرلی کہ سمجھوتہ ایکسپریس، مالیگاؤں کے تمام دھماکے، مکہ مسجد، اجمیر شریف کی درگاہ، پربھنی، ناندیڑ، کانپور اور دیگر کئی بم دھماکوں میں انہی ہندو دہشت گرد تنظیموں کا ہاتھ تھا اور اس سلسلے میں جو سینکڑوں مسلم نوجوانوں کو گرفتار کیا گیا ہے، ان کے کیس کی فوراً سماعت شروع کی جائے گی۔

ہندو دہشت گرد تنظیمیں ملوث:

عوامی سطح پر اس کے بعد کم از کم یہ دو باتیں تو تسلیم کرلی گئیں کہ ملک میں دہشت گردانہ کارروائیوں میں صرف مسلمان نہیں، بلکہ ہندو دہشت گرد تنظیمیں بھی بڑے پیمانے پر ملوث ہیں اور دوسری بات یہ کہ اب تک یہ جو بہت بڑی تعداد میں دہشت گردی کے الزام میں

مسلم نوجوانوں کو گرفتار کیا گیا ہے یا پولس نے فرضی انکاؤنٹر میں مار ڈالا ہے، ان میں بیشتر کارروائیاں متعصّبانہ اور غیر قانونی تھیں اور ہماری تفتیشی ایجنسیوں اور پولس انتظامیہ نے بربریت کا ثبوت دیا ہے۔ دہلی کے جامعہ نگر کے علاقہ بٹلہ ہاؤس میں ہونے والے پولس انکاؤنٹر کے سلسلے میں اتنے ثبوت وشواہد موجود تھے کہ خود حکمراں جماعت کے قائدین اور پارٹی کے سکریٹری پورے ہندوستان میں کہتے پھرے کہ یہ انکاؤنٹر فرضی تھا اور معصوم نوجوانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے۔ جب دہشت گردانہ کارروائیوں کے الزام میں گرفتار کیے گئے مسلم نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد کے کیس کی سماعت عدالتوں میں شروع ہوئی، تو دنیا نے دیکھا کہ کس طرح بے بنیاد الزامات کے تحت انہیں غلط طریقے سے گرفتار کیا گیا تھا اور اب تک بغیر مقدمہ چلائے ان کی زندگیاں برباد کی جا رہی تھیں۔ مکہ مسجد، مالیگاؤں، اجمیر درگاہ اور دیگر دھماکوں کے الزام میں بعد میں ہندو دہشت گردوں کو گرفتار کیا گیا اور ان پر الزامات بھی ثابت ہوگئے، اس کے باوجود انہی دھماکوں کے الزام میں گرفتار کئے گئے مسلم نوجوانوں کے کیس کی سماعت کرنے یا پھر انہیں بے گناہ قرار دے کر ان کو رہا کرنے کے معاملے میں حکومت اور ان کی ایجنسیاں مسلسل غیر منصفانہ، بلکہ متعصّبانہ رویہ اپناتی رہیں۔ سماجی تنظیموں اور گرفتار شدگان کے لواحقین کی رات ودن کی دوڑ دھوپ کے بعد اچھی خاصی تعداد میں مسلم نوجوانون کا معاملہ عدالت میں پیش کیا گیا اور ان میں بیشتر الزامات سے بری قرار دیئے گئے، لیکن اب بھی ایک خاصی بڑی تعداد انصاف کے انتظار میں جیل کے عقوبت خانوں میں اذیت ناکی کی زندگی گذار رہی ہے، لیکن ہندو دہشت گردوں کے منظر عام پر آنے اور ان کی گرفتاریوں کے بعد ان کے کرتوتوں کی تفصیلات کے ظاہر ہونے کے بعد اچانک حالات میں اتنی تبدیلی ضرور آئی کہ مسلم نوجوانوں کی غیر قانونی گرفتاریوں کے بے لگام سلسلے میں کمی آئی اور مسلمانوں کے لئے خوف ودہشت کا جو ماحول بنانے کا پروگرام شروع کیا گیا تھا، اس پر کچھ دنوں کے لئے روک لگا دی گئی۔

مسلم نوجوانوں کی گرفتاریاں:

یہ روک بالکل عارضی تھی اور اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ہندو دہشت گردوں کی گرفتاری نے اس پورے معاملے کو ایک بالکل نیا رخ دے دیا تھا اور اب یک طرفہ کارروائی کرنا مشکل سا لگنے لگا تھا، لیکن حالیہ دنوں جس طرح بے بنیاد الزام لگا کر ملک کے مختلف علاقوں سے مسلم نوجوانوں کو گرفتار کرنے کا سلسلہ پھر شروع کیا گیا ہے اور اچانک اس میں شدت آگئی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پرانے بنائے ہوئے منصوبے کے تحت پھر کارروائی شروع ہوگئی ہے۔ اس مرتبہ جن نوجوانوں کو گرفتار کیا گیا ہے، اس میں بیشتر نوجوان اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اچھے عہدوں پر فائز ہیں اور جو طالب علم ہیں، وہ بھی شاندار تعلیمی ریکارڈ رکھتے ہیں۔ ان سے پہلے دہلی اور دربھنگہ سے جن نوجوانوں کو گرفتار کیا گیا تھا، وہ بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اچھی کمپنیوں میں ملازمت سے وابستہ تھے۔ گویا اب گرفتار کرتے وقت اس کا خیال رکھا جا رہا ہے کہ ایسے پڑھے لکھے اور اچھی ملازمتوں سے وابستہ نوجوانوں کو گرفتار کیا جائے، جو معاشرے میں اپنی اچھی شبیہ رکھتے ہیں، تاکہ ایک تو مسلم معاشرے میں پڑھا لکھا طبقہ بھی مشکوک ہوکر رہ جائے، دوسرے اچھی اور بڑی کمپنیاں بھی اب اچھی صلاحیت اور قابلیت رکھنے والے مسلم نوجوانوں کے سلسلے میں منفی رویہ اپنانے پر مجبور ہوجائیں اور کسی قسم کا رسک لینے کے بارے میں نہ سوچیں۔

سب کا درجہ یکساں:

مرکزی حکومت ہو یا پھر اس کی مخالف کسی دوسری پارٹی کی ریاستی سرکار، اب تک دہشت گردی کے نام پر مسلم نوجوانوں کو ہراساں کرنے، گرفتار کرنے اور بعض دفعہ فرضی انکاؤنٹر میں مار ڈالنے کے سلسلے میں سب کا رویہ یکساں رہا ہے اور اس وقت جبکہ ملک میں سیاسی حالات بے حد غیر اطمینان بخش ہیں اور مرکزی حکومت الزامات سے چاروں طرف

سے گھری ہوئی خود اپنی جان بچانے کی تگ ودو میں لگی ہوئی ہے اور کسی بھی سیاسی پارٹی کو اس وقت اقتدار کی کرسی کی طرف دیکھنے کے علاوہ کوئی بات سجھائی نہیں دے رہی ہے، ان حالات میں مسلم نوجوانوں کو گرفتار کرنے کے اس نئے سلسلے پر کوئی سننے کے لئے بھی تیار ہوگا، اس کی کوئی امید نظر نہیں آتی ہے۔ حالانکہ اگر اس نہایت گمبھیر مسئلہ پر مرکزی حکومت دھیان دینا چاہے، تو اس کے لئے کوئی بہت مشکل کام نہیں ہے، کیونکہ اب تو بہت سارے ایسے ثبوت وشواہد اور دستاویزات موجود ہیں، جن سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ مسلم نوجوانوں کو بالکل کسی خاص منصوبے کے تحت ٹارگٹ بنایا جا رہا ہے اور اس سلسلے میں ہماری تفتیشی اور خفیہ ایجنسیاں ظلم اور بے ایمانی کا ثبوت پیش کرتی رہی ہیں۔ گذشتہ دنوں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بعض اساتذہ پر مشتمل منیشا سیٹھی کی قیادت میں ایک ٹیم نے ایک تحقیقی دستاویز شائع کی ہے، جس میں دہلی پولس کے اسپیشل سیل کے ذریعہ گرفتار کیئے گئے ان 14 مسلم نوجوانوں کے کیس کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں، جنہیں دہشت گردی کے الزام میں گرفتار کیا گیا اور کافی عرصے تک عدالت میں پیش نہیں کیا گیا، لیکن جب ان کا کیس عدالت تک پہنچا، تو عدالت نے ان کے خلاف کوئی ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے ان کو باعزت بری کر دیا۔ اور اس دستاویز میں اعداد وشمار پیش کر کے یہ بھی ثابت کیا گیا کہ اب تک جتنے بھی گرفتار شدگان کے کیس عدالت میں پہنچے ہیں، ان میں بہت ہی کم لوگوں پر پولس الزام ثابت کرنے میں کامیاب ہوسکی ہے۔ پولس اور ایجنسیوں کے اس طرح ایکسپوز ہونے کے باوجود آخر حکومت اپنے رویہ میں تبدیلی لانے کے لئے تیار کیوں نہیں ہے؟۔

(بشکریہ نئی دنیا)

☆☆

بے قصور مسلم نوجوانوں کی گرفتاری کا سچ!

● مولانا اسرار الحق قاسمی

دہشت گردی کے الزام میں جس بڑے پیمانہ پر مسلم نوجوانوں کو گرفتار کیا گیا ہے، اس نے پورے مسلم طبقہ کو ہراساں و پریشاں کر دیا ہے۔ ہر مسلمان گھر سے باہر نکلتے وقت یہ خطرہ محسوس کرنے لگا ہے کہ کہیں راہ میں اسے گرفتار نہ کرلیا جائے بلکہ گھر میں بیٹھے ہوئے مسلمان بھی اس خوف سے کپکپانے لگے ہیں کہ کہیں انہیں گھر سے ہی نہ اٹھالیا جائے اور پھر کسی ایسے نامعلوم قید خانے میں ڈال دیا جایا جائے جہاں ان کی کوئی سننے والا نہ ہو، جہاں ان پر اذیتوں کے پہاڑ توڑے جائیں اور جہاں انہیں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے پر مجبور کیا جائے۔

جی ہاں! یہ خدشہ انہیں اس لئے دامن گیر ہوتا ہے کہ وہ آئے دن اپنے پڑوس، اپنے محلے، اپنے گاؤں وشہر کے نوجوانوں کو پولس کے ہاتھوں دہشت گردی کے الزام میں گرفتار ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ کبھی گھروں سے اٹھاتے ہوئے بھی دیکھتے ہیں جب کہ وہ نوجوان بے قصور ہوتے ہیں، ان کے ریکارڈ صاف ستھرے ہوتے ہیں لیکن پولس اہلکار اور تفتیشی ایجنسیاں ان کے دہشت گرد ہونے پر اصرار کرتی ہیں اور ثبوت بھی گھڑ لیتی ہیں مگر چونکہ جھوٹ جھوٹ ہی ہوتا ہے جو کسی نہ کسی دن بے نقاب ہو ہی جاتا ہے۔

اگرچہ دہشت گردی کے الزام میں گرفتار تمام مسلمانوں کے معاملات کی اصلیت کو سامنے لانے کے لئے ہنوز جستجو نہیں کی جاسکی ہے، تاہم جن معاملات کی چھان بین کی گئی

اور حقائق معلوم کئے گئے ان میں سے زیادہ تر گھڑے ہوئے نکلے۔ ایسے بہت سے مسلم نوجوانوں کو عدالتیں بری کر چکی ہیں اور یہ کہہ چکی ہیں کہ وہ نوجوان بے قصور تھے۔ علاوہ ازیں ایسے متعدد مقدمات جو ہنوز فیصلہ کے مرحلے تک نہیں پہنچے ہیں ان کے تعلق سے جو حقائق سامنے آئے ہیں وہ بھی چونکا دینے والے ہیں، کیونکہ ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلم نوجوانوں کو کتنی بے دردی کے ساتھ گرفتار کیا جاتا ہے، ان کے خلاف سازشیں رچی جاتی ہیں، انہیں منصوبہ بند طریقے سے اٹھایا جاتا ہے اور ان کے خلاف ثبوت گھڑے جاتے ہیں۔ مثلاً:

مکہ مسجد میں بم دھماکے ہوئے، جمعہ کا دن تھا، کئی نمازی آناً فاناً موت کی آغوش میں چلے گئے اور متعدد زخمی ہو گئے۔ جائے واردات اس طرف اشارہ کرتے تھے کہ اس کے ذمہ دار مسلم مخالف عناصر ہوں گے لیکن حیرانی اس وقت ہوئی جب اس کے الزام میں مسلم نوجوانوں کو ہی گرفتار کیا گیا، وہ بھی غیر قانونی طریقوں سے۔ جن نوجوانوں کو گرفتار کیا گیا ان میں ایک نام ابراہیم جنید کا تھا۔ ابراہیم جنید کو ۳/ستمبر ۲۰۰۷ء کو اغواء کے انداز میں گرفتار کیا گیا۔ پتہ نہ چلنے پر ۵/ستمبر کو ابراہیم کے گھر والوں نے حیدرآباد ہائی کورٹ میں تلاش گمشدہ کی درخواست دی۔ اس کا جواب پولس نے ۱۳/ستمبر کو یہ دیا کہ حیدرآباد پولس نے ابراہیم جنید کو ۸/ستمبر کو گرفتار کیا ہے۔ ابراہیم جنید سمیت دیگر بے قصور ملزموں کو قصوروار ٹھہرانے کے لئے پولس نے متعدد ثبوت گھڑ ڈالے تاکہ کسی طرح گرفتار کئے گئے نوجوان دہشت گرد اور مکہ مسجد میں بم دھماکوں کے ذمہ دار ثابت ہو سکیں لیکن عدالت اپنی تحقیق کے بعد بالآخر اس نتیجہ پر پہنچی کہ پولس نے جو کہانی گھڑی وہ فرضی تھی، جن نوجوانوں کو گرفتار کیا گیا تھا، وہ بے قصور تھے۔ چنانچہ عدالت نے انہیں بری کر دیا۔

مالیگاؤں بم دھماکوں کے الزام میں گرفتار مسلم نوجوانوں کی کہانی بھی بڑی دردناک ہے جنہیں زبردستی دھماکوں کا ذمہ دار ٹھہرانے کی کوشش کی گئی۔ مالیگاؤں بم دھماکے ۸/ستمبر

۲۰۰۶ء میں ہوئے تھے۔ ان دھماکوں کی زد میں آکر قریب ۳۸/افراد جاں بحق ہوئے اور ۱۰۰/سے زائد زخمی۔ مرنے اور زخمی ہونے والے تقریباً سب ہی مسلمان ہی تھے۔ ہر چند کہ تفتیشی اصولوں کا تقاضا تھا کہ مسلم مخالف گروہوں کو شک کے دائرے میں لیا جاتا لیکن یہاں بھی مکہ مسجد والی کہانی دہرائی گئی اور مسلم نوجوانوں کو ہی گرفتار کیا گیا۔ اس دھماکے کے الزام میں ۹/مسلم نوجوانوں کو گرفتار کیا گیا اور ان پر مقدمات چلائے گئے۔ اس سارے معاملے میں پولس اور خفیہ ایجنسیوں کا کردار ایک طرح سے منفی ہی رہا۔ حادثے کا ماسٹر مائنڈ شبیر مسیح اللہ نامی شخص کو قرار دیا گیا جبکہ شبیر مسیح اللہ دو مہینے پہلے سے ہی ممبئی پولیس کی حراست میں تھا۔ اسی معاملے میں محمد زاہد عبدالماجد انصاری کو بھی گھسیٹا گیا اور اس پر الزام یہ لگایا گیا کہ اس نے دہشت گردانہ کارروائی کو عملی جامہ پہنایا جب کہ عدالت نے اپنی تحقیق کے دوران یہ پایا کہ محمد زاہد مالیگاؤں سے ۴۰۰/کلومیٹر کے فاصلے پر پھول ساونگی گاؤں ایوت محل ضلع مہاراشٹر میں جمعہ کی نماز کی امامت کر رہا تھا۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ وہ شخص جو سیکڑوں کلومیٹر دور ہو وہ کس طرح اپنے ہاتھوں سے بم نصب کر سکتا ہے۔ اسی واقعہ کے ایک اور ملزم ابرار احمد نے ۱۸/اپریل ۲۰۰۹ کو عدالت میں یہ حلف نامہ داخل کیا کہ اسے ۲۳ اور ۲۴/اکتوبر ۲۰۰۶ کو غیر قانونی حراست کے دوران کرنل پروہت کے گھر دیولالی کیمپ ناسک میں رکھا گیا۔ جب کہ کرنل پروہت وہ شخص ہے جس پر مالیگاؤں، مکہ مسجد، اجمیر شریف اور سمجھوتہ ایکسپریس میں دھماکوں کی پلاننگ کا الزام ہے۔ یہ بھی رپورٹوں سے ثابت ہو چکا ہے کہ کرنل پروہت کے اسرائیل سے گہرے تعلقات تھے اور وہ ہندوستان سے جمہوریت کا خاتمہ کر کے ہندو راشٹر بنانے کے لئے اسرائیل سے تعاون چاہتا تھا اور اسرائیل بھی اس کی ہر طرح سے معاونت کرنے کے لئے تیار تھا۔ ایسے ملک دشمن اور دہشت گردانہ دھماکوں کے ملزم کے گھر پر پولیس کا ابرار احمد کو رکھنا ایک عجیب سی بات ہے۔ کیا اس سے یہ اشارہ نہیں ملتا کہ پولس کے کرنل پروہت سے قریبی تعلقات رہے ہوں گے

اور پولیس اس کی حمایت یا مدد کرتی ہوگی؟ اہم بات یہ ہے کہ مالیگاؤں دھماکوں کے لئے پولیس نے جن ۹ رمسلم نوجوانوں کو ذمہ دار ٹھہرایا، عدالت نے اپنی تحقیق اور چھان بین میں ان کو بے قصور پایا اور بری کر دیا۔ اب یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارے ملک کی پولیس اور تفتیشی ایجنسیوں کو اتنا بھی اندازہ نہیں کہ کون حقیقی دہشت گرد ہو سکتا ہے اور کون بے قصور؟ اگر واقعی ہمارے ملک کی پولیس اس شعور سے محروم ہے تو اسے ملک کی بدقسمتی ہی کہا جائے گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ پولیس اچھی طرح سے جانتی ہے مگر جب وہ جان بوجھ کر بے قصوروں کو قصوروار اور قصورواروں کو بے قصور ٹھہرانے پر تل جائے تو پھر کیا کیا جا سکتا ہے؟ پولیس اور خفیہ ایجنسیوں کے ذریعہ بے قصور کو قصوروار ثابت کئے ہوئے شخص کے سامنے اپنے بے قصور ہونے کو ثابت کرنے کا صرف ایک ہی راستہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ ہے عدالتوں کی طرف رجوع۔ عدالتوں نے مکہ مسجد اور مالیگاؤں بم دھماکوں کے بے قصور مسلم ملزمین کی صحیح طور پر چھان بین کی اور بالآخر پولیس کے جھوٹ کا پردہ فاش کر کے انہیں بری کر دیا، لیکن سوال یہ ہے کہ جن بے قصوروں کو پولیس کے ذریعہ گرفتار کیا گیا ہے کیا ان کے اہل خانہ اتنی استطاعت رکھتے ہیں کہ عدالتوں میں مقدمات لڑیں؟ کیا وکیل کی فیس دینے، عدالتوں کے چکر کاٹنے اور اس سے متعلقہ دیگر قسم کے اخراجات کو برداشت کرنے کے اہل ہیں؟ اگر اس کا جائزہ لیا جائے تو اس نتیجہ پر پہنچنا کچھ دشوار نہیں کہ ایسے کتنے ہی نوجوان قید و بند کی صعوبتیں برداشتیں کر رہے ہیں جن کے والدین اپنی غربت کی وجہ سے ان کے مقدمات کی پیروی نہیں کر سکتے۔

اتر پردیش کے گورکھ پور، فیض آباد اور بارہ بنکی میں ۲۳ رنومبر ۲۰۰۷ رکو سلسلہ وار بم دھماکے ہوئے جن میں مجموعی طور پر تقریباً ۱۴ رافراد مارے گئے۔ اتر پردیش کی اے ٹی ایس نے ان دھماکوں کا الزام طارق قاسمی اور خالد مجاہد پر لگایا اور اس کے لئے اس طرح ڈرامہ رچا کہ بارہ بنکی ریلوے اسٹیشن سے ان کی گرفتاری دکھائی، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ طارق

قاسمی کو ۱۲ ردسمبر ۲۰۰۷ کو اس وقت اغواء کیا گیا تھا جب وہ اپنی موٹر سائیکل سے تبلیغی جماعت کے ایک پروگرام میں شرکت کے لئے شیرواں ضلع اعظم گڑھ جا رہا تھا۔ ۱۴ ردسمبر کو طارق قاسمی کے دادا نے مقامی پولیس اسٹیشن میں شکایت بھی درج کرائی تھی اور اتر پردیش کی وزیر اعلیٰ کو بھی درخواست بھیجی تھی۔ جب کہ دوسری طرف خالد مجاہد کو ۱۶ ردسمبر ۲۰۰۷ کو مڑیاہوں بازار ضلع جونپور سے اغواء کیا گیا تھا۔ سادہ لباس میں ایس ٹی ایف کے جوانوں نے خالد کو ٹاٹا سومو میں زبردستی بٹھایا۔

غور کرنے کا مقام یہ ہے کہ پولیس کس طرح سے بے قصوروں کو دہشت گرد ثابت کرنے میں لگی رہتی ہے اور طرح طرح کے جھوٹے افسانے گھڑتی ہے۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ جب تک پولیس اور خفیہ ایجنسیاں اس طرح کا گھناؤنا کردار ادا کرتی رہیں گی، اس وقت تک ملک سے دہشت گردی کا خاتمہ نہیں ہو سکے گا، کیونکہ اصل دہشت گرد آزاد گھومتے رہیں گے اور بے قصور پکڑے جاتے رہیں گے، لہٰذا پولیس اور تفتیشی ایجنسیوں کو راہ راست پر لانا انتہائی ضروری ہے۔

(مضمون نگار مشہور عالم دین اور ممبر پارلیمنٹ ہیں)

☆☆

باب سوم

بے گناہوں کی کہانی خود انہی کی زبانی

داستان بم دھماکوں کے بے گناہوں کی!

مالیگاؤں بم دھماکوں کے الزام میں قید و بند کی صعوبتیں اٹھانے کے بعد ۱۶ نومبر ۲۰۱۱ کو ۷؍مسلم نوجوان رہا ہوئے۔ سوال یہ ہے کہ اب وہ کس حال میں ہیں؟ جانئے ان کی کہانی ان کی زبانی، ان کے شب و روز کس طرح گذر رہے ہیں۔ روزنامہ انقلاب سے وابستہ صحافی مختار عدیل کی رپورٹ۔

پانچ سال قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے کے بعد جب رِہائی ملی تو مالیگاؤں بم دھماکوں کے ملزمین کیلئے باہر کی دنیا بالکل بدلی ہوئی تھی۔ اے ٹی ایس اور پھر سی بی آئی نے ان پر دہشت گردی کا جو دھبہ لگایا تھا وہ ہیمنت کرکرے کے ذریعہ بھگوا دہشت گردوں کی گرفتاری نیز سوامی اسیمانند کے اس اعتراف کے بعد کہ ۲۰۰۶ کے دھماکے بھی انہی کے گروپ کی کارستانی تھے، پوری طرح سے ہٹا تو نہیں کچھ ہلکا ضرور ہو گیا ہے۔ ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد ان لوگوں کیلئے ایک بڑا چیلنج جہاں اپنی بے گناہی ثابت کرنا ہے وہیں رہائی کے بعد سماج میں اپنے کھوئے ہوئے وقار کی بحالی اور اپنے بال بچوں کی پرورش کیلئے ابتر ہو چکی معاشی حالت کو سدھارنا بھی ہے۔

رہائی کے بعد سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں:

ڈاکٹر سلمان فارسی اس لحاظ سے خوش قسمت رہے کہ انہیں ملازمت کی تلاش کیلئے دردر

کی ٹھوکر نہیں کھانی پڑی جہاں ان پر لگا دہشت گردی کے الزام کا دھبہ آڑے آ سکتا تھا۔ البتہ یہ ہوا کہ ممبئی کے گوونڈی علاقے میں کامیابی سے چل رہا ان کا جو مطب گرفتاری کی وجہ سے بند ہوا تھا وہ اسے دوبارہ شروع نہیں کر سکے۔ اب وہ مالیگاؤں میں اپنے گھر پر ہی مطب چلاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے خود کو سماجی اور سیاسی سرگرمیوں میں بھی مصروف کر لیا ہے۔

ڈاکٹر سلمان فارسی کو رہائی کے بعد نئی آزمائش سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک آزمائش جیل کے اندر تھی دوسری جیل سے نکلنے کے بعد۔ ان کے مطابق شروع شروع میں تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ جیل کے کرب سے معنوی آزادی تو مل گئی لیکن جو ذہنی کوفت طاری تھی وہ کم نہیں ہوئی تھی۔ ڈاکٹر فارسی نے بتایا کہ ''حالات کچھ اس طرح ابتر تھے کہ ابھی تک سدھرے نہیں ہیں۔ گھر کی معاشی حالت خراب ہو چکی تھی۔ ایک طرف گھر گرہستی دیکھنا تھا تو دوسری طرف بچوں کی تعلیم اور لازمی اخراجات بھی سامنے تھے۔''

ڈاکٹر سلمان فارسی نے بتایا کہ ''گھر کی معاشی حالت سدھارنے کیلئے ذہنی یکسوئی کی ضرورت ہوتی ہے جو دھیرے دھیرے معمول پر آئی۔ شب و روز یہی کوشش ہوتی کہ کسی بھی طرح دو پیسے کا انتظام ہو جائے تاکہ کسی کے آگے دست سوال دراز کرنے کی نوبت نہ آئے۔'' انہوں نے بتایا کہ ''رہائی کے بعد مالیگاؤں کے پرانے مکان میں مطب شروع کر دیا ہے جہاں اہلیہ پریکٹس کرتی تھیں۔'' بہرحال وہ اس سے مطمئن نہیں اور جلد ہی ایک نیا کلینک شہر کے جنوبی علاقہ کی گنجان مسلم بستی میں شروع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر سلمان فارسی نے سماجی اور سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا بھی شروع کر دیا ہے اور سماجوادی پارٹی کی مقامی یونٹ سے منسلک ہو گئے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے بتایا کہ ابتداء سے ہی قومی اور ملّی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا جذبہ رہا ہے اس جذبہ کو بروئے کار لانے کیلئے کسی سیاسی جماعت سے منسلک ہونا ضروری تھا۔

۵ سال کی قید اور گھر میں چوری کی دہری مار کے باوجود شبیر مسیح اللہ نے خود کو سنبھالا:

اے ٹی ایس کے ذریعہ مالیگاؤں (۲۰۰۶) کے بم دھماکوں کے الزام میں گرفتاری کے ساتھ ہی شبیر مسیح اللہ کا بیڑی کا کاروبار تباہ ہو گیا تھا۔ یہ ان کے اہل خانہ کیلئے دہری مار تھی۔ ایک طرف جہاں ذریعہ معاش بند ہو گیا تو دوسری جانب عدالتی کارروائی میں تیزی سے پیسے خرچ ہونے لگے۔ ۵ سال بعد ضمانت پر رہائی نصیب ہوئی تو شبیر مسیح اللہ کو زندگی کی گاڑی نئے سرے سے شروع کرنی تھی۔ دکان میں تالا لگتے ہی شبیر مسیح اللہ کے اہل خانہ امتحان میں مبتلا ہو گئے اور اب رہائی کے بعد شبیر مسیح اللہ کا امتحان تھا کہ وہ کس طرح ایک نئی زندگی شروع کرنے میں کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ شہر کے مچھلی بازار سے متصل ایک گلی میں شبیر مسیح اللہ کی بیڑی کی دکان اور جعفر نگر میں ایک گودام تھا۔ شبیر کے مطابق رہائی ملنے کے کچھ دنوں بعد جب میں نے اپنی دکان کا شٹر کھولا تو اُس میں کچھ پرانی بیڑیاں نظر آئیں۔ کاروبار کی شروعات انہی بیڑیوں سے کی۔ انہیں درست کر کے فروخت کر دیا۔ اُس کے بعد گودام میں پہنچا تو وہاں کا نقشہ بدلا ہوا تھا۔ گودام میں رکھی ہوئی بہت ساری اشیاء تفتیش کاروں نے تلاشی کے بہانے تباہ کر دی تھیں اور کچھ چوری بھی ہو گئیں۔ انہوں نے بتایا کہ گرفتاری کے بعد ایک دوسری مار ان کے خاندان پر اس وقت پڑی جب (۲۰۰۸) میں مکان میں چوری ہو گئی۔ شبیر کے مطابق ''میرے مکان میں چوری ہوئی تھی اور چوروں نے پورا مکان صاف کر دیا تھا۔ بیوی کے زیور، گھریلو ساز و سامان نقدی کپڑے سبھی چور اُڑا لے گئے تھے۔ ایسے حالات میں میری رہائی کے بعد کئی امتحانات یکے بعد دیگرے آتے گئے لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم تھا کہ دوستوں رشتہ داروں اور بہی خواہوں نے میری ڈھارس بندھائی اور دوبارہ کاروبار شروع کرنے کیلئے حوصلہ دیا نیز نیک خواہشات اور مشوروں سے نوازا۔

شبیر مسیح اللہ کے مطابق ''گرفتاری سے قبل جو اثاثہ تھا وہ رہائی ملنے تک برباد ہو چکا

تھا۔۵ سال کی قید کے دوران قانونی معاملات میں بھی خطیر رقم خرچ ہوچکی تھی۔اَب ایسے حالات میں دوبارہ کاروبار شروع کرنا بہت مشکل تھا۔'' انہوں نے بتایا کہ مالیگاؤں میں 'مارشل بیٹری' ہر خاص و عام میں مقبول تھی اس لئے خیال یہی آیا کہ دوبارہ بیٹری کاروبار شروع کیا جائے۔

انہوں نے کہا کہ دکان میں رکھی ہوئی چار پانچ بیٹریاں اور گودام میں پڑے ہوئے بھنگار کو فروخت کرکے ۳۰ / ہزار جمع کئے اور یہی کل پونجی بیٹری کے کاروبار میں لگادی۔ ۳۰ / ہزار میں کاروباری رولنگ ہونے لگی اور آہستہ آہستہ معاشی حالت بہتر ہونے لگی۔آج کاروبار تیزی سے پھل پھول رہا ہے اور سابقہ روایت کے مطابق سارے گاہک دوبارہ مارشل بیٹری استعمال کرنے لگے ہیں شہر کے دینی مدارس اور مساجد میں مارشل بیٹری کی تیارشدہ بیٹریاں لگائی جاتی ہیں جو مہنگی بیٹریوں کے مقابلے میں سستی اور پائیدار ہیں۔

شبیر مسیح اللہ نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اعصابی امراض کا علاج کرنا بھی شروع کردیا ہے۔ یہ ہنر انہوں نے جیل میں قید و بند کی صعوبتوں کے درمیان سیکھا۔اس سلسلے میں وہ بتاتے ہیں کہ ''جیل کے اندر یہ ہنر سیکھنے کا خیال ظالم پولیس اہلکاروں اور تفتیش کاروں کے وحشیانہ رویے کی وجہ سے آیا۔'' شبیر کے مطابق وہ ٹارچر کے سبب شدید اعصابی تکلیف کا شکار ہوگئے تھے۔جیل میں ہی انہوں نے اس تکلیف سے نجات پانے کیلئے کتابوں کا مطالعہ شروع کیا اور ایکوپنکچر و پریشر میتھڈ سیکھ لیا۔آج یہ بھی ان کے کام آرہا ہے۔

شبیر مسیح اللہ نے کہا کہ ''مچھلی بازار کی بیٹری کی دکان کے بغل میں ہی اعصابی امراض کے علاج کیلئے کلینک شروع کیا ہے جہاں اوسطاً ۲۵ / مریض روزانہ آتے ہیں۔کلینک میں نہ صرف عام آدمی بلکہ کچھ پولیس اہلکار بھی علاج کی غرض سے آتے ہیں۔'' طریقہ علاج کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ ایکوپنکچر و پریشر میتھڈ کے ذریعے جسے ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن نے بھی منظوری دی ہے، علاج کیا جاتا ہے۔شبیر مسیح اللہ نے بتایا کہ ایکوپنکچر و

پریشر طریقہ علاج میں ریڑھ کی ہڈی، گردن، اسپائنل کاڈ، ہاتھ پیر میں شدید درد، گھٹنوں کا درد وغیرہ کا علاج بغیر دوا گولی کے کیا جاتا ہے۔ چلتے چلتے انہوں نے کہا ''ضمانت پر رہائی تو نصیب ہوگئی مگر مقدمہ سے باعزت بَری ہونے کا فیصلہ اپنی زندگی میں سننا چاہتا ہوں۔''

جیل میں آرٹی آئی کے ذریعے جمع ہوئی معلومات کا اردو ترجمہ کررہے ہیں:

شب برات بم دھما کہ مقدمہ میں ضمانت پر رِہا ہونے والے ڈاکٹر فروغ انور اقبال احمد مخدومی ایک ایسے شخص کا نام ہے جس کا اقبالیہ بیان دیگر ۶ افراد سے بالکل مختلف ہے۔اے ٹی ایس اور لوکل پولیس ڈاکٹر مخدومی سے اپنی منشاء کے مطابق اقبالیہ بیان حاصل کرنے میں ناکام رہی اسی بنیاد پر ڈاکٹر مخدومی کا موقف ہے کہ این آئی اے کو گمراہ نہیں کیا گیا تو مقدمہ کا فیصلہ آسانی سے اور جلد ہونے سے کوئی روک نہیں سکتا۔جیل سے رِہائی کے چند دنوں بعد ہی انہوں نے اپنا کلینک واقع شہید عبدالحمید روڈ مسجد خانقاہ سعیدیہ کے اوپری منزلہ پر شروع کردیا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں سے ۲۰۰۶ میں ڈاکٹر مخدومی کو مقامی پولیس کی مدد سے اے ٹی ایس نے گرفتار کیا تھا۔ ڈاکٹر مخدومی کی گرفتاری کے ساتھ ہی کلینک بھی بند ہوگئی اور ۵ سال میں تقریباً ۲۰ / لاکھ کا نقصان ہوا۔تمام گولیاں، دوائیاں اور کلینک میں زیر استعمال مشینریاں سب ناکارہ ہوگئیں۔

ڈاکٹر مخدومی نے بتایا کہ ''قید و بند کے دوران بھی وقت کا صحیح استعمال کرنے کی کوشش کی۔حکومت ہند نے حق معلومات قانون (رائٹ ٹو انفارمیشن) کے ذریعے ہر شہری کو قانونی طور پر مضبوط حق فراہم کیا ہے جس کا صحیح استعمال کیا جائے تو بہت سی معلومات بیٹھے بٹھائے مل جاتی ہیں۔ آرتھر روڈ جیل میں قید کے دوران آرٹی آئی کے توسط سے سیکڑوں عریضے مرکزی و ریاستی حکومت کی اہم وزارتوں، سرکاری محکموں اور اہم شعبوں کو روانہ کئے تھے۔ایک اندازے کے مطابق روانہ کردہ عریضوں کی تعداد ۲۰۷ / کے قریب ہے۔''

ضمانت پر رِہائی کے بعد ڈاکٹر مخدومی نے جتنے آر ٹی آئی کے عریضے روانہ کئے تھے اُن کے جوابات بتدریج موصول ہو رہے ہیں۔ موصولہ جوابات کا اُردو میں ترجمہ کا کام جاری ہے، وہ اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ ''اپنا جائز حق مانگنے کا سلیقہ اور اُس کے حصول کے ذرائع کا علم ہونا بے حد ضروری ہے۔'' بطور مثال انہوں نے بتایا کہ آر ٹی آئی کے ذریعے مالیگاؤں۔ اندور ریلوے لائن کی معلومات، وزارت ریلوے سے مانگی گئی جس کی پوری معلومات جب دی گئی تو ہمیں جیل میں علم ہوا کہ اس پروجیکٹ کی خوبیوں اور خامیوں کی شرح کیسی ہے۔

مالیگاؤں کے زمینی حقائق سے اُس وقت کے ریلوے وزیر لالو پرساد یادو کو واقفیت نہیں تھی۔ چونکہ ہم جانتے تھے اس لئے کچھ تجاویز اور مشورے لکھ کر روانہ کئے گئے جس کو وزارت ریلوے نے بسر چشم قبول کیا اور فی الحال ریلوے لائن کو منظوری مل گئی ہے جس کیلئے ۱۷۵۰ کروڑ کی خطیر رقم پر مشتمل بجٹ بھی منظور ہو چکا ہے۔ مریضوں کی تشخیص کرنا، مطالعہ کرنا، معلومات جمع کرنا اور مالیگاؤں کی اجتماعی ترقی اور مسلمانوں کی ہمہ جہت ترقی کیلئے ایک جامع پروجیکٹ ترتیب دینے میں دن رات مصروف ڈاکٹر فروغ مخدومی نے بتایا کہ ''آر ٹی آئی کے ذریعے مالیگاؤں میں ٹیکسٹائل پارک، ایم آئی ڈی سی، اسپیشل اکنامی زون کا قیام، ریلوے لائن کی تعمیر، اعلیٰ تعلیمی اداروں کی منظوری، مالیگاؤں کو ضلع کا درجہ جیسے اہم بنیادی مسائل حل کئے جا سکتے ہیں۔'' ڈاکٹر مخدومی نے کہا کہ علمی کم مائیگی انتقام کی طرف راغب کرتی ہے۔ ایس ایس سی اور ایچ ایس سی کے نوجوانوں کی ذہنی تربیت کرنا بے حد ضروری ہے۔ اگر قانون کی معلومات ہوگی تو ہمارے نوجوان کبھی تفتیش کاروں کے عتاب کا شکار نہیں ہوں گے۔

کئی مرتبہ معلومات نہ ملنے کی صورت میں بھی ڈاکٹر مخدومی نے حوصلہ نہیں ہارا۔ وہ اس بات کو گرہ میں باندھ کر چلتے ہیں مشکلات کا نام ہی ہے زندگی۔ آر ٹی آئی کے سیکڑوں

عریضوں کے جوابات سپریم کورٹ، ملکوکا کورٹ سے بھی موصول ہوئے ہیں جو اُردو ترجمہ کی شکل اختیار کر رہے ہیں۔ اگر زندگی نے ساتھ دیا تو فروغ مخدومی وہ سب کام کریں گے جن کا عزم انہوں نے ۵ سال جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارتے ہوئے کیا ہے۔

رئیس احمد کسب حلال کے ذریعے قرض کی ادائیگی میں سرگرداں:

تین بیٹیاں اور دو بیٹے اسکولوں میں زیر تعلیم ہیں۔ بڑی بیٹی ایچ ایس سی کے بعد ڈی ایڈ میں داخلہ لے چکی ہے۔ بیٹا دانش بارہویں اور اُسامہ آٹھویں جماعت میں ہے۔ بیٹی فائزہ دسویں اور عائشہ سینئر کے جی میں زیر تعلیم ہے ۵۔ بچوں کی کفالت، تعلیمی اخراجات برداشت کرنے کے بعد گھر گرہستی بھی جاری رکھنا ہمالیہ جیسی مہنگائی کے اِس زمانے میں اُس شخص کیلئے انتہائی درجہ کا امتحان کہیں گے جس نے زندگی کے پانچ قیمتی سال جیل میں گزارے ہیں۔

رئیس احمد رجب علی کی زندگی آسان کم اور مشکل زیادہ ہے۔ تلاش معاش کیلئے گرفتاری سے قبل اس شخص نے ممبئی میں مشقت آمیز دن اور آزمائشی راتیں گزاری ہیں۔ مدن پورہ سانکلی اسٹریٹ کی ایک دکان پر ملازمت کی۔ قسمت کا بند تالہ کھولنے کیلئے سلائی کڑھائی کا ہنر سیکھ لیا اور کچھ بننے کیلئے دیار عرب میں سکونت اختیار کی۔ سعودی عرب سے واپسی کے بعد مالیگاؤں میں بودوباش اختیار کرنے کا ارادہ ہوا۔ چونکہ رئیس احمد کی شادی مالیگاؤں میں ہوئی تھی اس لئے یہاں پر پیر جمانے میں کوئی خاص دقت پیش نہیں آئی۔ ضمانت پر رِہا ہونے والے شبیر مسیح اللہ کی بہن رئیس احمد کی زوجیت میں ہے۔

مہاراشٹر اے ٹی ایس نے سالے بہنوئی کو ٹارگیٹ بنایا۔ پہلے شبیر احمد کی گرفتاری ہوئی اُس کے بعد رئیس احمد کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ ایک ہی خاندان سے دو ذمہ دار افراد کی گرفتاری

سے پورا خاندان مصائب میں مبتلا ہوگیا۔رئیس احمد نے کہا کہ'' نومبر۲۰۱۱ میں رِہائی ملنے کے چندمہینوں تک بے کار ہی بیٹھا رہا۔ ملنے ملانے والوں کا ہجوم صبح سے شام تک رہتا تھا۔ تھوڑی فرصت ہوئی تو کسب معاش کی فکر لاحق ہوئی۔اسی دوران شبیر احمد نے انجمن چوک میں واقع 'غزل اسٹور' کے تعلق سے گفتگو کی۔غزل اسٹور شبیر احمد کی ملکیت ہے۔گرفتاری سے قبل اس نے کسی دوسرے شخص کو کرائے پر دیا تھا۔''

چھ مہینے قبل غزل اسٹور رئیس احمد نے شبیر سے کرائے پر حاصل کیا اور دکان چلانے کیلئے تقریباً ۳لاکھ کا قرض حاصل کرلیا ہے۔قرض کی ادائیگی کی فکر پریشان کئے رہتی ہے۔ رئیس احمد کے مطابق'' ہفتے پندرہ دن میں دکان کا مال لانے کیلئے ممبئی جانا ہوتا ہے۔اور کبھی مکوکا کورٹ میں مقدمہ کی تاریخ پر عدالت جاتے ہیں تو اُدھر سے مالیگاؤں واپسی میں دکان کا مال لیتے ہوئے آتے ہیں۔'' انہوں نے کہا کہ کرائے پر اسٹور چلانے سے ایک جزوی فائدہ یہ ہوا کہ گھر گرہستی چلانے کی راہ نکل آئی،کم از کم گھریلو روزمرہ کی ضروریات تو پوری ہونے لگی ہیں البتہ دوسرے اخراجات کیلئے بہت سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ بہت جلد زندگی سہل ہوجائے گی۔

معاشی طور پر کمزور نورالہدیٰ کی پہلی ترجیح اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی ہے:

روز کنواں کھود کر، پانی پینے والوں کی بستی مالیگاؤں کے جعفر نگر میں نورالہدیٰ شمس الضحیٰ کا بوسیدہ مکان ہے۔اس بستی میں شام ہوتے ہی مزدوروں کے یہاں چولہے جلتے ہیں اور رات کا اندھیرا مہیب ہوتے ہی غریبی مزید واضح ہوکر سامنے آتی ہے۔ چھ بھائی، تین بہنوں اور ماں باپ پر مشتمل نورالہدیٰ کا پریوار اِن دنوں شدید معاشی بحران سے دوچار ہے۔جب تک نورالہدیٰ قید میں تھا،اُس کے اہل خانہ دوہری آزمائش میں مبتلا تھے۔ایک طرف گھریلو اخراجات کے پورا کرنے کی ذمہ داری تھی تو دوسری جانب قانونی کارروائیوں

کیلئے درکار نقدی ضرورت۔

نورالہدیٰ کی رِہائی کے بعد اہل خانہ کی جان میں جان آئی۔ برسوں بعد کمانے والا بیٹا ضمانت پر رِہا ہوکر پر گھر آیا تھا،مگر یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی کیونکہ نورالہدیٰ بظاہر تو صحت مند دکھائی دے رہا تھا،قمیص اور پتلون اُس کے جسم پر تنگ و چست معلوم ہوتی تھی لیکن یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ نورالہدیٰ کی جسمانی صحت ٹھیک نہیں۔اس کی وجہ نورالہدیٰ نے جو بتائی وہ یہ کہ قید کے دوران اینٹی ٹیررسٹ اسکواڈ کے اہلکاروں نے اپنی منشاء کے مطابق سب کچھ کروانے کیلئے اس پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ ڈالے تھے۔ناتواں انسانی جسم آخر کب تک برداشت کرتا؟ آخر کار نورالہدیٰ کو مستقل جسمانی سُوجن کی شکایت لاحق ہوگئی جو قید سے رِہائی کے بعد بھی بدستور جاری ہے۔

شریک گفتگو نورالہدیٰ کے چھوٹے بھائی نورالدین نے کہا کہ'' یہ 'صحت' جو بظاہر نظر آتی ہے، درحقیقت جسمانی سوجن ہے۔ قید کے دوران بھائی کو جسم پر ناک، کان اور آنکھوں کے اوپری حصے میں،سر کے دائیں بائیں، ہاتھوں پیروں اور نازک حصوں پر الیکٹرک شاک دیئے جاتے تھے جس کے سبب بھائی کو مستقل طور سے بدن میں رعشہ طاری رہنے کی شکایت لاحق ہوگئی ہے۔کبھی کبھی دماغ سے متصل حصوں میں شدید درد اُٹھتا ہے۔ اس وقت جب درد نا قابل برداشت ہوجائے تو بھائی کو قابو میں کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ا لیکٹرک شاک کے علاوہ قید کے دوران نارکو انالائسس ، برین میپنگ ٹیسٹ بھی ہوئے۔ اس دوران ذہنی جسمانی کیفیت میں بڑی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں کبھی کبھی تو اعصابی نظام میں گڑبڑاہٹ ہونے سے طبیعت میں چڑ چڑا پن بھی آجاتا ہے۔''

نورالہدیٰ نے بتایا کہ رِہائی کے بعد ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے سے گھر بار تو نہیں چل سکتا تھا،لہٰذا سینٹرل سائزنگ میں مزدوری کرنے لگا۔کچھ دنوں بعد سائزنگ کی ملازمت ترک کردی اور چھوٹے بھائی نورالدین کو ساتھ لے کر آگرہ روڈ جعفر نگر ناکہ کے قریب چھوٹی سی

کرانہ دکان شروع کی۔ دکان شروع کرنے کیلئے متعلقین نے قرض دیا، احباب نے تعاون کیا، جس کی وجہ سے رفتہ رفتہ دکان چل جانے کی امید جاگ اٹھی ہے۔ اگر ایسا ہوا تو ان شاء اللہ حالات بہتر ہو جائیں گے۔ نورالہدیٰ نے کہا کہ فی الحال یہ دکان ہی آمدنی کا واحد ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رزق میں برکتیں عطا فرمائی ہیں البتہ سب سے بڑی فکر گھریلو اخراجات کی تکمیل ہے جسے پوری کرنا ناممکن تو نہیں مشکل ضرور ہے۔

جیل سے رہائی کے بعد ابراراحمد آبائی پیشہ اور لوم صنعت سے دوبارہ وابستہ ہو گئے:

ابراراحمد غلام احمد کو مقامی پولیس اور مہاراشٹر اینٹی ٹیررسٹ اسکواڈ نے مہرہ بنا کر پورے مقدمہ میں استعمال کیا، بے دریغ جھوٹ کہلوانے کیلئے پولیس نے بے تحاشہ تکالیف دی جس کے اثرات آج بھی ابراراحمد کے جسم پر موجود ہیں۔ ابراراحمد کے بازوؤں، پیر کے نچلے حصوں کو پٹائی کے دوران پولیس نے نشانہ بنایا۔ پولیس کی اذیتوں کے اثرات ختم نہیں ہو رہے ہیں اسی سبب سے ابراراحمد جسمانی کرب میں مبتلا ہے جسمانی کمزوری کے باعث اہل خانہ ابراراحمد کو محنت طلب کام کرنے نہیں دیتے۔

مالیگاؤں سے حراست میں لینے کے بعد ناسک، ستانہ اور اس کے بعد مدھیہ پردیش کے کئی شہروں کے مندروں مٹھوں پاٹھ شالاؤں میں ابراراحمد اور اس کی بیوی جنت النساء کو لیکر پولیس اہلکار گھومتے پھرتے رہے آخر میں ابراراحمد کو سرکاری گواہ بنا کر مقدمہ میں شامل کر لیا گیا۔ مہرہ بنانے سے قبل جوہو (ممبئی) کی چندن پولیس چوکی میں ابراراحمد کی پولیس نے بے تحاشہ پٹائی کی اور پیروں کے ناخن تک اکھاڑ لئے۔ اکھڑے ہوئے ناخن آج بھی ٹوٹے ہوئے ہیں جو پولیس کے مظالم کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ کھانے میں نشہ آور اشیاء ملا کر دی جاتی تھی جس کا کھانے کے دوران کوئی احساس نہیں ہوتا بلکہ کھانے کے تھوڑی دیر بعد غنودگی طاری ہو جاتی تھی۔ ابراراحمد اِن دنوں آیورویدک اور طب یونانی کے ذریعے علاج

ومعالجہ کروا رہے ہیں۔ رہائی کو آٹھ مہینے ہونے کو آئے ہیں لیکن جیل کی زندگی ذہن سے محو نہیں ہو سکی ہے۔ درمیان میں ابراراحمد نے اپنی بیوی جنت النساء سے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔ حالانکہ ان کا کہنا ہے کہ زندگی رواں دواں ہو جائے تو پھر سے اپنی دنیا بسانے کا ارادہ ہے۔

گفتگو میں شریک ابراراحمد کے بڑے بھائی ایڈوکیٹ جلیل احمد سعید نے کہا کہ اہل خانہ ابراراحمد کی مستقل نگرانی میں لگے رہتے ہیں۔ اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ مل کر ابرار احمد پارچہ بافی صنعت میں لگا ہوا ہے۔ شب برات بم دھماکہ مقدمہ میں سوامی اسیمانند کے اقبالیہ بیان کے بعد بہت اہم موقع میسر آیا تھا اور قانونی ماہرین کے مطابق اسیمانند کا بیان ضمانت پر رہائی کے اہم اسباب میں سے ایک ہے، البتہ اِس سے قبل مارچ ۲۰۰۸ میں ابراراحمد نے نیا حلف نامہ ظاہر کیا تھا۔ حلف نامہ میں ابراراحمد نے جو حقائق بیان کئے تھے اس سے ملتی جلتی باتیں سوامی اسیمانند نے اپنے اقبالیہ بیان میں کہی تھی۔

مولانا زاہد عبدالمجید نانِ شبینہ کیلئے بھی محتاج، بکریوں کا چارا اور کٹلری سامان بیچنے پر مجبور ہیں:

'غریبی میں آٹا گیلا' یہ کہاوت مولانا زاہد عبدالمجید کے موجودہ حالات پر صادق آتی ہے۔ رہائی ملنے کے بعد دگرگوں حالات نے زاہد سے کبھی بکری کا چارا فروخت کروایا تو کبھی چار پہیوں کی ٹھیلہ گاڑی پر کٹلری آئٹم بیچنے پر مجبور کیا۔ جس کے شب وروز امامت و خطابت میں گزرے ہیں، جو مسجد کے منبر سے رشد و ہدایت کا پیغام دیتا رہا اُسی زاہد نے دنیاوی حالات اور گھر گرہستی جاری رکھنے کیلئے وہ سب کرنے میں کبھی تردد نہیں کیا جو عام طور پر لوگ اپنے لئے کسرِ شان سمجھتے ہیں۔

بم دھماکہ مقدمہ میں ضمانت پر رہائی ملنے کے بعد جس طرح سے ہمدردی کا اظہار کیا

گیا وہ زاہد عبدالمجید کے حق میں عارضی ثابت ہوا چونکہ اُن کے والد ماسٹر عبدالمجید نے گھر سے بے دخل کردیا تھا اس لئے ملّی تنظیموں نے زاہد کی رِہائش کا نظم کرنے کا وعدہ کیا تھا جو آج تک وفا نہیں ہوسکا ہے۔ زاہد نے بتایا کہ ''دوستوں کے تعاون اور پھلساونگی (ایوت محل) کے ہمدردوں کی مدد سے جیسے تیسے رِہائش کا انتظام ہوگیا ہے لیکن یہ رِہائش گاہ شہر سے باہر غیر آباد علاقہ میں میسر آئی ہے۔''

ایوت محل کے پھلساونگی کی ایک مسجد میں امامت خطابت اور قرب وجوار کے علاقوں میں تبلیغی کام کو انجام دینے والے زاہد عبدالمجید کو اے ٹی ایس نے مشاورت چوک میں بم رکھنے کے الزام میں گرفتار کیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ ''رِہائی کے بعد پھلساونگی کے ہمدردوں نے خوش دلی کا مظاہرہ کیا جو ریاکاری سے پاک تھا البتہ مالیگاؤں میں بڑی مایوسی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ عام میل جول سے لوگ کتراتے ہیں راستہ بدل دیتے ہیں نظر انداز کردیتے ہیں ہمدردی میں بھی دو لفظ گفتگو کے روادار نہیں ہیں۔'' انہوں نے مزید کہا کہ ''گھر بار چلانے کیلئے ہر ممکن کام کرنے کو تیار ہوں، مگر ترجیحات میں امامت وخطابت ہے کیونکہ میرے پاس جو جذبہ ہے وہ مذہبی خدمات انجام دینے کا ہے۔''

زاہد نے مالیگاؤں کی کئی مسجدوں میں امامت کے فرائض انجام دینے کیلئے ذمہ داروں سے رابطہ کیا، لیکن دلاسہ اور تسلی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ انہوں نے نم آنکھوں سے بتایا کہ ایک ہمدرد شفیق احمد سیٹھ (ناگ والے) کے توسط سے اہلحدیث محمدی مسجد میں تقرری عمل میں آئی تب عارضی راحت ملی، لیکن تین ہفتوں کے بعد ایک شخص کی مداخلت کے سبب وہاں سے بھی ہٹا دیا گیا جو میرے لئے کسی بہت بڑے صدمے سے کم نہیں تھا۔ انہوں نے بتایا کہ کسب معاش کیلئے جانوروں کا چارا فروخت کیا اُس کے بعد ٹھیلہ گاڑی پر گشت کر کے کٹلری آئٹم بیچنا شروع کیا، لیکن کوئی کاروبار گھریلو ضرورت پوری نہیں کرسکا۔ اِن دنوں بے روزگاری کی مار جھیل رہا ہوں۔

زاہد عبدالمجید کے مطابق پھلساونگی کے لوگ بلاتے ہیں، لیکن وہاں جانے میں خاصی پریشانی ہے کیونکہ ہر ہفتہ مالیگاؤں کے پولیس اسٹیشن میں حاضری لازمی ہے اس کے علاوہ ۱۹۹۹ء کا ایک کیس مقامی عدالت میں زیر سماعت ہے، بڑا بھائی جاوید عبدالمجید اسلحہ معاملہ میں قید ہے مکوکا کورٹ میں تاریخ پر ممبئی جانا پڑتا ہے اس لئے پھلساونگی میں سکونت اختیار نہیں کرسکتا۔ کیا مولانا زاہد عبدالمجید کیلئے مسجدوں اور میناروں کے شہر میں امامت وخطابت کا منصب مل پائے گا؟ یہ اہم سوال ہے جس کا جواب شاید مسجدوں کے ٹرسٹیان کے پاس ہی ہو۔

☆☆

محمد عامر خان
بے گناہی کی سزا: 14 سال جیل

● اے این شبلی

ہندوستان دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے، اسے سیکولر ملک بھی کہا جاتا ہے۔ ایک ایسا ملک جس کے آئین میں ہر کسی کے ساتھ چاہے وہ کسی بھی مذہب کا ہو برابری کا سلوک کرنے کو کہا گیا ہے۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ یہاں ہر کسی کو اپنی بات کہنے کی آزادی ہے۔ اسی جمہوری اور سیکولر ملک کا ایک شہری محمد عامر خان بھی ہے جس کو بغیر کسی قصور کے ایک دو نہیں بلکہ پورے 14 سال جیل کے اندر گزارنے پڑے۔ صرف عامر ہی نہیں یہاں آئے دن صرف شک کی بنیاد پر مسلم نوجوانوں کی گرفتاری اور بغیر کسی ٹرائل کے انہیں لمبے عرصے تک جیل میں ڈال دینا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ گزشتہ کئی سالوں سے یہ سلسلہ جاری ہے اور بے چارے مسلمانوں کی لاکھ چیخ و پکار کے بعد بھی مسلمانوں پر خاص طور پر مسلم نوجوانوں پر ظلم کا یہ سلسلہ رک نہیں رہا ہے۔ جس طرح دنیا کے سب سے بڑے سیکولر ملک ہندوستان میں ہر دھماکے کے بعد مسلم نوجوانوں کو گرفتار کر کے انہیں فوراً دہشت گرد قرار دے کر جیل میں ڈال دیا جاتا ہے اسی کا شکار عامر خان بھی بنے۔ 14 سال ہندوستان کی مختلف جیلوں میں گزارنے کے بعد رہا ہونے والے محمد عامر خان سے جب ہم نے اس کے دہلی کے آزاد مارکٹ میں واقع گھر میں ملاقات کی تو ایک طرف جہاں اس کی دردناک کہانی سن کر

ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے وہیں ہمیں اس بات سے بھی خوشی ملی جس نوجوان کو بغیر کسی گناہ کے 14 سال جیل میں گزارنے پڑے جس کی جوانی کے قیمتی 14 سال فرقہ پرستوں نے ان سے چھین لئے وہ اب ان ساری باتوں کو بھول کر آج بھی ہندوستان کے آئین پر مکمل یقین رکھتے ہیں اور ایک شاندار اور باوقار زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔

وہ کالی رات:

عامر 20 فروری 1998 کی وہ سیاہ رات نہیں بھولتے جب انہیں کچھ پولس والوں نے یہ کہتے ہوئے گرفتار کر لیا کہ دسمبر 1996 اور اکتوبر 1997 کے دوران دہلی، روہتک، سونی پت اور غازی آباد میں ہوئے 19 مختلف دھماکوں کا ذمہ دار تو ہی ہے۔ عامر اس کالی رات کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں پولس والوں نے مجھے زبردستی اٹھا کر جیپسی میں بیٹھا دیا اور میرے ہاتھ پاؤں باندھنے کے علاوہ میری آنکھوں پر پٹی بھی لگا دی۔ یہ کون جگہ تھی اور وہ مجھے کہاں لے گئے تھے یہ تو مجھے نہیں پتہ مگر اگلے سات دنوں تک میرے ساتھ جو سلوک کیا گیا اسے سن کر کسی کے بھی رونگٹے کھڑے ہو سکتے ہیں۔ عامر نے کہا اس دوران نہ صرف مجھے مارا پیٹا گیا، میرے اندرونی اعضاء میں پٹرول ڈالا گیا بلکہ کسی کو جسمانی طور پر تکلیف پہنچانے کے جو بھی طریقے ہو سکتے ہیں، وہ سب مجھ پر آزمائے گئے اور مجھ سے سادہ کاغذوں پر زبردستی دستخط کرائے گئے۔ ان سات دنوں کے دوران مجھے ایسی ایسی تکلیفیں دی گئیں جن کا احساس مجھے آج بھی ہوتا ہے۔ خاص طور پر سردی کے دنوں میں 14 سال گزر جانے کے بعد بھی میرے پیروں میں درد شروع ہو جاتا ہے۔ دماغی طور پر مجھے اتنا پریشان کیا گیا کہ اب میں ہائپر ٹینشن کا شکار ہو گیا ہوں اور میرا بی پی کنٹرول نہیں رہتا۔ عامر نے اپنی دکھ بھری داستان سناتے ہوئے مزید کہا کہ مجھے سات دن تک ہر طرح سے ٹارچر کرنے کے بعد کورٹ میں پیش کیا گیا۔ کورٹ میں چونکہ انگریزی میں کاروائی ہو رہی تھی

اس لیے مجھے پتہ نہیں چلا کہ وکیل صاحب کہنا کیا چاہ رہے ہیں۔ جب میں نے چارج شیٹ دیکھی تو مجھے پتہ چلا کی پولیس نے مجھے ریوالور، دھماکہ خیز مادہ، اسکول کی سرٹیفکٹ، کیرکٹر سرٹی فیکیٹ اور راشن کارڈ کے ساتھ پرانی دہلی ریلوے اسٹیشن کے پاس سے گرفتار کیا تھا۔

والد کو نہیں دفنا پانے کا غم:

عامر کی گرفتاری کی خبر ان کے گھر والوں کو نہیں دی گئی۔ عامر کہتے ہیں، میرے والد جو اب اس دنیا میں نہیں رہے کو میرے گرفتار ہونے اور پھر جیل میں ڈالے جانے کی خبر اخباروں کے ذریعے لگی۔ بعد میں بڑی کوشش اور ادھر ادھر بھاگنے کے بعد انہوں نے وکیل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ مگر اس پورے معاملے کے دوران وہ اتنا ٹوٹ چکے تھے کہ ان کا زندہ رہنا مشکل ہوگیا۔ میرے ابو کے جگر میں انفکشن ہوگیا اور پھر ایک دن میرے جیل رہتے ہوئے ان کی موت ہوگئی۔ عامر نے بہت ہی افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کی وہ اس دنیا سے چلے گئے مگر اپنی موجودگی میں اپنے بے قصور بیٹا کو جیل سے باہر نکالنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ حد تو تب ہوگئی جب مجھے اپنے ابو کی موت کا پتہ ان کی موت کے تقریباً ایک ہفتہ بعد لگا جب میرے وکیل فیروز خان غازی صاحب نے مجھے اس کی اطلاع دی۔ ابو کی موت کے بعد اب اس دنیا میں میری مدد کے لئے صرف میری ماں رہ گئی تھی۔
اس وقت جب میں گرفتار ہوا تھا تو کچھ خاندان والے بھی میری مدد کے لیے سامنے آئے تھے مگر جب پولیس نے سب کو ڈرانا دھمکانا شروع کیا تو پھر ہر کوئی مجھ سے اور میرے گھر والوں سے دور ہوتا چلا گیا۔ شروع میں تو قانونی مدد کے لئے میرے والد ادھر ادھر بھاگتے رہے مگر ان کی موت کے بعد یہ ساری ذمہ داری میری امی پر آ گئی۔ میری ماں ایک پردہ نشیں خاتون تھیں انہوں نے کبھی باہر کی دنیا نہیں دیکھی۔ جب بھی نکلی بہت ہی ضروری کام

سے نکلیں مگر اپنے بے قصور بیٹے کے رہائی کے لئے انہیں در در بھٹکنا پڑا۔ اور پھر ایک دن ایسا آیا جب قسمت نے میرا اور میری ماں کا بھی ساتھ نہیں دیا۔ 2008 میں ان پر فالج کا حملہ ہوا اور برین ہیمریج کی وجہ سے ان کا ہلنا ڈولنا اور بولنا۔ سننا سب کچھ بند ہوگیا۔

کاش ماں کی زبان سے 'بیٹا' سن پاتا:

عامر خان نے اپنی دکھ بھری داستاں سناتے ہوئے کہا کہ آج جب کہ میں اپنی زندگی کے قیمتی 14 سال جیل میں گزارنے کے بعد رہا ہوگیا ہوں تو مجھے جس بات کا سب سے زیادہ افسوس ہے وہ یہ کہ میری ماں جس نے میری رہائی کے لئے در در کی ٹھوکریں کھائیں، مجھے جیل سے باہر دیکھنے کے لئے انہیں کہاں کہاں نہیں جانے پڑے اور آج جبکہ میں جیل سے باہر آ گیا ہوں تو میری ماں اس حالت میں نہیں ہے کہ وہ میری رہائی کی خوشیاں منا سکے اور مجھے بیٹا کہہ سکے۔ بس وہ مجھے رات دن دیکھتی رہتی ہے۔ سمجھ نہیں پاتا ہوں کیا کروں؟ میری رہائی کے بعد میرے گھر میڈیا والے آتے رہتے ہیں ماں سب کو دیکھتی رہتی ہے مگر سمجھ نہیں پاتی کہ کیا ہو رہا ہے۔ لوگ کہتے ہے ان کا علاج ممکن ہے مگر علاج کے لئے پیسوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ساری دولت تو میری رہائی میں خرچ ہوگئی۔ ابو کا کاروبار بھی ختم ہو گیا اور کئی دوسری پراپرٹی بھی فروخت ہوگئیں۔ اب ایک بڑی تمنا ہے کہ ماں کی آواز سنوں مگر ایسا کب ہوگا مجھے نہیں معلوم۔

آئین پر عقیدہ برقرار:

بغیر کسی سزا کے جیل میں 14 سال گزارنے کے باوجود محمد عامر کو اپنے ملک کے آئین پر مکمل بھروسہ ہے۔ یہاں کے نظام عدلیہ کو بھی وہ بہت بہتر طریقے سے سمجھنے لگے ہیں۔ عامر کے مطابق اچھے برے تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔ مجھے افسوس صرف اس بات کا ہوتا ہے جب ملک ایک ہے، یہاں کا آئین ایک ہے یہاں کے تمام شہری چاہے وہ کسی مذہب کے

ہوں ایک جیسے ہیں تو پھر ہر کسی کے لئے الگ الگ پیمانہ کیوں؟ عامر نے کہا کہ مجھے افسوس اس بات کا بھی ہے کہ جب پیشی کے دوران پرگیہ ٹھاکر اور کرنل پروہت جیسے لوگوں کو لوگ دیکھتے تو ان پر پھولوں کی بارش ہوتی اور جب میری بوڑھی ماں مجھ بے قصور سے ملنے کی کوشش کرتی تو اسے ملنے دینے سے انکار کیا جاتا۔ مجھے اس بات کا بھی افسوس ہے کہ جیل میں دس سال گزار دینے کے بعد جب میں نے ضمانت کی کوشش کی تو میرے معاملے کو انتہائی سنجیدہ کہہ کر ضمانت دینے سے منع کر دیا گیا جبکہ مجھ پر جو الزامات لگے تھے اس میں صرف 2 افراد کی موت ہوئی تھی اور 18 زخمی ہوئے تھے جبکہ دوسری طرف مجھے پتہ چلا کہ ہاشم پورہ میں 42 مسلمانوں کی موت کے ذمہ دار پولس والے ضمانت پر ہیں۔ یعنی دو لوگوں کی موت کے ذمہ دار کو ضمانت نہیں اور 42 لوگوں کی موت کے ذمہ دار کو ضمانت۔ عامر نے بڑی معصومیت سے کہا کہ کچھ یہی سوچ کر افسوس ہوتا ہے مگر ان سب کے باوجود میں مایوس نہیں ہوا ہوں اور ابھی بھی ملک کے آئین کا احترام کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا۔

برے لوگوں کے ساتھ رہ کر بھی اچھے بنے رہے عامر:

عامر نے اپنے جیل کے دنوں کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ وہاں طرح طرح کے لوگ تھے کچھ نامی غنڈے بھی تھے تو کچھ اپنے کو بے قصور بتانے والے بھی۔ ان سب کے درمیان میں نے اپنے کو اچھا بنائے رکھا۔ جیل میں میری پڑھائی بھی جاری رہی۔ جیل میں بی اے کرنے کے دوران کے اپنا اگنو کا شناختی کارڈ دکھاتے ہوئے عامر نے کہا کی وہ تو آگے بھی پڑھنا چاہتے تھے مگر پتہ نہیں کیوں دوسرے قیدیوں کی تعلیم تو جاری رہی مگر مجھے پہلے سال کے بعد آگے پڑھنے سے منع کر دیا گیا۔ اس طرح میں وہاں چاہ کر بھی اپنی تعلیم جاری نہیں رکھ سکا۔ البتہ میں نے گاندھی سمیت کئی کتابیں پڑھیں۔ وہیں مجھے امن کا سبق ملا اور چونکہ میرے مذہب اسلام میں بھی سب کو معاف کرنے کا سبق پڑھایا گیا ہے اسی لئے اس پر

چلتے ہوئے میں نے اب ان سب کو معاف کر دیا ہے جس نے میرے ساتھ برا کیا اور میری زندگی کے قیمتی 14 سال برباد کرنے میں شامل رہے۔

جیل سے نکلنے کے بعد بھی مسئلہ برقرار:

عامر کو اس بات کا بھی افسوس ہے کہ ان کے ساتھ پولس والوں نے جو برا کیا وہ تو کیا ہی، بے قصور ہونے کے بعد بھی انہیں جیل میں 14 سال گزارنے پڑے اسے بھی اب بھول جانا چاہتا ہوں مگر افسوس تو اب اس بات کا ہے کہ اب جب میں باہر آکر ایک مہذب زندگی گزارنا چاہ رہا ہوں تو بھی مشکل ہو رہی ہے۔ اب تو عامر کی زندگی کچھ آسان بھی ہوگئی ہے شروع میں جیل سے نکلنے کے بعد انہیں مختلف پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جو رشتہ دار تھے وہ تو پہلے کی طرح ہی دور دور ہی رہے اور مجھ جیسوں کی مدد کے نام پر دنیا کو گمراہ کر رہے ہیں وہ بھی دور رہے۔ راقم نے میڈیا کے ذریعہ ملی تنظیموں کو اس بات کا احساس دلایا کہ اب جبکہ عامر جیل سے رہا ہو گئے ہیں اور ایک باوقار زندگی گزارنا چاہتے ہیں ایسے میں کیا عامر جیسوں کی مدد کرنا ان ملی تنظیموں کی ذمہ داری نہیں ہے انہوں مختلف ناموں سے اپنی دکانیں کھول رکھی ہیں اور جن کا کام جلسے جلوس اور سیمینار کے انعقاد کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ میرے بار بار لکھنے کے بعد بھی جماعت اسلامی ہند کے علاوہ کسی بھی تنظیم کی نیند نہیں کھلی اور عامر کی پریشانی برقرار رہی۔ اس دوران عامر کو شبنم ہاشمی کی تنظیم انہد میں کام کرنے کا موقع مل گیا جہاں سے ملنے والے تنخواہ کی وجہ سے ان کی پریشانیاں کچھ کم ہو گئیں۔ ایسا نہیں ہے عامر نے اپنی اور اپنے جیسے دوسروں کی مدد کے لئے ملی تنظیموں سے مدد نہیں مانگی۔ ایک بار تو انہوں نے ملی کاؤنسل کے ایک پروگرام میں سب کے سامنے یہ کہہ دیا کہ یہاں اسٹیج پر جو حضرات موجود ہیں ان میں سے کسی نے بھی نہ تو ان کی اس وقت مدد کی جب وہ جیل گئے اور نہ ہی اب وہ کسی طرح کی کوئی مدد کے لئے سامنے آ رہے ہیں۔ دہلی میں

بہار کے ایک صاحب ہیں، آئے دن کوئی نہ کوئی سمینار کرتے ہیں مسلمانوں کے غم میں آنسو بہاتے ہیں مگر جب ان سے کسی نے کہا کہ عامر کو کمپیوٹر دے دیجئے اس کی کچھ مدد ہو جائیگی تو ہر سیمنار پر لاکھوں خرچ کرنے والے اس نام نہاد مسلم تھنک ٹینک نے منع کر دیا۔

عامر کہتے ہیں میں نے جیل میں اس لئے اپنی پڑھائی جاری رکھی کہ باہر آ کر اچھا بزنس کروں گا یا پھر کوئی نوکری کروں گا مگر جب باہر آیا تو کوئی راستہ ہی نظر نہیں آیا۔ عامر کہتے ہیں، مدد کے وعدے تو بہت لوگوں نے کئے ہیں مگر کہیں سے کوئی مدد کی سوائے ایک دو تنظیموں کے میں انتظار ہی کرتا رہ گیا۔ عامر مایوسی کے عالم میں کہتے ہیں، حکومت کہتی ہے مسلمانوں کو مین اسٹریم میں آنا چاہئے۔ میں نے جیل میں رہ کر تعلیم حاصل کی مین اسٹریم میں آنا چاہتا ہوں مگر مجھے کوئی بتلائے تو صحیح کی مین اسٹریم کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ کیا جیل میں بغیر کسی قصور کے 14 سال گزارنا اور پھر باہر آ کر بھی پڑھائی کے باوجود کام کے لئے ترسنا یہی مین اسٹریم ہے۔

میڈیا کا رول:

جیل میں تو عامر اخبار پڑھتے ہی تھے رہائی کے بعد عامر کو تقریباً روزانہ کسی نہ کسی اخبار والے کو انٹرویو دینا پڑا۔ خود بھی صحافی بننے کا شوق رکھنے والے عامر اب میڈیا کو بڑی اچھی طرح سے سمجھنے لگے ہیں۔ وہ کہتے ہیں، آج میڈیا سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ ایک طرف جہاں میڈیا کی وجہ سے کئی بے قصور پریشان ہونے سے بچ جاتے ہیں وہیں میڈیا کی وجہ سے کئی بے گناہوں کی زندگی بھی تباہ ہو جاتی ہے۔ ایک طرف عامر نے جہاں اپنے گھر آنے والے صحافیوں اور خاص طور پر انگریزی کے اخبار 'دی ہندو' کی خاتون صحافی ودیا سبرامنیم کی تعریفوں کے پل باندھے وہیں انہوں نے بے ایمان میڈیا والوں کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ غازی آباد میں وہاں کے ایک بڑے ہندی اخبار نے مجھے پاکستانی لکھ دیا۔ اس اخبار کی

اس غلط خبر کی وجہ سے جہاں مجھے وکیل ملنے مشکل ہو گئے وہیں مجھے جو گارڈ جیل سے عدالت لے جاتے تھے وہ بھی مجھے بری نظر سے دیکھنے لگے اور جیل کے میرے ساتھی بھی مجھے کہنے لگے کی بھائی تو پاکستانی ہے پہلے نہیں بتایا۔ عامر نے اس خبر کے رپورٹر کو معاف کرتے ہوئے کہا کہ اگر اس دن وہ غلط خبر نہیں چھپی ہوتی تو شاید میں اور پہلے جیل سے باہر آ جاتا۔

وکلاء کا شکریہ:

عامر کے گھر پر ان سے ملاقات کے دوران ہم نے جتنا وقت بھی ان کے ساتھ گزارا اس دوران انہوں نے اپنے دو خاص وکیل فیروز خان غازی اور این ڈی پنچولی کا بار بار شکریہ ادا کیا۔ عامر کے مطابق ان دو لوگوں نے نہ صرف ان 14 سالوں میں میری قانونی مدد کی اور مجھے جیل سے باہر نکالنے میں مدد کی بلکہ اب بھی یہ لوگ مجھے ہر ممکن مدد دینے کو تیار رہتے ہیں۔ عامر نے ان دونوں کے لئے خاص دعا کرتے ہوئے کہا کہ اللہ ان دونوں کی مدد کرے۔ آج بھی عامر کو اگر کچھ کرنا ہوتا ہے تو وہ ان دو وکیلوں سے ضرور مشورہ کرتے ہیں۔

بے گناہ ہونے کے باوجود جیل میں 14 سال گزارنے والے عامر کو دیکھ کر نہیں لگتا کہ وہ مایوس ہیں۔ انہیں اپنی زندگی کے 14 سال جیل میں گزار دینے کا افسوس تو ہے مگر اب وہ نئے سرے سے اپنی زندگی جینا چاہتے ہیں۔ شبنم ہاشمی جیسی انسانی حقوق کی علمبرداروں کی مدد سے انہیں نوکری مل گئی ہے اور شادی بھی ہو گئی ہے۔ ہماری دعا ہے کہ ان کی آنے والی زندگی خوشی خوشی گزرے اور انہیں پھر کسی ایسی مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے جو ان کی زندگی کو تباہ کر دے۔

(مصنف آزاد ایکسپریس ڈاٹ کام کے ایڈیٹر اور ہندوستان ایکسپریس کے بیورو چیف ہیں)

☆☆

’پورا گاؤں میرے بیٹے کی گواہی دے گا‘

● فیروز احمد (والد انجینئر فصیح محمود)

بہار کے مدھوبنی اور دربھنگہ اضلاع میں مسلمانوں میں بہت سے لوگوں کا کہنا ہے کہ ان دنوں وہ ’دہشت گردی کے الزامات‘ سے کافی پریشان ہیں۔ انہی علاقوں کے چودہ افراد کو شدت پسند کارروائیوں میں شامل یا مددگار بتا کر گزشتہ چار برسوں میں مختلف جگہوں سے گرفتار کیا گیا ہے۔ بہار کے ایسے ہی ایک نوجوان انجینئر فصیح محمود کو ۱۳ر مئی ۲۰۱۲ء کو سعودی عرب سے گرفتار کیا گیا۔ بہار کے دربھنگہ ضلع میں باڑھ سمیلہ نام کا ایک گاؤں ہے اور فصیح محمود اسی مسلم اکثریت گاؤں کے رہائشی ہیں۔ اس گاؤں سے حالیہ دنوں تین لڑکے مزید گرفتار ہوئے ہیں۔ ان سب پر ایک ہی طرح کا الزام ہے کہ تینوں مبینہ شدت پسند تنظیم ’انڈین مجاہدین‘ سے منسلک ہیں۔ یہ گرفتاریاں بہار پولیس کو بتائے بغیر دیگر ریاستوں کی پولیس نے کی ہیں۔

فصیح محمود کی اہلیہ نکہت پروین نے بی بی سی کو بتایا ’سعودی عرب میں الزبیل علاقے میں اپنے شوہر کے ساتھ میں جہاں تھی، وہاں سادہ لباس میں چار یا پانچ لوگ آئے اور خود کو سعودی پولیس اہلکار بتایا۔ پھر کہا کہ انڈین پولیس کو کسی معاملے میں فصیح کی تلاش ہے، اس لئے اسے پہلے سعودی دارالحکومت ریاض میں واقع بھارتی سفارتخانے لے جا کر انڈیا بھیج دیا جائے گا۔ انہوں نے ہمارے کمرے کی تلاشی بھی لی، لیپ ٹاپ اور موبائل ضبط کر کے وہ فصیح کو اپنے ساتھ لے گئے اور مجھے کسی رشتے دار کے ساتھ بھارت چلے جانے کے لیے

کہا۔‘ نکہت پروین نے بتایا ’بیس مئی کو ایک بار میرے شوہر نے مجھے فون کیا تھا، یہ کال کسی سعودی پولیس والے کے فون سے کی گئی تھی۔ وہ روتے ہوئے اتنا بتا سکے کہ انہوں نے کچھ نہیں کیا ہے۔ اس کے بعد اس نمبر پر کوئی رابطہ نہیں ہوا۔‘

ادھر دربھنگہ ضلع کے باڑھ سمیلا گاؤں جا کر میں نے فصیح کے لواحقین اور گاؤں والوں سے بات چیت کی۔ وہاں زیادہ تر لوگ رنج اور غم میں ڈوبے ہیں اور اپنی بے بسی بیان کرنے لگے۔ فصیح کے والد فیروز احمد پیشے سے ڈاکٹر ہیں اور گاؤں کی معزز شخصیت مانے جاتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ’نا جانے کس نے یہ سازش رچی ہے، میرے بیٹے کو اس طرح بے بنیاد الزام لگا کر پھنسایا گیا ہے۔ کچھ نہیں کر پانے کی لاچاری ہمارے سامنے ہے۔‘ فصیح کی ماں گاؤں کے ہی اسکول میں ٹیچر ہیں۔ بیٹے کی گرفتاری سے وہ بے حد غم زدہ ہیں۔ روتے ہوئے بتانے لگی ’اس بات کی گواہی پورا گاؤں دے گا کہ میرا بیٹا بے قصور ہے۔ سعودی عرب اور انڈیا کی پولیس مجھے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر بتائے کہ اسے کہاں اور کیوں چھپا کر رکھا گیا ہے؟‘

ڈاکٹر فیروز کے گھر کے پاس ہی عبدالسلام کا گھر ہے۔ ان کے بیٹے کفیل اختر کو کرناٹک پولیس نے گزشتہ چھ مئی کو علی الصبح گھر میں گھس کر گرفتار کر لیا تھا۔ عبدالسلام کا کہنا ہے کہ ’دہشت گردوں سے ہمارے بچوں کے منسلک ہونے یا انڈین مجاہدین کے لئے کام کرنے کے الزام لگانے کے پیچھے ضرور ایسی طاقتیں کام کر رہی ہوں، جو ہندو۔ مسلم تفریق کی بنیاد پر سیاست کرتے ہوں گی۔ میرا بیٹا تو کسی کا دل دکھانے سے ڈرتا تھا، وہ خونی کھیل کا حصہ کیسے ہوسکتا ہے۔‘ اس واقعہ کے بعد ریاست کے وزیر اعلیٰ نتیش کمار نے کرناٹک کے وزیر اعلیٰ کو خط لکھ کر احتجاج کا اظہار کیا تھا۔ بہار پولیس کو اطلاع دیے بغیر اس کاروائی کو انجام دینے کو انہوں نے قانونی عمل کی خلاف ورزی تصور کیا تھا۔ کرناٹک حکومت نے جوابی خط میں صفائی دی تھی کہ اس ضروری خفیہ کارروائی کی معلومات کہیں فاش نہ ہو جائیں،

اسی لئے احتیاط برتی گئی۔ دوسری جانب بہار کے پولیس ڈائریکٹر جنرل ابھے آنند نے اس دلیل سے نا اتفاقی ظاہر کرتے ہوئے بی بی سی کو بتایا کہ ریاستوں کے درمیان ایسا عدم اعتماد خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ مدھوبنی اور دربھنگہ اضلاع کے دیہی علاقوں میں لوگوں کا کہنا ہے کہ یہاں جس گاؤں کا کوئی مسلمان اس طرح کے الزام میں پکڑا جاتا ہے تو اس پورے گاؤں کے مسلمانوں کو دہشت گردوں کا مددگار مان لیا جاتا ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ بدنامی اس قدر پھیلتی ہے کہ برادری کے ہی بہت سے لوگ ان گاؤں میں رشتے بنانے سے گریز کرتے ہیں اور دربھنگہ اور مدھوبنی اضلاع کے جو نوجوان اگر دیگر علاقوں میں کہیں پڑھتے یا کام کرتے ہیں تو ان پر اپنے ہی خاندان کے لوگ شک کی نظر رکھتے ہیں۔

☆☆

آفٹر دی اسٹارم
سات 'بے گناہ مسلم دہشت گردوں' کی کہانی

● اے این شبلی

آج سے گیارہ سال قبل گجرات میں مسلمانوں کا جو قتل عام ہوا تھا اس کے زخم ابھی بھرے نہیں ہیں بلکہ گجرات حکومت کا اس تعلق سے جو رول ہے اس سے ایسا لگتا ہے ہندو دہشت گردوں کے ظلم کا شکار ہوئے مسلمانوں کے زخم شاید کبھی بھریں گے بھی نہیں۔ ایک طرف جہاں اس ملک میں نریندر مودی اور پروین توگڑیا جیسے لوگ ہیں جو مسلمانوں کی جان کے پیاسے ہیں وہیں اسی ملک میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو مسلمان تو نہیں ہیں مگر انہیں مسلمانوں سے نفرت نہیں ہے اور وہ ہر حال میں سچائی اور ایمانداری کا ساتھ دینا چاہتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں میں سے ایک ہیں دستاویزی فلم میکر شبھرادیپ چکرورتی۔ چکرورتی صاحب نے سائنس اور بین الاقوامی تعلقات میں پوسٹ گریجویشن کیا اور ایک صحافی اور دستاویزی فلم ساز کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ انہوں نے اب تک چار دستاویزی فلمیں بنائی ہیں اور ان کی مسلمانوں کے تئیں دلچسپی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے ان کی چاروں ہی فلمیں مسلمانوں پر کسی نہ کسی صورت میں ظلم کے تعلق سے ہیں۔ ان کی دستاویزی فلم After the Storm (طوفان کے بعد) کافی مشہور ہوئی۔ دستاویزی فلم طوفان کے بعد ان سات مسلمانوں کی کہانی ہے جنہیں دہشت گردی کے الزام میں گرفتار کیا گیا اور جو

بعد میں بے قصور ثابت ہوئے۔ان سات مظلوم مسلمانوں کے نام ہیں مختار احمد، محمد فصیح الدین احمد، عمر فاروق، معتصم بلال، حارث انصاری، محمد مسرت حسین ُ بابیٔ اور شیخ عبدالکلیم۔ان سبھی پر دہشت گردی کا جھوٹا الزام عائد کیا گیا مگر بعد میں یہ سبھی بری ہو گئے۔اس فلم میں ان ساتوں مسلمانوں کی پریشانیوں کو بیان کیا گیا ہے۔یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے جب یہ گرفتار ہوئے تب انہیں کیسی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا اور اب جبکہ وہ آزاد ہو گئے ہیں تو ان کی کیسی پریشانیاں ہیں جواب بھی باقی ہیں۔

مختار احمد: بنگلور کے 49 سالہ مختار احمد ریڈیمیڈ کپڑوں کا کاروبار کرتے تھے۔انہیں 3 ستمبر 1993 کو سی بی آئی نے چنئی میں آر ایس ایس کے علاقائی دفتر میں بم دھماکہ کے الزام میں گرفتار کیا تھا۔انہیں بعد میں عدالت کی طرف سے بری کیا گیا تھا اور حتمی فیصلہ 6 دسمبر 2010 کو سپریم کورٹ کی طرف سے آیا جس میں بھی وہ بری قرار پائے۔انہیں بے قصور ہونے کے باوجود 6 سال جیل میں گزارنے پڑے۔

محمد فصیح الدین: حیدرآباد کے محمد فصیح الدین احمد گریجویشن کر رہے تھے جب انہیں یکم ستمبر 2007 کو پولس نے گوکول اور لمبینی پارک میں دھماکہ کے سلسلے میں گرفتار کیا۔ستم ظریفی یہ کہ اسی دھماکہ میں ان کے رشتہ دار کا انتقال ہو گیا۔حالانکہ محمد فصیح الدین فروری 2008 میں رہا ہو گئے اور انہوں نے اپنی تعلیم بھی مکمل کر لی مگر ان کے اندر سے پولس کا خوف اب بھی نہیں نکلا ہے۔وہ اب بھی ذہنی صدمے کے شکار ہیں اور انہیں اب بھی یہ ڈر ستا تا رہتا ہے کہ کہیں پھر نہ پولس مجھے کسی جھوٹے کیس میں پھنسا دے۔

عمر فاروق : 28 سال کے عمر فاروق کو 11 مئی 2006 کو احمد آباد پولس نے ایک ہندو لیڈر کے قتل کی سازش رچنے کے الزام میں گرفتار کیا۔بعد میں پولس نے یہ دکھایا کہ فاروق کو 9 جون کو گرفتار کیا گیا ہے۔جیل میں ساڑھے چار سال گزارنے کے بعد بے گناہ عمر فاروق 29 جولائی 2010 کو رہا ہو گئے۔وہ جیل سے تو باہر آچکے ہیں مگر فی الحال

وہ بے روزگار ہیں اور قرض کے بوجھ تلے دبتے جا رہے ہیں۔

معتصم بلال: 5 مارچ 2008 کو معتصم بلال کو اس وقت گرفتار کیا گیا جب وہ پرانے حیدرآباد میں اپنے گھر کے سامنے بیٹھے تھے۔بلال کو دوسرے 20 لوگوں کے ساتھ مکہ مسجد دھماکے کا ملزم بتایا گیا۔چونکہ بلال کے خلاف پولس کوئی ثبوت اکٹھا نہیں کر سکی اس لئے انہیں لگ بھگ چھ مہینہ بعد 31 دسمبر 2008 کو رہا کر دیا گیا۔دوسرے بدنصیب مسلمانوں کے مقابلے حالانکہ بلال نے کم مدت جیل میں گزاری مگر ان کا نقصان یہ ہوا کہ وہ نہ تو اپنی انجینئرنگ کی پڑھائی مکمل کر سکے اور نہ ہی ان کی بہن کی شادی ہو پا رہی ہے۔وہ کہتے ہیں میرے جیل جانے کی وجہ سے سماج میں ایک باوقار زندگی گزارنا میرے لئے مشکل ہو رہا ہے۔

حارث انصاری: حارث احمد آباد کے مشہور سماجی کارکن شکیل احمد کے بیٹے ہیں۔ایک میڈیکل ٹرانسکرپٹنشٹ کے طور ان کا کیریئر شاندار چل رہا تھا کہ 7 دسمبر 2003 کو وہ منحوس گھڑی آئی جب انہیں دوسرے پانچ لوگوں کے ساتھ احمد آباد کی بڑی عمارتوں میں دھماکہ کی سازش رچنے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔پولس نے حارث کو ۷ر دسمبر کو گرفتار کیا مگر اسے 11 دسمبر کو گرفتار بتایا گیا۔چھ سال جیل میں گزارنے کے بعد حارث کو دسمبر 2009 میں رہا کر دیا گیا۔اب حارث ویسے تو آزاد ہیں مگر بے قصور ہونے کے باوجود جیل میں چھ سال گزارنے کی وجہ سے وہ پوری طرح سے ٹوٹ چکے ہیں اور کچھ بھی کرنے کی حالت میں نہیں ہیں۔

محمد مسرت حسین: 35 سال مسرت حسین پرنٹنگ پریس میں کام کرتے تھے۔انہیں پولس نے کولکاتا میں امریکن سنٹر میں دھماکہ کے الزام میں 5 مارچ کو گرفتار کیا مگر دنیا کے سامنے انہیں 7 مارچ کو لایا گیا۔8 سال جیل میں گزارنے کے بعد کولکاتا ہائی کورٹ نے انہیں 7 فروری 2010 کو رہا کر دیا۔ان کی فیلی کی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ اپنے گھر رہ

سکیں اس لئے وہ اپنی بیوی اور اپنی دو بچیوں کے ساتھ سسرال میں رہتے ہیں۔ ان کی زندگی پوری طرح سے تباہ ہو چکی ہے۔

شیخ عبدالکلیم: شیخ عبدالکلیم وہی ہیں جن کے اخلاق سے متاثر ہو کر سوامی اسیمانند نے اپنی غلطی مانی تھی اور کہا تھا کہ کئی دھماکوں میں مسلمان نہیں بلکہ ہندو دہشت گردوں کا ہاتھ ہے۔ جب پولس نے یکم جون 2007 کو شیخ عبدالکلیم کو گرفتار کیا تھا تو وہ پیرا میڈیکل کا کورس کر رہے تھے۔ انہیں نقلی سم کارڈ اور مکہ مسجد میں دھماکہ کے جرم میں گرفتار کیا گیا تھا۔ لگ بھگ ڈیڑھ سال جیل میں گزارنے کے بعد اب وہ کیس سے بری ہو گئے ہیں اور قانون کی پڑھائی کر رہے ہیں۔

☆☆

اعجاز مرزا

'تفتیش کاروں نے میرے بیان پر یقین نہیں کیا'

دہشت گردی کے الزامات میں 6 ماہ تک جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند رہنے کے بعد کل رات ضمانت پر رہا ہونے والے ڈی آر ڈی او کے جونیئر سائنٹسٹ اعجاز مرزا نے کہا ہے کہ بے گناہ ثابت ہونے کے بعد وہ اس دفاعی تحقیقی تنظیم میں دوبارہ شامل ہونا پسند کریں گے۔ مرزا کو پولیس نے 14 دیگر لوگوں کے ساتھ گزشتہ سال اگست میں گرفتار کیا تھا اور ان پر الزام لگایا تھا کہ وہ جنوبی ہند میں چند معروف سیاست دانوں اور مذہبی لیڈروں کو ہلاک کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ تاہم قومی تفتیشی ایجنسی نے اس معاملہ کی انکوائری کے بعد صرف 12 لوگوں کے خلاف چارج شیٹ داخل کی اور کہا کہ دیگر دو کے خلاف کسی طرح واقعاتی ثبوت موجود نہیں ہیں۔ این آئی اے نے اپنی چارج شیٹ میں مرزا کے خلاف کوئی الزام نہیں لگایا۔ این آئی اے کی خصوصی عدالت نے انہیں ضمانت پر رہا کر دیا ہے۔ خیال رہے کہ مرزا کی گرفتاری کے بعد ڈی آر ڈی او نے انہیں ملازمت سے برطرف کر دیا تھا۔ وہ کچھ عرصے پہلے ہی ڈی آر ڈی او کے سی اے بی ایس لیب میں جونیئر سائنٹسٹ کے طور پر شامل ہوئے تھے۔ اعجاز مرزا نے آج نامہ نگاروں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ اگر مجھے اس معاملے میں بے گناہ ثابت کر دیا جاتا ہے تو میری دلی خواہش ہے کہ مجھے ڈی آر ڈی او میں دوبارہ بحال کر دیا جائے، لیکن اس وقت تک میں کچھ اپنے گھر والوں کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔

اعجاز مرزا نے کہا کہ اگر ڈی آر ڈی او نے انہیں بحال نہیں کیا تب وہ کسی دوسرے تحقیقی ادارے میں شامل ہونے کے بارے میں غور کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ گرفتار کرنے کے بعد پولیس نے ان سے طرح طرح کے سوالات کیے۔ ان سے پوچھا کہ کیا وہ دہشت گردی کی تربیت کے لئے پاکستان گئے تھے اور ڈی آر ڈی او میں جوائن کرنے کا ان کا مقصد کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ جب میں نے ان تمام الزامات سے انکار کیا اور کہا کہ وہ میری تعلیمی اسناد دیکھ سکتے ہیں تو انہوں نے یقین نہیں کیا۔ انہوں نے بتایا کہ جیل میں این آئی اے کے علاوہ گجرات اور آندھرا پردیش کی پولیس نے بھی ان سے پوچھ گچھ کی۔

انہوں نے کہا کہ انہیں یقین ہے کہ ان کا بھائی شعیب بھی، جو 12 چارج شیٹ کیے گئے ملزمین میں شامل ہے، بے گناہ ثابت ہوگا۔ اعجاز مرزا نے کہا کہ حالانکہ میں نے اپنے بھائی کے خلاف دائر کی گئی چارج شیٹ کو نہیں دیکھا ہے لیکن مجھے ہندوستانی عدلیہ اور اللہ پر پورا بھروسہ ہے۔

☆☆

انجینئر انصار احمد

تفتیش کے دوران عضو خاص پر کرنٹ لگایا گیا

دہشت گردانہ معاملے میں گرفتار انجینئر انصار احمد بادشاہ شیخ نے تفتیشی ایجنسیوں پر یہ الزام عائد کیا کہ گرفتاری کے بعد تفتیشی ایجنسیوں کے عملے نے دوران تفتیش اسے برہنہ کر کے مقام مخصوص پر الیکٹرک شارٹ دیا تھا اور مختلف اذیتیں دی تھیں۔ خصوصی مکوکا عدالت کے جج وائی ڈی شندے کے روبرو 7/11 ممبئی ٹرین بم دھماکہ کیس میں ملزمین کو مفت قانونی امداد فراہم کرنے والی تنظیم جمعیۃ علماء مہاراشٹر (مولانا ارشد مدنی) کے وکیل ایڈوکیٹ عبدالوہاب خان کی جانب سے پوچھے گئے سوالات کے جواب میں ملزم انصار احمد نے کہا کہ ستمبر 2008 کو اسے کرائم برانچ کے افسر ارون چوہان اور دنیش کدم نے پربھادیوی علاقے میں اس کے آفس آئی سی آئی پروڈنشیل سے گرفتار کیا تھا اور اس پر یہ الزام عائد کیا تھا کہ اس نے احمد آباد میں ہوئے بم دھماکوں سے 5 منٹ قبل میڈیا کو ایک ای میل روانہ کیا تھا اور ان دھماکوں کی ذمہ داری قبول کی تھی۔

انہوں نے بتایا کہ مجھے اس بات کا علم بھی نہیں تھا کہ میں نے اپنے ای میل آئی ڈی سے کوئی ای میل روانہ کیا تھا، لیکن اس کے باوجود بھی میرے سر پر یہ الزام عائد کر دیا گیا اور اسی کا ذکر فرد جرم میں بھی کیا گیا ہے۔ نیز گرفتاری کے بعد 5 دنوں تک مجھے غیر قانونی طور پر حراست میں رکھنے کے بعد 25 ستمبر کو ممبئی کے قلعہ کورٹ میں پیش کیا گیا جہاں سے عدالت نے پولیس تحویل میں رکھے جانے کا حکم جاری کیا جس کے بعد تقریباً ڈیڑھ ماہ تک

میں پولیس تحویل میں تھا، اس دوران مجھے مختلف مقامات پر لے جایا گیا، حالانکہ ان مقامات سے میں واقف نہیں تھا۔

آندھراپردیش کے چتوڑ ضلع کے پلر گاؤں سے تعلق رکھنے والے چالیس سالہ کمپیوٹر انجینئر نے اپنے مبینہ اعتراف جرم کی کہانی بتاتے ہوئے عدالت کو بتایا کہ 18 اکتوبر 2008 کو کرائم برانچ کے ایک افسر انسپکٹر راڈرکس نے مجھے قلعہ کورٹ میں ایک چیمبر میں پیش کیا، لیکن میں اس افسر کا نام نہیں بتانا چاہتا۔ چیمبر میں بیٹھے افسر نے مجھ سے صرف نام اور پتہ پوچھا اور بعد میں مجھے باہر جا کر بیٹھنے کی ہدایت دی۔ انصار احمد نے عدالت کو بتایا کہ چند گھنٹوں بعد چیمبر سے ایک پولیس کانسٹبل باہر نکلا۔ بعد میں اس نے چند ٹائپ شدہ کاغذات پر مجھے دستخط کرنے کی ہدایت دی، میں نے ان کاغذات کا مطالعہ کیے بغیر ہی اس پر دستخط کر دیے۔ بعد میں مجھے جیل میں اس کے اقبالیہ بیان کی تصدیق کی نقل موصول ہوئی، جسے دیکھ کر مجھے حیرانی ہوئی کہ میں نے کب ممبئی لوکل ٹرین بم دھماکہ معاملوں میں اقبالیہ بیان دیا تھا۔ بیان کے اندراج کے دوران اعتراف جرم میں یہ تحریر تھا کہ وہ دہشت گردانہ حملوں کی تربیت کیلئے ریاض بھٹکل اور صادق نامی ملزمین کے ہمراہ پاکستان گیا تھا۔ انصار کے بقول ریاض بھٹکل کے تعلق سے اخبارات کے ذریعہ اطلاع ملی تھی کہ وہ ملک کے مختلف مقامات پر ہوئے بم دھماکوں کے معاملے میں مفرور ملزم ہے، لیکن وہ ریاض بھٹکل سے واقف نہیں تھا، البتہ وہ صادق کو ضرور پہچانتا ہے، کیونکہ وہ اور صادق ممبئی کے چیتا کیمپ علاقے میں واقع آئیڈیل ہائی اسکول میں ایک ساتھ زیر تعلیم تھے۔

عارف بدر کا بیان:

اعظم گڑھ سے تعلق رکھنے والے حافظ قرآن عارف بدر کا بھی عدالت میں بیان درج

کیا گیا۔ انہوں نے عدالت کو بتلایا کہ وہ 2008 سے جیل میں مقید ہے اور اس کے خلاف ممبئی اور گجرات میں دو دہشت گردانہ معاملات التواء میں ہیں۔

خاموش طبیعت باشرع حافظ بدر نے وکلاء کے بیشتر سوالوں کا جواب کافی سوچنے کے بعد تاخیر سے دیتے ہوئے کہا کہ وہ صرف اردو اور عربی سے واقف ہے نیز اس کے خلاف فرد جرم ضرور عائد کر دی گئی ہے، لیکن اس میں کیا تحریر ہے اس سے وہ نابلد ہے۔

(بشکریہ روزنامہ راشٹریہ سہارا، دہلی)

☆☆

سرکاری فرقہ وارانہ بھید بھاؤ

ڈاکٹر انور علی باعزت بری ہونے کے باوجود برخاست
کرنل پروہت ہنوز باتنخواہ

● ادارہ

ملک میں مسلمانوں کے ساتھ انصاف کے دوہرے معیار کا ایک اور ثبوت اس وقت سامنے آیا جب دہشت گردی کے الزامات کے تحت گرفتار کئے گئے محکمہ دفاع کے ۲/اعلیٰ افسران میں سے مالیگاؤں ۲۰۰۸ء بم دھماکے کا کلیدی ملزم کرنل پروہت اب بھی محکمہ دفاع کا ملازم ہے اور اسے باقاعدہ ماہانہ تنخواہ حاصل ہورہی ہے جبکہ ممبئی کے ملنڈ بم دھماکہ معاملے کے ملزم ڈاکٹر انور علی کو باعزت بری کئے جانے کے باوجود بھی محکمہ دفاع نے انہیں دوبارہ ملازمت پر نہیں رکھا بلکہ انہیں نوکری سے ہی برخاست کردیا۔ حق معلومات کے تحت حاصل کی گئی معلومات کے مطابق کرنل پروہت آج بھی فوج میں کرنل کے عہدے پر فائز ہے اور اسے وہ تمام مراعات حاصل ہیں جو فوج کے کسی جوان کو حاصل ہوتی ہیں، ساتھ ہی ساتھ اسے ماہانہ تنخواہ بھی حاصل ہورہی ہے۔ باعزت بری کئے جانے کے بعد اور ایک معاملے میں ضمانت حاصل کرنے کے بعد جیل کی سلاخوں سے رہا ڈاکٹر انور علی فوج کے اعلیٰ افسران سے انہیں دوبارہ نوکری پر رکھنے کی درخواست بھی کی لیکن ان کی نوکری اب تک بحال نہیں کی گئی یہاں تک کہ جب انہوں نے محکمہ روزگار میں روزگار حاصل کرنے کے لئے درخواست دی تو اب تک ایک سال سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی انہیں ایک بھی کال لیٹر یعنی کے روزگار کا پروانہ حاصل نہیں ہوا۔

موصولہ اطلاعات کے مطابق مہاراشٹر کے پونے شہر میں واقع نیشنل ڈیفنس اکیڈمی میں ڈاکٹر انور علی جاوید علی خان لیکچرار کے عہدے پر فائز تھے۔ ۹/مئی ۲۰۰۳ء ان کی زندگی کا ایک سیاہ باب تھا جہاں سے ان کی بربادزندگی کا آغاز ہوا۔ مہاراشٹر پولیس کے انسداد دہشت گردی دستہ (اے ٹی ایس) نے انہیں مضافات کی لوکل ٹرین میں ہوئے بم دھماکوں کے معاملے میں گرفتار کرلیا اور ۱۱/مئی ۲۰۰۹ء کو انہیں باقائدہ ایک ملزم بنا کر ممبئی کی خصوصی مکوکا عدالت میں پیش کیا گیا۔ عدالت میں پیشی کے دوسرے دن ہی یعنی ۱۲/مئی کو انہیں نوکری سے برخاست کردیا گیا اور یہ جواز دیا گیا کہ ان کی غیر حاضری کے سبب انہیں نوکری سے نکال دیا گیا ہے۔

دوران گرفتاری ان پر ماہ دسمبر ۲۰۰۳ء میں ہوئے گھاٹ کوپر بی ای ایس ٹی بس بم دھماکوں کا الزام بھی عائد کردیا گیا اور ان پر ان دھماکوں کے سازش میں شامل ہونے کے الزامات لگائے گئے لیکن ۹/ماہ بعد پولیس ان کے خلاف عدالت میں کوئی ثبوت نہیں پیش کر سکی اور خود سرکاری وکیل نے ڈاکٹر انور اور دیگر ۸/ملزمین کے تعلق سے عدالت میں ایک عرض داشت داخل کی اور عدالت کو بتایا کہ ملزمین کے خلاف متذکرہ معاملے میں کوئی ثبوت موجود نہیں ہے، لہٰذا انہیں معاملے سے ڈسچارج کیا جائے جس کے بعد خصوصی عدالت نے انہیں باعزت بری قرار دیا لیکن ان پر عائد مصیبتوں کا خاتمہ نہیں ہوا بلکہ ملنڈ بم دھماکہ کا الزام ان کے ماتھے پر لگا ہی رہا۔

پونے شہر کے جونے مودی خانہ نامی علاقے میں مع اہل وعیال رہائش پذیر ڈاکٹر انور علی ۸/برسوں تک ممبئی کے آرتھر روڈ جیل میں مقید رہے۔ بلا آخر فروری ۲۰۱۱ء کو خصوصی پوٹا عدالت نے ناکافی شہادت کی بنا پر انہیں ضمانت پر رہا کئے جانے کا حکم صادر کیا لیکن خصوصی عدالت کے اس فیصلے کے خلاف جانچ ایجنسیوں نے ہائی کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا اور عدالت سے درخواست کہ وہ ملزم کو حاصل شدہ ضمانت کو منسوخ کردے لیکن ایجنسیوں کو ہائی کورٹ مین منہ کی کھانی پڑی اور عدالت نے پوٹا عدالت کے فیصلے کو برقرار رکھتے ہوئے

ڈاکٹر انور علی کی ضمانت کو درست قرار دیا۔

فی الوقت ملنڈ بم دھماکوں کا معاملہ التواء میں پڑا ہوا ہے اور آج بھی اس مقدمہ کی سماعت عدالت میں جاری ہے۔ڈاکٹر انور علی خود کو بے قصور بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان دھماکوں سے ان کا کوئی تعلق ہی نہیں تھا اور ۸؍سال انہوں نے جیل میں جو صعوبتیں برداشت کی ہیں اس عرصے میں ان کے اہل خانہ کو جن تکالیف اور مالی تنگی کا سامنا کرنا پڑا تھا، وہ ناقابل بیان ہے۔ڈاکٹر انور علی خاص کر اے ٹی ایس کی تحویل میں گزارے ہوئے دنوں کو یاد کر کے رو پڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا دشمن کو بھی ان کی تحویل میں نہ دے۔انہوں نے کہا کہ نوکری سے نکالے جانے کے بعد تلاش روزگار کے لئے وہ دردر کی ٹھوکریں کھاتے ہیں لیکن آج بھی انہیں نوکری حاصل نہیں ہوئی ہے البتہ جیل میں گزرے ان کے ایام کے دوران انہوں نے ۳۰؍دنوں کے اندر اردو سیکھنے کی ایک کتاب لکھی تھی جس سے انگریزی، ہندی اور مراٹھی اور دیگر اہل زبان سے واقف حضرات ایک قلیل عرصے میں اردو سیکھ سکتے ہیں۔اسی کتاب کو انہوں نے اپنا ذریعہ معاش بنالیا اور اب وہ اس کتاب کو خود لے جا کر غیر اردو داں حضرات میں فروخت کرتے ہیں اور وہی ان کی کمائی کا ذریعہ ہے۔

ڈاکٹر انور علی کی ملازمت سے برخاستگی کو لیکر حق وانصاف کی لڑائی لڑنے کے لئے مشہور تنظیم جمعیۃ علماء ہند کے قومی صدر مولانا ارشد مدنی نے یوپی اے چیئر پرسن سونیا گاندھی، وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ، وزیر دفاع اے کے انٹونی کے نام ایک خط روانہ کر کے ڈاکٹر انور علی کی نوکری کو بحال کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ کرنل پروہت اور ڈاکٹر انور علی دونوں ہی دہشت گردی کے الزام میں گرفتار کئے گئے ہیں لیکن کرنل پروہت کی ملازمت آج تک قائم ہے، انہیں تنخواہ حاصل ہو رہی ہے جبکہ ڈاکٹر انور علی کی گرفتاری کے دوسرے دن ہی انہیں نوکری سے برخاست کر دیا گیا۔

☆☆

خالد بے گناہ، طارق بے قصور
انصاف کے منہ پہ نہیں آنکھوں پہ پٹی

● سہیل انجم

ایمرجنسی کے زمانے میں جب پولیس مبینہ مشتبہ افراد کو گرفتار کر رہی تھی تو اسی دوران پولیس نے ایک شخص کو لکھنؤ میں ریل کی پٹری اکھاڑنے کے الزام میں گرفتار کیا تھا۔بعد میں جب وہ شخص جیل سے چھوٹ کر آیا تو اس کے ایک عزیز نے پوچھا کہ ارے بھائی تم تو بہت سیدھے سادھے آدمی ہو یہاں تک کہ تم زندگی میں کبھی لکھنؤ بھی نہیں گئے تو پھر تمہیں پولیس نے لکھنؤ میں ریل کی پٹری اکھاڑنے کے الزام میں کیسے گرفتار کرلیا؟ اس پر اس شخص نے از راہ تفنن کہا کہ ہاں میں کبھی لکھنؤ نہیں گیا لیکن حکومت تو یہ سمجھتی ہے نا کہ ہم لوگ بہت طاقتور ہیں اور سینکڑوں میل دور بیٹھے بیٹھے لکھنؤ میں ریل کی پٹری اکھاڑ سکتے ہیں۔وہ شخص اعظم گڑھ کا باشندہ تھا۔اسی اعظم گڑھ کا جس کو آج کل متعصب میڈیا ''آتنک گڑھ'' بنانے پر تلا ہوا ہے اور جہاں کے طارق قاسمی شہری ہیں۔وہی طارق قاسمی جن کو ایک دوسرے شخص خالد مجاہد کے ساتھ وارانسی، لکھنؤ اور فیض آباد کی عدالتوں میں 23 نومبر 2007 کو ہونے والے بم دھماکوں کے الزام میں 22 دسمبر 2007 کو بارہ بنکی سے اے ٹی ایس نے گرفتار کیا تھا۔اس نے جہاں یہ دعویٰ کیا تھا کہ ان دونوں نے ہی مذکورہ کچہریوں میں بم دھماکے کئے ہیں، وہیں یہ گل افشانی بھی کی تھی کہ ان لوگوں کے پاس سے بڑی مقدار میں دھماکہ خیز اشیا اور آر ڈی ایکس برآمد ہوا ہے۔گویا پولیس آج بھی یہ سمجھتی ہے کہ مسلمان سینکڑوں کلومیٹر

دور بیٹھ کر بھی دہشت گردانہ وارداتیں کر سکتے ہیں۔

ایک عام چوپال سے لے کر ملک کے سب سے بڑے اور سب سے مقتدر ایوان پارلیمنٹ تک میں اس پر بحث ہو رہی ہے کہ دہشت گردی کے نام پر بے قصور مسلم نوجوانوں کو گرفتار کیا جا رہا ہے اور انہیں جھوٹے مقدمات میں پھنسا کر جیلوں میں سڑایا جا رہا ہے، لیکن ہوتا کچھ نہیں ہے۔

خالد مجاہد اور طارق قاسمی کا معاملہ بالکل سامنے کا ہے۔ طارق کو 12 دسمبر 2007 کو اعظم گڑھ سے اور خالد کو 16 دسمبر 2007 کو مڑیاہو جونپور سے ریاستی پولیس نے اٹھایا تھا اور انہیں 22 دسمبر کو بارہ بنکی سے گرفتار دکھایا گیا۔ جب اس معاملے پر کافی ہنگامہ اور احتجاج ہوا تو اس وقت کی بی ایس پی حکومت نے مارچ 2008 میں جسٹس آر ڈی نمیش کی سربراہی میں یک رکنی کمیشن تشکیل دیا تھا۔ اس کمیشن نے پانچ سال کی جانچ کے بعد 31 اگست 2012 کو اپنی رپورٹ موجودہ سماجوادی پارٹی کی حکومت کو سونپ دی۔ یہ رپورٹ آج تک اسمبلی میں پیش نہیں کی گئی اور نہ ہی عوام کے سامنے رکھی گئی۔ البتہ اس کے بعض اقتباسات ضرور سامنے آگئے ہیں جس سے یہ حقیقت واضح ہوگئی ہے کہ پولیس نے خالد مجاہد اور طارق قاسمی کو جھوٹ موٹ ہی پھنسایا ہے۔ یہ رپورٹ انسانی حقوق کی بعض تنظیموں نے حاصل کر کے انٹرنیٹ پر ڈال دی ہے۔ اس رپورٹ کے 237 صفحات انٹرنیٹ پر ہندی میں موجود ہیں جن میں 137 صفحات آپریٹنگ پارٹ سے تعلق رکھتے ہیں جن میں کمیشن نے اس معاملے کا تجزیہ کیا ہے اور جانچ کا نتیجہ نکالا ہے۔ آخر میں اس نے اپنی سفارشات پیش کی ہیں۔ اس رپورٹ میں صاف طور پر کہا گیا ہے کہ ان دونوں افراد کا کوئی ہاتھ ان دھماکوں میں ثابت نہیں ہو سکا ہے بلکہ کمیشن نے دو قدم آگے بڑھتے ہوئے یہاں تک کہا ہے کہ اے ٹی ایس کے جن افسران نے یہ گرفتاری کی ہے ان کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے۔

رپورٹ کے مطابق بارہ بنکی سے ان دونوں افراد کی گرفتاری مشکوک ہے اور اس معاملے میں استغاثہ کے گواہوں نے جو بیانات دیے ہیں ان پر مکمل طور پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ کمیشن نے اے ٹی ایس کے ان افسران کے خلاف قانونی کارروائی کرنے کی سفارش کی ہے جنہوں نے ان دونوں کو پھنسایا ہے۔ جن افسران اور اسٹاف نے ایسا کیا ہے اور قانون کی خلاف ورزی کی ہے ان کی نشاندہی کی جائے اور انہیں سزا دی جائے۔ چونکہ یہ معاملہ عدالت میں زیر سماعت ہے اس لئے کمیشن نے ایسے لوگوں کی نشاندہی سے معذرت چاہی ہے۔ اس نے ایسے واقعات کو روکنے کے لئے بارہ سفارشات کی ہیں۔ وہ سفارشات یہ ہیں: دہشت گردی کے واقعات میں پولیس کے بجائے کسی دوسرے گزٹیڈ افسر کو برآمدگی کے دوران گواہ بنایا جائے۔ مبینہ ملزموں سے پوچھ گچھ کی ویڈیو ریکارڈنگ کی جائے۔ تفتیش پولیس کے کسی دوسرے گزٹیڈ افسر سے ہی کرائی جائے۔ ایسے معاملات کو نمٹانے کے لئے خصوصی عدالتوں کا قیام کیا جائے۔ ایسے معاملات میں الگ سے استغاثہ سیل بنایا جائے جو معاملات کو جلد نمٹانے میں مدد کرے۔ ایسے معاملات کو جلد از جلد اور زیادہ سے زیادہ دو سال کے اندر نمٹا دیا جائے۔ ہر مرحلے کی گواہی کے لئے وقت مقرر کیا جائے۔ اگر معاملہ متعینہ مدت کے اندر نہیں نمٹایا جا سکا ہے تو اس کا جائزہ لیا جائے اور ذمہ دار لوگوں کے خلاف کارروائی کی جائے۔ متاثرین کو مناسب معاوضہ دینے کا انتظام کیا جائے۔ جو افسران اچھا کام کریں ان کو انعام دیا جائے اور جو افسران بے قصوروں کو پھنسانے کے ذمہ دار پائے جائیں ان کے خلاف کارروائی کی جائے۔ ایسے معاملات سے متعلق ذمہ داروں کو پورا تحفظ فراہم کیا جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس رپورٹ کے منظر عام پر آنے اور تمام صورت حال کے واضح ہو جانے کے باوجود حکومت کے کانوں پر جوں نہیں رینگی ہے۔ اس نے ابھی تک اس رپورٹ کو ایوان میں نہیں رکھا ہے اور اسے عام بھی نہیں کیا ہے۔ اب انسانی حقوق کی بعض تنظیموں نے اس تعلق سے

عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ حکومت کو مجبور کیا جا سکے کہ وہ یہ رپورٹ عام کرے اور اس کی روشنی میں ضروری کارروائی کرے۔ یہ اعلان عوامی کونسل برائے امن و جمہوریت نے کیا ہے۔ اس کمیٹی کے ایک عہدے دار اسد حیات نے کہا ہے کہ چونکہ پولیس کی رپورٹ کی بنیاد پر ان دونوں کے خلاف کارروائی کی جا رہی ہے اور حکومت ہی کے قائم کردہ کمیشن نے اس گرفتاری کو غیر قانونی قرار دیا ہے، اس لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ یہ رپورٹ عام کی جائے۔ بہت سے لوگوں نے ان دونوں نوجوانوں اور ایسے دوسرے بے قصوروں کو رہا کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔

مسلم نوجوانوں کو جھوٹے کیسوں میں پھنسانے کا معاملہ تو اب بالکل طشت از بام ہو چکا ہے۔ خالد اور طارق کے معاملے سے قطع نظر بنگلور کے ایک نوجوان مسلم صحافی اور ''دکن ہیرالڈ'' سے وابستہ مطیع الرحمٰن اور ڈی آر ڈی او کے سائنس داں اعجاز احمد مرزا کی رہائی کا واقعہ ایک تازہ واقعہ ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جانچ ایجنسیاں یہ مان کر کیوں چل رہی ہیں کہ جہاں بھی اور جو بھی دھماکے ہوتے ہیں ان میں مسلم نوجوان ہی ملوث ہوں گے؟ جب کہ ایک دوسرے مکتبہ فکر یعنی زعفرانیوں کی دہشت گردی بھی بے نقاب ہو چکی ہے اور متعدد دھماکوں میں ان کا ہاتھ پایا گیا ہے۔ سوال یہ بھی ہے کہ جب نمیش کمیشن نے مذکورہ دونوں نوجوانوں کو بے قصور قرار دیا ہے تو حکومت انہیں کیوں نہیں رہا کر رہی ہے؟ دوسری بات یہ کہ جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ کچہریوں میں ہونے والے دھماکوں میں ان کا ہاتھ نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان دھماکوں کے پس پردہ کچھ دوسری طاقتیں ہی کارفرما ہیں۔ پولیس اور جانچ ایجنسیاں ان طاقتوں اور ان سے وابستہ لوگوں کی تلاش کیوں نہیں کرتیں؟ اس رپورٹ کی روشنی میں یہ بات صاف ہے کہ جو لوگ دھماکوں کے اصل قصوروار اور ذمہ دار ہیں وہ آزادانہ گھوم رہے ہیں اور خدشہ ہے کہ وہ دوسرے مقامات پر دھماکے کرنے کی سازش کر رہے ہوں گے۔

نمیش کمیشن نے اپنی رپورٹ میں سفارش کی ہے کہ ایسے معاملات کو جلد از جلد نمٹانے کے لئے خصوصی عدالتیں قائم کی جائیں۔ حکومت پر اس سلسلے میں دباؤ بھی ڈالا جا رہا ہے اور حکومت اس کا وعدہ بھی کرتی آئی ہے لیکن آج تک زود رفتار عدالتیں قائم نہیں ہو سکی ہیں۔ دہلی گینگ ریپ اور ایسے ہی دوسرے معاملات کے لئے فوری طور پر فاسٹ ٹریک عدالتیں قائم کی جا چکی ہیں تو پھر دہشت گردانہ واقعات میں مسلم نوجوانوں کی گرفتاری کے معاملات کو نمٹانے کے لیے فاسٹ ٹریک کورٹس کیوں نہیں بنائی جا رہی ہیں؟ ہزاروں مسلم نوجوان سلاخوں کے پیچھے پہنچا دئے گئے ہیں اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ حالانکہ عدالتوں سے بے قصور مسلم نوجوان بری ہو رہے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ پولیس جان بوجھ کر مسلمانوں کو جھوٹے مقدمات میں پھنساتی ہے۔ اس کے باوجود نہ تو مرکزی حکومت کے کانوں میں جوں رینگ رہی ہے اور نہ ہی اتر پردیش حکومت کے کانوں میں۔ سماجوادی پارٹی نے الیکشن کے دوران یہ وعدہ کیا تھا کہ جھوٹے مقدمات میں پھانسے گئے مسلم نوجوانوں کو رہا کیا جائے گا۔ سماجوادی پارٹی کے اقتدار میں ا?نے کے بعد مسلم تنظیموں اور انسانی حقوق کی کارکنوں نے اکھلیش حکومت سے بارہا یہ مطالبہ کیا ہے وہ اپنا وعدہ پورا کرے اور مزید براں یہ کہ اکھلیش حکومت نے بھی بارہا وعدہ کیا ہے کہ جلد ہی ان نوجوانوں کو رہا کیا جائے گا لیکن اس کے باوجود اس سلسلے میں کوئی کارروائی آگے نہیں بڑھ رہی ہے۔ کیا حکومت کے سامنے کوئی مجبوری ہے جو وہ بے قصور مسلمانوں کو رہا کرنے سے کترا رہی ہے یا کوئی دوسری بات ہے؟ بہر حال معاملہ جو بھی ہو یہ اس حکومت کی ذمہ داری ہے کہ اب جب کہ سارے حقائق منظر عام پر آ گئے ہیں تو وہ جیلوں میں بند بے قصور مسلم نوجوانوں کو رہا کرے تاکہ اس کا اعتبار عوام میں اور بالخصوص اقلیتوں میں قائم رہے۔

☆☆

باب چہارم

فرقہ وارانہ فسادات

عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کا فیصلہ کیا ہے تا کہ حکومت کو مجبور کیا جا سکے کہ وہ یہ رپورٹ عام کرے اور اس کی روشنی میں ضروری کارروائی کرے۔ یہ اعلان عوامی کونسل برائے امن و جمہوریت نے کیا ہے۔ اس کمیٹی کے ایک عہدے دار اسد حیات نے کہا ہے کہ چونکہ پولیس کی رپورٹ کی بنیاد پر ان دونوں کے خلاف کارروائی کی جارہی ہے اور حکومت ہی کے قائم کردہ کمیشن نے اس گرفتاری کو غیر قانونی قرار دیا ہے' اس لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ یہ رپورٹ عام کی جائے۔ بہت سے لوگوں نے ان دونوں نوجوانوں اور ایسے دوسرے بے قصوروں کو رہا کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔

مسلم نوجوانوں کو جھوٹے کیسوں میں پھنسانے کا معاملہ تو اب بالکل طشت از بام ہو چکا ہے۔ خالد اور طارق کے معاملے سے قطع نظر بنگلور کے ایک نوجوان مسلم صحافی اور ''دکن ہیرالڈ'' سے وابستہ مطیع الرحمٰن اور ڈی آر ڈی او کے سائنس داں اعجاز احمد مرزا کی رہائی کا واقعہ ایک تازہ واقعہ ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جانچ ایجنسیاں یہ مان کر کیوں چل رہی ہیں کہ جہاں بھی اور جو بھی دھماکے ہوتے ہیں ان میں مسلم نوجوان ہی ملوث ہوں گے؟ جب کہ ایک دوسرے مکتبہ فکر یعنی زعفرانیوں کی دہشت گردی بھی بے نقاب ہو چکی ہے او رمتعدد دھماکوں میں ان کا ہاتھ پایا گیا ہے۔ سوال یہ بھی ہے کہ جب نمیش کمیشن نے مذکورہ دونوں نوجوانوں کو بے قصور قرار دیا ہے تو حکومت انہیں کیوں نہیں رہا کر رہی ہے؟ دوسری بات یہ کہ جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ کچہریوں میں ہونے والے دھماکوں میں ان کا ہاتھ نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان دھماکوں کے پس پردہ کچھ دوسری طاقتیں ہی کارفرما ہیں۔ پولیس اور جانچ ایجنسیاں ان طاقتوں اور ان سے وابستہ لوگوں کی تلاش کیوں نہیں کرتیں؟ اس رپورٹ کی روشنی میں یہ بات صاف ہے کہ جو لوگ دھماکوں کے اصل قصوروار اور ذمہ دار ہیں وہ آزادانہ گھوم رہے ہیں اور خدشہ ہے کہ وہ دوسرے مقامات پر دھماکے کرنے کی سازش کر رہے ہوں گے۔

نمیش کمیشن نے اپنی رپورٹ میں سفارش کی ہے کہ ایسے معاملات کو جلد از جلد نمٹانے کے لئے خصوصی عدالتیں قائم کی جائیں۔ حکومت پر اس سلسلے میں دباؤ بھی ڈالا جارہا ہے اور حکومت اس کا وعدہ بھی کرتی آئی ہے لیکن آج تک زود رفتار عدالتیں قائم نہیں ہوسکی ہیں۔ دہلی گینگ ریپ اور ایسے ہی دوسرے معاملات کے لئے فوری طور پر فاسٹ ٹریک عدالتیں قائم کی جا چکی ہیں تو پھر دہشت گردانہ واقعات میں مسلم نوجوانوں کی گرفتاری کے معاملات کو نمٹانے کے لیے فاسٹ ٹریک کورٹس کیوں نہیں بنائی جارہی ہیں؟ ہزاروں مسلم نوجوان سلاخوں کے پیچھے پہنچا دئے گئے ہیں اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ حالانکہ عدالتوں سے بے قصور مسلم نوجوان بری ہو رہے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ پولیس جان بوجھ کر مسلمانوں کو جھوٹے مقدمات میں پھنساتی ہے۔ اس کے باوجود نہ تو مرکزی حکومت کے کانوں میں جوں رینگ رہی ہے اور نہ ہی اتر پردیش حکومت کے کانوں میں۔ سماجوادی پارٹی نے الیکشن کے دوران یہ وعدہ کیا تھا کہ جھوٹے مقدمات میں پھانسے گئے مسلم نوجوانوں کو رہا کیا جائے گا۔ سماجوادی پارٹی کے اقتدار میں ا?نے کے بعد مسلم تنظیموں اور انسانی حقوق کی کارکنوں نے اکھلیش حکومت سے بارہا یہ مطالبہ کیا ہے وہ اپنا وعدہ پورا کرے اور مزید براں یہ کہ اکھلیش حکومت نے بھی بارہا وعدہ کیا ہے کہ جلد ہی ان نوجوانوں کو رہا کیا جائے گا لیکن اس کے باوجود اس سلسلے میں کوئی کارروائی آگے نہیں بڑھ رہی ہے۔ کیا حکومت کے سامنے کوئی مجبوری ہے جو وہ بے قصور مسلمانوں کو رہا کرنے سے کترا رہی ہے یا کوئی دوسری بات ہے؟ بہرحال معاملہ جو بھی ہو یہ اس حکومت کی ذمہ داری ہے کہ اب جب کہ سارے حقائق منظر عام پر آ گئے ہیں تو وہ جیلوں میں بند بے قصور مسلم نوجوانوں کو رہا کرے تا کہ اس کا اعتبار عوام میں اور بالخصوص اقلیتوں میں قائم رہے۔

☆☆

باب چہارم

فرقہ وارانہ فسادات

فرقہ وارانہ فسادات کے خلاف جنگ

● عبدالحمید یوسف

وطن عزیز کی آزادی کی خاطر مذہب، علاقہ، زبان اور ثقافت سے بالاتر ہو کرانگریزوں کے خلاف متحد ہوکر جہاد کرنے والے آج مختلف بنیادوں پر نہ صرف یہ کہ بٹے ہوئے ہیں بلکہ وہ ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار بھی ہیں۔ یہ نہایت افسوسناک صورتِ حال ہے جس سے مجاہدینِ آزادی کی روحوں کو تکلیف پہنچتی ہوگی۔ 15 اگست 1947ء عیسوی کو ہم نے انگریزوں سے آزادی تو حاصل کر لی تھی لیکن انگریز نے ہمارے درمیان اختلاف کا جو بیج بویا تھا اس سے ہم ابھی تک آزاد نہیں ہو سکے ہیں۔ انگریزوں نے زبان، علاقہ، ثقافت اور مذہب کی بنیاد پر لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی اختیار کر کے ہندوستان پر قبضہ کیا تھا۔ انگریزی سامراج سے نجات حاصل کرنے کے لئے بدیر ہی سہی یہاں کی اکثریت نے متحدہ لڑائی شروع کی، لیکن جب آزادی کی صبح طلوع ہوئی تو جو دیکھنے کو ملا وہ بہت خوش کن نہیں تھا۔ ہندوستانی نہ صرف یہ کہ آپس میں بری طرح بٹ چکے تھے بلکہ ان کے اندر کی حیوانیت نے انھیں ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کا جواز بھی عطا کر دیا تھا۔ اور ہم آج تک مختلف بنیادوں پر لڑتے چلے آرہے ہیں۔ اگر کہیں کشمیر کے نام پر لڑائی ہے تو کہیں مبینہ طور پر بنگلہ دیشی مہاجرین سے نجات کی لڑائی۔ کہیں پاکستانی شدت پسند تحریکوں سے مبینہ طور پر تعلق رکھنے والے نوجوانوں کے خاتمہ کی لڑائی ہے تو کہیں مذہب کے نام پر فرقہ وارانہ فسادات۔ اگر تقسیم کا سانحہ عمل میں نہ آیا ہوتا (تقسیم ہند کے ضمن میں انگریزوں

کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے) تو نہ کوئی بنگلہ دیشی مہاجر ہوتا اور نہ ہی کوئی سرحد پار کی دہشت گرد تنظیموں سے تعلق رکھتا۔ تقسیم کی وجہ سے ہمارا وہ اتحاد جس کی وجہ سے ہمیں آزادی ملی تھی پارہ پارہ نہ ہوا ہوتا تو شاید مذہب کے نام پر ہم اتنے دور دور نہ رہتے۔ آزادی کے بعد سے چھ دہائی سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن ہمیں مل جل کر رہنے کا ہنر نہیں سکھنے دیا گیا۔ سیاسی پارٹیوں اور عوام الناس پر اپنی برتری برقرار رکھنے کے خواہش مند کچھ مذہبی رہنماؤں نے اپنے مفاد کی خاطر ہمیں انھیں لوگوں سے الجھائے رکھا جن کے ساتھ ہم اپنی زندگی کے روز وشب گزارتے ہیں۔ نتیجہ فرقہ وارانہ فسادات کی صورت میں سامنے ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستانیوں کی اکثریت، چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان یا کسی اور مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، امن پسند ہے اور شر پسند عناصر کی تعداد کم ہے۔ لیکن تالاب کے سارے پانی کو گدلا کرنے کے لئے صرف چند مچھلیاں کافی ہوتی ہیں۔ ایک چھوٹے سے گروہ کی امن مخالف سرگرمیاں پورے ملک کے امن کو غارت کر دیتی ہیں۔ فرقہ واریت انگریزوں کے دور میں بھی تھی مگر جب بات آزادی کی آئی تو یہ ہمارے درمیان اتحاد کی راہ میں حائل نہیں ہوئی۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ مجاہدین آزادی کے اس خواب کو پورا کرنے میں ہم ابھی تک ناکام ہیں کہ انگریزوں کے جانے کے بعد ہندوستان میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ حاصل ہوگا۔ دستور کے معماروں نے تہذیبی، ثقافتی اور مذہبی رواداری کو برقرار رکھتے ہوئے ہندوستان کو سیکولر بنیادوں پر استوار کیا تھا۔ ہمارا دستور فرقہ پرستی کے بجائے بقائے باہم اور امن وآشتی کی وکالت کرتا ہی۔ لیکن فرقہ وارانہ فسادات اب بھی ہوتے ہیں۔ فسادات نے ہمارے درمیان حائل عدم اعتماد کی خلیج وسیع کیا ہے۔ افسوس ناک امر یہ ہے کہ ان فسادات کو سیاسی سرپرستی حاصل ہوتی ہے جس کی وجہ سے فسادی بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہ صورتِ حال شر پسند عناصر کی حوصلہ افزائی کرتی ہے اور ایک فساد کے ختم ہو جانے کے بعد دوسرے فساد کے ہونے کا خدشہ ہمیشہ برقرار رہتا ہے۔ یہی

وجہ ہے کہ اگر ماضی میں ہمیں جبل پور، تیل چری، جمشید پور، بھیونڈی، مراد آباد، بھاگلپور اور بابری مسجد کی شہادت کے بعد ہونے والے فسادات جھیلنے پڑے تھے تو ہمیں 2002ء میں ہونے والے گجرات کے بھیانک فسادات سے بھی گزرنا پڑا ہے۔ کوسی کلاں، پرتاپ گڑھ اور آسام کے فسادات تو ابھی چند دنوں کی بات ہیں۔ مزید یہ کہ ہر سال بڑے تہواروں کے موقع پر مختلف علاقوں میں لوگ ایک دوسرے سے دست وگریباں تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اکا دکا فسادات کو چھوڑ کر دیگر فساد سیاسی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ملک کی دو بڑی پارٹیوں پر اس الزام کو جھوٹ نہیں قرار دیا جا سکتا ہے کہ وہ مختلف مقاصد کے حصول کے لئے فسادات کرواتی ہیں۔ ہندتوا میں یقین رکھنے والی بی جے پی اگر فسادات سے مسلمانوں کو نقصان پہنچا کر ہندوؤں کو خوش کرنے کے الزام سے بری نہیں ہے تو کانگریس بھی ایسے الزام کا سامنا کر رہی ہے کہ وہ فسادات کے ذریعہ اقلیتوں کے دلوں میں خوف پیدا کرتی ہے اور پھر متاثرین کا سب سے بڑے مسیحا بن کر الیکشن میں ان کی ہمدردی حاصل کرتی ہی۔ ہمارے آباء واجداد نے انگریزوں کی غلامی کے خلاف دونوں مسلح اور غیر مسلح جہاد کیا تھا۔ اس کے لئے انھیں جانی و مالی قربانیاں پیش کرنا پڑی تھیں۔ آج ہمیں دیگر مسائل سمیت فسادات اور اس کے اصل سبب متعصب ذہنیت کے خلاف علمِ جہاد بلند کرنا ہوگا تا کہ ہمارے جان و مال محفوظ ہو سکیں۔ ہمیں فسادات سے آزادی کی طویل جنگ لڑنی ہوگی۔ بڑے پیمانے پر کرائے جانے والے منظّم فساد کے لئے خاص طور سے خفیہ ایجنسیوں کی گرفت کی جانی چاہئے کہ اتنے بڑے پیمانے پر رچی جانے والی ملک مخالف سازش کی انھیں بھنک بھی نہیں لگی، یا اگر انہیں معلوم بھی ہوا تو کچھ وجوہات کی بنا پر اسے زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا۔ بیشک متعلقہ انتظامیہ کی بروقت کارروائی سے ایسے فسادات پر بھی تھوڑے وقت میں قابو پا کر انھیں طویل ہونے سے بچایا جا سکتا ہی، لیکن چھوٹے پیمانے پر ہونے والے فسادات جو کہ کسی وقتی حادثہ کی وجہ سے واقع ہوتے ہیں ان کے لئے مقامی پولس ذمہ دار ہی۔ اکثر ایسا

دیکھا گیا ہے کہ ایک حادثہ جو صرف وقتی کشیدگی کا سبب بن سکتا تھا انتظامیہ کی لاپرواہی سے جان و مال کے بھاری نقصان کا پیش خیمہ ثابت ہو جاتا ہے۔ مندروں میں گائے کا گوشت پھینکنے اور تہواروں کے موقع پر مسجدوں سے گزرتے ہوئے بلا وجہ ہڑ بونگ اور اشتعال انگریز نعرے بازی کے ذریعہ پیدا شدہ کشیدگی کو مقامی پولس بہ آسانی قابو میں کرسکتی ہی۔ لیکن جب یہی پولس اپنی آنکھوں کے سامنے کشیدگی کو فرقہ وارانہ تصادم میں تبدیل ہونے بلکہ ٹکراؤ کی صورت میں کسی خاص فرقہ کی طرفداری کرتی ہے تو اس بات کے امکانات بڑھ جاتے ہیں کہ دونوں طرف کے لوگوں کا جانی اور مالی خسارہ ہو۔ دراصل پولس اور ان کے اوپر کے دیگر افسران میں کچھ لوگ ابھی بھی ایسے ہیں جو فرقہ پرست ذہنیت کے حامل ہیں۔ وہیں سیاسی پارٹیاں بھی اپنے مفاد کی خاطر عوام الناس کو لڑانے کی پالیسی اپنائے ہوئے ہیں۔ ان سے ہمیں نجات حاصل کرنے کی ضرورت ہی۔ فسادات کو روکنے میں تساہلی سے کام لینے والے افسران کی سرکوبی بہت ضروری ہے۔ ابھی تک کے مشاہدات بتاتے ہیں کہ محض تبادلہ کر دینا کارگر ثابت نہیں ہوتا ہی۔ اسی طرح سے فساد کے اصل ملزمین کو سزا نہیں دی جاتی ہی۔ چاہے وہ ممبئی کے فسادات ہوں یا گجرات کے، فساد کے اصل ملزمین آزاد گھوم رہے ہیں۔ معرف سماجی کارکن تیستا سیتلواد نے ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ ''جب تک سزا سے مستثنیٰ کا کلچر ختم نہیں ہوتا، فرقہ وارانہ فسادات کے قصورواروں کو سزا نہیں دی جاتی، ہم یہ پیغام نہیں دے پاتے کہ تقسیم کی سیاست ہم برداشت نہیں کریں گے تب تک ایسے واردات کو روکنا ممکن نہیں ہی۔''

☆☆

ہاشم پورہ۔ ملیانہ فسادات
کیا انصاف ملے گا؟

● سدھارتھ رائے

ہندوستانی سیاست میں ناپاک اور پاک صاف میں فرق نہیں ہے۔ ہندوستان کے لیڈروں میں بیوقوفی اور دور اندیشی کا فرق نہیں ہے۔ ہندوستان کی سرکاروں میں اچھی حکومت اور خراب حکومت کا بھی فرق نہیں ہے۔ فرق صرف ایک ہے اور یہی فرق اولین ہے اور پارٹیوں کی تشریح کرتا ہے۔ بی جے پی فرقہ پرست ہے، آر ایس ایس فرقہ پرست ہے اور کانگریس، بی ایس پی، پسماندہ ذاتوں کی پارٹیاں اور بائیں بازو کی پارٹیاں فرقہ پرست نہیں ہیں، لیکن کیا یہ فرق صحیح معنوں میں کیا جاسکتا ہے۔ میرٹھ کے تحت ملیانہ اور ہاشم پورہ جہاں آج سے 24 سال پہلے 1987 میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے تھے۔ ان سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔

ہندوستان کا سب سے پہلا فرقہ وارانہ فساد 1809 میں بنارس میں ہوا تھا۔ اس کا سبب عیدگاہ اور ہنومان ٹیلے کے درمیان زمین کا جھگڑا تھا۔ سرکاری ریکارڈ کے مطابق یہ پہلا موقع تھا جب ہندو اور مسلمان مذہب کے نام پر ایک دوسرے سے الجھے تھے، اس کے بعد تو فسادات کی جھڑی ہی لگ گئی۔ انگریز حکومت اور مضبوط ہوتی چلی گئی اور ہندوستان پر حکومت کرنے کا سب سے آسان طریقہ تھا اسے توڑ دینا۔ انہوں نے وہی کیا بھی۔ ہم 1857 کی لڑائی کو آزادی کی سب سے پہلی لڑائی مانتے ہیں، لیکن تب بھی ہندوستان ایک

ساتھ نہیں تھا۔ سرکاری ریکارڈ بتاتے ہیں کہ جب میرٹھ کے جوان دہلی پہنچے تو دہلی کے ہندوؤں نے بہادر شاہ ظفر سے شکایت کی کہ یہ جوان ہندوؤں کی دکانیں لوٹ رہے ہیں۔ آپس کی بات چیت بتاتی ہے کہ دہلی کے ہندو اس انقلاب کو خدائی قہر مانتے تھے۔

پھر آیا 1931 کا کانپور فساد، جسے گجرات فسادات سے پہلے ہندوستان کا سب بڑا فساد مانا جاتا ہے۔ چونکانے والی بات یہ ہے کہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات ایک ہی طریقے سے ہوتے ہیں۔ ایک ہی طریقے سے جھگڑا شروع ہوتا ہے اور ایک ہی طریقے سے لوگوں کو مارا جاتا ہے اور ایک ہی طرح کے لوگ فسادات میں شامل ہوتے ہیں۔ میرٹھ فسادات کو ہندوستان کے دوسرے فسادات کے ساتھ دیکھا جائے تو ایک پیٹرن نکل کر آتا ہے۔ میرٹھ فسادات کی شروعات ہوئی تھی آنجہانی راجیو گاندھی کے حکم پر؟ ہندوؤں کے لیے رام جنم بھومی کا تالا کھولنے سے مسلمان بھڑک گئے اور ہندو بھی پیچھے نہیں رہے۔ فساد بھڑک گیا، دونوں ہی طرف سے لوگوں کی جانیں گئیں، لیکن میرٹھ کے ہاشم پورہ محلے اور ملیانہ گاؤں میں جو ہوا، اس نے لوگوں کا دل دہلا دیا۔ یہاں بڑے پیمانے پر جان و مال کا نقصان تو ہوا ہی ساتھ ہی ہندوستان کا آئیڈیا بھی چکنا چور ہو گیا۔

ہاشم پورہ میں 22 مئی 1987 کی رات پی اے سی کے جوانوں نے مسلمانوں کو گرفتار کیا اور ایک پیپل کے پیڑ کے پاس لے جا کر قطار میں کھڑا کر دیا، ان میں سے بچوں اور بوڑھوں کو الگ کر کے بھیج دیا گیا۔ باقی 42 مسلم نوجوانوں کو قریب میں واقع گلمرگ سنیما ہال پر کھڑے پی اے سی کے ٹرک میں بٹھا کر تھانہ لے جانے کے لیے روانہ کیا گیا، لیکن پی اے سی کے جوان اس ٹرک کو تھانے نہ لے جا کر پلاٹون کمانڈر سریندر پال سنگھ کی قیادت میں دہلی-میرٹھ ہائی وے پر لے گئے اور وہاں گنگا نہر کے کنارے ایک آم کے درخت کے نیچے سبھی کو اتارا اور پھر قطار میں کھڑا کر کے انہیں گولی مار دی گئی اور ان کی لاشیں نہر میں بہا دی گئیں۔ کچھ لوگوں نے شور مچایا اور ٹرک سے نہیں اترے۔ انہیں پھر ماکن پور

گاؤں کے قریب ہنڈن نہر کے پاس اتار کر گولی ماری گئی اور ان کی لاشیں نہر میں پھینک دی گئیں۔ ان میں سے صرف 5 لوگ بچ پائے، جنہیں پی اے سی کے جوانوں نے گولی مارنے کے بعد مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ یہی لوگ وہاں سے جان بچا کر بھاگے اور انہی کی زبانی یہ خوفناک کہانی سامنے آئی۔

ملیانہ گاؤں میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ ملیانہ میں ایک چھوٹا سا علاقہ مسلمانوں کا ہے۔ یہاں مسلم آبادی ہندو اکثریتی علاقوں سے گھری ہوئی ہے۔ یہاں مسلمان شیخ اور ہندو بنیے زمیندار تھے، جن کے کھیتوں پر دلت طبقے کے لوگ کام کرتے تھے۔ فسادات کے دوران ایک مقامی بنیا لیڈر نے دلتوں کو اکسایا اور مسلمانوں کو کاٹ دیا گیا۔ ایک بار پھر سے پی اے سی تعینات کی گئی۔ واقعہ کے چشم دید مسلم بتاتے ہیں کہ رات کو ان کے سامنے ہی شراب کا ٹھیکہ پی اے سی نے فسادیوں سے لٹوا دیا جس سے یہ اندازہ ہو گیا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ کچھ دیر بعد ہی فسادیوں کی بھیڑ مسلم علاقے پر ٹوٹ پڑی، پی اے سی کے جوان ان کے ساتھ تھے، فسادی لوٹ پاٹ کرنے لگے اور پی اے سی کے جوانوں نے ایک اونچی عمارت پر چڑھ کر اندھا دھند گولیاں برسانی شروع کر دیں، جس میں بہت لوگ مارے گئے۔

1931 کے کانپور فساد کو فسادات کا معیار مانا گیا ہے۔ 1931 میں کانپور میں فسادات اس لیے ہوئے تھے کیوں کہ کانگریس کے لیڈروں نے ''تحریک عدم موالات'' کے تحت شہر بند کا اعلان کیا تھا۔ شہر میں زیادہ تر کپڑوں کی دکانیں مسلمانوں کی تھیں اور جب بند کافی دنوں تک جاری رہا تو مسلمانوں کو خسارہ ہونے لگا۔ انہوں نے اپنی دکانیں کھولنا شروع کر دیں، جس پر کانگریسی کارکن وہاں جا کر دکانیں بند کرانے کی کوشش کرنے لگے۔ پہلے تو تو میں میں ہوئی اور پھر مار پیٹ۔ چونکہ کانگریسی ہندو تھے اور کپڑا تاجر مسلمان، اس لیے یہ بات ہندو بنام مسلمان بن گئی اور فساد شروع ہو گیا۔ ملیانہ میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ دراصل مقامی بنیا برادری کا مسلمانوں سے مقابلہ تھا۔ جب میرٹھ شہر میں فساد بھڑکا تو بنیا

برادری کو موقع مل گیا۔ اس نے فسادیوں کی رہنمائی کی، لیکن فسادی کون تھے؟ یہ دو طرح کے لوگ تھے۔ پہلے تھے دلت، مزدور۔ بنیا برادری نے غریب دلتوں کو لوٹ پاٹ کا لالچ دیا، جس سے وہ مسلمانوں کے گھر لوٹنے لگے۔ دوسری طرف کے فسادی شہر سے آئے تھے۔ یہ فسادی کوئی نئے اداکار نہیں تھے۔ یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ اتر پردیش میں ہی بلیا ضلع میں ہوئے فسادوں میں ایک بات نکل کر سامنے آئی تھی کہ قریب کے غازی پور ضلع کے لوگ ہی رات میں بلیا جا کر فساد کرتے اور صبح سویرے اپنے گھروں کو لوٹ آتے تھے۔ وہی یہاں بھی ہوا۔ ہندوستان میں فسادات میں افواہوں کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہاں افواہ پھیلی کہ ملیانہ میں بہت سارے ہندوؤں کو مار دیا گیا۔ ایک اور بات قابل توجہ ہے کہ فسادات سے پہلے شراب کا ٹھیکہ کیوں لوٹا گیا؟ کانپور میں بھی پتہ چلا تھا کہ فساد بھڑکانے میں سب سے اہم کردار چورا چکوں، غنڈوں نے نبھایا تھا۔ ایسا انہوں نے لوٹ کے ارادے سے کیا تھا، وہی ملیانہ میں بھی ہوا۔ اسی لیے غنڈوں اور چوروں نے سب سے پہلے شراب لوٹی۔

دیگر فسادات کی طرح ان فسادات میں دھاردار ہتھیاروں اور آگ زنی کا سہارا لیا گیا۔ یاد رکھنے والی بات ہے کہ کانپور کے فسادات میں گنیش شنکر ودیارتھی جیسے بڑے لیڈر کا قتل چاقو مار کر کیا گیا تھا۔ ملیانہ میں چاقو اور تلوار کا استعمال ہوا۔ ایک خاتون کا پیٹ چیر دیا گیا اور ایک بچہ کا پیر پکڑ کر اسے آگ میں جھونک دیا گیا۔ ایک ہی کنبے کے 11 اور دیگر 6 لوگوں کو گھروں میں آگ لگا کر زندہ جلا دیا گیا۔ ملیانہ اور ہاشم پورہ میں ایک بات جو یکساں تھی، وہ تھی پولس انتظامیہ کی فسادیوں کے ساتھ سازباز۔ اصل میں دیکھا جائے تو ہندوستان میں آزادی کے پہلے سے ہی انتظامیہ خاص طور سے پولس ایک ہندو فوجی نظام کی طرح کام کرتی ہے۔ ملیانہ یا ہاشم پورہ میں کوئی نئی بات نہیں ہوئی تھی۔ 1931 میں کانپور میں بھی پولس نے مسلمانوں پر ہر طرح کے مظالم ڈھائے تھے، ان فسادات پر بیٹھی جانچ کمیٹی نے

نوٹ کیا تھا کہ پولس نے ہندو پولس اور ہندو فسادیوں کی طرح کام کیا تھا۔ اس کمیٹی نے پوسٹ مارٹم کی بنیاد پر یہ نتیجہ نکالا کہ عام لوگوں نے تو دھاردار ہتھیار استعمال کیے تھے، لیکن ایسے کئی لوگ تھے، جو پولس کی گولی سے ہلاک ہوئے تھے، کیوں کہ پولس نے بھیڑ کو تتر بتر کرنے کے لیے نہیں، بلکہ جان سے مارنے کے ارادے سے گولیاں چلائی تھیں۔ پولس کی گولی باری میں مرنے والے زیادہ تر لوگوں کے جسم پر کمر سے اوپر زخم تھے۔ ملیانہ میں بھی چشم دید لوگ بتاتے ہیں کہ زیادہ تر لوگ کمر کے اوپر لگی گولیوں سے ہلاک ہوئے۔ گولیاں زیادہ تر سینے اور سر میں لگی تھیں۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ پولس فورس ہندو اکثریت پر مشتمل ہے۔ آج سے نہیں آزادی کے پہلے سے ہی۔ ویسے بھی پی اے سی کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو آزاد ہندوستان میں اس پولس فورس نے بہت منفی کردار ادا کیا ہے۔ کانپور میں کچھ سال پہلے ہوئے فسادوں میں بھی یہی دیکھا گیا کہ پی اے سی نے سبق سکھانے کی نیت سے کئی مسلم علاقوں میں گولی باری کی اور مسلمانوں کو گھروں سے باہر گھسیٹ کر مارا پیٹا۔ اتر پردیش کی تو یہ تہذیب بن گئی ہے کہ جب بھی کہیں فساد ہوتے ہیں تو ہندو فسادی پی اے سی کے آنے کا انتظار کرتے ہیں اور پھر اس کے ساتھ مل کر فساد کرتے ہیں۔

ملیانہ میں مسلمانوں کے تئیں حکومت کا سوتیلا سلوک صاف دکھائی دیتا ہے۔ مسلم محلے میں بہت گندگی ہے، سڑکیں ٹوٹی ہوئی ہیں اور بجلی کے تار یہاں وہاں لٹکے ہوئے ہیں۔ جیسے ہی آپ ملیانہ کی عیدگاہ سے آگے بڑھتے ہیں صاف ستھری اور کنکریٹ کی پکی سڑکیں آپ کا استقبال کرتی ہیں۔ ہندو بنیا طبقہ اور دلتوں کے رہن سہن سے آپ ان کی خوشحالی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مسلمان بچے ننگے اور پھٹے بنیان پہن کر گھومتے ہیں۔ ملیانہ امبیڈکر گرام تو بن گیا، لیکن وہاں کے مسلمان دوسرے درجے کی زندگی جی رہے ہیں۔ مایاوتی نے بھی سابقہ لیڈروں کی طرح مسلمانوں کو نظر انداز کر دیا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ملیانہ اور ہاشم پورہ کے لوگوں کو آج تک انصاف ملا ہی نہیں۔ تب سے اب تک کئی سرکاریں بن چکی ہیں،

لیکن ان کی کوئی سنوائی نہیں ہوئی۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ فساد ہندوستان کی سب سے بڑی سیکولر پارٹی کانگریس کے دورِ اقتدار میں ہوا۔ اس وقت کانگریس کے ویر بہادر سنگھ اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ تھے۔ مرکز میں کانگریس کی سرکار تھی اور راجیو گاندھی وزیر اعظم تھے، لیکن کیا ہوا؟ اس وقت کے وزیر داخلہ بوٹا سنگھ نے تو کہا کہ صرف 10 مسلمانوں کی موت ہوئی ہے، جب کہ ان دونوں جگہوں پر تقریباً 150 مسلمان مارے گئے تھے۔ ملیانہ کا تو حال یہ ہے کہ وہاں کے واقعہ کی ایف آئی آر تک عدالت کے ریکارڈ سے غائب ہو چکی ہے۔ ملیانہ اور ہاشم پورہ کے لوگ بتاتے ہیں کہ ان سے ملنے اور انصاف دلانے کے لیے راجیو گاندھی، چندر شیکھر، وی پی سنگھ، لال کرشن اڈوانی، ملائم سنگھ اور کلیان سنگھ جیسے بڑے بڑے لیڈر آئے، لیکن ان کے سارے وعدے صرف ووٹوں کی سیاست تک محدود رہے۔

اب کون سیکولر ہے اور کون نہیں، یہ کہنا مشکل ہے۔ جو اپنے کو سیکولر اور مسلمانوں کا مسیحا بتاتے تھے، انہی کی ناک کے نیچے یہ سفاکانہ قتل عام ہوا۔ فسادات میں فسادی تھے۔ یہ سنگھی اور کانگریسی دونوں ہی رہے ہوں گے، لیکن سرکار تو سرکار ہوتی ہے۔ خواہ کسی کی بھی ہو، تو پھر آج تک انصاف کیوں نہیں ملا؟ آج 25 ویں سال میں بھی انصاف کا انتظار ہے۔ بچے جوان ہو گئے۔ جوان بوڑھے ہو گئے، لیکن انصاف سرکاری فائلوں اور عدالت کی پیشیوں میں الجھ کر رہ گیا۔ آئین ہند خود کو سیکولر بتاتا ہے یا نہیں، یہ ان فساد متاثرین کے لیے معنی نہیں رکھتا۔ ان کا اپنا ہندوستان ہے، جو مسلم مخالف ہے اور ڈانٹ پھٹکار سے بھرا ہوا ہے۔

☆☆

بھاگلپور فساد کے نام پر سیاست

● ادارہ

بھاگلپور یوں تو آج بھی سلک نگری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، لیکن اس کی اصلی شناخت اب 1989 کے بدنام زمانہ مسلم کش فسادات سے جڑ گئی ہے، یہ بدترین فساد کانگریسی دورِ حکومت کے آخری ایام میں ہوا تھا۔ اس لئے کانگریس کو ہی اس فساد کا ذمہ دار مانا گیا اور بھاگلپور کے فساد متاثرین کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتے ہوئے پورے بہار کی سیکولر عوام نے اس کی سزا کانگریس کو دی۔ اس مسلم کش فساد کے بعد کانگریس کے قدم بہار سے اس طرح اکھڑے کہ آج 23 سال سے زائد گزر جانے کے بعد بھی وہ اقتدار میں واپسی کے لئے جدو جہد کر رہی ہے۔ کانگریس کو تو بھرپور سزا مل گئی، مگر اس کے بعد بھاگلپور فساد کے نام پر سیاست کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہا ہے۔ تمام سیکولر اور غیر سیکولر پارٹیاں بھاگلپور فساد کے نام پر سیاست کرتی ہیں۔ اس سے سیاسی فائدہ اٹھاتی ہیں اور کسی نہ کسی طریقے سے اپنا کام بنانے کے بعد بھاگلپور فساد سے بری طرح متاثر ہونے والے مسلمانوں کے زخموں پر نمک چھڑک دیتی ہیں جس سے ان کا درد جاگ اٹھتا ہے۔

بہار کی موجودہ حکومت کے سربراہ نتیش کمار نے بھی یہی کیا ہے انہیں بہار کا اقتدار ہتھیانا تھا تو انہوں نے 2005 کے اسمبلی انتخاب کے دوران مسلم ووٹروں کو اپنی پارٹی جنتا دل یونائیٹڈ کی طرف راغب کرنے کی غرض سے بھاگلپور کا معاملہ اٹھایا تھا اور اقتدار میں

آنے پر فساد متاثرین کو انصاف دلانے کا وعدہ کیا تھا۔اس وقت کے سیاسی حالات نے بھی ان کی مدد کی اور وہ اقتدار میں آ گئے۔لیکن اقتدار میں آنے کے بعد انہوں نے سابقہ حکومت کی طرف سے تشکیل دئے گئے کمیشن کی سفارشوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ایک نیا کمیشن قائم کرنے کا اعلان کیا اور 6 ماہ کے اندر اس کی رپورٹ سامنے لاکر ظالموں کو سزا اور مظلوموں کو انصاف دلانے کا وعدہ کیا مگر جب 6 ماہ بعد بھی کمیشن کی رپورٹ سامنے نہیں آئی تو ابوقیصر نے بھاگلپور فساد متاثرین کو انصاف دلانے کا بیڑا اٹھایا، ان کی لگاتار جدوجہد رنگ لائی۔کمیشن کو عبوری رپورٹ پیش کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔نتیجہ کے طور پر بھاگلپور کے فساد متاثرین کو ماہانہ پنشن اور سکھ فساد متاثرین کو معاوضہ مرکزی حکومت کی طرف سے ملا، لیکن چوں کہ کمیشن نے ابھی تک حتمی رپورٹ نہیں پیش کی ہے اور نہ ہی اس نے انصاف کے لئے دعویداروں کے دعووں پر غور کیا ہے اس لئے بھاگلپور کے فساد متاثرین کو پورا انصاف نہیں مل سکا ہے۔لیکن جتنا بھی کچھ ملا ہے اس میں محمد ابوقیصر کا بڑا ہاتھ ہے۔ وہی ابوقیصر جب بھاگلپور کے سب سے زیادہ مسلم ووٹر والے حلقہ ناتھ نگر حلقہ سے آر جے ڈی۔ایل جے پی اتحاد کے امیدوار بنے تو نتیش کمار نے اپنی پارٹی جنتا دل متحدہ کے ٹکٹ پر ایک ایسے امیدوار کو کھڑا کر دیا ہے جس کا خاندان مسلمانوں کے قاتل کے طور پر جانا جاتا ہے۔میری مراد اجے منڈل سے ہے یہ وہی اجے منڈل ہے جس کے والد کو ابھی کچھ ہی روز قبل گھوگھا میں چار مسلمانوں کے قتل کے الزام میں عدالت عمر قید کی سزا سنا چکی ہے۔نتیش نے منڈل کو اپنا امیدوار بنا کر اس اسمبلی حلقہ کے علاوہ پورے بہار کے مسلمانوں کے زخموں پر نمک پاشی کی ہے۔ایسا یہاں کے مسلمانوں کا ماننا ہے اور اس کا جواب مسلمان آئندہ اسمبلی انتخاب میں ضرور دیں گے۔

بھاگلپور میں ہونے والے فسادات میں ایک ہزار سے زیادہ افراد مارے گئے تھے اور مسلمانوں کی پاور لوم کی صنعت تباہ ہوگئی تھی۔وزیرِ اعلیٰ نتیش کمار نے یہ اعلان کیا تھا کہ

حکومت فسادات پر ایک قرطاس ابیض بھی جاری کرے گی۔حزب اختلاف کی جماعت راشٹریہ جنتا دل نے نئی حکومت کے قدم کا خیر مقدم کیا ہے لیکن حکمران جماعت کے ارادوں پر شکوک بھی ظاہر کیے ہیں۔ پارٹی کے ترجمان شیوانند تیواری نے کہا کہ ’نئی حکومت کے سامنے بے روزگاری، امن وقانون اور ذات پات کے ٹکراو جیسے اہم سوالات ہیں جن سے توجہ ہٹانے کے لیے نتیش نے یہ اعلانات کیے ہیں۔‘

تاہم بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ نتیش نے پوری ایمانداری کے ساتھ فسادات کی تحقیقات کا حکم دیا ہے۔ ریاست کے سرکردہ مسلم کارکن انور علی کہتے ہیں کہ ’نتیش کمار ایک سنجیدہ رہنما ہیں اور ان کے قول وفعل میں زیادہ فرق نہیں رہا ہے۔اس لیے بہار کی مسلم برادری یہ امید کر رہی ہے کہ وہ جو کہہ رہے ہیں وہ کریں گے بھی۔‘ ان کا خیال ہے کہ بھاگلپور میں پاورلوم کی صنعت کی بحالی اور معاوضے کی ادائیگی کے وعدے پر اگر عمل کیا گیا تو یہ ریاست کے مسلمانوں کے لیے ایک بہت بڑا اقدام ہوگا۔‘

روزنامہ انڈین ایکسپریس کے تجزیہ نگار جے پرکاش یادو کا خیال ہے کہ ان اعلانات میں کچھ سیاست بھی کارفرما ہے۔’اس بار کافی مسلم ووٹ لالو سے ٹوٹ کر نتیش کی طرف گئے اور ان کے اتحاد کے کئی امیدوار جیتے بھی۔اب وہ مسلمانوں کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔‘

جناب پرکاش یادو کا خیال ہے کہ فسادات پر قرطاس ابیض جاری کیے جانے سے لالو یادو کی جماعت کی ساکھ مزید خراب ہوگی۔’وہائٹ پیپر میں اس بات کی تفصیل ہوگی کہ کتنے لوگوں کو معاوضہ دیا گیا۔ کتنے بلوائی گرفتار کیے گئے اور کتنے پکڑے نہیں گئے۔ کس کس پر مقدمہ چلا۔اس میں سابقہ حکمت پر ضرور انگلیاں اٹھیں گی۔‘

’ریاست کے بہت سے لوگ حکومت کے اعلانات سے بیزار نظر آتے ہیں۔سرکردہ سیاسی کارکن رضی احمد کہتے ہیں کہ فسادات کی ازسرنو تحقیقات سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ہم

نے رانچی کے فسادات دیکھے، بہار شریف اور جمشید پور کے بلوے دیکھے۔ ان پر کتنی رپورٹیں آئیں لیکن عمل کسی پر نہیں ہوا۔

تجزیہ کاروں کا خیال ہے کہ سیاسی جماعتیں فسادات کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرتی رہی ہیں۔ ماضی کا اگر ریکارڈ دیکھیں تو خواہ وہ 1984 کے سکھ مخالف فسادات رہے ہوں یا گجرات کے فسادات، ملائم سنگھ کے اقتدار میں ملیانہ اور ہاشم پورہ کا قتل عام رہا ہو یا کانگریس کے دور میں ممبئی کے فسادات۔ ان واقعات میں سزائیں تو عموماً کسی کو نہیں ملیں لیکن ان پر سیاست برسوں تک کی جاتی رہی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بھاگلپور بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔

☆☆

پردیس کے سہارے بہاری مسلمان

● عتیق مظفر پوری

بہار کے مسلمانوں کی معاشی حالت کو سمجھنے کے لئے فرقہ وارانہ فسادات کی تاریخ اور ان کے اسباب پر ایک سرسری نگاہ ڈالیں تو شاید بات آسان ہو جائے گی۔ لالو، رابڑی کے کم وبیش پندرہ سالہ اقتدار کے دوران بہار میں کوئی بڑا اور تباہ کن فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا لیکن اس کا سہرا صرف آر جے ڈی حکومت کو نہیں جاتا۔ اس سلسلہ میں راقم الحروف کی ہمیشہ سے یہ رائے رہی ہے کہ بھاگلپور کے مسلم کش فسادات کے بعد ریاست کے مسلمانوں کے پاس ایسا کوئی صنعتی مرکزی مقام بچا ہی نہیں جسے فرقہ پرست عناصر اپنا نشانہ بناتے۔ آزاد ہندوستان میں بھڑکے فرقہ وارانہ فسادات کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں۔ ان ہی شہروں اور مقامات کو نشانہ بنایا گیا جہاں صنعتی اعتبار سے مسلمانوں کی بالا دستی قائم تھی یا وہ معاشی اعتبار سے قدر مستحکم تھے۔ بہار کی سطح پر بھاگلپور کے مسلم کش فسادات کو اس سلسلہ کی آخری کڑی کہا جاسکتا ہے۔ آج کی تاریخ میں بہار کے مسلمانوں کے پاس نہ تو کوئی صنعت ہے اور نہ کسی شعبہ میں انہیں کسی قسم کی بالا دستی حاصل ہے۔ حد یہ ہے کہ بہار کی سطح کا کوئی شخصی مسلم صنعتی وتجارتی گھرانہ بھی نظر نہیں آتا۔ مسلمانوں کی اکثریت بشمول عورت ومرد دیہی سطح پر کھیتوں کھلیانوں اور گھروں میں محنت مزدوری اور شہری سطح پر چائے پان کی دکان، ہوٹل، رکشہ پلنگ اور پھیری جیسے کام دھندوں پر زندہ ہے۔ عورتیں گھروں میں سلائی، کڑھائی اور بیڑیاں بنانے جیسے کام کر کے اپنے کنبوں کی پرورش میں ہاتھ بٹاتی ہیں بلکہ بہت سے

خاندانوں کی روزی روٹی کے یہی بنیادی ذرائع ہیں جو اکثر بنیادی ضروریات کی تکمیل میں ناکافی ثابت ہوتے ہیں اور گھر کے مردوں کو کولکاتہ، ممبئی اور دہلی جیسے بڑے شہروں کی جانب کوچ کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے، یہ صورت حال اس قدر خوفناک شکل اختیار کر چکی ہے کہ بہار کے طول وعرض میں پھیلے گاؤں میں شاید ہی کوئی ایسا مسلم گھرانہ ہو جس کا کوئی فرد تلاش معاش میں بہار سے باہر نہ ہوگا۔ اس میں دانشور، غیر دانشور، تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ کی کوئی قید نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سوٹ کیس اور زری کے کارخانوں سے لے کر مدارس ومساجد، اسکول، کالج، یونیورسٹی اور اردو اخبارات کے دفاتر تک میں بہار کے مسلمانوں کی قابل ذکر تعداد نظر آتی ہے جو دراصل بہار کے مسلمانوں کا اصل ذریعۂ معاش بلکہ ان کی روزی روٹی اور عزت ووقار کے ضامن ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے علم وہنر اور اپنی محنت شاقہ سے بہار کے مسلمانوں بلکہ بہار کی معیشت کو سہارا دیا ہوا ہے۔ بشمول بیرون ممالک بہار سے باہر رہ کر محنت ومزدوری کرنے والے یہ بہاری مسلمان بہار کی معیشت کا کتنا اہم حصہ ہیں اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ بہار کے دور دراز دیہی گاؤں میں اگر آپ کو کوئی 4-5 کمروں پر مشتمل بڑا مکان نظر آئے تو سمجھ لیں کہ اس گھر کا کوئی فرد یقینی طور پر خلیجی ممالک میں رہتا ہوگا ورنہ بہار کے مسلمانوں کی اکثریت کے پاس اتنی گنجائش نہیں ہے کہ وہ بہار میں رہ کر یہ کارنامہ انجام دے سکے۔ زمینیں تقسیم ہو کر اتنی مختصر ہوگئی ہیں کہ ان سے 4-5 افراد پر مشتمل کنبے کی بھی مناسب طریقہ سے پرورش نہیں کی جاسکتی۔ مزید براں سیلاب اور خشک سالی جیسی قدرتی آفات سے کبھی پیچھا نہیں چھوٹتا، عام طور پر بہار کا کوئی نہ کوئی حصہ ان دونوں صورت حال میں سے کسی ایک سے ہمیشہ دوچار رہتا ہے۔ ان قدرتی آفات کے متاثرین میں یوں تو سبھی فرقہ کے لوگ شامل ہوتے ہیں لیکن نزلہ برعضو ضعیف کے مصداق مسلمان یہاں بھی دوسروں کے مقابلہ کہیں زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر انہیں نوکر شاہی کے تعصب کے سبب نقصان کا مناسب

مجموعہ القاسم: جلد پنجم
مسلم مسائل اور اس کا حل

معاوضہ نہیں مل پاتا۔ اسی طرح وہ نام نہاد راحت کاری کے فیوض وبرکات سے بھی اکثر محروم رہتے ہیں۔

اب دہشت گردی کے نئے شگوفے نے مسلمانوں کے سامنے ایک نئی الجھن پیدا کردی ہے۔ ممبئی بم دھماکوں کے بعد بہار کے دو اضلاع سے دو مسلم نوجوانوں کی گرفتاری کے بعد سے مسلم اکثریتی بستیوں کو مشتبہ بنا کر پیش کرنے کی سازشیں شروع کردی گئی ہیں۔ حالانکہ گیا کا ایک نوجوان جو حافظ قرآن تھا اور بنگلور کے کسی مدرسہ کا مدرس تھا وہ بے قصور ثابت ہوا اور چند دنوں کی تفتیش کے بعد اسے پولیس نے رہا بھی کردیا لیکن اس کی گرفتاری سے مسلم معاشرہ اور اس نوجوان کی شخصیت پر جو داغ لگے تھے، وہ اب بھی دونوں کا تعاقب کررہے ہیں۔ ذرائع ابلاغ نے اس مسلم نوجوان کی گرفتاری پر جتنا واویلا مچایا، اس کی باعزت رہائی پر اسی قدر خاموش رہا۔ یہ روش تبدیل ہونی چاہئے۔ باعزت بری ہونے والے مسلم نوجوانوں کی بے گناہی کا کما حقہ چرچا ہونا چاہئے۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو بہار کے مسلمانوں کی معاش کا یہ اہم ذریعہ بھی متاثر ہوسکتا ہے اس پر خاص طور سے توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

☆☆

بہار میں روزگار کے مسائل سے مسلمان پریشان

● سید شمیم انور

بہار میں بہار ہے لیکن کم روزگار ہے اور ستم بالائے ستم یہ کہ خدا جتنا ہی مہربان ہے عوام اتنی ہی پریشان ہے۔ ان حالات میں بہار کا مسلمان حیران ہے کہ مسیحائی کا دعویٰ کرنے والے کس سیاسی رہبر کا بازو تھامے کہ اس کے نوجوان ہاتھوں کو روزگار مل سکے۔ آزادی کے پچاس سالوں میں ہر سیاسی پارٹی اسے طفل تسلی دیتی آرہی ہے اور ''چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ'' کے مصداق سبھی کو آزمایا جارہا ہے لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات یعنی وعوں کے سبز باغ صرف سبز باغ اقلیتوں کے تئیں دستوری ذمہ داریاں ادا کرنا تو بڑی بات ہے، ہاں احسان کے نام پر اردو زبان کے لئے چند آسامیاں یا پھر بہار مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے ملازمین کے لئے گرانٹس کے نام پر پھینکے ہوئے بھیک کے چند ٹکڑے بہار کے مسلمانوں کے درمیان سرکاری شعبوں میں روزگار پانے جیسے مواقع اونٹ کے منھ میں زیرہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ آبادی کے تناسب کے ساتھ کاوش ہر شعبۂ زندگی میں بہار کے مسلم بے روزگاروں کو باعزت نوکریاں اور ہنرمندوں کو روزگار کے لے پونجی مل پاتی۔ دوسرے صوبوں کی طرح بہار میں بھی ملت کا سب سے بڑا المیہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ سیاسی اعتبار سے اب تک کوئی مؤثر وزن نہیں بناسکی ہے۔ مسلمانوں کے ووٹ کو اپنی جھولیوں میں ڈال کر سیاسی پارٹیاں اپنا پلڑا بھاری کرتی رہتی ہیں لیکن مراعات ومفادات صرف اپنے لوگوں کے لئے محفوظ رکھے جاتے ہیں۔

سیاسی بے وزنی کے رہنے سے بہار کی مسلم آبادی اپنے حقوق حاصل کرنے کی منزل سے ابھی کوسوں دور ہے، جس کی وجہ سے اس کی اقتصادی حیثیت ناگفتہ بہ ہے، آج کے ماحول میں بغیر مستحکم معیشت کے سیاست میں وزن بنانا بھی مشکل ہے اور بغیر سیاست میں حصہ داری کے معیشت کا استحکام بھی مشکل ہے۔ دنیا کے نقشے پر کئی ملکوں کی لڑکھڑاتی معیشت نے بڑے بڑے انقلاب دکھلائے اور سیاسی سورماؤں کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی۔ دراصل جہاں مضبوط معیشت دیرپا سیاسی استحکام لاتی ہے وہیں سیاسی استحکام قوموں میں بہار معیشت کے دروازے کھولتا ہے۔

صوبہ بہار میں مسلمانوں کے درمیان صوبائی اور ملکی پیمانے کی تنظیموں نے بھی مسلمانوں کی گرتی معیشت اور مسلم نوجوانوں میں بے روزگاری جیسے مسئلے پر قابو پانے کے لئے کسی نہ کسی درجے میں پروگرام رکھے ہیں۔ بلاشبہ نقشے بنانا اور لائحہ عمل تیار کرنا بھی ایک کام ہے لیکن یہ مثبت پہلو فائل اور کتابچوں تک ہی محدود رہ کر دعوت عمل دے رہا ہے۔ افسوس زمین پر اب تک عملاً کام کا آغاز نہیں ہوسکا۔

مسلمانوں کی معیشت کو نقل وطن اور آبادی کے تبادلے جیسے عوامل نے بھی متاثر کیا ہے، دانشوروں اور اونچے عہدوں پر فائز تعلیمی ادارے چلانے والے اہل علم کے نقل مکانی کے خلاء کے ساتھ 1954 کے زمینداری کے خاتمے نے بھی مسلمانوں کے درمیان روزگار کو نقصان پہنچایا۔ آٹے میں نمک کے برابر مسلم سرکاری ملازم اور چند فنی تعلیم یافتہ افراد کے ساتھ درمیانی طبقہ اور غریب مزدور اور کمزور کسانوں نے مل جل کر روزگار کے مواقع ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے لیکن خلفشار اور فسادات نے انہیں حتی الوسع آگے بڑھنے سے روکا ہے۔

قدرتی وسائل میں اول اور آبادی میں دوئم صوبہ بہار میں مسلمانوں کا تناسب ملکی تناسب سے کچھ زیادہ ہے۔ نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس صوبہ میں جہاں بعض مسلم

اکثریت پر مشتمل ہیں وہیں چند ایسے اضلاع بھی ہیں جن میں ان کی تعداد کم ہونے کے باوجود نمایاں ہے اور وہاں کے مسلمان تعلیم اور روزگار میں مسلم اکثریتی خطے سے آگے ہیں۔ ان میں دربھنگہ، سیوان، گیا جب کہ تقریباً 130 لاکھ مسلم آبادی پر مشتمل پورنیہ، کٹیہار، کشن گنج اور ارریہ کو مرکزیت حاصل ہے۔ روزگار کے شعبے زراعت، ملازمت (سرکاری وغیر سرکاری) تجارت اور صنعت وحرفت میں یہ علاقہ بنیادی طور سے زراعت سے جڑا ہے جہاں نیپال سے آئی ہوئی سیلابی ندیاں پانی پر تیرتے ہوئے اس خطے میں اکثر تباہی مچاتی ہیں جس سے علاقے کی کمر ٹوٹتی رہتی ہے، 15 سے 20 فٹ پانی پر تیرتا ہوا یہ زرعی خطہ حکومتوں کی بے توجہی سے بجلی کی کمی، جدید زرعی تکنیک کے فقدان اور رسائل کی سہولتوں سے محروم ہے۔ یہاں کے کسان عموماً دھان، پاٹ اور ربیع کی کھیتی کیا کرتے ہیں۔ پاٹ یہاں کا غذی کھیتی کی واحد جنس ہے لیکن اس اہم کچے مال کے ذریعہ روزگار کے امکانات کے باوجود کسی طرح کی چھوٹی یا بڑی مسلم آبادی کے نوجوان روزگار کے لئے سرگرداں ہیں اور منفی پہلو کے باوجود حوصلہ کے ساتھ آگے بڑھنے اور روزگار کے مواقع تلاش کرنے میں کوشاں ہیں۔ دہلی، ممبئی، کولکاتا اور دیگر صنعتی شہروں میں چھوٹے بڑے کام، ہوٹل کی ملازمت یا فلک بوس عمارتوں کے تعمیراتی کام کی شکل میں ہو یا ہنرمند کاریگروں کی صف میں ہوں یا راجستھان کے سنگ تراش ہوں یا پنجاب ہریانہ کے کھیتوں میں پسینہ بہاتے مزدور ہوں یا مدرسوں کے معلم ہوں یا مسجدوں کے امام صاحبان ہوں یا بچوں کے ماڈرن اسکول چلاتے تعلیم یافتہ نوجوان ہی ہوں، سبھوں نے اپنی کڑی محنتوں سے جہاں ملت کے درمیان کچھ کرنے کا حوصلہ پیدا کیا ہے وہیں یہ الزام غلط ثابت کیا ہے کہ بہاری کاہل ہوتے ہیں۔

دینی وملی جماعتوں کی سرگرمیوں اور کوششوں نے یہاں کے مسلمانوں میں دینی اور دنیاوی جدید تعلیم اور تکنیک کی طرف راغب ہونے کا شعور پیدا کیا ہے اور کمپیوٹر الیکٹرونکس جیسے میدان میں قدم آگے بڑھانے کا جذبہ جگایا ہے۔ صوبائی حکومت کی حوصلہ

شکن پالیسیوں اور اپنے محدود وسائل کے باوجود یہاں کے مسلمان اونچی اور تکنیکی تعلیم جیسے آئی ٹی آئی، ڈپلومہ، انجینئرنگ کالج، طبیہ کالج، ڈینٹل کالج اور میڈیکل کالج کامیابی کے ساتھ چلا رہے ہیں، جس میں تعلیمی خدمات کے ساتھ ساتھ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو روزگار بھی ملا ہے۔

زراعت کے میدان میں روزگار کے مواقع محدود ہو جانے کے باعث دوسرے شعبہ ہائے تجارت اور چھوٹے صنعت جیسے دست کاری وغیرہ میں یہاں کے مسلمان آزادی کے قبل سے ہی کچھ روزگار کرتے ہیں۔ چھوٹی صنعت اور دست کاری کے میدان میں ہنرمند مسلم برادریوں کا اہم رول رہا ہے۔ ہینڈلوم، سوتی اور ریشمی کپڑے کی صنعت میں مومن برادری، سلائی اور ریڈی میڈ کپڑے کی تیاری میں ادریسی برادری اور لاکھ کی چوڑیاں بنانے میں لاہری برادری، چھوٹے گھریلو استعمال کی چیزیں اور کھیتی کے چھوٹے اوزار بنانے میں بکھو برادری، رنگ سازی اور جلد سازی، رنگریز برادری اور آتش بازی اور شکار میں میر شکار برادری، چمڑے کی صنعت میں عراقی برادری خاص ہیں وہیں عام مسلمان بیڑی سازی، بسکٹ سازی، لکڑی کا کاروبار، چھوٹے چھوٹے کھلونے، موٹر مکینک، بجلی لائن، سائیکل مرمت جیسے شعبوں میں روزگار کی جگہ بنائے ہوئے ہیں۔ ہینڈلوم اور ریشمی کپڑے کی صنعت میں مومن برادری نے خود کو مخصوص طور سے جوڑ کر خود اچھا روزگار حاصل کر کے دوسروں کے لئے بھی روزگار حاصل کر کے دوسروں کے لئے بھی روزگار فراہم کئے ہیں اور مسلمانوں کے درمیان بے روزگاری کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے معاشی استحکام بھی حاصل ہوا ہے اور مسلم سماج بڑے ہی دور رس اثرات پڑے ہیں۔ ادریسی برادری نے سلائی اور ریڈی میڈ کپڑوں کے کاروبار کو فروغ دینے میں بڑی مدد کی ہے۔ اس کا نمایاں فائدہ بہار میں تو کم لیکن دہلی، کولکاتہ جیسے شہروں میں بہار کے مسلمانوں کو زیادہ ہو سکا ہے۔ تجارت کے میدان میں شہروں میں چھوٹی دکانیں کھولنے اور اسے کامیابی سے چلانے کے

نتیجے میں مسلمانوں کا حوصلہ بلند ہوا ہے۔اب تو بعض شہروں میں مسلم سرمایہ کاروں نے پٹرول پمپ، ایٹ فیکٹری، پلائی وڈ فیکٹری اور بڑی کمپنیوں کی ایجنسیاں حاصل کرنے کے ساتھ کوآپریٹو بینک بھی کھڑے کئے ہیں۔ان کارکردگیوں کے باوجود بہار کے مسلمان اپنی آبادی کے تناسب سے کہیں پیچھے ہیں۔تعلیم، ہنر اور اس کے درمیان کے وسائل کو منظّم کرکے صحیح منصوبہ بندی کے ساتھ روزگار اور اقتصادی مضبوطی کے لئے مناسب سرمایہ اور جدید تکنیک کے ساتھ تحریک کی بنیاد ڈالی جائے تو خیر امت کے حامل مسلمان صوبہ میں روزگار کے وسیع میدان بنا سکتے ہیں جس سے ان کے اپنے مسائل حل ہونے کے ساتھ ساتھ ان کا دست فراخ رفاہی کاموں میں بھی استعمال ہو سکتا ہے۔

☆☆

بنکر صنعت مسائل اور امکانات

● انیس الرحمٰن قاسمی

ریشمی نگر بھاگلپور جس کی شہرت ومقبولیت بین الاقوامی ہے اور جس کی صناعتی وکاریگری کا اعتراف صدیوں سے ہندو بیرون ہند میں کیا جاتا رہا ہے اور جس کی وجہ سے اربوں روپے سالانہ کی آمدنی زرمبادلہ کی شکل میں حکومت ہند کو بھی ہو رہی ہے۔صد حیف کہ اس ریشمی نگر کی بنکر برادری کا بیشتر حصہ فاقہ کشی اور موت وزیست کی کشمکش سے دوچار ہے۔ ہزاروں نوجوان تلاش روزگار کے لئے گھر سے دور دراز شہروں کی جانب کوچ کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ یہاں کے ہینڈلوم اور پاورلوم کی گراں قدر صنعت پر مرگ کا سیاہ سایہ چھاتا جا رہا ہے، جبکہ یہاں کے ہنرمند کاریگروں کی وجہ سے دوسرے مقامات کی رونق میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے، حالانکہ مرکزی حکومت نے ملکی سطح پر بنکروں کی فلاح و بہبود کے لئے منصوبہ بنایا ہے، لیکن اس کا خاطر خواہ اثر یہاں کے بنکروں کو نہیں مل رہا ہے جس کی وجہ سے غریب بنکروں کے گھروں میں یاسیت کا اندھیرا بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

مرکزی حکومت کی وسیع اسکیم اور منصوبوں پر اجمالی نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہینڈلوم بنکروں کے رہائشی بندوبست کے لئے 2912 کروڑ 50 لاکھ روپے، بنکروں کی دوا، علاج اور صحت کے لئے 47 کروڑ 50 لاکھ روپے، تعلیم کے لئے 300 کروڑ روپے، مقابلہ جاتی امتحانات یو جی سی کے لئے 27 کروڑ 57 لاکھ روپے، ہاسٹل کے لئے 179 کروڑ 60 لاکھ روپے سالانہ مختص کئے گئے ہیں لیکن بھاگلپور کو اس منصوبہ سے کوئی

قابل ذکر فائدہ نہیں ملا ہے۔اسی طرح مرکزی حکومت کے ذریعہ بنکروں کی فلاحی اسکیم کے تحت 1989 سے یہ فیصلہ بھی منظور شدہ ہے کہ بنکروں کو سوت کے تاجروں کے استحصال سے بچانے کے لئے مل دروں پر سوت فراہم کیا جائے گا چنانچہ ریشمی دھاگہ ’یارن بینک اسکیم‘ بھی آٹھویں منصوبہ میں شامل ہے لیکن صد حیف کہ یارن بینک کے قیام پر بھی اب تک کوئی توجہ نہیں دی گئی ہے۔

بنکروں کے لئے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ہینڈ لوم ٹیکنالوجی کے تحت حکومت نے 23 سروس مراکز کے قیام کا فیصلہ کیا ہے لیکن بھاگلپور میں ابھی تک ایک کا قیام عمل میں نہیں آیا ہے۔ دیہی نوجوانوں کو روزگار فراہم کرنے کے لئے ایک لاکھ نوجوانوں کی تربیت کا جو پروگرام ہے اس میں بھی بھاگلپور کو ابھی تک شامل نہیں کیا گیا ہے۔ ہتھ کرگھا دیہی ترقی منصوبے کے تحت 1991 سے ایک اسکیم جاری ہے جس کے تحت بنکروں کی رہائش گاہوں اور کارخانوں کی تعمیر کا پروگرام ہے اور بنکر گاؤں کی تعمیر کا منصوبہ بھی اس میں شامل ہے جس کے تحت بنکر گاؤں کی ترقی کے لئے 25 لاکھ کی رقم مختص ہے۔ اس اسکیم کے تحت ہر سال 25 دیہی علاقوں کا انتخاب کیا جاتا ہے لیکن بھاگلپور میں اب تک ایک بھی بنکر گاؤں کی تعمیر نہیں ہوسکی ہے حالانکہ یہاں کے سیکڑوں گاؤں سیلاب اور 1989 کے فساد کی وجہ سے ابھی تک ویران ہیں۔

مذکورہ بالا حالات واسباب کی روشنی میں غریب بنکروں کی فلاح و بہبود اور بھاگلپور کی صنعت کی ترقی وفروغ کے لئے مومن بنکر وکاس کمیٹی کی جانب سے 10/نومبر 1997 کو گورنر بہار اخلاق الرحمٰن قدوائی اور متعدد مرکزی وریاستی وزراء سے میمورنڈم کے ذریعہ درج ذیل مطالبات کئے گئے تھے:

☆ بنکروں کو سوت امپورٹ کی سہولت اور مناسب قیمت پر ریشم کی فراہمی کے لئے یارن بینک قائم کیا جائے۔

☆ تیار مال کی فروختگی اور سپلائی کے لئے پروڈکشن مراکز قائم کئے جائیں۔

☆ اقلیتی مالیاتی کارپوریشن اور دوسری فلاحی اسکیموں سے بنکروں کو آسان قسطوں پر قرض دیا جائے۔

☆ محکمہ بجلی اور بنکروں کے معاملات طے کئے جائیں اور بجلی کی فراہمی تسلسل کے ساتھ کی جائے۔

☆ متاثرین فساد بنکروں کی راحت کے نام پر دی گئی رقم کو قرض میں بدلنے کی سازش کی تحقیقات کی جائیں اور رقم کو معاف کردیا جائے تاکہ وارنٹ گرفتاری اور دیگر مصیبتوں سے ان کو بچایا جاسکے۔

☆ بنکروں کی آبادیوں میں اسپتال کا قیام، نیز ہیلتھ پیکیج سے بنکروں کو فائدہ پہنچایا جائے۔

☆ شہروں میں زیر تعلیم بنکروں کے لئے ہوسٹل کی تعمیر کی جائے۔

☆ متاثرین سیلاب اور متاثرین فساد بنکروں کے لئے مکانات معہ ورک شیڈ کی تعمیر کو اولین ترجیحات میں شامل کیا جائے۔

اگر بنکروں میں اجتماعی بیداری آجائے گی تو بنکروں کی آبادیوں میں ترقی کی بہار نو آجائے گی لیکن مرکزی وریاستی حکومت کی توجہ کے بغیر اس کے تن مردہ میں نئی زندگی کے آثار دور دور تک نظر نہیں آتے۔

☆☆

بھاگلپور کے فساد متاثرین
دو دہائی بعد بھی انصاف سے محروم

● اشرف استھانوی

بہار کے بدنام زمانہ اور ملک کے بدترین مسلم کش فسادات میں سے ایک بھاگلپور فساد نے بہار کی سیاست کا رخ پلٹ کر رکھ دیا۔ اس فساد کے بعد ریاست سے 40 سالہ کانگریسی دور حکومت کا خاتمہ ہو گیا، کیوں کہ اس فساد کے لئے کانگریس کو ذمہ دار مانا گیا اور وہیں سے شروع ہوا بھاگلپور فساد کے نام پر سیاست کا طویل سلسلہ جو دو دہائی بعد بھی جاری ہے اور شاید آگے بھی جاری رہے گا۔ اس سیاست کے نتیجے میں فساد کی آگ پر اپنے مفاد کی روٹی سینکنے والوں کو تو فائدہ ہوا، مگر فساد متاثرین کو انصاف آج تک نہیں مل سکا۔

بھاگلپور فساد کے نام پر اقتدار میں آنے والی اور بعد میں مسلمانوں کی مسیحائی کا تاج زریں اپنے سر پر رکھ لینے والی لالو کی حکومت نے جسٹس شمس الحسن اور آر این پرساد پر مشتمل مشترکہ تحقیقاتی کمیشن قائم کیا تھا، جس کی رپورٹ قابل قدر ہونے کے باوجود قابل عمل نہیں سمجھی گئی۔ حقیقی اور بڑے قصورواروں کو سزا نہیں دلائی جا سکی۔ کچھ متاثرین کو ریاستی حکومت کی طرف سے معمولی معاوضہ ملا اور کچھ کو چھوٹے موٹے کیسوں میں سزا ملی اور اتنا بڑا معاملہ نمٹ گیا، یا نمٹا ہوا مان لیا گیا، لیکن بھاگلپور فساد کے متاثرین اور ریاست کے عام انصاف پسند شہریوں کو اس وقت جھٹکا لگا جب بھاگلپور فساد میں بڑھ چڑھ کر مجرمانہ کردار ادا کرنے والوں کو سزا ملنے کے بجائے جزا یعنی انعام دیا گیا۔ اس کھلی ناانصافی کے خلاف احتجاج کی

آواز تو بہت بلند کی گئی مگر وہ سماجی انصاف اور ایم وائی اتحاد کے نعروں کے شور میں دب کر رہ گئی اور اس طرح سماجی انصاف کے 15-16 سال انصاف کے بغیر گزر گئے۔

پھر آئی نتیش کمار کی حکومت جو اس وعدے کے ساتھ ہی اقتدار میں آئی تھی کہ وہ بھاگلپور کے ظالموں کو سزا اور مظلوموں کو انصاف دلائے گی اور معاملے کی از سر نو تحقیقات کرانے کے بعد فائل بند کیسوں کو دوبارہ کھلوائے گی۔ تاکہ جو لوگ سابقہ حکومت کی مہربانیوں کے طفیل سزا سے بچ گئے ہیں انہیں سزایاب کیا جا سکے۔ چنانچہ نتیش حکومت نے اقتدار میں آتے ہی جسٹس این این سنگھ کی سربراہی میں ایک نفری تحقیقاتی کمیشن قائم کیا جسے 6 ماہ کے اندر اپنی رپورٹ پیش کر کے ظالموں کو سزا اور مظلوموں کو انصاف دلانا تھا، مگر یہ خواب بھی شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا اور دیوانے کا خواب بن کر رہ گیا۔ یہ کمیشن 6 ماہ تو کیا حکومت کی پوری مدت کار میں بھی وہ کام انجام نہیں دے سکی جس کے لئے اس کا قیام عمل میں آیا تھا اور اگر کمیشن کی موجودہ توسیعی مدت کار کا خیال کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ کمیشن موجودہ حکومت اور اسمبلی کی مدت ختم ہونے کے بعد بھی کام کرتی رہے گی، مگر ریزلٹ کے نام پر پھر وہی چند پھلجھڑیاں ہی سامنے آئیں گی۔ کوئی بڑا کارنامہ نہیں۔ جب کہ اس کمیشن پر ماہانہ 3 لاکھ روپے خرچ ہو رہے ہیں۔ ماہانہ سوا لاکھ روپے تو صرف کمیشن کے چیرمین کی تنخواہ اور دیگر سہولیات و مراعات پر صرف ہو رہے ہیں۔

موجودہ این این سنگھ کمیشن نے ابھی تک اپنی صرف ایک عبوری رپورٹ پیش کی ہے جس میں اس نے سکھ فساد متاثرین کی طرح بھاگلپور کے فساد متاثرین کو بھی ساڑھے تین لاکھ روپے معاوضہ مرکزی حکومت کی طرف سے دینے کی سفارش کی تھی اور چوں کہ مرکزی حکومت معاوضہ کی یہ رقم صرف ان متاثرین کو فراہم کرتی ہے جنہیں ریاستی حکومت شناخت کرنے کے بعد ماہانہ ڈھائی ہزار کی پنشن دے رہی ہوتی ہے۔ اس لئے کمیشن کی عبوری رپورٹ آتے ہی ریاستی حکومت نے منتخب متاثرین کو ڈھائی ہزار روپے ماہانہ پنشن کی ادائیگی کا حکم جاری کر دیا اور

اس کی بنیاد پر ریاستی حکومت نے مرکز سے خصوصی معاوضہ کی رقم کا مطالبہ کیا۔ مرکز نے دسمبر 2008 میں 30 کروڑ روپے اس مد میں ریاستی حکومت کو فراہم بھی کرادئے اور اپریل 2009 میں یہ رقم بھاگلپور ضلع انتظامیہ کے سپرد بھی کردی گئی۔ کمیشن کی سفارش پر ہی کچھ پرانے اور فائل بند کیسوں کو دوبارہ کھلوایا گیا جس کے نتیجہ میں بھاگلپور فساد کے بدنام زمانہ سرغنہ کامیشور یادو کو سزا بھی ملی۔ اس صراحت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سارے مسائل حل ہو گئے اور بھاگلپور فساد کے ظالموں کو سزا اور مظلوموں کو انصاف مل گیا، مگر حقیقت اس کے برعکس ہے، کیونکہ جب ہم حقائق اور متعلقہ ریکارڈ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں سخت مایوسی ہوتی ہے۔

مایوسی کی وجہ یہ ہے کہ بھاگلپور فساد کے دوران تقریباً دو ہزار افراد شہید کردئے گئے تھے۔ جسٹس شمس الحسن کمیشن نے تحقیقات کے بعد یہ تعداد 1981 تسلیم کی تھی، مگر ضلع انتظامیہ نے صرف 861 متاثرین کو تسلیم کیا ہے۔ ان میں سے صرف 449 کو مرکزی معاوضہ کی رقم ساڑھے تین لاکھ روپے ادا کرنے کی سفارش کی گئی ہے، لیکن جیسا کہ راقم الحروف پہلے ہی تحریر کرچکا ہے کہ یہ رقم صرف ان لوگوں کو ہی پہلے ادا کی گئی، جنہیں ریاستی حکومت سے ماہانہ ڈھائی ہزار روپے بطور پنشن مل رہے ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو محض 287 کو ہی یہ رقم مل سکے گی، کیوں کہ پنشن اتنے ہی لوگوں کو مل رہی ہے۔ یعنی نہ 1981، نہ ہی 861، اور نہ ہی 449۔ صرف 287 کو معاوضہ کی حد تک انصاف مل سکے گا۔ ایسا اس لئے ہوگا کہ سابقہ کمیشن کی سفارش کو نظر انداز کردیا گیا اور غیر ذمہ دار اور متعصب افسران پر مشتمل ضلع انتظامیہ نے جو تعداد طے کی ہے اسی کو حقیقی تعداد مان لیا گیا۔ موجودہ کمیشن نے بھی اس پر اپنی تحقیق نہیں کی اور نہ ہی نئے دعویداروں کی درخواستوں پر غور کیا۔ یہ وہ دعویدار ہیں جو اس وقت عدم تحفظ کے احساس کا شکار ہو کر بھاگلپور یا بہار سے ہی باہر تھے اور اب وہ اپنا حق اور انصاف لینے کے لئے حاضر ہیں، مگر کمیشن نے ایسے تمام دعویداروں کو یہ کہہ کر مایوس کردیا کہ نئے دعویداروں کو سننا ان کے ٹرم آف ریفرینس میں شامل نہیں۔ یہ معاملہ ہائی

کورٹ تک پہنچا۔ پٹنہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے 2006 میں ایک مفاد عامہ کی سنوائی کے بعد کمیشن کو واضح ہدایت جاری کی کہ وہ تمام دعویداروں کو سنے اور اپنی صوابدید کے مطابق فیصلہ کرے مگر کمیشن نے ہائی کورٹ کے حکم کو بھی نظر انداز کردیا اور ایسی تمام درخواستوں کو اس نے ضلع انتظامیہ کو ریفر کردیا۔ متاثرین کی حقیقی تعداد کیا ہے اور کیا ہونی چاہئے۔ یا سابقہ کمیشن نے 1981 کی جو تعداد بتائی تھی وہ تعداد کیوں قابل اعتبار نہیں۔ اس پر موجودہ کمیشن نے کچھ نہیں کیا اور اپنی طرف سے اس سلسلے میں کوئی تحقیق یا دلیل نہیں پیش کی۔ پس ضلع انتظامیہ نے جو اعداد وشمار کمیشن کے سامنے رکھ دیے اسی پر آمنا وصدقنا کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ سوال یہ ہے کہ اگر ضلع انتظامیہ کو ہی سب کچھ کرنا تھا تو پھر اس کمیشن کے قیام کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اور ضلع انتظامیہ کس حد تک انصاف پسند اور ذمہ دار ہے اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ فساد کے سرغنہ کامیشور یادو کو جس واحد گواہ نصیر الدین کی گواہی پر سزا ملی اسے بھی آج تک مرکزی معاوضہ کی رقم کی ادائیگی نہیں کی گئی ہے۔ جب کہ اس سلسلہ میں اس نے ہر دروازے پر دستک دی ہے اور اس کا کیس بہت صاف اور واضح ہے۔ بھاگلپور فساد کے اسپیشل پی پی اور پٹنہ ہائی کورٹ کے سنیئر ایڈوکیٹ صلاح الدین خاں نے بھی اپنی سطح سے مظلوم نصیر الدین کو انصاف دلانے کی کوشش کی اور تمام معاملوں کی تفصیلات پیش کرتے ہوئے اسے انصاف دینے کی پرزور سفارش کی، مگر اسے آج تک انصاف نہیں مل سکا۔ اندیشہ ہے کہ کہیں انصاف کے لئے بھاگ دوڑ کرتے ہوئے مظلومین کی جان نہ چلی جائے کیوں کہ ایک تو عمر کافی ہوچکی ہے دوسرے غموں اور مایوسیوں کا بوجھ بھی جان لیوا ثابت ہوسکتا ہے۔

ضلع انتظامیہ کی نظر میں فساد متاثرین کی تعداد اتنی کم کیوں ہے یا ماہانہ پنشن اور مرکزی معاوضہ پانے کے حقدار لوگوں کی تعداد اتنی مختصر کیوں ہے یہ سوال تو ہر زبان پر ہے مگر اس کا جواب شاید حکومت اور انتظامیہ کے کسی ذمہ دار فرد کے پاس نہیں ہے، لیکن راقم الحروف کا یہ

مانا ہے کہ یہ سب اس لئے ہے کیوں کہ سابقہ کمیشن کی سفارشوں کو نظر انداز کر دیا گیا۔ موجودہ کمیشن نے اپنا فرض ذمہ داری کے ساتھ ادا نہیں کیا اور ضلع انتظامیہ نے جو کچھ کیا وہ مقامی سیاست اور مصلحت کی آڑ میں کیا۔ اس لئے اس میں حقیقت کی جلوہ نمائی نہیں ہو سکی۔ ضلع انتظامیہ نے معاوضہ کے لئے صرف مقتولین کے والدین اور والدین نہ ہوں تو شوہر یا بیوہ کو ہی حقدار مانا۔ اس کے علاوہ تعداد میں تخفیف کی ایک وجہ یہ بھی رہی کہ کئی معاملوں میں ایسا ہوا کہ کوئی قریبی رشتہ دار یا دعویدار ہی ایسا نہیں بچا جسے ضلع انتظامیہ تسلیم کر سکے۔ یعنی فساد میں پورا خاندان صاف ہو گیا۔

یہاں تک تو بات ہوئی صرف جزا اور سزا کی۔ لیکن انصاف کا دائرہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا ہے۔ فساد کے دوران ذاتی املاک کے نقصان اور ان پر جبراً اور ظلماً قبضہ کے بھی سینکڑوں معاملے ہیں۔ ان کے علاوہ فساد کے بعد ڈرے سہمے مسلمانوں کو مزید ڈرا دھمکا کر ان کی جائیداد کو کوڑیوں کے مول ہتھیا لینے کے بھی کئی معاملے ہیں جن پر آج تک کوئی کارروائی نہیں ہوئی اور نہ ہی مظلوموں کو انصاف دلانے کی کوئی شعوری کوشش ہوئی۔ موجودہ این این سنگھ کمیشن کے سامنے اس طرح کے ایک ہزار دعوے درخواست کی شکل میں پیش کئے گئے، مگر کمیشن نے ان درخواستوں پر غور تو دور رہا انہیں قابل اعتنا بھی نہیں سمجھا۔ درحقیقت اس پورے معاملے میں این این سنگھ کمیشن کا رویہ انتہائی مایوس کن رہا۔ اس نے محض 4-5 بار بھاگلپور کا دورہ کیا اور بقیہ پوری مدت پٹنہ میں بیٹھ کر تمام درخواستوں کو DM بھاگلپور کو ریفر کرنے میں گزار دی، کسی دعوے کی سماعت نہیں کی۔ کسی معاملے کی اپنی سطح سے جانچ نہیں کی۔ سابقہ کمیشن کی سفارش سے بھی کوئی مدد نہیں لی۔ صرف ساڑھے تین لاکھ روپے معاوضہ کی سفارش اور اس کے لئے ضروری ماہانہ پنشن کی ادائیگی کی سفارش کی، کچھ کیس کھلوائے اور بقیہ تمام معاملے یوں ہی ضلع انتظامیہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیئے۔ اس طرح بھاگلپور کے مظلومین 20 سال بعد بھی انصاف سے محروم ہی رہ گئے۔

جسٹس این این سنگھ جانچ کمیشن کے کام کے طور طریقے سے مسلم یونائیٹڈ فرنٹ کے صدر ابو قیصر قطعی مطمئن نہیں ہیں۔ بھاگلپور فساد متاثرین کو انصاف دلانے کے لئے عرصے دراز سے تحریک چلا رہے ابو قیصر کا سیدھا الزام ہے کہ کمیشن کا کام کرنے کا طور طریقہ آزادانہ اور منصفانہ نہیں ہے اور ایسی حالت میں فساد متاثرین کے ساتھ کبھی انصاف نہیں ہو سکتا۔ ابو قیصر کا یہ بھی الزام ہے کہ کمیشن وہی کچھ کر رہا ہے جو ریاستی حکومت چاہ رہی ہے۔ ان کا سیدھا سوال ہے کہ فساد متاثرین کے معاوضہ کی مد میں مرکز سے حاصل رقم کو ریاستی حکومت فساد متاثرین کو دینا ہی نہیں چاہتی ہے۔

بھاگلپور فساد متاثرین کو انصاف دلانے کا دعویٰ کرنے والوں کی قلعی کھولنے والے معاملوں کے اعداد شمار سینکڑوں میں ہے۔ انہیں معاملوں میں ایک معاملہ بھاگلپور کے آشا نند پور کے باشندہ 85 سالہ نصیر الدین انصاری کا ہے۔ چہرے کی جھریاں اور سونی آنکھیں، بس اب یہی ہے نصیر الدین کی زندگی کی جمع پونجی۔ بھاگلپور فساد کے دوران فساد کے اہم سرغنہ کامیشور یادو نے نصیر الدین کے اکلوتے 22 سالہ نور نظر قیوم الدین کو پان کی دکان سے باہر کھینچ کر اس کے سینے کو گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا۔ اپنے بیٹے کی جان بچانے جب نصیر الدین دوڑے تو فسادیوں نے انہیں بھی گولی کا نشانہ بنایا۔ نصیر الدین کی جان بچ گئی، لیکن پاؤں پر لگی گولیوں کے نشان آج بھی بیٹے کے قتل کے خاموش گواہ ہیں۔ جس نصیر الدین کی واحد ایک گواہی کی بنیاد پر کامیشور یادو کو عدالت نے تاعمر قید کی سزا دی تھی، اسی نصیر الدین کو مرکز کی امدادی رقم سے محروم رکھا گیا ہے۔ فساد جانچ کمیشن کا دروازہ کھٹکھٹانے اور ضلع میں بیٹھے اعلیٰ افسران کی منت سماجت کے باوجود اب تک نصیر الدین کو انصاف نہیں مل سکا ہے۔ نصیر الدین کا ماننا ہے کہ انصاف کے نام پر ناانصافی کا کھیل کھیلنے والوں سے اب اوپر والا ہی نمٹے گا۔

(مضمون نگار صحافی اور تجزیہ نگار ہیں)

☆☆

نتیش حکومت، مسلمان اور انصاف

● ادارہ

برمیشور مکھیا کا قتل اور اس کی سی بی آئی جانچ کی سفارش ایسے وقت میں ہوئی جب فاربس گنج پولیس فائرنگ کی پہلی برسی منائی جا رہی تھی۔ نتیش حکومت نے اعلیٰ ذات کی نمائندگی کرنے والی ایک انتہا پسند تنظیم کے سرغنہ کے قتل کے معاملے کی سی بی آئی جانچ کی سفارش اپنی حلیف بھارتیہ جنتا پارٹی اور مقتول برمیشور مکھیا کے اہل خاندان کے دباؤ میں آ کر کردی، حالاں کہ برمیشور مکھیا پر درجنوں قتل عام اور سینکڑوں افراد کے بہیمانہ قتل کے الزامات تھے۔ اور اس سلسلے میں 22 مقدمات بہار کی مختلف عدالتوں میں چل رہے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ نتیش حکومت کے اقتدار میں آنے کے بعد گذشتہ ساڑھے چھ برسوں کے دوران مکھیا کے خلاف مقدمات کی صحیح پیروی نہ ہونے اور سابقہ لالو۔ رابڑی حکومت کے ذریعہ مکھیا کے خلاف لگائے گئے الزامات کی جانچ کے لئے تشکیل دئے گئے امیر داس کمیشن کو نتیش حکومت میں تحلیل کردیئے جانے کے سبب مکھیا کے خلاف استغاثہ کی کارروائی کمزور پڑ گئی تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ 22 میں سے 16 معاملوں میں مکھیا کو الزامات سے بری کردیا گیا تھا اور بقیہ 6 میں وہ ضمانت پر تھے۔ اور اس بات کا غالب امکان تھا کہ حکومت کے مخلصانہ رویہ کے طفیل وہ بقیہ مقدمات میں بھی بری کردیئے جاتے لیکن بہار کی مختلف عدالتوں میں تقریباً دو درجن مقدمات اور لاکھوں کروڑوں عوام کے دلوں میں اتنی ہی تعداد میں درج شکایتیں انہیں ایک قاتل ثابت کرنے کے لئے کافی تھیں اور اگر ملک کی تمام عدالتیں بھی مکھیا

کو تمام مقدمات میں بری کر دیتیں جب بھی بہار کے لاکھوں کروڑوں عوام کی انگلیاں سینکڑوں افراد کے قتل کے سلسلے میں مقتول مکھیا کی طرف کبھی بھی بے ساختہ اٹھنے کے لئے تیار رہتیں۔ اور نتیش حکومت کے مکھیا نواز وزیر گری راج سنگھ جیسے اعلیٰ ذات کے کروڑوں نمائندے مل کر بھی انہیں بے قصور یا گری راج سنگھ کے الفاظ میں انہیں گاندھیائی لیڈر ثابت نہیں کر پاتے۔

ممنوعہ انتہا پسند تنظیم رنویر سینا کے بانی اور آخری سانس تک اس کی سربراہی کرنے والے برمیشور مکھیا کے قتل کی سی بی آئی جانچ کی سفارش میں انتہائی فراخدلی اور جلد بازی کا مظاہرہ کرنے والی بہار کی نتیش حکومت پر فاربس گنج پولیس فائرنگ اور بہار میں بے قصور مسلم نوجوانوں کی غیر قانونی گرفتاری اور گرفتار نوجوان میں سے ایک کی پر اسرار شہادت اور ایک کی لگاتار پر اسرار ہوتی جا رہی مفقود الخبری کی سی بی آئی جانچ کے لئے تیز رفتار اور موثر پہل کرنے کا دباؤ بڑھنے لگا ہے۔

کون نہیں جانتا کہ نکسلیوں کے قہر سے بہار کے اعلیٰ ذات سے تعلق رکھنے والے بڑے کسانوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے مکھیا نے رنویر سینا بنائی تھی اور اس نے نکسلی تشدد کا جواب تشدد سے دے کر قتل وغارت گری کی ایک نئی تاریخ رقم کی تھی۔ انصاف پسند اور امن میں یقین رکھنے والے افراد کی نظر میں ماؤ نوازوں کی پر تشدد کارروائیاں، رنویر سینا کی جوابی قتل وغارت گری اور مکھیا کا بہیمانہ قتل سب کے سب تعزیری اور قابل مواخذہ جرم ہیں۔ اور ان میں سے کسی بھی کارروائی کو درست نہیں ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ضرور کیا جاسکتا ہے کہ اگر برمیشور مکھیا کا قتل سی بی آئی جانچ کا متقاضی ہے تو پھر فاربس گنج پولیس فائرنگ میں شہید ہونے والوں کو انصاف دلانے کے لئے سی بی آئی جانچ کیوں ضروری نہیں سمجھی گئی۔ برمیشور کے قتل کی سی بی آئی جانچ کی سفارش صرف ان کے اہل خاندان کر رہے تھے یا وہ طبقہ کر رہا تھا جس کے مفادات کے تحفظ کے لئے انہوں نے تشدد کا راستہ

اپنایا تھا یا قانون اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔ جب کہ فاربس گنج پولیس فائرنگ کی جانچ کا مطالبہ پورا بہار کر رہا تھا جس میں ہر فرقہ اور طبقہ اور ہر سیاسی پارٹی کے لوگ (حکمراں اتحاد کو چھوڑ کر) شامل تھے۔ فاربس گنج میں جن لوگوں کو اپنی جانیں گنوانی پڑی تھیں ان میں سے کسی کے خلاف بھی دنیا کی کسی بھی عدالت یا مقامی فاربس گنج تھانہ سمیت کسی بھی تھانے میں کوئی معاملہ کبھی درج نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے کبھی تشدد اور قتل وغارت گری کا راستہ نہیں اپنایا تھا۔ انہوں نے قانون اپنے ہاتھ میں لینے کی غلطی کبھی نہیں کی تھی۔ شہیدوں میں 6 ماہ کا شیر خوار بچہ، ایک حاملہ ماں اور اس کی کوکھ میں سانس لے رہا 7 ماہ کا بچہ بھی شامل تھا۔ اس نوجوان کا بھی کوئی قصور نہیں تھا جس کے چہرے اور سینے کو بوٹوں سے کچل کر ایک خاکی وردی دھاری نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس منظر کو میڈیا کی آنکھ سے سارے ملک کی عوام نے دیکھا تھا کیا یہ معاملہ سی بی آئی جانچ کا متقاضی نہیں تھا۔ لیکن نتیش حکومت نے اپنی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سی بی آئی جانچ کے تمام مطالبات کو مسترد کر دیا اور ایک نام نہاد عدالتی کمیشن قائم کر دیا اور یہ کہہ کر عوام کو مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ 6 ماہ کے اندر رپورٹ آجائے گی اور رپورٹ میں جو لوگ بھی قصوروار قرار پائیں گے انہیں معقول سزا دی جائے گی، لیکن خود حکومت نے ایسا نہیں ہونے دیا اس نے 6 ماہ تک تو کمیشن کو بنیادی سہولیات بھی مہیا نہیں کرائے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ایک سال بعد بھی اس کی کوئی رپورٹ سامنے نہیں آئی ہے اور نہ ہی مستقبل قریب میں کوئی رپورٹ آنے یا فاربس گنج کے مظلومین کو انصاف ملنے کی امید ہے۔

اسی دوران انجینئر فصیح محمود کے سعودی عرب سے اٹھائے جانے اور تقریباً دو ماہ بعد بھی اس کی کوئی خبر نہ ملنے اور پونے کی یروداجیل میں دہشت گردی کے الزام میں بند قتیل ظفر صدیقی کے پراسرار قتل نے ریاست کا ماحول مزید گرم کر دیا ہے۔ بہار میں حکمراں این ڈی اے کو چھوڑ کر تقریباً تمام سیاسی پارٹیاں مسلم رضا کار تنظیمیں حقوق انسانی کے تحفظ کے لئے

کام کرنے والوں اور خود قتیل صدیقی، فصیح محمود، کفیل اختر کے اہل خاندان سمیت سارا بہار اس وقت نتیش حکومت سے تقاضا کر رہا ہے کہ بہار کے ایک خاص خطہ کے مسلمانوں کو دہشت گردی کے نام پر ٹارگٹ کرنے کی خفیہ اور دیگر تفتیشی ایجنسیوں کی من مانی کارروائیوں بالخصوص قتیل صدیقی اور فصیح محمود کے معاملے کو بے نقاب کرنے کے لئے ریاستی حکومت اپنی سطح سے مرکزی حکومت سے نہ صرف سی بی آئی جانچ کی سفارش کرے بلکہ اس کے لئے دباؤ بھی ڈالے تاکہ مسلمانوں کو دہشت گردی کے نام پر قربان کرنے کی منصوبہ بند سازش کا انکشاف ہو سکے۔ قتیل کے والد ظفیر صدیقی، بھائی حنظلہ، سیف محمد افروز، آفتاب نے اس قتل کے لئے دہشت گردی مخالف دستہ اے ٹی ایس اور آئی بی کو ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے اس معاملے کی سی بی آئی جانچ کا مطالبہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ قتیل حالاں کہ بے قصور تھا۔ پھر بھی اگر آئی بی اور اے ٹی ایس کے لوگ اسے قصوروار مان رہے تھے یا الزام لگا رہے تھے تو انہیں اپنے الزام کو عدالت میں ثابت کرنا چاہئے تھا اور یہ کام عدالت کا تھا کہ وہ اسے سزا دیتی، لیکن وہ تو ابھی تک اس کے خلاف فرد جرم تک عائد نہیں کر سکے تھے۔ اور ایسے حالات میں وہ جب کہ انتہائی سیکورٹی والے یروداجیل کے اسپیشل سیل میں بند تھا اسے کیسے قتل کر دیا گیا۔ اس کی جانچ سی بی آئی سے کرائی جائے۔

قتیل صدیقی کی لاش بذریعہ طیارہ ممبئی سے دہلی ہوتے ہوئے پٹنہ ایئرپورٹ پہنچی تو حکومت کا کوئی نمائندہ وہاں موجود نہیں تھا، سیاسی پارٹیوں میں راشٹریہ جنتا دل کے رہنما وہاں، اہل خاندان کا غم بانٹنے پہنچے تھے۔ پارٹی کے سکریٹری جنرل اور رکن پارلیمنٹ رام کرپال یادو اور بہار قانون ساز کونسل میں حزب اختلاف کے لیڈر پروفیسر غلام غوث نے کہا کہ اتنی ہائی سیکوریٹی والی جیل میں قتیل صدیقی کا قتل کیسے ہو گیا۔ اس کی سی بی آئی جانچ ہونی چاہئے، تاکہ اصلیت کا پتہ چل سکے۔ کیوں کہ اس معاملے میں سازش کی بو آرہی ہے۔ ان رہنماؤں کا یہ بھی کہنا تھا کہ بہار کے دربھنگہ اور مدھوبنی کے گاؤں میں گذشتہ کئی ماہ

سے مسلم نوجوانوں کی پراسرار طریقے سے گرفتاریاں ہو رہی ہیں مگر ریاستی حکومت کو جیسے کچھ پتہ ہی نہیں رہتا اور اب تو انہیں پراسرار طریقے سے غائب کر دینے یا جیل میں ہلاک کر دینے کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ یہ انتہائی خطرناک رجحان ہے۔ حکومت کو اس معاملے میں ضروری پہل کرتے ہوئے مسلمانوں کو انصاف دلانے کے لئے آگے آنا چاہئے۔ سی پی آئی کی بہار یونٹ نے بھی قتیل ظفر صدیقی کے قتل پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے اس پورے معاملے کی غیر جانبدارانہ جانچ کا مطالبہ کیا ہے۔ سی پی آئی کے ریاستی سکریٹری راجندر پرساد سنگھ کا کہنا تھا کہ قتیل صدیقی کے قتل سے اقلیتی فرقہ میں دہشت اور عدم تحفظ کا احساس عام ہے۔ کیوں کہ دربھنگہ مدھوبنی اور کوسی علاقے کے کئی مسلم نوجوانوں کو بغیر ثبوت کے اور بغیر ریاستی پولیس کو بتائے دوسری ریاستوں کی پولیس اٹھا کر لے جاتی ہے اور یہ سلسلہ دراز ہوتا جا رہا ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بیشک دہشت گردی ایک بڑا مسئلہ ہے اور اس سے ہر فرقہ اور طبقہ متاثر ہو رہا ہے۔ لیکن شک کی بنیاد پر ایک خاص فرقہ کے لوگوں کو نشانہ بنانا کسی طرح بھی صحیح نہیں۔ اس سے جمہوریت میں لوگوں کا اعتماد کمزور ہوگا۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ وزیر اعلیٰ نتیش کمار نے مسلمانوں کی اس طرح غیر قانونی گرفتاری کی تو ماضی میں مخالفت کی ہے لیکن اسے روکنے کے لئے کوئی ٹھوس کارروائی نہیں کی ہے۔ جب کہ انہیں اس معاملے میں پہل کرتے ہوئے مسلمانوں کو انصاف دلانے اور سازش کو بے نقاب کرنے کے لئے آگے آنا چاہئے۔ سابق مرکزی وزیر محمد علی اشرف فاطمی اور بہار کانگریس کے رہنما اعظمی باری نے بھی اس معاملے کی سی بی آئی جانچ کا مطالبہ کیا ہے۔

24 جون کو ہزاروں کی تعداد میں انصاف پسند شہریوں نے راجدھانی پٹنہ کے کارگل چوک کے نزدیک عظیم الشان دھرنا دیا اور زبردست صدائے احتجاج بلند کی۔ اس زبردست احتجاجی دھرنے کے توسط سے نہ صرف دہشت گردی کے جھوٹے الزام میں مسلم نوجوانوں کی گرفتاری کی مذمت کی گئی بلکہ ایسے نوجوانوں کی فوری رہائی کا بھی مطالبہ کیا گیا۔ دھرنے

میں راجدھانی پٹنہ، دربھنگہ، مدھوبنی کے علاوہ ریاست کے مختلف ضلعوں سے نمائندہ وفد نے شرکت کی۔ دھرنے کا اہتمام ''ناگرک پہل'' کی جانب سے کیا گیا تھا۔ دھرنے میں شریک مختلف سماجی اور حقوق انسانی کی علمبردار تنظیموں کے ذمہ داروں نے شرکت کی۔ مقررین نے کسی بھی سطح پر دہشت گردی کی مذمت کی لیکن دہشت گردی کے نام پر ملزم کو مجرم قرار دے کر اے ٹی ایس کے ذریعہ بغیر کسی اطلاع کے غیر قانونی طریقہ سے مسلم نوجوانوں کو اٹھا لئے جانے کی کارروائی پر حد درجہ تشویش کا اظہار کیا اور کہا کہ اس طرح کی کارروائی متعصّبانہ، ظالمانہ اور حقوق انسانی کی صریح خلاف ورزی ہے۔ مقررین نے کہا کہ دہشت گردی کے نام پر اس طرح کی گرفتاری ایک خاص فرقہ کے لوگوں کو بدنام کرنے اور انہیں دہشت زدہ کرنے کی مذموم کوشش ہے۔ ایسی کارروائی سے دہشت گردی کو کمزور نہیں کیا جا سکتا۔ ملک میں فرقہ وارانہ سیاست، حکومت کی پشت پناہی میں چلائی جانے والی فرقہ وارانہ سرگرمی اور فساد، ملک کا پڑوسی ممالک، مغربی ایشیا کے دوست ممالک سے رشتوں کا خراب ہونا اور دہشت گردی سے نپٹنے کی حکومت کی غلط پالیسی نیز پولس کا ظالمانہ سلوک دہشت گردی کی جڑ میں نظر آتا ہے۔ ریاست بہار میں 17 بے قصور لوگوں کو دہشت گردی کے نام پر گرفتار کیا گیا ہے۔ دربھنگہ اور مدھوبنی کے مسلم اکثریت والے علاقوں کو ایک سازش کے تحت نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ ان تمام گرفتاریوں میں آئین اور سپریم کورٹ کی طرف سے کسی کی گرفتاری سے متعلق پولس گائیڈ لائن اور حقوق انسانی کی دھجیاں اڑائی جا رہی ہیں۔ ایسے واقعات میں حکومت کی خاموشی انتہائی افسوسناک ہے۔ مقررین نے قتیل صدیقی کا پونے جیل میں قتل کو ہندستانی جمہوریت کے لئے ایک بدنما داغ قرار دیا وہیں سعودی عرب سے گرفتار کئے گئے انجینئر فصیح محمود کے بارے میں حکومت ہند کی طرف سے کوئی معلومات فراہم نہ کئے جانے کو باعث شرم قرار دیا۔ مقررین نے اس طرح کی متعصّبانہ کارروائی کے لئے مرکز اور ریاستی حکومت کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا کہ جہاں

مرکزی حکومت کی ایجنسیاں اس طرح کی ظالمانہ کارروائی انجام دے رہی ہیں وہیں اس معاملے میں ریاستی حکومت کی خاموشی اور گمراہ کن بیان بھی حد درجہ افسوسناک ہے۔ ریاست میں کسی طرح کی کارروائی سے مقامی حکومت یا انتظامیہ ہرگز صاف انکار نہیں کرسکتی اور خاموشی سے اپنا دامن نہیں بچا سکتی۔ اس لئے ایسے معاملات میں حکومت کو پوری ایمانداری اور کھلی ذہنیت کا مظاہرہ کرنا چاہئے تاکہ انصاف کا تقاضہ پورا ہو اور عوام کا اعتماد قائم ہو سکے۔ دھرنے کے توسط سے ریاستی حکومت سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ بہار سے ہوئی اس طرح کی سبھی گرفتاریوں کے سلسلے میں ایک اعلی سطحی ٹیم تشکیل کرے اور اس ٹیم کو متعلقہ ریاستوں کے دورے پر بھیجا جائے جو اس طرح کے واقعات کے بارے میں حقیقت سے عوام کو واقف کرائے۔ وہیں قتیل صدیقی کا عدالتی حراست میں ہوئے قتل معاملے کی بھی اعلی سطحی جانچ کا مطالبہ کیا گیا۔ یہ بھی مطالبہ کیا گیا کہ جن لوگوں کو بنا چارج شیٹ کے طویل مدت سے جیلوں میں قید رکھا گیا ہے اور اذیتیں دی جا رہی ہیں انہیں فوری رہا کیا جائے نیز دہشت گردی جیسے حساس معاملے میں لاپرواہی برتنے والے پولس افسران کے خلاف سخت کارروائی کی جائے۔ مختلف جماعتوں اور تنظیموں سے وابستہ مقررین نے ایک آواز میں اس عہد کا اعادہ کیا کہ اس سنگین مسئلے پر اب خاموش نہیں رہا جا سکتا ہے اور ملک کے جمہوری قدروں کے تحفظ کے لئے بے قصور لوگوں کو مکمل انصاف دلانے تک تحریک سرگرمی کے ساتھ جاری رکھی جائے گی۔ دھرنا سے سی پی آئی مالے کے جنرل سکریٹری دیپانکر بھٹا چاریہ، قانون ساز کونسل میں اپوزیشن لیڈر غلام غوث، معروف سماجی کارکن ستیہ نارائن مدن، کنچن بالا، فادر فلپ منترا، مہندر یادو، نیئر الزماں، نیئر فاطمی، ایس یو سی آئی کے ارون سنگھ، سعودی عرب میں گرفتار انجینئر فصیح محمود کی اہلیہ نکہت پروین والدہ عامرہ جمال، مقتول قتیل صدیقی کے بھائی شکیل صدیقی، سماجی کارکن انیس انکر، سلمان خان، فادر دیوسیا، زاہد انصاری، روپیش، ڈاکٹر حامد رضا، شمیم رضا، رام چندر لال داس، پروفیسر ایم این کرن، پروفیسر ونئے

کنٹھ، ڈاکٹر ڈیزی نارائن، ایل جے پی کے ڈاکٹر ستیہ نند شرما، سماجی کارکن کرشن مراری، سی پی ایم کے سرود یہ شرما، واحد انصاری، محمد عارف انصاری، رابطہ کمیٹی کے محمد افضل حسین، رام جی رائے، کے ڈی یادو، پشپ راج، اے کے پربھاکر، فارورڈ بلاک کے وکیل ٹھاکر، پٹنہ ہائی کورٹ کے سینئر وکیل بسنت چودھری، حسن رضا، شفیع انصاری، منت اللہ، اشوک مانو، عبدالسلام، ظفر امام، شیلندر پرتاپ ایڈووکیٹ، منیش رنجن ایڈووکیٹ، سسٹر لینا، سسٹر روزالین سمیت بڑی تعداد میں مختلف سماجی، سیاسی، ملی اور حقوق انسانی کے علمبردار تنظیموں سے وابستہ افراد نے خطاب کیا۔

ان کا کہنا تھا کہ اب تک جتنے بھی نوجوان اس علاقہ سے اٹھائے گئے ہیں کسی کے خلاف کوئی معاملہ نہیں تھا۔ سب بے قصور ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی کے خلاف عدالت میں کوئی معاملہ پیش نہیں ہو سکا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ نتیش حکومت اس دباؤ کا سامنا کس طرح کرتی ہے اور مسلمانوں کو انصاف دلانے اور اپنی سیکولر شبیہ کو بچانے کے لئے کون سا قدم اٹھاتی ہے۔

(بشکریہ ہفت روزہ چوتھی دنیا)

☆☆

بابری مسجد-تعمیر سے شہادت تک

● رشید انصاری

6/دسمبر ہر سال آتا ہے اور ہمیں بابری مسجد کی شہادت کے المناک واقعہ کے ساتھ ہندوستان میں بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی اور فاشزم اور حکومت کی مشنری میں محدود پیمانے پر سہی لیکن ہر سطح (وزراء سے لے کر ایک پولیس کانسٹبل تک) پر پائے جانے والے تعصب اور مسلم دشمنی سے صرف مسلمانوں کو ہی نہیں بلکہ پوری قوم اور ملک کو لاحق خطرات سے آگاہ کرتا ہے گو کہ بابری مسجد کی شہادت کے کلیدی مجرم نرسمہا راؤ جیسا فرقہ پرست، مسلم دشمن اور نااہل شخص نہ وزیراعظم بنا ہے اور نہ ہی بن سکے گا۔ سیکولرازم کا دم بھرنے والی تمام جماعتوں کانگریس اور سنگھ پریوار دونوں ہی بابری مسجد کی شہادت کے جرم میں برابر کی شریک ہیں۔

یہ گڑے مردے اکھاڑنا، یا زخموں کو ہرا کرنا نہیں ہے بلکہ ماضی سے سبق لینے کیلئے بابری مسجد کے ماضی کا ذکر انگریزوں، کانگریس اور سنگھ پریوار کے حوالے سے اختصار کے ساتھ پیش ہے۔

شہنشاہ بابر کے ایک سپہ سالار میر باقی نے 1528ء میں ایودھیا (ضلع فیض آباد) میں بابری مسجد تعمیر کروائی تھی۔ 1528ء سے لے کر 1850ء کے بعد تک بھی یہ بات کسی نے نہیں کہی تھی کہ بابری مسجد کسی مندر (خاص طور پر رام چندر جی کے مقام پیدائش) رام جنم بھومی کی جگہ بنے مندر کو توڑ کر بنائی گئی تھی ویسے رام چندر جی کا مقام پیدائش ایودھیا ہونا نیز

رام چندر جی کی حقیقی تاریخی حیثیت ہی مشتبہ باتیں ہیں حد تو یہ کہ بابری مسجد کی جگہ پر رام چندر جی کے مقام پیدائش کا ہونا گذشتہ سال الہ آباد ہائی کورٹ نے دلیل وثبوت کی بنیاد پر نہیں بلکہ ”عقیدے“ کی بنیاد پر تسلیم کر کے نہ صرف خود کو مذاق کا موضوع بنا لیا بلکہ ملک کی عدالت عظمیٰ نے بھی عدالت عالیہ الہ آباد کے اس فیصلے کو ”عجیب وغریب“ قرار دے کر عدالتی فیصلہ پر اعتراض کرنے کا جواز پیدا کر دیا ہے۔

بابری مسجد رام جنم بھومی مسئلہ انگریزوں نے ہی پیدا کیا تھا۔ اس کے ساتھ ان ہی بیکر صاحب نے کئی ایسے فتنہ انگیز نکات پیش کئے جنہوں نے ایک غیر متنازع بات کو متنازع بنانے میں اہم حصہ لیا ہے۔ ہالینڈ سے تعلق رکھنے والے ہنس بیکر نے ہی 1008ء میں ”جنم بھومی مندر“ کی تعمیر کی بات لکھی تھی۔ انگریزوں کی ریشہ دوانیوں میں یہ امر بھی شامل ہے کہ 1855ء کی پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد ایودھیا میں انگریزوں کی افواج اور انگریزوں کے نمک خوار ہندو زمینداروں اور تعلقہ داروں نے مل کر ہنومان گڑھی کی مسجد شہید کی اور مسجدیں بھی توڑیں جب مولوی امیر علی امیٹھوی نے مساجد کو واگذار کرنے کیلئے کارروائی کی تو تاریخ حدیقۃ شہدا اور قیصر التواریخ کے مورخین کا خیال ہے کہ انگریزوں کے توپ خانے کی زد میں آ کر مجاہدین شہید ہوئے اور بعد ازیں انگریزوں نے مولوی امیر علی کو سزائے موت دے کر شہید کر دیا۔ اس کے بعد مقدمہ بازی تو ہوتی رہی لیکن کوئی خاص مسئلہ پیدا نہ ہو سکا۔ (افکار ملی ماہنامہ۔ بابری مسجد نمبر 2003) اس کے بعد انگریزوں نے اپنی سروے رپورٹس، انتظامیہ کے شائع کردہ گزیٹرس وغیرہ میں بابری مسجد کے بارے میں لکھنا شروع کیا کہ یہاں پہلے مندر تھا چنانچہ اس سلسلے میں مانگمری مارٹن اور پی کارینگی کی رپورٹس نے قیاسات کی بنیاد پر مندر کی جگہ مسجد کے مفروضے پیش کئے۔

1870ء میں فیض آباد تحصیل کا بندوبست ہونے لگا تو قائم مقام ڈپٹی کمشنر پی کارینگی P.CARENGY نے تین مندروں (بشمول رام جنم بھومی استھان) کی جگہ

مسجدوں کی تعمیر کا فتنہ چھیڑا تھا وہ بھی ''مقامی طور پر سے یقین کئے جانے کی بنیاد پر'' (نہ کہ کسی تاریخی شواہد یا ثبوت) کارینگی کی رپورٹ وہ پہلی رپورٹ جس میں مسجد مندر مسئلہ کھڑا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کے بعد برطانوی حکومت کے دور میں تمام دستاویزات میں اسی رپورٹ کو بنیاد بنا کر اور نمک مرچ لگا کر پیش کیا گیا۔

1871ء میں ملک میں آثار قدیمہ کا محکمہ قائم کیا گیا۔ آثار قدیمہ کے تعلق سے اہم کام الیگزینڈر کننگھم نے انجام دیا۔ اس نے بھی مسلمانوں پر مندر مسمار کرنے کی باتیں لکھیں۔ انگریزوں کی کوشش یہی تھی کہ ایک بڑا قضیہ کھڑا کر دیا جائے وہ اس میں کامیاب رہے۔ (بابری مسجد۔ سید صباح الدین)۔ انگریزوں نے اس قضیہ کو بڑھانے کی تدابیر کیں اور یہ تاثر قائم کیا کہ مندر کو مسمار کر کے بابری مسجد بنائی گئی تھی۔ بابری مسجد کے مقابل ایک خالی جگہ جو ''جنم استھان'' کہلاتا تھا صدہا برس سے خالی پڑا تھا تاہم ہندو وہاں پوجا ضرور کرتے تھے۔ 1863ء میں تھانیدار کی اعانت سے راتوں رات ایک چبوترہ بنالیا اور اس کو بڑا کرنے کی کوشش بھی کرتے رہے چنانچہ بابری مسجد کے متولی، خطیب اور موذن محمد اصغر نے اس سلسلے میں 1883ء اور 1884 میں دو درخواستیں دی تھیں جس کا ذکر سید صباح الدین نے ''بابری مسجد'' نامی کتاب میں درج کیا ہے۔ دوسری جانب 1885ء میں مہنت رگھو ویر داس اور دوسرے مہنتوں نے چبوترہ پر مندر تعمیر کرنے کی اجازت کیلئے عدالت میں درخواست دی تھی۔ واضح ہو کہ یہ چبوترہ مسجد سے باہر تھا اور اس عرضی میں یہ دعویٰ نہیں کیا گیا تھا کہ بابری مسجد مندر توڑ کر بنائی گئی ہے۔ نہ ہی بابری مسجد کو حاصل کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔ فیض آباد کے پنڈت ہری کشن نے یہ درخواست خارج کر دی تھی۔ اس فیصلے کے خلاف مہنتوں نے جو اپیل کی تھی وہ بھی ڈسٹرکٹ جج نے خارج کر دی لیکن انگریز جج (ایف۔ اے چیمپئر) نے اپنے فیصلے میں بغیر کسی دلیل کے انگریز مورخوں کی پیروی میں لکھا کہ ''یہ بات افسوسناک ہے کہ ایک مسجد ایسی زمین پر بنائی گئی جو ہندوؤں کے نزدیک

خاص تقدس رکھتی ہے لیکن کیوں کہ واقعہ 356 سال قبل پیش آیا تھا لہٰذا اب اس کا تدارک ممکن نہیں ہے۔ جملہ فریقین موجودہ حالت کو برقرار رکھیں۔'' (بابری مسجد اے ٹیل ان ٹولڈ صفحہ 50/محمد جمیل اختر)

1885ء کے بعد فریقین نے خاموشی اختیار کر لی تھی ہندوؤں نے بابری مسجد پر کوئی دعویٰ نہیں کیا وہ مسجد سے باہر واقع چبوترے پر پوجا کرتے رہے لیکن یہ خاموشی اور قضیہ کا آگے نہ بڑھنا انگریزوں کو پسند نہ تھا چنانچہ 1905ء میں ایچ آر نیویل نے فیض آباد گزیٹر مرتب کیا اور صفحہ:153 پر لکھا:

''1528ء میں بابر نے اس روایتی جگہ پر اجودھیا میں مسجد بنائی جہاں رام پیدا ہوئے تھے۔'' اس نے یہ بھی لکھا تھا ''یہاں مسلمان حاکم کی موجودگی اور اس کے دربار کی وجہ سے ہندوؤں کی مقدس جگہیں پس پشت پڑ گئیں۔'' نیویل نے وہی جھوٹ باتیں دہرادی ہیں جو ماضی میں انگریز کہتے رہے تھے لیکن اس نے ہر بات یوں وثوق سے لکھی جیسے کہ ثابت شدہ تاریخی حقائق لکھ رہا ہے جبکہ اس کے پیشرو ''قیاس۔ مانا جاتا ہے'' وغیرہ کے سہارے جھوٹ لکھا کرتے تھے۔ مسز اے ایس بیورج نے 1922ء میں تزک بابری کا انگریزی میں ترجمہ کیا اس کی بددیانتی کا حال یہ ہے کہ جب اس کو بابرنامہ مغلوں کے عہد کی کسی تاریخ سے یہ پتہ نہ چل سکا کہ بابر نے رام جنم استھان کو مسمار کر کے وہاں ایک مسجد بنائی تو اس نے بابرنامہ کے صفحہ 656 پر 1905ء کے گزیٹر ایچ آر نیویل کا ہی بیان نقل کر دیا بیورج نے بھی محقق کی جگہ قیاسات پر مبنی خیالات کا اظہار کیا۔ اس نے بابر کی ایودھیا آمد کا ذکر کیا لیکن اس نے یہ بات قیاساً (Presumable) سے شروع کی ہے اور یہ بھی حیرت انگیز انکشاف کر دیا کہ ''تزک بابری'' میں 935ھ (م 1528ء) کے چند جزوی واقعات تحریر نہیں کئے گئے جس کی وجہ سے اودھ کے متعلق معلومات حاصل نہیں کئے جا سکے۔

یہ تو تھیں انگریزوں کی ریشہ دوانیاں اور جو بات قضیہ نہ تھی اسے قضیہ بنانے کی کوشش

کے احوال۔

عام طور پر مانا جاتا ہے کہ آزادی کے بعد 22 اور 23 دسمبر کی درمیانی شب کو اچانک شر پسندوں نے بابری مسجد کا تالا توڑ کر مسجد میں گھس کر منبر کے پاس مورتیاں رکھ دیں لیکن ساری بات یوں نہیں ہے اس سلسلے میں کانگریس کا رول شروع سے آخر تک قابل مذمت رہا واضح ہو کہ بابری مسجد میں مورتیاں جب رکھی گئیں تب سے 1986ء میں بابری مسجد میں پوجا کی اجازت دیئے جانے اور 1992ء میں مرکز میں کانگریس کا راج تھا بلکہ اتر پردیش میں بھی زیادہ تر کانگریس کا راج رہا۔ سنگھ پریوار تو 1984ء میں مندر مسجد معاملے میں سامنے آئی تھی۔ ملک جب آزاد ہوا، گاندھی جی کے قتل سے پہلے اور بعد ایودھیا اور فیض آباد وغیرہ میں کیا حالات تھے اس کا اندازہ گاندھی جی کے چیلے اور رکن پردیش کانگریس کمیٹی اور سکریٹری کانگریس کمیٹی فیض آباد کے ان خطوط سے ہوتا ہے جو کہ انہوں نے اس وقت کے یوپی کے وزیر داخلہ لال بہادر شاستری (آنجہانی وزیر اعظم ہند) کو لکھے تھے۔ 13/نومبر 1949ء کو چبوترہ وسیع کرنے کیلئے بابری مسجد کے آس پاس جو قبریں تھیں ان کو کھود ڈالا گیا تھا گویا بابری مسجد میں بتوں کی تنصیب سے پہلے ہی اجودھیا میں کشیدگی تھی۔ مزید تفصیلات اکشے کمار برہمچاری کے خطوط میں پڑھے جاسکتے ہیں۔ (افکار ملی، ماہنامہ دہلی) کا بابری مسجد نمبر 2003 صفحہ 157 اور 'بابری مسجد' مرتبہ محمد عارف اقبال (حصہ دوم صفحہ 449)۔

شری اکشے برہمچاری نے لکھا تھا: میں تقریباً بارہ بجے بابری مسجد گیا۔ (23 دسمبر 1949) جہاں مورتی رکھی ہوئی تھی تھوڑے سے آدمی مسجد کے پاس جمع تھے اس وقت آسانی سے مسجد کی حفاظت ہوسکتی تھی اور مورتی کو ہٹایا جاسکتا تھا۔ ضلع مجسٹریٹ نے اس کو مناسب نہیں سمجھا۔

آگے بڑھنے سے قبل یہ بتادیا جائے کہ دسمبر 1949ء میں پنڈت گووند ولبھ پنت یوپی کے وزیر اعلیٰ تھے لال بہادری شاستری وزیر داخلہ تھے۔ مسلمان قائدین میں مولانا

مجموعہ القاسم: جلد پنجم　　　　مسلم مسائل اور اس کا حل

آزاد، سیف الدین کچلو، آصف علی، رفیع احمد قدوائی، ڈاکٹر سید محمود اور شیخ عبداللہ تھے لیکن اس سلسلے میں کسی کا کچھ کرنا و کہنا تو دور کی بات ہے کسی نے ایودھیا کا دورہ نہیں کیا۔ دسمبر 1949ء اور اس کے بعد فیض آباد کے ڈپٹی کمشنر کے کے نیر چاہتے تو 23 دسمبر یا اس کے بعد مورتیاں مسجد سے ہٹائی جاسکتی تھیں۔ حد تو یہ ہے کہ ڈپٹی کمشنر فیض آباد نے اس وقت کے چیف سکریٹری اتر پردیش بھگوان سہائے کو جواب دیا کہ ''مسجد سے مورتیاں ہٹانے کو ایک خطرناک قدم قرار دیا اور ایسا کرنے سے اپنی معذوری ظاہر کی۔'' (بابری مسجد، حصہ اول صفحہ 327)

ممتاز قانون داں اور مصنف اے جی نورانی نے 1949-50ء کے مرکزی وزیر داخلہ سردار پٹیل اور وزیر اعلیٰ یوپی پنڈت گووند ولبھ پنت کی خط و کتابت انگریزی ماہنامہ ''مین اسٹریم'' میں شائع کی تھی جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دونوں رہنماؤں کو علم تھا کہ ایک مسجد کو مندر بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ دونوں قائدین نے سچائی کو تسلیم کرنے کے باوجود اس کو طاقت کے ذریعہ بحال کرنے کی جگہ تصفیہ، افہام وتفہیم پر زور دیا اور ''یکطرفہ کارروائی'' سے احتراز کئے جانے اور جارحانہ اور دباؤ والے طریقوں کو اختیار کرنے کا مشورہ نہیں دیا۔ مسجد پر غاصبانہ قبضہ کو سردار اور پنت نے سچائی تسلیم کرنے کے باوجود ''تصفیہ'' کی ضرورت کیوں نہیں محسوس کی تھی۔ کیوں اس کا جواب کون دے۔ (بابری مسجد حصہ دوم، محمد عارف اقبال صفحہ 455 تا 458)

مسجد پر ناجائز قبضہ برخواست کرنے کی جگہ ڈپٹی کمشنر کرشن کمار نائر نے مسجد اور متصل قبرستان کو قرق کرلیا اور مسجد میں تالا ڈال دیا گیا۔ مسلمانوں نے مقدمہ دائر کرنے کی مدت کے آخری دنوں میں 1961ء میں یوپی سنی وقف بورڈ نے مذکورہ اراضی پر حق ملکیت کا دعویٰ کرتے ہوئے مسجد سے مورتی ہٹوانے کیلئے عدالت میں اپیل دائر کی۔ اتنے اہم معاملے میں اس قدر تاخیر نا قابل فہم ہے۔

مندرجہ بالا واقعات سے بڑے بڑے کانگریسی قائدین اور اس دور کے مسلمان قائدین کی روش کا پتہ چلتا ہے۔ 1984ء دہلی میں ہندوؤں (وشواہندو پریشد) نے مسجد کا تالا کھلوانے کا مطالبہ کیا اس طرح سنگھ پریوار ''مندرو ہیں (جہاں بابری مسجد تھی) بنے گا'' کے نعرے کے ساتھ میدان میں آگئی اس کا بی جے پی کو فوری فائدہ یہ ہوا کہ جہاں 1984ء کے انتخابات میں اسے صرف دو نشستیں پارلیمان میں حاصل ہوئی تھیں لیکن اگلے انتخابات میں یہ تعداد 90 سے زائد ہوگئی تھی۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کانگریس کے بے حد اہم اور سینئر قائد پنڈت نہرو کے ساتھی اور پنڈت نہرو اور لال بہادری شاستری کی موت کے بعد نگران وزیر اعظم بننے والے شری گلزاری لال نندہ 1982ء میں وشواہندو پریشد میں شامل ہوگئے تھے اور 1983ء میں ''شری رام جنم اتسو سمیتی'' بنائی تھی۔

کانگریسی حکومتوں نے بابری مسجد کی ملکیت کے مقدمہ یا 1992ء میں بابری مسجد کی شہادت کے بعد شہادت کے مجرموں کے خلاف مقدمہ کی عاجلانہ یکسوئی کیلئے کچھ نہیں کیا لگتا یہی ہے کہ حکومتوں کی پالیسی کی بنیاد ٹال مٹول پر رہی حد تو یہ ہے کہ لبراہن کمیشن کو بھی دل کھول کر مہلت دی گئی غرض کہ قانونی لحاظ سے معاملہ کی یکسوئی کی سنجیدہ کوشش کا ہمیشہ فقدان رہا۔

یکم فروری 1986ء ڈسٹرکٹ جج فیض آباد نے بابری مسجد کا تالا کھول کر ہندوؤں کو عام پوجا پاٹ کی اجازت دی عدالت نے یہ فیصلہ دیتے وقت قواعد وضوابط کو اس حد تک بالائے طاق رکھا کہ فریق مخالف مسلمانوں کو اپنی رائے تک دینے کا موقع نہیں دیا گیا کمال تو یہ ہے کہ یہ حکم ایک ایسے فرد کی درخواست پر دیا گیا تھا جس کا کسی مقدمہ سے کوئی تعلق نہ تھا جبکہ ملکیت کے مقدمہ کے ایک اہم فریق محمد ہاشم کے عذر و دلائل کو ڈسٹرکٹ جج کے ایم پانڈے نے نہ صرف ایک دن قبل یو ایس پانڈے کی درخواست کا فیصلہ کرتے ہوئے اصل مقدمہ 1950ء کے اس عدالتی حکم جس کے تحت بابری مسجد کو مقفل کر دیا گیا تھا نظر انداز

کر کے بابری مسجد کو عملاً مندر میں تبدیل کر دیا اور متنازع فیہ عمارت (جس کی ملکیت کا مقدمہ زیر سماعت تھا) کا مکمل اختیار فریق مخالف یعنی ہندوؤں کو دے دیا۔ اس درخواست کو منصف مجسٹریٹ نے مسترد کر دیا تھا لیکن راجیو گاندھی جو اس وقت وزیر اعظم تھے ''ہندو ووٹ'' کو مضبوط کرنے کیلئے اپنے چچا، مشیر اور مرکزی وزیر ارون نہرو کے مشورے پر بابری مسجد کا تالا کھلوایا تھا اسی واسطے اس فیصلے کی اور تالا کھولے جانے کی زبردست تشہیر ہوئی آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن سے اس کی زبردست تشہیر کی گئی۔

طرفہ ستم یہ ہے کہ ڈسٹرکٹ جج کے فیصلے کے خلاف محمد ہاشم کی اپیل کو الہ آباد کی عدالت العالیہ (ہائی کورٹ) نے مسترد کرتے ہوئے ''جوں کی توں حالت'' یعنی مسجد میں پوجا کی اجازت برقرار رکھی۔ (صفحہ 73 پروفیسر ایس اے ایچ حقانی، Under Siege Secularism)

سچ تو یہ ہے کہ اسی واقعہ کے بعد ملک بھر کے مسلمانوں کو بابری مسجد پر 1949ء سے کیا گذرتی رہی ہے بلکہ بابری مسجد کے وجود کا پتہ چلا ویسے 1984ء سے ہی ملک بھر میں بابری مسجد کا چرچا ہونے لگا تھا لیکن عام نہ تھا۔

راجیو گاندھی کے دور میں 9/نومبر 1989ء کو "شیلا نیاس" کیا گیا تو کہ یہ عدالت کے حکم کے برخلاف امتناع فیہ علاقہ میں کیا گیا لیکن اس دور کے وزیر داخلہ بوٹا سنگھ نے یہ کہہ کر دھوکہ دیا کہ یہ ممنوعہ علاقہ سے باہر ہوا ہے۔

30/اکتوبر 1990ء کو یوپی میں ملائم سنگھ وزیر اعلیٰ تھے ہزاروں کارسیوکوں نے بابری مسجد کو منہدم کرنے کی کوشش کی ملائم سنگھ کے حکم پر ان کو روکنے کیلئے گولی چلائی گئی۔ مسجد کو بچالیا گیا چند کارسیوک مارے گئے لیکن مسجد کو بچالیا گیا۔

نرسمہا راؤ کی بدنیتی کا حال ملاحظہ ہو وہ وزیر اعظم بنے تو ستمبر 1991ء میں ایک بل پیش کیا گیا جس کے تحت مختلف مذاہب کی عبادت گاہوں کی حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں

ہوگی اور 15 اگست 1947ء کو ان کی جو حیثیت تھی وہ برقرار رہے گی تاہم بابری مسجد کو نرسمہا راؤ نے اس بل کی شرائط سے مستثنیٰ رکھا۔ (کیوں؟ نرسمہا راؤ کو بابری مسجد کی برقراری منظور نہ تھی)۔

بالآخر 6-دسمبر کو بابری مسجد کو شہید کردیا گیا!!

مسجد کی شہادت سے قبل نرسمہا راؤ سارے ملک کو یہ کہہ کر دھوکہ دیتے رہے کہ مسئلہ حل کرلیا جائے گا سپریم کورٹ میں بھی مسجد کی برقراری اور نقصان نہ پہنچانے کا حلف نامہ نرسمہا راؤ نے اپنے دوست کلیان سنگھ سے داخل کروایا اور جس وقت مسجد شہید کی جارہی تھی نرسمہا راؤ سوتے رہے کارسیوکوں کو من مانی کرنے کی کھلی چھوٹ حاصل تھی پولیس اور نیم فوجی دستوں کو مداخلت سے روک دیا گیا اور نہ صرف مسجد شہید کردی گئی بلکہ اس کی جگہ عارضی مندر کی تعمیر تک نرسمہا راؤ کی مجرمانہ کرتوت برقرار رہی ہے اس لئے بابری مسجد کی شہادت کا کلیدی مجرم نرسمہا راؤ کو کہا جاتا ہے۔

☆☆

بابری مسجد کی شہادت کے بعد

ملک میں فرقہ پرستوں کا خونی کھیل

● ادارہ

بابری مسجد کی شہادت کے زخم نے مسلمانوں کو کیا کم لہولہان کیا تھا کہ اس کے بعد پھوٹ پڑنے والے فرقہ وارانہ فسادات نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی۔ ایودھیا سے واپس جانے والے ہزاروں ہزار فسادی، ملک کے جس کونے میں بھی پہنچے، وہاں انہوں نے وحشیوں کی طرح قتل وخون کا بازار گرم کیا، لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے ہی مقامی سطح کے فسادیوں نے حالات کو اتنا پراگندہ کردیا تھا کہ باہر سے کسی کے آکر حالات کو بگاڑنے کی زیادہ ضرورت نہیں تھی۔

ہندوستان میں ہزاروں کی تعداد میں بڑے فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ہیں، لیکن بابری مسجد کی شہادت کے بعد برپا ہونے والے فسادات میں موجود اعداد وشمار کے مطابق ڈیڑھ ہزار سے زائد لوگوں کو قتل کیا گیا اور دسیوں ہزار لوگ بری طرح تباہ وبرباد ہوکر زخمی حالت میں اسپتالوں اور ریلیف کیمپوں میں پہنچے۔

بچوں کو ان کی ماؤں کے سامنے زندہ جلادیا گیا۔ نہ جانے کتنی لڑکیوں اور معصوم لوگوں پر ایسیڈ سے بھرے بوتل بم پھینکے گئے۔ ممبئی میں ایک عورت جو اپنے گھر کے سامنے پولس چوکی کے جوانوں کے لئے چائے بنایا کرتی تھی، اسے انہی میں سے ایک پولس والے نے نہایت بے دردی سے گولی ماردی۔ بابری مسجد کی شہادت کی خبر سننے کے بعد ملک کے بیشتر

علاقوں میں مسلمانوں نے سڑک پر نکل کر احتجاج کرنے کی کوشش کی اور ان بیشتر جگہوں پر پولس نے ان کے ساتھ بربریت کا ثبوت پیش کیا۔ کارسیوکوں نے پوری ایک تاریخی بابری مسجد کو نیست و نابود کر دیا' لیکن وہاں پولس نے ایک لاٹھی بھی نہیں چلائی' لیکن جہاں جہاں مسلمانوں نے اس کے بعد سڑک پر نکل کر اپنا احتجاج درج کرایا' وہاں وہاں ان پر پولس نے بے دردی سے گولیاں چلائیں۔ درج ذیل میں ہم مختلف ریاستوں میں مسلمانوں کی ہلاکت کے سرکاری اعداد و شمار کا ایک مختصر خاکہ پیش کر رہے ہیں' جس سے پتہ چل سکے کہ پورے ملک میں مسلمانوں کے خلاف ذہنیت میں کس قدر یکسانیت تھی۔

گجرات میں ہلاک کئے جانے والوں کی تعداد 246 تھی۔ یہاں فساد میں پولس اور انتظامیہ نے فسادیوں کو اپنی جانب سے پوری چھوٹ دے رکھی تھی۔ رپورٹ کے مطابق یہاں وہ شریف اور باوقار' کہے جانے والے لوگ بھی قتل و غارت گری میں بڑھ چڑھ کر ملوث رہے' جن کو کبھی اس قسم کے معاملات میں بہت آگے آگے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ بعض مشہور مالدار ہندو صنعت کاروں نے باضابطہ بڑے پیمانے پر دھاردار ہتھیار خرید کر لوگوں میں تقسیم کئے۔ احمد آباد اور سورت میں بڑے پیمانے پر مسلم کشی اور ان کے گھروں کو تباہ کرنے کی وارداتیں سامنے آئیں۔ پولس نے بھی ان فسادیوں کا خوب جم کر ساتھ دیا۔ صرف احمد آباد میں جو 37 مسلمان مارے گئے تھے' ان میں 28 پولس کی فائرنگ کا شکار ہوئے تھے۔ پانچ دنوں تک فسادات کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہا' جب تک فوج نے آکر سڑکوں پر فلیگ مارچ نہ کیا۔ سورت میں مارے جانے والے مسلمانوں کی تعداد 55 تھی۔ یہاں یہ بات خاص طور پر نوٹ کرنے کی ہے کہ جہاں جہاں مسلمانوں کی معاشی حالت نسبتاً بہتر تھی، وہاں وہاں ان کو خصوصی طور پر نشانہ بنایا گیا تھا۔ مدھیہ پردیش میں 120 مسلمان ہلاک کئے گئے تھے۔ یہاں بابری مسجد کی شہادت کے دوسرے دن حالات کا ہندو انتہا پسندوں اور مقامی اخباروں نے اس قدر پرچار کر دیا کہ اس سے پہلے کہ

مسلمانوں کی جانب سے کوئی احتجاجی جلوس وغیرہ نکلتا' ان پر حملے شروع کر دیئے گئے' جیسے ہی مسجد کی شہادت کی خبر پہنچی، بھوپال میں بجرنگ دل اور وشو ہندو پریشد کے کارکنوں نے فتح کا جشن منانا شروع کیا۔ پولس خاموش تماشائی بنی رہی اور فسادی مسلم محلوں پر حملے کرتے رہے۔ یہاں شدید قسم کے مسلم کش فسادات کا سلسلہ 12 دسمبر تک جاری رہا اور سرکاری اعداد و شمار کے مطابق صرف بھوپال میں 95 اور دیگر شہروں میں 35 مسلمان بے دردی سے قتل کئے گئے۔ یہاں سنگھ برادر ہڈ کے کارکنوں نے کھلے عام ہتھیار تقسیم کئے اور فسادیوں کو مسلم مکانوں پر حملہ کرنے پر ابھارا۔ مدھیہ پردیش کے وزیر اعلیٰ سندر لال پٹوا نے اپنی فرقہ وارانہ ذہنیت کا ثبوت پیش کرتے ہوئے ایک ہفتہ تک کہیں بھی فسادیوں کو اس وقت تک روکنے کی کوشش نہیں کی' جب تک ان کو پورا احساس نہ ہو گیا کہ اب مرکز یہاں گورنر راج نافذ کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔

مہاراشٹر میں سب سے زیادہ 2600 مسلمان مارے گئے اور ان میں بیشتر پولس کی گولیوں کا شکار ہوئے تھے۔ جے جے اسپتال کے مردہ خانے میں جتنی لاشیں بھی رکھی گئی تھیں، وہ سب مسلمانوں کی تھیں اور سبھی پولس کی گولیوں سے چھلنی ہوئی تھیں۔ مردہ خانے کے باہر روتے بلکتے مسلمان اپنے لواحقین کی لاشیں حاصل کرنے کے لئے دوڑ دھوپ کر رہے تھے اور پولس ان پر ڈنڈے برسا رہی تھی۔ خود ممبئی کے پولس کمشنر این کے باپٹ نے یہ قبول کیا تھا کہ بیشتر مارے جانے والے لوگ پولس فائرنگ کا شکار ہوئے تھے۔ ساؤتھ اور سینٹرل ممبئی کا کوئی بھی مسلم محلّہ اور دھاراوی' دیونار اور گھاٹ کوپر کا سلم نہیں تھا' جہاں لاشیں نہیں گری تھیں اور جہاں مسلمانوں کے مکانوں اور ان کی دکانوں کو نذر آتش نہیں کیا گیا تھا۔ شیوسینا کے چیف بال ٹھاکرے نے اپنی اشتعال انگریز تقریروں کے ذریعہ اپنے سینکوں کو بار بار مسلمانوں کو سبق سکھانے کیلئے اکسایا تھا اور ان کے بیشتر مقامی قائدین جگہ جگہ حملہ آوروں کی قیادت کرتے نظر آرہے تھے۔ ممبئی پورے ایک ہفتہ تک

خاک وخون میں ڈوبی رہی۔ آسام میں مارے جانے والے لوگوں کی تعداد 115 تھی۔ یہاں پہلے سے ہی بنگلہ دیشی گھس پیٹھئے کے نام پر فرقہ وارانہ تناؤ موجود تھا۔ لہٰذا بابری مسجد کی شہادت کی خبر نے اس تناؤ کو آگے بڑھانے میں تیل کا کام انجام دیا۔ یہاں کے فساد میں دونوں فرقوں کے لوگ مارے گئے تھے، لیکن مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی' اس کے باوجود کانگریسی وزیر اعلیٰ ہتیشور سیکیا نے فساد شروع کرنے کا الزام مسلمانوں پر ہی لگایا اور کہا کہ وہ بڑے پیمانے پر بھڑکنے والے فساد کو اس لئے نہیں روک سکے، کیونکہ ان کے پاس پیرا ملٹری فورسیز کی کمی تھی اور مرکز نے انہیں بروقت کمک نہیں پہنچائی۔

مغربی بنگال میں حالانکہ ایک مارکسٹ حکومت قائم تھی' جو اقلیتوں کو تحفظ فراہم کرنے کی دعویدار ہے' لیکن وہاں بھی 32 افراد ہلاک کئے گئے اور ان میں 30 مسلمان تھے۔ سب سے زیادہ متاثرہ مقام کلکتہ تھا اور اس کے بعد بنگال کے بعد دوسرے دیہی علاقے۔ یہاں بعض سی پی ایم کے ورکروں تک کو مسلم مخالف فساد میں حصہ لیتے ہوئے دیکھا گیا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جن ریاستوں میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت تھی' وہاں ہلاکت کی تعداد ان ریاستوں سے کہیں کم رہی، جہاں کانگریس کی حکومت قائم تھی۔ یوپی میں 205 لوگوں کی ہلاکت ہوئی' جبکہ راجستھان میں 50 لوگ مارے گئے۔ ان دونوں جگہوں پر امید کی جارہی تھی کہ ہلاکتوں اور تباہیوں کی تعداد زیادہ اور سلسلہ دراز ہوگا۔ راجستھان میں تو بھیروں سنگھ شیخاوت نے فساد کو زیادہ پھیلنے نہیں دیا' لیکن یوپی میں چونکہ مسلمان خود سکتہ کے عالم میں تھے اور یہاں احتجاجی جلسے جلوس منعقد نہیں کئے گئے' اس لئے ہلاکتوں کی تعداد مہاراشٹر اور گجرات سے کم ہی رہی۔ کانپور اور بنارس میں فساد کا اثر زیادہ رہا' لیکن دوسرے حساس علاقے نسبتاً خاموش رہے۔

بہار میں مارے جانے والے لوگوں کی تعداد 24 تھی، لیکن ان میں پولیس فائرنگ کا کوئی شکار نہیں ہوا تھا۔ رانچی' جمشید پور اور مونگیر میں حالات بے قابو ہوگئے تھے، جو بعد

مجموعہ القاسم: جلد پنجم
مسلم مسائل اور اس کا حل

میں جلد ہی سنبھال لئے گئے۔ یہاں مارے جانے والوں میں دونوں فرقوں کے لوگ شامل تھے۔ چونکہ وزیر اعلیٰ لالو پرساد یادو نے بہت ہی سختی سے نظم ونسق کو بحال کر رکھا تھا اور کارسیوکوں اور دیگر فسادیوں کی بڑے پیمانے پر فوراً گرفتاری شروع کردی تھی' اس لئے نہ تو فرقہ وارانہ فساد نے خوفناک صورت اختیار کی اور نہ ہی اس کا سلسلہ دراز ہوسکا۔ ہندی بیلٹ کہی جانے والی ریاستوں میں بہار میں نقصان کا تناسب دوسری جگہوں سے کافی کم رہا۔ کیرالہ اور آندھرا پردیش میں 12-12، جبکہ تامل ناڈو میں ہلاکتوں کی تعداد 2 رہی، جبکہ کرناٹک میں 60 افراد ہلاک کئے گئے۔ کرناٹک میں مسلمانوں کے علاوہ دوسرے فرقے کے ہلاک ہونے والوں کی تعداد بھی کم نہیں تھی۔ پنجاب اور ہریانہ میں بہت حد تک امن وامان قائم رہا۔ صرف مالیر کوٹلہ میں ہلکا تناؤ پیدا ہوگیا تھا۔ حالانکہ بابری مسجد کی شہادت کے بعد ملک کے بیشتر حصوں میں پھوٹ پڑنے والے فرقہ وارانہ فسادات ہفتہ دس دن کے بعد تھم گئے، لیکن مسلمانوں کو جو زخم لگے تھے، ان کی اب تک بھرپائی نہیں ہوسکی ہے۔

☆☆

ممبئی فرقہ وارانہ فسادات

● ادارہ

ممبئی فسادات کے بعد پورے 12 سال لگ گئے جب انصاف نے محض اپنی ایک جھلک دکھائی۔ 9 جولائی 2008 کو شیوسینا کے لیڈر اور سابق ایم ایل اے اور ایم پی مدھوکر سرپوت دار پر ممبئی کی ایک مقامی عدالت نے مقدمہ چلایا۔ یہ مقدمہ 1992-93 کے ممبئی فسادات سے متعلق تھا۔ جن میں تقریباً 1000 بے قصور لوگوں کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔ لیکن کیا ہوا، سرپوت دار کو محض ایک سال کی سزا ہوئی اور ضمانت بھی فوراً مل گئی اور اس نے باہر آ کر اس مقدمہ کے خلاف ایک اپیل بھی فائل کر دی۔ 2010 میں سرپوت دار مر گیا اور اس کے ساتھ ہی یہ کیس بھی اپنی موت آپ مر گیا۔ رہی بات گجرات کی تو گجرات کے اوڈ کی کی ایک عدالت نے مبینہ طور پر 18 فسادیوں کو عمر قید کی سزا دی ہے، جس کا کریڈٹ سپریم کورٹ اور یقیناً میڈیا اور سماجی کارکنان کے سر جاتا ہے۔ 1992-93 کے ممبئی فسادات سے متعلق انصاف کے پیچھے بھاگنے والے اس معاملہ میں حسرت کا اظہار ہی کر سکتے ہیں۔ ممبئی ہائی کورٹ میں سینئر ایڈوکیٹ سعید اختر کہتے ہیں ''اگر آپ 1992-93 کے ممبئی فسادات کا موازنہ گجرات 2002 کے فسادات سے کریں گے تو آپ کو پتہ چلے گا کہ سپریم کورٹ نے اس میں ایکشن لیا، تحقیقات کے لیے ایس آئی ٹی کی تشکیل کی۔ مگر ممبئی فسادات میں ہم دیکھتے ہیں کہ عدالت عالیہ نے کوئی ایک فیصلہ بھی نہیں لیا۔''

اگر آپ بھول گئے ہوں تو ذہن میں تازہ کر لیں کہ 1993 میں جسٹس سری کرشنا

کمیشن آف انکوائری کا وجود عمل میں آیا تھا لیکن کمیشن ابھی یہ کام کر ہی رہا تھا کہ شیوسینا بی جے پی نے انتخابات جیت کر مشترکہ طور پر حکومت بنالی اور اس نے فوراً ہی یہ فیصلہ کر ڈالا کہ کمیشن کو ختم کر دیا جائے۔ پورے ملک میں اس کے خلاف زبردست احتجاج ہوا اور ریاستی حکومت سے مطالبہ ہوا کہ وہ کمیشن کو اپنا کام کرنے دے، لیکن 1998 میں کمیشن نے جب اپنی رپورٹ پیش کی تو اس وقت کی شیوسینا بی جے پی کی ریاستی حکومت نے اسے پورے طور پر یہ کہتے ہوئے مسترد کر دیا کہ رپورٹ سیاسی بنیادوں پر تیار کی گئی ہے۔ کمیشن نے شیوسینا لیڈروں اور کارکنان کو سختی کے ساتھ مجرم قرار دیا تھا اور ان کے ساتھ ہی 31 پولیس والوں کے خلاف بھی سخت قدم اٹھانے کی سفارش کی تھی۔ آج تک حقیقت میں کچھ بھی نہیں ہوا۔ حالانکہ کانگریس اور این سی پی 1999 سے برابر مہاراشٹر پر حکومت کرتی آ رہی ہیں۔ ممبئی فسادات کے کیسوں کا مطالعہ وتحقیق کرنے والے سماجی کارکن رام پنیانی اس بارے میں کوئی ٹھوس قدم نہ اٹھانے کا تجزیہ یوں کرتے ہیں کہ ''کانگریس جو سیکولر ہونے کا دعوی کرتی ہے جب بھی فرقہ وارانہ فسادات کا مسئلہ ہوتا ہے تو وہ بہت موقع پرست ثابت ہوتی ہے۔ کانگریس نے 1992-93 میں ممبئی میں فسادات کو ہونے دیا اور کانگریس وزیر اعلی نے فسادات کو روکنے میں کوئی دل چسپی نہیں لی۔ اس کے علاوہ فساد کے کیسوں میں کانگریس نے کسی صراحت سے کام نہیں لیا بلکہ یا تو چیزوں کو یوں ہی ہونے دیا یا ان کو نظر انداز کیا''۔ یاد کریں کہ شیوسینا کے بہت زیادہ سرگرم لیڈروں میں سے دو بڑے لیڈر چھگن بھجبل اور نارائن رانے اب این سی پی اور کانگریس کے لیڈر ہیں اور حکومت میں وزیر ہیں۔ یقیناً پنیانی پوری قطعیت سے بی جے پی کو فرقہ پرست مانتے ہیں۔ ممبئی فسادات کے بارے میں یہ دوہرا رویہ اور منافقت اس وقت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے اگر آپ وقت نکالیں اور یہ دیکھنے کی زحمت کریں کہ 1999 میں جب مہاراشٹر میں کانگریس اور این سی پی نے مل کر سرکار بنائی تو کیا ہوا۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ 31 پولیس والوں کے خلاف کڑے قدم

اٹھانے کی سفارش ممبئی فساد میں ان کے مشتبہ اور خراب کردار کی بنیاد پر کی گئی تھی۔ مگر ان 31 میں سے 11 کو کانگریس اور این سی پی سرکار نے صاف صاف بری کر دیا حالانکہ ان کے خلاف سری کرشنا کمیشن کے سامنے بہت سی گواہیاں آئی تھیں اور بہت سی شہادتیں ان کے خلاف تھیں۔ ایک کانسٹبل جس کے خلاف یہ کیس تھا کہ اس نے ایک گونگے بہرے مسلم لڑکے کو فسادیوں کے ایک جتھے کو قتل کرنے کے لیے دیدیا تھا، اس کو محض زبانی سرزنش کی گئی اور چھوڑ دیا گیا۔ کچھ پولیس والوں کو یہ سزا دی گئی کہ کچھ سالوں تک ان کی تنخواہ نہیں دی گئی پھر بحال ہو گئے۔ آر ڈی تیاگی جو فسادات کے وقت اے سی پی تھا، اور اس کے خلاف واضح ثبوت تھے، 2001 میں آر ڈی تیاگی اور اس کی ٹیم پر یہ الزام لگایا گیا کہ انہوں نے 9 جنوری 1993 سلیمان بیکری کے کارکنوں پر اندھادھن گولیاں چلائی تھیں، جن میں سے نو ملازم تو موقع پر ہی مر گئے تھے۔ جب ان لوگوں پر قتل کا یہ الزام لگا تو میڈیا میں خوب ہنگامہ کیا گیا کہ اس سے پولیس والوں کا مورال ڈاؤن ہوگا جو مافیا اور دہشت گردی دونوں سے لڑ رہی ہے۔

فسادات کے بعد آر ڈی تیاگی کو ترقی دے کر کمیشن آف ممبئی پولیس جیسا اہم منصب دیا گیا۔ 1993 میں تیاگی اور اس کی ٹیم کو سیشن کورٹ نے یہ کہتے ہوئے بری کر دیا کہ یہ لوگ اپنی ڈیوٹی انجام دے رہے تھے۔ اس کا تقابل اس سے کیجیے کہ سیکولر حلقے کس عزم وہمت سے گجرات میں اسی طرح کے الزامات میں ماخوذ پولیس والوں کو پراسیکیوٹ کر رہے ہیں۔ مزید برآں، 14 اگست 2007 کو کانگریس پارلیمنٹری پارٹی نے ایک جنرل باڈی کی میٹنگ کی، جس کو خطاب کرتے ہوئے یوپی اے چیرپرسن سونیا گاندھی نے کہا کہ سری کرشنا کمیشن رپورٹ کی تحقیقات پر یقینی عمل درآمد ہونا چاہیے۔ اس سے آٹھ سال قبل کانگریس این سی پی کی مشترکہ سرکار مہاراشٹر میں بن چکی تھی۔ پانچ سال مزید اور گزر گئے سونیا گاندھی کی نیک امیدوں، ارادوں اور نصیحتوں کے باوجود کچھ بھی تو نہیں

ہوا۔ ایک کانگریسی لیڈر نسیم خان نے وزیر اعظم سے ملاقات کی اور ایک ڈیلی گیشن کی یادداشتیں ان کو پیش کیں۔ میمورنڈم میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ ممبئی فساد متاثرین کو بھی پنجاب کے متاثرین کے برابر معاوضہ دیا جائے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ روزنامہ ہندوستان کے ایڈیٹر سرفراز آرزو کہتے ہیں کہ ”1992-93 کے ممبئی فسادات کے بعد زیادہ تر متاثرین کو 1500 روپے کا معاوضہ ملا جبکہ ایک لاکھ مقتولین کو اعزا نوازا گیا، اگر آپ کو یاد ہو تو دہلی فسادات کے متاثرین کو 30 لاکھ روپے دیے گئے تھے“۔

اب ایک بات واضح ہوگئی ہے کہ میڈیا و این جی او اور عدلیہ کی مشترکہ جدوجہد سے فسادیوں کو سزا ملنا یقینی ہوتا جارہا ہے، گجرات میں سزا کی شروعات ہوگئی ہے، بہار میں نتیش کمار کے برسر اقتدار آنے کے بعد 1989 کے بھاگلپور کے مجرموں کو سزا ملی اور اڑیسہ میں کندھمال فساد کے فوراً بعد بھی یہی ہوا۔ البتہ ممبئی فسادات کے معاملہ میں ابھی تک لوگوں کو انصاف کا انتظار ہے۔

☆☆

...اور جب ممبئی جل رہا تھا

● دانش ریاض

فارق ماپکر بینک میں ملازمت کرتے ہیں اور گزشتہ بیس برسوں سے حق وانصاف کی لڑائی لڑرہے ہیں۔1992 میں جب لال کرشن اڈوانی اوراس کے ہمنوا شدت پسند ہندو ٹولے نے بابری مسجد شہید کی تو پورا ملک فرقہ وارانہ فسادات کی آگ میں جلنے لگا۔ممبئی چونکہ فرقہ پرستوں کا اہم پڑاؤ تھالہذا نفرت کی فصل یہاں بھی اگائی گئی اور پورے شہر کو ہندو انتہا پسندوں نے یرغمال بنالیا۔فاروق ماپکر اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہونے کے لئے ظہر کے وقت وڈالا میں واقع ہری مسجد میں داخل ہی ہوئے تھے کہ پولس اہلکاروں نے نمازیوں کو گولیوں کا نشانہ بنانا شروع کردیا۔جرم محض یہ تھا کہ وہ مسلمان تھے اوراس رب کو سجدہ کرتے تھے جو خالق و مالک کائنات ہے۔پل بھر میں ہی جہاں چھ افراد داعی اجل کو لبیک کہہ گئے وہیں کئی ایک افراد زخمی بھی ہوئے،جبکہ پولس نے پچاس افراد کو حراست میں لے لیا اور یہ باور کرایا کہ یہ فسادی تھے حالانکہ جب ایمنسٹی انٹرنیشنل اور جسٹس بی این کرشنا نے معاملے کی تحقیق کی تو انہوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ جب ان لوگوں نے کسی ہندو کے جائداد کو تباہ نہیں کیا، نہ ہی کسی مجمع میں شامل ہوکر کوئی ایسی حرکت کی جو فرقہ وارانہ ماحول کو خراب کرتی تو پھر یہ مجرم کیسے قرار پائے؟ یہ تو پولس انسپکٹر نکھل کاپسے کا جرم ہے کہ اس نے نہتھے شہریوں پر گولیاں برسانے کا حکم دیا اور معصوم شہریوں کا قتل کروایا،لیکن اس وضاحت کے باوجود نہ تو حکومت کے ماتھے پر شکن آیا اور نہ ہی انتظامیہ خاطی پولس اہلکاروں کے

خلاف کوئی کارروائی کرسکی۔المیہ تو یہ رہا کہ جب ہائی کورٹ نے کارروائی کا عندیہ دیا اور کاپسے سے غیر انسانی اور بہیمانہ سلوک کے خلاف وضاحت طلب کی تو پولس انسپکٹر کاپسے نہ صرف خاموش رہا بلکہ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ مسوءل نامے کو ہی ٹھکرا دیا لیکن حکومت ہی کاپسے کے حق میں سپریم کورٹ چلی گئی اور پورے معاملے پر اسٹے آرڈر لے کر آگئی۔
فاروق ماپکر ٹی ایس آئی سے گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں ”جب ہم لوگوں نے اس اسٹے کے خلاف سپریم کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا تو حکومت نے ہی ملزم کی حمایت کا فیصلہ کرلیا۔
دراصل ممبئی کا فساد حکومت وانتظامیہ کی ملی بھگت کا شاخسانہ تھا،حکومت نے پولس اہلکاروں کے ساتھ مل کر شیطنیت کا مظاہرہ کیا تھا۔اب معاملہ سی بی آئی کے حوالے ہے لیکن وہ بھی ہمارے ساتھ کھیل کھیل رہی ہے۔“ ماپکر ماضی کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں ”اگر حکومت فسادات پر قابو کرنا چاہے تو بآسانی کرسکتی ہے لیکن جب حکومت ہی فسادات کروائے اور شہریوں کے مابین نفرت کی بیج بوئے تو کوئی شخص کچھ نہیں کرسکتا۔“

ہوسکتا ہے کہ ماپکر نے فسادات کا جو گھناؤنا چہرہ دیکھا ہے اس نے اسے حکومت و انتظامیہ سے نالاں کردیا ہو اور اب اسے یہاں کے جمہوری نظام پر بھروسہ کرنے میں تکلیف ہورہی ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ پولس وانتظامیہ کا گھناؤنا رول نہ صرف عام ہندوستانی شہریوں کو مشتعل کئے دے رہا ہے بلکہ عام سیکولر ہندو بھی مروجہ ذہنیت کے خلاف منھ کھولتا نظر آتا ہے۔پروفیسر رام پنیانی جنہوں اپنی زندگی کا لمبا عرصہ فرقہ پرستی کے خلاف لڑتے ہوئے گذارا ہے،ممبئی فسادات پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں۔”فرقہ وارانہ فسادات دراصل فرقہ وارانہ ذہنیت کی پیداوار ہیں۔جو یاسی لیڈران کو اس بات کا موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ اپنی سیاست کی بساط بچھاسکیں اور اپنے ارادہ کو مضبوط کرسکیں، حالانکہ اگر حکومت وانتظامیہ چاہے تو ہمارے پاس ایسے قوانین موجود ہیں جو فرقہ پرستی کا خاتمہ کرسکتے ہیں لیکن یہ سیاسی قوت ارادی اور حکومتی چابکدستی کے مرہون منت ہے،

انتظامیہ کی خامیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے پروفیسر پنیانی کہتے ہیں ’’دراصل پولس کی زیادتی، انتظامیہ کی نااہلی اور حکومت کی تساہلی کی وجہ سے ہی فرقہ وارانہ واقعات تشدد کی شکل اختیار کرلیتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہمیں انسداد فرقہ وارانہ فسادات بل کی ضرورت ہے جوان جیسے حالات میں موثر رول ادا کرسکےاور خاطیوں کوخاطر خواہ سزادی جاسکے۔کیونکہ ہم گجرات میں دیکھ رہے ہیں کہ وہاں کسی کوبھی اب تک سزانہیں دی جاسکی ہے جبکہ سیاسی بازیگر خوف وہراس کا ماحول پیدا کرکے آج بھی حالات کوکشیدہ کرنے کی کوشش کررہے ہیں، کیونکہ فرقہ وارانہ ماحول ان کی سیاست کو پختہ سے پختہ تر کرنے کا باعث بن رہا ہے۔‘‘

رام پنیانی کے مطابق ’’اب حالات اس بات کے متقاضی ہیں کہ ہم مختلف پیمانے پر اور مختلف انداز میں انسداد فرقہ پرستی مہم چلائیں تاکہ لوگوں کے ذہنوں کو بدلا جاسکے، ساتھ ہی اقلیتوں کی حفاظت کے لئے ایسے قوانین وضع کئے جائیں جو ملک میں امن وامان کی فضا قائم رکھ سکے۔کیونکہ اقلیتوں کا دل جیتے بغیر ہم کبھی بھی لمبا سفر طے نہیں کرسکتے۔‘‘

لیکن بھارت بچاؤ آندولن کے سربراہ فیروز میٹھی بوروالا کہتے ہیں ’’فسادات عموماً ریاستی حکومت کی ایماء پر ہوتے ہیں، لہٰذا ہمیں تو اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ آخر ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین کس طرح الفت ومحبت کی فضا ہموار ہو۔

☆☆

ممبئی فرقہ وارانہ فسادات

متاثرین کو انصاف ملے گا؟

● زبیر احمد

ممبئی میں سن 1993 کے بم دھماکوں سے متاثرہ لوگوں کے لیئے یہ تسلی کی بات ہے کہ آخر کار اس حادثے میں ملوث مجرموں کے خلاف فیصلے آنے شروع ہو گئے ہیں، لیکن ملک بھر میں ایسے ہزاروں مظلوم ہیں جو فرقہ وارانہ فسادات کے شکار ہوئے ہیں اور وہ ابھی تک انصاف کا انتظار کررہے ہیں۔

ان مقدمات میں کئی ایسے ہیں جو ممبئی دھماکے کے مقدموں سے بھی لمبے چلے آرہے ہیں اور جو کافی دنوں سے چرچا میں رہے ہیں۔ان مقدمات کے فیصلے میں ہورہی دیری سے مسلمانوں اور سکھوں میں کافی مایوسی ہے اور ان کا کہنا ہے کہ یہ دیری دراصل ان کے خلاف ایک منظّم تعصب ہے۔ممبئی دھماکوں سے متعلق عدالت کے پہلے فیصلے کا ملک بھر میں خیر مقدم کیا گیا لیکن ممبئی کے ماہم علاقے جہاں مسلمانوں کی خاصی آبادی ہے وہاں کا ماحول ایسا نہیں تھا۔

یہ وہ علاقہ ہے جہاں میمن برادری کے لوگ رہتے ہیں اور اس خاندان کے چار اہم افراد اس معاملے میں قصوروار قرار دیئے گئے ہیں۔میمن گھرانے کے پڑوسیوں کو عدالت کے فیصلے پر بھروسہ نہیں ہے۔عابد صدیقی میمن خاندان کے پڑوسی ہیں، عدالت کے فیصلے کی خبر سنتے ہی ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ان کا کہنا ہے کہ حالانکہ عدالت نے میمن

خاندان کے خلاف فیصلہ سنایا ہے، لیکن ہم نہیں مانتے کہ وہ لوگ ممبئی دھماکے میں ملوث تھے۔ان کے رشتے کی بہن حریت صدیقی یہ جاننا چاہتی ہیں کہ ممبئی دھماکے سے قبل ہوئے فرقہ وارانہ فسادات کے مجرموں کے خلاف کب فیصلے ہونگے۔مبینہ طور پر ممبئی کے دھماکے داؤدابراہیم کے اشارے پر کیے گئے تھے، یہ دھماکے بابری مسجد منہدم کیے جانے کے بعد ممبئی میں ہوئے فرقہ وارانہ فسادات کے بعد ہوئے تھے۔اس وقت ملک گیر فرقہ وارانہ فسادات میں کم از کم دو ہزار لوگ مارے گئے تھے۔ممبئی کے فرقہ وارانہ فسادات میں سب سے زیادہ مسلمان ہلاک ہوئے تھے۔اس کے بعد پولیس پر شدید نکتہ چینی ہوئی تھی۔اس پر مسلمانوں کا تحفظ نہ فراہم کرنے کے الزامات لگے تھے۔

اسی طرح ایودھیا میں ہندو نظریاتی تنظیم کے کئی لیڈروں پر تشدد بھڑکانے کا الزام ہے، لیکن کسی کے خلاف ابھی تک کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ممبئی میں ہوئے فرقہ وارانہ فسادات کی جانچ کرنے والے کمیشن نے کئی ملزمین کی پہچان کی تھی لیکن ابھی تک سبھی آزاد ہیں۔

سکھ فرقے کے لوگوں کی حالت بھی مسلمانوں سے الگ نہیں ہے۔سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی کے قتل کے بعد دہلی میں ہوئے فرقہ وارانہ فسادات میں ہزاروں سکھ ہلاک ہوگئے تھے۔ان فسادات کے متاثرین گزشتہ 22 برسوں سے انصاف کے منتظر ہیں۔ان فسادات میں بھی تحقیقات کرنے والے کمیشنوں جن کی تعداد نو ہے، نے کئی مشہور لیڈروں کی پہچان کی تھی جو اس معاملے میں کسی نہ کسی طرح ملوث تھے، لیکن آج تک ان میں کسی کو سزا نہیں ملی۔ایسا لگتا ہے کہ ان تمام معاملات میں کارروائی کرنے میں سیاسی رکاوٹیں کھڑی ہوتی رہی ہیں۔سکھ مخالف فسادات کی جانچ کرنے والے ناناوتی کمیشن کی رپورٹ کے بعد مرکزی حکومت نے متعلقہ ریاستی حکومت سے صرف اتنا کہا ہے کہ وہ فسادات میں ملوث لوگوں کے خلاف کارروائی کرے۔ان فسادات میں کئی کانگریسی لیڈر کے ملوث ہونے کی بات سامنے آئی ہے۔ممبئی فسادات کی جانچ کرنے والے شری کرشنا کمیشن کی رپورٹ کو شیو

سینا حکومت نے ماننے سے انکار کردیا۔اس کے بعد کانگریس کی حکومت آئی، لیکن آج تک اس معاملے میں آگے کوئی کارروائی نہیں ہوئی ہے۔اسی طرح انیس برس قبل میرٹھ کے قریب ہاشم پور میں چالیس مسلمان ہلاک کردیے گئے۔اس معاملے میں 19 پولیس اہلکاروں پر الزام لگے۔معاملہ ابھی تک عدالت میں ہے اور تمام پولیس اہلکار ابھی بھی نوکری کررہے ہیں۔

تو سوال یہ ہے کہ ان حالات کا ذمہ دار کون ہے؟ مبصرین کا کہنا ہے کہ ان معاملوں میں عام طور پر سیاسی عزم کی کمی ہے اور یہ اس کی سب سے بڑی وجہ ہے۔کیونکہ فسادات سے متاثرہ لوگوں کیلئے سرکار ہی وکیل فراہم کرتی ہے اور یہ بات کافی حد تک وکیل پر منحصر کرتی ہے کہ وہ معاملے کو عدالت میں کیسے رکھتا ہے۔اس لیے حکومت کے عزم کی عکاسی وکلاء کے کام سے ہوجاتی ہے۔

سن 1989 میں بہار کے بھاگل پور میں ہوئے فسادات کی رپورٹ لالو پرساد کی حکومت کے دور میں پیش کی گئی تھی۔اس معاملے میں مقامی عدالت میں 14 لوگوں کے خلاف کارروائی ہوئی لیکن ثبوت کی کمی کے باعث ابھی بھی 22 لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوسکی۔

انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والوں کی نظروں میں یہ سراسر حکومت کی جانبدارانہ رویے کا نتیجہ ہے۔میمن کے پڑوسی ممبئی دھماکے پر فیصلہ کے متعلق کہتے ہیں کہ ’کیا یہ حکومت کے جانبدارانہ رویے کی مثال نہیں ہے‘؟

☆☆

ممبئی فسادات کے مجرم
ابھی تک آزاد کیوں ہیں؟

● مظفر سلطان لونگی

فرقہ وارانہ فسادات ہندوستانی سیاست کا ایک ایسا ناسور ہے کہ جس کا جوں جوں علاج کیا جاتا ہے ناسور گہرا ہوتا جاتا ہے۔ جرم گو نہایت سنگین ہے، لیکن اپنی منفرد نوعیت کے باعث فرقہ وارانہ فساد کے جرائم کا نہ تو اندراج ہوتا ہے اور نہ ہی تفتیش، جب پولیس کیس درج ہی نہیں کی گئی تو تفتیش کا سوال کیسے پیدا ہوگا، اور خطا کار آزادانہ گھومتے اور فرقہ پرستوں کے حلقوں میں اپنے جرم کا اعلانیہ ذکر کرتے ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات کے مجرموں کو سزا دینے کے معاملہ میں حکومت بے بس دکھائی دیتی ہے، لیکن حکومت کو فساد زدگان کے آنسو پونچھنے کے لئے کچھ کرنا ہی پڑتا ہے، لہذا انکوائری کمیشن بٹھایا جاتا ہے، جو کاروائی شروع کرنے ہی میں غیر معمولی تاخیر کرتا ہے، اور رپورٹ تکمیل کرتے کرتے اپنی میعاد میں بار بار توسیع کرواتا ہے۔ بالآخر جب وہ رپورٹ پیش کرتا ہے تو تب تک یا تو حکومت فرقہ پرست پارٹیوں کے ہاتھ میں چلی گئی ہوتی ہے یا پھر نام نہاد سیکولر حکومت رپورٹ کا جائزہ لینے میں ہی پورا وقت لے لیتی ہے، یعنی فرقہ وارانہ فسادات سے متعلق کسی انکوائری کمیشن کی رپورٹ پر عمل کی شبھ گھڑی آتی ہی نہیں۔ مثال کے طور پر سنہ 1993 کے ممبئی فسادات کی تحقیقات کے لئے مقرر کردہ سری کرشنا کمیشن جس کی رپورٹ مہاراشٹرا حکومت نے سرد خانہ میں رکھ چھوڑی ہے، اور اب تک اس رپورٹ کی سفارشات پر عمل نہیں کیا گیا، لیکن مہاراشٹرا کی موجودہ کانگریس این سی پی حکومت بار بار یہ تاثر دینے کی کوشش کرتی رہی ہے کہ وہ سری کرشنا کمیشن کی سفارشات پر عمل کرنے ہی

والی ہے۔ اب تازہ تاثر یکم فروری کو دیا گیا تھا، جب مہاراشٹرا کے وزیر داخلہ آر آر پاٹل ''این سی پی'' نے کہا کہ سری کرشنا کمیشن کی رپورٹ پر اقدام کیا جارہا ہے، لیکن ایک ہی سانس میں انھوں نے یہ بھی کہا کہ چونکہ وقت اتنا بیت چکا ہے کہ گواہوں کو تلاش کرنا مشکل ہوگیا ہے۔ کوئی یہ نہیں کہتا کہ تاخیر کے اسباب کیا تھے؟ مبینہ طور پر یہ کہا جارہا ہے کہ سری کرشنا رپورٹ کی تعمیل میں تاخیر جان بوجھ کر کی جارہی ہے، کیونکہ مہاراشٹرا کی مخلوط حکومت کے وزیر اعلی کانگریس کے ہیں، لیکن اس معاملے میں بے بس ہیں۔ کمیشن کی سفارشات پر عمل وزیر داخلہ کی ذمہ داری ہے، اور وزیر داخلہ آر آر پاٹل این سی پی سے متعلق ہیں اور این سی پی صدر شرد پور کے شیوسینا لیڈر مرحوم بال ٹھاکرے سے قریبی روابط رہے ہیں، اور وہ بال ٹھاکرے کے لئے دل میں نہایت نرم گوشہ رکھتے ہیں، کانگریس کو توقع ہے کہ سری کرشنا رپورٹ کی تکمیل میں تاخیر یا عدم تکمیل کے نتیجہ میں کانگریس مسلم ووٹوں سے محروم ہوجائیگی۔ اپنے مسلم ووٹ بینک کو وعدوں کے حصار میں محفوظ رکھنے کے لئے وزیر اعلی نے ریاست کے مسلم لیڈروں کی ایک میٹنگ طلب کی اور سری کرشنا کمیشن کی سفارشات پر بہت جلد عمل کرنے کا وعدہ کیا۔ سوال یہ ہے کہ سری کرشنا رپورٹ کی سفارشات پر عمل میں یہ ٹال مٹول کیوں کی جارہی ہے؟ اس کی صرف ایک وجہ ہے کہ رپورٹ میں شیوسینا کے کارکنوں اور لیڈر کو ممبئی کے مسلمانوں کے جان کی ہلاکت اور مال کی تباہی کے لئے ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے، کیونکہ شرد پوار کے لئے مہاراشٹرا پر آہنی گرفت باقی رکھنے شیوسینا کا سہارا چاہیے، وہ اس رپورٹ کی تکمیل میں صرف تاخیر یا غیر معمولی تاخیر ہی نہیں چاہتے بلکہ سرے سے تعمیل ہی نہیں چاہتے۔ شیوسینا کے موجودہ صدر رادھو ٹھاکرے نے دھمکی بھی دی ہے کہ اگر سری کرشنا رپورٹ پر عمل کیا گیا تو مہاراشٹرا بھڑک اٹھے گا۔ مہاراشٹرا کے بی جے پی لیڈروں نے بھی دھمکی دی ہے کہ اگر 93 کے ممبئی فسادات کے مقدمات دوبارہ کھولے گئے تو اس کا فائدہ فرقہ پرست طاقتوں یعنی بی جے پی اور شیوسینا ہی کو ہوگا۔ جیسا کہ حالیہ گجرات اسمبلی انتخابات میں گودھرا فساد کے ذمہ دار نریندر مودی کو "موت کا سوداگر قرار دینے سے ہوا۔

☆☆

آہ! بابری مسجد

● نصراللہ مہر

ہاں اے فغانِ بابری، پرسوز ہے تیرا بیاں
دل کے افق پر چھا رہا ہے تری آہوں کا دھواں
کیا تیرے اونچے گنبدوں پر کفر نے یلغار کی
تو ہی بتا یہ کیا ہوا اے سجدہ گاہِ غازیاں
محراب تھی، منبر تھا، گنبد تھے تیرے مینار تھے
اک پرشکن تہذیب کا چہرہ تھے ترے جسم و جاں
صدیوں تلک تیری زمیں پر عشق نے سجدے کیے
تو ارتکازِ عشق کی اک داستاں در داستاں
تیرا شکوہ کھویا گیا، میرا بھرم جاتا رہا
تو تھی شکوہ ملتِ اسلامیہ کی پاسباں
یہ دل ابھی بھولا نہیں تھا قبلۂ اول کا دکھ
کیسے مٹاؤں گا میں اب ان تازہ زخموں کے نشاں
تیرے نمازی آج تیرے صحن میں دیکھے نہیں
گونجی نہیں ہے آج بھی تیرے موذن کی اذاں
جانے کہاں پر رہ گئے ہیں کوئی بھی پہنچا نہیں
وہ تیرا بابر، ترا عالمگیر، تیرا شاہ جہاں

گجرات فسادات پر سیاست

● ابوشامل

ممبئی فسادات کے بعد جو مسلم اور پاکستان مخالف رجحان بھارت میں تقویت پاتا جارہا ہے اس سے یہ بات بالکل عیاں ہوکر سامنے آگئی ہے کہ بھارت میں اگلے انتخابات میں مسلم مخالف اور پاکستان دشمن جذبات پر سیاست کھیلی جائے گی اور گزشتہ دنوں چند بیانات سے بھارتی سیاسی منظرنامے میں ہلچل مچادی ہے۔

گزشتہ دو دہائیوں میں بھارت نے اقتصادی سطح پر جو ترقی کی اس نے مسلسل اس تاثر کو تقویت پہنچائی کہ بھارت اب تنگ نظری وانتہا پسندی کی دلدل سے نکلتا جائے گا اور اقتصادی مجبوریاں اس کی پاؤں کی بیڑیاں بنیں گی۔ لیکن 2002ء کے گجرات فسادات نے ان تمام خوش فہمیوں کا خاتمہ کردیا اور حالیہ واقعات کے بعد ایسا لگتا ہے کہ مستقبل کا بھارت ہندو انتہا پسندوں کے رحم وکرم پر ہوگا۔ سرکاری سرپرستی میں ہونے والے مسلم کش گجرات فسادات اس حقیقت کا اظہار تھا کہ بھارت انتہا پسندی کے آتش فشاں پر بیٹھا ہے۔

گجرات فسادات میں حکومتی کردار اس قدر واضح تھا کہ اس سے نظریں چرانا ممکن ہی نہیں خصوصاً ریاستی وزیراعلیٰ نریندر مودی کے بیانات اس حقیقت کا کھلا اظہار تھا کہ وہ اور ان کی جماعت (بھارتیہ جنتا پارٹی) بھارت کو صرف اور صرف ایک ہندو ریاست کے طور پر دیکھنا چاہتی ہے۔ گجرات فسادات میں ڈھائی ہزار مسلمانوں کا قتل عام اور ہزاروں کے سماجی مقاطعے (social boycott) کے واقعات ’’دمکتے بھارت‘‘ کے اصل چہرے کو

بے نقاب اور وہاں کے مسلمانوں کی حالت زار کو بیان کرنے کے لیے کافی تھے۔

گجرات فسادات اور کشمیر میں انسانی حقوق کی بدترین خلاف ورزیاں اس ردعمل کا باعث بنیں جسے ''مسلم انتہاپسندی'' کا نام دیا گیا۔لیکن سالِ گزشتہ کے اواخر میں ممبئی حملوں کے بعد ہندوتوا کے علمبرداروں کو پاکستان کی آڑ میں مسلم دشمنی کا نیا موقع ملا۔اور اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے لیے اگلے انتخابات کا انتظار کیا جارہا ہے اور تب تک ''پاکستان مخالف بیانات'' کا سلسلہ جاری رکھا جائے گا۔

اگر صرف ریاست گجرات کے تناظر میں بات کی جائے تو بھارت کی موجودہ اقتصادی ترقی میں ریاست گجرات بلاشبہ بہت اہمیت کی حامل ہے اور اس اہم ریاست میں ہندو انتہا پسندوں کا اثر ورسوخ بھی کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ وزیراعلیٰ نریندر مودی گزشتہ تین ادوار سے اقتدار کے سنگھاسن پر بیٹھے ہیں اور اب لگتا ہے کہ پاکستان اور مسلم دشمنی کے موجودہ رجحان سے فائدہ سمیٹنے کے لیے بھارت کی انتہاپسند ہندو قیادت کی نگاہیں انہی پر جاٹھہری ہیں۔ بھارتی معیشت کے دو بڑے ناموں سنیل متل اور انل امبانی نے بھارتی ریاست گجرات کے وزیراعلی نریندر مودی کو قومی سطح کا رہنما قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ وہ بھارت کی مستقبل کی قیادت ہیں۔ دونوں کاروباری شخصیات گجرات میں منعقدہ چوتھی ''وائبرینٹ گجرات گلوبل انوسٹرز سمٹ'' سے خطاب کر رہی تھیں۔

انیل امبانی نے کہا کہ نریندر بھائی کی زیر قیادت گجرات نے تمام شعبوں میں زبردست ترقی کی ہے اس لیے تصور کیجیے کہ جب وہ بھارت کی قیادت کریں گے تو کیا ہوگا۔ ان جیسی شخصیت کو تو ملک کا اگلا رہنما ہونا چاہیے۔انہوں نے کہا کہ میرے والد دھیرو بھائی کہا کرتے تھے کہ ''مودی تو لمبی ریس کا گھوڑا ہے۔''

بھارتی متل نے کہا کہ ''وزیراعلی مودی سی ای او کے طور پر جانے جاتے ہیں درحقیقت وہ سی ای او نہیں ہیں کیونکہ وہ کسی ادارے یا شعبے کو نہیں چلاتے۔ وہ ایک ریاست کو چلا رہے

ہیں اور ملک کو بھی چلا سکتے ہیں۔''

دونوں اہم شخصیات کے اس بیان نے بھارتی سیاست کے میدانوں میں زلزلہ برپا کر دیا ہے۔ اور لگتا ہے کہ اگلے انتخابات کے لیے دونوں اہم سیاسی جماعتیں پاکستان اور انتہاپسندی کی آڑ میں مسلم مخالف کارڈ کھیلیں گی اور نریندر مودی کے حوالے سے جاری بیانات اس کا واضح اظہار ہیں۔ کانگریس ہرگز یہ نہ چاہے گی کہ پاکستان مخالف رجحان کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بی جے پی اسے اقتدار سے نکال باہر کرے جبکہ بی جے پی کی پوری کوشش ہے کہ وہ اس موقع کا بھرپور فائدہ اٹھائے۔کانگریس نے متل اور امبانی کو کہا ہے کہ وہ کسی بھی قسم کا بیان دینے سے پہلے ''گجرات قتل عام'' کو ذہن میں رکھیں۔کانگریس نے یہ بھی الزام لگایا ہے کہ مودی کی حکومت ''معصوم لوگوں کی لاشوں'' پر کھڑی ہے۔

موقر بھارتی روزنامے ہندوستان ٹائمز نے بھی ذرائع کے حوالے سے کہا ہے کہ بی جے پی کی نچلی سطح کی قیادت نریندر مودی کو وزارت عظمیٰ کا امیدوار دیکھنا چاہتی ہے اور انہوں نے اس یقین کا اظہار کیا ہے کہ مودی کے امیدوار ہونے کی صورت میں انہیں 30 فیصد سے زیادہ ووٹ ملیں گے۔

آثار کہہ رہے ہیں کہ ان بیانات کے نتیجے میں بی جے پی میں زبردست اکھاڑ پچھاڑ ہوسکتی ہے اور ''نئی قیادت'' سامنے آسکتی ہے جو اگلے انتخابات میں کانگریس جیسی نام نہاد ''سیکولر'' تنظیم کی بہت سخت حریف ثابت ہوگی۔

خوف کے بادل چھٹنے لگے؟

2002ء میں گجرات فسادات کے بعد اب ریاست کے مسلمان آہستہ آہستہ خوف کے سائے سے پیچھا چھڑا رہے ہیں۔معروف بھارتی روزنامے ہندوستان ٹائمز کی خبر کے مطابق فسادات کے 6 سال بعد اب ریاست کے مسلمان اب خاص نمبر پلیٹوں کی نیلامی میں ایک مرتبہ پھر ۷۸۶ کے حصول کی کوششیں کرتے دکھائی دے رہے ہیں۔ جسے ''بسم اللہ

الرحمن الرحیم‘‘ کا متبادل سمجھا جاتا ہے۔

فسادات سے قبل مسلمان زیادہ سے زیادہ بولی لگا کر اپنی گاڑیوں کے لیے ایسی نمبر پلیٹیں حاصل کیا کرتے تھے لیکن 2002ء کے اوائل سے ایسی نمبر پلیٹوں کی نیلامی روک دی گئی تھی جن پر 786 درج ہوتا تھا اور ان فسادات کے بعد ریاست میں پیدا ہونے والی صورتحال کے باعث مسلمان اپنی شناخت چھپانے اور ہندو انتہا پسندوں کے عتاب کا نشانہ بننے سے بچنے کے لیے ایسی نمبر پلیٹوں سے گریز کرنے لگے۔

اخبار کے مطابق گزشتہ ماہ ہونے والی ایک نیلامی میں مسلمان ایک مرتبہ پھر 786 کے حصول کے لیے کوشاں دکھائی دیے اور پرویز شیخ نامی ایک مسلمان نے نیلامی میں 4186 روپے کی ادائیگی کر کے اپنی موٹر سائیکل کے لیے 786 کے نمبر کی حامل پلیٹ حاصل کر لی۔

بھارتی گجرات میں 2002ء فسادات کے بعد مسلمانوں کی حالت کی بہتری کے لیے کیا اقدامات اٹھائے گئے؟ اور کیا اٹھائے جا رہے ہیں؟ اور کیا واقعی ریاست گجرات میں صورت حال میں بہتری آ رہی ہے؟ کیا دو ہزار مسلمانوں کے قتل عام کو اتنی آسانی سے بھلایا جا سکتا ہے؟ کیا آج بھی اسی وزیر اعلیٰ کی موجودگی میں مسلمان سکھ کا سانس لے سکتے ہیں؟ کیا 786 نمبر والی تختیوں کی نیلامی اس امر کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جو آج بھی ہر اس شخص کے ذہن میں ابھر رہے ہیں جو خود کو امت واحدہ کا حصہ سمجھتا ہے۔

☆☆

گجرات میں مسلمانوں کا قتل عام

● عابد انور

گجرات میں قتل عام کے دس سال پورے ہو رہے ہیں۔ان دس برسوں کے دوران قومی سطح سے لے کر بین الاقوامی سطح پر بھارتیہ جنتا پارٹی کی نریندر مودی حکومت پر زبردست تنقید اور مذمت کی گئی ،اسے انسانیت دشمن قرار دیا گیا لیکن مودی پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ سپریم کورٹ نے بارہا مودی پر سخت تبصرے کئے لیکن مودی کے کان پر جوں تک نہ رینگی اور وہ تمام ہدایات اور ضابطوں کو انگوٹھا دکھاتا آیا۔اب تک کسی خاطی کو سزا نہیں دی گئی۔ جتنے پولیس افسران نریندر مودی کے حکم کو بجانے لانے میں ملوث تھے وہ ترقی کرتے رہے۔جن افسران نے بھی تھوڑی سی سچ بات بولنے کی کوشش انہیں زنداں میں ڈال دیا گیا۔آج درجنوں افسر مودی کے عتاب کے شکار ہیں۔ گجرات قتل کے دوران اور اس کے بعد جن لوگوں نے بھی رضا کارانہ طور پر متاثرین کو راحت پہچانے کی کوشش کی مودی حکومت ان کا قافیہ تنگ کر دیا گیا۔مثال کو طور پر مولانا عمر خاں آئی پی ایس افسر سنجیو اور سماجی کارکن تیستا سیتلواڈ‘ جنہیں مودی حکومت نے تنگ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ مولانا عمر کو تو گودھرا ٹرین حادثہ کا اہم ملزم بنا کر طویل عرصہ تک جیل میں بند رکھا اور کچھ عرصہ قبل ہی بری ہوئے ہیں۔سنجیو بھٹ کو بھی معطل کر کے ایک معمولی کانسٹبل کی شکایت پر جیل میں ڈال دیا گیا لیکن جب سنجیو بھٹ نے نریندر مودی کے سیاہ کارنامے اور گجرات قتل عام میں مودی کے کردار پر ثبوت پیش کیا تو اس کو تسلیم کرنے بجائے عدلیہ اور حکومت کی مشنری اپاہج بن

گئی۔تیستا سیتلواڈ پر مقدمہ قائم کرکے پریشان کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ وہ مظلومین کے لئے حصول انصاف کی جنگ ترک کردیں،جس پر سپریم کورٹ نے بھی مودی حکومت کو سخت سست اور پھٹکار لگائی ہے۔سپریم کورٹ نے حالیہ دنوں میں کہا ہے کہ گجرات کی حکومت 2002 کے فسادات سے متعلق ’سو فیصدی فرضی کیس میں، سماجی کارکن تیستا سیتلواڈ کو نشانہ بنا رہی ہے۔جسٹس آفتاب عالم اور جسٹس رنجنا پرکاش دیسائی پر مشتمل بنچ نے یہ ریمارکس تیستا سیتلواڈ کی ایک پٹیشن پر سماعت کے دوران دیے۔تیستا سیتلواڈ گجرات کے فسادات کے متاثرین کو انصاف دلوانے کے لیے طویل عرصے سے جدوجہد کر رہی ہیں۔گجرات کی حکومت نے تیستا پر 2002 کے فسادات میں مارے جانے والے کچھ افراد کی لاشوں کو غیر قانونی طور پر قبریں کھودوا کر نکلوانے کا الزام لگایا تھا۔عدالت عظمیٰ نے سخت تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ سو فیصد فرضی کیس ہے جو درخواست گزار کو ہراساں کرنے کے لیے قائم کیا گیا ہے۔یہ لاشیں ان لوگوں کی تھیں جو فسادات کے دوران ہلاک کئے گئے تھے اور کوئی قانونی کارروائی کئے بغیر ثبوت مٹانے کے لئے اجتماعی قبروں میں دفنا دیا تھا۔

اس قتل عام کو دس سال پورے ہو رہے ہیں لیکن ان دس برسوں میں اب تک مظلوم حصول انصاف سے کوسوں دور ہیں۔ان دس برسوں میں گجرات کو نریندر مودی نے مسلمانوں کے لئے ایک بڑے جیل کی شکل میں ضروری تبدیل کردیا۔ ناناوتی کمیشن کچھوے کی چال سے تحقیقات کر رہی ہے۔دس سال عرصہ میں کسی کو سزا نہیں ملی ہے اور نہ متاثرین کے زخم پر مرہم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس پر بھی عدالت عظمیٰ کو پھٹکار لگاتے ہوئے متاثرین کو مناسب معاوضہ دینے کا حکم دیا ہے۔گجرات کے متاثرین اور عام لوگوں سے بات کی جاتی ہے تو عام طور پر سب ہی ناانصافی کی شکایت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کچھ نہیں بدلا ہے جس طرح مسلمانوں کے تئیں تعصب عام تھا وہ اب بھی ہے۔مسلمانوں کو اب بھی کسی پاش کالونی میں مکان خریدنا دوبھر ہے، امتیازی سلوک عام بات ہے، مرکز نے

گجرات کے مسلمانوں کو انصاف دلانے میں کوئی مثبت قدم نہیں اٹھایا۔مسلمان مشترکہ آبادی میں اپنے آپ کو محفوظ نہیں پاتے وہ ان ہی علاقوں میں گھر لینا پسند کرتے ہیں جہاں مسلمان رہتے ہیں۔حکومت کے تمام شعبوں میں مسلمانوں کے ساتھ تعصب اور ناروا سلوک عام بات ہے۔گودھرا میں سابرمتی ایکسپریس کے ڈبے ایس چھ جلائے جانے کے الزام میں نوے سے زیادہ لوگوں کو گرفتار کیا گیا تھا جس میں سے تریسٹھ افراد گزشتہ ایک برس پہلے اس لیے رہا کر دیے گئے تھے۔کیونکہ وہ بے قصور تھے۔اکتیس افراد اب اس الزام میں جیل میں ہیں۔جن افراد کو رہا کیا گیا ہے ان کے نو سال برباد ضرور ہو گئے۔اس کا ذمہ دار کون ہوگا۔63 خاندان جس کرب میں مبتلا رہا اور جس تکلیف سے ان خاندانوں کو گزرنا پڑا اس کا حساب کون دے گا۔گودھرا کے مسلمان میڈیا سے بے حد ناراض دکھائی دیتے ہیں بار بار درخواست کیے جانے کے بعد ایک ہی جواب دیتے رہے کہ ’ہمیں میڈیا سے کوئی بات نہیں کرنی، میری تصویر نہ کھینچنا، مجھے بالکل بات نہیں کرنی۔ان گرفتار شدگان اور رہا ہونے والے اپنی گزر و بسر مزدوری کر کے کرتے ہیں۔جب یہ جیل میں تھے ان کی بیویاں اپنا گزارہ مزدوری کر کے کرتی تھیں۔گودھرا ٹرین حادثہ میں گرفتار کئے گئے گیارہ افراد کا تعلق غریب طبقہ سے ہے۔جن کی عورتیں گھروں میں برتن مانجھتی ہیں۔

ان دس برسوں میں مودی حکومت کے خلاف عدالت عظمیٰ، بین الاقوامی انسانی حقوق تنظیموں اور دیگر پلیٹ فارموں پر کئے تبصرے بھی اس بات کے گواہ ہیں کہ مودی نے فسادیوں کو سزائے موت دلانے کے بجائے انہیں بچانے میں اپنا سارا وقت گزارا ہے۔ گجرات مظلومین کی مودی کی بے حسی سے تنگ آکر سپریم کورٹ نے مودی کو جم کر پھٹکارا اور سخت تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ’’اگر انصاف نہیں دے سکتے تو گدی چھوڑ دیں‘‘۔ جسٹس وی این کھرے جسٹس برجیش کمار اور جسٹس ایس پی سنہا پر مشتمل بینچ نے گزشتہ کچھ برس قبل ایک کیس کی سماعت کرتے ہوئے گجرات کے چیف سکریٹری اور ڈائرکٹر جنرل

پولیس کو عدالت میں طلب کر کے پوچھا تھا کہ ماتحت عدالت میں ملزمان کے بری کئے جانے کے خلاف ہائی کورٹ میں آنکھ میں دھول جھونکنے والی اپیل کیسے دائر کی۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل نے 2004 کی اپنی سالانہ رپورٹ میں فسادیوں کو سزا نہ دینے پر مودی کو جم کر لتاڑا تھا۔اس تنظیم نے مودی کو اس کے لئے بھی سخت تنقید کا نشانہ بنایا کہ انفرادی طور پر درج کرائے جانے والے 4252 شکایات میں سے 2032 پر کارروائی کیوں بندی کردی گئی۔امریکی کانگریس کی جانب سے قائم بین الاقوامی آزادی مذہب کمیشن نے آر ایس ایس اور بی جے پی حکومت پر سخت ضرب لگاتے ہوئے حکومت ہند سے مطالبہ کیا تھا کہ 2002 کے گجرات فسادات کے ذمہ داروں کو سزا دے کر ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی روایت کو زندہ رکھے۔اس کمیشن میں ہندوستان میں مذہبی آزادی پر تشویش ظاہر کرتے ہوئے مذہبی منافرت پر ہونے ہندو انتہا پسندوں کے حملے کو موجب تشویش قرار دیا تھا۔اس کمیشن نے بی جے پی حکمرانی والی ریاست کی صورت حال کا خاص طور پر ذکر کیا تھا۔اسی طرح کا سامنا نریندر مودی کو اس وقت بھی کرنا پڑا تھا جب وہ برطانیہ کے دورے پر گئے تھے، لیکن وہ اس طرح کے ہر سوال کو بے شرمی سے ٹال گئے۔انسانی حقوق کی تنظیموں نے گجرات فسادات میں خواتین بطور حکمت عملی جنسی تشدد کے استعمال پر بھی تشویش کا اظہار کیا تھا۔بین الاقوامی برادری نے ان تنظیموں سے اپیل کی تھی کہ اس پر جلد از جلد روک لگائی جائے اور اس کے خلاف قانون وضع کیا جائے۔دہلی یونیورسٹی کی پروفیسر اوما چکرورتی نے گجرات فسادات میں مسلم خواتین کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا کہ فسادات کے دوران فسادیوں نے عورتوں کے چھاتیوں پر ضرب لگائیں ان کے جنسی اعضا کو نشانہ بنایا اور حاملہ عورتوں کے پیٹ تک چاک کئے گئے۔انہوں نے کہا تھا کہ اتنے بڑے پیمانے پر مسلم خواتین کے ساتھ اس طرح کے واقعات بغیر ملی بھگت کے نہیں ہو سکتے۔

گجرات فسادات کے بعد مسلمانوں کو نہ صرف مخصوص اور چند علاقوں تک محدود

ہونے کے لئے مجبور کیا گیا بلکہ ان پر روزگار کے دروازے بھی بند کئے گئے۔سرکاری اسکیموں کے تحت ملنے والے فوائد سے یکسر مسلمانوں کو دور رکھا گیا۔اس رویہ پر 2006 میں قومی اقلیتی کمیشن اور مارکسی کمیونسٹ پارٹی نے آواز بلند کی تھی۔سی پی آئی ایم نے وزیراعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ کو خط لکھ کر اس کے خلاف شکایت کی تھی وہیں قومی اقلیتی کمیشن نے گجرات حکومت کو نوٹس بھیج کر جواب طلب کیا تھا۔ابھی متاثرین کا پورا خاندان اپنے گھر نہیں لوٹ سکا ہے۔2007 میں حکومت گجرات نے اعتراف کیا تھا کہ تین ہزار 600 مسلم خاندان عارضی کیمپوں میں مقیم ہے۔بہت سے خاندان اب بھی اپنے گھروں کو واپس نہیں ہو سکے ہیں، کیوں کہ انہیں خوف ہے ان کے ساتھ تعصب یا زیادتی کی جائے گی۔جو خاندان خوش حال ہے، انہوں نے اپنا ٹھکانہ کسی دوسری جگہ منتقل کر لیا لیکن جو لوگ خستہ حالت میں ہیں وہ گھٹن بھری زندگی جینے پر مجبور ہیں۔ابھی بیشتر خاندان کو معاوضہ تک نہیں ملا جس پر گزشتہ دنوں سپریم کورٹ نے مودی حکومت جم کر پھٹکار لگائی ہے۔حیرانی کی بات تو یہ ہے کہ بہت سے خاندان کو اب تک موت کی سرٹی فیکیٹ بھی نہیں ملی ہے جس سے معاوضہ اور دیگر سہولت کی کارروائی آگے بڑھتی ہے۔نرودا پاٹیا میں جہاں نوے (۹۰ر) افراد کا قتل کیا گیا تھا اور بیشتر مکانات جلا دیے گئے تھے، بہت سے مکینوں کا کہنا ہے خوف کے سائے میں رہنے کو مجبور ہیں۔ بہت سے خاندان کو ان علاقوں میں مجبوراً واپس آنا پڑا جہاں ان کا سب کچھ لٹ گیا تھا۔ان دس برسوں کے دوران گواہوں کو ڈرانے دھمکانے اور انصاف کی راہ میں مودی حکومت کے روڑے اٹکانے کے علاوہ دوسرا کوئی قابل ذکر کام نہیں ہوا۔

یہ بات اب پوری طرح صاف ہوگئی ہے کہ گجرات میں ہوئے فسادات، فسادات نہیں تھے بلکہ یہ مسلمانوں کی منصوبہ بند اور پہلے سے طے شدہ نسل کشی اور نسلی تطہیر تھی۔اس کا مقصد مسلمانوں کا مکمل صفایا تھا جس کی نہ صرف ہندوستان کے انصاف، امن پسند،

انسانیت نواز افراد نے بلکہ بین الاقوامی برادری نے مسلمانوں کے خلاف محاذ کھول رکھا ہے لیکن جب حد سے زیادہ ظلم وستم جبر واستبداد میں اضافہ ہوا اور خواتین کے ساتھ بڑے پیمانے پر اجتماعی عصمت دری ہو تو دشمنوں کو بھی مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اس کی مخالفت اور مذمت کرے۔ بین الاقوامی برادری نے بھی یہی کیا ہے۔ جب انہوں نے مظالم حیوانیت وحشت وبربریت کے تمام ریکارڈ ٹوٹتے ہوئے دیکھا تھا تو وہ بھی اس کے خلاف بولنے پر مجبور ہوئے تھے اور ہندوستان کی بی جے پی حکومت پر سخت تنقید کی۔ جس کی وجہ سے مرکزی حکومت چراغ پا ہوگئی اور گجرات میں مسلمانوں کی نسل کشی کو اپنا اندرونی معاملہ قرار دیا تھا۔ گودھرا سانحہ کے بعد گویا سنگھ پریوار (آر ایس ایس) کو مسلمانوں کے قتل عام کا لائسنس مل گیا تھا اور انہوں نے نریندر مودی حکومت اور بی جے پی کی مرکزی حکومت کی رضامندی سے اپنی انسانیت اور ثقافتی تنظیم ہونے کا ثبوت پیش کرتے ہوئے محلوں، سوسائٹیوں کے ساتھ مکینوں کو بھی زندہ جلا ڈالا۔ جس طرح منظم طریقہ سے یہ فساد ہوا تھا اور پولیس خاموش تماشائی بنی رہی تھی اور نریندر مودی نے پولیس اور انتظامیہ کی کاروائی کو اطمینان بخش بتلایا تھا اور اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ سنگھ پریوار کو مسلمانوں کے قتل عام کی کھلی چھوٹ ملی ہوئی تھی اور فسادی آرام سے چن چن کر مسلمانوں کو قتل کرتے رہے تھے۔ گجرات سانحہ کا سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اس بار پڑھے لکھے لوگ گاڑیاں لیکر آتے تھے اور دکانوں، مکانوں کو لوٹ کر اس میں آگ لگا دیتے تھے۔

ملک کی تاریخ میں یہ پہلی بار ہوا تھا کہ مسلمانوں کے قتل عام اور نسل کشی کو پارلیمنٹ میں جائز ٹھہرایا گیا تھا اور ظلم کو ظلم نہیں کہا گیا تھا بلکہ اسے جائز ٹھہرانے کے لئے بہانے تلاش کئے گئے تھے اور اس موقع پر نام نہاد سیکولر جمہوریت پسند پارٹیاں بے نقاب ہوگئی تھیں۔ حالانکہ ہندوستان کے ہر محبّ وطن نے جس طرح سنگھ پریوار اور ریاست کی بی جے پی حکومت کو مورد الزام ٹھہرایا تھا وہ بی جے پی اور نریندر مودی کی آنکھ کھولنے کے لئے کافی تھا،

لیکن جو فاشسٹ حکومت ہوتی ہے وہ ان آوازوں کی پرواہ نہیں کرتی۔ یہی ریاستی اور اس وقت کی مرکزی حکومت نے کیا تھا جس میں بہار کے وزیر اعلیٰ نتیش کمار بھی شامل تھے۔ فاشسٹ کی یہی پہچان ہوتی ہے کہ وہ کسی مخالفت کو برداشت نہیں کرتے اور ہر وقت انتقامی کاروائی پر آمادہ ہوتے ہیں۔ سنگھ پریوار کے شاکھاؤں کے زہریلے ماحول، نفرت کرنے کی تعلیم وتربیت اور مسلم دشمنی ومسلم کشی کی بھٹی سے نکلے بی جے پی کے وزراء کیوں کر مسلمانوں کے ہمدرد ہو سکتے تھے اور یہ امید رکھنا کہ اپنے شاکھاؤں کے پروردہ کے خلاف کوئی کاروائی کریں گے احمقوں کی جنت میں رہنے کے مثل ہے۔ چاہے ساری دنیا شور کیوں نہ مچاتی پھرے۔ یہی اس وقت گجرات میں ہے اور اس وقت این ڈی اے کی حکومت میں تھی۔

اس پر یقین نہیں ہوتا لیکن یہ سچ ہے کہ بی جے پی کے کچھ ممبران پارلیمنٹ نے گجرات میں مسلمانوں کے قتل عام کو انصاف پر مبنی بتایا تھا۔ ان ممبران پارلیمنٹ کا کہنا تھا کہ فرقہ وارانہ فساد ہندوؤں کے ردعمل کا ہی ایک حصہ ہے۔ کئی بھاجپا ممبران پارلیمنٹ نے بات چیت کے دوران کہا تھا کہ کیونکہ گودھرا کیس سے ہندوؤں کے جذبات مجروح ہوئے ہیں اس لئے وہ غصے میں سڑکوں پر اتر آئے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ گودھرا میں ۵۸ ریل مسافروں کے قتل پر ہی ہندوؤں نے تشدد کا راستہ اختیار کیا ہے۔ بی جے پی کی اس وقت کی ممبر پارلیمنٹ جیا بین ٹھاکرے نے کہا کہ اپوزیشن لیڈر گودھرا کیس کی مذمت کرنے میں بھی ناکام ہے، جس سے ہندوؤں کے جذبات کو اور دھکا پہنچا۔ انہوں نے کہا کہ جب بے قصور ریل مسافروں کو بے رحمی سے جلا کر مار دیا گیا تو گجرات کا جلنا لازمی ہے۔ انہوں نے کہا کہ فساد ہندو ردعمل کا ہی مشتعل روپ ہے۔ ہندو اپنے بھائیوں اور بہنوں کو زندہ جلتے ہوئے کس طرح دیکھ سکتے ہیں۔ اتر پردیش سے اس وقت کو بی جے پی ممبر پارلیمنٹ سوامی چمیانند نے اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ اپوزیشن لیڈر وی ایچ پی اور اس کے کارکنان کو ہی ہر واقعہ کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ ایسے میں ہندوؤں کے جذبات کو دھکا لگتا

ہے،انہوں نے سوالیہ انداز میں پوچھا تھا کہ سرکار مشتعل بھیڑ کو بھلا کیسے کنٹرول کرسکتی ہے۔ راجیہ سبھا میں اس وقت کے بی جے پی کے لیڈر انترے ڈی دوے نے مسلمان مخالف فساد کو ہندوؤں کے جذبات کا اظہار بتایا۔انہوں نے کہا کہ گودھرا معاملے نے ملک کے ہندوعوام کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔

گجرات میں جو کچھ ہوا تھا اور جو کچھ اس وقت ہو رہا ہے اس کی پیش بندی کئی دہائیوں سے کی گئی تھی خاص طور پر ۱۱/ستمبر 2001 کے بعد جب مسلمانوں کو دہشت گرد اور اسلام کو دہشت گردی کا مذہب قرار دینے کی ناپاک کوشش کی جارہی تھی اس وقت بھی ہندوتو کے علمبردار مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی میں پیچھے نہیں تھے جہاں کوئی واقعہ پیش آتا اسے مسلم مخالف زاویہ سے دیکھا جاتا۔ ہر واقعہ کو مسلمانوں سے جوڑ کر فرقہ پرست تنظیموں نے مسلمانوں کے خلاف پورے ہندوستان میں ماحول بنایا اور نفرت کی دیوار کھڑی کی تھی،جس کا نتیجہ گجرات میں مسلمانوں کا قتل عام سے سامنے آیا تھا۔آر ایس ایس جس کی ۲۴/ذیلی تنظیمیں ہیں اور بھارتیہ جنتا پارٹی اس کا سیاسی بازو ہے مسلمانوں کے خلاف نفرت کا ماحول پیدا کر کے اقتدار پر قابض ہوئی تھی اس کے قابض ہونے میں کچھ نام ونہاد پارٹیاں اور کچھ سابق سوشلسٹ رہنماؤں نے نمایاں کردار ادا کیا تھا- گودھرا سانحہ کے بعد ۲۸/فروری کو گجرات بند کے دوران وی ایچ پی بجرنگ دل اور ہندو جاگرن منچ جیسے سنگھی تنظیموں کو مسلمانوں کے قتل عام کا بہانہ مل گیا۔ان تنظیموں نے کھل کر مسلمانوں کو چن چن کر ان کے مکان دوکان ہوٹلوں وغیرہ سمیت زندہ جلایا۔دور دور تک کہیں پولیس کا نام ونشان تک نہیں تھی جہاں کہیں پولیس موجود تھی وہاں انہوں نے مسلمانوں کے قتل میں برابر کا حصہ لیا تھا۔ ان دہشت گرد تنظیموں کے دفاع میں مسلمان ان سے حفاظت کی درخواست کرتے رہے لیکن پولیس ان کو بچانے کے لئے نہیں پہنچی تھی۔۲۸/فروری کے شام میں ہی فوج پہنچ چکی تھی لیکن فوج کے تعینات کرنے میں میں مودی سرکار نے غیر معمولی تاخیر سے کام لیا تھا۔

گجرات حکومت کی طرح مرکز کی واجپئی سرکار نے بھی فرقہ وارانہ فساد بلکہ نسل کشی روکنے میں لاپرواہی برتی تھی۔ ۲۸/فروری کو ہی مرکزی حکومت کو گجرات میں فسادات کی اطلاعات مل گئی تھی لیکن نہ اس وقت وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی اور نہ ہی وزیر داخلہ ایل کے اڈوانی نے فسادیوں سے سختی سے نمٹنے کا حکم دینے کی ضرورت محسوس کی تھی۔لوک مورچہ جس میں سماجوادی پارٹی کے سابق جنرل سکریٹری مسٹر امر سنگھ رکن لوک سبھا راج ببر،مارکسی کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر سیتارام یچوری اور سابق ممبر پارلیمنٹ شبانہ اعظمی شامل تھیں۔ انہوں نے ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ فساد زدہ علاقوں میں پولیس خاموش تماشائی بنی رہی تھی اور اس نے احمد آباد میں لوٹ مار کے سلسلے کو بند کرانے کے لئے کوئی کارروائی نہیں کی۔انہوں نے الزام لگایا کہ فسادیوں کو ہتھیار اور پیٹرول پولیس کی گاڑیوں سے فراہم کیا جارہا تھا۔

گجرات اور خاص طور پر گودھرا میں کوئی مسلمان لب کھولنے کے لئے تیار نہیں ہے لیکن ان کی آنکھیں بہت کچھ کہہ جاتی ہیں اور ان کے انداز بیان ہاؤ بھاؤ ساری تکلیفیں بیان کردیتے ہیں۔ایک رپورٹ کے مطابق بہت سارے لوگ تو یہاں آپ سے بات ہی نہیں کرنا چاہتے ہیں۔گودھرا بٹا ہوا شہر ہے۔ ہندو اور مسلمانوں کے علاقے واضح طور پر بٹے ہوئے ہیں۔مسلم آبادی والے پلون بازار علاقے میں کیسری چوک ہے وہاں 2005 کے بعد ہر دن ترنگا پرچم لہرایا جاتا ہے۔جھنڈا لہرانے کا کام فاروق کیسری کرتے ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ وزیر اعلی نریندر مودی کے زبردست حمایتی ہیں۔ان کا کہنا ہے ’ادھر لوگوں کا نام بہت بدنام تھا تو 2005 میں یہاں کے ضلع کلکٹر نے کہا یہاں ہر دن ترنگا پرچم لہراؤ تاکہ یہاں کے لوگوں کو یہ پیغام دے سکو کہ آپ بھی ہندوستانی ہیں‘۔گودھرا کے ایک مسلمان نے کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ یہاں کا مسلمان بہت ڈرا ہوا ہے۔اتنا ڈرا ہوا ہے کہ کچھ بولے گا نہیں۔

گجرات میں اگر انصاف کا پرچم بلند کرنا ہے تو سب سے پہلے نریندر مودی کو ان کی اصل جگہ جیل میں ڈالنا ہوگا۔ جب تک بی جے پی کی حکومت وہاں نہیں بدلتی اس وقت انصاف ملنا تو دور کی بات اس کے بارے میں سوچنا بھی دیوانے کے خواب کی مانند ہے۔ ان دس برسوں نے مودی نے گجرات کو مکمل طور پر تعصب، نسلی امتیاز اور ناانصافی کے وائرس میں مبتلا کر دیا ہے اور یہ اس طرح کا خطرناک وائرس ہے کہ اسے فارمیٹ کئے بغیر ختم نہیں کیا جاسکتا۔ گجرات جب بھی انصاف کی امید تھوڑی سی پیدا ہوئی اسی لمحہ انصاف کے سر میں سر ملانے والے مودی کے گود میں نظر آیا۔ گجرات کی آئی پی ایس افسر گیتا جوہری جب سپریم کورٹ کی ہدایت پر نریندر مودی کے خلاف تحقیقات کر رہی تھیں اس وقت لگا اب مودی کو سزا سے کوئی نہیں بچا سکتا لیکن جوں جوں تحقیقات آگے بڑھی گیتا جوہری کو پریشان کیا جانے لگا، ان پر طرح طرح کے الزامات عائد کئے جانے لگے۔ انجام کار انہوں نے مودی کو کلین چٹ دینے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔ ادیب شاعر اور دانشور طبقہ ان سب چیزوں سے خود الگ تھلگ رکھتے ہیں۔ مودی کا وائرس ان طبقوں پر صاف نظر آتا ہے۔ گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ ادیب راجندر شاہ نے بھی گجرات فسادات کو جائز ٹھہرایا تھا۔ انہوں نے گجرات فسادات کو منصفانہ قرار دیا تھا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ کوئی بھی افسر اپنے حاکم کے خلاف نہیں جاسکتا۔ یہی حال گجرات کا ہے۔ کتنے افسران مودی کے خلاف میدان میں آئے، لیکن انتظامی سطح پر کوئی تعاون نہ ملنے پر ان کی آواز نقار خانے میں دب کر رہ گئی۔ اگر ان افسران نے تحقیقاتی ٹیم کو ثبوت بھی پیش کئے تو اسے دیدہ دلیری کے ساتھ نظر انداز کر دیا گیا۔ کچھ افسران نے ہمت دکھائی تو یا انہیں عضو معطل کی طرح ایسی جگہ ڈال دیا جہاں جو ان کے لئے سب سے بڑی سزا ثابت ہوئی یا انہیں معطل کیا انہیں برخاست کر دیا گیا۔ جب تک گجرات سے مودی نامی وائرس کو ختم نہیں کیا جاتا اس وقت ہندوستان کے خوبصورت ماتھے سے گجرات قتل عام کا کلنگ نہیں مٹے گا اور اس کو نہیں روکا گیا تو وہ پورے

ہندوستان میں پھیل جائے گا اور پھر ہندوستان میں جو بدامنی پھیلے گی جس سے جہاں انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہوگی وہیں بین الاقوامی طور پر ہندوستان کا سر بھی جھکے گا اس لئے ہندوستان کے لئے باعث شرم بننے والے ہر اس چیز سے ہندوستانیوں کو چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا جب ہی ہم ترقی یافتہ ملک بن سکیں گے۔ گجرات قتل عام کے خلاف انصاف کی آواز بلند کرنے والی اہم شخصیتوں میں شبنم ہاشمی، تیستا سیتلواڈ، مکل سنہا، دیگر اور سنجیو بھٹ کا کارنامہ بھی قابل اعتراف ہے۔ ان لوگوں کی محنت اور جہد وجہد کی وجہ سے گجرات کے حالات سے دنیا کو آگاہی ہوئی ورنہ ان فاسشٹوں نے میڈیا کو اپنا غلام بنا رکھا ہے۔

(مضمون نگار صحافی اور نیوز ایجنسی یو این آئی سے وابستہ ہیں)

☆☆

گجرات فسادات

مجرموں کو بچانے کے لیے خطرناک کھیل

● سہیل انجم

گجرات میں 2002 میں جو بدترین فرقہ وارانہ فسادات ہوئے تھے ان میں بلوائیوں، فسادیوں، شرپسندوں اور حکومتی عملے کی ملی بھگت کے انکشافات بار بار ہوتے آئے ہیں۔ ان فسادات میں سرکاری مشینری کے استعمال کے جو نا قابل تردید شواہد منظر عام پر آئے ہیں اب ان کا سلسلہ اس سے بھی آگے تک دراز ہو گیا ہے۔ جہاں پہلے فسادیوں کے ساتھ مل کر خونی کھیل کھیلا گیا، ان کا ساتھ دیا گیا، فسادات کے بعد یہ کوشش کی گئی کہ ان کے خلاف قانونی کارروائی نہ ہو، اگر ہو تو ان کے خلاف بہت ہلکے پھلکے چارج لگائے جائیں اور پھر آسانی کے ساتھ ان کو بری کرالیا جائے، وہیں اب اعلی سرکاری سطح پر ایک اور خطرناک کھیل کھیلا جارہا ہے اور اس میں وزیر اعلی نریندر مودی کا دفتر، ریاست کے ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل اور آر ایس ایس کے ایک نظریہ ساز ملوث ہیں۔ سینئر آئی پی ایس افسر سنجیو بھٹ نے اس سلسلے میں جو انکشاف کیا ہے وہ انتہائی چونکا دینے والا ہے۔

سنجیو بھٹ نے سپریم کورٹ میں ایک حلف نامہ داخل کر کے بتایا ہے کہ سپریم کورٹ نے گجرات فسادات کی جانچ کے لیے جو اسپیشل انوسٹی گیٹیو ٹیم یعنی ایس آئی ٹی بنائی ہے اس کی جانچ رپورٹ ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل کے توسط سے آر ایس ایس کے نظریہ ساز گورو مورتی کو بھیج دی جاتی ہے اور وہ اس کی روشنی میں فسادات کے مجرموں کو بچانے کی حکمت

عملی تیار کرتے ہیں۔ سنجیو بھٹ نے ایک آفیسر کی حیثیت سے ایسے کئی ای میل کو ہیک کیا ہے جس سے یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ ریاست کے سیاست دانوں نے سرکاری افسران کے ساتھ مل کر ان رپورٹوں کی روشنی میں دفاعی حکمت عملی تیار کی ہے۔ فسادات کے نو معاملات کی جانچ رپورٹیں ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل تشار مہتا نے گذشتہ سال ایک سرکاری ای میل سے بھیجی تھیں۔ ان کو یہ رپورٹ محکمہ داخلہ کے انڈر سکریٹری وجے بدیکھا نے ارسال کی تھیں۔ اور انہوں نے یہ رپورٹیں گورو مورتی کو بھیج دیں۔ گورو مورتی کا کام یہ تھا کہ وہ ان جانچ رپورٹوں کی روشنی میں ایک رپورٹ بنائیں اور ملزموں کے وکلا کو بھیج دیں تاکہ وہ اس کی روشنی میں اپنے مؤکلوں کا مقدمہ آسان بنا سکیں اور دفاعی حکمت عملی تیار کر سکیں۔ خیال رہے کہ یہ مقدمات سپریم کورٹ میں چل رہے ہیں۔ حالانکہ گورو مورتی ایسی کسی بھی ای میل رپورٹ کی وصولیابی کی تردید کرتے ہیں لیکن سنجیو بھٹ کے پاس اس کا پورا ثبوت موجود ہے۔ سنجیو بھٹ نے سپریم کورٹ میں حلف نامہ داخل کر کے ضمنی کاغذات منسلک کیے ہیں جن میں ای میل کے سلسلے میں تفصیلات ہیں۔ ایسے ملزموں میں گل برگ سوسائٹی کے ملزمان بھی ہیں جنھوں نے کانگریس کے رکن پارلیمنٹ احسان جعفری سمیت درجنوں افراد کو زندہ جلا دیا تھا۔ ان ملزموں کے بچاؤ میں وزیر اعلیٰ نریندر مودی کے ساتھ مل کر بھی ساز باز کی گئی ہے۔ تشار مہتہ نے خود ہی ملزموں کے لیے ایک مسودہ تیار کیا تاکہ چارج شیٹڈ ملزموں کو بچایا جا سکے۔

بقول سنجیو بھٹ تشار مہتا نے چار اپریل 2010 کو ملزموں کے وکلا کو وہ مسودہ ارسال کیا تھا۔ مہتا نے صرف یہی نہیں کہ ملزموں کے لیے مسودہ تیار کیا بلکہ انہوں نے جوابی حلف نامے کا مسودہ بھی تیار کیا اور سرکار کی طرف سے پیش ہونے والوں کو دے دیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے گل برگ سوسائٹی کے ملزموں کے لیے سپریم کورٹ میں داخل کرنے کے لیے جو مسودہ تیار کیا تھا اس کی ایک کاپی وزیر اعلی کے چیف سکریٹری کو پندرہ اپریل 2010

کو بھیج دی۔انہوں نے یہی کاپی گورومورتی کو بھی فارورڈ کردی۔ یہ سب کام انٹرنیٹ کے ذریعے کیا جاتا رہا اور مسودہ کی نقل ای میل کی جاتی رہی۔ سنجیو بھٹ کے مطابق ریاستی حکومت کی جانب سے جو بھی حلف نامے داخل کیے جاتے ان میں سے بیشتر گورومورتی سے ہوکر گزرتے تھے۔انہوں نے سپریم کورٹ میں داخل حلف نامہ میں کہا ہے کہ سب سے قابل اعتراض بات یہ ہے کہ تشار مہتہ ایک طرف ملزموں کی خاطر عدالت میں پیش کرنے کے لیے حلف نامہ تیار کرتے تھے اور دوسری طرف ان حلف ناموں کا جواب دینے کے لیے حکومت کی طرف سے بھی حلف نامہ تیار کرتے تھے۔ ایک اخبار کے ایڈیٹر کو بھی ایک ای میل ارسال کیا گیا۔ یہ ذکیہ جعفری کے کیس کے سلسلے میں تھا۔ حالانکہ مذکورہ ایڈیٹر کو ایسے کسی بھی ای میل کے حاصل ہونے کے بارے میں کچھ یاد نہیں ہے۔ سنجیو بھٹ نے جنھوں نے گجرات فسادات میں سرکاری مشینری کے ملوث ہونے اور وزیراعلیٰ کی اہم میٹنگ میں پولیس افسران کو دی جانے والی اس ہدایت کا انکشاف کیا تھا کہ وہ ہندووں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کریں اور مسلمانوں کے خلاف ان کا غصہ نکلنے دیں، حکومت کے عتاب کا شکار ہیں۔ انہوں نے سہراب الدین فرضی انکاونٹر معاملے میں بھی اسی قسم کی سازشوں کا انکشاف کیا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ گجرات میں انصاف کا حصول کتنا مشکل ہے اور غلط کاموں میں کس طرح حکومت کے ذمہ داران ملوث ہیں۔

حالانکہ گجرات کے وزیراعلی اور ان کی پوری حکومت یہ دعوی کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی کہ ان کی ریاست میں کسی بھی فرقے کے تئیں کسی بھی قسم کا امتیاز نہیں برتا جاتا۔لیکن حقائق ہیں کہ کچھ اور کہہ رہے ہیں۔ آج گجرات میں انصاف کی حصولیابی خاص کر ایک مخصوص فرقے کے لیے بالکل ایسا ہی ہے جیسے کہ صحرا میں پانی تلاش کرنا۔ وہاں سراب تو ہے لیکن پانی نہیں۔صحرا میں کڑی دھوپ میں دور سے پانی بہتا ہوا نظر آتا ہے لیکن جب پیاسا شخص اس کے پاس پہنچتا ہے تو پانی کا کہیں نام ونشان نہیں ہوتا بلکہ ریت ہی ریت نظر

آتی ہے۔ یہ ایک قسم کا دھوکہ ہوتا ہے۔ بالکل یہی کیفیت گجرات میں ایک مخصوص فرقے کے ساتھ پیش آرہی ہے۔دور سے ایسا لگے گا کہ انصاف کے لیے کوششیں چل رہی ہیں اور لوگوں کو انصاف مل بھی رہا ہے، کسی کے خلاف کسی تعصب سے کام نہیں لیا جارہا ہے۔لیکن اندر جھانک کر دیکھنے پر پتہ چلتا ہے کہ وہ انصاف نہیں انصاف کے نام پر دھوکہ ہے اور خود انصاف سے ناانصافی ہورہی ہے۔نریندر مودی کے دور اقتدار میں کسی کو بھی یہ امید نہیں ہے کہ وہاں مسلمانوں کو انصاف مل سکے گا۔اب تو سپریم کورٹ کو بھی گجرات کی سرکاری مشینری پر بھروسہ نہیں ہے۔اسی لیے اس نے 9 مقدمات کی جانچ ایس آئی ٹی کے سپرد کررکھی ہے۔

گجرات میں فسادات کے متاثرین کے بارے میں وزیراعلی بار بار دروغ بیانی سے کام لیتے ہیں۔انہوں نے بہت پہلے بہ اصرار یہ بیان دیا تھا کہ اب کوئی بھی شخص کسی راحت کیمپ میں نہیں ہے۔سب کو ان کے گھروں کو پہنچا دیا گیا ہے، لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔آج بھی بہت سے متاثرین ریلیف کیمپوں میں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں جہاں ان کو بنیادی انسانی سہولتیں تک میسر نہیں ہیں۔ وہ لوگ اپنے گھروں کو تو جانا چاہتے ہیں لیکن جا نہیں سکتے۔ کیونکہ ایک تو بہت سے لوگوں کے مکان تباہ ہوگئے ہیں اب وہ ناقابل رہائش ہیں اور ان کے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہے کہ وہ ان کو درست کرواسکیں یا ازسرنو ان کی تعمیر کرواسکیں۔دوسرے جن کے گھر کسی طرح قابل رہائش بنائے بھی جاسکتے ہیں وہاں کے حالات اس لائق نہیں ہیں کہ وہاں رہا جاسکے۔ان کے سامنے واپس آنے کے لیے ایسی شرطیں رکھی جاتی ہیں جو قابل قبول نہیں ہوتیں۔ان سے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے جن لوگوں کے خلاف مقدمات قائم کررکھے ہیں ان کو واپس لے لیں اور صلح نامہ داخل کرکے کہہ دیں کہ اب ان کا ان سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔وہ اپنے پڑوسیوں سے خوش ہیں اور ان سے انہیں کوئی شکایت نہیں ہے لہٰذا وہ مقدمات اٹھا رہے ہیں۔یا پھر جو لوگ وہاں جاکر رہنا بھی چاہتے ہیں ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ خود کو مسلمان کے طور پر ظاہر نہ ہونے دیں اور ان کے کسی بھی کام سے

یہ نہیں لگنا چاہیے کہ وہ مسلمان ہیں۔ ایسے میں کوئی بھی مسلمان ان شرائط کو کیسے تسلیم کرسکتا ہے۔ جو مسلمان ریلیف کیمپوں سے اپنے گھروں میں جاچکے ہیں وہاں بھی حالات اطمینان بخش نہیں ہیں۔ مسلم اکثریتی علاقوں کے حالات اور بھی بدتر ہیں یا بدتر بنا دیے گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ رہائشی کالونیاں نہیں بلکہ عارضی بستیاں ہیں جہاں بنیادی انسانی سہولتوں کا فقدان ہے۔ نہ تو پانی کی سپلائی ہے نہ بجلی کی اور نہ ہی سڑکوں اور راستوں کی حالت ٹھیک ہے۔ جبکہ انہی مسلم علاقوں سے متصل دوسری آبادیاں تمام تر بنیادی سہولتوں سے آراستہ ہیں اور وہاں کوئی پریشانی نہیں ہے۔ ایک دوسرے کے متصل قائم ان بستیوں میں زمین آسمان کا فرق ہے اور ایسا نہیں لگتا کہ وہ ایک ہی ریاست کی آبادیاں ہیں۔ یہ ہے نریندر مودی کے گجرات کی حالت جہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کو واضح طور پر دو خیموں میں تقسیم کردیا گیا ہے۔

ادھر سنجیو بھٹ جو انکشافات کررہے ہیں ان سے مسلمانوں کے حالات کی ابتری کا مزید اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان حالات میں اگر مودی یہ دعویٰ کریں کہ ان کی حکومت میں کسی کے ساتھ کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا تو یہ سوائے دھوکہ کے اور کیا ہے۔ گویا مسلمانوں پر دوہری تہری مار پڑ رہی ہے۔ ایک طرف فسادات میں ان کا سب کچھ تباہ و برباد کردیا گیا۔ دوسری طرف ریلیف اور بازآبادکاری کے نام پر ان کے ساتھ ناانصافی کی گئی اور تیسرے یہ کہ اب مجرموں کو بچانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ریاستی حکومت اس میں نہ صرف شامل ہے بلکہ پیش پیش ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ مجرموں کو سزا ملے، کیونکہ اس کو خدشہ ہے کہ اس طرح اس کے کرتوت بھی سامنے آئیں گے اور اس سے جواب دیتے نہیں بن پڑے گا۔ بہرحال سنجیو بھٹ نے جو انکشاف کیا ہے وہ قانون وانصاف کے ساتھ کھلا مذاق ہے اور سپریم کورٹ کو چاہیے کہ وہ اس پر متعلقہ لوگوں کے خلاف کارروائی کرے تاکہ آئندہ اس کی ہی مقرر کردہ ٹیم کی رپورٹ کا استحصال نہ کیا جاسکے اور مظلوموں کو انصاف کی فراہمی کو یقینی بنایا جاسکے۔

☆☆

مجموعہ القاسم: جلد پنجم
مسلم مسائل اور اس کا حل

گجرات میں نفرت اور ناانصافی کے ۱۰ رسال

● ادارہ

گجرات میں گودھرا کے واقعہ کو دس برس سے زائد کا عرصہ گزر گیا۔ وہاں سابرمتی ٹرین کا ایک ڈبہ جلائے جانے سے انسٹھ ہندو زائرین ہلاک ہوئے تھے۔ اس کے بعد پوری ریاست میں مسلمانوں کے خلاف فسادات پھوٹ پڑے تھے جن میں ایک ہزار سے زائد افراد مارے گئے اور ہزاروں مجروح ہوئے۔

وزیراعلیٰ نریندر مودی گزشتہ دس برس سے اقتدار میں ہیں۔ اور یہ دعویٰ کیا جارہا ہے کہ ان کی قیادت میں ریاست نے قابلِ ذکر ترقی کی ہے لیکن ریاست کے مسلمان پچھلے دس برس سے پوری طرح الگ تھلگ پڑے ہوئے ہیں۔

گودھرا کے واقعے میں گیارہ مسلمانوں کو موت اور اکیس کو عمر قید کی سزا سنائی گئی، جبکہ ایک ہزار سے زیادہ مسلمانوں کے قتل کے لیے بیشتر معاملات میں ابھی تک انصاف نہیں مل سکا ہے اور ملزم آزاد گھوم رہے ہیں۔

ریاست میں مکانوں اور دکانوں کی خریداری اور تجارت میں مسلمانوں کو سخت مشکلات اور تفریق کا سامنا ہے۔ سہیل ساچورا ایک نوجوان ایگزیکٹو اور ایک کمپنی میں ملازم ہیں، وہ کہتے ہیں کہ گجرات میں ہندوازم نظریہ رفتہ رفتہ مقبولیت حاصل کررہا ہے ’مسلمانوں کے بچوں کو اچھے اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں داخلہ اس لیے نہیں دیا جاتا کہ وہ مسلمان ہیں۔ انہیں تجارت میں بھی مشکلات کا سامنا ہے۔‘

پروفیسر عابد حسین شمسی کہتے ہیں کہ ریاست میں مودی کی دہشت پھیلی ہوئی ہے۔ اگر کوئی ہندو مسلمانوں کو اپنا مکان یا دکان کرائے پر دینا چاہے تو ہندو تنظیمیں اس کے اوپر دباؤ ڈال کر ایسا کرنے سے روکتی ہیں۔

’’آج سے سات آٹھ برس پہلے تک میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ مودی ٹائپ کا نظریہ آگے بڑھ سکتا ہے، لیکن آج ایسا نہیں کہہ سکتا۔ آج بھارت میں ہندو آئزیزیشن دھیرے دھیرے ہو رہا ہے۔ گجرات، مدھیہ پردیش، راجستھان، جھارکھنڈ اور چھتیس گڑھ جیسی ریاستوں میں اس کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ ہندو ریاست باضابطہ طور پر ڈکلیر نہیں ہوگی، لیکن حقیقت یہی ہے اور یہ سیکولر اسٹس کے لیے بہت بڑا چیلنج ہے۔‘‘

سرکردہ وکیل دانشور گریش پٹیل ریاست کے مسلمان تعلیم میں پہلے سے ہی کافی پیچھے تھے اور اب انہیں اقتصادی اور سماجی طور پر الگ تھلگ کرنے کی پالیسی سے ان کے راستے اور بھی مسدود ہو گئے ہیں۔

ریاست کی ایک سماجی کارکن سوروپ دھرو کہتی ہیں کہ گجرات میں مسلمانوں کے سامنے سب سے بڑا سوال زندہ رہنے کا ہے۔ ’ان کے سامنے جیسے حالات ہیں اس میں انہیں لگتا ہے کہ مذہب ہی تحفظ کا ایک راستہ ہے۔ مذہبی لوگ جو کہتے ہیں وہ اسی پر عمل کرتے ہیں، وہ اپنے خول میں سمٹتے جارہے ہیں۔‘

۲۰۰۲ کے فسادات کے بعد وزیرِ اعلیٰ نریندر مودی نے کبھی کسی طرح کی غلطی یا انتظامی لغزش کا اعتراف نہیں کیا اور نہ ہی مسلمانوں کی تباہی پر کسی طرح کی افسردگی ظاہر کی۔ گجرات کا معاشرہ بھی مسلمانوں کے خلاف کھلی تفریق اور تشدد پر خاموش تماشائی بنا رہا۔ گجرات آج ایک منقسم معاشرہ ہے۔

دانشور اور سرکردہ وکیل گریش پٹیل کہتے ہیں یہ محض اتفاق نہیں ہے۔ گجرات میں سخت گیر ہندوئیت کا تجربہ کیا گیا ہے۔ گجرات، مدھیہ پردیش، راجستھان، جھارکھنڈ اور چھتیس گڑھ

جیسی ریاستوں میں اس کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ ہندو ریاست باضابطہ طور پر ڈکلیر نہیں ہوگی لیکن حقیقت یہی ہے اور یہ سیکولراٹیٹس کے لیے بہت بڑا چیلنج ہے۔‘ مسٹر پٹیل کا کہنا ہے کہ مودی گجرات کی مثال دیتے ہوئے بی جے پی کو یہ پیغام دے رہے ہیں کہ مسلمانوں کو چھوڑو، انتخابات ان کے بغیر بھی جیتے جاسکتے ہیں۔ ایک دوسرے کارکن ہیرن گاندھی اس خیال سے پوری طرح اتفاق نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ گجرات میں جو تجربہ کیا گیا ہے اس کا اثر ملک کی سیاست پر کچھ عرصے کے لیے ضرور رہیگا لیکن یہ مجموعی طور پر کامیاب نہیں ہوسکے گا۔‘ مودی کی مخالفت ویزا نہ دیکر صرف امریکہ ہی نہیں کر رہا ہے۔ بہار کے وزیرِ اعلیٰ نتیش کمار نے انتخابی مہم کے لیے ان کی مخالفت کی۔ خود بی جے پی کے اندر مودی کے سوال پر اختلافات ہیں۔ سو بہت سے لیڈر نہیں چاہتے کہ مودی کو بہت زیادہ پرموٹ کیا جائے مگر جب بات سخت گیر ہندو ووٹ کی آتی ہے تو مودی کو مثال بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ ہندوئیت کا نظریہ بھارت کی اپنی نوعیت کے سبب مین اسٹریم سیاست میں زیادہ عرصے تک نہیں چل سکے گا۔‘

2002 کے فسادات کے بعد گجرات وزیر اعلی نریندر مودی کی آہنی گرفت میں ہے۔ ریاست ترقی کی نئی منزلوں کو چھو رہی ہے۔ مسلمانوں کے خلاف دانستہ تفریق، ناانصافیوں اور فسادات کے کلنک کے باوجود مودی کی مقبولیت ریاست کی حدود سے نکل کر ملک کے دوسرے خطوں تک پھیل رہی ہے۔

ہندوستانی میڈیا، بھارتی جنتا پارٹی کی قیادت کا ایک بڑا حصہ سرکردہ صنعتکار سیاسی ہندوئیت کے اس اوتار کو مستقبل میں ملک کی وزارتِ عظمی کے امیدوار کے طور پر دیکھ رہے ہیں۔

☆☆

گودھرا عدالتی فیصلہ
چند ابھرتے ہوئے سوالات

● ڈاکٹر محمد منظور عالم

یہ ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے کہ گودھرا سانحہ کی پانچ ایجنسیوں کے ذریعہ انکوائری اور احمد آباد کی سابرمتی جیل میں قائم کی گئی خصوصی عدالت کے فیصلے کے بعد سازش کی تھیوری ہنوز حل نہیں ہو پائی ہے اور اس تعلق سے متعدد سوالات ذہنوں میں ابھرتے ہیں۔ متعدد سوالات میں سب سے اہم سوال تو یہ ہے کہ جن دو لوگوں مولانا حسین عمرجی اور محمد حسین کلوٹا جنھیں پورے معاملہ میں اصل سازشی اور گودھرا سانحہ کا ماسٹر مائنڈ بتا کر مقدمہ چلایا گیا تھا، کے خلاف پولیس کی کہانی من گھڑت ثابت ہوگئی اور وہ بری ہوگئے تو کیا مقدمہ میں کوئی جان رہ گئی؟ اور پھر فیصلہ کس بنیاد پر سنایا گیا؟

یہ سوال بھی اہم ہے کہ جب مقدمہ میں ملزمین کے خلاف پوٹا کا نفاذ ہی سازش ثابت ہو چکا اور اس کو ہٹا دیا گیا تو ملزمین کی گرفتاری اور ان کے خلاف عائد کئے گئے الزامات میں دیانتداری اور اس کی بنیاد پر آگے کی قانونی کارروائی پر یقین کیسے کیا جا سکتا ہے؟ اس فیصلے سے یہ سوال بھی اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ یہ گودھرا سانحہ کے مہلوکین کے ساتھ انصاف ہے یا بے قصوروں کے ساتھ ناانصافی اور زیادتی کے بعد انصاف؟ گودھرا ریل سانحہ ملک کی تاریخ کا ایک ایسا واقعہ ہے جس کی جتنی انکوائری کی گئی اتنی ہی الگ الگ تھیوری سامنے آئی جس کے سبب یہ واقعہ معمہ بن کر رہ گیا ہے۔ ہر ایک نے اپنے اپنے نظریہ سے اس کی تعبیر کی۔ یہی

مجموعہ القاسم: جلد پنجم
مسلم مسائل اور اس کا حل

وجہ ہے کہ اس پورے معاملہ میں نشیب و فراز بھی بہت آئے۔

ان سب باتوں کے باوجود اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اقتدار کے لئے گجرات میں بی جے پی کے ذریعہ مسلمانوں کی نسل کشی کا جو منصوبہ بنایا گیا تھا اس کے لئے اس واقعہ کو جواز ضرور بنایا گیا اور پھر لگا تار ڈھائی ماہ تک چلنے والے مسلم کش فسادات کو گودھرا کا ردعمل قرار دیا گیا۔

۲۷ فروری 2002ء کے بعد ہوئے فسادات کی نوعیت پر غور کرتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ سب کچھ ریہرسل اور منصوبہ نیز حکومت اور پولیس کی سانٹھ گانٹھ کے بغیر ہرگز نہیں ہوا ہوگا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو کہ بعد ازاں فسادات کے مقدمے کی خانہ پری اور صرف ناناوتی کمیشن سے انکوائری کرنے کی ہٹ دھرمی اور آزادانہ طور پر انکوائری یا دوسری ریاستوں میں مقدمات چلانے کی مخالفت سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ امر بھی غور طلب ہے کہ گجرات کی ریاستی حکومت نے گودھرا کے مسلم ملزمین کو سخت سے سخت سزا دلانے اور ریاست کے مختلف حصوں میں ہوئے فسادات کے غیر مسلم ملزمین کو بچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ گودھرا سانحہ کے تعلق سے یہ بات شروع سے متنازعہ رہی کہ یہ ایک اتفاقی حادثہ تھا یا منصوبہ بند، اور اس کے پیچھے سازش تھی تو کس کی؟

خصوصی عدالت نے اب اپنا فیصلہ سنا دیا ہے اور یہ کہنا کہ یہ مسئلہ حل ہو گیا کسی بھی طرح صحیح نہیں ہوگا۔ گجرات میں نریندر مودی کی قیادت میں بی جے پی حکومت کا موقف تو شروع سے یہی رہا کہ گودھرا سانحہ منصوبہ بند تھا اور اس کے پیچھے سازش صرف مسلمانوں کی تھی۔ اس کے برخلاف ملک کے انصاف پسند، سنجیدہ طبقات بشمول مسلمان، کانگریس اور بائیں بازو کی پارٹیاں نیز انسانی حقوق کی تنظیمیں اسے اتفاقی واقعہ بتاتی رہی ہیں۔

گودھرا سانحہ میں کسی کی سازش ہو یا نہ ہو، گجرات کی مودی حکومت نے اس واقعہ میں مسلمانوں کو پھنسانے کی سازش ضرور رچی تھی۔ جس کی تفصیلات مختلف رپورٹوں میں آتی

رہی ہیں تا کہ بعد میں گجرات کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی نسل کشی کو ہلکا کر کے پیش کیا جا سکے۔ یہی وجہ تھی کہ صرف گودھرا کے واقعہ میں ایک سو سے زائد مسلمانوں کو گرفتار کیا گیا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ ملک میں پوٹا کا نفاذ اس واقعہ کے بعد ہوا تھا لہٰذا ان پر پوٹا لاگو نہیں ہوتا، ان پر پوٹا لگا کر ٹارچر کے ذریعہ زبردستی اقبال جرم کرایا گیا اور 9 برسوں تک ملزمین کو جیل میں رکھا گیا۔ انہیں کبھی ضمانت نہیں ملی جبکہ بعد میں ہونے والے مسلم کش فسادات کے تمام مقدمات میں ملزمین کو آسانی سے ضمانت دی گئی۔ گودھرا کے پورے معاملے کو اس طرح پیش کیا گیا جیسے اس کے ملزمین بہت بڑے دہشت گرد ہیں لہٰذا ان کے مقدمات کی کارروائی کسی عدالت میں نہ ہوکر سابرمتی جیل میں ہوئی۔ اس طرح یہ بھی نادر واقعہ تھا جب سابرمتی جیل کا کیمپس عدالت بن گیا تھا۔

مختلف ایجنسیوں کی انکوائری کے علاوہ یہ قابل ذکر ہے کہ 21 نومبر 2003 کو سپریم کورٹ نے گودھرا سمیت گجرات فسادات کے 9 معاملوں کی انکوائری پر روک لگاتے ہوئے ۲۶/ مارچ 2008 کو ان کی انکوائری اور آگے کی قانونی کارروائی کے لئے ایس آئی ٹی تشکیل دی جس کی رپورٹ مہر بند ہوکر سپریم کورٹ میں داخل ہے۔

اپریل 2009 میں ان معاملوں کی فاسٹ ٹریک سماعت کے لئے خصوصی عدالت تشکیل کی گئی، جس نے 19 فروری 2011 کو اپنا فیصلہ سنا دیا جبکہ 40 ابھی بھی مفرور ہیں۔ دریں اثنا خبر ملی ہے کہ 3 مارچ 2011 کو ان مفرور میں سے ایک اسمٰعیل یوسف چنگا کو گودھرا میں ان کی رہائش گاہ سے گرفتار کرلیا گیا ہے۔ قابل غور ہے کہ دیگر آٹھ معاملے ابھی بھی انصاف کے منتظر ہیں۔ خصوصی عدالت کا یہ فیصلہ اس پولیس فورس کی تفتیش پر منحصر ہے جس کا ابتداء سے ہی گودھرا سانحہ کے بعد ریاست کے مختلف حصوں میں بڑے پیمانے پر مسلمانوں کو قتل کئے جانے والوں سے ہاتھ ملا ہوا تھا۔ محض پولیس رپورٹوں کی بنیادوں پر سازش کی تھیوری کو فیصلے میں ماننا کسی لحاظ سے بھی ذہن کو مطمئن نہیں کرتا ہے۔ یہ بات کسی

مجموعہ القاسم: جلد پنجم
مسلم مسائل اور اس کا حل

سے ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ گجرات کی پولیس فورس ایک ایسے نظام کا حصہ ہے جس کے پیش نظر سپریم کورٹ نے بھی بعض مقدمات کو ریاست گجرات سے باہر منتقل کرنا ضروری سمجھا تھا۔ یہ کہنا کسی بھی طرح درست نہیں ہوگا کہ خصوصی عدالت کا یہ فیصلہ سائنٹفک تحقیق وتفتیش پر مبنی ہے۔ اگر سائنٹفک ہونے کا مطلب نارکوٹسٹ ہے تو حکومت گجرات کو یہ بات ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ اسے فل پروف نتیجہ کے طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا ہے۔ حقوق انسانی کی تنظیمیں بھی اس پر معترض ہوتی ہیں۔ پٹرول، طریقہ کار اور فارنسک جیسی چیزوں کے استعمال سے سابرمتی ایکسپریس کے ڈبوں کی سائنٹفک تفتیش کرنے کی جو بات کی جاتی ہے اس سے متعدد الگ الگ نتائج سامنے آئے ہیں۔ اگر ناناوتی کمیشن اسے سازش مانتا ہے تو جسٹس یوسی بنرجی کمیٹی اسے حادثہ گردانتی ہے۔ یہ بات بھی کم اہم نہیں ہے کہ خصوصی عدالت کے فیصلے پر جسٹس یوسی بنرجی نے مکمل طور پر عدم اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ اپنی جانچ رپورٹ پر 200 فیصد تک قائم رہیں گے اور وہ اس سے بالکل نہیں پلٹیں گے۔ ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے اپنی جانچ رپورٹ معاملے کے سبھی پہلوؤں پر غور کرنے اور 80 گواہوں کی گواہی کے بعد تیار کی تھی۔

سچ تو یہ ہے کہ خصوصی عدالت کا فیصلہ ٹپ آف دی آئس برگ (Tip of the iceberg) ہے، کیونکہ پورے معاملے میں جن دو اشخاص کو اصل ملزم مانا گیا تھا انہیں بھی بری کر دیا گیا۔ اس سوال کا جواب کون دے گا کہ وہ 63 افراد جن کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں ہو سکا 9 سال تک جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے کیوں سڑتے رہے؟ اور اب جبکہ بری کر دیے گئے ہیں ان کے معاوضہ کے بارے میں کوئی بات کیوں نہیں کی جارہی ہے؟ نیز وہ پانچ افراد جو کہ انہی 63 بری کئے گئے بدنصیب لوگوں میں سے ہیں اور بدنما داغ کے ساتھ ہی قید کی حالت میں اس دنیا سے چلے گئے اور 80 سالہ ایک شخص کعبۃ اللہ جو کہ اتر پردیش کے گونڈا کا باشندہ ہے اپنی رہائی کے چند گھنٹے بعد گودھرا ہی میں داعی اجل کو لبیک کہہ گیا

کے بارے میں خصوصی عدالت کا موقف سامنے نہیں آیا ہے۔ عدالت کو اس تعلق سے واضح طور پر کچھ کہنا چاہئے تھا اور ان کے وارثین کے مناسب معاوضہ کی بات بھی کرنی چاہئے تھی۔ ہوسکتا ہے کہ ان پانچ افراد کے ساتھ کی گئی ناانصافی اور زیادتی ہی ان کی موت کا سبب بن گئی ہو۔ بری کئے گئے افراد کے لئے معاوضہ ہی کافی نہیں ہے بلکہ بری کئے گئے افراد جن کی سماجی حیثیت بری طرح مجروح ہوچکی ہے کو سرکاری نوکری دیکر انہیں سماج میں عزت واحترام کے ساتھ جینے کا موقع دینا چاہئے جیسا کہ بری کئے گئے کچھ افراد کو جیل محکمہ کی نوکری دیکر کیا گیا ہے۔

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ خصوصی عدالت گودھرا سانحہ کے پورے معاملے میں ان 59 کارسیوکوں جن کی موت کا دعویٰ کیا جاتا ہے کے نام اور ورثاء کا پتہ بھی نہیں معلوم کر پائی اور نہ ہی سابرمتی ایکسپریس کی جلائی گئی S-6 بوگی کے ریزرویشن چارٹ کو حاصل کر پائی لیکن ان کے قتل کے الزم میں سماعت پوری کر ڈالی اور ایک سو لوگوں کی زندگی سے کھلواڑ کیا۔

ان حقائق کی روشنی میں فطری تقاضہ ہے کہ خصوصی عدالت کا یہ فیصلہ ہائی کورٹ سپریم کورٹ میں چیلنج کیا جانا چاہئے تاکہ پورا معاملہ جو معمہ بن گیا ہے، سلجھایا جا سکے اور صحیح صورتحال سامنے آسکے۔

☆☆

مودی کے دامن پر جو داغ ہیں، دھوئے نہیں جاسکتے!

● جسٹس مرکنڈے کاٹجو

جو لوگ گجرات کے وزیر اعلیٰ نریندر مودی کی حمایت میں شور وغوغا مچائے ہوئے ہیں وہ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ وہی پالیسی ہندوستان کو ترقی اور کامیابی کی جانب لے جاسکتی ہے جو اس ملک کے سبھی فرقوں کیلئے سودمند اور فائدہ بخش ہو۔

مودی کو ایک اہم اور طاقتور لیڈر کے طور پر ہی نہیں، ملک کے مستقبل کا وزیر اعظم قرار دیا جارہا ہے۔ اس خیال کا اظہار الہ آباد میں جاری کمبھ میلہ میں صرف بی جے پی یا آر ایس ایس نے ہی نہیں کیا ہے بلکہ ملک کا ایک طبقہ خصوصی طور پر تعلیم یافتہ نوجوان اس خیال کی حمایت کررہے ہیں کہ ملک کا آئندہ وزیر اعظم نریندر مودی ہوں۔

میں حال ہی میں دہلی سے بھوپال کیلئے سفر کررہا تھا۔ فلائٹ میں میری بغل والی سیٹ پر ایک گجراتی تاجر بیٹھا ہوا تھا۔ دوران سفر میں نے اس سے نریندر مودی کے بارے میں اس کے تاثرات دریافت کئے تو وہ مودی کی تعریفوں کے پل باندھنے لگا۔ میں نے درمیان میں گجرات کے ۲۰۰۲ء کے فسادات میں ۲/ ہزار مسلمانوں کے قتل عام کے بارے میں جب سوال کیا تو اس پر کسی طرح کے افسوس کا اظہار کرنے کے بجائے اس نے کہا کہ گجرات میں مسلمان ہمیشہ کوئی نہ کوئی مسئلہ پیدا کیا کرتے تھے مگر ۲۰۰۲ء کے بعد سے یہاں کا مسلمان خاموش ہوگیا ہے اور اس کے بعد سے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا اور گجرات میں امن و امان ہے۔ اس کے یہ کہنے پر میں نے اس سے کہا کہ یہ خاموشی یا امن ایک قبرستان کے

سناٹے جیسا ہوتا ہے اوراس طرح کا امن اس وقت تک دیر پا نہیں ہوتا جب تک مظلوموں کو انصاف نہیں مل جاتا۔ میرے اس ردعمل پر اس نے جارحانہ انداز میں اپنی سیٹ بدل لی۔ حقیقت یہ ہے کہ گجرات کا مسلمان آج بھی خوفزدہ ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اگر اس نے ۲۰۰۲ء کے فسادات کے خلاف کوئی آواز اٹھائی تو اسے پھر نشانہ بنایا جاسکتا ہے اور اُسے از سر نو قتل و غارت گری کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ پورے ہندوستان میں تقریباً ۲۰۰ رملین مسلمان قومی طور پر نریندر مودی کی مخالفت میں ہیں۔ (یہ الگ بات کہ کچھ مسلمان مختلف وجوہات کی بنا پر مودی کی حمایت میں ضرور ہیں۔)

مشکوک بے ساختگی:

مودی نوازوں کا دعویٰ ہے کہ گجرات میں جو کچھ بھی ہوا وہ گودھرا سانحہ کا ردعمل ہے۔ میں اس خیال سے متفق نہیں ہوں۔ پہلی بات تو یہ کہ گودھرا سانحہ کے بارے میں جو حقائق پیش کئے گئے ہیں وہ اب بھی میرے لئے ایک معمہ ہے۔ اس ٹرین سانحہ میں اصل میں کیا ہوا تھا یہ بات ابھی تک سمجھ میں نہیں آئی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس سانحہ کیلئے جن افراد کو ذمہ دار قرار دیا گیا تھا، اُنہیں سخت سزا بھی دی جا چکی ہے، لیکن ان افراد کے گناہ کے عوض میں پورے گجرات کے مسلمانوں کو نشانہ بنانے اور ان کی جان و مال سے کھلواڑ کرنے کو کیسے جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔ گجرات میں صرف ۹ رفیصد مسلم آبادی ہے جبکہ بقیہ آبادی میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ ۲۰۰۲ء میں یہاں کے مسلمانوں کی نسل کشی کی گئی، ان کے مال و اسباب کو لوٹا گیا، ان کے گھروں کو جلایا گیا اور ان کے ساتھ دیگر خوفناک جرم کئے گئے۔

۲۰۰۲ء میں گجرات میں مسلمانوں کے ساتھ ہونیوالی ناانصافی اور ان کے قتل عام کو جس دیدہ دلیری سے گودھرا سانحہ کا ردعمل قرار دیا گیا وہ ٹھیک اس واقعہ کی یاد دلا رہا ہے جب ۱۹۳۸ء میں پورے جرمنی میں یہودیوں کو نازیوں نے اپنی وحشت کا نشانہ بنایا تھا۔

اس دوران متعدد یہودیوں کو قتل کر دیا گیا تھا اور ان کی املاک کو بھی زبردست نقصان پہنچایا گیا تھا۔ واضح رہے کہ یہ فساد پیرس میں ایک جرمن سفارت کار کے ایک یہودی نوجوان پر جان لیوا حملے کی وجہ سے پھوٹ پڑا تھا۔ اس نوجوان نے یہ حملہ انتقامی کارروائی کے طور پر کیا تھا، کیونکہ اس کے اہل خانہ کو نازیوں نے کافی پریشان کیا تھا۔ نازی حکومت کا دعویٰ تھا کہ یہودیوں کے خلاف جرمنی میں جو مظاہرہ کیا گیا تھا وہ صرف مذکورہ نوجوان کی حرکت کا ردعمل تھا جبکہ حقیقت یہ کہ نازیوں نے منصوبہ بند طریقہ سے جرمنی میں یہودیوں کو تشدد کا نشانہ بنایا اور اس کے لئے تشدد پسند عناصر کی بھرپور مدد حاصل کی۔

اگر ہم تاریخی تناظر میں ہندستان کا تجزیہ کریں تو ہندوستان وسیع پیمانہ پر مہاجروں کا ملک رہا ہے، لہٰذا یہاں پر بھانت بھانت کی قومیں آباد ہیں۔ ایسی صورت میں ہندوستان کی ترقی اور کامیابی کیلئے ضروری ہے کہ ہر پالیسی سیکولرازم کی علمبردار ہو۔ تب ہی اس ملک کے شہریوں کو متحد رکھا جاسکتا ہے اور اتحاد میں ہی ملک کی ترقی و کامیابی پنہاں ہے۔ سب کے ساتھ اور سب کیلئے یکساں سلوک کی پالیسی مشہور مغل بادشاہ اکبر نے اپنائی تھی جس کو ہمارے سیاسی رہنماؤں مثلاً پنڈت جواہر لال نہرو اور ان کے حامیوں نے بھی اپنایا، جنہوں نے ہمیں سیکولرازم کا درس دیا اور سیکولرازم کا آئین عطا کیا۔ جب تک ہم اس پالیسی کے پابند نہیں ہوں گے ہم اپنے ملک کے وجود کو قائم نہیں رکھ پائیں گے۔ یہ کسی بھی صورت میں نہیں کہا جاسکتا کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کا ہے۔ یہ جتنا ہندوؤں کا ہے اتنا ہی مسلمانوں، سکھوں، عیسائیوں، پارسیوں اور جین وغیرہ کا بھی ہے۔ وطن عزیز میں یہ بھی ممکن نہیں کہ یہاں کسی ایک قوم یا فرقہ کو کوئی برتری حاصل ہو، مثلاً ہندوؤں کو اس ملک میں پہلے درجہ کا شہری ہونیکا حق حاصل ہو اور دیگر قوم کے شہریوں کو دوسرے اور تیسرے درجہ کی شہریت۔ یہاں پر ہر کسی کو پہلے درجہ کی شہریت حاصل ہے۔ گجرات میں مسلمانوں کی جس بے رحمی سے نسل کشی کی گئی اسے کبھی فراموش کیا جاسکتا ہے نہ ہی اس کیلئے کوئی معافی کی گنجائش ہے۔

اس معاملے میں مودی پر لگنے والے دھبہ کو عرب کی ساری خوشبو (عطریات) سے بھی نہیں دھویا جا سکتا ہے۔

مودی کے حامی کہتے ہیں کہ اس قتل عام میں مودی ملوث نہیں تھے نہ ہی کسی عدالت نے انہیں اس معاملے میں مورد الزام ٹھہرایا ہے۔ میں عدلیہ پر کسی طرح کی کوئی تنقید نہیں کرنا چاہتا، لیکن یہ بھی ماننے کیلئے تیار نہیں ہوں کہ ۲۰۰۲ء کے مسلم کش فساد میں مودی کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ جس وقت گجرات فرقہ پرستی کی آگ میں جھلس رہا تھا اور ایک مخصوص قوم کو ظلم و بربریت کا نشانہ بنایا جا رہا تھا اس وقت گجرات کی کمان مودی کے ہاتھ میں ہی تھی۔ ایسی صورت میں اس بات پر کیسے یقین کیا جائے کہ مودی کا اس فساد سے کوئی لینا دینا نہیں ہے، کم از کم میں اس بات پر یقین کرنے کیلئے تیار نہیں ہوں۔

اپنی اس دلیل کو ثابت کرنے کیلئے میں ایک مثال پیش کرنا چاہتا ہوں۔ احسان جعفری ایک محترم اور ضعیف رکن پارلیمان تھے، جو احمد آباد کے چمن پورہ علاقہ میں رہائش پذیر تھے۔ وہ اپنے اہل خانہ کیساتھ گلبرگ ہاؤسنگ سوسائٹی میں رہا کرتے تھے۔ یہ مسلمانوں کی کثیر آبادی والا علاقہ ہے۔ ان کی اہلیہ ذکیہ جعفری کے سرکاری بیان کے مطابق ۲۸ر فروری ۲۰۰۲ء کو تشدد پسند عناصر کا ایک ہجوم ان کی رہائش گاہ میں داخل ہوا اور احسان جعفری کو ان کے کمرہ سے کھینچ کر باہر نکالا اور انہیں بڑی بے رحمی سے زندہ جلا دیا۔ احسان جعفری کے علاوہ بھی کئی مسلمانوں کا یہاں پر قتل کیا گیا۔ جائے واردات سے صرف ایک کلومیٹر کے فاصلے پر پولیس اسٹیشن اور ۲ر کلومیٹر کے فاصلے پر پولیس کمشنر کا دفتر واقع تھا۔ اس کے باوجود یہ کہا جائے کہ اس واقعہ بارے میں مودی کو کوئی علم نہیں تھا تو یہ سمجھ میں نہ آنیوالی بات ہے۔ اس وقت سے ذکیہ جعفری انصاف کیلئے در در کی ٹھوکریں کھا رہی ہیں مگر انہیں ابھی تک انصاف نہیں ملا ہے۔ میں اس معاملے کی گہرائی میں نہیں جانا چاہتا ہوں کیونکہ یہ ہنوز زیر سماعت ہے۔ ہاں، میں اس بات کی وضاحت ضرور کرنا چاہتا ہوں کہ مودی گجرات میں

جس ترقی اور کامیابی کا راگ الاپ رہے ہیں اس کی سچائی اور حقیقت کیا ہے۔ 'ڈیولپمنٹ' کا حقیقی مفہوم ملک کے عوام کے معیار زندگی میں بہتری ہے۔ اگر بڑے صنعتکاروں کو رعایتی یا سستی زمین اور سستی بجلی فراہم کرنے کو ڈیولپمنٹ کا نام دیا جا رہا ہے تو میری نزدیک یہ کوئی ترقی نہیں ہے۔

کیا یہی گجرات کی ترقی ہے؟:

گجرات کے ۴۸ر فیصد بچے ناکافی خوراک کا شکار ہیں، جو کہ قومی اوسط سے بھی زیادہ ہے۔ گجرات میں سب سے زیادہ نومولود بچے موت کا شکار ہوتے ہیں۔ اسی طرح زچگی کے دوران سب سے زیادہ عورتوں کی موت گجرات میں ہوتی ہے۔ قبائلی علاقوں میں غربت کی شرح بھی ۵۷ر فیصد ہے۔ ماحولیات کے معاملے میں بھی گجرات پستی کی جانب رواں ہے۔ تعلیم کے شعبہ میں بھی گجرات کی حالت ابتر ہو رہی ہے۔ یو این ڈی پی کی رپورٹ جو اس نے ۲۰۱۰ر میں جاری کی تھی کے مطابق ہندوستان کی دیگر ریاستوں کے مقابلے میں گجرات مختلف ترقیاتی شعبوں میں ۹ر ویں مقام پر تھا، البتہ یہ ضرور ہے کہ صنعت کاروں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ مودی نے گجرات میں کاروباری ماحول پیدا کیا ہے، لیکن کیا ہندوستان میں صرف کاروباری یا صنعتکار ہی رہتے ہیں؟ اگر ہمیں اس ملک کو کامیاب اور ترقی یافتہ دیکھنا ہے تو میں ملک کے ہر شہری سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ میری باتوں پر سنجیدگی سے غور کریں اور بعد ازیں اپنا فیصلہ صادر کریں ورنہ ہم بھی وہی غلطی کریں گے جو ۱۹۳۳ء میں جرمن نے کی تھی۔

(مضمون نگار سابق چیف جسٹس اور پریس کونسل آف انڈیا کے چیئرمین ہیں۔)

☆☆

گجرات کا لہو
مودی کے تعاقب میں

● ادارہ

تمام ثبوت مٹا دیئے مگر......

آستین کا لہو کیسے مٹائیں گے؟

نہایت منصوبہ بند طریقے سے نریندر مودی نے 2002 میں گجرات میں مسلم کش فسادات کرائے اور سنگھ پریوار کے کارکنوں کے ساتھ پوری سرکاری مشنری کو مسلمانوں کے قتل عام اور ان کو تباہ و برباد کرنے کے مشن میں لگا دیا۔ ہزاروں مسلمان مارے گئے، بلکہ زندہ جلائے گئے اور لاکھوں مسلمانوں کو اپنا سب کچھ لٹا کر بے پناہی کے عالم میں دربدر ہونا پڑا اور اس طرح گجرات کو ہندو ماڈل ریاست کے طور پر تجربہ گاہ بنا کر سنگھ پریوار نے یہ سمجھا کہ اس نے ایک بہت بڑی کامیابی حاصل کر لی ہے اور یہ تجربہ انہیں پورے ہندوستان میں اپنے مشن کو آگے بڑھانے میں ایک کشادہ رہگزر فراہم کرے گا' لیکن نہ ظلم کی ٹہنی کبھی سرسبز رہتی ہے اور نہ ہی انتقام کے پودے میں کبھی پھل آتے ہیں۔ گجرات کے مسلم کش فسادات نے سنگھ پریوار کے بڑھتے ہوئے سیاسی کامیابی کے رتھ کو ایک جھٹکے کے ساتھ روک کر رکھ دیا اور جس نریندر مودی کو ہندوستان کا وزیر اعظم بنانے کا خواب دیکھا جا رہا تھا' وہ نریندر مودی آج اپنے گناہوں کے تمام ثبوت مٹانے اور اپنی قہر سامانی پر پردہ ڈالنے کی کوششوں میں لگا ہوا ہے، لیکن وہ جیسے جیسے اپنے گناہوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے' ویسے ویسے اس کے

جسم کے کپڑے اس کو بے لباس کرتے چلے جاتے ہیں۔ گجرات کے مظلومین کا لہو نریندر مودی کے مسلسل تعاقب میں ہے اور وہ اپنی جان بچانے کے لئے جتنے بھی یگیہ اور ہون کر لے، لیکن خود اس کی آستین کا لہو گواہی دے گا اور وہ اپنے کیفر کردار تک پہنچے گا۔

اطلاعات کے مطابق مودی نے 2002 کے مسلم کش گجرات فسادات کے تمام ثبوت وشواہد مٹا دیئے ہیں اور اب کوئی بھی ریکارڈ ایسا موجود نہیں ہے' جس سے وزیر اعلیٰ سے لے کر انتظامیہ کے کسی بھی عمل پر سوالیہ نشان کھڑا کیا جائے۔ یعنی اب تک تو پوری حکومت اور اس کے زیر اثر چلنے والی انتظامیہ اس پورے کیس پر خاک ڈالنے کی کوشش کرتے رہے تھے اور اس فساد کو عام ردعمل کی ایک کارروائی قرار دے رہا تھا لیکن اب ان کی جھوٹ اور مکاری کی قلعی کھولنے والے وہ تمام ثبوت وشواہد بھی خاک میں ملا دیئے گئے ہیں، جو ریکارڈ کی شکل میں حکومت کے دفاتر اور انتظامیہ کی فائلوں میں موجود تھے۔ مظلومین اور ہندوستان کے ہر انصاف پسند شہری کو اس خبر سے مایوسی تو ضرور ہوئی ہے اور لوگ محسوس کرتے ہیں کہ ظالموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کی جنگ اب اور بھی کٹھن ہو جائے گی، لیکن اس قسم کے ہتھکنڈوں سے انصاف ملنے میں تاخیر تو ہو سکتی ہے، لیکن ظلم اپنا بھیانک چہرہ چھپانے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکے گا، کیونکہ ظالم اپنے ظلم کے ثبوت مٹاتے مٹاتے خود ہی مٹ کر رہ جاتا ہے۔ تاریخ اس کا ثبوت پیش کرتی ہے۔

مظلوم کے حمایتی مایوس نہیں:

گجرات کے مسلم کش فسادات کی ناناوتی- مہتا انکوائری میں مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کی پیروی کرنے والی این جی او نے اب یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ اس سلسلے میں عدالت میں عرضی دائر کرے گی اور عدالت سے گذارش کرے گی کہ ریاستی حکومت کی جانب سے فسادات کے تمام ثبوت وشواہد کے ختم کئے جانے پر حکومت سے جواب طلب

کرے اور اس جرم کے خلاف ریاستی حکومت کو ماخوذ کرے۔ تمام ثبوت وشواہد کو مٹا دینے کی بات اب خود حکومت نے بھی قبول کرلی ہے اور حکومت کے کاؤنسل ایس بی وکیل نے اس کا باضابطہ اقرار کیا ہے اس کے مطابق فسادات سے متعلق تمام ریکارڈ پرانے ہوجانے کی وجہ سے 2007 میں برباد کردیئے گئے تھے اور پرانے ریکارڈ وقت گزرجانے کے بعد عام طور پر اسی طرح برباد کردیئے جاتے ہیں' لیکن حکومت کے لئے اس سوال کا جواب دینا آسان نہیں ہوگا کہ جب اس پورے معاملے کے مقدمات عدالت میں زیر سماعت ہیں، تو پھر اس سے متعلق ریکارڈ کیوں تباہ کئے گئے۔

این جی او جن سنگھرش مورچہ کے ذمہ دار اور سرکاری دھاندلیوں اور مظالم کے خلاف آواز بلند کرنے والے سماجی کارکن مکل سنہا کے مطابق وہ حکومت کے ثبوت مٹانے کی مجرمانہ حرکت کے خلاف قانونی کارروائی کرنے جارہے ہیں اور اس سلسلے میں باضابطہ قانونی کارروائی کے ذریعہ حکومت کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ وزیراعلیٰ کے خاص حکم سے ٹیلی فون پر ہونے والی تمام بات چیت اور دیئے جانے والے احکام' سرکاری گاڑیوں کے آنے جانے کی لاگ بک اور پولس موومنٹ کی ڈائری' یہ تمام ثبوت اور ریکارڈ مٹادیئے گئے ہیں، اس سے وزیراعلیٰ اور اعلیٰ پولس افسران کے ان تمام کالے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے' جس سے ان کا مکروہ چہرہ سامنے آتا ہے۔

سرکاری کونسل ایس بی وکیل نے کہا ہے کہ چونکہ ریکارڈ کافی پرانا ہوچکا تھا' اس لئے معمول کے مطابق ان تمام ریکارڈز کو برباد کیا گیا ہے' لیکن فساد کے زمانے میں گجرات انٹلیجنس بیورو کے ہیڈ رہے ڈی جی پی شری کمار کہتے ہیں کہ ایس بی وکیل بالکل غیر قانونی بات کہہ رہے ہیں۔ گجرات پولس مینوئل کے مطابق کوئی بھی ریکارڈ اس وقت تک برباد نہیں کیا جاسکتا ہے، جب تک اس سے متعلق معاملہ عدالت میں زیر سماعت ہو۔ ایسے وقت میں جبکہ خود سپریم کورٹ اس معاملے کی سماعت کررہا ہے، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اس کیس سے

متعلق سرکاری ریکارڈس برباد کردیئے جائیں۔ بقول شری کمار، دراصل گجرات حکومت قانونی پھندے سے اپنی گردن چھڑانے کے لئے یہ سب ہاتھ پاؤں ماررہی ہے اور اتنی خطرناک قسم کی حرکت کررہی ہے' لیکن اس سے اس کے گناہ پر پردہ نہیں ڈالا جاسکے گا۔

اب بھی ہے ثبوت موجود:

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حکومت کی جانب سے تمام بے حد اہم ثبوت وشواہد کو تباہ کردینے سے مظلومین کے لئے مزید پریشانیاں کھڑی ہوگئی ہیں اور ان کے لئے عدالت میں معاملہ دشوار ہوگیا ہے' لیکن ایسا نہیں ہے کہ سب کچھ ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ کیونکہ چونکہ سپریم کورٹ خود اس کیس کی نگرانی کررہی ہے' اس لئے وہ اتنی آسانی سے اس اہم سوال کو نظرانداز نہیں کرے گی کہ زیر سماعت مقدمے سے متعلق تمام سرکاری ریکارڈ آخر کیوں تباہ کردیئے گئے۔ دوسری طرف گجرات کے سابق ڈی جی پی آر بی شری کمار کے پاس اپنی وہ ذاتی ڈائری موجود ہے، جس میں وہ بحیثیت ریاستی انٹلیجنس چیف تمام ریکارڈز درج کیا کرتے تھے اور انہوں نے اپنی اس ذاتی ڈائری کو ناناوتی، مہتا پینل کو مہیا بھی کرادیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اس کی ایک کاپی ایس آئی ٹی کی اس اسپیشل ٹیم کو بھی مہیا کرائی ہے، جو سپریم کورٹ کے حکم پر اس کیس کی تفتیش کررہی ہے۔ اس ڈائری میں کافی اہم ریکارڈ موجود ہیں اور جس سے عدالت کو کافی اہم معلومات حاصل ہوں گی، لیکن اصل ریکارڈ کے برباد کردیئے جانے کی وجہ سے معاملہ تو کمزور ضرور پڑا ہے اور بقول آر بی شری کمار اب سیاسی لیڈروں اور اعلیٰ پولس افسران پر ہاتھ ڈالنا مشکل تو ضرور ہوگیا ہے۔

شری کمار کہتے ہیں کہ حکومت کی بدنیتی اور بدمعاشی کا اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جب وہ اپنی پوسٹ سے ہٹائے گئے تھے' تو ریاستی حکومت نے باضابطہ انہیں ایک چارج شیٹ دی تھی اور حکم دیا تھا کہ وہ اپنی سیمی آفیشل ڈائری دفتر سے نہیں لے جائیں اور اس کو

دفتر کے حوالے کرکے جائیں۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ میری وہ ڈائری بھی ایک اہم ثبوت ہے، لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہو پائے اور آج وہ ڈائری ایک نہایت اہم ثبوت کے طور پر موجود ہے۔ اس وقت حکومت کے حکم کے مطابق اگر میں نے وہ ڈائری حکومت کے حوالے کردی ہوتی' تو آج اس ڈائری کا بھی وہی حشر ہوا ہوتا' جو دوسرے تمام اہم ثبوتوں اور ریکارڈز کا ہوا۔

آج عدالت میں پیش کی گئی یہ ڈائری اس لئے نہایت اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں انٹلیجنس چیف کے طور پر آر جی شیوکمار نے ان تمام واقعات اور حادثات کو ریکارڈ کیا تھا، جو اس وقت پیش آرہے تھے اور حکومت کی جانب سے احکامات اور ہدایات دی جارہی تھیں، علاوہ ازیں اس ڈائری میں بہت تفصیل سے بھارتیہ جنتا پارٹی کے لیڈروں اور پولس کے اعلیٰ افسران کی اس وقت کی مشترکہ کارروائیوں اور اہم میٹنگوں کی بھی پوری روداد موجود ہے۔

اب چاہے نریندر مودی وقتی طور پر کامیاب ہی ہوتے نظر آئیں، لیکن حقیقت یہی ہے کہ وہ اپنا دامن بچانے میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔

(بشکریہ نئی دنیا)

☆☆

گجرات مسلم کش فسادات

بے گناہ کون ہے اس شہر میں قاتل کے سوا!

● ڈاکٹر مشتاق احمد

قومی یکجہتی کونسل کے پندرہویں اجلاس میں فرقہ وارانہ تشدد انسداد بل کو بیشتر ریاستی حکومتوں نے یہ کہہ کر خارج کردیا کہ اس بل میں ترمیم واضافے کے بعد ہی اس پر غور وخوض کیا جائے گا۔ اگرچہ مرکزی حکومت چاہتی تھی کہ قومی یکجہتی کونسل سے پاس ہونے کے بعد اس قانون کو پارلیمنٹ میں بل کے طور پر پیش کیا جائے گا، لیکن غیر کانگریسی ریاستی حکومتوں کے وزیر اعلیٰ کے ساتھ ساتھ یوپی اے کی حمایتی جماعت مثلاً ترنمول کانگریس کی لیڈر اور مغربی بنگال کی وزیر اعلیٰ ممتا بنرجی نے بھی اس بل کی مخالفت کرکے یہ ثابت کردیا ہے کہ کانگریس حکومت اپنے حامیوں کے دل میں کتنی جگہ رکھتی ہے بالخصوص مسلمانوں سے متعلق کسی مسئلے پر؟ بہرکیف ابھی فرقہ وارانہ انسداد بل پر بحث ومباحثہ چل ہی رہا ہے کہ ملک کی سب سے بڑی عدالت سپریم کورٹ نے گجرات فسادات کیس میں فساد کے مبینہ ماسٹر مائنڈ وزیر اعلیٰ نریندر مودی کو یہ کہتے ہوئے راحت دے دی ہے کہ ان کے خلاف جو بھی الزامات ہیں اس کی سماعت ریاست کی نچلی عدالتوں میں ہوگی۔ واضح ہو کہ عدالتِ عظمیٰ کے اس فیصلے سے نریندر مودی کو اگرچہ کلین چٹ نہیں ملی ہے لیکن اتنی بات تو صاف ہوگئی ہے کہ گجرات فسادات کے متاثرین کو امروز فردا میں انصاف نہیں ملنے جارہا ہے۔ سپریم کورٹ میں ۲۰۰۲ء کے گجرات فسادات کے لئے وزیر اعلیٰ نریندر مودی اور دیگر ۲۶ر

افراد کے مبینہ فسادات میں شامل ہونے کے الزامات کو ثابت کرنے کے لئے خصوصی سراغ رساں ٹیم (ایس آئی ٹی) کی تشکیل دی گئی تھی اور اس ٹیم نے اپنی رپورٹ میں وزیر اعلیٰ نریندر مودی کو قصوروار ٹھہرایا ہے لیکن عدالتِ عظمیٰ نے خصوصی سراغ رساں ٹیم کی رپورٹ پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس میں جو دلائل پیش کئے گئے ہیں وہ مودی کو ملزم ٹھہرانے کے لئے ناکافی ہیں۔ واضح ہو کہ گلبرگہ ہاؤسنگ سوسائٹی میں کانگریس کے سابق ممبر پارلیامنٹ احسان جعفری کے ساتھ کئی دیگر افراد کو زندہ جلایا گیا تھا اور اس واقعے کی چشم دید گواہ بیگم احسان جعفری اپنے شوہر کے قاتل کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کی لڑائی لڑ رہی ہیں۔ عدالتِ عظمیٰ کے فاضل جسٹس ڈی کے جین، جسٹس پی سداشوم اور جسٹس آفتاب عالم پر مشتمل ڈویژن بنچ نے مسٹر مودی اور ان کے ساتھیوں کے رول کی جانچ کے سلسلے میں ایس آئی ٹی کو یہ ہدایت دی ہے کہ وہ اس معاملے میں اپنی قطعی رپورٹ نچلی عدالت میں پیش کریں۔ واضح ہو کہ گجرات گلبرگہ سوسائٹی میں ۲۸ فروری ۲۰۰۲ء کو احسان جعفری کے ساتھ ساتھ ۳۷/افراد کو زندہ جلایا گیا تھا۔ فساد کے بعد مودی کے علاوہ دیگر ۲۶/لوگوں کے خلاف معاملہ درج ہوا تھا اب جب کہ ایک بار پھر اس معاملے کو نچلی عدالت میں سماعت کے لئے بھیجا جارہا ہے تو یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ فسادات کے مہلوکین کے ورثا کو انصاف ملنے نہیں جارہا ہے، کیوں کہ پہلے ہی سے یہ بات دہرائی جاتی رہی ہے کہ اس معاملے کی سماعت ریاست سے باہر کی عدالتوں میں کی جائے۔ حال کے دنوں میں کئی آئی پی ایس آفیسران نے بھی مودی کو ملزم ٹھہرایا ہے اب جب نچلی عدالت میں از سرِ نو ٹرائل شروع ہوگا تو یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کتنا وقت لگ سکتا ہے اور اب سپریم کورٹ اس معاملے پر مزید کوئی نگرانی بھی نہیں رکھے گی۔ یہ مثل مشہور ہے کہ ’’انصاف میں تاخیر بھی ایک ناانصافی ہے۔‘‘ اس تناظر میں گجرات فسادات کے مہلوکین کے ورثا اور دیگر متاثرین کو انصاف کے لئے برسوں جدوجہد کرنی ہوگی اور ہمارے ملک میں عدالت میں معاملات کے جتنے انبار

ہیں اس میں اس کیس کی سماعت میں کتنا وقت لگے گا یہ کہنا مشکل ہے، اس لئے اب یہ بات صاف ہوگئی ہے کہ گجرات فسادات کے مجرموں کو قانونی داؤ پیچ کی وجہ سے راحت ملتی جارہی ہے۔ ایک طرف قومی یکجہتی کونسل نے حکومت کے فرقہ وارانہ انسداد بل کو خارج کردیا ہے تو دوسری طرف عدالتِ عظمیٰ کے اس فیصلے سے گجرات فسادات کے ملزمین کو راحت ملی ہے۔ ان دونوں واقعات سے ملک کے ایسے فرقہ پرست ذہنیت کے لوگوں کو حوصلہ ملا ہے جو ملک کی سالمیت کو پارہ پارہ کرنا چاہتے ہیں اور اس جمہوری نظام میں ملک کے اقلیت طبقے کو خوف و ہراس میں رکھنا چاہتے ہیں۔ ریاستی اور مرکزی حکومتیں سیاست کی بساط پر اپنی اپنی شطرنجی چال چل رہی ہیں اور ان کی چالوں سے عوام خسارۂ عظیم سے دوچار ہورہی ہیں۔ بالخصوص اقلیت طبقہ روز بروز محرومیوں اور ناامیدیوں کے بحرِ ذخار میں غوطہ زن ہوتا جارہا ہے۔ اس طرح ملک کے اس ماحول کو دیکھ کر اس وقت میرے ذہن میں سردار جعفری کا یہ شعر گونج رہا ہے کہ

تیغ منصف ہو جہاں، دار و رسن ہوں شاہد
بے گنہہ کون ہے اس شہر میں قاتل کے سوا

☆☆

گودھرا کو بم سے اڑانا چاہتے تھے ہندو دہشت گرد

کیا گودھرا ٹرین حادثہ بھی اسی گھناونی سوچ کی سازش تھی؟

● ادارہ

یہ بات تو مالیگاؤں میں 2008 میں ہوئے بم دھماکے کے کچھ ہی دنوں بعد بالکل ثابت ہوگئی تھی کہ ملک میں دہشت گردانہ کارروائیوں میں ہندو دہشت گردوں کا پورا ایک ٹولہ ملوث ہے اوراس کے عزائم بہت خطرناک ہیں اوران کی تربیت بہت منظّم انداز میں کی گئی ہے' لیکن جیسے جیسے تفتیش آگے بڑھی اوراس میں ملوث ہندو دہشت گردوں کی گرفتاری کا سلسلہ شروع ہوا' ویسے ویسے بہت ہی خطرناک قسم کی تصویرابھر کرسامنے آنے لگی۔

ملک میں ہونے والے بیشتر ہلاکت خیز بم دھماکوں میں ان کی شمولیت کی بات سامنے آنے لگی اور یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ ان خطرناک عزائم کی پوری منصوبہ بندی میں آرایس ایس سے متعلق بڑے ذمہ داران کا اہم کردار رہا ہے۔ پرگیہ سنگھ ٹھاکر' کرنل پروہت اور دیگر ہندو دہشت گردوں نے اپنی گرفتاری کے بعد خوداس کا اعتراف کیا کہ انہوں نے ان تخریبی کارروائیوں کوکس طرح انجام دیا ہے اوران کے ساتھ اورکون کون لوگ شریک تھے۔ اسی وقت یہ بات بھی سامنے آگئی تھی کہ آرایس ایس کے پرچارک اورمتحرک کارکن سنیل جوشی اوران کے دیگر ساتھی رام جی کلسانگرا اورسندیپ ڈانگے نے پورے ملک میں گھوم گھوم کراس ہندو دہشت گردی کے نیٹ ورک کوکس طرح منظّم کیا تھا اور بم دھماکوں کو

انجام دینے میں کس طرح کا عملی کردار ادا کیا تھا۔ مالیگاؤں بم دھماکے کی تفتیش ہیمنت کرکرے کررہے تھے اور انہی کی تفتیش کے دوران ہندو دہشت گردی کا یہ بھیانک چہرہ سامنے آیا تھا' لیکن ممبئی میں 26/11 کے حملے کے دوران ان کی موت کے بعدایسالگا' جیسے تفتیش کی یہ نہایت اہم شروعات آگے بڑھنے سے پہلے ہی کسی انجان مقام پر جاکر رک جائے گی اور ہندو دہشت گردوں کے آقاؤں تک قانون کا ہاتھ پہنچنا ناممکن ہوجائے گا' کیونکہ جس طرح ہماری تفتیشی ایجنسیاں اور پولس انتظامیہ بم دھماکوں کے الزام میں بغیر ثبوت وشواہد کے مسلمانوں کومسلسل گرفتار کرنے میں لگی ہوئی تھیں، اس سے تو یہی اندازہ لگ رہا تھا کہ اب بھی ہندو دہشت گردوں کے وجود کوتسلیم کرنے کے لئے سرکاری انتظامیہ بالکل تیارنہیں ہے، لیکن اچانک آرایس ایس کے ایک اوراہم فرد اسیمانند کی گرفتاری نے اس پورے منظر کو بالکل بدل کررکھ دیااورعدالت میں اس کے اعترافی بیان میں تفصیل سے یہ بات سامنے آگئی کہ مالیگاؤں کے 2008 کے بم دھماکے میں ہی صرف نہیں، بلکہ 2006 میں مالیگاؤں میں ہونے والے بم دھماکے' جس میں 35 مسلمان مارے گئے تھے اورکئی سوبری طرح زخمی ہوئے تھے،اس کے علاوہ سمجھوتہ ایکسپریس،خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ،حیدرآباد کی مکہ مسجداور دیگرمہاراشٹر کے شہروں اوردوسری جگہوں پر ہونے والے ہلاکت خیز بم دھماکوں میں بھی ہندودہشت گردوں کا ہاتھ تھا اوران تمام دھماکوں میں آرایس ایس سے جڑے ہوئے لوگ ملوث تھے۔ یہاں تک کہ اسیمانند کے بیان کے مطابق آرایس ایس کے نہایت اہم قائداورمسلم سنگھ کے بانی اندریش کمار بھی پورے طور پراس میں شریک تھے۔ واضح ہوکہ ان تمام بم دھماکوں کے الزام میں تفتیشی ایجنسیوں نے یک طرفہ طور پر مسلمانوں کی بڑے پیمانہ پرگرفتاریاں کی تھیں اور یہ سلسلہ جاری تھا۔ یہاں تک کہ اسیمانند کے اعترافی بیان کے باوجود نہ تو مسلمانوں کی گرفتاریوں کا سلسلہ رکا اور نہ ہی ان گرفتار مسلمانوں کی رہائی کی بہت دنوں تک کوئی صورت پیدا ہوئی، جوان دھماکوں

کے الزام میں پکڑے گئے، جبکہ اصل مجرموں کی پوری طرح سے نشاندہی ہوگئی تھی اور این آئی اے نے یہ قبول کر کے اپنی تفتیش کا رخ تبدیل کر دیا تھا کہ ان تمام بم دھماکوں میں ہندو دہشت گرد ملوث ہیں۔

حالیہ دنوں میں این آئی اے نے چار مفرور اور اصل مجرموں کو گرفتار کر کے ان کے اعترافی بیانات سے اس بات کو حتمی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ نہ صرف یہ کہ ملک میں ہندو دہشت گردوں کا ایک بڑا گروہ سرگرم عمل ہے اور اسی نے ملک کے یہ تمام خوفناک بم دھماکوں کو انجام دیا ہے۔ گرفتار کئے گئے ان ہندو دہشت گردوں نے نہ صرف ان بم دھماکوں میں شریک ہونے کی بات قبول کی ہے، بلکہ اس پورے منصوبے کے تمام اہم کرداروں کے چہرے سے بھی پردہ اٹھا دیا ہے۔ اب ثبوت کے لئے کسی بڑے گواہ یا زیادہ تار جوڑنے کی ضرورت نہیں ہے، پھر بھی گذشتہ دنوں جو فارنسک لیب رپورٹ سامنے آئی ہے، اس نے اس پوری سازش کو اور بھی کھول کر رکھ دیا ہے۔ این آئی اے کو حیدرآباد فارنسک لیب سے جو رپورٹ حاصل ہوئی ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ مالیگاؤں کے 2006 اور 2008 کے بم دھماکوں کے ساتھ ساتھ اجمیر شریف کی درگاہ، حیدرآباد کی مکہ مسجد، گجرات کے موڈاسا اور سمجھوتہ ایکسپریس میں جو بم دھماکے ہوئے تھے، سب میں پورے طور پر مماثلت پائی جاتی ہے اور یہ سب دھماکے ایک ہی گروہ کے ہاتھوں انجام پائے ہیں۔ ان تمام دھماکوں میں جو بم اور بم کنٹینرز استعمال کئے گئے تھے اور بم بنانے کی تکنیک برتی گئی تھی، جو الیکٹرانک سرکٹ استعمال میں لائے گئے تھے اور ان کو دھماکہ کرنے کا جو میکنزم بنایا گیا تھا، سب میں یکسانیت تھی اور یہ بالکل ایک ہی ذہن کی کارروائی نظر آتی ہے۔ یہ فارنسک لیب رپورٹ عدالت میں دیئے گئے، اسیما نند کے اس اعترافی بیان کی پورے طور پر تصدیق کرتی ہے کہ ان تمام بم دھماکوں میں ان ہندو دہشت گرد گروپوں کا ہاتھ تھا جس کی قیادت اندریش کمار کر رہے تھے۔ اسیما نند نے اپنے عدالت کے روبرو دیئے اعترافی بیان

میں سنیل جوشی، رام جی کلسنگرا اور سندیپ ڈانگے کو بھی کلیدی مجرم بتایا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ ستمبر 2008 میں مہاراشٹر کے مالیگاؤں اور گجرات کے موڈاسا میں ہونے والے بم دھماکوں سے کئی دن پہلے مدھیہ پردیش کے اندور سے دو شخص ایک ہیرو ہونڈا موٹر سائیکل پر سوار ہو کر ایک بہت ہی مخصوص مشن پر نکلے تھے۔ ان کا ایک تیسرا ساتھی اسی مشن پر اسی وقت نکلا تھا، لیکن وہ بس کے ذریعہ روانہ ہوا تھا۔ ان تینوں کی منزل گودھرا تھی۔ جہاں سے انہیں اپنے خطرناک مشن کے لئے تیار ہو کر اپنے ٹارگٹ کی طرف جانا تھا۔ نیشنل انویسٹی گیشن ایجنسی (این آئی اے) کے ذرائع کے مطابق یہ تینوں لوگ دھان سنگھ، رام جی کلسنگرا اور امیت عرف پرنس تھے۔ جنہوں نے مالیگاؤں کے 2006 کے بم دھماکے، سمجھوتہ ایکسپریس، مکہ مسجد اور اجمیر درگاہ کے بم دھماکوں کو انجام دیا تھا۔ گویا یہ جتنے بھی بم دھماکے ہوئے اور ان میں جن لوگوں کا ہاتھ تھا، ان سب کا گودھرا سے ایک خصوصی تعلق تھا اور انہوں نے ہر دھماکے کو انجام دینے سے پہلے گودھرا کے مخصوص مرکز میں جا کر ضرور منصوبہ سازی کی۔ گویا تمام بم دھماکوں میں گودھرا کو ایک مخصوص مرکزی مقام حاصل ہے، اس لئے اب اس شبہ کو تقویت ملتی جا رہی ہے کہ گودھرا اسٹیشن پر سابرمتی ایکسپریس کے دو ڈبوں میں جو حیرت انگیز انداز میں آگ لگی تھی اور جس میں 58 مسافر جل کر مر گئے تھے، وہ یقیناً ایک خاص سازش کا نتیجہ تھا اور اس میں ان لوگوں کا ہاتھ نہیں تھا، جن کو باہر سے پٹرول چھڑک کر آگ لگانے کے جرم میں ماخوذ کیا گیا اور موت سے لے کر تا حیات قید کی سزا سنائی گئی۔ کیا عجب کہ آگ لگانے کی یہ سازش اسی گودھرا کے مخصوص مرکز میں تیار کی گئی ہو اور اسی کے تحت یہ آگ اندر سے لگی ہوئی، جس کی طرف ریلوے انکوائری بورڈ کی ایک تحقیقاتی رپورٹ میں اشارہ کیا گیا تھا۔ اس وجہ سے اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ اس کی از سر نو انکوائری کرائی جائے، تاکہ اس پیدا ہونے والے شکوک کا ازالہ ہو سکے۔

اب جبکہ این آئی اے کی تفتیش نے اے ٹی ایس کی پرانی تفتیش، جن میں مالیگاؤں کے

2006 کے بم دھماکے میں مسلمانوں کو مجرم قرار دیا گیا تھا کو غلط ثابت کر دیا ہے' تو اب ایک نیا شوشہ سامنے آیا ہے کہ اس بم دھماکے کو ہندو دہشت گردوں نے تو انجام دیا تھا اور جس کے چار مجرم گرفتار کئے جا چکے ہیں، لیکن ان میں دو مسلم نوجوانوں کی بھی شمولیت تھی، جنہوں نے ان ہندو دہشت گردوں کو بم رکھنے میں مدد فراہم کی تھی، کیونکہ ان کے بغیر مسجد اور قبرستان میں جا کر بم نصب کرنا آسان کام نہیں تھا۔ ذرائع کے مطابق اسیمانند نے ہی اپنے بیان میں یہ بات کہی تھی کہ اجمیر میں جو دھماکہ ہوا، اس میں کوئی نہ کوئی مسلمان بھی شامل تھا۔ اسیمانند کے مطابق سنیل جوشی نے اس سے کہا تھا کہ اجمیر درگاہ میں دھماکہ ان کے لوگوں نے کیا تھا اور ان کے ساتھ دو مسلم لڑکے بھی شریک تھے۔ اسیمانند نے جب جوشی سے پوچھا کہ یہ مسلم لڑکے تم کو کہاں سے ملے، تو اس نے بتایا کہ آر ایس ایس کے قائد اندریش کمار نے ان کو ہمارے پاس بھیجا تھا۔ مسلم لڑکے ہندو دہشت گردوں کے آلہ کار تھے یا نہیں، یہ تو ثابت ہونا باقی ہے' لیکن کم از کم یہ بات تو مکمل طور پر ثابت ہوگئی ہے کہ ان دھماکوں میں اندریش کمار ہی ماسٹر مائنڈ کا کردار نبھا رہا تھا۔

(بشکریہ نئی دنیا)

☆☆

سپریم کورٹ کی تصدیق

مودی کے خلاف رپورٹ غیر اطمینان بخش

● ادارہ

سپریم کورٹ نے بھی اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ اے ٹی ایس نے گجرات کے گلبرگ سوسائٹی میں ہونے والے قتل عام کی جو رپورٹ تیار کی ہے، اس میں نہایت جانبداری برتتے ہوئے گجرات کے وزیر اعلیٰ نریندر مودی کو بچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اے ٹی ایس کی پوری رپورٹ میں ثبوت وشواہد تو جس طرح پیش کئے گئے تھے، اس سے پورا الزام نریندر مودی کے سر جاتا تھا، لیکن اپنی رپورٹ میں اے ٹی ایس نے آخر میں جو نتیجہ نکالا تھا، اس میں نریندر مودی کو بالکل کلین چٹ دیدی گئی تھی۔ نئی دنیا نے اپنے تجزیہ میں اے ٹی ایس کی اس رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ خود اس رپورٹ میں ہی نریندر مودی کے خلاف اتنے شواہد موجود ہیں کہ بآسانی ان کو ان جرائم کی بنیاد پر سولی پر چڑھایا جا سکتا ہے۔ لیکن اے ٹی ایس کے بڑے ایماندار سمجھے جانے والے ڈائریکٹر نے بھی اپنی اس رپورٹ میں وہی حرکت کی، جو ہماری تمام تفتیشی ایجنسیاں اکثر مسلم معاملات میں کرتی آئی ہیں۔ سپریم کورٹ کو بھی اس رپورٹ میں ایسی ہی بددیانتی کا احساس ہوا ہے اور اب اس نے بھی اس پر سوالیہ نشان لگاتے ہوئے دوبارہ اس کیس پر نظر ثانی کرنے کی بات کہی ہے۔

28 فروری 2002 کو احمد آباد کی گلبرگ سوسائٹی پر شدت پسند حملہ آوروں نے نہایت

منظّم انداز میں حملہ کیا تھا اور یہ سب کچھ حکومت کی پوری مشنری کی موجودگی اور اس کے تعاون سے انجام دیا گیا تھا۔ پوری سوسائٹی کو نذر آتش کر دیا گیا تھا اور اس میں تقریباً 50 لوگ قتل کئے گئے تھے۔ قتل کئے جانے والے لوگوں میں کانگریس کے سابق رکن پارلیمنٹ، احسان جعفری بھی تھے، جن کو زندہ جلا دیا گیا تھا۔ جب ان کے مکان پر حملہ آوروں نے دھاوا بولا تھا، تو انہوں نے مستقل وزیر اعلیٰ کے دفتر انتظامیہ کے اعلیٰ افسران اور مقامی پولس افسران کو لوگوں کی جان بچانے کے لئے فون پر رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن کسی نے بھی ان کی مدد کی گذارش کو قابل اعتنا نہیں سمجھا تھا اور کسی جانب سے بھی ان کی مدد کے لئے کوئی ہاتھ نہیں بڑھا تھا۔ بالآخر وہ اکیلے ہی فسادیوں سے اپنی زندگی کی جنگ لڑتے لڑتے مارے گئے اور ان کے ساتھ دیگر پچاس افراد کو بھی بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔

بعد کی تحقیقات میں اور بعض سینئر پولس افسروں کے اقبالیہ بیان اور کنٹرول روم سے جاری کی گئیں ہدایات کے شواہد کی روشنی میں یہ بات بالکل صاف ہوگئی تھی کہ گلبرگ سوسائٹی ہی نہیں، بلکہ پورے فساد میں ریاستی حکومت کی پوری مشنری غنڈوں کے ساتھ مسلمانوں کو تباہ کرنے اور انہیں جانی و مالی نقصان پہنچانے میں شریک تھی اور وزیر اعلیٰ اس پورے مشن کی قیادت کر رہے تھے۔ خود اے ٹی ایس نے جو اپنی رپورٹ پیش کی ہے، اس میں بھی ان تمام باتوں کو قبول کیا گیا ہے، لیکن جب نریندر مودی کو کٹہرے میں کھڑا کرنے کی بات آئی، تو یہاں پر بددیانتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کو صاف صاف بچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ سپریم کورٹ نے اے ٹی ایس کے ڈائریکٹر آر کے راگھون سے بہت صاف لفظوں میں کہا ہے کہ آپ کی رپورٹ میں ایسا لگتا ہے کہ صاف طور پر بعض معاملات میں اونچ نیچ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، کیونکہ آپ نے جو تحقیقات کی ہیں، وہ الگ ہیں اور اس سے جو نتیجہ نکالا ہے، وہ بالکل الگ ہے، اس لئے اب اس پورے معاملے میں دوبارہ تفتیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں عدالت نے دوسری سماعت کے

لئے 25 اپریل کی تاریخ مقرر کی ہے۔ عدالت نے محسوس کیا کہ تفتیشی ایجنسی نے اپنی رپورٹ میں گجرات کیڈر کے دو اعلیٰ پولس افسران، ڈی بی گونڈیا اور ایم کے ٹنڈن اور سابق ریاستی وزیر داخلہ گوردھن زڈافیا کے خلاف تو شواہد پیش کئے ہیں، لیکن ہر جگہ ان معاملات میں نریندر مودی کو بچانے کی کوشش کی گئی ہے۔

تفتیشی ایجنسیوں کا مسلم مخالف رویہ:

اے ٹی ایس کی یہ رپورٹ جو سپریم کورٹ میں پیش کی گئی ہے، اس رپورٹ کو تیار کرنے اور پورے معاملے کی از سر نو تفتیش و تحقیق کرنے کے لئے خود سپریم کورٹ نے بھی اے ٹی ایس کی نئی ٹیم آر کے راگھون کی قیادت میں تشکیل دی تھی۔ جب اس تفتیشی ایجنسی کی رپورٹ اتنی بددیانتی پر مشتمل ہو سکتی ہے، تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہماری پولس انتظامیہ اور خفیہ اور تفتیشی ایجنسیوں کا رویہ مسلمانوں کے تئیں کس قدر غیر منصفانہ، جانبدارانہ اور دشمنانہ ہوتا ہوگا۔ مسلمانوں کی جانب سے مستقلاً اس مسئلہ پر احتجاج کیا جاتا رہا ہے اور مختلف دہشت گردانہ معاملات میں جان بوجھ کر مسلم نوجوانوں کو پھنسانے اور ان کے خلاف کیس بنانے کی حرکتوں کے خلاف مسلمان اپنی آواز اٹھاتے رہے ہیں، لیکن نہ تو اقلیتوں کی حفاظت کا دعویٰ کرنے والی یہ حکومت کبھی مسلمانوں کے ان مطالبوں کو سننے کے لئے تیار ہوئی اور نہ ہی ہماری ایجنسیوں نے اس سلسلے میں اپنی روش میں کوئی تبدیلی پیدا کی۔ گجرات سے لے کر دہلی اور حیدرآباد سے لے کر اتر پردیش، بنگال اور مدھیہ پردیش تک، ہر جگہ تفتیشی ایجنسیوں کا رویہ ہمیشہ ہی مسلم مخالفانہ رہا اور انہوں نے جان بوجھ کر مسلمانوں کو مختلف مقدمات میں پھنسا کر ان کو کمزور کرنے اور نفسیاتی طور پر خوف زدہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

گزشتہ دنوں ایک سول سوسائٹی کے ارکان نے وزیر داخلہ پی چدمبرم کو بہت تفصیلی

خط لکھ کر ان ایجنسیوں کی مسلم مخالف ذہنیت پر سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے اور اس میں ثبوت وشواہد کی روشنی میں تفصیل سے یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح پولس انتظامیہ اور ہماری تفتیشی ایجنسیاں مسلمانوں کے خلاف اپنی بد دیانتی اور سفاکی کا مظاہرہ کرتی ہیں اور یہ ثابت ہوجانے کے باوجود کہ انہوں نے جو کیس بنایا تھا، اس کی بنیاد ہی غلط تھی، اس کے بعد بھی اس کیس کو مزید مضبوط بنانے کے لئے مختلف قسم کے ناجائز ہتھکنڈوں کا استعمال کرتی ہیں، اس لئے موجودہ بہت سارے قوانین میں فوری تبدیلی کی ضرورت ہے، تاکہ غلط طریقے سے کسی کو پھنسانے کی انتظامیہ کو جو آزادی حاصل ہے، اس کا خاتمہ کیا جاسکے۔

کہا گیا ہے کہ ایسے بے شمار ثبوت موجود ہیں کہ مسلم نوجوانوں کو دہشت گردی کے نام پر ان معاملات میں پھنسا کر ان کی زندگی کے اہم ماہ وسال کو برباد کیا گیا، جن میں ان کا دور دور تک بھی کوئی ہاتھ نہیں تھا اور اس سلسلے میں دہلی کی اسپیشل سیل نے تو ظلم وزیادتی کی انتہا ہی کردی ہے۔ آئی ایس آئی کا ایجنٹ ہونے کے الزام میں نہ جانے کتنے لوگوں کو گرفتار کیا اور ان کو بغیر مقدمہ چلائے ہوئے برسوں تک جیل کی کال کوٹھری میں رکھا گیا۔ حوالہ دیتے ہوئے اس خط میں لکھا گیا ہے کہ جولائی 2005 میں دہلی پولس کے اسپیشل سیل نے سات مسلم نوجوانوں کو یہ کہہ کر گرفتار کیا تھا کہ یہ آئی ایس آئی کے ایجنٹ ہیں۔ اس گرفتاری کے پانچ سال بعد ایڈیشنل سیشن جج اے ایس بھٹ کی عدالت نے ان ساتوں کو بالکل معصوم قرار دیا اور کہا کہ کسی بھی ثبوت کی روشنی میں ان پر کوئی الزام ثابت نہیں ہوتا ہے، بلکہ یہ بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ صرف انعام حاصل کرنے اور پرموشن کے لالچ میں ان نوجوانوں کو پولس نے اپنا وسیلہ بنایا اور بے بنیاد کیس میں پھنسا کر ان کی زندگی تباہ کی۔ اس خط میں اس البدر کیس کا بھی ذکر کیا گیا ہے، جس میں دو مسلم نوجوانوں کو دہشت گرد قرار دے کر گرفتار کیا گیا تھا، جبکہ اصل میں وہ دونوں پولیس کے مخبر تھے، لیکن اپنا کارنامہ دکھا کر

ان پولیس والوں نے پریسیڈنٹ ایوارڈ تک حاصل کیا۔ جب ثابت ہوگیا کہ ان دونوں مسلم نوجوانوں کو صرف اپنی کامیابی کے لئے گرفتار کیا گیا تھا، تو ان دونوں کی رہائی تو ہوگئی، لیکن ان انعام یافتہ پولس والوں کے خلاف کوئی کارروائی تک نہیں کی گئی۔ چدمبرم کو لکھے اس خط میں تفتیشی ایجنسیوں کی ایسی بے شمار مسلم دشمن حرکتوں کا ذکر کیا گیا ہے، جو سراسر بددیانتی پر مشتمل تھیں، لیکن سب کچھ جاننے کے باوجود بھی حکومت نے خاطی افسروں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ آج بھی بے بنیاد کیسوں میں پچاسوں مسلم نوجوان پورے ملک کی جیلوں میں اذیت ناک زندگی گزار رہے ہیں اور وزارت داخلہ کو بھی خوب معلوم ہے کہ یہ سب بالکل معصوم ہیں اور ان کو غلط الزامات میں پھنسایا گیا ہے، اس کے باوجود حکومت کی طرف سے بالکل خاموشی ہے۔

(بشکریہ نئی دنیا دہلی)

☆☆

صادق جمال اور سہراب الدین انکاؤنٹر

پھر چیخ اٹھا مودی کے آستین کا لہو

● ادارہ

ابھی اور نہ جانے کتنے معصوم مسلم نوجوانوں کے خون کی لالی کے دھبے نریندر مودی کے دامن پر اپنی بے گناہی کی شہادت دینے کے لئے نمودار ہونے والے ہیں۔ جو لوگ فسادیوں اور ہنگامے کے دوران پولس کی گولیوں کا شکار ہوئے، ان کی تعداد تو ہزاروں میں ہے، لیکن جن مسلم نوجوانوں کو چن چن کر فرضی مڈبھیڑ کے نام پر موت کے گھاٹ اتارا گیا، ان کی بھی تعداد دن بدن بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ کسی وجہ سے بعض فرضی مڈبھیڑ کے واقعات جو میڈیا اور سماج کے بعض انصاف پسند لوگوں کی آواز اٹھانے کی وجہ سے سرخیوں میں آئے، ان پر سے جب پردہ اٹھا تو پتہ چلا کہ کتنی حیوانیت کا مظاہرہ کیا گیا ہے، نریندر مودی کی حکومت میں اور کس منصوبہ بند طریقے سے مسلمانوں کی کمر توڑنے کی باضابطہ کوشش کی گئی ہے۔ وزیر اعلیٰ سے لے کر پوری سرکاری مشنری بالکل ایک مخصوص منصوبے کے تحت کام کرتی رہی اور کسی نے ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سوچا کہ کبھی ان کی آستین پر لگا ہوا لہو پکار پکار کر ان کی حیوانیت کی داستان سنائے گا۔ عشرت جہاں اور سہراب الدین شیخ کے لہو کی گواہی ابھی مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ اب نرودہ کے صادق جمال کا معاملہ سامنے آیا ہے، جسے نہایت بے دردی سے، نریندر مودی کے قتل کا منصوبہ بنانے کے الزام میں بدنام زمانہ، حیوان صفت پولس ڈی جی ونجارا نے فرضی مڈبھیڑ میں گولیوں کا نشانہ بنایا تھا۔ یہ وہی ڈی

جی ونجارا ہے، جس کے نام بیسیوں بے گناہ مسلم نوجوانوں کی ہلاکت درج ہے اور جس کی سفاکی کے متعلق خود اس کے ماتحت افسروں نے گواہیاں درج کرائی ہیں۔

صادق جمال کا کیس ایک ہندو صحافی کی مسلسل تگ و دو کی وجہ سے سامنے آیا ہے اور اس صحافی نے اتنے ثبوت وشواہد فراہم کردیئے ہیں کہ اب اس پر دوسرے کیسوں کی طرح پردہ ڈالنا حکومت کے لئے ممکن نہیں رہا۔ گجرات ہائی کورٹ نے ثبوت وشواہد کی روشنی میں صادق جمال کا کیس ریاستی پولس سے لے کر اب سی بی آئی کے حوالے کردیا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ گجرات ہائی کورٹ کے اس فیصلے کی وجہ سے ریاستی حکومت پریشانی میں مبتلا ہوگئی ہے، لیکن صادق جمال کے اہل خاندان کو کیا واقعی انصاف مل پائے گا اور ان کے قتل میں ملوث اوپر سے لے کر نیچے کی سطح تک کے تمام خاطیوں کو سزا ہو پائے گی، اس کے متعلق ابھی کچھ کہہ پانا بہت مشکل ہے۔

صادق جمال کو احمد آباد کے نرودا علاقے میں گلیکسی سنیما کے سامنے 31 جنوری 2003 کو ڈی جی ونجارا کی سرکردگی میں اس کی پولس ٹیم نے گولیوں سے بھون ڈالا تھا۔ اس وقت پولس نے دعویٰ کیا تھا کہ صادق جمال کا تعلق لشکر طیبہ سے تھا اور وہ گجرات میں وزیر اعلیٰ نریندر مودی اور سینئر بی جے پی لیڈر ایل کے اڈوانی کو قتل کرنے کی نیت سے داخل ہوا تھا۔ بعد میں اس فہرست میں پروین توگڑیا کا بھی نام جوڑ دیا گیا تھا۔ واضح ہو کہ جتنے مسلم نوجوانوں کو فرضی مڈبھیڑ میں مارا گیا، ان سب پر یہی الزام لگایا گیا کہ یہ لوگ وزیر اعلیٰ نریندر مودی اور توگڑیا وغیرہ جیسے لوگوں کے قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے یا قتل کرنے جا رہے تھے، لیکن صادق جمال کے اس فرضی مڈبھیڑ میں قتل پر 2003 میں ہی ممبئی میں سکونت پذیر ایک ہندو صحافی کیتن ترودکر نے سوال اٹھادیئے تھے اور مکوکا اسپیشل کورٹ میں حاضر ہوکر گواہی دی تھی کہ صادق جمال کوئی مجرم نہیں تھا اسے فرضی مڈبھیڑ میں مار گرایا گیا ہے اور کیتن نے اپنی اس گواہی میں ایک اور نہایت اہم بات کہی تھی کہ صادق جمال کے قتل میں مہاراشٹر کی کانگریسی حکومت کا ایک منظور نظر پولس افسر جسے انکاؤنٹر اسپیشلسٹ کا خطاب ملا ہوا تھا، بھی پورے طور

پر یوں شریک تھا کہ اس نے ہی صادق جمال کو گجرات کے ایک سیاست داں کی گذارش پر گجرات پولس کے حوالے کیا تھا۔ مہاراشٹر کا یہ پولس افسر دیا نائک تھا، جسے ایک زمانے میں مہاراشٹر کے وزیر داخلہ اپنا سب سے چہیتا سپوت قرار دیتے تھے، کیونکہ اس نے پچاسوں انکاؤنٹر کر کے ممبئی کو جرائم پیشہ افراد سے محفوظ کرنے کا کمال کر دکھایا تھا۔

کیتن ترواڈکر نے بعد میں میڈیا کے سامنے یہ بات کہی تھی کہ صادق جمال کو دیا نائک نے 11 جنوری 2003 کو بوریولی نیشنل پارک میں ڈی جی ونجارا کے حوالے کیا تھا۔ بعد میں گجرات پولس نے 13 جنوری کو اسے احمد آباد لے جا کر قتل کر ڈالا اور وہی پرانا الزام مشتہر کیا کہ صادق وزیر اعلیٰ نریندر مودی کو قتل کرنے کی نیت سے گجرات میں داخل ہوا تھا اور اس الزام میں تقریباً 20 مسلم نوجوانوں کا شکار کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ 2002 کے گودھرا فساد کے بعد پورے گجرات میں بھڑکے مسلم کش فسادات میں چونکہ بڑی تعداد میں مسلمان مارے گئے تھے، لہٰذا یہ لوگ اسی کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔

حالانکہ اگر دیکھا جائے تو صادق جمال کے قتل میں گجرات اور مہاراشٹر دونوں کی پولس یکساں طور پر ملوث ہے اور اس سلسلے میں کسی کا بھی دامن پاک نہیں رہا ہے اور اس کے ساتھ ہماری تفتیشی ایجنسیاں بھی ہمیشہ جانبدارانہ کارروائی کا ثبوت پیش کرتی رہی ہیں۔ اس کے باوجود گجرات ہائی کورٹ کے اس فیصلے سے کہ اب اس کیس کی تحقیقات سی بی آئی کرے گی، صادق جمال کے اہل خاندان کو انصاف ملنے کی امید پیدا ہوگئی ہے۔ اب یہ امید کب پوری ہوتی ہے، یہ تو بہر حال دیکھنے کی بات ہوگی، لیکن سی بی آئی کے حوالے کرنے سے اس کیس کی نوعیت میں تو بہر حال تبدیلی واقع ہو ہی گئی ہے اور اسی وجہ سے سمجھا جا رہا ہے کہ ریاستی حکومت کے لئے یک گونہ پریشانی میں ضرور اضافہ ہوگیا ہے۔ دراصل فرضی مڈ بھیڑ کے سلسلے میں سی بی آئی کے حوالے اس سے پہلے بھی گجرات کے دو کیس کئے جا چکے ہیں اور اس طرح یہ تیسرا کیس ہے۔ دوسرے کیسوں کی طرح ریاستی حکومت نے پوری

کوشش کی کہ یہ کیس بھی کسی طرح سی بی آئی کے حوالے نہ کیا جائے اور گجرات ہائی کورٹ کو مشورہ دیا گیا کہ اسپیشل ٹاسک فورس تشکیل دے کر گجرات میں ہی اس کی تفتیش کی جائے، لیکن ہائی کورٹ کے جسٹس ایم آر شاہ نے سرکاری مشینری کی حرکتوں کو دیکھتے ہوئے اس کیس کو سی بی آئی کے ہی حوالے کرنے کا فیصلہ سنایا۔ جسٹس شاہ نے اپنے فیصلے میں کہا کہ چونکہ اس کیس میں پولس کے اعلیٰ افسران ملوث ہیں، اس لئے اس کیس کی آزاد ایجنسی سے ہی تفتیش ہونی چاہئے۔ جسٹس شاہ نے حکومت کی جانب سے دائر کی گئی اس عرضی کو بھی خارج کر دیا کہ چونکہ مقتول کے بھائی نے واردات کے سات سال بعد اس سلسلے میں مقدمہ دائر کیا ہے، اس لئے مقدمہ دائر کرنے والے کی نیت پر شبہ پیدا ہوتا ہے۔ جسٹس شاہ نے کہا کہ جرم کبھی فوت نہیں ہوتا اور اس کے خلاف ہر اپیل قابل سماعت ہوتی ہے۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ گجرات میں جتنے بھی فرضی مڈ بھیڑ کے واقعات ہوئے ہیں، ان سبھی میں سب سے متحرک کردار ڈی جی ونجارا نے ادا کیا ہے اور اس سلسلے میں ونجارا کی مدد ہمیشہ مہاراشٹر کے اس کے ہم منصب پولس افسران کرتے رہے ہیں۔ ممبئی کی کالج طالبہ عشرت جہاں کا احمد آباد کے نزدیک 15 جنوری 2004 کو انکاؤنٹر کیا گیا تھا اور کہا جاتا ہے کہ عشرت جہاں کو بھی گجرات پولس کے حوالے کرنے میں ممبئی کے بعض پولس افسران نے ہی مدد پہنچائی تھی۔ اس سلسلے میں ونجارا مودی کی آنکھوں کا تارہ بنا ہوا تھا، حالانکہ آج وہ جیل میں ہے، پھر بھی نریندر مودی کی پوری سرکاری مشینری مستقل اس کو بچانے کی کوششوں میں لگی رہتی ہے۔

صادق جمال کے کیس میں سب سے اہم کردار کیتن ترواڈکر نے ادا کیا ہے اور ان کی فراہم کردہ شہادتوں اور گواہیوں سے اگر صادق جمال کا قتل ایک فرضی مڈ بھیڑ ثابت ہو جاتا ہے، تو اس سے نہ صرف صادق جمال کے لواحقین کو انصاف ملے گا، بلکہ گجرات کے حیوان صفت درندوں کے گرد کستا ہوا شکنجہ اپنی گرفت اور مضبوط کر پائے گا۔

☆☆

آسام میں فرقہ وارانہ فسادات

● دلال مشرا

آسام کے فسادزدہ بوڈولینڈ ٹیریٹوریل اٹانومس ڈسٹرکٹس علاقہ میں خون اور آنسو یکساں طور پر بہہ رہے ہیں۔ حالانکہ صورت حال میں بتدریج بہتری آرہی ہے، تاہم ابھی بھی اس پورے علاقہ میں کشیدگی کا ماحول ہے۔ موجودہ بی ٹی اے ڈی علاقہ بالترتیب 1991,1987 اور 1996 میں تین زبردست فسادات سے لرز گیا۔ ان نسلی فسادات میں ہزاروں لوگ مارے گئے۔ 1987 میں پہلا فساد بوڈوز اور سنتھالیوں کے درمیان تصادم کا نتیجہ تھا، دوسرا فساد بوڈوز اور غیر قانونی مہاجرین کے درمیان پیش آیا اور تیسرا فساد بوڈوز اور سنتھالیوں میں ٹکراؤ کی وجہ سے رونما ہوا۔ 1996 کے فساد میں سنتھالیوں کے علاوہ کوچ-راج بنگشی اور مقامی مسلمانوں کو بھی زبردست نقصان اٹھانا پڑا۔ البتہ حال میں جولائی کے آخری حصہ میں جو فساد رونما ہوا، وہ بلاشبہ بوڈو اور مشتبہ بنگلہ دیشیوں کے درمیان ایک تصادم ہے۔ اس فساد میں دونوں برادریوں کے زائد از 5 لاکھ لوگ بے گھر ہو گئے ہیں۔ 10 اگست تک تقریباً 77 لوگ جاں بحق ہوئے ہیں اور 10000 سے زائد گھروں کو نذر آتش کردیا گیا ہے۔

یہ تصادم 19 جولائی 2012 کو شروع ہوا۔ اس دن ضلع کوکراجھار کے مگرماری میں نامعلوم بندوق برداروں نے اقلیتی برادری کے دو لوگوں کو گولی مار کر ہلاک کردیا۔ اس

حادثہ کے بعد موٹر سائیکل پر سوار شرپسندوں کا ایک گروپ کوکراجھار کے بھاٹی پارا گاؤں میں داخل ہوا اور بوڈو کنبہ کے ایک مکان کو مسمار کردیا۔ 20 جولائی کو بوڈو لبریشن ٹائگر (بی ایل ٹی) کے ایک سابق باغی سمیت بوڈو کے 4 نوجوانوں کو کوکراجھار کے نامپاڑا گاؤں میں گولی ماردی گئی۔ اس طرح کے واقعات نے بعد میں فرقہ وارانہ تشدد کی شکل اختیار کرلی۔ فساد کے پہلے تین دنوں میں بی ٹی اے ڈی علاقہ کے مختلف حصوں میں 36 لوگ مارے گئے۔ ان دنوں میں دونوں برادریوں کے زائد از 8,000 مکانات نذر آتش کر دیئے گئے۔ 48 گھنٹوں کے اندر 3 لاکھ سے زائد لوگ بے گھر ہوگئے۔ 6 دنوں تک مسلسل خونریزی کے بعد چرانگ، کوکراجھار اور باسکا اضلاع میں فوج تعینات کردی گئی۔ 27 جولائی کے بعد فساد کی چنگاری قریبی اضلاع میں بھی بھڑک گئی۔ حالانکہ ضلع ڈھبری بی ٹی اے ڈی علاقہ میں نہیں آتا ہے، تاہم اس ضلع میں بھی فساد کی آگ بھڑک اٹھی۔ ریاستی حکومت نے بی ٹی اے ڈی علاقہ میں کرفیو نافذ کردیا اور حالات پر قابو پانے کے لئے فسادیوں کو دیکھتے ہی گولی مارنے کا حکم دے دیا۔

انتیس جولائی کو وزیراعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ نے بی ٹی اے ڈی علاقہ کا دورہ کیا اور متاثرین کی بازآبادکاری اور مسمار کئے گئے مکانات کی تعمیر نو کے لئے 300 کروڑ روپے کے ایک خصوصی پیکیج کا اعلان کیا۔ اپنے دورہ کے دوران وزیراعظم نے یہ یقین دہانی بھی کرائی کہ ضرورت پڑنے پر مرکزی حکومت بی ٹی اے ڈی انتظامیہ کو مزید مالی امداد فراہم کرے گی۔ وزیراعظم نے آسام فساد کو ملک کی پیشانی پر ایک بدنما داغ سے تعبیر کیا ہے۔ اس وقت کے وزیر داخلہ پی چدمبرم نے بھی 30 جولائی کو بی ٹی اے ڈی علاقہ کا دورہ اور ان کے دورہ کے دوران ضلع چرانگ میں 10 مکانات جلادیئے گئے۔ کوکراجھار سے 10 کلومیٹر کی دوری پر واقع رانی گھلی میں فسادیوں نے تین افراد کو گولی ماردی اور دیگر کئی افراد کو زخمی کردیا۔ انتظامیہ نے ایک بار پھر کوکراجھار اور ڈھبری اضلاع میں کرفیو نافذ کردیا۔

کشیدگی میں اس وقت اضافہ ہو گیا جب ایک ہجوم نے متاثرین کی تین لاشوں کے ساتھ جلوس نکالا اور این ایچ 31 جام کر دیا۔ اسے دیکھ کر ہزاروں لوگ سڑکوں پر نکل آئے اور ہجوم میں شامل ہو گئے۔ صورت حال پر قابو پانے کی غرض سے انتظامیہ نے کرفیو نافذ کر دیا اور ضلع ڈھبری کے بلاشی پارا سب ڈویژن میں فسادیوں کو دیکھتے ہی گولی مارنے کا حکم دے دیا۔ فسادیوں نے 5 اگست کو ضلع چرانگ میں باپ اور بیٹے کا قتل کر دیا۔ اس واقعہ کے فوراً بعد ضلع انتظامیہ نے پورے ضلع میں کرفیو نافذ کر دیا۔

تشدد پھوٹنے کے فوراً بعد ہی بی ٹی اے ڈی سربراہ گرمام ہیلیری نے الزام لگایا کہ ہندوستان اور بنگلہ دیش کے بین الاقوامی سرحد سے سینکڑوں بنگلہ دیشی بی ٹی اے ڈی علاقہ میں گھس آئے ہیں۔ انہوں نے مزید یہ الزام لگایا کہ یہی لوگ اس تشدد کے ذمہ دار ہیں۔ آل ایکس-بی ایل ٹی ویلفیئر سوسائٹی کے سکریٹری جنوموہن موشہری نے بھی یہ الزام عائد کیا کہ رمضان اسلام کی چیئرمین شپ کے تحت نوتشکیل شدہ ملی ٹنیٹ تنظیم یونائیٹڈ مسلم نیشنل آرمی بی ٹی اے ڈی علاقہ میں تازہ ترین تشدد کے لئے ذمہ دار ہے۔ موشہری نے الزام لگایا کہ اس تنظیم کا قیام 15 جون کو عمل میں آیا اور اس نے ایک علیٰحدہ مسلم ریاست کا مطالبہ کیا ہے جو کہ بی ٹی اے ڈی علاقہ کے 4 اضلاع سمیت آسام کے 13 اضلاع پر مشتمل ہو۔ دریں اثنا، الفا لیڈر مرینل ہزاریکا نے بھی یہی الزام لگاتے ہوئے کہا ہے کہ ہتھیاروں سے بھری ایک کشتی نے پڑوسی بنگلہ دیش سے برہم پتر کو پار کیا ہے۔ ہزاریکا کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے موشہری نے کہا کہ ”ہزاریکا نے یہ کہا تھا کہ اسلحوں سے لدی ایک مشین کشتی نے برہم پتر کو پار کیا تھا اور مزید دو کشتیاں پار کر رہی ہیں۔ حکومت کو اس معاملہ کی جانچ کرنی چاہئے۔“ بوڈولینڈ ٹیریٹوریل کونسل کے نائب سربراہ کھمپا بورگویری نے بھی یہ الزام لگایا ہے کہ اس فساد میں بنگلہ دیشی ملوث ہیں۔ دوسری طرف اس الزام کو یکسر مسترد کرتے ہوئے اولڈ آسام مائناریٹی اسٹوڈنٹس یونین اور آل بی ٹی سی مائناریٹی اسٹوڈنٹس یونین نے کہا ہے

کہ فساد میں غیر قانونی مہاجرین ملوث نہیں ہیں۔ فساد کے لئے بی ٹی اے ڈی سربراہ پورے طور پر ذمہ دار ہیں۔

جماعت اسلامی کے سکریٹری مجتبیٰ فاروق کہتے ہیں کہ ”آسام کی ساری سیاست مسلمانوں کی بڑھتی آبادی کو لے کر ہے۔ اب انہوں نے ایک آسان راستہ یہ نکالا کہ مسلمانوں کو باہر کیا جائے۔ ریاستی حکومت مسلمانوں کے تعلق سے سنجیدہ نہیں ہے۔ وہ صرف دکھاوے کے لئے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی بات کرتی ہے“۔

☆☆

آسام میں مسلمانوں کا قتل عام اور سوشل میڈیا

● عابد انور

ہندوستان میں مسائل کا خاتمہ اس لئے نہیں ہوتا کیوں کہ یہاں ہر معاملے میں دوہرا معیار اپنایا جاتا ہے۔حکومت ہو یا افسران، لیڈر ہو یا دیگر شعبہ حیات سے وابستہ افراد کبھی بھی ایمانداری سے کام نہیں کرتے اور نہ ہی حالات وواقعات کا صحیح تجزیہ کر کے تصفیہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔سب سے بری بات یہ ہوتی ہے کہ ہر معاملے کو مسلم اور ہندو کے پہلو سے دیکھا جاتا ہے جس میں تعصب کا رنگ نمایاں ہوتا ہے جس کی وجہ سے تجزیہ کرنے والے یا مسائل کا حل کرنے والے یا ادراک کرنے والے ہندو اور مسلم کے نظریہ کے حصار میں قید ہو جاتے ہیں اور مسئلہ حل ہونے کے بجائے مزید پیچیدہ ہو جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ملک بھر میں کہیں بھی چھوٹی موٹی جھڑپ ہوتی ہے وہ فوراً فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر لیتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے دونوں فرقوں کے درمیان فساد شروع ہو جاتا ہے۔اگر اس معاملے کو صرف انسانیت کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو وہ معاملہ وہیں دب جائے گا اور فساد کی صورت اختیار نہیں کرے گا۔اس کے علاوہ معاملہ مسلمانوں کا ہوتا ہے یا مسلمانوں کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے تو ہندوستانی میڈیا فوراً اسے فرقہ وارانہ رنگ دینے میں لگ جاتا ہے۔الیکٹرونک میڈیا یا ہو پرنٹ میڈیا مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کو بھی ہندوؤں پر ہونے والے مظالم کے طور پر پیش کرتا ہے۔آسام، بریلی، مرادآباد، کوسی کلاں اور گوپال گڑھ کے فسادات کے بارے میں ہندوستانی میڈیا کی رائے جو انٹرنیٹ پر دستیاب ہے اسے دیکھ

لیں تو آپ کو خود بخود اندازہ ہو جائے گا کہ ہندوستانی میڈیا کس قدر مسلم دشمنی پر آمادہ ہے۔ ہندی اور ہندوستانی میڈیا (اردو اخبارات کے علاوہ) کا کوئی بھی مطالعہ کرے گا تو ان کے علم میں ایک ہی بات رچ بس جائے گی کہ ہندوستانی مسلمان جرائم پیشہ ہیں، دہشت گرد ہیں، فسادی ہیں اور طرح طرح کے جرائم میں ملوث ہیں۔انہیں انسانیت سے عار ہے۔ ہندوستانی میڈیا مسلمانوں کے ساتھ ایک منصوبہ بند اور منظّم سازش کے تحت ایسا کر رہا ہے اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اگر ان کے مظالم کے پہاڑ توڑے جائیں تو یہ کہا جا سکے کہ مجرم کے ساتھ اور کیسا سلوک ہوگا۔میڈیا نے مسلمانوں کے مسائل اٹھانے سے ہمیشہ گریز کیا ہے اگر انتظامیہ، پولیس اور حکومت کے اہلکاران پر مظالم ڈھاتے ہیں تو اولاً ہندوستانی میڈیا اپنے یہاں جگہ ہی نہیں دیتا اگر دیتا بھی ہے تو اندرونی صفحہ پر ایسی جگہ کہ جس پر کسی کی نظر نہ پڑ سکے۔کہتے ہیں کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔آج جو خبر کہیں نہیں ملے گی وہ سوشل نیٹ ورک اور سوشل میڈیا پر وہ خبر مل جائے گی۔سوشل میڈیا نے ہر آدمی کو سٹیزن جرنلسٹ بنا دیا ہے اور وہ اپنے علاقے اور گرد و پیش کے حالات وواقعات کو سوشل میڈیا کے توسط سے فوراً پوری دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔ بہار کی نتیش کمار حکومت جو ہندوستانی میڈیا کے سہارے بہتر حکومت فراہم کر رہی ہے کوئی بڑا واقعہ پیش آتا ہے میڈیا اس کو دینے سے گریز کرتا ہے جس پر پریس کونسل نے بھی اعتراض کیا ہے اور اس بارے میں تفتیش بھی کی ہے لیکن بہار کے سوشل میڈیا نے ہر معاملے کو لوگوں کو تک پہنچایا ہے۔یہی میڈیا آج حکومت اور فرقہ پرستوں کی آنکھوں میں کانٹوں کی طرح چبھ رہا ہے۔سکے کے دو پہلو کی طرح یہاں فرقہ پرست طاقتوں کے دو پہلو ہیں ایک بی جے پی اور دوسری کانگریس ہے۔دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ بی جے پی جو کرتی ہے وہ کھلم کھلا کرتی ہے اور کانگریس خاموشی سے۔

سوشل میڈیا نے پوری دنیا کو ایک گاؤں کی شکل میں پیش کر دیا ہے جہاں کہیں بھی مظالم کے واقعات پیش آتے ہیں سوشل میڈیا پر اس کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔ہندوستانی میڈیا

نے جس طرح برما اور آسام کے مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کے بارے میں کچھ لکھنے کے بجائے آسامی مسلمانوں کو بنگلہ دیشی قرار دینے میں زمین آسمان ایک کر دیا ہے۔ آج کوئی بھی ہندی یا انگریزی کا چینل دیکھیں سب میں ایک ہی آواز سنائی دے گی بنگلہ دیشی گھس پیٹھئے (درانداز) کوئی بھی میڈیا حقیقت سے پردہ اٹھانے کی کوشش نہیں کر رہا ہے اور نہ ہی آسامی مسلمانوں ہونے والے مظالم کے بارے میں اپنے یہاں کچھ لکھ رہا ہے۔ اس میں سوشل میڈیا کا حرکت میں آنا لازمی ہے۔ سوشل میڈ فیس بک، ٹوئٹر اور دیگر ویب سائٹوں پر اس سے متعلق تصاویر اور ویڈیو آنے لگے۔ جب سے کیمرہ والا موبائل آیا ہے ہر طرح کے واقعہ کا اب ریکارڈ کیا جانے لگا ہے اور ریکارڈ کر کے وہ یوٹیوب اور فیس بک اور ٹوئٹر اور دوسرے سوشل نیٹ ورکنگ سائٹوں پر ڈال رہے ہیں۔ حکومت نے شمال مشرق کے لوگوں میں خوف وہراس کا بہانہ بنا کر اس کے خلاف کارروائی کی ہے۔ ایس ایم ایس، ایم ایم ایس اور دیگر فوٹو گراف اور ویڈیو اپ لوڈ پر متعلقہ سائٹوں سے پابندی لگانے کے لئے کہا ہے۔ حد یہ تو ہے کہ پانچ ایس ایم ایس سے زائد بھیجنے پر بھی پابندی ہے۔ حکومت نے عین عید کے موقع پر یہ پابندی لگائی ہے کیا حکومت ایسا ہی قدم ہولی دیوالی کے موقع پر اٹھا سکتی تھی۔ اس سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ کسی مسلم لیڈر یا تنظیم سے وابستہ کسی رہنما اس کے خلاف آواز بلند کرنے کی زحمت تک نہیں کی۔ یہ اچھی بات ہے کہ امریکہ نے اس پر اعتراض کیا ہے۔ حکومت کو سوشل میڈیا پر پابندی لگانے کے بجائے مظالم کو روکنے کی کوشش کرنی چاہئے جب مظالم نہیں ہوں گے تو سوشل میڈیا پر بھی ذکر نہیں آئے گا۔

شمال مشرق کے لوگوں کے خلاف پھیلی افواہ اور دہشت کا شکار کوئی ہندو نہیں ہوا بلکہ مسلمان ہوا ہے۔ بنگلور سے آسام جانے والی ایک خصوصی ٹرین میں کچھ لوگوں نے مغربی بنگال کے جلپائی گوڑی میں ۴۰،۵۰ لوگوں پر مشتمل مشتعل بھیڑ نے لوگوں کے آئی کارڈ چیک کئے جتنے مسلمان پائے گئے ان سب کو زدوکوب کیا اور پھر ۱۴! افراد کو ٹرین سے باہر

پھینک دیا۔ جن میں چار کی موت ہوگئی اور باقی سنگین زخمی حالت میں سلی گوڑی کے اسپتال میں داخل ہیں۔ سوال یہ ہے افواہ تو مسلمان پھیلا رہے تھے جیسا کہ ہندوستانی میڈیا کا خیال ہے تو ان لوگوں کو کس نے ٹرین سے پھینکا؟۔ ظاہر سی بات ہے کہ یہ گھناؤنا کارنامہ سنگھ پریوار اور اس کے ہمدرد کے علاوہ اور کوئی انجام نہیں دے سکتا۔ کیوں کہ اتنے اچھے کام سنگھ پریوار والے ہی کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بنگلور میں گارڈ کا کام کرنے والے ۲۲ سالہ شاہجہان چودھری بھی اسی ٹرین سے اپنے گھر لوٹ رہے تھے ان کے ساتھ بھی مار پیٹ کی گئی جس کے بعد وہ نازک حالت میں اسپتال میں داخل ہیں۔ ٹرین میں آر پی ایف کے دس خصوصی طور پر تربیت یافتہ جوان اور پانچ ریلوے پولیس کے جوان تعینات تھے اس کے باوجود دو تین گھنٹے تک چلنے والے اس تشدد کے کھیل کو روکنے میں ناکام رہے۔ اتنے دیر تک ان لوگوں نے ڈبہ اندر سے بند کئے رکھا اور ریلوے پولیس نے اس پر کوئی توجہ کیوں نہیں دی اور نہ ہی ریلوے کے اعلی افسران کو خبر دی۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ان ۴۰،۵۰ افراد میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو بنگلور سے ٹرین میں سوار ہوئے تھے۔ ٹرین سے پھینکے گئے ان تمام چودہ جوانوں کا تعلق آسام کے ضلع ہیلاکانڈی تھا۔ ذاکر حسین نامی ایک شخص اسی ٹرین میں سفر کر رہا تھا لیکن اس کا کوئی اتہ پتہ نہیں ہے۔ مرکزی وریاستی حکومت کی بے حسی کا اندازہ اس بات لگایا جاسکتا ہے کہ ان ۱۴ مسلمانوں کو ٹرین سے پھینکنے والے اب تک گرفت سے باہر ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حکومت کا ان لوگوں کو گرفت میں لینے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ تصور کیجئے اگر یہ مسلمان نہ ہو کر ہندو ہوتے تو اس وقت پورا ملک جل رہا ہوتا۔ فرقہ پرست مسلمانوں کو ہر جگہ ,,سبق،، سکھا رہے ہوتے۔

اس میں کوئی شک نہیں سوشل میڈیا اس وقت خبر عام کرنے کا سب سے موثر ہتھیار اور زرد صحافت کا ردعمل ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں لوگوں کے ذاتی ویب سائٹس ہیں جس میں اپنے اردگرد پیش آنے والے واقعات کو قلم بند کرتے رہتے ہیں۔ سوشل میڈیا کی خاص

بات یہ ہے کہ لمحوں میں یہ بات پوری دنیا میں پھیل جاتی ہے اور ہر اس آدمی تک پہنچ جاتی ہے جو سائٹ کھولے بیٹھا ہے۔ حالیہ دنوں میں سوشل سائٹوں میں لوگوں کی دلچسپی میں بے تحاشہ اضافہ ہوا ہے۔ ہر انسان کوئی نہ کوئی سوشل نیٹ ورک سائٹ سے منسلک ہونا چاہتا ہے۔ ہر بڑے آدمی کا فیس بک اور ٹوئٹر پر اکاؤنٹ ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق ٹویٹر کے صارفین کی تعداد 50 کروڑ سے تجاوز ہو چکی ہے۔ روزانہ اوسطاً 14 کروڑ افراد ٹویٹ کرتے ہیں، فیس بک ایک ارب صارفین ہونے کی طرف گامزن ہے، فیس بک کے سرگرم صارفین کی تعداد 80 کروڑ سے زائد ہے، فیس بک پر ہر ماہ 6 ارب تصاویر پوسٹ کی جاتی ہیں اور تقریباً ایک کھرب تصاویر ان کے سرورز میں محفوظ ہیں، فیس بک کو دنیا میں تصاویر کے اشتراک کا سب سے بڑا پلیٹ فارم سمجھا جا رہا ہے گزشتہ برس سے آغاز کرنے والے گوگل پلس کے صارفین کی تعداد 9 کروڑ ہے اب تک گوگل پلس پر دس لاکھ سے زیادہ صفحات تخلیق کیے گئے ہیں۔ فیس بک نے حال ہی میں اعلان کیا ہے کہ وہ جلد ہی ایک ارب صارفین کا سنگ میل عبور کر جائیں گے۔ گزشتہ برس گوگل پلس سوشل میڈیا کا سب بڑا حریف بن کر سامنے آیا۔

سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ جب مسلمانوں کے خلاف فیس بک اور ٹوئٹر پر اشتعال انگیز مواد شائع کئے جاتے ہیں تو اس وقت حکومت کی نیند کیوں نہیں کھلتی۔ آسام میں فرقہ وارانہ فسادات، روہنگیا مسلم اور بنگلور سے شمال مشرق کے لوگوں کا واپس لوٹنا ان تمام میں کہیں نہ کہیں سوشل میڈیا کی جھلک ضرور نظر آتی ہے۔ فیس بک پر ایسی تصاویر ہیں جو اشتعال انگیز ہیں۔ یہ تصاویر بالکل سچی لگتی ہیں۔ اسی طرح کچھ تصاویر ایسی بھی ہیں جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کا ہاتھ پیر کاٹ دیا ہے اور ایک آدمی کا چمڑا اتار رہا ہے جب کہ حقیقت میں یہ ممکن نہیں ہے کہ انسان کا چمڑا اتارا جا سکے۔ یہ کام یک طرفہ نہیں ہے۔ مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں کی طرف سے اشتعال پھیلا جاتا ہے۔ مظالم کے شکار

مسلمانوں کے فوٹوگراف کو ہندوؤں کے تصاویر میں تبدیل کر کے یہ بتانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ہندوؤں پر بہت ظلم ہو رہا ہے۔ اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں کہ تو مرادآباد، بریلی، کوسی کلاں اور دیگر مقامات پر ہونے والے فسادات کے بارے میں ہندی میں سرچ کریں تو آپ کو بے شمار اس طرح کے مواد مل جائیں گے کہ جس میں ہندوؤں کو انتقام کے لئے اکسایا گیا ہے جب کہ حقیقی صورت حال یہ ہے کہ ان مقامات پر ہندوؤں کا کوئی نقصان نہیں ہوا ہے۔ نقصان صرف مسلمانوں کا ہوا ہے خواہ وہ جانی ہو یا مالی۔ یہ تصویریں کمپیوٹر کے ذریعے تبدیل کر دی جاتی ہیں اور حقیقت سے بہت مختلف بھی ہوتی ہیں ان تصویروں سے جذبات کو بھڑکانے کام باقاعدہ ہوتا۔ شمال مشرق کے کچھ باشندوں میں تھوڑی کھلبلی کیا مچی حکومت کیا، اپوزیشن کیا اور یہاں تک پارلیمنٹ میں ہنگامہ کھڑا ہو گیا ہے جب کہ کہیں اب تک شمال مشرق کے باشندوں کے کسی طرح کے غلط سلوک کی خبر نہیں ہے جب کہ کچھ مسلمانوں کے ٹرین سے پھینک کر موت کے گھاٹ اتارنے واقعہ پیش آچکا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اب تک تقریباً ۳۰ر ہزار افراد ہندوستان کے مختلف شہروں میں شمال مشرق کوچ کر چکے ہیں۔ بنگلور، چنئی، پونے اور ممبئی جیسے شہروں سے خوفزدہ ہو کر شمال مشرق کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق گزشتہ تین سے چار دن میں تقریبا 15 ہزار لوگ بنگلور چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق تقریباً 800 لوگ ممبئی چھوڑ چکے ہیں۔ آخر حکومت اس طرح کے واقعات رونما ہونے کا موقع ہی کیوں دیتی ہے۔ سوشل میڈیا پر پابندی لگانا اس مسئلے کا حل نہیں ہے۔ یہ آزادی اظہار پر حملہ ہے جو جمہوری حقوق کے منافی ہے۔ کارروائی اگر کرنی ہے تو تمام لوگوں پر کارروائی کرنی چاہئے۔ صرف مسلمانوں پر کارروائی کر کے حکومت یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہی ہے کہ صرف مسلمان اشتعال پھیلا رہے ہیں جبکہ اشتعال پھیلانے والے مسلمان آٹے میں نمک کے برابر ہیں اور ہندو اشتعال پھیلانے میں آگا ہیں۔ اس بات کو انڈین ایکسپریس اور ٹائمس آف انڈیا

نے اپنی خصوصی رپورٹ میں اجاگر کیا ہے۔ ریاستی یا مرکزی حکومت نے کتنے ایسے لوگوں کو گرفتار کیا ہے۔ مرکزی داخلہ سکریٹری نے اس مسئلے پر اپنے لب کیوں سی لئے ہیں۔ یہ بات عقل میں آنے والی بھی ہے ٹکنالوجی تک پہنچ سب سے زیادہ کس کی ہے۔ کس کے پاس وسائل کی بھرمار ہے اور کس کو پولیس اور قانون کا خوف نہیں ہے۔ کس کے سیاں کوتوال ہیں۔ ان سب باتوں پر غور کیا جاتا تو یہ نوبت نہیں آتی۔ ہندوستان میں یہ فیشن بن گیا ہے کہ کچھ بھی ہو پاکستان کا نام لے کر گلوخلاصی کرلیا جائے۔ فرقہ وارانہ فسادات کو بھی بیرونی ہاتھ قرار دے کر اپنے کو بری الذمہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حالانکہ ہر جگہ تمام فسادات کی تہہ میں سنگھ پریوار اور اس سے وابستہ تنظیموں کا ہاتھ ثابت ہوا ہے لیکن آج تک ہندوستان کوئی قانون ان لوگوں کی گردن ناپنے میں ناکام رہا ہے۔

حکومت کے دوہرے پیمانے کا ایک واقعہ اور سامنے آیا ہے جب راج ٹھاکرے نے غنڈہ گردی کے سہارے میں ممبئی میں ریلی نکالی اور جی بھر کر مسلمانوں، شمال ہندوستانیوں اور بنگلہ دیشیوں کے نام پر مسلمانوں کو کوسا۔ راج ٹھاکرے نے پولیس کی اجازت کے بغیر منگل کو ممبئی میں اپنے ہزاروں حامیوں کے ساتھ مارچ نکالا تھا۔ یہ مارچ، 11 اگست کو ایک مسلم ریلی کے دوران تشدد کی مخالفت میں نکالا گیا تھا۔ مسلمانوں کے خلاف ممبئی پولیس نے فوراً گرفتاری شروع کردی تھی اور درجنوں لوگ جیل میں ہیں جبکہ راج ٹھاکرے اور ان کے غنڈے آزاد گھوم رہے ہیں۔ شمال مشرق کے باشندوں کے سلسلے میں حکومت کو تشویش ہے یہ اچھی بات ہے لیکن آسام کے مسلمانوں کو کے بارے میں بھی حکومت ہند اور حکومت آسام کو فکر مند ہونا چاہئے۔ تقریباً پانچ لاکھ افراد مختلف کیمپوں میں نہایت کسمپرسی کی حالت میں رہ رہے ہیں یہاں تک کے اسی کیمپ میں ان کی عید بھی گزری۔ کیمپ بھی اب ان پناہ گزینوں کیلئے محفوظ نہیں رہا۔ سب سے افسوسناک بیان بوڈو لینڈ حکام کی طرف سے آرہا ہے جو مسلمانوں کو مزید دہشت میں مبتلا کرتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جس کے پاس ثبوت ہوں گے

اسی کو آنے دیا جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ سارے ثبوت جل چکے ہیں۔ مسلمان اب ثبوت کہاں سے لائیں گے۔ اس پر حکومت ہند اور نہ ہی حکومت آسام کا ردعمل سامنے آیا ہے جو حکومت کے منشا کو ظاہر کرتا ہے۔ ان سب واقعات وحادثات کا مقصد صاف طور پر جو سامنے آرہا ہے وہ آسام سے مسلمانوں کو نکالنا ہے تاکہ بوڈو کو اپنی اکثریت ثابت کرنے میں آسانی ہو اور حکومت آسام کو آئندہ حکومت بنانے میں کسی طرح کی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ حکومت ہند اگر سوشل میڈیا کے اشتعال انگیزی پر اس قدر توجہ دے رہی ہے تو اسے ہندی میڈیا اور یہاں کے ٹی وی چینلوں پر بھی توجہ دینی چاہئے اور مسلمانوں کے خلاف ۲۴ر گھنٹے چلنے والے پروپیگنڈہ کے سدباب کے لئے ٹھوس قدم اٹھانا چاہئے کیوں کہ یہ چینل اور اخبارات مسلمانوں کے خلاف اشتعال اور نفرت پھیلانے میں پیش پیش ہیں۔

آسام اور برما کے مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف مسلمانوں کو احتجاج کرنا چاہئے لیکن تشدد سے نہیں کیوں کہ تشدد نے مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کو پس پشت ڈال دیا اور احتجاج اس پر حاوی ہوگیا۔ میڈیا نے اس موقع کو غنیمت تصور کرتے ہوئے آسامی مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کے معاملہ کو زندہ درگور کردیا ہے۔ پورے ہفتہ میڈیا میں مسلمانوں کا پرتشدد احتجاج ہی چھایا رہا۔ میڈیا نے اس وقت تک چین کا سانس نہیں لیا جب کہ ممبئی تشدد معاملے میں پچاس کے قریب مسلمان گرفتار نہیں ہوگئے۔ مسلمانوں کو حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے ہر ایسے واقعہ سے گریز کرنا چاہئے جس میں تشدد ہو۔ میڈیا کے متعصّبانہ رویے کو اجاگر کرنے کے لئے صحیح پلیٹ فارم کو استعمال کرنا چاہئے۔ اگر اخبار آپ کے خلاف لکھتا ہے تو اس کا منظّم طور پر بائیکاٹ کرنا چاہئے اور جو ٹی وی چینلز مسلمانوں کی شبہیہ کو داغدار کرتا ہے تو اس چینل کو دیکھنا چھوڑ دیں اور اس کی شکایت پریس کونسل آف انڈیا، وزارت اطلاعات ونشریات اور اس وزارت کے میڈیا مانیٹرنگ سیل کو کریں۔

☆☆

آسام کے مسلمانوں کیلئے زمین تنگ

● سید ماجد علی

آسام کو ہندو انتہا پسندوں نے اپنی شکار گاہ بنایا۔ بوڈو قبائل کے لوگ جنہیں پولیس کی سرپرستی بھی حاصل تھی مسلمانوں کو بے دردی سے موت کی گھاٹ اتارا، مسلمان خواتین کی آبرو و عصمت کو تار تار کیا۔ ان پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا۔ مسلمان اپنی جان بچانے کیلئے اپنے گھروں کو چھوڑ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگنے پر مجبور ہوئے۔ بے سروسامانی کا یہ عالم ہے کہ بھوک اور پیاس سے ان کی حالت خراب ہوگئی۔ سیکولر ہندوستان میں جانوروں کے تحفظ کا قانون موجود ہے۔ اس قانون کا احترام کرنا ہر ہندوستانی شہری پر فرض ہے۔ مور اور ہرن ایسی قومی مخلوق ہیں، جن پر حملہ کرنا یا ان کا شکار کرنا جرم ہے، لیکن مسلمان کو جان سے مارنا یا اس کی املاک کو نذر آتش کرنا کوئی جرم نہیں ہے، مسلمانوں کے بارے میں یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ یہ تیسرے درجے کے شہری ہیں اس لئے ان کے جان و مال کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ ان کے ساتھ ہر طرح کا ناروا سلوک جائز ہے۔

آسام میں فساد رکنے میں نہیں آ رہا، مسلمانوں کی بستیاں ویران ہوتی جا رہی ہیں، مقامی لوگ جو مسلمانوں کے ساتھ بود و باش اختیار کئے ہوئے تھے، انہوں نے بھی نظریں پھیر لیں۔ غیر مسلم پڑوسی اپنے مسلمان پڑوسیوں کو پہچاننے سے انکار کر رہے ہیں۔ افراتفری کے عالم میں خاندان کے افراد ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ بوڑھے ماں باپ اپنے بچوں کو تلاش کرتے ہوئے بدحواس نظر آتے ہیں۔ ایسی اطلاعات بھی ہیں کہ کئی

بستیوں میں ہندو غنڈے مسلمانوں کی لڑکیوں کو اٹھا کر لے گئے۔ عینی شاہدین کا کہنا ہے کہ آسام میں مسلمانوں پر قیامت وقت سے پہلے گزر رہی ہے۔

آسام میں مسلمانوں کی آبادی ایک تہائی آبادی پر مشتمل ہے۔ آزادی کے بعد سے ہی ہندو سیاست دانوں اور مذہبی انتہا پسندوں نے یہاں کے مسلمانوں کے ساتھ ظلم پر مبنی سیاست جاری رکھی اور بوڈو قبائل کو مسلمانوں کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ جس کے نتیجے میں بوڈو قبائل مسلمانوں کو وقتاً فوقتاً تشدد کا نشانہ بناتے اور ان کا قتل عام کرتے رہے۔ ہندو انتہا پسندوں کی یہ سازش آج بھی جاری و ساری ہے۔ آسام میں مسلمان چائے کی پتی کی تجارت کیا کرتے تھے حکومت نے یا تو انہیں قتل کرا دیا، یا پھر منظم طریقوں سے ان کے کاروبار تباہ کر دیئے گئے۔ آسام کے مسلمانوں کو تحصیل علم میں بھی پس ماندہ بنانے کے لئے عجیب وغریب حربے استعمال کئے گئے۔ ان میں شدید طور پر احساس کمتری پیدا کی گئی۔ ترقی تو بہت دور کی بات ہے ان کے آگے سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ وہ اپنا وجود کس طرح بچائیں۔

تاریخ دھرائی جائے تو آسام میں نیلی وہ مقام ہے جہاں 18 فروری 1983ء میں تاریخ کا سب سے تباہ کن فساد ہوا تھا۔ اس فساد میں سرکاری طور پر 5 ہزار اور غیر سرکاری طور پر تقریباً 10 ہزار مسلمانوں کو شہید کیا گیا۔ ان فسادات میں بھی ہندوؤں نے بیدردی سے مسلمان عورتوں، ضعیف مردوں اور بچوں کو زندہ جلا دیا تھا۔ مسلمانوں کی لاشیں اتنی کثیر تعداد میں تھیں کہ ان کو اٹھانے والا کوئی نہیں تھا۔ لاشیں جب سڑنے لگیں تو، ریاستی حکومت کی طرف سے ملٹری کے جوانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ لاشوں کو ٹھکانے لگانے کا کام کریں۔ لیکن لاشیں اس درجہ سڑ چکیں تھیں کہ ان کو کرچھیوں سے اٹھا کر ٹرکوں میں ڈالنا ممکن نہیں تھا۔ آخر کار مسلمانوں کی لاشوں پر بلڈوزر چلا کر ان کے وجود کو نیست و نابود کر دیا گیا۔ مسلم تنظیمیں احتجاج کرتی رہیں لیکن ان کو کام کرنے سے روک دیا گیا۔

ہندوستان میں برسر اقتدار کانگریس کے عہدیدار اپنی جماعت کو ایک سیکولر جماعت

قرار دیتے ہیں۔ان کا دعویٰ ہے کہ کانگریس آرایس ایس کے نظریات سے کوئی مطابقت نہیں رکھتی اور وہ نسل پرستی کی دشمن ہے اور وہ یہ دعویٰ بھی کرتی ہے اس کے اقتدار میں مسلمانوں کی زندگیاں محفوظ ہیں اور وہ مسلمانوں کو یکساں ترقی فراہم کرتی ہے۔مسلمان اس کے دوراقتدار میں آبرومندانہ زندگی گزارتے ہیں، جبکہ آرایس ایس اس ملک سے مسلمانوں کے وجود کو مٹانے کیلئے کمربستہ ہے،لیکن کانگریس کے ان دعووں کا پول آسام میں 21 جولائی 2012 سے جاری فسادات میں کھل گیا جب بوڈو قبائل مسلمانوں کو بربریت کا نشانہ بناتے رہے اور ہندوستانی حکومت،فوج، پولیس اورصوبے کی انتظامیہ مسلسل 10 دن تک خاموش تماشائی بنی رہی اور بوڈوقبائل کے لوگ مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگاتے اورمسلمانوں کے نوجوانوں کوقتل کرتے رہے،لیکن کیا آسام میں مسلمانوں کے ساتھ کانگریس حکومت نے منصفانہ رویہ اختیار کیا؟ یہ حقوق انسانی کے بین الاقوامی اداروں کے لئے ایک سوالیہ نشان اور عالم اسلام کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔

غور کیجئے تو آسام کی حالت گجرات سے کچھ مختلف نہیں۔گجرات میں نریندرمودی کے ذریعہ آرایس ایس کی حکمت عملی نافذ العمل ہے۔کانگریس کا یہ دعویٰ صرف ایک ڈھکوسلہ ہے۔کانگریس اور آرایس ایس کے درمیان صرف نام ہی کا فرق ہے اور کانگریس بھی آرایس ایس کی طرح مسلمانوں کے وجود سے ملک کو پاک کرنا چاہتی ہے۔

1983ءفسادات کا منصوبہ بھی آرایس ایس نے بنایا تھا۔گجرات میں مسلمانوں پر حملے کرنے والے آرایس ایس کے ہی غنڈے تھے،مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیز نعرے لگاتے رہے تھے اور حکومت کی طرف سے ان کو چھوٹ دی گئی تھی کہ وہ مسلمانوں کو قتل کرکے اپنے دل کی بھڑاس نکالیں۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ آسام میں مسلمانوں کو بھیس بدل کر قتل والے بوڈوقبائل کے ساتھ کانگریس کے انتہاپسند نوجوان بھی شامل تھے۔ایک ہندولڑکی کی آبرو لٹنے پر ہندوستانی میڈیا نے زمین وآسمان ایک کردیا،لیکن مسلمانوں کی سینکڑوں

بیٹیوں کے قتل عام پر زبانیں گونگی ہوگئیں۔مسجدوں میں فساد کے خوف سے اور جان بچانے کی خاطر مسلمانوں نے رخ کرنا چھوڑ دیا۔فسادیوں کو یہ بات اچھی طرح سے معلوم ہے رمضان المبارک میں مسلمان روزے رکھتے ہیں،عبادت کے لئے مسجد جاتے ہیں اسلئے انہوں نے مسجدوں کو نشانہ بنانا شروع کردیا ہے۔جوصورتحال میانمار (برما) میں ہے ایسی ہی صورتحال آسام میں بھی نظر آرہی ہے۔میانمار (برما) میں کسی شخص کو قتل کرنے کیلئے صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ وہ مسلمان ہے۔اسی طرح آسام میں بھی کسی شخص کو مارنے کے لئے اتنا ہی معلوم ہونا کافی ہے کہ وہ مسلمان ہے۔

چشم تصور سے دیکھئے کہ وہ باپ کتنا پریشان ہے، جس کی دو بیٹوں کو ہندوغنڈے پولیس کی نگرانی میں اٹھا کرلے گئے۔وہ کس سے فریاد کرے اور کس کو اپنا حال دل دکھائے۔ آسام کے مسلمانوں کی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھی ہوئی ہیں، ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔لبوں سے سسکیاں نکل رہی ہیں۔اندھیری راتوں میں یہ کہاں جاکر اپنی نیند پوری کریں۔روزے رکھنا،نماز ادا کرنا اور تراویح کی صفیں ترتیب دینا،ان کیلئے کتنا مشکل ہوگا۔لیکن ان کے دلوں میں اسلام زندہ ہے،ایسی قیامت خیز گھڑی میں یہ قبلہ رخ ہوکر اللہ کے سامنے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

ارکان (برما) اور آسام کے مظلوم مسلمان، اسلامی دنیا سے خصوصا مسلمانوں سے سوال کرتے ہیں کہ ہم اتنے بے حس کیوں ہوگئے ہیں۔اخبارات روزانہ مظلوم مسلمانوں کے فوٹو اوران کی جلتی ہوئی سلگتی ہوئی بستیوں کی تصویریں شائع کررہے ہیں،لیکن مسلمانوں کو اپنے تباہ حال مسلمانوں بھائیوں کی خبر لینے کی فکر کیوں نہیں؟ کیا ہم واقعی اتنے بے حس ہوگئے ہیں کہ ہم دنیا بھر میں مسلمانوں کیخلاف ہونیوالے ظلم پر خاموش رہیں؟

☆☆

فاربس گنج کے واقعہ نے گجرات کی یاد تازہ کردی

● اشرف استھانوی

چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے۔ یہ کہاوت سنگھ پریوار پر صادق آتی ہے۔ چونکہ اس کی بنیاد مسلم دشمنی پر قائم ہے، اس لیے سنگھ پریوار کے لوگ جہاں بھی رہیں گے مسلم دشمنی کا ثبوت دیتے ہی رہیں گے۔ اقتدار میں رہیں یا اقتدار سے باہر مسلم کشی کا ان کا مشن چلتا ہی رہتا ہے۔ اجتماعی مسلم کشی ممکن نہ ہو تو قسطوں میں ہی سہی سلسلہ جاری رہتا ہے۔ بہار کے مسلم اکثریتی ارریہ ضلع کے فاربس گنج کے بھجن پور گاؤں میں ۳ جون ۲۰۱۱ء کو جو کچھ ہوا وہ اسی مشن کا حصہ تھا۔

نتیش کمار کی قیادت والی بہار کی این ڈی اے حکومت میں مسلم کشی کے اس تازہ واقعہ کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔ پہلے تو بہار انڈسٹریل ایریا ڈیولپمنٹ اتھارٹی (BIADA) نے گاؤں کے غریب مسلمانوں کی قیمتی زمین کو کوڑیوں کے مول یعنی محض 15 ہزار روپے فی ایکڑ کی شرح پر اسمال اسکیل انڈسٹریز یعنی چھوٹی صنعتوں کے قیام کے نام پر تحویل میں لے لی، حالانکہ اس زمین کی قیمت آج 15 لاکھ روپے فی ایکڑ ہے اور یہ سب علاقہ کی ترقی اور وہاں کے غریب مسلمانوں کی حالت بہتر بنانے کے نام پر ہوا ہے۔ حکومت کے دلال مسلم اور غیر مسلم رہنماؤں نے مسلمانوں کو بڑے سنہرے خواب دکھائے اور یہ بھی بتایا کہ آج تک ان کی حالت سدھارنے کی فکر کسی کو نہیں ہوئی۔ پہلی بار نیائے کے ساتھ وکاس کرنے والی نتیش حکومت کو ان کا خیال آیا ہے۔ گاؤں کے غریب مسلمان پھولے نہ سمائے۔

2010 کے اسمبلی انتخاب میں بھی 40 فیصد سے زیادہ مسلم آبادی والے ارریہ ضلع کے مسلمانوں نے جم کر این ڈی اے کو ووٹ دیا۔ ادھر انجام سے بے خبر مسلمانوں کی زمین بی جے پی ایم ایل سی اشوک کمار اگروال کو لیز پر دے دی گئی۔ بتایا گیا کہ یہاں پر ایک بڑی گلوکوز فیکٹری بنے گی۔ اس لیے وہ راستہ بھی اب ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا جس پر چل کر گاؤں کے لوگ عیدگاہ، کربلا، اسپتال اور بازار جایا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ لوگوں کی پریشانی بڑھی، مسلمانوں کا وفد ایس ڈی او سے ملا اور اُن سے مودبانہ درخواست کی کہ اُن سے آمد و رفت کا نصف صدی پرانا راستہ نہ چھینا جائے اور اگر یہ بہت ضروری ہے تو پہلے کوئی متبادل راستہ دیا جائے، مگر ایس ڈی او نے پہلے تو افسری جھاڑی اور بعد میں حکومت کے حکم سے مجبور ہونے کی بات کہہ کر ان کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ ادھر راستہ کے چکر میں فیکٹری کی تعمیر کے کام میں آرہی رکاوٹ سے پریشان بی جے پی ایم ایل سی اشوک اگروال نے اپنے آقا اور ریاست کے نائب وزیر اعلیٰ سشیل کمار مودی سے سرکاری مدد کی درخواست کی۔ چنانچہ سشیل مودی 29 مئی 2011 کو وہاں گئے اور انتظامیہ کو سخت ہدایت کی کہ وہ فیکٹری کے قیام میں اشوک کمار اگروال کی ہر ممکن مدد کریں اور اگر گاؤں والے رکاوٹ کھڑی کرتے ہیں تو اُن سے سختی کے ساتھ نمٹیں۔

مودی کی ہدایت کا یہ اثر ہوا کہ یکم جون 2011 کو رات میں پورا گاؤں تحویل میں لے لیا گیا، علاقہ پولیس چھاؤنی میں تبدیل ہو گیا اور پھر راتوں رات پولیس کی نگرانی میں بھجن پور والوں کا پرانا راستہ مسدود کر کے وہاں فیکٹری کے لیے دیوار کھڑی کر دی گئی جب کہ دن میں کمپنی کے افسران، انتظامیہ کے افسران اور گاؤں کے مکھیا اور دوسرے لوگوں کے درمیان جو میٹنگ ہوئی تھی اس میں یہ طے پایا تھا کہ فیکٹری کے جنوبی حصہ میں گاؤں والوں کو متبادل راستہ فراہم کرایا جائے گا اور گاؤں والوں نے بھی اس بات کی تحریری یقین دہانی کرائی تھی کہ اگر انہیں متبادل راستہ فراہم کر دیا گیا تو وہ پرانے راستہ پر اپنا دعویٰ ختم کر دیں

گے، لیکن 2 جون کی صبح جب انہیں معاہدے کا یہ حشر نظر آیا تو وہ ایک بار پھر وفد کی شکل میں ایس ڈی او کے پاس گئے اور اُن سے انصاف مانگا مگر جب وہاں سے انہیں یہی جواب ملا کہ دیوار بن گئی ہے، وہ اب نہیں ہٹے گی تو ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا کیوں کہ اس دیوار نے اُن سے ان کی زندگی کا حق چھین لیا تھا، وہ روزی روٹی کمانے اور ضرورت کے سامان خریدنے کے لیے بازار جانے یا علاج کے لیے اسپتال کا رخ کرنے کے لائق بھی نہیں رہ گئے تھے۔ یہ تو سراسر ظلم ہے۔ان کی اپنی منتخب حکومت ان کے ساتھ ایسا ظلم کرے گی یہ تو انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے ظلم سے ٹکرانے کا فیصلہ کرلیا۔ جمعہ 3 جون 2011 کی صبح نمودار ہوئی۔ اس دن کے سارے اخبارات میں نائب وزیر اعلیٰ سشیل کمار مودی کا یہ بیان چھپا تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ کوئی ظلم اور ناانصافی روا نہیں رکھی جائے گی، جیسا کہ انہوں نے ای ٹی وی کے سمینار میں کہا تھا۔

مسلمانوں نے پہلے تو نماز جمعہ ادا کی اور اس کے بعد چل پڑے ظلم کی دیوار گرانے۔ یہ ایک احتجاجی رویہ تھا جو ظلم کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ مشتعل لوگوں نے دیوار گرادی۔ دیوار گرتے ہی پولیس کا اصلی چہرہ سامنے آگیا۔ خاکی وردی میں ملبوس درندوں نے بے تحاشہ گولیاں برسانی شروع کردیں۔ پولیس نے فائرنگ سے پہلے کسی انتباہ کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ نہ لاٹھی چارج نہ آنسو گیس، براہ راست فائرنگ۔ گولی فاروق انصاری کے بیٹے 18 سالہ محمد مصطفیٰ انصاری کو لگی، گولی لگتے ہی وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ مگر ظالموں کو رحم نہ آیا۔ ایک جوان نے پہلے تو اس کے چہرے کو بوٹ سے کچلا اور پھر اس کے سینے پر چڑھ کر دیوانہ وار اس وقت تک اسے روندتا رہا جب تک وہ ٹھنڈا نہ ہوگیا۔ یہ منظر ٹی وی چینلوں پر پورے ملک کے عوام نے دیکھا۔ فاروق انصاری کی 36 سالہ حاملہ اہلیہ کو بھی گولیوں سے چھلنی کردیا گیا۔ 20 سالہ مختار انصاری بھی پولس کی گولیوں کا شکار ہوا۔ صدیق انصاری کا شیر خوار بچہ نوشاد انصاری جو اس وقت اپنی ماں کی گود میں تھا، گولیوں کی تاب نہ لا کر چل بسا۔ اس کی ماں کو

زخمی حالت میں اسپتال پہنچایا گیا مگر وہ بھی مالک حقیقی سے جا ملیں۔ اس طرح چھ زندگیاں پولیس ظلم کا شکار ہوگئیں۔ پورا بہار ہی نہیں پورے ملک کے عوام پولیس کی اس بربریت کا نظارہ دیکھ کر اور سن کر دنگ رہ گئے مگر بہار کی نتیش حکومت نے اب تک صرف معاملے کی عدالتی تحقیقاتی اور ایک شیر خوار کی موت پر 3 لاکھ معاوضہ کا اعلان کیا اور باقی مقتولین کے بارے میں وہ خاموش ہے۔ کارروائی کے نام پر صرف اس ایک جوان کے خلاف 302 کا مقدمہ ہوا ہے جس نے زخمی نوجوان کو بوٹوں سے کچل کر مار ڈالا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اپوزیشن کے رہنماؤں سمیت جہاں حقوق انسانی کے علم بردار اس معاملے پر چیخ چیخ کر احتجاج کررہے ہیں اور بہار سے دہلی تک دھرنا اور مظاہرہ کر کے اپنی آواز بلند کررہے ہیں وہیں سنگھ پریوار سے وابستہ افراد، اس واقعہ کی مذمت کرنے سے بھی گریز کررہے ہیں۔ جس بی جے پی کے لوگ بابا رام دیو کے حامیوں پر لاٹھی چارج کیے جانے سے بلبلا اٹھے تھے اور بابائے قوم مہاتما گاندھی کی سمادھی پر ہونے والے احتجاجی ستیہ گرہ کے دوران رقص بے ہنگم کرنے سے بھی نہیں چوکے تھے وہ اس معاملے پر مہر بہ لب ہیں۔ نیشنل میڈیا کا رویہ بھی انتہائی افسوسناک ہے۔ بابا کی حمایت میں آسمان سر پر اٹھانے والا میڈیا فاربس گنج کے معاملے میں بالکل خاموش ہے تو اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ معاملہ مسلمانوں کا ہے۔ ان پر اگر لاٹھی بھی چلے تو میڈیا چیخ اٹھتا ہے اور مسلمانوں پر گولیاں چلیں اور انہیں دن کے اجالے میں بوٹوں سے روند کر مار ڈالا جائے تو کسی کے کان میں جوں تک نہیں رینگتی۔ بی جے پی کی شراکت والی نتیش حکومت کا رویہ بھی انتہائی جانبدارانہ اور غیر مساویانہ ہے۔ ریلوے کے کھلے پھاٹک پر ٹرین اور جیپ کی ٹکر میں لوگ ہلاک ہوجائیں تو ریلوے سے پہلے وزیر اعلیٰ نتیش کمار معاوضہ کی سوغات لے کر دوڑ پڑتے ہیں مگر غریب مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے جائیں، ان کا حق چھینا جائے، انہیں گولیوں کا نشانہ بنایا جائے تو جانچ کا بہانہ بنا کر معاوضہ کا اعلان تک نہیں کرپاتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ حکومت کا کوئی نمائندہ وزیر یا حکمراں پارٹی کا کوئی ایم ایل اے تک جائے حادثہ پر متاثرین

کے آنسو پونچھنے کے لیے آج تک نہیں پہنچا۔ زبانی اظہار ہمدردی کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی جا رہی ہے۔ بی جے پی کے سنیئر رہنما اور ریاست کے نائب وزیر اعلیٰ سشیل کمار مودی کا اخباری بیان صرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ معاملے کی جانچ کرائی جائے گی اور جو قصوروار ثابت ہوگا اسے سزا ملے گی، مگر اس المناک واقعہ کی وہ مذمت تک نہیں کر پاتے ہیں۔ ایسے میں پولیس کا سینہ چوڑا نہ ہوگا اور حوصلہ بلند نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا۔ پولیس کا غیر انسانی چہرہ تو اکثر نظر آجاتا ہے مگر اس کا مسلم مخالف چہرہ عموماً تب نظر آتا ہے جب اسے حکومت کی در پردہ حمایت حاصل ہوتی ہے۔ پھر چاہے وہ فاربس گنج ہو یا بھاگلپور ہو یا گجرات، حکومت کی سرپرستی سے ہی پولیس مسلم دشمنی کا کھل کر مظاہرہ کر پاتی ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ روایتی اپوزیشن رہنماؤں کے علاوہ مہیش بھٹ اور شبنم ہاشمی جیسے لوگ بھی فاربس گنج کا دورہ کرنے کے بعد یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ فاربس گنج میں پولیس کا جو مسلم دشمن چہرہ نظر آیا اس نے گجرات کی یاد تازہ کر دی۔ اگر بہار اسی راہ پر چلتا رہا تو اسے گجرات بننے میں دیر نہیں لگے گی۔ بہار کو گجرات کی دوسری تجربہ گاہ بننے سے کوئی نہیں روک پائے گا۔ پولیس کی وردی میں ملبوس جوان بے ہوش نوجوان پر کود رہا ہے، اسے اپنے بوٹوں سے روند رہا ہے اور اس کے دوسرے ساتھی اس کا حوصلہ بڑھا رہے ہیں۔ ایک ہندوستانی شہری کے ساتھ ایسا سلوک کیسے روا رکھا جا سکتا ہے۔ اتنی نفرت کیوں اور کہاں سے آگئی۔ کیا وہ کوئی غیر ملکی دشمن یا حملہ آور تھا؟ جس کے ساتھ اس طرح کا سلوک کیا جائے اور ارباب حکومت اس کی مذمت تک نہ کریں؟

یہ اور اس نوعیت کے بہت سارے سوالات ہیں جن کا حکومت بہار کے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ بی جے پی سے تعلق رکھنے والے نائب وزیر اعلیٰ سشیل کمار مودی پر تو اس معاملے کو ہوا دینے کا سیدھا الزام ہے، وہ کیا جواب دیں گے۔ جنتا دل یو سے تعلق رکھنے والے اور سیکولر بننے کی فکر میں نریندر مودی کا ہاتھ جھٹکنے والے نتیش کمار کے پاس بھی اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے کہ گوپال گنج جیل میں ڈاکٹر کے قتل کی جانچ تو وہ سی بی آئی کو

سونپتے ہیں مگر اسی وقت وہ فاربس گنج معاملے کی جانچ کے لیے عدالتی کمیشن کے قیام کی بات کیوں کر رہے ہیں۔ کیا فاربس گنج کا معاملہ گوپال گنج سے کم سنگین ہے؟ جب کہ اسی ضلع میں 6 ماہ قبل بھی اسی نوعیت کا مسلم کش رویہ پولیس کے سامنے آچکا ہے۔ ایس ایس بی کے جوانوں نے پہلے مسلم عورتوں کو ہوس کا شکار بنایا اور جب احتجاج ہوا تو اندھا دھند فائرنگ کر کے 4 مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس وقت بھی مسلمانوں کے ہمدرد این ڈی اے کے رہنما اور ان کے ہمنوا میڈیا کے منہ پر تالا لگا دیا گیا۔

نتیش اور مودی بار بار یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کی حکومت میں کوئی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا۔ کسی حد تک یہ بات صحیح بھی ہے، بے شک کوئی بڑا فساد نہیں ہوا لیکن قسطوں میں مسلم دشمنی ہوتی رہی۔ ارریہ ضلع کے مذکورہ بالا دونوں واقعات کے علاوہ ویشالی ضلع کے چک مجاہد گاؤں کے مسلمانوں کو گئوکشی کے نام پر دہشت میں مبتلا کر کے گاؤں چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ سیتا مڑھی کے جندیہا گاؤں میں زیر تعمیر مسجد منہدم کر دی گئی، مگر کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ سیتا مڑھی کے ہی کپرول گاؤں میں مدرسہ نذر آتش کر دیا گیا، دربھنگہ کے تارالاہی گاؤں میں ہولی کے موقع پر مسلمانوں کی دکانیں جلا دی گئیں، گوپال گنج کے برولی گاؤں میں مدرسہ پر حملہ ہوا، قرآن مقدس کے نسخے نذر آتش کر دیے گئے، سہسرام میں حافظ مسعود کی لاش کو قبر سے نکال کر اس کی بے حرمتی کی گئی۔ داڑھی نوچ لی گئی۔ کفن تار تار کر دیا گیا مگر ایف آئی آر کے باوجود کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ فرقہ پرست آج بھی آزاد ہو کر دندناتے پھر رہے ہیں۔ سہسرام میں ہی سیف الدین انصاری کا مکان منہدم کر کے مندر تعمیر کرنے کی کوشش کی گئی اور ایک مولوی صاحب کے منہ میں شرپسندوں نے پیشاب کر دیا، مگر کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ کیمور ضلع کے ادا گاؤں میں تین غریب مسلمانوں کو درخت سے باندھ کر اتنا پیٹا گیا کہ وہ اپاہج ہو گئے، یہ اور اس طرح کے درجنوں مسلم دشمنی کے واقعات حکومت کے دعووں کا منہ چڑا رہے ہیں۔

☆☆

وزیراعظم کے 15 نکاتی پروگرام کی حقیقت

15 نکاتی پروگرام سے متعلق اسکیموں کا فائدہ مسلمانوں کو نہیں مل رہا ہے

● ادارہ

مرکز کی کانگریس حکومت ملک میں مسلمانوں کی حالت کو دلتوں سے بدترین بتانے والی سچر کمیٹی کی سفارشات پر عمل کرنے کی سمت میں 'وزیراعظم کے 15 نکاتی پروگرام' سے متعلق منصوبوں کی عمل درآمدگی کی زمینی حقیقت سے بے خبر ہے۔ مرکزی حکومت نے حق اطلاعات (آرٹی آئی) قانون کے تحت دائرعرضی کے جواب میں خود یہ تسلیم کیا ہے کہ وزیر اعظم کے پروگرام کے منصوبوں کے اثرات کا اندازہ نہیں لگا پا رہی ہے۔

مراد آباد کے آرٹی آئی کارکن سلیم بیگ کی طرف سے دی گئی درخواست کے گزشتہ 20 دسمبر کے جواب میں وزارت اقلیتی امور نے کہا ہے کہ ملک میں اقلیتوں کی فلاح کے لئے وزیراعظم کے نئے 15 نکاتی پروگرام میں شامل منصوبوں کے اثرات کا جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ ایسے میں یہ پتہ نہیں ہے کہ وزیراعظم کے حوصلہ افزا پروگرام میں شامل منصوبوں کا کیا اثر پڑ رہا ہے اور ان کی عمل درآمدگی کی زمینی حقیقت کیا ہے۔ بیگ نے گزشتہ سال 16 نومبر کو ایک آرٹی آئی درخواست کے ذریعے مرکزی اور دہلی حکومت سے پوچھا تھا کہ سچر کمیٹی کی سفارشات کو نافذ کر کے ملک کے اقلیتی طبقے کو سماج کی مین اسٹریم میں لانے کے لئے نافذ تمام منصوبوں کے اثرات اور عملدرآمدگی کی نگرانی کے لئے کون سا نظام بنایا گیا ہے۔

غور طلب ہے کہ ملک کے 90 اقلیتی غلبہ والے علاقوں میں وزیراعظم کے 15 نکاتی پروگرام کی اسکیم چلائی جا رہی ہے۔ بیگ نے ذرائع ابلاغ کو بتایا کہ سال 2005 میں یوم آزادی کے موقع پر وزیراعظم منموہن سنگھ نے قوم کے نام اپنے پیغام میں اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لئے ترمیم اور بہتر 15 نکاتی پروگرام تیار کرنے اور اس میں خاص مقاصد کو مقرر وقت کی مدت میں حاصل کرنے کی بات کہی تھی، لیکن جب منصوبوں کے اثرات کا جائزہ ہی نہیں لیا جا رہا ہے تو مقصد اور وقت کی حد کی باتیں بے معنی ہو جاتی ہے۔ بیگ نے کہا کہ سچر کمیٹی کا مطالعہ مکمل طور پر مسلمانوں کی اقتصادی، سماجی اور تعلیمی حالات پر مبنی تھا اور اس نے مسلمانوں کے لئے منصوبے چلانے کی بات کہی تھی، لیکن اس کی سفارشات کی بنیاد پر شروع کی گئی اسکیموں کا فائدہ آئینی مجبوریوں کی آڑ میں دیگر مذاہب کے ایسے طبقوں کو دیا جا رہا ہے جو پہلے سے ہی دیگر سہولیات کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

واضح رہے کہ یکم اپریل 2007 سے نافذ وزیراعظم کے 15 نکاتی پروگرام میں اینٹگریٹیڈ چائلڈ ڈیولپمنٹ کی مناسب دستیابی، اسکولی تعلیم کی فراہمی کو بہتر بنانا اور اردو تعلیم کے لئے زیادہ وسائل و مدرسہ میں جدید تعلیم، اقلیتی فرقوں کے متوسط طلبہ کے لئے وظیفہ اور مولانا آزاد تعلیمی ادارے کے ذریعے سے تعلیمی سطح کو مزید موثر بنانے کے اہداف شامل ہیں۔

اس کے علاوہ، غریبوں کے لئے سوروزگار اور مزدوری روزگار منصوبہ و تکنیکی تعلیم کے ذریعے معاشی سرگرمیوں کے لئے مدد۔ ریاستی اور مرکزی سروس میں بحالی، دیہی رہائش منصوبوں میں مناسب حصہ داری، اقلیتی فرقوں کی ملن بستیوں کی حالت میں اصلاح، فرقہ وارانہ واقعات کی روک تھام مذہبی جرائم کے لئے سرکاری اور فرقہ وارانہ فسادات کے متاثرین کی بازآبادکاری بھی وزیراعظم کے 15 نکاتی پروگرام میں شامل ہے۔

☆☆

باب پنجم

متفرقات

تبلیغی جماعت تاریخ کے آئینے میں

● مولانا سید محمد شاہد سہارنپوری

سوال نمبر(۱) جماعت کا کام کب اور کس حالت میں شروع ہوا؟

جواب:۔ مولانا محمد الیاس کاندھلوی اپنے پیرو مرشد حضرت مولانا خلیل احمد کی معیت میں ۱۶؍شوال ۱۳۴۴ھ/ ۲۹؍اپریل ۱۹۲۶ء پنجشنبہ میں سہارنپور سے روانہ ہوئے اور حج سے فارغ ہوکر ۹؍محرم ۱۳۴۵ھ/ ۲۰؍جولائی ۱۹۲۶ء میں مدینہ منورہ پہنچے، وہاں پہنچ کر مولانا محمد الیاس پر ایک عجیب قسم کی بے چینی اضطراب اور کڑھن طاری ہوئی، ان حالات کو دیکھ کر مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری مہاجر مدنیؒ نے رفقاء سفر کو مشورہ دیا کہ یا تو تم لوگ مولانا الیاس کے ہندوستان جانے تک یہاں قیام کرو، یا مولانا کے بغیر واپس ہوجاؤ، اس پر رفقاء نے مدینہ شریف میں قیام کا فیصلہ کیا اور پھر یہیں کے قیام میں مولانا محمد الیاس کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت ہوئی اور ارشاد فرمایا گیا کہ ہم تم سے کام لیں گے، اس خواب کے بعد مولانا الیاس کی بے چینی میں اور اضافہ ہوگیا، بار بار سوچتے تھے کہ میں ضعیف وناتواں کیا کام کروں گا، حضرت مولانا سید احمد فیض آبادی (برادر اکبر حضرت اقدس شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی) نے یہ بے چینی اور فکر دیکھ کر تسلی دی اور فرمایا کہ یہ تو نہیں کہا گیا کہ تم کام کروگے بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ تم سے کام لیں گے، بس مطمئن رہو کام لینے والے خود ہی کام لے لیں گے، اس جواب سے مولانا کی پریشان طبیعت کو بڑا اطمینان وسکون ہوا، اور آپ نے ہندوستان واپسی کا ارادہ فرمالیا، پانچ ماہ حرمین شریفین میں

قیام کے بعد ۲۷؍ربیع الثانی ۱۳۴۵ھ/ ۴؍نومبر ۱۹۲۶ء میں دہلی واپس تشریف لائے۔ اور غور وخوض کے بعد ہر ہر گاؤں میں چھوٹے بڑے مکاتب قائم کرنے کا داعیہ اور جذبہ پیدا ہوا اور یہ مکاتب شروع کئے گئے، کچھ عرصہ بعد دعوت وتبلیغ کے متعلق طبیعت پر جزم اور اعتماد پیدا ہوا اور اس سلسلہ میں بہت سے ابتدائی مشورے اور تشکیلیں اپنے احباب ومتعلقین بالخصوص شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنی سے فرمائے اور پھر ۱۳۴۸ھ/ ۱۹۳۰ء میں سہارنپور تشریف لا کر اس سلسلہ میں دو تین دن تک مشورے اور تشکیلیں کرتے رہے، اور پھر عملی قدم اٹھاتے ہوئے ایک ابتدائی جلسہ ۲۹؍ذیقعدہ ۱۳۴۸ھ/ ۲۹؍اپریل ۱۹۳۰ء کو بعد نماز عشاء جامع مسجد سہارنپور میں کیا گیا، یہ اس سلسلہ کا سب سے پہلا عوامی جلسہ تھا، جب کہ اس سے ایک یوم قبل ۲۸؍ذیقعدہ ۱۳۴۸ھ/ ۲۸؍اپریل ۱۹۳۰ء میں حضرت مولانا محمد الیاس نے جامعہ مظاہر علوم کے تمام اساتذہ کو جمع فرما کر دعوت وتبلیغ کی اہمیت و ضرورت پر ایک مفصل تقریر بھی فرمائی تھی، جس کے نتیجہ میں اکابر اساتذہ نے باہمی مشورے سے اپنی ترتیب قائم کر کے اسی دن اس نہج پر دعوتی کام شروع کر دیا۔

دعوت وتبلیغ کا یہ پورا نظام اس کے چھ نمبروں پر قائم ہے اور یہ چھ نمبر حضرت مولانا محمد الیاس نے شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کے مشورے اور رائے سے ہی متعین فرمائے تھے، چنانچہ مولانا الیاس، مولانا محمد زکریا کو اپنے مکتوب محررہ ۲۶؍رمضان ۱۳۲۶ھ/ ۳؍جنوری ۱۹۳۵ء میں لکھتے ہیں کہ!

’’تمہاری اس ہمت کا اظہار بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ بندہ ناچیز کو اس تبلیغ کے اصول قرار دینے میں آپ کی صحبت کو بھی بہت زیادہ دخل ہے، حق تعالیٰ مجھے آپ کے شکر کی توفیق بخشیں۔‘‘

یہ پوری تفصیل راقم سطور کی کتاب سوانح حضرت جی ثالث مولانا محمد انعام الحسن کاندھلوی جلد اوّل کے ص:۳۱ سے ص:۳۷ تک موجود ہے۔

نوٹ: مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی پیدائش ۱۳۰۳ھ/ ۱۸۸۶ء میں قصبہ کاندھلہ ضلع مظفرنگر میں ہوئی اور وفات ۲۱؍رجب ۱۳۶۳ھ/ ۱۳؍جولائی ۱۹۴۴ء میں مرکز نظام الدین دہلی میں ہوئی، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی، اور پھر وہیں آپ کو مرکز کے احاطہ میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

سوال نمبر(۲) جماعت کے کام کی شروعات سے قبل دنیا کے حالات!

جواب: دعوت وتبلیغ کا کام ہندوستان میں اس وقت شروع ہوا جب کہ یہاں انگریزوں کی حکومت تھی اور مسلمان اُن کی نگاہ میں ہر لحاظ سے معتوب تھے، دنیاوی حکومت تو اُن کی ختم ہو ہی چکی تھی، اُن کے دینی شعائر اور اسلامی قدروں پر بھی مختلف حیثیتوں سے مسلسل اور متواتر حملے کئے جا رہے تھے، عیسائی مشنریاں اور دیگر مذاہب کے مبلغین ان کی مذہبی جڑوں کو کھوکھلا کرنے میں مشغول تھے۔

اور جو رہی سہی تہذیب اور اخلاقی روایات باقی رہ گئی تھیں اُن کو یہاں کے مسلمانوں نے اپنے آپ کو دو خانوں یعنی کانگریس اور لیگ میں تقسیم کر کے ان کا جنازہ نکال رکھا تھا، ایسے حالات میں یہ دعوتی کام شروع ہوا اور اس میں ایمان واعمال کے ساتھ اکرام مسلم کے پہلو پر پورا زور صرف کیا گیا۔

سوال نمبر(۳) بنگلے والی مسجد میں تبلیغی کام کا آغاز!

جواب: اگر تبلیغی کام سے مراد موجودہ دعوتی کام ہے تو اس کی تفصیل جواب نمبر ایک میں آ چکی ہے اور اگر اس سے ہٹ کر اصلاحی کام مراد ہے تو عرض ہے کہ مولانا محمد الیاس ۱۳۲۸ھ/ ۱۹۱۰ء میں جامعہ مظاہر علوم سہارنپور کے استاذ بن کر یہاں پڑھا رہے تھے اور اُن کے بڑے بھائی حضرت مولانا محمد صاحب (جو امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے شاگرد تھے) نظام الدین میں مسلمانوں کے عقائد واعمال کی اصلاح میں مشغول تھے، لیکن جب ۲۵؍ربیع الثانی ۱۳۳۶ھ/ ۸؍فروری ۱۹۱۸ء میں حضرت مولانا محمد صاحب کا نظام الدین

دہلی میں انتقال ہوگیا، تب مولانا محمد الیاس اپنے پیرومرشد حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری کے حکم سے نظام الدین تشریف لے گئے اور وہاں پہنچ کر مسلمانوں خاص طور پر مسلمانان میوات کی اصلاح وترتیب میں مشغول ہوگئے۔

سوال نمبر(۴) رئیس التبلیغ حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی!

آپ کی ولادت ۲۵/جمادی الاولیٰ ۱۳۳۵ھ/ ۲۰/ مارچ ۱۹۱۷ء میں کاندھلہ میں ہوئی، ابتدائی کتابیں اپنے والد محترم اور دیگر حضرات سے پڑھ کر شوال ۱۳۵۴ھ/ جنوری ۱۹۳۶ء میں جامعہ مظاہرعلوم میں داخلہ لے کر اپنی تعلیم کی تکمیل کی اور حدیث شریف میں صحاح ستہ کی تمام کتابیں یہاں پڑھیں، حضرت جی ثالث مولانا انعام الحسن کاندھلوی جس طریقہ سے تمام زندگی دعوتی میدان میں آپ کے ساتھ رہے اسی طرح تعلیمی میدان میں بھی شروع سے آخر تک آپ کے ساتھ رہے۔

مولانا محمد یوسف کی حیات میں دعوت وتبلیغ کے کام کی جڑیں عرب ممالک میں قائم ہوکر وہاں کام کی شروعات ہوئی، اور مراکز قائم ہوئے۔

آپ حضرت مولانا محمد الیاس کے ہاتھ پر بیعت تھے انہوں نے آپ کی احسان وسلوک کی راہ سے پوری تربیت فرمائی اور پھر ان کی جانب سے خلیفہ اور مجاز بیعت بن کر بلا مبالغہ لاکھوں لوگوں کو اپنی بیعت میں شامل کر کے اُن کو راہ خدا میں اپنی جان، اپنا مال اور اپنا وقت لگانے پر کھڑا کردیا۔

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی کی صاحبزادی مسماۃ ذکیہ خاتون سے آپ کا نکاح مسنونہ ہوا، اور پھر ذکیہ خاتون کے انتقال کے بعد حضرت مولانا محمد زکریا کی دوسری صاحبزادی مسماۃ راشدہ خاتون آپ کے نکاح میں آئیں۔

مولانا محمد یوسف صاحب کا انتقال ۲۹/ذیقعدہ ۱۳۸۴ھ/۲/اپریل ۱۹۶۵ء میں لاہور پاکستان کے ایک تبلیغی اجتماع میں ہوا، آپ کا جنازہ دہلی لایا گیا، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا

کاندھلوی نے نماز جنازہ پڑھائی اور والد ماجد حضرت مولانا محمد الیاس کے پہلو میں مرکز نظام الدین میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔

سوال نمبر(۵) حضرت جی مولانا انعام الحسن کاندھلوی!

جواب:۔ حضرت جی ثالث مولانا انعام الحسن کی ولادت ۸/جمادی الاول ۱۳۳۶ھ/۲۰/فروری ۱۹۱۸ء میں قصبہ کاندھلہ ضلع مظفرنگر میں ہوئی، ابتدائی تعلیم وتربیت مولانا محمد الیاس کاندھلوی سے حاصل کر کے جامعہ مظاہرعلوم سہارنپور تشریف لائے اور یہاں رہ کر اپنی دینی تعلیم خاص کر حدیث شریف کی تمام کتابیں یعنی صحاح ستہ پڑھی، بخاری شریف آپ نے شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی سے پڑھی تھی اور پھر انہی کی صاحبزادی مسماۃ ذاکرہ خاتون سے آپ کا نکاح مسنونہ ہوا۔

مولانا محمد یوسف کے انتقال کے بعد آپ اُن کے جانشین اور دعوت وتبلیغ کے حضرت جی ثالث بنائے گئے اور ۳۰/ذیقعدہ ۱۳۸۴ھ/۱۳/اپریل ۱۹۶۵ء میں آپ نے سب سے پہلی بیعت چونسٹھ کھمبے کی وسیع عمارت میں کی، جہاں ملک بھر سے آئے ہوئے بااصول کارکن اور علاقہ میوات کے علماء وخواص کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔

مولانا محمد انعام الحسن کو بھی حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی سے اجازت وبیعت اور خلافت حاصل تھی، چنانچہ اسی بنیاد پر آپ نے زندگی بھر پوری دنیا کے لاکھوں لوگوں کو بیعت فرما کر دعوت وتبلیغ کے ذریعہ سے راہ خدا پر لگایا، آپ کی زندگی میں دعوت وتبلیغ کی عظیم الشان محنت افریقہ، امریکہ اور یورپ کے ملکوں میں خوب پھیلی، بڑے بڑے وہاں پر اجتماعات ہوئے اور تبلیغی مراکز قائم ہوئے۔

آپ کی حیات کا آخری تبلیغی اجتماع اور اس کے لئے آپ کا آخری دعوتی سفر ۶/محرم الحرام ۱۴۱۶ھ/ ۶/جون ۱۹۹۵ء میں کسیروہ ضلع مظفرنگر یوپی کا ہوا، ضعف وکمزوری کے ساتھ ان ایام میں دل کی تکلیف اور سینہ کی چبھن بھی وقفے وقفے سے ہورہی تھی، لیکن اسی

حالت میں سفر کر کے اجتماع کے لوازمات اور معمولات پورے فرمائے، چنانچہ آپ نے یہاں متعدد تقاریریں کیں، ہزاروں کے مجمع کو بیعت بھی فرمایا اور اختتام دعا اور مصافحہ فرما کر اپنے وطن کاندھلہ مختصر قیام کر کے دہلی واپس آئے اور یہاں پہنچ کر اپنی حیات مستعار کا ڈیڑھ دن پورا فرما کر ۹ رمحرم ۱۴۱۶ھ/ ۹ رجون جمعہ کا دن گذار کر شب میں داعی اجل کو لبیک کہا، اگلے دن لاکھوں لوگوں کے مجمع میں آپ کی نماز جنازہ صاحبزادہ مولانا زبیر الحسن صاحب نے پڑھائی اور اپنے دیرینہ ہم دم و رفیق حضرت مولانا محمد یوسف کے پہلو میں آپ کو دفن کر دیا گیا۔ **رحمہ اللہ تعالیٰ**

نوٹ: مولانا محمد الیاسؒ نے بحیثیت امیر اول دعوت وتبلیغ کا کام سترہ (۱۷) سال کیا ہے، مولانا محمد یوسفؒ نے بحیثیت امیر دوم دعوت وتبلیغ کا کام بائیس (۲۲) سال کیا اور مولانا محمد انعام الحسنؒ نے بحیثیت امیر ثالث دعوت وتبلیغ کا کام بتیس (۳۲) سال فرمایا ہے۔

(مضمون نگار جامعہ مظاہر علوم سہارنپور کے امین عام ہیں)

☆☆

مادی تعلیم بلا تربیت
اسلامی معاشرہ کی صحت و ترقی ناممکن

● مولانا انور جمال قاسمی

علم ایک روشنی و رہنما قوت ہے، جو انسان کی پوشیدہ و خفتہ قوت اخذ وادراک، ایجاد و اختراع کو ابھارتی و جگاتی ہے، اس کے اندر وہ خوب سے خوب تر امور انجام دینے کی لیاقت پیدا کرتی ہے اور اس کے شعور کو لطیف بنا کر خیر وشر، عزت و ذلت، مفید ومضر، ہدایت و ضلالت، عناد وایثار، امن وآشتی میں فرق وامتیاز کرنے کے لائق بناتی ہے۔

تعلیم جیسی بھی ہو اس کا تعلق طبعیات و مابعد الطبعیات سے ہو، یا مادہ وروحانیت اس کے موضوعات ہوں، اس سے مثبت ومنفی، تعمیری وتخریبی، اچھے و برے مقاصد ومطالب حاصل کرنا اہل علم وفن پر موقوف ہوتا ہے، لیکن شخصیات وسوانحی تحریرات کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے، کہ انسان کی نیت وارادے کی تکمیل نفس وعقل کے ہاتھوں میں ہونے کے سبب عموماً اہل علم وفن سے خیر وفلاح، انسانیت نوازی، رواداری و خیر سگالی کے امور و افعال کم واقع ہوئے، مگر تعلیم کے منافی امور ان سے زیادہ انجام پاتے رہے ہیں، ایسا اس لئے کہ علم و معرفت کی خاصیت تعلّی وتفوق، انا پسندی وخود رائی ہے اور جب وہ انسان میں آتا ہے، تو اس کے اندر وہی خاصیت منتقل ہو کر اس کو بھی خود پسند وخود آرا بنا دیتی ہے۔

اس لئے حصول تعلیم کے ساتھ انسان کی تربیت ضروری و لازمی شئی سمجھی گئی ہے اور شاید دنیا میں تعلیم وتعلم کا آغاز ہوا تو تربیت کی بھی شروعات ہوئی، وہ اس طرح کہ یہ دونوں

لفظ (الگ الگ معنی ومفہوم رکھنے کے باوجود) ایک دوسرے کے ساتھ اس قدر مربوط و مستعمل ہیں کہ سرسری نگاہ میں وہ مختلف المعنی معلوم نہیں ہوتے، کسی بھی فنون کی کتابیں اٹھالیں، اس میں یہ دونوں الفاظ ایک ساتھ مرقوم ملیں گے، عام انسانوں کی زبانوں پر دونوں کا باہم مربوط بلا تکلف آجانا، اس بات کی غماز ہے کہ یہ ایک دوسرے کے لئے لازم وتکملہ کی حیثیت رکھتے ہیں، تعلیم بلا تربیت میں نہ نکھار آتا ہے، نہ وہ نفع بخش وکارآمد بنتی ہے۔

تربیت کی اس اہمیت وافادیت کے سبب ہر قوم ومذہب نے تعلیم کے ساتھ تربیت کو ضروری سمجھا ہے اور نسلوں کی سیرت واخلاق کی اصلاح، ذہنی وفکری طور پر انہیں قومی میراث کا آئینہ بنانے میں ہمیشہ ان کی تربیت کا اہتمام کیا ہے۔

ماضی وحال کے ماہرین ومربیان تعلیم وتربیت نے اسکی تعریف اوراس کے تعلق سے اس کے کارو عمل کی توضیح ان لفظوں میں کی ہے۔

تربیت ایک جہد مسلسل ہے، جس کو والدین اور افراد خاندان اپنے بچے ونسلوں کی اپنے مذہبی اعتقادات، روایات، تصور کائنات اور زندگی کے نصب العین کی فکر کے اساس پر ذہن سازی اوراس کے سیرت وسلوک کی تہذیب وتادیب کرتے ہیں، اس طرح ان کے آباء واجداد سے ان تک منتقل ہونے والے مذہبی وتہذیبی میراث کا وہ ٹھیک طور پر صالح و لائق وارث بن کر اسے مزید وسعت کے ساتھ دوسروں تک پہنچانا وہ اپنا قومی فریضہ تصور کرنے لگتا ہے؛ اس بات کو مزید وضاحت سے دوسرے انداز میں زمانۂ قریب کے اسلامی علوم وتربیت کے ایک عبقری نے یوں بیان کیا ہے؛

تربیت کا کام وعمل عام مصنوعات، خام مواد، اور ایجادات جیسا نہیں ہے، جو کسی ملک و شہر کے ساتھ مخصوص ومحدود نہ ہو کر ہر جگہ اس کی درآمد وبرآمد ہوتی ہے، بلکہ تربیتی عمل وہ ایسا قومی لباس ہے جو اس کے قومی خدوخال، موروثی تقالید وروایات اوراس کے فاضلانہ آداب، قومی مقاصد کے ساتھ اس قوم کی نئی نسلوں پر اس طرح فٹ کئے جائیں کہ آئندہ ان نسلوں کا

قومی مقاصد کی راہ میں جینا ومرنا ان کے مقاصد حیات کی ترجیحات میں ہوجائے۔

میدان تربیت کے مسلم وغیر مسلم ماہرین ومفکرین کے بیان کردہ تعریف وحقیقت سے تربیت کے جو نکات ودفعات اور خطوط ونقشے ابھرے ہیں، اس سے اس کی بنیاد وخطوط پر تربیت پانے والی نسلوں کا اپنے خاندان، قبیلہ، قوم ومذہب اور تہذیب وتمدن کا پیکر ومخلص نمائندہ تیار ہونے کی طرف اشارے ملتے ہیں، لیکن اس کے کسی ایک لفظ سے بھی ان تربیت یافتہ نسلوں کا کسی بھی راستہ سے مال ومادہ بٹور کر عیش پرستانہ زندگی بنانے والا ہونے کی طرف کوئی اشارے نہیں پائے جارہے ہیں۔

ماضی میں ہر قوم وملت میں اپنی نسل وافراد کی تربیت کا خاص خیال وانتظام تھا، ان کے بچوں میں شعور کی آنکھ کھلنے سے قبل والدین میں اس کی تربیت کی فکر بڑھ جاتی تھی، پھر اس کے بعد نسل کی اصلاح کے اس اہم کام میں درجہ بہ درجہ گھر خاندان کے بڑے بوڑھے کی نگاہیں شریک ہوجاتی تھیں، ان کی نقل وحرکت، اخلاق وعادات، بول چال، نشست و برخاست کی اصلاح وتادیب سبھوں کی ذمہ داریوں میں ہوتی تھی انہیں شائستہ وسلیقہ مند، مہذب وباادب بنانے میں سختی کی جاتی، ان کی سیرت وکردار، خیال وجذبات کو پاک و صاف اور فکر وسوچ کو مثبت وتعمیری بنانے کی غرض سے دیسی تعلیم انہیں اول وہلہ میں استاد کی صورت میں وہ مربی وقدوہ کا سامنا ہوتا، جن کی ہر ہر حرکت واداء، قیام وقعود، عادات و اخلاق بلکہ ان کا ذوق وشوق ان بچوں ونسلوں میں منتقل ہو کر انہیں حسن سیرت واخلاق فاضلہ کے ایسے انشا میں بدل دیتا تھا، جن کے اندر مذہبی تعلیمات اور تہذیبی روایات و اخلاق جلوہ گر ہوتے، وہ ملک وقوم اور عام انسان وکائنات کے تئیں نفع رساں ہوتا تھا۔

اس تربیت کا یہ نتیجہ تھا، کہ ہر مذہب ومعاشرہ میں اہل علم کی کمی وقلت کے باوصف وہ خیر وفلاح، نیکی وبھلائی، سلامتی وآشتی اور رواداری وانسانیت نوازی کا منبع وپیامبر ہوتا، لوگ عام طور پر ان کے رنگ میں رنگنے اوران کی صفات وخیال سے متفق ومتصف ہونے

کی کوشش کرتے تھے، نفرت وبدی، عدم رواداری، اور انسانیت کشی کی صفت غضبیہ مغلوب ودبی ہوتی تھی، گاؤں ومحلّہ، شہروقصبہ میں لمبی دوری وطویل مسافتیں تھیں، لیکن اس میں بسے انسانوں کے دلوں میں دوری نہیں قربتیں تھی اور بلاامتیاز مذہب وفرقہ ایک دوسرے کے غم خوار وغم گسار ہوتے تھے۔

اس کے برعکس جدید علوم وفنون اور مغربی وامریکی طرز تربیت کے ثمرات اچھے ثابت نہیں ہوئے، اس نے انسانوں کے خصائل حمیدہ مٹانے اور اخلاق رذیلہ کی تخم ریزی کی، اس نے انسانوں کے جسموں کو صاف ستھرا، خوشبودار بنایا، لیکن انسانی ذہن ودل کو گندہ و بدبودار کیا ہے انسانی آبادیوں کو ایک بستی میں بدل تو دیا ہے، مگر ان کے دلوں میں نفرت و دوری بنا کر دل کو بھیڑیا وچیتا بنادیا، جو ہر کمزور کو پھاڑنے پر آمادہ نظر آتا ہے، چونکہ مغرب ظاہر بین ومظاہر پرست ہے، وہ اندرون کو نہ دیکھ کر بیرون کو دیکھنے کا عادی ہے، اشیاء کی تہوں میں نہ پہنچ کر اس کی سطحوں کو ڈھونڈنے کا خوگر واقع ہوا ہے، بہ این وجہ اس نے مظاہر کائنات سے تعلق رکھنے والے علوم وفنون کو موضوع تحقیق بنایا اور کائنات بحروبر میں پوشیدہ طاقت وتوانائی، دولت وثروت کی اور چونکہ یہ علوم وفنون کائنات ومافیہا سے تعلق رکھنے کے سبب خالص مادی تھے، اس لیے ان کی تحصیل کے مقاصد واغراض کا مادی ہونا اور اس کے نتائج وثمرات کا مادی صورتوں میں رونما ہونا بھی قرین قیاس تھا، علاوہ ازیں ان مادی علوم و فنون کی ایجاد واختراع یورپی ہاتھوں نے کیا، تو اس نے اس کی تعلیم وتدریس اپنے نظام تعلیم وتربیت اور تہذیبی وثقافتی ماحول میں دینا لازمی سمجھا، تاکہ ان کے نوجوان ان علوم سے پیدا ہونے والی دولت وثروت کے نشے میں اپنی موروثی تہذیب وثقافت سے غفلت ونسیان کے شکار نہ بن جائیں، اس طرح انہوں نے ان علوم کی تعلیم کے ساتھ امریکی ویورپی تہذیب وتمدن کی تدریس کا سامان فراہم کیا اور اس تعلیم کی توسیع وپھیلاؤ میں تہذیب و ثقافت کی اشاعت وتبلیغ کے راستے بھی بنادیئے ہیں۔

یورپی ماہرین تعلیم وتربیت کے نزدیک جدید علوم وفنون اور مغربی طرز تربیت کے حصول کا مقصد خالص مادی ہے، وہ اس کی غایت انسانی خواہشات ومطالب کی تکمیل کے لئے اسباب وذرائع کی فراہمی اور طاقت وتوانائی، رفاہیت ومعیشت کا حاصل ہونا ضروری سمجھتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ مغربی معاشرہ میں اہل علم انسان علمی مرتبہ ومقام، عزت و جاہ اور سماج میں باوزن وباوقار اسی وقت ہوسکتا ہے، جب وہ اپنی تمام تر لیاقت وصلاحیت اور اس کے تصرفات میں آئے تمام وسائل وذرائع سے بلاکسی خاص عقیدہ واخلاق، اعلی اقدار وروایات کا خیال کئے زیادہ سے زیادہ مادی اہداف ومقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

اس سے یہ تاثر ہوتا ہے کہ مادی علم ومعرفت کی دنیا میں کسی بھی جدید اہل علم کا جتنا بڑا مقام ومرتبہ کیوں نہ ہو، وہ ایک عظیم عالم وبڑا دانش ور ہوکر بھی یورپی دنیا میں بغیر مادی شان وشوکت کے وہ نہ کوئی اہمیت رکھتا ہے اور نہ اس کی اس مادی مزاج سماج میں کوئی قیمت ہے، یورپ کے اس مادی مزاج وخیال کے سبب وہاں کی شریفانہ وعزت دار زندگی کا معیار وہ زندگی ہے، جس میں خوشحال وفارغ البالی، شان وشوکت اور ہر طرح کے ٹھاٹھ موجود ہوں اور انسانی ضروریات ولوازمات اور تحسینات کے تمام ساز وسامان بہم حاصل ہوں، تو ایسا انسان مغربی دنیا ومعاشرہ میں لائق توجہ اور اس کی بات قابل سماعت ہوسکتی ہے، اس طرح کے جاہ وشان، عیش وعشرت کی زندگی پانے کی غرض سے اہل علم ودانشمندوں کی تمام تر توجہات اور محنت وکوشش ان کی ذات میں محصور ہوگئی، ان کی تگ ودو اخلاق واقدار، صحیح و غلط، اچھے برے، جائز وناجائز ذرائع کا خیال کئے بغیر قلیل مدت میں کثیر مال ومادہ سمیٹ کر مغرب کی شریفانہ زندگی کے صفوں میں کھڑے ہونے تک محدود ہوگئی۔

اس طرح جدید علوم وفنون اور تعلیم وتربیت سے پیدا ہونے والے رجحانات وفکر نے مغربی معاشرہ کے اخلاقیات کی جڑیں کھود ڈالی، کسب مال ودولت اور حصول عیش وعشرت

میں جائز وناجائز، اچھے وبرے ذرائع کی تمیز بے معنی ہوگئی، اخلاق واحترام کی بنیاد اغراض و مفاد ہوگئی، لوٹ وکھسوٹ کا بازار کھلا، ہر شخص اپنی ذات میں سمٹ گیا، مار دھاڑ، قتل وخون ہلکا وستا بنا، انسانی دلوں سے انسانیت رخصت ہوگئی، رشتے ناطے ختم ہوئے، قرابت داری کی بنیاد مادی فوائد بنے، حتی کہ والدین کا احترام وحسن واخلاق کی وجہ مادہ بن گئی، انسانوں کے مابین سے بھائی چارگی، انسانی اخوت، انس ومحبت، ہمدردی، رواداری ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئی ہے۔

جب جدید علوم وفنون مع اس کی تعلیم وتربیت کا سیلاب بلاخیز مشرقی دنیا میں داخل ہوا، تو وہ اپنے تمام خواص ولوازمات، اثرات ونتائج اور مقاصد ومطالب کے ساتھ آیا، مسلمانوں کے علاوہ مشرقی مذہبی وغیر مذہبی قوموں کا ان علوم کے ساتھ کیسا معاملہ رہا اور انہوں نے اس کو ہضم کرنے کا کون سا ایسا نسخہ اپنایا جو ان کی مشرقیت ومذہبیت کی حفاظت کا ضامن بنا، یا انہوں نے اپنی مذہبی ومشرقی شناخت کی حفاظت کا خیال کئے بغیر اس کو من وعن قبول کرلیا اور اس کے نتیجے میں انہیں کیا ملے یا وہ کیا کھوئے اس پر تبصرہ کی گنجائش نہیں ہے، ہمیں تو اس جگہ مشرقی دنیا کی سب سے ممتاز ومنفرد قوم وملت مسلمان کے حوالے سے ان نتائج کو قلم بند کرنا ہے، جو انہیں جدید علوم بہ شمول اس کے نظام تعلیم وتربیت، مقاصد تعلیم و تربیت اور طرز تعلیم وتربیت وغیرہ سے ہاتھ آئے یا پھر اس کے عوض انہوں نے کتنے مذہبی و تہذیبی قیمتی اثاثے سے ہاتھ دھوئے ہیں۔

دنیا کی دیگر اقوام کی طرح مسلمانوں نے بھی جدید مادی علوم کا استعمال کیا اور اپنے بچوں کو اس نئی تعلیم کے دینے کا آغاز کیا، لوگوں میں اس کی دلچسپی بڑھی وپھیلی اور وہ اس کو سینے سے لگانے پر مجبور نظر آئے، ایسا کرنا ان کے لئے مستقبل میں ممکنہ نئے حالات پیش آنے کے سبب ناگزیر بھی تھا اور اس سے منہ موڑنے کا نتیجہ عالمی نقشے میں قوم کو حاشیہ پر کھڑا کرنے کے مترادف بھی تھا، اس سے ان علوم وفنون کی تعلیم سے کبھی کسی نے نہ روکا اور نہ ان

علوم کی توسیع کو محدود کرنے کی کسی سمت سے کوئی کوشش ہوئی۔

البتہ مغرب کی ثقافتی وتہذیبی ماحول وتربیت میں ان جدید علوم وفنون کی تعلیم کا دنیا اور اس سے پیدا ہونے والے مشرقی روایات واسلامی تہذیب وثقافت کو مسخ ومسموم کرنے والے نتائج قوم کے دور اندیش دانشمندوں کی نگاہوں میں کھٹکتے رہے اور وہ اس سے قوم کو ہمیشہ متنبہ وآگاہ کرتے رہے ہیں۔

ایسا اس لئے کہ کسی بھی علوم کی تعلیم وتحصیل نہ بری ہے نہ مضر اور اسے حاصل کرنے کا ہر قوم وملت کو حق ہے، وہ مضر ونتائج بد پیدا کرنے کا سبب اس وقت بنتی ہے، جب اس کی تحصیل سے انسان کے مقاصد بدل جاتے ہیں، اس کا استعمال غلط راستے اور برے مطالب کی تکمیل کے لئے کیا جاتا ہے، یا پھر ان علوم کو ان کی تہذیب وثقافت ان کے طریقۂ تعلیم وتربیت، نظام وماحول کے ساتھ ان کے اثرات ونتائج کا خیال کئے بغیر لینا اس قوم وملت کی تہذیب ومعاشرہ کے تئیں تباہ کن ہوتا ہے، جو خود عظیم ترین تہذیب وثقافت، بے مثال نظام تعلیم وپاک وصاف تربیت اور بے شمار علوم وفنون کے ورثے کی مالک وموجد ہوتی ہے، ایسی پوزیشن میں زندہ وبیدار قوم غیروں کے علوم وفنون کو اپنے قومی نظام تعلیم و تربیت، تعلیمی ماحول وطریقۂ تعلیم وتربیت میں سیکھنے کا سختی سے اہتمام کرتی ہے، تو اس طرح سے ان علوم وفنون کو حاصل کرنے والی ان کی نئی نسلیں ان کے تہذیبی وثقافتی زہر واثرات اور اخلاقی امراض سے بہت حد تک محفوظ رہنے میں کامیاب رہتی ہے۔

جدید مادی وسائنسی علوم وفنون کی تعلیم وتحصیل کے حوالے سے مجموعی اعتبار سے مسلمانوں نے اس مذہبی فرموں ومقیاسوں میں جانچنے کا اہتمام نہیں کیا، بلکہ عربی وعجمی مسلم ریاستیں جن کی حکومتیں اور وزارت تعلیم وکلچر اپنی تھی، انہوں نے بھی بغیر قیل وقال، نقد وجرح اور جانچ وپڑتال کے اس تعلیم کو مع اس کی تہذیب وثقافت کے قبول کرلیا، حتی کہ قوم و ملک کی ترقی وخوشحالی یورپی زندگی کے طرز طریقے، بود وباس، رنگ وڈھنگ، وضع قطع اور

لباس و پوشاک کی نقل میں سمجھا اور مسلم بچے و بچیاں چھ سال کی غیر شعوری عمر سے ۲۵/۳۰ر سال کی پختہ شعور کی عمر تک جدید علوم کی ان درس گاہوں میں زندگی کے صاف ستھرے قیمتی لمحات گزارنے لگے، جن میں عصری علوم، یورپی و امریکی تہذیب وثقافت میں دے جاتے ہیں اور ان پر اعظموں کے معاشروں کی تقلید وتطبیق مسلم نسلوں کے صاف وشفاف قلب و ذہن پر کی جاتی ہیں، ان اسلام مخالف اور اخلاق وشرافت کے منافی طریقۂ تعلیم، ماحول، نقل وحرکت، کھیل کود، مغرب کے پروردہ مغرب نواز اساتذہ ومعلمات اور یورپی مسحورکن تہذیبی وثقافتی پروگرام ان کے مزاج ورجحان کی مغربی تشکیل میں ہمہ وقت لگے رہتے ہیں، نتیجتاً ہماری نوجوان نسلیں ذہن وفکر، عادات واخلاق اور سوچ وبچار کے اعتبار سے مادی و صنعتی کلچروں کی دلدادہ وبہی خواہ ہورہی ہیں اور اس کو اپنی زندگی کے نصب العین کا آئیڈیل بنارہی ہیں۔

ان حالات میں مسلمان جیسی اسلامی تعلیم وتربیت، روایات واقدار کی وارث عظیم ترین قوم کی قومی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ اپنے نوجوان نسلوں کو صحیح العقیدہ و پختہ دینی خیال بنانے اور اسلامی تعلیمات وتہذیب کا مسیحا متبع ونمائندہ دیکھنے کی غرض سے اولا اپنے گھروں کو دینی تربیت گاہ بنانے کا اہتمام کرتی اور اس میں تربیت کرتی جوفنون تربیت کی روح ہے؛ تو انہیں اس کا عمدہ پھل صحیح وصاف ذہن وفکر، حسن عمل وبلند اخلاق اور اخلاقی امراض سے پاک نسل کی صورت میں مل سکتا تھا۔

اسکے لیے انہیں اپنے گھروں میں اسلامی خیالات وجذبات کے آغوش کی مائیں لانے ہوں گے، اپنے مکانوں کو اسلامی تعلیمات وروایات کا مظہر بنانے ہوں گے، بچے کے والدین وقرابت دار کو اپنے اسلامی فکر وعمل، اچھے عادات واخلاق سے انہیں متاثر کرنے کا دھیان رکھنا ہوگا، ان مسلم نئے پود کے قلب ونظر، ذہن وفکر میں اسلامی تعلیمات و اقدار راسخ کرنے اور مغربی افکار وخیالات سے انہیں دور رکھنے کی ہمہ وقت کوشش کرنی

ہوگی، بچوں کے والدین وفیملی ممبران کو تربیت کی غرض سے پہلے خود پر اسلامی تعلیمات و احکامات، اخلاق وعادات کی تعمیل وتطبیق میں کوتاہی کا شکار نہ ہونا ہوگا اور حتی الوسع ان کے روبرو غیر اسلامی فعل یا اسلام مخالف امور کے ارتکاب کی غلطی سے انہیں برے تاثرات لینے کا موقع نہ دینا ہوگا، اسلام کے فرائض و بنیادی اعتقادات واحکامات کا خود پابند بننا اور ناصحانہ انداز میں انہیں بھی اس کی پابندی کی ترغیب دینی ہوگی؛ اپنے گھریلو ماحول کو بہ تدریج اسلامی بنانے کی فکر کرنی اور پہلے قدم کے طور پر اپنے کمروں وحجروں کو ان سازوسامان، اسباب وآلات سے آراستہ کرنے سے احتراز کرنا ہوگا، جو آج کی تاریخ میں فساد معاشرہ، مخرب اخلاق وخیال کے ذرائع کی صورت میں ہر گھر میں داخل ہو چکے ہیں، اور ہر آن مسلمان لڑکے ولڑکیوں کی انگلیاں ان کے بٹنوں اور نگاہیں ان کے پردوں پر ہوتی ہے؛ انہیں ان کے کلاس فیلو، دوست واحباب کے انتخاب میں ان کی رہنمائی کرنی ہوگی اور ان کے بیرون خانہ کی نقل وحرکت، سیرت وسیاحت اور اوقات گزاری پر بھی کڑی نگاہ رکھنی ہوگی، غیر درسی کتب بینی کے جوائز میں بھی وہ اپنے بڑوں کی مدد کے محتاج ہوتے ہیں، انہیں مشفقانہ و دل نشیں اسلوب میں سیرت واخلاق، مصلحتیں واکابرین کی سوانح واسلامی تعلیمات پر لکھی ہوئی کتب پڑھنے کی ترغیب وشوق دلانے ہوں گے، ان کے ذہن وفکر میں حسن سیرت وسلوک اور حسن اخلاق وپاکیزہ عادات کی خوبی راسخ کرنے میں محنت سے گریز نہ کرنا ہوگا، تاکہ وہ ازخود اپنے دینی عادات واخلاق اور نجی زندگی وکردار کو اسلامی تعلیمات کے مطابق دیکھ کر دل میں فخر واعتزاز محسوس کرنے لگے اور کسی اسلام مخالف ماحول ومجالس، اور مجمع میں انہیں اسلامی وضع قطع اور دینی تعلیمات میں شریک ہونا ان کے اندر نہ خفت پیدا کرے اور نہ انہیں احساس کمتری میں مبتلا ہونے کا باعث بنے؛

مسلمان نسلیں اگر اپنی لاشعوری کے سنوں سے اپنے گھروں میں اس طرح اسلامی تربیت حاصل کریں گی، دینی تعلیمات واسلامی ماحول ومعاشرہ اور تہذیب وتمدن کی عادی

بنائی جائیں گی، اسلامی اخلاق وحسن سیرت کی خوبی ونفع ان کے ذہن وفکر میں جمائے جائیں گے، والدین کے اسلامی عمل ودینی باتوں وکلاسوں سے جب انہیں فکری وروحانی غذا بہم پہنچے گی، تو وہ مسلم نسلیں بیرون خانہ عصری درس گاہوں میں امریکی ویورپی تہذیب وتمدن کی سمیت واخلاقی امراض سے کافی حد تک محفوظ ہی نہیں رہیں گی، بلکہ خود میں اس کے دفاع ومقابلہ کی قوت وتوانائی پا کر اس سے آنکھیں ملانے میں نہ انہیں خفت ہوگی نہ جھجک؛ نیز اسلامی احکام وتعلیمات پر عمل کرنا بھی انہیں آسان وسہل معلوم ہوگا اور غیروں کو اس کی طرف دعوت دینے میں وہ خود میں قوت وایمانی طاقت محسوس کریں گے۔

یہ کام مغربی ماحول اوراس کے اثرات کے غلبہ کی وجہ سے بہ ظاہر مشکل دیکھائی دیتا ہے، لیکن اتنا مشکل نہیں جتنا اس کو سمجھا جارہا ہے، یہ سب کچھ ماحول وحالات پر موقوف ہے، تہذیب وتربیت میں ماحول کا کردار کلیدی ہوتا ہے، وہ بچے ونوجوانوں کے قلب وذہن کو متاثر کرنے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، جو کام کتابوں، تقریروں اور خطبات سے برسوں میں تکمیل پذیر ہوں گے، وہ اس کے مناسب ماحول پانے سے ہفتوں ومہینوں میں پائے تکمیل کو پہنچ جاتے ہیں، اور آج موبائل وکمپیوٹیر کے دور میں ماحول کے اثرات کی افادیت سمجھانے کی چنداں ضرورت نہیں ہیں۔

عام مسلم گھروں میں مسلمان بچے وبچیوں، لڑکے ولڑکیوں کی دینی تعلیم واسلامی تربیت کے تعلق سے اس طرح کا اہتمام نہ ہونے کی وجہ سے دین ودینی فکر وعمل سے انہیں دور ہونے کا یہ ایک بنیادی بہت بڑا سبب ہے؛ اسی پر بس نہیں، بلکہ مسلمانوں کی آنکھوں پر امریکی ویورپی تہذیب وثقافت کے موٹے سیاہ عینک چڑھ جانے کے سبب انہیں دنیوی ترقی کا راز عصری مادی علوم وفنون کی تعلیم بہ شمول جدید تہذیب وتمدن کی مکمل پیروی میں آنے لگی ہے، بہ این وجہ وہ اپنے نسلوں کی تربیت بھی امریکی ویورپی طرز زندگی پر کرنے لگے ہیں؛ ان کے بچوں کے نام اسلامی کے بجائے انگریزی کے کریہہ معنی کے لفظوں سے

رکھے جانے کی فضا عام ہورہی ہے، صبح سویرے ان بچوں کا گڈ مورنگ پاپا کے لفظوں پر بیدار ہونا، نہا دھو کر نرسری، مشنری، کرسچن، ڈی اے وی اسکولوں میں جانا اور آنا، اس کے بعد اسکول کے ''ہوم ورک'' سے بچے وقتوں کو ٹی وی، انٹرنیٹ اور موبائلوں کے اسکرینوں پر امریکی ویورپی ثقافتوں وتہذیبوں میں گزارنا مسلم بچوں کا یومیہ روٹین ہے، ان کے چوبیس گھنٹوں میں کہیں سے بھی دینی تعلیم وکلمات، اسلامی ماحول وتہذیب کا ان کے کانوں وآنکھوں کے سامنے نہ آنا ان کے قلب وذہن، فکر ونظر کو اسلام سے برگشتہ کرنے کی یہ بھی ایک بڑی وجہ ہے، اسلام مخالف دنیا کی قدیم ترین یا جدید ترین تہذیبوں، روایتوں ورسموں کی طرف ان کا تیزی سے بڑھنا اور اسے عجلت سے اپنانا، مسلم نوخیز (لڑکے ولڑکیوں) نسلوں سے اسلامی معاشرہ کے ایک ایک اقدار کے ٹوٹتے ہوئے مظاہر، اسلامی روایات ورسومات سے نفرت ودوری جدید تربیت کے نتیجے ہیں، مسلم تعلیم یافتہ مہذب (امریکی تہذیب سے) لڑکیوں میں عریاں فیشن پرستی کے بڑھتے رجحان، ان کے اندر شرمناک وحیا سوز حرکات وسکنات کا اضافہ، خود کو ننگا وعریاں رکھنے کے حق کا مطالبہ، اسلام مخالف فلموں میں خدا اور رسول بیزار کردار ادا کرنا، مسلم دین دار لڑکوں کے مقابلہ میں غیر مسلم ہنود ویہود لڑکوں کو رشتۂ ازدواج میں ترجیح دینے، زوجین میں کثرت نا اتفاقی کے کھیل وکود میں حصہ لینے کا ان کے اندر بڑھتا ہوا شوق، عزت واکرام کا معیار دولت وکرسی وغیرہ امریکی ویورپی طرز تربیت پر مسلم بچوں کی تربیت کے ثمرات ونتائج ہیں، جو آج عالمی برادری میں ہمارے مسلم نوجوان ودوشیزاؤں کی پہچان وشناخت بن چکی ہے۔

تعلیم وتعلّم کے موضوع پر منعقد ہونے والے اجتماع واجلاس میں مسلم لڑکیوں کو خواندہ بنانے کے فوائد ومعاشرہ کی ترقی پر ہمارے دینی ودنیوی رہنماؤں کی پرجوش تقاریر اوران کی ناخواندگی وجہل سے معاشرہ کے مریض وپچھڑنے کے برے نتائج سے خبردار کرنے کا رزلٹ یہ ہوا ہے کہ مسلم لڑکیوں میں جدید تعلیم کی تحصیل کا شوق ولگن عام ہو چکا ہے اور

سرکاری سہولیات، مراعات وانعامات اور ملازمت ونوکری کی طمع ولالچ میں وہ علمی مسابقت میں آگے وامتیاز حاصل کررہی ہیں، پرائمری سے جامعات کی حد کے امتحانات میں وہ فائق وپوزیشن لارہی ہیں، لیکن جہاں تک معاشرہ وتہذیب کی ترقی وترویج اور خوانگی زندگی میں راحت وسکون کا تعلق ہے، تو ان کے تعلیم یافتہ ہونے سے مسلم گھروں میں امریکی ویورپی معاشرتی اقدار وآداب، شناخت وپہچان کے طور وطریقے کی ترویج واشاعت تو ہورہی ہے، لیکن اسلامی تہذیب وتمدن، اخلاق وآداب، دینی ارکان واقدار کی ان سے بہ تدریج توہین وتوفن ہورہی ہے، اس لیے یورپی وامریکی تہذیب میں مسلم نسلوں کا جدید علوم حاصل کرکے اسلامی معاشرہ کو ترقی دینے کی پیشین گوئی بڑی تعجب خیز ہے؛ حقیقت تو یہ ہے کہ اسلامی تہذیب وتمدن کے سمٹتے ہوئے دائرے، مسلمان نئی نسلوں میں اسلام واسلامی امور سے بڑھتی ہوئی بے رغبتی اور مسلم سماج میں ڈھیل پڑتی ہوئی اس کی گرفت اور اس کی جگہ سخت ہوئی امریکی ماحول وطرز معاشرت پر غور وفکر کرنے والا انسان محو حیرت ہے کہ جب یہ دونوں دو شئی ہے، دونوں دو تہذیب وتمدن کے نام ہیں، دونوں کا کسی نقطہ پر ملاپ وسمجھوتہ آسان نہیں، تو پھر غیر اسلامی تہذیب وماحول میں مادی وسائنسی تعلیم پانے والے نسلوں سے اسلامی معاشرہ کی آبیاری کی امیدیں لگانا عبث ہے، چونکہ عملی دنیا ایسا نہیں ہوتا ہے، کہ ’’بوئے گیہوں اُگے جو‘‘ بہ ایں وجہ مسلم دنیا میں عصری علوم کی تعلیم (جس کی تحصیل فی زماننا ضروری ہے) کی ترغیب وبیداری کی روح پھونکنے کے سَمے ہمارے رہنما مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ بات جمانے کی بھی کوشش کریں کہ عصری ومادی علوم وفنون کی تحصیل جس طرح موجودہ وقت کا ایک بڑا چیلنج ہے، اسی طرح اس کے طرز تعلیم، تعلیمی ماحول ونظام سے گریز بھی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، چونکہ وہ طرز وطریقہ امریکی تہذیب وتمدن، تصور حیات وکائنات کی ترویج کا بھی وہ ایک راستہ ہے، اس لیے اس سے اسلامی تہذیب وتمدن کی ترقی وتوسیع کسی جہت سے ممکن نظر نہیں آتی ہے۔

جدید علوم کی تعلیم جس طرح جدید دنیا کی بنیادی ضرورت بن چکی ہے، اس سے گریز و بے اعتنائی ممکن نہیں ہے، لیکن اس سے ہمارے مسلم نوجوان لڑکے لڑکیوں میں پیدا ہونے والا عریاں ماحول اور زندگی کے تعلق سے ان کی سوچ ومزاج اسلام واسلامی تعلیم سے میل نہیں کھاتا ہے، ایسی نازک پوزیشن میں جدید علوم وفنون کی تعلیم اسلامی ماحول وتربیت میں دینا اسلامی معاشرہ کے بقا کے حوالے سے وقت کا اہم تقاضہ بن چکا ہے، اس لیے اسلامی ماحول پر مشتمل عصری علوم کی درس گاہ کا قیام، جدید علوم کے ماہرین اسلامی سوچ وفکر اور مزاج کے اساتذہ کی فراہمی وبحالی، درس وتدریس کو اسلامیائی رنگ دینے اور طلبہ و طالبات کو اسلامی ماحول وتربیت میں جدید علوم سے آراستہ کرنا مسلم حکومتوں کے وزارت تعلیم کی ملی وقومی ذمہ داری ہے، اس کے لیے انہیں ’’جوئے شیر‘‘ لانے کی دشواری نہیں ہوگی، بلکہ عزم وہمت، اخلاص ولگن سے یہ مشکل نظر آتا کام آسان ہوسکتا ہے اور غیر مسلم ملکوں میں مسلمان امراء، رؤساء اہل ثروت پر شرعی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی دولت کا کچھ حصہ اس طرح کی تعلیم گاہوں کے قیام میں لگا کر عند اللہ ماجور بنیں، جس کے قیام میں عموماً جمہوری ملکوں میں دستوری طور پر کوئی قید وبند نہیں ہوتے ہیں، بہ صورت دیگر اگر اس کار عظیم کی تکمیل میں مسلم حکومتیں پہلوتہی کرتی ہیں اور مسلمان اجتماعی طور پر شریک ہونے سے غفلت وسستی برت رہے ہیں، تو مسلمانوں کا دینی فریضہ یہ ہے کہ وہ انفرادی حیثیت سے اپنے بچوں کو عصری علوم کی تعلیم دلانے کے جدید تقاضے اور عالمی مطالبے کو پورا کرنے میں نادانی وکم عقلی کا شکار نہ بنیں اور دوسری طرف اندرون خانہ ان کی اسلامی نہج پر اس طرح پختہ تربیت کی جائے کہ ایمان واسلام ان کی نجی واجتماعی زندگی کے عملی دائرے میں طبع ثانیہ بن جائے اور وہ زندگی کے تمام امور ومشغولیتوں میں رہ کر بھی ایمان واسلام کے تقاضے سے نہ غافل بنیں اور نہ اسلام واسلامی معاشرہ کی توسیع وترقی سے لمحہ بھر بے فکر رہ سکیں، گویا وہ بھی ان کی زندگی کا ایک جزء لاینفک کی صورت اختیار کرلے، اگر ایسا نہیں ہوتا اور انہیں

صرف جدید و مادی علوم سے سنوارا جاتا رہا اور موجودہ دور کے انٹرنیٹ تہذیب وتمدن کی خطرناکی سے آنکھیں بند کرلی گئیں، تو آنے والے دنوں میں مسلمان نسلیں کیسی بنیں گی اس کا اندازہ کرنا حالات حاضرہ کے تناظر میں مشکل نہیں رہا، اس لیے مسلمان ایسے تعلیمی و تہذیبی پرخطر موڑ سے بہ آسانی اسی وقت گزر سکتے ہیں، جب وہ اپنے بچوں کو ہر طرح کے جدید وسائنسی علوم سے آراستہ اور اسلامی نہج پر ان کی اسلامی تربیت کرکے انہیں دین ودنیا کو اپنے حدود میں خوب سے خوب تر بنانے کے لائق بنادیں۔

(مضمون نگار معروف عالم دین اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں)

☆☆

عورتوں کے حقوق اور ہماری ذمہ داریاں

● انیس الرحمٰن القاسمی

کسی قوم کی تہذیب وتمدن اور ترقی کا حال معلوم کرنا ہو تو یہ دیکھو کہ اس کے معاشرے میں عورت کا درجہ کیا ہے، بہترین معیار یہی ہے۔ جس زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے، عورت ساری دنیا میں محکوم تھی اور کمترین سمجھی جاتی تھی، وہ بہت سے قانونی حقوق سے محروم تھی۔ بہت وثوق کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس وقت جب مذاہب وقوانین کا دور دورہ تھا ان کی رو سے عورت مردوں کی اس قدر محکوم تھی کہ مذہبی امور تک میں حصہ لینا اس کے لیے ممنوع تھا۔ عورتیں ان کے نزدیک سرچشمۂ گناہ تھیں۔ عرب کی عورت کا حال بھی دوسرے ملکوں کی عورتوں سے کچھ بہتر نہ تھا۔

عربوں کی نگاہ عورت کی طرف بس ایسی ہی تھی جسے ایک فطری اور سرسری نگاہ کہا جائے۔ اور اس سرسری نگاہ سے ہماری مراد یہ ہے کہ اس نظر میں کسی داخلی احساس کو دخل نہیں تھا کہ اس کو شرعی حدود یا عقائد کی پابندیوں کے اندر دیکھا جائے بلکہ وہ اس مزاج کے مطابق ہوتی تھی جو وقت اور ماحول کا تقاضہ ہوتا تھا۔

اور جہاں تک ضرورتوں کا تعلق ہے تو وہ حسب حال بدلتی رہتی تھیں، اسی لئے عربوں نے جاہلیت کے پہلے دور میں کبھی بھی عورت پر لعنت بھیجنے کو ضروری نہیں سمجھا اس لئے کہ عورت پر لعنت بھیجنے کا جو سلسلہ عمومی طور پر قرون اولی میں شروع ہوا، اور بڑھتا ہوا قرون وسطی تک پہنچا، آدم وحوا کی اس خطا پر ایمان رکھنے کا خمیازہ ہے جس کی بنا پر انہیں جنت

الفردوس کی نعمتوں سے محروم کر کے دنیا میں ڈالدیا گیا یہاں تک کہ بعض لوگوں نے عورت کو نجاست اور شر سے داغدار اور معیوب قرار دیا، کیونکہ اس کے نزدیک عورت مردوں میں شہوانی جذبات بھڑکانے کا باعث اور شیطان کا ایک جال ہے، لیکن عربوں نے عورت کو کبھی نہ اس نگاہ سے دیکھا، اور نہ اسے نجس اور شر و برائی کی جڑ قرار دیا، کیونکہ زمانہ جاہلیت میں عرب خطاء یا غلطی کا وہ مفہوم جانتے ہی نہیں تھے، جس کو سامنے رکھ کر لوگوں نے عورت کو شر کی دیوی کہا۔ اس طرح عرب کسی ایسے قاعدہ قانون یا سماجی اصول سے بھی واقف نہیں تھے، جس کے ذریعہ عورت کو کنیز یا باندی بنائے رکھنے کا حکم لگایا جاتا ہو۔

رومیوں کا عورتوں کے بارے میں نظریہ:

البتہ رومیوں میں ان جیسے قوانین، خطاء آدم کا اعتقاد کسی دین پر ایمان رکھنے سے پہلے ہی مروّج تھے، کیونکہ وہ لوگ ایک وسیع وعریض مملکت کے مالک تھے اور انہیں ضرورت تھی کہ اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کے کچھ حقوق مرتب کریں، کچھ معاملات طے کریں، اس طرح جب انھوں نے قوانین مرتب کرنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے اپنے زمانہ کی عورتوں کو اسی نگاہ سے دیکھا جس نگاہ سے وہ ہر کمزور اور طفیلی قسم کے لوگوں کو دیکھتے تھے۔ انہوں نے اس سلسلے میں عورتوں کی خاص دشواری اور ان کی مخصوص جنسی کمزوری کو ملحوظ نہیں رکھا۔ کیونکہ عورتوں کے تئیں ان کا ٹھیک وہی نظریہ تھا جو چھوٹے بچوں اور اجمالی طور پر معذور و محتاج لوگوں کے تئیں تھا، چنانچہ ان کے ساتھ کمزوروں جیسا ہی برتاؤ کیا اور انہیں وہی حقوق دیئے جو کمزوروں کو دیے جاتے ہیں۔

کمیونسٹوں کا نظریہ:

کمیونسٹوں کا نظریہ ہے جو عورت و مرد کو ہر حال میں مساوی دیکھنا چاہتے ہیں، ان کی خواہش ہے کہ خاندانی نظام کو درہم برہم کر دیں، کیونکہ ان کے خیال میں خاندان ہی

استحصال کی جڑ اور بنیاد ہے، اور کسی کا استحصال منحصر ہے عورت و مرد کے حقوق میں فرق کر نے پر۔ اس لئے پہلے ضروری ہے کہ اس فرق کو ختم کیا جائے اور عورت مرد کے درمیان تمام حالات اور تمام اعمال میں مساوات پیدا کی جائے۔

اسلام کا نظریہ:

اسلام آیا تو اس نے عورتوں کے حقوق کے سلسلے میں وہاں سے شروعات کی جہاں تک تہذیب وقیادت کے آداب پہنچ چکے تھے، لہٰذا اسلام نے اس رواج کو ہر طبقہ کی عورت کا مردوں پر واجبی حق قرار دیدیا اس کو صرف گھریلو خواتین تک محدود نہیں رہنے دیا، جیسا کہ عہد جہالت کے آداب میں اصطلاح اور رواج کی رو سے انہیں عورتوں تک محدود تھا، جسے وہ بھاتا تھا اپنا لیتا تھا، جیسے ناپسند ہوتا ٹھکرا دیتا تھا۔

پھر اسلام نے اس رواج میں حقوق کی پاسداری کے ایک درجہ کا اور اضافہ کر دیا، جہاں تک دعوت محمدی سے پہلے اعلیٰ سے اعلیٰ خاندان کی اعلیٰ سے اعلیٰ خواتین نہ پہنچ سکیں، اور ایسا اسلام نے اس لیے کیا کیونکہ عورتوں کو بھی اس نے احکام وآوامر کا مکلّف بنا دیا، انہیں بھی ہر چیز میں مردوں ہی کی طرح مخاطب کیا سوائے چند مخصوص اعمال کے جو اس درست رواج (شریعت) میں مردوں کے ساتھ خاص ہیں۔

چنانچہ عورت ایک ایسی انسان ہے جس کے حقوق اور ذمہ داریوں کا اسلامی شریعت میں لحاظ رکھا گیا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

ولهن مثل الذی علیهن بالمعروف وللرجال علیهن درجة. (البقرة ۲۲۸)

ترجمہ: ''اور عورتوں کے لیے بھی حقوق ہیں جو کہ مثل ان ہی حقوق کے ہیں جو عورتوں پر ہیں قاعدہ (شرعی) کے موافق اور مردوں کا ان مقابلہ میں کچھ درجہ بڑھا ہوا ہے''۔

یہ فرق جو دونوں صنفوں میں ہے، وہ ان کے حقوق کے بنیادی اختلاف کا نتیجہ نہیں، بلکہ یہ تو اس فرق کی وجہ سے پیدا ہوا ہے جو معاشی مرتبے میں ان کے درمیان تھا۔ عملی طور پر عورت کو وہ سماجی مواقع حاصل نہیں جو مردوں کو تجربات، اختراعات اور معلومات عامہ کے سلسلے میں حاصل ہیں۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ معاشی طور پر عورتوں کا انحصار مردوں پر ہے اور یہی پہلو ہے جو مردوں کو ایک طرح کی برتری اور ذمہ داری عطا کرتا ہے۔

اسلام میں خواتین کو خیار بلوغت:

اس لئے عالی خاندان یا معمولی گھرانے کی کوئی بھی بڑی عمر کی خاتون یا دوشیزہ بغیر اس کی رضا حاصل کئے یا باقاعدہ اس سے رجوع کئے رشتہ ازدواج سے منسلک نہیں کی جاسکتی اس سلسلہ میں اسلام میں یہ اصول موجود ہے کہ کسی بھی بیوہ یا کنواری عورت کی اس وقت تک شادی نہ کی جائے جب تک اس سے مکمل اجازت نہ حاصل کرلی جائے اور اس کی رضامندی کی علامت خاموشی ہے جیسا کہ بعض احادیث میں وارد ہے۔

خواتین کو وراثت کا حق:

نیز اسلام نے عورت کو یہ حق دیا کہ وہ جس چیز کی چاہے مالک بنے، جس چیز کو چاہے خریدے یا فروخت کرے اور یہ کہ وہ وراثت میں بھی شریک ہوگی حالانکہ پہلے اس کے لئے یہ چیزیں حرام تھیں کیونکہ میدان جنگ میں لڑائی کے فرائض انجام نہیں دیتی تھی بلکہ مرد کو یہ حق حاصل تھا کہ میراث میں عورت کو بھی جبرواکراہ کے ساتھ اپنے حصہ میں اسی طرح منتقل کرلیتا تھا جس طرح گھوڑے، اونٹ اور دیگر دنیاوی ساز وسامان کو۔ اسلام نے اس مکروہ عمل کو قطعی باطل قرار دیا اور قرآن کریم میں کہا گیا: **یا ایھا الذین آمنوا لایحل لکم ان ترثوا النساء کرھا** (النساء . ۱۹)

ترجمہ: اے ایمان والو تمہارے لئے جائز نہیں ہے کہ زبردستی عورتوں کے وارث ہو جاؤ۔

وراثت کے سلسلہ میں اسلامی شریعت کا یہ قانون ہے کہ عورتوں کا حصہ مردوں کے مقابلہ میں نصف ہے۔

عورتوں کی اس قانونی حصہ داری میں بظاہر جو عدم مساوات سی نظر آتی ہے اس کی تشریح علامہ ڈاکٹر محمد اقبال نے یوں کی ہے:

لڑکی کا یہ حصہ اس کی کسی فطری کمتری کی بناء پر نہیں بلکہ اس کے معاشی مواقع کے پیش نظر ہے اور اس مقام کی وجہ سے جو اپنے معاشرے کے نظام میں اس کو حاصل ہے ''محمڈن لاء'' کے مطابق لڑکی اس جائداد کی پوری طرح مالک تصور کی گئی ہے، جو اس کو شادی کے وقت باپ کی طرف سے بھی ملتی ہے اور شوہر کی طرف سے بھی، مزید برآں مہر بھی کلیتہً اسی کی ملکیت ہوتی ہے، جو خود اس کی مرضی کے مطابق معجّل ہو یا مؤجل، اتنا ہی نہیں بلکہ مہر کی ادائیگی تک وہ اپنے شوہر کی ساری جائداد اپنے قبضے میں رکھ سکتی ہے، ساری عمر کی کفالت کی ذمہ داری بھی (شادی سے پہلے باپ پر اور شادی کے بعد) شوہر پر ہے۔ اگر آپ اس زاویۂ نظر سے قانون وراثت کے عمل کو دیکھیں تو آپ کو بیٹے اور بیٹیوں کے معاشی مرتبے میں کوئی مادی تفاوت نظر نہیں آئے گا بلکہ حق تو یہ ہے کہ وراثت کی حصہ داری میں بظاہر غیر مساوی نظر آنے والی یہ صورت ہی اصل میں قانونی مساوات مہیا کرتی ہے۔ (اسلام کی مذہبی فکر کی تشکیل جدید ص ۱۶۱،۱۶۲)

خواتین کو حق بیعت:

اور اسلام نے یہ بھی فیصلہ کن بات کہہ دی کہ خواتین بھی اسی طرح بیعت کرنے کا حق رکھتی ہیں جس طرح مردوں کو یہ حق حاصل ہے۔ اور یہ بھی کافی نہیں ہے کہ اگر عورتوں کے والد یا شوہر یا ان کے ولی نے بیعت کرلی ہے تو وہ عورتوں کی طرف سے بھی سمجھی جائے جیسا کہ نص قرآن سے ثابت ہے اور سورہ ممتحنہ کی آیت نمبر ۱۲ میں اس کا حکم موجود ہے۔

پھر اسلام میں یہ بھی ضروری قرار دیا گیا ہے کہ خواتین کے ساتھ محبت وانسیت کا تعلق اسی

ذمہ داری کے ساتھ پورا کیا جائے جس طرح حسن معاملہ میں اس کا خیال رکھا جاتا ہے، یعنی نرمی، ملاطفت اور بھلائی اختیار کرنے میں وسیع الظرفی کو ملحوظ رکھا جائے، جیسا کہ شریعت اسلامیہ کا مطالبہ ہے۔ اسی لئے مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ لڑکیوں کی ولادت کو بھی نہایت خوش طبعی اور رضامندی سے قبول کریں اور ان لوگوں کو تنبیہ کی ہے جو لڑکی کی پیدائش پر کراہت اور ترش روئی کا مظاہرہ کرتے ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے "**واذا بشر احدهم بالانثیٰ ظل وجهه مسودا وهو كظيم يتوارى من القوم من سوء مابشر به أيمسكه على هون أم يدسه في التراب ألا ساء مايحكمون**"

ترجمہ: ''اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی خوش خبری ملتی ہے، تو سارے دن اس کا چہرہ سیاہ رہتا ہے اور اندر ہی اندر گھٹتا رہتا ہے، اس خوشخبری کی ذلت کی وجہ سے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے اور شب وروز اس ادھیڑ بن میں رہتا ہے کہ آیا ذلت قبول کر کے اس کو زندہ رہنے دے یا مٹی میں گاڑ دے، کتنا برا فیصلہ کرتے ہیں یہ لوگ''۔

خواتین کے ساتھ عدل وانصاف:

خواتین کے ساتھ عدل انصاف کے معاملہ میں آنحضرت ﷺ کے ارشادات بھی قرآن کریم ہی کا ایک حصہ معلوم ہوتے ہیں اور اسی نہج پر وارد ہوئے ہیں، جیسا کہ آپ نے فرمایا "**خيركم من خيركم للنساء**" تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو عورتوں کے حق میں بہتر ہو۔ آپ نے فرمایا "**ماكرم النساء الاكريم ولااهانهن الالئيم**" عورتوں کے ساتھ اکرام واحترام کا برتاؤ کرنے والا تو کریم اور شریف ہی ہوتا ہے اور جس نے عورتوں کے ساتھ اہانت آمیز سلوک کیا وہ کمینہ ہے۔

تعلیمی حقوق:

اسلام نے آکر طلب علم کو تمام مسلمان مرد وعورت پر لازم کر دیا، اور نبی ﷺ نے

باندیوں کے لئے بھی اسے پسند فرمایا جیسا کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس مرد کے پاس کوئی کم عمر باندی ہو اور اس نے اس کو اچھی طرح زیور تعلیم سے آراستہ کیا اور ادب سکھایا پھر اس کو آزاد کر کے اس کی شادی کر دی تو ایسے آدمی کے لئے دو اجر ہیں۔

یقین کیجئے عورتوں کو تعلیم وتربیت اور ان کے حقوق سے آشنا کرنے میں ساری کوتاہی مسلمانوں کی ہے اسلام کی نہیں، اور ہم تو یہاں تک تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمان اپنے مذہب کی ہدایات کو پورا کرنے سے اس قدر قاصر رہے ہیں کہ اب وہی اس کے خلاف ایک ثبوت بن کر رہ گئے ہیں۔

خواتین کے ساتھ حسن سلوک:

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آنحضرت ﷺ نے عورت کے ساتھ حسن سلوک کو اپنی طبیعت شریفہ پر اس طرح اور اس انداز سے لازمی نہیں کر لیا تھا جس طرح احکام خداوندی کو اس شخص پر بھی فرض کیا جاتا ہے جو اس کی اطاعت کو بخوشی قبول نہ کر رہا ہو بلکہ حضور ﷺ نے عورت کے ساتھ نیکی کا برتاؤ ایسے ہی فطری طور پر کیا جس طرح آپ نے ہر جاندار مخلوق خاص طور پر کمزوروں کے ساتھ کیا۔ نیز آپ ﷺ نے تو عورتوں کے ساتھ نیکی کرنے کو مردوں کے عمدگی اخلاق کے درمیان مقابلہ کرنے کی کسوٹی اور بھلائی وکمال کی طلب میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا عنوان قرار دیا ہے۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو عورتوں کے لئے اچھا ہے''۔

اس سلسلہ میں یہ بھی روایت ملتی ہے کہ آپ جب بھی گھر میں تشریف لاتے تو اہل خانہ کے کاموں میں مشغول ہو جاتے اور جب نماز کا وقت آتا تو مسجد تشریف لے جاتے۔ اسی لئے آپ نے گھر میں بیوی کی خدمت کو مستحب قرار دیا اور فرمایا "**خدمتك زوجتك صدقة**" اپنی بیوی کی خدمت ایک صدقہ ہے۔ آپ ﷺ خود اپنے اہل خانہ

کے معاملہ میں نہایت ہوشیار اور عقل مند آدمی تھے آپ کو قطعاً یہ بات پسند نہ تھی کہ خواتین کے چہرہ پر بغیر مسکراہٹ کے نظر ڈالیں اور صبح وشام خواتین کے پاس جانا اور ملاقات کرنا آپ کا معمول تھا اور جب بھی آپ ان سے علیحدگی میں ملتے تو ہنستے مسکراتے ہوئے باتیں کرتے، جیسا کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ نرم دل اور ہمیشہ ہنستے مسکراتے رہنے والے شخص تھے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ اس کے بعد جو دور آئے ان میں عورتوں کے ساتھ اس سے زیادہ صحیح انصاف کی مثال پیش نہیں کی جا سکتی اور یہ اہم بات نہیں کہ مرد عورت کو ہر معاملہ میں مساوی حیثیت دی جائے اور ہر طرح سے مردوں کے برابر حقوق اور واجبات عورتوں کو حاصل ہوں ۔کیوں کہ دونوں میں اختلاف کے باوجود مماثلت دینا نہ تو انصاف سے قریب ہے نہ کسی طرح درست ہے لیکن اہم بات یہ ہے کہ عورت کے حقوق اس کے مساوی ہوں اور عورت کے لئے وہی سب کچھ ہو، یعنی وہی سہولیات حاصل ہوں جیسی کے اسی پر ذمہ داریاں عاید ہیں، اور اس سلسلہ میں عورت پر زندگی کے عام یا خاص حالات میں قطعاً کوئی ظلم نہ کیا جائے اور عورت سے کوئی ایسا کام چھوٹنے نہ پائے جس کے لئے وہ مناسب وبہتر طریقہ پر انجام دے سکتی ہو۔ اور اس معاملہ میں بنیادی بات وہی مذکورہ کلام اللہ کا ارشاد ہے کہ عورتوں کا بھی حق ہے جیسا کہ مردوں کا ان پر حق ہے۔ اور مردوں کو ان کے اوپر ایک درجہ فضیلت حاصل ہے، اور یہی درجۂ فضیلت جو صرف مردوں کو حاصل ہے حکومت اور خارجی کاموں میں عورت کے حصہ دار کے دعوی کو باطل قرار دیتا ہے۔ اور حقیقت میں مرد وعورت دونوں کے حقوق کے سلسلہ میں یہی انصاف کا درست پیمانہ ہے، کیونکہ یہ ایک مضبوط حکم اس واقع کے مطابق ہے جو نہ کبھی ماضی میں بدلا ہے، نہ آج بدل سکتا ہے، نہ آئندہ کبھی بدلے گا، چاہے کتنے ہی قوانین بدل جائیں، لوگوں کے اقوال اور آراء میں کتنی ہی تبدیلی آجائے۔

نیز مرد وعورت کا اختلاف ایک علمی حقیقت بھی ہے، ایک تاریخی حقیقت بھی ہے، ایک

حسی حقیقت بھی ہے۔ اور ایسی حقیقت ہے جو عقل اور بداہت دونوں سے سمجھی جا سکتی ہے۔ عورت مرد سے جسمانی غدود کے معینہ اعمال یا کارکردگی میں مختلف ہوتی ہے، اعضاء جسمانی کی بناوٹ میں مختلف ہوتی ہے، ذوق اور احساس میں مختلف ہوتی ہے، عورت مرد سے اپنے کاموں اور ذمہ داریوں میں مختلف ہوتی، اور یہ عملی فرق زمانہ قدیم سے ہر قوم وقبیلہ میں پایا جاتا ہے اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ فرق واختلاف محض مردوں کی کرتوت اور تسلط کی وجہ سے رہا ہے یہ فطری یا قدرتی نہیں ہے تو گویا اس نے خود ہی اعتراف کرلیا کہ یہ فرق طبعی حقیقی ہے محض مردوں کے دخل اندازی کا نتیجہ نہیں ہے۔

عورت کا مرد کے مقابلہ قدرت حاصل ہونے میں بھی فرق ہے مثلاً ایسے کام جو قدیم دور سے عورت ہی کے لئے مخصوص رہے ہیں جیسے کھانا پکانا سلائی کرنا، بناؤ سنگار کا کام کرنا، میت پر رونا آہ وبکا کرنا، جنازہ کے ساتھ جانا، اس کے اوصاف بیان کرنا، یہ سب کام اگر چہ زمانہ قدیم سے عورتوں کے لئے مخصوص رہے ہیں، لیکن جب انہی کاموں میں مردوں سے مقابلہ کی نوبت آجائے تو مرد عورت سے اعلی درجہ کا باورچی ہوتا ہے، نئے نئے ڈیزائن کے لباس تیار کرتا ہے، ولادت کے معاملات میں عورت سے بہترین ڈاکٹر ثابت ہوتا ہے، اور وہ تمام مرثیے جو عورتوں نے کہے ہیں مردوں کے اشعار میں موجود نئے مرثیے کے ایک قصیدہ کی بھی برابری نہیں کرسکتے۔

عورت مرد سے مختلف ہوتی ہے اور اس فطرتی اصول کے مطابق اس کا مختلف ہو نالازمی ہے، جس میں ہر جاندار شامل ہے حقیقت ہی فطری اصول عمل کی یکسانیت پر زور نہیں دیتا بلکہ عمل کی تقسیم اور اسکی متنوع شکل کا خواہاں رہتا ہے، فطرت نے مرد عورت کو دو جنسوں میں اس لئے نہیں رکھا ہے کہ ان کو حقوق اور واجبات میں مشترک ایک حیثیت دیدی جائے بلکہ ان دونوں کو اس لئے دو جنس میں رکھا ہے تا کہ حقوق اور واجبات میں فرق ہو۔ یہ وہ حقیقت ہے جو ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔

لہٰذا یہ قطعاً انصاف کی بات نہیں ہے کہ مرد و عورت تمام حقوق اور واجبات میں مساوی ہو جائیں جبکہ وہ کھلی آنکھوں اور ظاہراً مختلف ہیں جو بالکل علم و شعور کے سامنے ہے اس وقت سے جب سے انسان کا وجود ہوا، اور صحیح معنی میں انصاف تو وہ ہے جس میں فطرت کا حکم اور آداب انسانیت سب جمع ہو جائے کہ وہ برابر سرابر اتنے حقوق حاصل کرے جتنے واجبات ادا کرتے ہیں، اتنے ہی حقوق اسے دئے جائیں جتنی ذمہ داریوں کی وہ جواب دہ ہو۔

اب خلاصہ بحث یہ ہوا کہ عورت کے حقوق کا مسئلہ نہ تو کسی ایک فرد کا مسئلہ ہے نہ صرف ایک امت کا مسئلہ ہے، نہ کسی وقتی سوسائٹی کا مسئلہ ہے بلکہ یہ تو ہمیشہ سے پوری نوع انسانی کا مسئلہ رہا اور آئندہ بھی رہے گا اس لئے اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں کہ ایسے ضوابط بیان کیے جائیں جو تمام انسانوں کے مساوات اور مصالح کا ترجمان ہو۔

نئے زمانے کی عورت کے بارے میں خواہ کوئی بھی رائے ہو، مگر بغیر کسی شک شبہ کے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اسلام نے عورت کو جس اعلیٰ ترین منزل پر پہونچایا ہے اس کا قدیم عرب معاشرہ میں یا دوسری قوموں میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا بلکہ اپنے دین کی پاسداری کرنے والا مسلمان تو عورت کو وہ حقوق عطا کرتا ہے جو خود اس کے مطالبہ سے زیادہ ہوتے ہیں۔ کاش یہ اس زمانہ میں ہوتا جب عورتیں اپنے حقوق کا مطالبہ کیا کرتی تھیں۔

وقت آگیا ہے کہ مسلمان اسے محسوس کریں کہ اسلامی معاشرہ اس وقت تک سرسبز نہیں ہوسکتا جب تک عورت کو محکومی سے نجات نہیں ملتی اور وہ امتیاز ختم نہیں ہوتا جو بیچ میں حائل ہے اور معاشرے میں سے پوری طرح احکام قرآنی کے مطابق حصہ لینے کی اجازت نہیں دی جاتی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''عورتیں ریاست کا ستون ہیں، اگر وہ اچھی ہیں تو ریاست بھی اچھی ہے اگر وہ خراب ہیں تو ریاست بھی خراب ہوگی''۔

(مضمون نگار جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے ریسرچ اسکالر ہیں)

☆☆

مجموعه القاسم: جلد پنجم — مسلم مسائل اور اس کا حل

اسلام میں تعلیم اور عورت

● ڈاکٹر رخسانہ نکہت لاری

علم کے تین وسیع دائرے ہیں (١) خود شناسی (٢) خداشناسی اور (٣) کائنات۔

جب انسان اپنی اس حس کو استعمال کرتا ہے جو جانکاری بہم پہونچاتی ہے تو سب سے پہلے اس کی نظر خود پر ہی ہوتی ہے اور ہونی چاہئے کہ وہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے اور اسے کیا کرنا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اس کے پاس عقل بھی ہے اور ضمیر بھی۔ تب اس کی نظر اپنی بناوٹ کی پیچیدگی کے سبب اپنے بنانے والے کو تلاش کرتی ہے۔ مذہب کے ذریعہ سے انسان کو اپنی اس کھوج کا نشان ملتا ہے جو اسے باور کراتا ہے کہ کوئی عظیم ہستی ہے جس نے انسانی جسم کو ایسا منظّم بنایا ہے ''**اقرأ باسم ربک الذی خلق**'' تاکہ کسی مقصد کو وہ پورا کرے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے اس کا خالق اسے کچھ حقوق عطا کرتا ہے اور کچھ فرائض پورے کرنے کا حکم دیتا ہے۔

ان حقوق و فرائض کی ادائیگی کے لئے لکھی ہوئی کتاب وحی کے ذریعہ اور اس کتاب کے اوپر عمل کرنے والے کچھ منتخب کردہ انسانوں کے ذریعہ چند ہدایات عطا کرتا ہے۔ جس کے سبب انسان کے اندر انتخاب کرنے کا مادہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے لئے کیا فائدہ مند ہے اور کیا نقصان دہ ہے **أمر بالمعروف و نهى عن المنكر**. جس کے لئے اسے اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی کائنات کو سمجھنا ہوتا ہے تاکہ اس کا استعمال کرسکے۔ اور کائنات کی تمام اشیاء کی جانکاری اسے علم کی طرف لے جاتی ہے۔ اور یہی وسیع علم مختلف شاخوں میں

تقسیم ہوجاتا ہے۔

اس علم کوتعلیم کے ذریعہ سے حاصل کیا جاتا ہے"**الرحمن علم القرآن خلق الانسان علمه البیان**"۔ تعلیم کی دوشکلیں ہیں۔ایک عام جانکاری جس سے سبھی انسانوں کوکم وبیش واقف ہونا چاہئے۔اوردوسرا خصوصی طور پر مرتب کیا ہوا علم۔جوانسان اپنی صلاحیت،حالات اوروسائل کومدِ نظر رکھ کرحاصل کرتا ہے۔

انسان کی جنس میں مرداورعورت دونوں شامل ہیں۔اس لئے دونوں کوعلم اورتعلیم کی ضرورت ہے۔اسلام میں عورت کی تعلیم کے لئے خصوصی ہدایات ہیں۔جوہمیں اللہ کی کتاب قرآن اورمحمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور پھراسلامی ادب میں وضاحت کے ساتھ ملتی ہیں۔قرآن میں اللہ کا فرمان ہے۔"اے ایمان والو!جب تم آپس میں آئندہ ایک مقررہ وقت کے لئے کوئی معاملہ کروتو اسے لکھ لیا کرو"۔(سورہ بقرہ ۲/۲۸۲) قرآن میں ہی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے"ایمان والے اورایمان والیاں ایک دوسرے کے ساتھی اورمددگار ہیں۔نیک باتوں کا آپس میں حکم دیتے ہیں اوربری باتوں سے روکتے ہیں"۔(سورہ توبہ)

اسی طرح متعدد آیات ہیں اورمردوعورت دونوں کوحصولِ علم کی دعوت دیتی ہیں۔نیکیوں کوپھیلانے اوربرائیوں کا قلع قمع کرنے کے لئے دونوں کی جانکاری اوران کے نتائج سے واقف ہونا بہت ضروری ہے۔اللہ کی صفات میں علم کی صفت ہے اوراللہ نے اپنی صفات کی کچھ رمق انسانوں کے اندر روح پھونک کر ڈال دی ہے۔اس لئے انسان کا پیدائشی حق ہے کہ وہ علم حاصل کرے اوراشرف المخلوقات ہونے کا حق ادا کرے۔

یہی وجہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علم کا طلب کرنا مسلم مردو عورت دونوں پر لازم ہے اورگود سے گورتک علم حاصل کروکہ اس کی کوئی حد نہیں۔بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کوتعلیم دینے کے لئے ہفتے میں دویا تین روزخصوصی طور پر مختص کئے تھے۔علم حدیث میں سب سے پہلے حضرت عائشہؓ کا نام لیا جاتا ہے کہ ان سے ہی زیادہ تر

رسولؐ کی احادیث مروی ہیں۔دوسرے صحابہ بھی آپ سے کسبِ علم کرتے تھے۔

تاریخ گواہ ہے کہ مسلم خواتین نے مردوں کے شانہ بشانہ علم وتعلیم کے مختلف میدانوں میں بہت سرکردہ رول ادا کیا ہے۔محمد رسولﷺ نے عورت کی تعلیم وتربیت پر خاص طور سے زور دیا کیونکہ یہ نسلوں کی معمار ہے۔بچے کا پہلا مدرسہ ماں کی گود ہے۔جیسا کہ ارسطو نے کہا ہے کہ بچے کی تربیت اس کی پیدائش سے بیس سال قبل شروع ہوجاتی ہے۔یعنی عام طور پر لڑکی بیس سال کی عمر میں ماں بنتی ہے تو بیس سال قبل جب اس کی تربیت شروع ہوئی تھی تو وہی تربیت کا بیج جواس کے اندر بویا گیا تھا وہ اپنے بچے کوعطا کرتی ہے۔نپولین نے بھی کہا تھا کہ مجھے سواچھی مائیں دومیں تمہیں ایک اچھا ملک وقوم دوں گا۔۔

حضورﷺ کی بہت سی صحابیات مختلف علوم کی ماہر تھیں۔حضرت زینبؓ چمڑے کے متعلق اچھا علم رکھتی تھیں اوراس کا کاروبار کرتی تھیں۔حضرت خنساءؓ عربی ادب کی بلند پایہ شاعرہ تھیں(The Literary History of Islam: Nicholson)۔سکینہ بنت حسینؓ بلند پایہ علم حاصل کرکے دوسروں کوعلمی مشورے دیتی تھیں(A segment of women rights in Islam : Kawthea M. Al-Minavi, Translated by Saifuddin H. Shaheen, Page-51)۔

قاضی اطہر مبارکپوریؒ نے اپنی کتاب"خواتینِ اسلام کی دینی وعلمی خدمات"اور پھر تاریخ جرجان،تاریخ بغداد،ابن خلکان،احمد خلیل ابن سعد،ابن خلدون اورمتعدد مؤرخین اورسیرت نگاروں نے بے شمار مسلم خواتین کا ذکر کیا ہے۔جنھوں نے علم کے مختلف شعبوں میں بلند پایہ مقام حاصل کیا اورحصول علم کے لئے دوردور سفر کیا اورتصانیف لکھیں(عورت اسلام اورجدید سائنس:حکیم محمد طارق محمود چغتائی)۔

فاطمہ بنت شیخ علاء الدین سمرقندیؒ حنفی فقہ کی زبردست ماہر تھیں،اوراپنے شوہر کی فقہی معاملات میں رہنمائی کرتی تھیں۔فتووں پران کے والداورشوہر کے ساتھ ان کے بھی دستخط

ہوتے تھے۔ تیسری صدی سے لے کر نویں صدی ہجری تک اور اس کے بعد بھی لاتعداد استاد خواتین ہوئی ہیں۔ جن سے مردوں نے تعلیم حاصل کی۔ مشہور امام ظہری کی استاد ایک خاتون تھیں۔ عبدالقادر جیلانیؒ کو جس طرح دنیا میں یاد کیا جاتا ہے اسی طرح رابعہ بصریؒ بھی یاد کی جاتی ہیں۔ (اسلام میں عورت کا درجہ اور اس کے حقوق، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ)۔

خدا نے مرد و عورت دونوں کو مختلف صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ زندگی میں ضرورت کے لحاظ سے خواتین نے اپنے اندر مختلف اوصاف پیدا کئے۔ مثلاً مراقش اور سہارا کے ریگستان میں سب سے تیز رفتار گھڑسوار خواتین ہی ہیں جو مغاربہ کے نام سے منسوب ہیں۔ نویں صدی میں عراق کی صوفی اور شاعرہ رابعہ الادویہ اور مصر میں بیسویں صدی کی جمیلہ بوپاشا۔ لیلیٰ خالد اور زینب الغزالی شہرت کے بامِ عروج کو پہنچیں (Women in religion, Edited by Jean Holon Sajohn Bowker: Chapter Islam, Written by: Laila Badawi, Page 84)۔

اس طرح دنیا کے مختلف ممالک اور خطوں میں لاتعداد مسلم خواتین نے مختلف میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دئے۔ ایک ہندوستانی ہونے کے ناطے میں ہندوستان کی بھی چند نامور مسلم خواتین کے نام درج کرنا چاہوں گی مثلاً رضیہ سلطانہ، چاند بی بی۔ ملکہ نور جہاں، شہزادی زیب النساء، بیگم حضرت محل، بیگم زینت محل، نشاط النساء، بیگم حسرت موہانی، سلطان جہاں بیگم، آمنہ بانو بیگم بی اماں، خواجہ بیگم، ریحانہ بین۔ (ہندوستان کی نامور خواتین، نصرت ناہید)۔

پروفیسر عابدہ سمیع الدین نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں سو سے زائد مسلم خواتین کے کارناموں پر بہت وقیع کتاب تصنیف کی ہے۔

لیکن گذشتہ صدیوں میں مسلم خواتین کی اس تعلیمی ترقی کے باوجود پچھلے دو سو سالوں میں ان کی تعلیم میں بتدریج انحطاط واقع ہوا ہے۔ جو تعداد اور صفات دونوں سطور پر نظر آتا

ہے۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ مثلاً وہ مسلم علماء جنھوں نے پردے کا مفہوم عورتوں کو قلعے میں بند رکھنے سے لیا۔ جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور اس کے بعد کافی صدیوں تک پردے کے صحیح مفہوم کے ساتھ عورتوں کو تعلیم سے آراستہ کرنے کا چلن عام تھا۔ کیونکہ اسلامی قوانین خواتین کی تعلیم پر قطعاً روک نہیں لگاتے۔ (۱)

مگر اسلامی دنیا میں عثمانی اور ترکی دور خلافت اور فرانسیسی انقلاب کے بعد جب آزادیٔ نسواں کے نعرے لگے تو علماء نے مسلم خواتین کی آزادی کو قوم و ملت کے لئے اخلاقی گراوٹ کا خطرہ محسوس کیا۔ اور انہیں پردے کی بیجا پابندیوں میں رکھ کر تعلیم سے بھی بے بہرہ رکھا۔ دنیا پر جب اسلامی حکومت کا دور ختم ہوا اور اسلام تنقید کے تیروں کی بوچھاروں سے لہولہان ہو گیا۔ نتیجتاً سیاسی استحصال کا بہت زیادہ اثر مسلمانوں کی معاشرت اور تعلیم پر ہوا۔ سیاسی مخالفین نے خاص طور پر مسلم خواتین کی تعلیم اور ان کے حقوق کی کمیوں کو دنیا کے بدلتے ہوئے منظر نامے میں میڈیا کے ذریعہ غلط رنگ میں اچھالا۔ جس کے سبب اسلام کی اور مسلم خواتین کی بہت غلط تصویر دنیا کے سامنے آرہی ہے۔ (۲) ورنہ اگر ہم تعلیم کی شرح کے اندراج پر نظر ڈالیں تو ہم اس نتیجے پر پہونچیں گے کہ بہت سے علاقوں میں اگر تعلیم کی شرح خواتین میں کم ہے تو صرف مسلم خواتین میں ہی نہیں بلکہ دوسری قوموں میں بھی کم بیش وہی شرح پائی جاتی ہے۔ ان کی عام وجوہات ہیں مثلاً یا تو تعلیمی ادارے ناکافی ہیں یا دور ہیں یا خواتین کے باہر نکلنے اور دور جانے میں تحفظ کا یا سواریوں کا کوئی انتظام نہیں۔ یا وہ علاقے جہالت اور معاشی بدحالی کا شکار ہیں، جہاں لڑکیوں سے گھریلو کام اور معاش پیدا کرنے کے لئے کام کرانے کا رواج ہے یا اسی طرح کے دوسرے اسباب۔ (۳)

ایک خاص بات کی طرف میں توجہ مبذول کرانا چاہوں گی کہ آج تعلیم کے میدان میں خواتین نے جو مدارج طے کئے ہیں وہ حیرت انگیز ہیں، مگر اس کے باوجود عورت ظلم کا شکار ہے Honored Kitting کے واقعات میں اور اس کے جنسی اور ذہنی استحصال

میں بے انتہا اضافہ ہوا ہے اور کہیں کہیں تو آج اس کی مظلومیت جہالت کے دور سے بھی زیادہ بڑھ گئی ہے۔ جس کا اثر صرف عورتوں کے انحطاط پر ہی نہیں پڑ رہا ہے بلکہ بچوں اور آنے والی نسلوں پر بھی پڑ رہا ہے۔

ان مسائل کو سلجھانے کے لئے میرے ذہن میں کچھ مشورے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ متوازن تعلیمی نظام کی تشکیل ہو اور بغیر کسی جانب دارانہ رویہ کے اس کے حصول میں جو رکاوٹیں ہیں انہیں ختم کیا جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسلام نے تعلیم کا وہ مخصوص معاملہ جو عورت کے دائرہ کار کی تکمیل کے لئے مخصوص کیا ہے اس کو غور وفکر کے ساتھ عملی جامہ پہنایا جائے اور تمام سہولیات مہیا کی جائیں۔ اس لئے کھلے ذہن کے مخلص مسلم علماء، مسلم تنظیموں اور تعلیمی اداروں کے ساتھ سرکاری نمائندوں کا فعال ہونا اور آپس میں مثبت تال میل ہونا ضروری ہے۔

ایک اور اہم اور توجہ طلب بات یہ ہے کہ خواتین کی ضروریات کے مطابق پروفیشنل تعلیم کے اعلیٰ تعلیمی ادارے مہیا کرائے جائیں تا کہ خواتین پر ہونے والی زیادتیوں کا کم سے کم امکان پیدا ہو۔ خواتین کے تحفظ کے صحیح انتظامات کے لئے مرد و عورت دونوں کے ذہنی وفکری ڈھانچے کا اسلامی طرز پر احیاء کرنا ضروری ہے، جو قرآن اور سیرت رسول ؐ کی رہنمائی سے مل سکے گا۔

1. A) Eligabeth white, "legal reform as an indicator of women's status in Muslim Nations (Beck & Keddie-Womens)

B) Islam & Democracy Fear of the Modern World: Fatima Mermissc, author of "Beyond the Veil", translated by Mary Jo Lake land,

C) Social science research & women's in the Arab

World (UNESCO) Paris, Chapter 7: Towards a theoretical frame work for Women's Studies, ...

2. In a Minority: Essays on Muslim Women in India. By Zoya Hasan & Ritu Memon- Chapter 10: Images and representations of Muslim Women in the Media 1990-2001, by Sabiha kidwai

3. A) Socio & Economic profile of India, by Peeyush Bajpai, haveesh Bhandari, Pali Sinha, Pub. 2005

B) India, Social Development Report, Council for Social Development, Pub, 2006,

C) Education- A Saga of spectucular Achievements & Conspicuous Failures : Jandhyala B. G. Tilak

D) Census of India (Various Years) Govt. of India.

E) Education (Kothari) commission (1966), F PGC 1933 Report.

☆☆

مسلم معاشرے میں بے پردگی کا بڑھتا رجحان

● ندیم اشرف

اسلام نے اپنی تعلیمات میں شرم وحیا کو ایمان کا ایک حصہ قرار دیا ہے۔ بے حیائی اور بے شرمی انسانی طبیعت اور مزاج سے میل نہیں کھاتی۔ ایک شریف اور مہذب معاشرے میں وہ لوگ اچھی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں، جن کے اندر شرم وحیا پائی جاتی ہے۔ حیا سوز گفتگو اور بے حیائی پر مبنی کوئی حرکت کھلے عام پسند نہیں کی جاتی۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی جسم کو بڑے خوبصورت سانچے میں ڈھالا ہے۔ عمر کے ایک خاص مرحلے میں وہ اپنے بدن کے بعض حصوں کے بارے میں بڑا حساس ہو جاتا ہے اور نہیں چاہتا کہ اس کے ان حصوں پر کسی کی نگاہ پڑے۔ انسان کی اس فطری خواہش کی تکمیل اللہ نے لباس کے ذریعہ کی ہے اور اس لباس کا خاص مقصد ستر پوشی بتایا ہے۔ چناں چہ فرماتا ہے:

يٰبَنِىۡۤ اٰدَمَ قَدۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكُمۡ لِبَاسًا يُّوَارِىۡ سَوۡاٰتِكُمۡ وَرِيۡشًا وَلِبَاسُ التَّقۡوٰى ذٰلِكَ خَيۡرٌ ذٰلِكَ مِنۡ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمۡ يَذَّكَّرُوۡنَ (الاعراف:۲۶)

”اے اولادِ آدم! ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے کہ تمہارے جسم کے قابل شرم حصوں کو ڈھانکے اور تمہارے لیے جسم کی حفاظت اور زینت کا ذریعہ بھی ہو اور بہترین لباس تقویٰ کا لباس ہے۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، شاید کہ لوگ اس سے نصیحت حاصل کریں۔“

اس آیت میں لباس کا اوّلین مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس سے جسم کے قابل شرم

حصوں کو ڈھانکا جاتا ہے۔ جس لباس سے یہ مقصد حاصل نہ ہو، اسے اسلامی لباس ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ نبی اکرم ﷺ کی احادیث اور علمائے امت کی وضاحت کے مطابق مردوں کا ستر ناف سے گھٹنے تک ہے اور عورتوں کا پورا بدن، ہتھیلی اور ٹخنے سے نیچے پیروں کے علاوہ ستر ہے۔ ستر سے مراد جسم کے قابل شرم حصے ہیں۔ ان حصوں کو مرد و عورت ہر ایک لیے چھپانا فرض ہے۔

آیت مذکورہ میں لباس کا دوسرا مقصد بڑے خوبصورت اور جامع انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ لباس کو ”ریش“ کہا گیا ہے، جو پرندہ کے پر کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ جس طرح پرندوں کے پر ان کے جسم کو موسمی اثرات سے محفوظ رکھتے اور ان کے حسن کو دوبالا کرتے ہیں، اسی طرح لباس بھی ہونا چاہیے، جو ہمیں موسمی اثرات سے محفوظ رکھے اور ہمارے لیے باعث زینت ہو۔

اسی آیت میں ایک تیسری بات یہ کہی گئی ہے کہ تقویٰ کا لباس سب سے زیادہ بہتر ہے۔ یعنی وہ لباس شریفوں اور دین داروں کا لباس ہو۔ اسے پہن کر انسان کے اندر کبر و غرور نہ پیدا ہو اور اس میں ان تعلیمات کی رعایت کی گئی ہو جو نبی اکرم ﷺ نے لباس کے تعلق سے بیان فرمائی ہیں۔

مسلم عورت کے لباس سے متعلق قرآن کے خصوصی احکام:

قرآن مجید میں ایک مسلم عورت کے لباس کے لیے کچھ خصوصی احکام بھی ہیں، جن کی پابندی کرنا اس کے لیے فرض ہے۔ ان احکام کی نوعیت مستحب کی نہیں ہے کہ ان پر عمل کر لیں تو بہتر اور افضل ہے اور نہ کریں تو کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ جس طرح ایک مسلمان عورت اسلام کے دوسرے فرائض کی ادائیگی اپنے لیے ضروری سمجھتی ہے، اسی طرح لباس کے ان احکام کی پابندی بھی اس کے لیے ضروری ہے۔

(۱) اللہ نے سورۂ نور میں فرمایا:

وَقُل لِّلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَى جُيُوبِهِنَّ

''(اے نبی!) مومنہ عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں، بجز اسکے جو خود ظاہر ہو جائے اور اپنی گردن اور سینوں پر اپنی اوڑھنی ڈالے رہیں۔''

لباس پورے جسم کو چھپانے والا ہو:

عورت کے سلسلے میں اسلام نے یہ تصور پیش کیا ہے کہ وہ سراپا عورت (چھپانے کی چیز) ہے، اس لیے اس کے بدن پر جو بھی لباس ہو وہ اسے پورے طور پر چھپانے والا ہو۔ ہتھیلیوں اور ٹخنوں سے نیچے پیر کو اس سے مستثنیٰ کیا گیا ہے اور یہ استثناء بھی ضرورت کی وجہ سے کیا گیا ہے۔ ہاتھوں کی مہندی یا ایڑیوں کی خوبصورتی کا اظہار مقصود ہو تو یہ حد درجہ معیوب ہے۔ برقع اگر ڈھیلا اور لمبا ہو تو اس سے بھی بچا جا سکتا ہے۔ بلکہ ایک دین دار خاتون کو ایسی تمام چیزوں سے پرہیز کرنا چاہئے، جس سے فتنہ پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ ایسا لباس جسے پہن کر پیٹ، پشت اور گردن کے حصے کھلے رہیں، شرعی لباس نہیں ہو سکتا ہے۔ نامحرم مردوں کے سامنے چہرے یا بدن کے کسی حصہ کی نمائش قطعی طور پر حرام ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''جب ہم ازواج مطہرات نبی اکرم ﷺ کی معیت میں احرام باندھ کر حج کے لیے جا رہی تھیں، اس وقت جب کوئی قافلہ ہمارے پاس سے گزرتا تھا تو ہم میں سے ہر ایک اپنے سر سے چہرے پر نقاب لٹکا لیتی تھی اور جب قافلہ گزر جاتا تھا تو چہرہ کھول لیتی تھی۔'' (مسند احمد ۶/۲۰)

برقع یا اوپر اوڑھنے والی چادر بذات خود زینت نہ ہو:

زیب و زینت سے بھرپور لباس عام لوگوں کی توجہ کا مرکز بنتا ہے اور شیطان کو وسوسہ اندازی کا موقع یہیں سے مل جاتا ہے۔ جب قرآن زینت کی چیزوں کو چھپانے کا حکم دیتا ہے تو وہ کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ جس زینت کو چھپانے کے لیے ایک مسلمان خاتون نے برقع پہنا ہے یا چادر اوڑھی ہے، وہ بذات خود مزین ہو۔ آرائش و زیبائش کے ساتھ نکلنے کو قرآن و سنت میں جاہلیت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

حضرت امیمہ بنت رقیقہ رضی اللہ عنہا نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں بیعت کرنے کے لیے حاضر ہوئیں۔ آپ نے فرمایا: میں تم سے بیعت تو کروں گا، لیکن شرط یہ ہے کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کروگی، چوری اور زنا کے قریب نہیں جاؤ گی، اپنی اولاد کو قتل نہیں کروگی اور نہ کسی دوسرے پر بہتان لگاؤ گی۔ میت پر نوحہ اور ماتم نہیں کروگی اور نہ قدیم جاہلیت کے انداز میں زیب و زینت کر کے گھر سے باہر نکلو گی۔'' (مسند احمد ۲/۱۹۶)

بعض مسلمان گھرانوں میں برقع پہننے کی روایت تو پائی جاتی ہے اور ان گھروں کی عورتیں چادر اور برقع کے بغیر باہر نہیں نکلتیں، لیکن شیروانی کے انداز میں بنے ہوئے منقش برقعے اور گوٹے کناریوں سے مزین چادریں بکثرت دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس قسم کے برقعے اور چادریں پردہ کی روح کے خلاف ہیں، ان سے پرہیز کرنا چاہیے۔

لباس کا کپڑا موٹا ہو تاکہ جسم کی کھال نظر نہ آئے:

جسم پر اگر اتنے باریک کپڑے ہوں کہ کھال جھلکے تو اس سے ستر پوشی نہیں ہوتی، بلکہ اس قسم کا کپڑا ہر زینت کو نمایاں کرتا اور عورت کو مزید فتنہ بنا دیتا ہے۔ آج کے دور میں اس کا چلن عام ہو گیا ہے۔ ایک مسلمان عورت کو اس قسم کے کپڑوں سے پورے طور پر پرہیز کرنا چاہئے۔ نبی اکرم ﷺ نے پیشین گوئی فرمائی تھی:

"میری امت کے آخری دور میں کچھ ایسی عورتیں ہوں گی جو کپڑے پہن کر بھی ننگی ہی رہیں گی۔ ان کے سروں پر بختی اونٹ کی کوہان جیسے جوڑے ہوں گے۔ ان پر لعنت بھیجتے رہو، کیونکہ ایسی عورتیں ملعون ہیں۔" (المعجم الصغیر ، ص ۲۳۲).

ایک دوسری روایت میں اتنا مزید اضافہ ہے:

"وہ جنت میں ہرگز نہیں داخل کی جائیں گی، بلکہ اس کی خوشبو بھی انھیں میسر نہ ہوگی، جبکہ جنت کی خوشبو ایک طویل مسافت کے فاصلے سے بھی محسوس کی جا رہی ہوگی۔" (مسلم)

امّ علقمہ بیان کرتی ہیں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ایک بار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بھتیجی حفصہ بنت عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ ان کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ حفصہ کے سر پر ایک ایسا دوپٹہ تھا جس سے ان کی پیشانی کی کھال جھلک رہی تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے وہ دوپٹہ پھاڑ دیا اور فرمایا: کیا تمہیں معلوم نہیں کہ سورۂ نور میں اللہ نے کیا حکم دیا ہے؟ پھر ایک دوسرا دوپٹہ منگا کر ان کو اوڑھنے کے لیے دیا۔" (ابن سعد ۸/ ۴۶)

مردوں کے لباس سے مشابہت نہ رکھے:

مرد اور عورت دونوں کی صنف الگ الگ ہے۔ دونوں کے مزاج اور طبیعت میں بھی نمایاں فرق ہے۔ اسلام نے پردہ کے تعلق سے دونوں کے لیے الگ الگ احکام دیے ہیں، لہٰذا دونوں کے لباس میں بھی فرق ہونا چاہیے۔ مردوں جیسا لباس پہن کر ایک عورت نہ مرد بن سکتی ہے اور نہ اپنے نسوانی مزاج میں کوئی تبدیلی پیدا کر سکتی ہے۔ جو لباس مردوں کے لیے خاص ہیں، ان سے ایک مسلمان عورت کو دور رہنا چاہیے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

"نبی اکرم ﷺ نے اس مرد پر لعنت فرمائی ہے جو عورتوں جیسا کپڑا پہنتا ہے اور اس عورت پر بھی لعنت فرمائی ہے جو مردوں جیسا لباس زیب تن کرتی ہے۔" (ابوداؤد ۲/ ۱۸۲)

ایک دوسری حدیث میں نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں: "ان عورتوں کا تعلق ہماری امت

سے نہیں ہے جو مردوں کی مشابہت اختیار کرتی ہیں۔ اسی طرح وہ مرد بھی ہم میں سے نہیں ہیں جو عورتوں کی مشابہت اختیار کرتے ہیں۔" (مسند احمد ۲/ ۱۹۹)

نام و نمود اور فخر و تکبر کا لباس نہ ہو:

تواضع، خاکساری اور اخلاص اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ہیں۔ فخر و غرور، کبر اور نخوت کو اسلام بدترین برائیوں میں شمار کرتا ہے۔ نام و نمود اور دکھاوا اسلام کو قطعاً پسند نہیں ہے۔ ایک مسلمان عورت اچھے سے اچھا کپڑا اپنے سرپرست اور اپنی حیثیت کے مطابق پہن سکتی ہے۔ لیکن یہ جذبہ کسی لمحے سرد نہیں پڑنا چاہیے کہ وہ اللہ کی بندی ہے۔ اس نعمت پر وہ اللہ کا شکر ادا کرے اور دوسری بہنوں کو کم تر اور حقیر نہ سمجھے۔ بعض مسلم گھرانوں کی تقریبات میں جو منظر سامنے آتا ہے وہ ہم سب کے لیے ایک بڑی آزمائش اور فتنہ ہے۔ نام و نمود کا تعلق دل سے ہے، لیکن ظاہری طرزِ عمل اگر اسلامی تعلیمات کے برعکس ہو تو اسے کس نام سے یاد کیا جائے گا؟ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

"جو دنیا میں شہرت اور نام و نمود کا لباس پہنے گا، اسے اللہ تعالیٰ قیامت میں ذلت اور رسوائی کا لباس پہنائے گا اور اسے آگ سے بھر دے گا۔" (ابوداؤد ۲/ ۱۷۲)۔

کتاب و سنت کی روشنی میں ایک مسلمان عورت کے لیے جو شرعی لباس متعین ہوتا ہے، اس کی یہ چند خصوصیات ہیں۔ ہم اپنے گھر میں کوشش کریں کہ ہماری خواتین اپنے لباس میں ان خصوصیات کی رعایت کریں۔ آج مسلم معاشرہ میں جو بے پردگی پائی جاتی ہے۔ اس کی ذمہ دار صرف عورتیں نہیں ہیں، بلکہ سب سے بڑا قصور سرپرست مردوں کا ہے۔ اگر ان کی خاموش تائید حاصل نہ ہو تو ایسا لباس مسلمان گھر میں نہیں پہنا جا سکتا، جس سے کتاب و سنت کے احکام کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔

(مضمون نگار مسلم یونیورسٹی کے شعبہ دینیات میں استاد ہیں)

☆☆

کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ

● مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو اس طور پر بسایا ہے کہ اس میں انسان کی خواہش کے ایک سے ایک سامان ہیں، لذیذ سے لذیذ غذا ہے، عمدہ سے عمدہ پانی ہے، آنکھوں کو بھانے والے رنگ برنگ کے پھول ہیں، دل کو رجھانے والے آبشار اور جھیلیں ہیں، حسین سے حسین تر انسان ہے کہ اہل ہوس جس کے اسیر زلف ہو کر رہ جاتے ہیں اور کتنی ہی نعمتیں ہیں، جن سے انسان کی طرح طرح کی خواہشات متعلق ہیں؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں مفادات وخواہشات اور چاہتوں میں تصادم کی کیفیت رکھی ہے، چیز ایک ہے لیکن طلب گار کئی ہیں، خواہش کسی ایک ہی کی پوری کی جاسکتی ہے؛ لیکن کتنی ہی خواہشات ہیں جو اس ایک شئی سے متعلق ہیں۔

آخرت کا معاملہ اس سے مختلف ہوگا، آخرت کی دنیا میں خواہشات بھی ہوں گی اور ہر خواہش کی تکمیل بھی، اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اتنی وافر مقدار میں ہوں گی اور اتنی یکسانیت کے ساتھ دستیاب ہوں گی کہ کوئی تصادم اور ٹکراؤ نہ ہوگا اور سب سے اہم بات یہ ہوگی کہ گو جنت میں بھی درجات ومراتب کا فرق ہوگا؛ لیکن ہر شخص کو یوں محسوس ہوگا کہ وہی سب سے بہتر حالت میں ہے، یہ احساس اس کے قلب کو پُر سکون رکھے گا اور احساس محرومی کا کوئی سایہ بھی اس کے سر سے نہ گذرے گا، جنت میں رہنے والوں کے درمیان نہ کوئی تصادم اور ٹکراؤ ہوگا، نہ باہمی نفرت وعداوت اور اس لئے وہاں جرم کا کوئی محرک بھی نہ ہوگا۔

اس دنیا میں چوں کہ انسان تصادم اور مسابقت کے ماحول میں زندگی بسر کرتا ہے، یہی ٹکراؤ نفرت وعداوت اور مخالفت کو جنم دیتا ہے، پھر کچھ لوگ اپنی خواہشات کو پورا کرنے اور مفادات کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں اور کچھ لوگ محروم وناکام، جو محروم ہوتا ہے یا کیا جاتا ہے، اس کے دل میں انتقام اور تشدد کے جذبات موجزن ہوتے ہیں اور یہی جذبات جرم کی صورت اختیار کرتے ہیں، دنیا میں ہر طبقہ مفادات میں دوسرے طبقہ سے متصادم ہے، غریبوں کو مالداروں سے گلہ ہے، مزدوروں کو آجرین سے شکوہ ہے، رعایا حاکموں اور فرماں رواؤں سے شاکی ہے، یہ تقسیم دنیا میں ہمیشہ قائم رہے گی کہ اسی سے کائنات کی ہمہ رنگی قائم ہے، اس لئے آخرت سے پہلے ایسی دنیا کا تصور نہیں کیا جاسکتا، جو جرم اور جرم کے جذبات سے مکمل طور پر محفوظ و مامون ہو؛ البتہ جرم کو روکنے کی ممکنہ تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں اور کی جاتی ہیں۔

جرم کو روکنے کے تین محرکات ہیں، اول: طبعی شرافت، دوسرے: قانون کا خوف، تیسرے: آخرت میں جواب دہی کا یقین، اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں اصلاً سلامتی اور صالحیت رکھی ہے، اسی کو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے: ''**کل ولد یولد علی الفطرة**'' (**بخاری: ۱۲۹۶، کتاب الجنائز، باب ماقبل فی اولاد المشرکین**) انسان بہرحال اپنی سرشت کے اعتبار سے درندہ نہیں ہوتا، ظلم وجور اور گناہ پر اس کا ضمیر یقیناً اسے کوستا ہے، اسی لئے جرم پیشہ قاتل نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں، گناہوں کا احساس ان کا تعاقب کرتا رہتا ہے، ان کی راتیں بے خواب ہوجاتی ہیں اور بعض پر تو اتنا زیادہ نفسیاتی دباؤ ہوتا ہے کہ وہ خودکشی کرلیتے ہیں، بہت سے انسان وہ ہیں جن کو طبعی شرافت اور ضمیر کی آواز گناہ سے روکے رکھتی ہے، گو وہ اسلام اور کسی اور مذہب کے قائل نہ ہوں، وہ دہریہ کیوں نہ ہو پھر بھی اللہ تعالیٰ نے قلب میں گناہ پر ٹوکنے اور روکنے کی جو صلاحیت دی ہے، وہ اسے تھامے رہتا ہے۔

جرم کو روکنے کا دوسرا مؤثر ذریعہ ’’قانون‘‘ ہے، اس دنیا میں جب سے انسانوں کی بستی بسی ہے، وہ کسی نہ کسی قانون کا پابند رہا ہے، بہت سے لوگ جو بے ضمیری میں مبتلا ہیں اور خدا کے خوف سے بھی عاری ہیں، سوائے قانون کے کوئی چیز نہیں جو ان کے ہاتھ کو تھام سکے، اسلام نے بھی کچھ جرائم کے لئے سزائیں مقرر کی ہیں اور وہ یہ ہیں: زنا، چوری، زنا کی تہمت، شراب نوشی، راہزنی اور ارتداد، ان سے متعلق سزاؤں کو ’’حدود‘‘ کہتے ہیں، یہ جرائم اللہ کے حقوق سے متعلق مانے گئے ہیں، اس لئے عدالت یا خود صاحبِ معاملہ بھی مجرم کو معاف کرنے کا مجاز نہیں، اسلام کے نظام جرم وسزا میں دوسری اہم چیز ’’قصاص و دیت‘‘ ہے، یہ قتل اور جزوی جسمانی مضرت رسانی سے متعلق ہے، اس جرم کو بندوں کے حقوق سے متعلق قرار دیا گیا ہے؛ اس لئے صاحبِ معاملہ یا اس کے اولیاء جرم کو معاف کر سکتے ہیں اور مال کی کسی مخصوص مقدار پر صلح بھی کر سکتے ہیں، ان کے علاوہ جو جرائم ہیں ان کی بابت، عدالت اپنی صواب دید سے سزا کا فیصلہ کر سکتی ہے اور ملک کی پارلیامنٹ کے لئے بھی ایسے جرائم کے بارے میں قانون سازی کی گنجائش ہے، ان جرائم سے متعلق سزا کو فقہ کی اصطلاح میں ’’تعزیر‘‘ کہا جاتا ہے۔

گناہ سے باز رکھنے کا تیسرا سب سے اہم اور سب سے اثر انگیز محرک آخرت کی جواب دہی کا احساس ہے، قانون دن کے اجالے میں انسان کے ہاتھ تھام سکتا ہے؛ لیکن رات کے اندھیروں اور انسان کے خلوت کدوں تک نہیں پہنچ سکتا، آخرت کی جواب دہی کا احساس ہی ایسی طاقت ہے جو انسان کو اپنی تنہائیوں میں بھی جرم سے باز رکھتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی شخص کی طبیعت مجرمانہ ہو اور خدا کا خوف اس کے دل میں نہ ہو تو کوئی طاقت نہیں جو اس کو جرم سے روک سکے، وہ اپنی کوتاہ کاریوں کے لئے ہزار تدبیریں نکال لے گا اور نئے نئے راستے تلاش کر لے گا، اسی لئے قرآن مجید نے جہاں کسی بات سے منع کیا ہے وہاں خوفِ خداوندی اور آخرت کی جواب دہی کی طرف متوجہ فرمایا ہے۔

زنا اسلامی نقطۂ نظر سے ’’حدود‘‘ میں شامل ہے، غیر شادی شدہ مردوں کے لئے اس کی

سزا سو کوڑے ہے اور شادی شدہ کے لئے سنگسار (Stoneto Death) کرنا، ظاہر ہے کہ یہ نہایت سخت سزا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ زنا کے نقصانات بھی بہت شدید ہیں، زنا نہ صرف دامنِ اخلاق کو تار تار کرنے اور مذہبی قدروں کو پامال کرنے کے مترادف ہے؛ بلکہ یہ ایک پورے خاندان کی عزت وآبرو سے کھیلنا اور اس پر ننگ وعار کا ٹیکہ لگانا ہے، جب ایک مرد کسی عورت سے بدکاری کرتا ہے تو یہ فعل عورت کے پورے خاندان کے لئے سماجی اعتبار سے بے عزتی کا باعث سمجھا جاتا ہے اور اصحابِ شرافت کے یہاں خود اس مرد کے خاندان کے لئے بھی یہ چیز کچھ کم باعث حیاء نہیں ہوتی، زنا کا سب سے زیادہ نقصان پیدا ہونے والے بچہ کو پہنچتا ہے، وہ باپ سے محروم رہتا ہے، باپ سے محرومی نہ صرف اس کو اپنی شناخت اور میراث سے محروم کرتی ہے؛ بلکہ قانونی طور پر اس کے اخراجات کا کوئی کفیل بھی باقی نہیں رہتا، اگر کنواری لڑکی کے ساتھ دست درازی کی گئی ہو تو اس کے کنوارپن کا ضائع ہو جانا ایسا نقصان ہے، جس کی کسی طور تلافی ممکن نہیں اور اگر وہ شادی شدہ ہے تو یہ اس کے شوہر کے ساتھ بھی زیادتی ہے، کہ اس سے اس کی عزت وآبرو کو صدمہ پہنچنے کے علاوہ قریبی زمانہ میں پیدا ہونے والے بچہ کا نسب بھی مشکوک ہو جاتا ہے، اسی لئے اسلام نے زنا کی سزا نہایت سخت مقرر کی ہے۔

اسلام نے یہ اور اس قسم کے جرائم میں جسمانی سزا مقرر کی ہے؛ کیوں کہ تجربہ ہے کہ جسمانی سزا مجرم پر جس درجہ اثر انداز ہوتی ہے محض قید سے وہ نتیجہ حاصل نہیں ہو پاتا؛ بلکہ اعداد وشمار کے تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جن مجرمین کو جیل بھیجا گیا اپنے ہم پیشہ مجرموں کے ساتھ یکجائی کی وجہ سے ان کے جرم کی صلاحیت میں اضافہ ہوا ہے، ۱۹۶۰ء میں مصر میں جرائم کے اعداد وشمار کے مطابق چوری کے ۷۴۱۹ کیس ہوئے، ان میں صرف ۲۵ کیس ایسے تھے جن میں مجرم کو پہلی بار یہ سزا مل رہی تھی، باقی تمام ملزمین وہ تھے جو ایک، دو، تین یا اس سے زیادہ دفعہ چوری کی سزا میں جیل جا چکے تھے اور ان میں غالب تعداد ان مجرمین کی تھی جو تین بار سے زیادہ جیل کے چکر لگا چکے تھے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس مجرم نے

جتنی سزا پائی اور جتنی بار جیل گیا، اپنے ہم پیشہ مجرمین کی صحبت سے اس کے جذبۂ جرم میں اضافہ ہی ہوتا گیا، اس کے برخلاف جسمانی سزائیں جرم کو روکنے میں زیادہ مؤثر ثابت ہوتی ہیں، سعودی عرب میں ۷۴ء تک چوری کے صرف بارہ ایسے واقعات ہوئے تھے، جن میں ہاتھ کاٹنے کی نوبت آئی، لیبیا میں بھی ایک زمانہ میں قانونِ شریعت کا نفاذ عمل میں آیا تھا، تو تین سال میں صرف چھ مجرمین کے ہاتھ کاٹنے کی نوبت آئی، اس لئے اس میں شبہ نہیں کہ جسمانی سزائیں، قتل وغیرہ کسی جرم کو روکنے میں جس درجہ مؤثر ہیں، محض قید کی سزا اس درجہ جرم کے سدباب میں مفید نہیں۔

زنا بالجبر کے سلسلے میں چند سال پہلے بھی بحث چھڑ گئی تھی کہ زانی کو سخت سے سخت سزا ملنی چاہئے، اس وقت کے وزیر داخلہ جناب لال کرشن اڈوانی نے مطالبہ کیا تھا کہ زنا پر سزائے موت دی جانی چاہئے، اب چند دنوں پہلے یہ حادثہ پیش آیا کہ چلتی ہوئی بس میں ایک میڈیکل طالبہ کی چھ لڑکوں نے مل کر اجتماعی آبروریزی کی، اس واقعہ نے پورے ملک میں ایک زلزلہ سا برپا کر دیا ہے اور خواتین تنظیموں اور سماجی قائدین سے لے کر سیاسی لیڈروں تک ہر طرف سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ اس جرم پر سزائے موت دی جانی چاہئے اور بعض لوگوں نے اخلاقی جرأت سے کام لیتے ہوئے واضح طور پر کہا کہ ایسے لوگوں کو شریعت کے قانون کے مطابق سنگسار کر دینا چاہئے، یہ اگرچہ ایک حقیقت پسندانہ مطالبہ ہے؛ لیکن افسوس کہ اس میں بھی پوری طرح سیاسی رنگ موجود ہے، جس لڑکی کی عصمت ریزی کی گئی وہ اونچی ذات کی تھی اور جن لڑکوں نے یہ ناشائستہ حرکت کی وہ نیچی ذات کے تھے، اس لئے اس کی خوب مذمت کی جا رہی ہے؛ لیکن اسی ملک میں بمبئی اور سورت کے فساد میں بے شمار مسلمان عورتوں کو بے آبرو کیا گیا اور ان کی بے آبروئی کے نقش کو محفوظ رکھنے کے لئے باضابطہ ویڈیو فلمیں بنائی گئیں، کشمیر میں نہ جانے کتنی عورتوں کی عصمت سے کھیلا گیا اور آج تک فوج کی طرف سے یہ شرمناک فعل جاری ہے، آسام اور منی پور وغیرہ کے قبائلی

علاقوں میں سرکاری حفاظتی دستوں کی طرف سے نہ جانے کتنی خواتین بے آبرو کی گئیں، دلت عورتوں کی آبرو سے کھیلنے اور ان کو مزید رسوا کرنے کے لئے پورے گاؤں میں بے لباس گشت کرانے کے کتنے ہی واقعات آئے دن اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں؛ لیکن نہ اس پر کسی کی آہ بلند ہوئی، نہ کسی نے رنج کے دو آنسو بہائے، نہ سیاسی لیڈروں کو جوش آیا اور نہ ذرائع ابلاغ کی غیرت جاگی؛ لیکن یہی ایک واقعہ غالبًا اونچی ذات سے ہونے کی وجہ سے اس قدر گرمایا اور بحث وگفتگو کا موضوع بنا؛ لیکن بہرحال اگر بعد از خرابی بسیار بھی سیاسی اور سماجی قائدین بیدار ہو جائیں اور ملک کی عوام ان لوگوں کا دکھ درد محسوس کرنے لگیں جو ایسی مصیبتوں سے گزر رہے ہیں تو اس شکوہ کے باوجود کہ:

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ

اسے ایک مثبت رویہ ہی سمجھا جائے گا!۔

لیکن میرے خیال میں یہ مسئلہ اتنا سرسری نہیں اور کئی نکات ہیں جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے، اول یہ کہ اسلام جب بھی کسی جرم پر سخت سزا متعین کرتا ہے تو اس جرم کو روکنے کے لئے مناسب ماحول بھی تیار کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ جرم کے محرکات اور عوامل کو کم سے کم کر دیا جائے، مثلاً: یہی زنا کی سزا ہے، تو اس کا دروازہ بند کرنے کے لئے شریعت نے پردہ کے احکام رکھے، محرم اور غیر محرم کے اختلاط کو منع کیا، دفاتر ہوں یا تعلیم گاہیں، یا سواریاں، ہر جگہ اسلامی نقطۂ نظر سے اختلاط کی ممانعت ہے، شراب کو حرام قرار دیا گیا؛ کیوں کہ نشہ شہوانی تقاضوں کو بے قابو کرنے والی چیز ہے، عورتوں کو برسرعام اپنی زیبائش وآرائش کے اظہار سے روکا گیا، دیدہ زیب، چست اور پُرکشش لباس پہن کر باہر نکلنے کی ممانعت فرمائی گئی؛ کیوں کہ یہ چیزیں انسانی ہوس کو راستہ دکھاتی ہیں، پھر اس ماحول میں زنا کی سخت ترین سزا رکھی گئی، دوسرے: جو جرم جتنا شدید ہے اس کے لئے قانونِ

شہادت کو بھی اسی قدر سخت بنایا گیا، زنا کے لئے چار عینی مرد گواہوں کی گواہی ضروری قرار دی گئی، بشرطیکہ مجرم کو خود اقرار نہ ہو۔

ہندوستان میں اولاً تو جرم کے محرکات کو کھلی چھوٹ دے دی گئی ہے، فحش فلموں کا بازار گرم ہے، عریاں ویڈیو کیسٹ ملتے ہیں، ٹی وی نے حیاء کی چادر اتار پھینکی ہے، فحش لٹریچر کا سیلاب ہے، بے شرمی پر مبنی عشقیہ گانے بچہ بچہ کی زبان پر ہیں، بے پردگی اور عریانیت نے پورے ماحول کو مسموم بنا دیا ہے، تعلیم گاہوں سے لے کر دفاتر تک مخلوط نظام کو اپنی ترقی کی علامت تصور کیا جاتا ہے، شراب عام ہے اور ایک طبقہ کو زنا کے لائسنس جاری کئے جاتے ہیں؛ بلکہ غیر شادی شدہ عورتوں سے باہمی رضامندی سے بدکاری کی جائے تو قانون کی نظر میں وہ زنا ہے ہی نہیں، پھر قانون شہادت اتنی بے احتیاطی پر مبنی ہے کہ محض ایک شخص کی گواہی پر بھی اہم سے اہم فیصلے کئے جاتے ہیں، ان حالات میں زنا کی سزا پھانسی کو قرار دینا میرا خیال ہے کہ کوئی قرین انصاف بات نہ ہوگی، اسی لئے فقہاء نے حدود شرعیہ کے جاری ہونے کے لئے ''دارالاسلام'' کی شرط لگائی ہے، زانی بے شک سخت ترین سزا کا مستحق ہے؛ لیکن تقاضہ انصاف یہ ہے کہ اس کو جرم سے بچنے کا ماحول دیا جائے، جو ماحول قدم قدم پر گناہ کی دعوت دیتا ہو، اس ماحول میں مجرم کو اس طرح کی سزا دیا جانا یقیناً محل نظر ہے، اس لئے حکومت کو چاہئے کہ پہلے ایسے قوانین بنائے جو جرم کے عوامل اور محرکات کو روک سکے اور ایسے پاکیزہ سماج کی تعمیر ہو سکے جس میں انسان گناہ کی طرف ہاتھ بڑھانے میں سو دفعہ سوچنے پر مجبور ہو، پھر زنا کی قرار واقعی سزا مقرر کرے!

(مضمون نگار ماہر اسلامیات، فقہ اکیڈمی انڈیا کے جنرل سکریٹری اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے سکریٹری ہیں)

☆☆

یہود ونصاریٰ کی اسلام دشمنی اور قصۂ ملالہ

● ابو محمد مفتی احمد نادر القاسمی

ایشیائی یعنی مسلم ملکوں میں مسلمانوں کے قتل وخون کا کھیل شروع ہوئے برطانوی استعمار سے آج تک تقریباً سوا سو سال کا عرصہ ہونے جا رہا ہے اور ابھی تک یا تو ظلم وتشدد کے ذریعہ انسانی خون سے پیاس بجھانے والے مغرب کے کرایہ کے قاتلوں کی پیاس نہیں بجھی ہے، یا پھر مظلوم ابھی اور بھی زندہ ہیں، نیل سے لیکر تا بہ خاک کاشغر یہی کھیل جاری ہے، بطور خاص عرب قوم کی تذلیل اور اسلام کی اہانت کا یہودیوں اور عیسائیوں نے وطیرہ بنا لیا ہے، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف طرح طرح کی نت نئی سازشیں رچنا ان کی زندگی کا ترجیحی حصہ قرار پا چکا ہے، سیاسی، معاشی اور سماجی ہر سطح پر امت مسلمہ جو آخری امت ہے، کی بیخ کنی کے درپے یہ دونوں طبقہ کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا ہے، ۱۹۹۲ء سے عراق، افغانستان اور پاکستان کو مکمل طور سے نیست ونابود کردینے کا مغرب کے توسط سے اسرائیل نے اپنا ہدف بنا رکھا ہے، اس کے لئے یہ درندہ صفت قوم طرح طرح کے بہانے تراشتی اور تلاش کرتی ہے، خود بم بلاسٹ کرتی ہے، عام انسانوں کو بھی موت کے گھاٹ اتارتی ہے، اور الزام بھی دوسروں پر تھوپ دیتی ہے، اور اپنا مقصد پورا کرتی ہے، اور مسلمان ہے کہ اپنے دشمنوں کی سازش سمجھنے کو تیار نہیں۔

اس وقت ملالہ کو بہانا بنا کر پاکستان پر مکمل کنٹرول کیلئے CIA پھر اسی طرح کی چال چلنے کی کوشش کر رہا ہے، جو اس نے عراق اور افغانستان میں مسلمانوں کے قتل وخون کیلئے

چلی تھی، لاکھوں اور کروڑوں لوگوں کے گھر مکان تباہ کردیئے، عورتیں بیوہ ہوئیں، بچے یتیم ہوئے، مگر اس کا ملال مغرب کو اس لئے نہیں ہے کہ وہ مسلمان تھے، ماضی کے ان واقعات کو اہل نظر سامنے رکھتے ہیں اور پھر ملالہ کے مسئلہ پر مغرب کی دلچسپی دیکھتے ہیں تو عجیب وغریب تضاد نظر آتا ہے، اور یہ سوال مختلف ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے کہ آخر پوری دنیا میں ملالہ یوسف زئی کے مسئلہ پر اتنا واویلا کیوں ہے؟ آخر اچانک اس پاکستانی بچی کے ساتھ عیسائی اور یہودی دنیا کے لوگوں میں اتنی ہمدردی کیوں اور کہاں سے پیدا ہوگئی؟ اور تو اور قائد اعظم جارج ڈبلیو بش جن کے ہاتھ ہزاروں مسلمانوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں، کی بیوی نے بھی اس کی ہمدردی میں بیان دے ڈالا، آخر مغرب کو اس معصوم بچی پر اپنی جان اور مال اس قدر نچھاور کردینے کا جذبہ کیوں پیدا ہوگیا؟ ایسا تو نہیں کہ اس بچی کو مغرب آئندہ کسی سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین جیسے نئے فتنے کیلئے تیار کررہا تھا، اور اچانک موساد، CIA اور مغرب کو مستقبل کے مشن میں جو اس بچی کے ذریعہ انجام پاناتھا نقصان پہونچ گیا، جس کی وجہ سے پوری مغربی لابی امریکہ اور سی آئی اے سمیت سب تلملا اٹھے، اور وہ بے چین ہوگئے، رہے پاکستان اور ہندوستان کے میڈیا پرسن اور سیاسی مبصرین تو ان کی تو پرانی عادت ہے، صرف صر میں صر ملانے کی، کیونکہ ان کی اپنی تو کوئی رائے ہوتی نہیں ہے، وہ تو مغرب کے وقت کے دھارے کے ساتھ چلتے ہیں، مغرب نے کہا جی ہاں، تو جی ہاں، اور جی نہیں تو پھر جی نہیں، اس مسئلہ پر تحریریں اخبارات میں اور نیٹ پر بھی میں نے پڑھی، تمام تحریروں کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوا کہ کسی رائٹر کی اپنی کوئی تجزیاتی رائے اس بارے میں نہیں ہے، بلکہ ایک بھیڑ کے ساتھ سب لوگ انقلاب زندہ آباد کا نعرہ لگانے والے محسوس ہوئے۔ الا ماشاء اللہ، اور اب تو ملالہ کے زخمی ہونے کے انعام اور بخشش میں نوبل انعام بھی ملنے والا ہے، اس کے بعد نہ تو ملالہ کے پاؤں زمین پر ہوں گے اور نہ ہی مغرب کے مداحوں کے، غور طلب امر یہ ہے کہ ایک طرف امریکہ کی مسلمانوں کے خون بہانے اور بچوں کے

یتیم کرنے میں اتنی فراخ دلی، اور دوسری طرف ملالہ کے ساتھ اتنی مہربانی؟ بات کچھ حلق سے نیچے نہیں اترتی۔

اس پوری کہانی اور ملالہ کے ساتھ برطانیہ، امریکہ اور دیگر مسلم مخالف تنظیموں اور افراد کا صرف ملالہ زندہ آباد کا نعرہ اور پھر نوبل انعام، آخر اس محض پندرہ سالہ لڑکی جسے ابھی تو اچھے اور برے کی تمیز بھی نہیں، اور نہ ہی اس میں اس کی زندگی کے لئے کیا مفید اور کیا نقصان دہ ہے، اسے بھی سمجھنے کا شعور پیدا نہیں ہوا ہے، آخر اسی بچی کے اوپر سب کچھ لٹا دینے کی وجہ کیا ہے؟ اس کے تار کہاں سے ملے ہوئے ہیں، کون اس کی سرپرستی کررہا ہے، کونسی لابی اسے آئندہ کیلئے کس مقصد کیلئے تیار کررہی ہے، اس سے کیا کام لیا جانا مفاد پرست عناصر کا مقصد ہے، اس کو مدنظر رکھنا بہت ضروری ہے، بالخصوص مسلمانوں کو اسے باریکی سے دیکھنا اور اس پر نظر رکھنا چاہئے۔

میں یہ بات محض اس وجہ سے کہہ رہا ہوں کہ اگر اس کا واقعی کسی سے کوئی رشتہ نہیں ہے، اور ہزاروں مسلم بچیوں کی طرح وہ بچی بھی اپنے اندر اپنی قوم کے تئیں نیک جذبہ رکھتی ہے، تو پھر اس کا یہ نیک جذبہ ہمارے لئے بصیرت کا سرمہ بنائے جانے کے لائق ہے، اور اس وقت اسے جو زخم پہونچا ہے، اس پر مرہم رکھنا ہمارا فرض ہے، پاکستان اور افغانستان اور تمام مسلمانوں کا فرض ہے، اس لئے کہ وہ مسلمان لڑکی ہے، وہ قوم کی بچی ہے، اور اس کے اچھے اور برے کے بارے میں سوچنے کا حق قوم کو ہے، مغرب کو نہیں ہے، ہم خود سوچ لیں گے کہ ہمیں اس بچی کی بھلائی کیلئے کیا کرنا ہے۔ مغرب کی نیت پر سوال اس لئے اٹھتا ہے کہ مغرب کو ملالہ کا ہی ملال کیوں ہے؟ کیا مسلمانوں میں ایسی اور کوئی بچی نہیں ہے جس کے لئے ملال کیا جائے؟ مغرب اور مغرب زدہ اہل ملال کے اس یکطرفہ ملال پر سوال اس لئے بھی پیدا ہوتا ہے کہ ملالہ کے ساتھ اور بھی دوسری بچی زخمی تھی، آخر اس کا لوگوں میں کیوں ملال نہیں ہے، آخر مصری خاتون مروہ شربینی (شهيدة الحجاب) جس کو صیہونیوں نے

جرمنی کی بھری عدالت میں گولی مار کر شہید کر دیا، (اللہ ان کے درجات کو بلند فرمائے)۔ آخر وہ بھی تو کسی کی ملالہ ہی تھی، آخر مغرب کو اس پر کیوں نہیں ملال آیا؟ پاکستان کی ہی ڈاکٹر عافیہ صدیقی آج تک امریکہ کی جیل میں اپنی قیمتی زندگی برف کی طرح پگھلا رہی ہے، اسکا ملال کیوں نہیں آ رہا ہے؟ گذشتہ ۱۸/۲۰ سالوں میں عراق، افغانستان، پاکستان اور فلسطین میں ہزاروں بچوں، عورتوں، مردوں اور ملت کی لاکھوں ملالاؤں کو اسرائیل، امریکہ اور اس کے اتحادی فوجوں نے تہہ تیغ کیا، آخر اس پر کیوں نہیں مغرب اور برطانیہ کے ان احتجاجیوں کو ملال آیا جو آج جھوٹے ملالہ کے غم میں گھلے جا رہے ہیں۔

ملالہ کے سلسلہ میں اس وقت جو کچھ بھی میڈیا میں خبریں آئیں، اس میں دنیا بھر کے اور بالخصوص افغانستان و پاکستان کے مسلمانوں کو بلیک میل کیا گیا۔ اور یہ صرف اس لئے کیا گیا تاکہ مسلم ملکوں کے مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کے دلوں میں بھی امریکہ اور مغرب کے تئیں نرمی پیدا ہو، اور یہ سمجھا جائے کہ امریکہ اور مغرب عورتوں کا بڑا خیر خواہ ہے، یہ پورا قصہ مغرب کے فریب کا اپی سوڈ تھا ــــ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس صنف نازک کا سب بڑا بدخواہ مغرب ہے ــــ بڑے بڑے گھناؤنے کرتوت مغرب نے مسلمانوں کے خلاف کئے ہیں، ڈنمارک کا کارٹونوں کا معاملہ ہو، یا امریکی فلم ساز کی طرف سے کیا جانے والا رسول اللہ کی شان میں اہانت آمیز فلم کا واقعہ ہو، فرانس میں مسلم خواتین کے ساتھ پے در پے زیادتیوں کا معاملہ ہو، ایران، عراق پہ پابندی اور پھر چڑھائی کا سانحہ ہو، مسلسل ۵۰ سالوں سے دہشت گرد صیہونی گروہ کا سرزمین اقصی پر قبضہ کر کے آزاد ریاست کے اعلان کا افسوس ناک اور پھر بے گناہ مسلمانوں کے قتل وخون کا تسلسل ہو، ان تمام چیزوں کو اگر آپ بنظر غائر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ پوری دو دہیاں مغرب کی مسلمانوں کے خلاف زیادتیوں اور مختلف طریقے سے مسلمانوں کی دل آزاریوں کی دہائیاں رہی ہیں، اور نہ جانے کب تک یہ سلسلہ جاری رہے گا، بہرحال ایسے میں کسی مغربی شخص کا کسی ایک لڑکی

کیلئے، یا کسی گروہ کا اس قدر سینہ کوبی کرنا، طرح طرح کے انعام و اکرام، اور امداد و بخشش کا اعلان کرنا، چہ معنی دارد؟

اس لئے راقم الحروف پورے وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ بھی کوئی اس خطہ کے مسلمانوں کے خلاف نئے گیم کا حصہ ہے جو آج سمجھ میں نہیں آ رہا ہے، آئندہ ضرور آ جائے گا، ہمارے ہندوستانی جرنلسٹوں، اور صحافیوں کو مغرب کی اس طرح کی بیہودہ سرگرمیوں اور امریکی اور خارجی مفادات میں کام کرنے والی ایجنسیوں کو اچھی طرح سمجھنا چاہئے، صیہونی لابی کی دن بدن ہماری صحافتی دنیا میں یہ مداخلت گہری ہی ہوتی جا رہی ہے، انگریزوں کے مشرقی ملکوں سے گئے ۶۰ سال کا عرصہ گذر چکا، مگر ابھی تک وہ ہماری بستیوں میں چھپے ہیں، ہماری عدالتوں میں بھی ہیں، ہمارے قانون کا بھی حصہ ہیں، ہماری سیاست کی باگ ڈور بھی انھیں کے ہاتھ میں ہے، اسرائیل جو ایک دہشت گرد گروہ ہے اور ناجائز طریقے پر ملک اور آزاد ریاست کا اعلان کر کے پوری دنیا سے سفارتی تعلقات استوار کر رہا ہے، اور مسلم ملکوں میں بھی اپنی جڑیں پیوست کرتا جا رہا ہے، وہ ممالک جو کل تک غریب ومظلوم نہتھے فلسطینی مسلمانوں کے دوست تھے، آج وہ یہودیوں کے دوست ہو چکے ہیں، ان سے سفارتی تعلقات ان کے قائم ہو چکے ہیں، اور بے چارے فلسطینی بے یار و مددگار ہوتے جا رہے ہیں، آج اتنے مسلم ممالک ہونے کے باوجود بے چارے فلسطینی مسلمانوں کا حال مدینہ ہجرت سے پہلے کے مسلمانوں جیسا ہوگیا ہے، غزہ کے مسلمانوں کو انسان دشمن نے دنیا نے بھوکے پیاسے حصار میں بند کر دیا ہے، مسجد اقصی قبلہ اول ہر وقت خطرے میں ہے، اور یہودی ناجائز طریقے پر جرمنی، امریکہ اور دوسرے ملکوں سے آ کر بستے چلے جا رہے ہیں اور ہم صرف تماشہ دیکھ رہے ہیں، دنیا کی اس قدر ان سے بے اعتنائی اور ان کو مرتے اور قتل ہوتے ہوئے دیکھنا انسانیت کے خلاف مجرمانہ حرکت اور اس معاملہ میں صیہونیوں کے خلاف اقدام نہ کرنا اس کی حمایت کے مترادف ہے۔ امت مسلمہ کے ہر ہر فرد کو یہ سمجھنا

چاہئے کہ خون چاہے ایران وعراق میں بہے، افغانستان میں بہے، پاکستان میں بہے، خون تو اہل ایمان ہی کا بہہ رہا ہے نا؟

امریکہ اور مغربی ممالک نے مسلمانوں کو اتنے دھوکے دئے ہیں کہ اگر وہ کوئی اچھی بات بھی کہے تو مسلمانوں کو یہ سوچنا کہ یہ پھر مسلمانوں کو کسی بڑی سازش میں پھنسانے کی تیاری ہے، امریکہ اور مغرب نے اپنا اعتماد اس قدر کھودیا ہے، اور یہ صورت حال اس وقت تک برقرار رہنی چاہئے جب تک دو اہم مسائل حل نہیں ہوتے، نمبر۱، ارض مقدس فلسطین سے مکمل طور پر یہودیوں کا انخلاء اور مسجد اقصی مسلمانوں کے حوالہ کیا جانا، نمبر۲۔ عراق، افغانستان اور عرب ملکوں سے امریکی اور اتحادی افواج کا اگر جمہوری طریقے پر دونوں مسئلے حل نہیں ہوتے تو امت کو آخری فیصلہ محض اللہ کی مدد اور توکل پر لینا چاہئے۔

(مضمون نگار اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا سے وابستہ ہیں)

☆☆

قرآن کی حکایت، قرآن کی شکایت

● یاور رحمٰن

قرآن کہتا ہے ’تم خیر امت ہو‘ یعنی بہترین امت ہو، سبحان اللہ! سوچو کتنے خوش نصیب ہو تم! رب نے تمہیں کتنی بلندی دی ہے۔ قرآن یہ بھی کہتا ہے، تمہیں امتِ سابقہ یعنی بنی اسرائیل کو معزول کر کے مامور کیا گیا ہے۔ یہ معمولی بات نہیں، ایک امت کو جسے خدا نے سارے جہان والوں پر فضیلت دی تھی، اس کے اعمال کی پاداش میں ذلت ومسکنت کی سوغات دیکر اسے Sack کیا گیا ہے اور تمہیں نبوتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے ساتھ Appoint کیا گیا ہے۔ مگر افسوس کہ تم اسی امت معزول ومعتوب کے نقشِ قدم پر چلنے لگے ہو، ذرا سوچو یہ کیا کر رہے ہو تم؟

قرآن پھر کہتا ہے، تمہارے بعد اب اس روئے زمین پر کوئی دوسری امت نہیں آئے گی بلکہ تمہارے بعد انسانی زندگی کا یہ زمینی سفر ختم ہوجائے گا اور پھر حشر قائم کر دیا جائے گا۔ گویا تم صدرِ جلسہ ہو تمہاری تقریر کے بعد یہ پروگرام ختم ہوجائے گا۔ غور کرو یہ کتنی عظیم ذمے داری ہے۔

قرآن یاد دلاتا ہے ’’تم امّتِ وسط ہو‘‘ یعنی تم عین فطرت پر قائم رہنے والی امّت ہو، ہر افراط اور ہر تفریط سے پاک ہو، پچھلی امّتوں نے غلو کر کے اپنے ایمان وعقیدہ کو بگاڑ لیا تھا۔ انھوں نے ایک طرف اپنے انبیاء کو قتل کیا تو دوسری طرف نبی کو خدا کا بیٹا تک بناڈالا۔ اللہ کے مقابلے میں انتہائی درجہ کی جسارتیں کیں یہاں تک کہ اپنے علماء اور مشائخ کو اپنا

رب تک بناڈالا۔تم اعتدال پر قائم رہنے والی امّت ہو، خدا کی اس دنیا کو بھی اعتدال پر قائم رکھنا تمہاری اولین ذمے داری ہے۔تم عدل و انصاف اور راستی کے پیامبر ہو، دنیا کی قوموں کے درمیان تمہیں صدر کی حیثیت حاصل ہے۔

لیکن افسوس کہ تم بھی ان ہی چکروں میں پھنس گئے جس میں پھنس کر پچھلی قومیں تباہ ہوگئیں۔اب تمہارا حال یہ ہے کہ تم اللہ کے نیک بندوں کے بارے میں مبالغہ آمیز رویّہ اپناتے ہو، فرائض سے جی چراتے ہو اور نوافل پر طوفان مچاتے ہو۔دین کے اصولوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتے اور فروع پر آپس میں آستینیں چڑھاتے ہو۔یاد کرو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس قول کو جو انہوں نے یہودی علماء سے کہا تھا ''تم مچھر چھانتے رہتے ہو اور سموچے اونٹ نگل جاتے ہو''۔

رفع یدین، قرأت فاتحہ خلفِ امام، آمین بالجہر، مسئلہ امکانِ کذب، امکان نظیر، علم غیب، خلقِ قرآن، طلاق ثلاثہ، رویتِ ہلال، حلالہ، بحث رضاعت اور لباس وحلیہ پر فرقوں میں بٹ جانے والے مسلمانو! ذرا سوچو تم بھی اسی ڈگر پر چل رہے ہو یا نہیں؟

قرآن کہتا ہے،'تم **شہداء علی الناس** ہو 'یعنی جب آخرت میں پوری نوعِ انسانی کا اکٹھا حساب لیا جائے گا، اس وقت رسولؐ ہمارے ذمے دار نمائندے کی حیثیت سے تم پر گواہی دیں گے کہ فکر صحیح اور عملِ صالح اور نظام عدل کی جو تعلیم ہم نے اسے دی تھی، وہ اس نے تم کو بے کم وکاست پوری کی پوری پہنچا دی اور عملاً اس کے مطابق کام کر کے دکھا دیا۔اس کے بعد رسولؐ کے قائم مقام اور اس کے نائب ہونے کی حیثیت سے تم کو عام انسانوں پر گواہ کی حیثیت سے اٹھنا ہوگا اور یہ شہادت دینی ہوگی کہ رسولؐ نے جو کچھ تمہیں پہنچایا تھا وہ تم نے انسانوں تک پہنچانے میں اور رسولؐ نے جو کچھ تمہیں دکھایا تھا وہ تم نے انسانوں کو دکھانے میں اپنی حد تک کوئی کوتاہی نہیں کی۔

ذرا سوچو! گواہی کے تم کتنے نازک مقام پر فائز ہو! اس کے باوجود بھی تم الٹی ہی چال

چل رہے ہو، اپنے قول وعمل سے الٹا اس پیغام کی منفی تشہیر کر رہے ہو، تم اپنے عمل سے گواہی دے رہے ہو کہ جس اسلام کے تم ماننے والے ہو اس کی ممبرشپ تو ایک مسلمان گھر اور ایک مسلمان معاشرے میں پیدا ہونے کی وجہ سے حالات کے تحت تم کو مل گئی لیکن درحقیقت تم عملاً اس سماج، گروہ اور مذہب کے فرد ہو جہاں خدا اور انسانوں کے بیچ وقت اور حالات کے مطابق وفاداریاں بدلتی رہتی ہیں۔ایسا کر کے کیا تم احکم الحاکمین کے ساتھ بھی سیاست کرنے کی جسارت نہیں کر رہے ہو؟

کیا تمہیں یہ احساس نہیں ہے کہ امّتِ وسط ہونے کی حیثیت سے تم پر اس دنیا کی بڑی ذمے داری ہے اگر تم نے اسکی خیر خواہی کا حق ادا نہیں کیا اور زمین سے فساد و بگاڑ کو ختم کرنے کی حتی الوسع کوشش نہیں کی تو تم سے پوچھا جائے گا کہ دنیا گمراہی کے غار میں پڑی تھی، تمہارے پاس کتاب ہدایت تھی، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بہترین اور کامل اسوہ تھا اور ان کے صحابہ رضی اللہ عنہ کے عظیم ترین کارناموں کا شاندار ریکارڈ تھا، پھر تم کہاں مرے پڑے تھے؟

تمہارے ہوتے ہوئے دنیا کے پانچ ارب لوگ گمراہ کیوں تھے؟ کفر، شرک، الحاد اور دہریت اس زمین پر زندہ کیسے رہے؟ بڑے فخر سے کہتے تھے، اس وقت دنیا میں ہر پانچواں شخص مسلمان ہے، یہ نہیں سوچا کہ ہر چھٹا شخص اسلام سے محروم کیوں ہے؟ تمہارے اپنے ملک میں تم بیس کروڑ تھے، اس کے باوجود اسّی کروڑ سے زیادہ لوگ توحید سے محروم کیوں تھے؟ بتاؤ کیا جواب دوگے؟

تمہارے منھ میں زبان تھی، ہاتھ میں قرآن تھا، ایک لازوال اور سنہرے اسلامی انقلاب کی ناقابلِ تردید تاریخ تھی، ملک میں دعوت وتبلیغ کی آزادی تھی، لوگ سننے کو آمادہ تھے، پھر تم غفلت میں کیوں پڑے تھے؟ بتاؤ کیا جواز پیش کروگے؟

قرآن پکارتا ہے، میرے پاس آؤ! میری توقیر کرو! مجھ سے پوچھو! مجھے پڑھو! مجھے سمجھو

میرے کہے ایک ایک نکتے پر عمل کرو! مجھے لیکر آگے بڑھو اور اس دنیا پر ایسے چھا جاؤ جیسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ چھا گئے تھے۔

قرآن کہتا ہے، میں کسی بشر کا کلام نہیں، اللہ کا کلام ہوں، معزز، مکرم اور بزرگ و برتر فرشتے جبرئیل امین علیہ السلام کے ذریعہ اللہ کے آخری نبی رحمت العالمین ﷺ پر نازل کیا گیا ہوں۔ میں تمہارے رب کا کلام ہوں! میرے لفظ، میرے حرف، میری آیتیں، میرے جملے، میری باتیں، میرے استعارے، میری تمثیلیں، میری بشارتیں، میری وعیدیں، میرے وعدے، مرے ڈراوے، مرے قصّے، میرے واقعے، یہ سب اسی الرّحمٰن کے ہیں جس نے تمہیں قرآن سکھایا، تمہیں پیدا کیا اور تمہیں بیان کی قوت دی۔ اس رب نے تمہیں سننے کی طاقت دی، دیکھنے کی قوت دی، سمجھنے کی صلاحیت دی اور بولنے کا ہنر دیا۔ اس نے کہا، حق کو سنو! حق کو دیکھو! حق کو سمجھو اور حق کا اعلان کردو!

قرآن پوچھتا ہے، پھر تم اپنی ان بے مثال صلاحیتوں کو کہاں کھپا رہے ہو؟ سنتے تو ہو مگر غیروں کی، دیکھتے تو ہو مگر پرائی نگاہوں سے، سمجھنا چاہتے ہو سب کچھ، سوائے میرے اور بولتے ہو اور خوب بولتے ہو مگر جو خود چاہتے ہو، وہ تو بولتے ہی نہیں جو خدا چاہتا ہے۔

قرآن شکوہ کرتا ہے، تمہیں ہر کتاب پڑھ لینے کا شوق ہے، شعر وادب کی محفلوں میں راتیں گذار دیتے ہو، نغمہ وموسیقی تمہارے دل کو بے پناہ بھاتے ہیں۔ انٹرنیٹ پر گھنٹوں آنکھیں گڑائے بیٹھے رہتے ہو۔ موبائل تمہاری مصروفیتوں کا نقطۂ آغاز بھی ہے اور انجام بھی۔ شعراء، مصنّفین، اداکاروں اور کھلاڑیوں کے بارے میں معلومات کے خزانے لٹاتے ہو! ناول اور افسانوں کے کرداروں میں کھو کر نہ جانے کتنے قیمتی لمحات گنواتے ہو، تہذیب و ثقافت کی آڑ میں فحاشی کو فن سے تعبیر کرتے ہو، شاعروں، ادیبوں، سیاستدانوں، فلسفیوں اور فنکاروں کی سوانح عمریاں راتوں کو جاگ جاگ کر پڑھتے ہو، روایتی واعظوں کے وعظ بھی خوب سنتے ہو، ضمیر کو اطمینان دلانے کے لئے علماء کی کچھ تقریریں بھی سن لیتے ہو،

اخبارات میں چھپی ایک ایک خبر اور ایک ایک مضمون کو پوری باریکی سے پڑھتے ہو اور میرے سلسلے میں؟

دن کو پوچھوں تو کہتے ہو، ابھی فرصت نہیں ہے، بعد میں،

رات کو پوچھوں تو کہتے ہو، ابھی دفتر سے لوٹا ہوں، تھکا ہوا ہوں دیکھتے نہیں؟

اور کبھی پڑھتے ہو تو ایسے پڑھتے ہو جیسے کوئی بوجھ اتار رہے ہو؟

میرے ساتھ ہی ایسا ظلم کیوں کرتے ہو! کیا تمہیں اس دن کا ڈر نہیں جب یہ ساری مصروفیتیں تیاگ کر تمہیں قبر کے اندھیروں میں جانا ہوگا۔ ماں بھی چھوڑ دیگی، باپ بھی چھوڑ دیگا، بیوی بھی ساتھ نہ دیگی، بچے بھی کام نہ آئیں گے۔ ساتھ کوئی دے گا تو میں دوں گا۔ مجھے یہاں ٹھکراؤ گے تو میں وہاں کیوں ساتھ دوں گا؟

تم بہانے بناتے ہو، کہتے ہو تمہاری زبان عربی ہے، سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ تو بس بے تکی بات ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جب تمہارے ملک میں فارسی بولی جاتی تھی تو تم فارسی فرفر بولتے تھے۔ پھر انگریزوں کے غلام ہوئے تو انگریزی بھی سیکھ گئے۔ تمہارے معصوم بچے کتوں، بلیوں اور چوہوں کو بھی انگریزی میں پکارتے ہیں۔ اب تم ہندی خوب سمجھتے ہو۔ پنجابی، بنگالی اور مراٹھی ہی نہیں، فرنچ، جرمن اور چینی زبانیں بھی سیکھنا چاہو تو دنوں میں سیکھ لیتے ہو اور فخر سے لوگوں پر جتاتے ہو۔ غرض جو زبان تمہارے دل کو بھا جائے، اسے سیکھ لیتے ہو۔ میں پوچھوں تو کہتے ہو، عربی سیکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہندوستان میں تو ہندی اردو اور انگریزی چلتی ہے۔ میری زبان نہ خود سیکھتے ہو نہ اپنے بچوں کو سیکھنے دیتے ہو۔ حالانکہ اللہ کے نیک بندوں نے مختلف زبانوں میں میرے ترجمے کر کے تمہاری راہ آسان کر دی ہے پھر بھی تم میری طرف پلٹ کر کے بھی نہیں دیکھتے۔ آخر تم ایسا کیوں کرتے ہو؟

تم بغیر سمجھے دو روپے کا اخبار نہیں پڑھتے۔

کسی اجنبی زبان میں sms آئے تو ڈیلیٹ کر دیتے ہو۔

کوئی تمہاری زبان میں بات نہ کرے تو بُرا مان جاتے ہو۔

آخر مجھے ہی کیوں بے سمجھے پڑھنا چاہتے ہو؟

میں جانتا ہوں تمہیں دنیا کی کسی اور کتاب سے وہ عقیدت نہیں جو مجھ سے ہے۔ لیکن سوچو تو سہی، آخر کیسی عقیدت ہے کہ تم یہ بھی نہیں جاننا چاہتے کہ میں کیا چاہتا ہوں؟

دنیا کے ہر علم کو گھول کر پی جانا چاہتے ہو، پوری دنیا کا جغرافیہ یاد کر لیتے ہو، الجبرا اور جیومیٹری کے پیچیدہ سے پیچیدہ سوالوں کو حل کر کے ہی دم لیتے ہو، ٹائم اور اسپیس پر مشکل کتابیں بھی سمجھ لیتے ہو، نفسیات کی گہرائیوں پر خوب باتیں کر لیتے ہو۔ کیا اک میں ہی ہوں جسکے لئے تمہارے ذہن کے کسی کونے میں ایک سوال تک نہیں؟

یہ میری نہیں، تمہاری ٹریجڈی ہے، یہ میرا نہیں، بلکہ تمہارا اپنا المیہ ہے کہ میں تمہارے مدرسوں میں بھی اجنبی ہوں۔ وہاں کے نصابوں میں فضولِ نصاب ہوں۔ کمسن بچوں کے ہاتھوں میں کھلونوں کی طرح دے دیا جاتا ہوں اور وہ اپنی معصومیت اور نادانی میں میری خوب بے حرمتی کرتے ہیں۔

بڑے مجھے بحثوں کا عنوان بناتے ہیں۔ ان کے سیکھنے سکھانے میں میرا نمبر فقہ، اصول، عقائد اور کلام کے بعد آتا ہے۔ وہ مجھ میں ایسے الجھتے ہیں جیسے کہ میں بس اک فلسفہ ہوں۔ میری ذات کو گرامر اور قواعد کی بحثوں میں الجھا کر میری روح کو پامال کرتے ہیں۔

تمہاری خانقاہوں میں میرا کوئی گزر نہیں، تمہاری تحریک وتبلیغ تک میں میرا کوئی ذکر نہیں، وہاں میں بس اک کتاب ہوں، طاق پر رکھا ہوا ہوں اس لئے کہ باعثِ ثواب ہوں۔

تمہیں رسول اللہؐ سے محبت ہے نا؟ ہاں بے شک ہے۔ میں دیکھتا ہوں تمہاری دیوانگی، جوش میں آ کر بے سمجھے کیا کیا کر جاتے ہو۔

تمہیں مجھ سے بھی بہت عقیدت ہے۔ میری بے حرمتی پر تمہارا خون کھول اٹھتا ہے، جان تک دے دیتے ہو۔ لیکن کیا تم نے کبھی سوچا ہے کہ میری بے حرمتی کی وجہ بھی تم بنتے ہو؟

تم دعویٰ ماننے کا کرتے ہو لیکن عملی زندگی میں کسی اور کے لکھے کو مانتے ہو! عجیب رشتہ ہے مجھ سے تمہارا۔

تم باتیں کرتے ہو تو کنفیوشس، شیکسپیئر، مارکس، لینن، شیلے، ارسطو، گاندھی، غالب اور نہ جانے کن کن لوگوں کے حوالے دیتے ہو۔ تمہیں میری کوئی آیت یاد نہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث یاد نہیں؟ صحابہؓ کے اقوال یاد نہیں؟ کیسے مسلمان ہو تم؟

رسول اللہ ﷺ کے صحابہؓ کی تمہاری نظر میں بے پناہ عزت ہے، ہے نا؟ ہونی ہی چاہئے۔ مگر کیا تم نہیں جانتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تربیت میری ہی ذریعہ کی تھی۔

انہوں نے مجھے پڑھا تھا، میرے ایک ایک حرف کو سمجھا تھا، میری ہر بات پر عمل کیا تھا، مجھ سے سچی محبت اور عقیدت کی تھی، میرے لئے جان دیتے تھے انھوں نے میری حکمرانی قائم کی تھی انہوں نے، مجھے اپنے ذات کے اوپر حکم تسلیم کر لیا تھا انہوں نے اور مجھے لیکر، میرے پیغام کو لیکر دنیا میں پھیل گئے تھے اور اس وقت کی تمام باطل طاقتوں کو زیر کر کے انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کرایا تھا۔

اور تمہارا حال کیا ہے؟ جو دین بڑی شان سے نکلا تھا اور عرب وعجم میں پھیل گیا تھا، اسے آج خود تم نے اجنبی کر دیا ہے۔ جس دین کو پھیلانے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پتھر کھائے تھے، گالیاں سنی تھی، اپنے بے داغ اور مقدس ترین دامن پر دشمنوں کی پھبتیاں سہی تھیں، اپنے گھر سے نکلنے پر مجبور کئے گئے تھے۔ شہر بدر ہوئے تھے۔ ان کے صحابہؓ نے ظلم سہے تھے، گھر بار چھوڑا تھا، رشتے دار چھوڑے تھے، زندگی کی راحتوں کو قربان کیا تھا اور جانیں دی تھیں، آج اسی دین محمدؐ کو تم آپس میں لڑ لڑ کر رسوا کر رہے ہو۔ اپنے قول اور عمل سے دین حق کو جھٹلا رہے ہو۔ لفظوں کا رشتہ جوڑ کر الٹا اس کو بدنام کر رہے ہو! آخر ایسا کیوں کر رہے ہو؟

آج تم کتنے ذلیل وخوار ہورہے ہو! کیسے کیسے مارے جاتے ہو، دشمن کی مزائلیں تمہارے معصوم بچوں کے بھی پرخچے اڑا رہی ہیں۔ اپنے ملک میں دہشت گردی کے جھوٹے الزاموں میں تم مارے جاتے ہو، جیلوں میں سڑائے جاتے ہو، ٹی وی اور اخباروں میں تماشا بنا کر دکھائے جاتے ہو، تمہارے مسلم ملکوں میں غیر تمہیں گھس گھس کر مار رہے ہیں، تمہاری ہوا اکھڑ چکی ہے۔ تمہاری بچیاں فیشن میں مگن ہیں، تمہارے بیٹے عشق وعاشقی میں مبتلا ہیں، تمہارے بوڑھے آرام پسند ہو گئے ہیں، تمہارے جوان بے حیا اور بے ہنگم ہو گئے ہیں۔ تمہاری عورتیں بے مروت و بے وفا ہو رہی ہیں، تمہارا سماج بدنام ہو گیا ہے پوری دنیا تمہیں بوجھ سمجھنے لگی ہے۔ نہ تمہیں سود کے معاملات سے پرہیز ہے نہ رشوت لینا چھوڑتے ہو، نہ جھوٹ سے تمہیں ڈر لگتا ہے نہ تمہارے آپس میں محبت و یگانگت ہے۔ تم عربی، عجمی، فارسی، شیعہ، سنی، دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور نہ جانے کن کن خانوں میں بٹے ہوئے ہو۔ یہ سارے الزامات اگر سچ نہیں ہیں تو تم انہیں غلط ثابت کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہو۔

تمہارا حال تو یہ ہے کہ خود بھی اپنی عقل کا استعمال نہیں کرتے، اپنے ہی موجودہ حالات پر غور کر لیتے تو شاید بات کچھ سمجھ میں آجاتی۔ مگر تم ہو کہ کوئی سمجھائے تو سمجھانے والے کی آواز تمہارے کانوں کے پردوں سے ہو کر گذر جاتی ہے اور تمہارا دماغ کہیں اور ہی مشغول رہتا ہے۔

تمہارے اندر نہ تو اللہ کا تقویٰ ہے، نہ اسکی طرف پلٹ کر دیکھتے ہو، نہ اسکے ساتھ اپنے رشتے کا بھرم ہے تمہیں۔ بے دیکھے رحمٰن کو مانتے تو ہو مگر اسکی رحمت کا نام لیکر بے دریغ گناہ کرتے ہو۔ اسکی عظمت، اس کی کبریائی، اسکی بزرگی اور اس کی بڑائی کا کوئی پاس ولحاظ نہیں ہے تمہیں، نہ تمہیں اس کے قہر سے، اس کے غیض وغضب سے ڈر لگتا ہے!!!

ذرا سوچو تو سہی کیسے بندے ہو تم؟ بندگی کو شرمسار کرتے رہتے ہو!

مجموعه القاسم: جلد پنجم
مسلم مسائل اور اس کا حل

بولو ایسا ہے کہ نہیں ہے؟؟؟

اگر تم مجھے سمجھ کے پڑھتے تو تمہیں معلوم ہوتا کہ پچھلی قومیں بھی ان ہی برائیوں کی وجہ سے ملیا میٹ کر دی گئیں۔ اللہ کے عذاب نے انہیں مٹا کے رکھ دیا۔ مگر افسوس کہ تم اپنی روش میں بہت آگے نکلتے جارہے ہو! تم اپنی صحت کے لئے بہترین اسپتال اور تجربہ کار ڈاکٹر چاہتے ہو، بچوں کی تعلیم کے لئے بہتر سے بہتر اسکول اور کالج ڈھونڈتے ہو۔ یہاں تک کہ کپڑوں کے لئے بہترین درزی اور حجامت کے لئے اچھے سے اچھے سیلون کی تلاش میں رہتے ہو۔ لیکن دین کے معاملات میں کسی سے بھی، کہیں بھی، اور کچھ بھی سن لینے کو کافی سمجھتے ہو۔

مجھ سے پوچھتے تک نہیں کہ آج جو بات مولوی صاحب نے، مولانا صاحب نے، پیر صاحب نے، شیخ جی نے اور فلاں صاحب نے بتائی ہے، اسکی حقیقت کیا ہے؟ کیا واقعی تمہیں میری کوئی ضرورت نہیں؟

ہاں ہے نا!

جھوٹی قسم کھانے کے لئے میرا استعمال کرتے ہو۔

مردوں کو بخشوانے کے لئے مجھے مدرسے کے بچوں سے پڑھواتے ہو۔

بہن اور بیٹی کو شادی میں رخصت کرتے وقت برکت کے لئے میرا عجوبہ استعمال کرتے ہو۔

تم میری عزت نہیں کرسکتے تو میری بے عزتی کیوں کرتے ہو؟

میں جزدان میں لپٹا تمہارے گھر کے کسی طاق پر پڑا رہتا ہوں اور اسی گھر میں تم خدا کے احکامات کی دھجیاں بکھیرتے رہتے ہو۔ تمہاری عورتیں ٹی وی میں مگن رہتی ہیں اور تم روپئے چھاپنے کی فکر میں لگے رہتے ہو۔ کیسی اذان، کیسی نماز، کون سی مسجد اور کاہے کی جماعت، اللہ کی پسندیدہ دنیا تمہاری نظر میں بالکل اجنبی ہے۔ بالکل اجنبی۔

تمہارے آس پاس کفر و شرک پنپتا رہتا ہے، تمہارے پڑوس میں یا کبھی خود تمہارے گھر میں کسی کمزور پر ظلم ہوتا رہتا ہے۔ کوئی کسی کا مال کھا جاتا ہے، کوئی کسی کی زمین ہڑپ کر جاتا ہے کوئی کسی کی عزت اچھالتا ہے، کوئی بھوکا ہے، کوئی ننگا ہے، کوئی بیمار ہے اور تم درد کے ان تمام ہنگاموں سے بے پرواہ ہو کر میٹھی نیند سوتے رہتے ہو۔

تمہاری زندگی صرف تین دائروں میں گھری ہوئی ہے،

''میں، میری بیوی اور میرے بچے'' اور ان کے لئے،

اچھا کھانا، عمدہ کپڑے اور عیش کے سامانوں سے بھرا ہوا مکان''۔ حق اور ناحق کا سوال آئے تو دوستی اور رشتے داری ہی نبھاتے ہو۔

یہ تمام خرابیاں اسی لئے تو ہیں کہ تم نے مجھے بالکل چھوڑ رکھا ہے۔ نہ خود اپنے مسائل کا حل مجھ سے پوچھتے ہو نہ کسی دوسرے کو یہ حق دینا چاہتے ہو۔ حالانکہ نہ تم کوئی سیٹھ ساہوکار ہو نہ میں تمہاری تجوری میں رکھا ہوا مال ہوں۔ پھر بھی ایسا لگتا ہے جیسے سانپ کی طرح پھن مارے مجھ پر بیٹھے ہو۔ میں آیا ہوں سب کی خاطر، پوری دنیا پیاسی ہے اور تمہارا حال یہ ہے کہ جیسے میں صرف پانی کا اک چشمہ ہوں اور تم صرف اپنا حق جمائے بیٹھے ہو۔ عملی زندگی میں مجھ سے رشتہ توڑ کے بیٹھے ہو اور پھر دنیا سے کہتے ہو۔

میرا اللہ
میرا نبی
اور میرا قرآن۔

ٹھیک ہی تو کہا تھا اس مردِ درویش اقبال نے،

وہ معزز تھے زمانے میں مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

ہاں! میں تو آیا اسی لئے تھا کہ تمہیں دنیا کی امامت دوں! تم دنیا والوں کے لیڈر اور

سردار بنو، میں نازل اسی لئے کیا گیا ہوں کہ جو مجھ پر ایمان لے آئے اسکی زندگی سنوار دوں۔ مجھے خدا نے اپنے نبیؐ پر اسی لئے تو اتارا ہے کہ میں اسکے امتی کو اونچا اٹھا دوں! جو مجھ پر ایمان لائے اور مجھے تھام لے میں اسے دنیا کی سرداری دوں۔ سنو! میں تم سے آخری بات کہوں؟

اب بھی وقت ہے، آنکھیں کھولو! میری اہمیت اور اپنی ذمے داری کا احساس کرو۔ میں آج بھی تمہارے درمیان، تمہارے گھر میں، تمہاری مسجدوں، تمہارے خانقاہوں اور تمہارے مکتبوں میں ہوں۔ مجھے مضبوط ارادوں کے ساتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑو اور روح کی گہرائیوں میں اتار لو اور میرے صفحات پر رقم شدہ یہ اعلانِ خداوندی پڑھ لو!

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ o

(ال عمران:139)

''دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو!!!''

☆☆

ایڈز کا شکار جنین
طب و شریعت کے آئینے میں

● مفتی محمد ارشد فاروقی

ایڈز کے بارے میں ماہرین طب بتاتے ہیں کہ یہ ایسی بیماری ہے جو انسانی جسم کی قوت مدافعت کم کرتی ہے اور ایڈز کچھ خاص قسم کے وائرس پیدا کردیتا ہے جس کا نام ہی قوت مدافعت کو نقصان پہنچانے والا طبی دنیا میں رکھا گیا ہے (HIV) یہ وائرس انسانی جسم میں ظاہر ہونے سے قبل کئی سال پہلے سے پایا جاتا ہے تو آدمی ایڈز کے وائرس کا شکار چلتا پھرتا رہتا ہے، اس کے چہرے مہرے سے پتہ بھی نہیں چلتا کہ وہ ایڈز زدہ ہے، البتہ یہ شخص دوسرے اشخاص تک ایڈز پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہے، ایڈز کے وائرس جسم و ساخت کے رقیق مادے میں موجود ہوتے ہیں۔

ایڈز کی شناخت جنسی متعدی مرض کی صورت میں کی گئی ہے جو خلاف فطرت وحرام جنسی ربط پیدا کرنے سے منتقل ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کے شکار بڑی تعداد میں مغربی ممالک میں پائے جاتے ہیں، جہاں زنا و بدکاری اور ہم جنسی کی وبا عام ہے (جسے اب ہندوستان میں قانونی حمایت حاصل ہے) اور پانچ ملین سے زیادہ ایڈز کے شکار ہندوستان میں ہیں، دوسری رپورٹ کے مطابق اب یہ تعداد 2.5 ملین میں سمٹ گئی ہے۔

ایڈز کی حشر سامانیاں اصل تک نہیں رہتیں بلکہ اپنی لپیٹ میں اس ننھے سے وجود کو بھی لے لیتی ہیں، جو شکم مادر میں ارتقائی عمل سے گذر کر عالم رنگ و بو کی رنگینیاں دیکھنے کے لئے

بے تاب ہے لیکن اس محفوظ مقام میں ایڈز وائرس اس کا تعاقب کررہا ہے، جو وائرس محبت و پیار کے ملاپ کے نتیجے میں ایڈز زدہ جوڑے نے منتقل کیا ہے۔

طبی ماہرین نے ایڈز میں مبتلا جنین کا علاج ڈھونڈھنے کی بھرپور کوشش کے باوجود اسقاط کا مشورہ دیا ہے، یہ طبی مشورہ کیا شرعی حکم بن سکتا ہے؟

جنین کی زندگی سے متعلق احکام کی واقفیت، شرعی اصول وضوابط اور انسانی مشاہدات و تجربات کی روشنی میں ممکن ہے، کتاب ہدایت میں خداوند قدوس کا فرمان ہے ''اور ہم نے آدمی کو چنی ہوئی مٹی سے بنایا، پھر بوند سے جما ہوا لہو بنایا، پھر جمے ہوئے لہو سے گوشت کی بوٹی بنائی، پھر اس بوٹی سے ہڈیاں بنائیں، پھر ان ہڈیوں پر گوشت پہنایا، پھر اس کو ایک نئی صورت میں اٹھا کھڑا کیا، سو بڑی برکت اللہ کی ہے جو سب سے بہتر بنانے والا ہے۔ (مومنون: ۱۲-۱۴)

انسانی جنین اس مخلوق کا نام ہے جو رحم مادر میں منوی جرثوموں اور نسوانی خلیوں سے مل کر پرورش پاتی ہے، ابتدائی عمل سے پیدائش تک جنین کا اطلاق ہوتا ہے، جنین کی لغوی تعریف کا فقہاء نے بھی اعتبار کیا ہے، البتہ کچھ فقہاء نے تخلیقی عمل کے شروع ہونے کی شرط لگائی ہے، سیدنا امام شافعیؒ کی یہی رائے ہے، وہ فرماتے ہیں جس جنین کے اسقاط پر تاوان لازم ہوتا ہے اس میں خلقی عمل کا آغاز ہونا ضروری ہے، جیسے انگلیوں، ناخن، آنکھ کی تخلیق۔ (الام ۶/۱۳۸)

اطباء شکم مادر میں پرورش پانے والے وجود کا نام جنین اسی وقت رکھتے ہیں جب انسانی سانچہ وجود میں آچکا ہو، انسانی اعضاء بن چکے ہوں، حمل کے تیسرے مہینے میں جنین یہ روپ اپنا لیتا ہے، جبکہ بعض اطباء کی رائے یہ ہے کہ جب حمل اس مرحلے میں پہنچ جائے کہ اگر رحم مادر سے الگ کرلیا جائے تو زندہ رہ سکے یہ ساتویں مہینے میں ممکن ہے۔ (القانون ۲/۵۷۲، ابن سینا)

اسقاط کے شرعی احکام:

چار مہینے کے جنین کا اسقاط تمام فقہاء حرام قرار دیتے ہیں کیوں کہ اس مرحلے میں روح سمانے کا عمل انجام پالیتا ہے، ”تم میں سے ہر ایک کی تخلیق رحم مادر میں ان مراحل سے گذر کر ہوتی ہے، چالیس روز نطفے کے مرحلے میں پھر چالیس دن جمے ہوئے لہو، پھر چالیس یوم گوشت کی بوٹی کی شکل میں پھر اللہ اس میں روح ڈالنے کے لئے فرشتہ بھیجتا ہے۔ (بخاری شریف، حدیث نمبر ۶۲۲۱)

خلاصہ یہ کہ جنین جب ایک سوبیس دن کا ہوجائے (اوراس میں روح اس مرحلے میں پڑ جاتی ہے) تو اسقاط ناجائز ہے۔ (حاشیہ ابن عابدین ۱۷۶/۳، فتح القدری ۴۰۰/۳، حاشیہ دسوقی ۲۱۱/۲، تفسیر قرطبی ۸/۱۲، الفقہ الاسلامی وادلتہ وہبہ زحیلی ۵۵۶/۳، احکام الجنین عمر غانم ۱۶۹-۱۷۰) البتہ اگر ایک سوبیس دن کے جنین کی وجہ سے ماں کی جان کو شدید خطرہ لاحق ہوجائے تو ناگزیر حالت میں اس مرحلے میں بھی اسقاط کی اجازت فقہاء نے دی ہے، لیکن فقہاء نے اس نازک صورت حال میں بھی حمل ساقط کرانے کی اجازت نہیں دی ہے اور **ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق** بطور دلیل پیش کرتے ہیں (اور نہ مارو اس جان کو جس کو اللہ نے منع کر دیا ہے مگر حق پر: بنی اسرائیل ۳۳) اوران فقہاء نے بطور نظیر یہ مسئلہ بھی پیش کیا ہے کہ اگر کسی بھی شخص کو کسی کے قتل پر مجبور کیا جائے تو اسے اپنی جان بچانے کے لئے دوسرے کا قتل جائز نہ ہوگا، چاہے جبر واکراہ کی صورت کتنی ہی پرخطر کیوں نہ ہو، اگر اس نے اس نتیجے میں قتل کیا تو جمہور فقہاء قصاص کے وجوب کے قائل ہیں۔

(بدائع الصنائع ۱۸۱/۷، المنثور فی القواعد ۱۸۸/۱، قواعد ابن رجب ۱۷۶، الاشباہ والنظائر للسیوطی، ۸۵)

لیکن بعض فقہاء نے جس صورت میں ماں کی جان بچانے کے لئے سوائے اسقاط کے کوئی صورت باقی نہ رہے اسقاط کی اجازت دی ہے کہ نہ حمل کی جان بچنے کی امید ہو نہ

ماں کی جان بچائی جاسکتی ہو۔ (الموسوعۃ الفقہیہ الکویتیہ ۵۷/۳)

یہ رائے گو عام فقہاء کی رائے سے الگ ہے لیکن مختلف دلائل کی بنیاد پر قابل ترجیح ہے۔

الف: فرع کو اصل کے خاتمے کا ذریعہ بنانا مناسب ہے، اسی لئے اگر اصل (باپ) فرع (بیٹے) کو قتل کردے تو قصاص واجب نہیں ہوتا، جمہور کی یہی رائے ہے۔ (الاحکام السلطانیہ، ۲۷۶، المغنی ۴۹۰/۱۱)

ب: فقہاء کی بڑی تعداد اس بات سے اتفاق کرتی ہے کہ جنین کے قاتل سے قصاص نہ لیا جائے گا چاہے بالقصد قتل پایا جائے یا ظلم وزیادتی کے نتیجے میں، یہ الگ بات ہے کہ یہ فعل حرام کا ارتکاب ہے، یہ اسی وقت ہے جب جنین مردہ حالت میں ساقط ہوا ہو کیوں کہ فقہاء جنین کی زندگی کو زندگی کے مساوی تسلیم نہیں کرتے۔ (الام ۱۳۸/۶، بدائع الصنائع، ۲۳۲/۷)

ج: جس کے رحم میں جنین پرورش پا رہا ہے وہ بیوی کی ذمہ دارانہ حیثیت رکھتی ہے، شوہر اس کی زندگی کا ساتھی، اس کا بے حد ضرورت مند ہے، اگر چھوٹے بچے بھی ہیں تو ضرورت وذمہ داری دوچند ہوجاتی ہے، یہ حقیقت غیر معمولی طور پر محسوس کی جاتی ہے کہ جنین کے بالمقابل ماں کی موت سے زیادہ مسائل پیدا ہوں گے۔

اسقاطِ حمل کے جواز کا فتویٰ اس نازک ترین مرحلے میں دیا جائے گا جب زچہ بچہ دونوں کو یکساں خطرہ لاحق ہو، ماں کی زندگی بغیر اسقاط کے بچانا ممکن ہو اور دونوں کی ہلاکت عدم اسقاط کی صورت میں یقینی ہو۔

ماں کی جان بچانے کے لئے جن صورتوں میں اسقاط حمل کی اجازت ہے اس میں یہ صورتیں داخل ہیں۔ حمل کے ابتدائی مہینوں ہی میں رحم مادر کا ایڈز وائرس کے شکنجے میں بری طرح کس جانا، رحم کے ماحول کا پراگندہ ہوجانا، استسقاء کی بیماری کا پیدا ہوجانا، جن کے نتیجے میں خشکی کی حدت بڑھ جانا، دل کا دورہ پڑھنا، جگر یا گردے کا متاثر ہوجانا، کینسر کا لاحقہ جن کی معتمد بھروسہ مند ماہر فن ڈاکٹر تصدیق کریں اور بتائیں کہ اگر حمل باقی رکھا گیا تو

ماں کی ہلاکت کا ظن غالب ہے۔ (ابحاث فقیہ نعیم یاسین، ۱۹۶، مشکلۃ الاجہاض، ۳۰/۳۶)

جب حمل کی مدت ایک سو بیس دن سے کم ہو اور ابھی جان نہ پڑی ہو ایسی حالت میں حمل کے اسقاط کے بارے میں فقہاء کے متعدد اقوال ہیں: (۱) حمل میں جان آجانے سے پہلے پہلے اسقاط حمل درست ہے، یہ رائے بعض حنفی علماء، ابن رشد مالکی اور کچھ حنبلی فقہاء کی ہے۔ (حاشیہ ابن عابدین ۳/۱۷۶، بدایۃ المجتہد ۴/۳۳۵، المغنی ۷/۸۰۲، الانصاف ۱/۳۸۶) یہ کہتے ہیں کہ حمل میں جب روح نہ پڑے اسقاط حرام نہیں ہے، کیوں کہ روح پڑنے سے قبل اس پر انسان کا اطلاق نہیں ہوتا (۲) حمل کے پہلے چالیسویں سے پہلے اسقاط درست ہے، لخمی مالکی، ابواسحاق، مروزی، شافعی اور حنابلہ کا راجح قول یہی ہے۔ (نہایۃ المحتاج ۸/۴۱۶، حاشیہ الاسوقی ۲/۲۶۷، المغنی ۷/۸۰۲، نیل المارب ۱/۱۱۱) ابن قدامہ نے اسقاط درست ہونے کی دلیل یہ دی ہے کہ اگر کسی نے حاملہ کے حمل کو اس طرح نقصان پہنچایا کہ مضغہ (گوشت کی بوٹی) کی صورت میں اسقاط ہوا گر باوثوق ذرائع (ماہر امراض نسواں) انسانی شبیہ تیار ہونے کی تصدیق کریں تو غرہ (یعنی غلام یا باندی کی قیمت) واجب ہوگا، لیکن اگر انسانی شبیہ نمایاں نہیں ہے تو فقہاء کے صحیح قول کے مطابق غرہ واجب نہ ہوگا۔ جیسے بندھے ہوئے خون (علقہ) کے اسقاط پر جرمانہ عائد نہیں ہوتا۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ انسان کا بری الذمہ ہونا اصلی حالت ہے اس میں کسی تاوان کا عائد کرنا شک وشبہ کی بنیاد پر درست نہیں ہے، جبکہ فقہاء کا ایک قول یہ بھی ہے کہ اس صورت میں بھی تاوان واجب ہوگا، اس کا باطل ہونا یوں ظاہر ہے کہ دم بستہ (علقہ) قطرۂ منی (نطفہ) کے اسقاط میں کوئی فقیہ تاوان (غرہ) کا قائل نہیں ہے (المغنی ۱۲/۴۷) حنابلہ کا مسلک راجح یہی ہے کہ حمل کے ابتدائی چالیسویں مرحلے میں اسقاط درست ہے، البتہ شکل انسانی (مصغہ) بننے کے بعد اجازت نہیں ہے۔

جو فقہاء نفخ روح سے پہلے یا ابتدائی چالیسویں مرحلے میں اسقاط کے جواز کے قائل

ہیں ان کے مقابلے میں کہا جاتا ہے کہ حمل چاہے جس مرحلے میں ہو جان پڑنے سے پہلے یا پہلے چلے کی مدت میں ہو گو فی الحال وہ انسانی وجود مکمل نہیں رکھتا، پر آدمیت کی آفرینی تو ہو چکی، تخلیقی مراحل سے وہ گذر رہا ہے، اگر اسقاط نہ کیا جائے تو زندہ آدمیت کا سراپا تیار ہو جائے گا، اسی نظریہ کے تحت علماء کی ایک جماعت عزل (مانع حمل ذرائع) کو ممنوع قرار دیتی ہے کیوں ک اولاد کا قتل حرام ہے۔ **ولا تقتلوا اولادكم خشية املاق نحن نرزقهم و اياكم** (اولاد کو غربت کے اندیشے سے نہ مار ڈالو، ہم ان کو بھی روزی دیتے ہیں اور تمہیں بھی۔ اسراء: ۳۱) رحم مادر میں نطفہ نہ پہنچانے کی تمام مساعی قابل مذمت ہیں، نادرست ہیں حالاں کہ اگر نطفہ رحم میں پہنچ بھی جائے تو نطفہ کی شکل میں جنین کا اطلاق نہیں ہوتا، جب نطفہ کو رحم مادر میں پہنچنے سے روکنے کی تدبیر ممنوع ہے تو حمل کا اسقاط ہر مرحلے میں ناجائز ہے، جب وجود سے پہلے وجود میں نہ لانے کے اسباب اختیار کرنا ناروا ہے تو وجود کے بعد کیوں کر روا ہوسکتا ہے؟ (اجہاض الحمل عباس شومان ۵۲-۵۳)

(۳) نفخ روح سے پہلے کسی شدید عذر کے باعث اسقاط جائز ہے۔ جمہور فقہاء احناف اور بعض شوافع کا یہی مذہب ہے۔ (حاشیہ ابن عابدین ۳/۱۷۶) یہ فقہاء نفخ روح سے پہلے شدید عذر کی وجہ سے اسقاط کے جواز کے قائل ہیں، البتہ اس عذر کی تعیین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ احناف نے بطور مثال ایک عذر پیش کیا کہ حاملہ کا دودھ پیتا بچہ ہو اور حمل کی وجہ سے دودھ بند ہو جائے اور کوئی متبادل نظم بھی دودھ پیتے بچے کے لئے نہ ہوسکتا ہو تو یہ عذر اسقاط کے لئے کافی ہے۔ (حاشیہ ابن عابدین، ۳/۱۷۶) اور بعض فقہاء شافعیہ زنا کے نتیجے میں ظاہر ہونے والے حمل کے اسقاط کے قائل ہیں اور عذر کا تحقق اس وقت مانتے ہیں، رملی نے اسی رجحان کا اظہار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر حمل بدکاری کا ثمرہ ہو تو اسقاط کے جواز کا رجحان ہوتا ہے، نفخ روح سے پہلے! بشرطیکہ حمل باقی رکھنے میں رسوائی کا اندیشہ ہو۔ (نہایۃ المحتاج ۸/۱۷۶)

اس رائے کے برخلاف کہا جاتا ہے کہ شریعت اسلامی زنا کے جرم کو ایسا خطرناک جرم تصور کرتی ہے کہ بدکار شادی شدہ ہو تو سنگسار کرنے اور غیر شادی شدہ ہو تو سو کوڑے بطور سزا تجویز کرتی ہے، اس کے باوجود زانیہ کے رحم میں پلنے والے رحم کا تحفظ کرتی ہے اور ڈلیوری تک سزا موخر کرتی ہے۔ محترمہ غامدیہ کے واقعہ سے یہ سبق ملتا ہے کہ جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پتہ چلا کہ وہ حاملہ ہیں تو وضع حمل تک سنگساری کو ملتوی فرمایا۔ (صحیح مسلم ۱۶۹۵، اجہاض الحمل شومان ۵۴)

نفخ روح سے پہلے معقول عذر پائے جانے کی صورت میں اسقاط کے جواز کے قائل عصر حاضر کے علماء بھی ہیں ان میں نمایاں نام ڈاکٹر یوسف القرضاوی، ڈاکٹر وہبہ زحیلی، شیخ محمود شلتوتؒ کا ہے۔ سعودی عرب کی ہیئت کبار العلماء (علماء بورڈ) کا فتویٰ بھی یہی ہے۔ ہندوستان کے مفتیان کرام کی رائے بھی یہی ہے۔ (فتاویٰ معاصرہ ۲/۵۴۷، الفقہ الاسلامی و ادلتہ ۳/۵۵۶، الاسلام عقیدۃ وشریعۃ ۲۰۴، فتویٰ ۱۴۰، فتاویٰ رحیمیہ، فتاویٰ دار العلوم دیوبند)

(۴) اسقاط بہر صورت حرام ہے: یہ رائے جمہور مالکیہ اور جمہور شوافع اور اہل ظاہر کی ہے، یہ ہر صورت میں اسقاط کی حرمت کے قائل ہیں۔ (بدایۃ المجتہد ۴/۳۳۵، حاشیہ دسوقی ۲/۲۶۶، بلغۃ السالک ۴/۱۹۱، نہایۃ المحتاج ۸/۴۱۶، المحلی ۱۱/۳۱)

امام غزالیؒ، علامہ ابن تیمیہؒ اور ابن رجب حنبلیؒ کی بھی یہی رائے تھی، ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ جب نطفہ نے استقرار پالیا تو وہ انسانی وجود میں ڈھلنے اور نفخ روح کے مرحلے تک پہنچنے کا ذریعہ بن چکا، اس لئے اسقاط کی اجازت وجود میں آنے والے انسان کی تخلیق روکنے کے مترادف ہے۔

جمہور اس دلیل کے جواب میں کہتے ہیں کہ شریعت نے ہمیشہ ضرورت کا خیال رکھا ہے، اس لئے اگر ضرورت اسقاط کی متقاضی نفخ روح سے پہلے ہو یا بعد میں اس کی رعایت رکھی جائے گی کیوں کہ اصولی اعتبار سے مصلحت ومفسد کی صورت ہے لیکن ماں کی جان بچانا

تقاضائے مصلحت ہے، اس لئے اسقاط حمل کی اجازت دی جائے گی۔

ایڈز کی وجہ سے اسقاط:

زچہ وبچہ کے مخصوص حالات اسقاط کا جواز پیدا کرتے ہیں ورنہ حقیقت حرمتِ اسقاط ہے۔ جیسے شدید عذر کی حالت ورنہ محض ماں کی خواہش وتمنا کی بنیاد پر اسقاط کی اجزت ہرگز نہ ہوگی، یہ خیال رہے کہ فقہ معاصر نے اسقاط کے متعلق تمام نظریات وافکار کا باریک بینی سے جائزلیا ہے، جیسے منصوبہ بندی اور تحدید نسل کے طور پر اسقاط کو اپنانا، یا بدکاری کی پردہ داری کے مقصد کے لئے یا اغوا کے نتیجے میں ٹھہرنے والے حمل کے متعلق تفصیلات جمع کردی گئیں ہیں۔

مضمون کا محور ایڈز کا شکار ہونے کی صورت میں جواز اسقاط ہے۔ ایڈز کے وائرس، لعاب، آنسو، ماں کا دودھ، مادہ منویہ، نسوانی ایام کے دورانیہ، سیلس، خون اور ہڈیوں کے گودے میں پائے جاتے ہیں اور یہ وائرس ایک انسان سے دوسرے انسان میں جنسی عمل، خون چڑھانے سے منتقل ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایڈز زدہ ماں کے بچے میں جس طرح منتقل ہوتے ہیں اسی طرح ایڈز زدہ باپ کے زریعے بھی بچے میں منتقل ہوتے ہیں۔ ماں کے دودھ کے وائرس بھی بچے کو ایڈز کی زد میں لے لیتے ہیں۔ عین پیدائش کے وقت بھی بچے میں سرایت کر سکتے ہیں۔ (تنظیم النسل، طریقہ ۲۱۵/۲۱۶، اجہاض الحمل شومان ۵۶، فقہ الضرورۃ وتطبیقاتہ المعاصرہ، ڈاکٹر ابوسلیمان ۶۴-۶۶)

ایڈز کے خطرات اور پیچیدہ حالات کے تئیں اہل علم کی یہ رائے بنتی ہے کہ ایڈز زدہ خاتون کے حمل کا اسقاط اس صورت میں درست ہے جب میڈیکل رپورٹ کی مدد سے پتہ چل جائے کہ جنین نفخ روح سے پہلے ہی ایڈز کے پنجوں میں جکڑ چکا ہے تا کہ ننھا وجود ایڈز کی دقتوں کا مقابلہ نہ کرے، کیوں کہ طبی تجربات بتاتے ہیں کہ ایسا بچہ جو شکم مادر میں رہتے

ہوئے ایڈز کی زد میں آچکا ہے وہ پیدا ہونے کے بعد چند ہی دنوں کا مہمان ہے۔

یہ طے ہے کہ ایڈز کے وائرس جنین میں دورانِ حمل منتقل ہونے کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں، بہ مشکل دس فیصد اوسط ہے اور یہ دس فیصد تعداد بھی حمل کے آخری مہینوں میں شکار ہوتی ہے۔ البتہ اگر طبی رپورٹ اس مرحلے میں ایڈز کے وائرس حمل میں پائے جانے کی تصدیق کردے جس مرحلے میں اسقاط کی شرعاً گنجائش ہے تو اسقاط جائز ہوگا۔ یاد رہے کہ یہ حکم اس پر مبنی ہے کہ ہمارے ذرائع علم بتاتے ہیں کہ ابھی تک ایڈز کا علاج دریافت نہ ہوسکا ہے۔ اگر علاج تک رسائی ہوجائے تو یہ حکم باقی نہیں رہے گا۔ یہ ضرور ہے کہ ماں کی زندگی کی و مصلحتوں کی خاطر اس متعین صورت میں اسقاط کا مشورہ دیا جائے گا، کیوں کہ یہ حقیقت ہے کہ حمل کے دوران دبا ہوا مرض ابھرنے لگتا ہے اور بہت جلد ظاہر ہوجاتا ہے۔ حاملہ عورت کی امید کے ساتھ اسقاط کی کارروائی کی اجازت دی جائے گی۔ (مقالہ ڈاکٹر جاسم علی سالم الاصابہ بمرض فقد المناعۃ المکتسبۃ واحکام المعاملات ۱۹۷، ۱۹۸)

حاملہ جب اس پوزیشن میں ہو کہ اگر اس کے حمل کا اسقاط نہ کیا جائے تو اس کی جان بچنے کی امید نہ رہے تو اسقاط درست ہوگا، اس لئے کہ ماں کی زندگی درجۂ یقین میں ہے اور حمل کی زندگی موہوم ہے اور یقینی کے حصول کے لئے ظنی کی قربانی شرعاً معتبر ہے۔ (حوالہ بالا)

اسقاط کی اجازت کا مشروط حکم اس صورت کا بتایا گیا ہے جب ماں کی جان خطرے میں ہو، دوسری صورت اسقاط کی جنین کے معاملے میں زیر بحث آتی ہے تو شرعی نقطۂ نظر سے اسقاط کے ذریعہ حمل کی زندگی کے خاتمے کی اجازت نہیں ہوگی۔

(الف) حاملہ ایڈز کے وائرس حمل میں جان پڑنے یا پیدائش کے وقت ہی عام طور پر منتقل ہوتے ہیں اور حمل انسان کے قالب میں ڈھل چکا ہوتا ہے، اس وقت اسقاط کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ (او آئی سی فقہ اکیڈمی کی قرارداد اس کی تائید کرتی ہے۔ (O.I.C

(ب) زیر بحث صورت میں اسقاط کے لئے مسئلے میں اصول فقہ کے حساب سے مصلحت اور رمفسدہ کے مابین ٹکراؤ ہو رہا ہے کہ باقی رکھا جائے یا ضائع کیا جائے، باقی رکھنے میں حمل کی زندگی کے حق کا تحفظ پایا جاتا ہے، البتہ یہ خدشہ بھی پایا جاتا ہے کہ اس حال میں پیدا ہو کہ ایڈز کی بیماری اس کے اندر موجود ہو، جبکہ یہ بھی امکان ہے کہ وہ زندہ رہے اور زندگی کا فائدہ اٹھائے، لمبی عمر پائے، ایمان وعمل صالح کی توفیق پائے، حق کی سربلندی کے لئے کوشاں رہے، مخلوق کو فائدہ پہنچائے، اس لئے کہ اس کے سر پر ہمیشہ ایڈز کی تلوار موت کی شکل میں لٹک رہی ہے۔ (تو وہ زندگی کے ہر لمحے کو قیمتی بنانے کی کوشش کرے گا) اصول فقہ کا قاعدہ ہے کہ جب ایک معین عمل میں مصلحت ومفسدہ (فائدہ ونقصان) اس طرح جمع ہوجائیں کہ نہ مصلحت کے حصول پر قدرت ہو نہ مفسدے کے دور کرنے پر قوت ہو اور مصلحت مفسدے کے مقابلے میں زیادہ اہم ہو تو مصلحت کو ترجیح حاصل ہوگی۔ (الاشباہ والنظائر، ابن وکیل ۲/۵۰ مختصر القواعد الصغری بن عبد السلام ۱۸۸)

(ج) ایڈز کا شکار حمل کو ساقط نہ کرنے میں ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ ممکن ہے کہ ولادت تک ایڈز کا علاج دریافت ہوجائے کیوں کہ میڈیکل ریسرچ برابر جاری ہے اور میڈیکل سائنس میں آئے دن انقلاب آتے رہتے ہیں، کتنے لاعلاج امراض کے علاج ڈھونڈ لئے گئے۔ اس پس منظر میں کیا عجب ہے کہ ایڈز کا علاج بھی اللہ قادر مطلق ظاہر فرمادے۔

(مضمون نگار جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند کے شعبۂ افتاء کے صدر ہیں)

☆☆

دارالعلوم دیوبند کا قضیۂ اہتمام اور مولانا غلام محمد وستانوی صاحب پر الزامات اعتراض کی حقیقت

● مولانا نسیم احمد غازی مظاہری

زیر نظر مضمون قضیۂ دارالعلوم کے دوران تحریر کیا گیا تھا۔ مضمون میں حضرت مولانا غلام محمد وستانوی صاحب پر عائد کئے گئے الزامات کی پرزور تردید کی گئی ہے اور بجا طور پر دارالعلوم کے منصب اہتمام پر ان کے تقرر کو صحیح قرار دیا گیا ہے، لیکن بدقسمتی سے حضرت مولانا غلام محمد وستانوی کو منصب اہتمام سے ہٹا دیا گیا۔ مضمون میں جو حالات وواقعات پیش کئے گئے ہیں اور جس دردمندی کا اظہار کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ مضمون کی افادیت برقرار رہے گی۔ اگرچہ مضمون نگار کا لہجہ کہیں کہیں بہت تلخ ہوگیا ہے لیکن جن حضرات جبہ ودستار کے لئے یہ تلخی ہے وہ ایک مدت سے قوم کی گردنوں پر بزور وتقویٰ وطاقت سوار ہیں اس لئے تلخیاں گوارا کی جاسکتی ہیں۔ (ادارہ)

حامداً ومصلیاً ومسلماً! امابعد!

دینی مدارس اور علماء حق کا وجود باوجود مخلوق پر رحمت خداوندی کا گھنا سایہ ہے خصوصاً دارالعلوم دیوبند ہزاروں اہل اللہ کی دعاؤں، تمناؤں اور آرزوؤں کا مظہر اور اس کا عالم گیر فیض مسلسل، اس کے مختلف بانیوں اور اس کے متدین کارپردازوں کی مخلصانہ جدوجہد اور عظیم قربانیوں کا نتیجہ وثمر ہے، دارالعلوم دیوبند اور اس جیسے دینی ادارے اور علمی مراکز ان اولیاء اللہ اور علماء ربانیین کے حسین خوابوں کی واقعی تعبیر اور ان مخلص مجاہدین اسلام کے مصمم

مجموعہ القاسم: جلد پنجم
مسلم مسائل اور اس کا حل

عزائم کی نورانی تصویر ہے جنہوں نے ہندوستان میں بقائے اسلام کے لئے بے دریغ قربانیاں پیش کی تھیں، آج دارالعلوم دیوبند پورے عالم کو علم وعرفان کے آب حیواں سے سیراب وفیضیاب کرنے کے لئے رواں دواں ہے، یقیناً وہ ایک نورانی والہامی معتبر ومؤقر دریائے فیض ہے جو تشنگانِ علم وعمل کی سیرابی کے لئے شب وروز جاری وساری ہے۔

یہ وہ عظیم الشان علمی وعرفانی ادارہ ہے جس کے اہل حل وعقد، اساتذہ وطلبا کا منجانب اللہ انتخاب ہوتا ہے، ہاں بسا اوقات شومئی قسمت سے ناشائستہ تدبیروں کے ذریعہ چور دروازوں سے کچھ اجنبی ومفسد مزاج لوگ یہاں آکر خیمہ زن ہوجاتے ہیں۔ یہ تلامذۂ ابلیس اپنی حرص وہوس کو پورا کرنے کے لئے پاکیزہ وپرامن ماحول کو گندہ وپراگندہ کرکے دارالعلوم اور اس کے مسلک ومشرب کو رسوا وبدنام کرنے کی نامسعود کوششیں کرتے ہیں لیکن قدرتی طور پر جلد یا بدیر ایسے لوگوں سے یہ مقدس سرزمین پاک وصاف ہوجاتی ہے اور فسادی عناصر خود ہی رسوا وذلیل ہوکر اس مقدس سرزمین سے بے دخل ہوجاتے ہیں۔

ارباب شوریٰ:

یہاں کے ارباب شوریٰ ملک کے ایسے علماء ربانیین ومشائخ حقانی اور متدین ومعتبر حضرات ہوتے ہیں جو صاحب الرائے اور صائب الرائے ہونے کے ساتھ دارالعلوم کے ہمدرد وخیرخواہ اور مسلک دیوبند میں مستحکم ومضبوط اور صلاح وصلاحیت سے مالا مال ہوتے ہیں، اراکین شوریٰ بہت ہی غور وخوض کے بعد مذکورہ اوصاف سے متصف کسی شخصیت کو رکن کی حیثیت سے شوریٰ میں شامل فرماتے ہیں، البتہ گاہے نا قابل بیان اسباب واغراض کے تحت بعض فاسد المزاج اور خالص سیاسی لوگوں کی یہاں دراندازی اور گھس پیٹھ ہوجاتی ہے جس میں سیاست یا شخصیت پرستی کو دخل ہوتا ہے جس کا خمیازہ ارباب دارالعلوم اور خود دارالعلوم کو بھگتنا پڑتا ہے اور یہی فساد جاہ طلبی کے عفریت کی شکل میں رونما ہوکر انتشار

وخلفشار کی قیامت بپا کر دیتا ہے جس سے رواں دواں نظام درہم برہم اور سکون واطمینان کا ماحول اتھل پتھل ہو جاتا ہے جس سے دارالعلوم اور اس کے مسلک ومشرب کی بے عزتی ورسوائی کا موقع دشمنوں اور بدخواہوں کے ہاتھ آجاتا ہے اور اس کی تخریب میں خوب دلچسپی لے کر اپنی بھڑاس نکال لیتے ہیں، لیکن ہر بار بفضلہٖ تعالیٰ یہ شیطانی حملہ اور اولادِ ابلیس کی نامسعود کوشش ناکامی کا منہ دیکھ کر ختم ہو جاتی ہے اور حالات پرسکون اور نظام تعلیم وتعمیر اپنے سابقہ حالات کی جانب عود کر کے الآن کما کان کا منظر پیش کر دیتا ہے۔

حادثۂ فاجعہ اور انتخاب نو:

ماضی قریب میں دارالعلوم کے ایک مخلص خادم کارگزار مہتمم صاحب اور ان کے بعد اکابر کی یادگار معمر وتجربہ کار امین اور دیانت دار مہتمم صاحب دنیا سے کوچ فرما گئے جو اس عظیم ادارہ کا بڑا نقصان تھا، دارالعلوم کے صدر مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن بجنوری کی وفات حسرت آیات کے بعد دارالعلوم کے اس جلیل القدر عہدہ کو پر کرنا ایک اہم مسئلہ تھا، اراکین شوریٰ اس سلسلہ میں بہت ہی فکر مند تھے، چنانچہ ان حضرات نے بڑے غور وخوض اور صلاح ومشورہ کے بعد ایک ایسی فقید المثال جلیل القدر اور معیاری شخصیت کو اس صدارت اہتمام کے ذی شان عہدہ کے لئے منتخب فرما کر باقاعدہ حتمی فیصلہ فرمادیا کہ کم از کم اہل شوریٰ میں کوئی دوسرا شخص ان گوناگوں خصوصیات کا حامل نہیں تھا جو حق تعالیٰ نے نو منتخب مہتمم مولانا غلام محمد وستانوی کو اپنے فضل وکرم سے عطا فرمائی ہیں، وہ تقریباً جواں سال وقوی وامین ہونے کے باوصف جواں ہمت متدین عالم وفاضل متحمل مزاج ملنسار وسیع النظر بااخلاق مشائخ وقت سے تربیت یافتہ شیخ طریقت حضرت مولانا صدیق احمد صاحب باندوی کے باقاعدہ مجاز بیعت وخلیفہ برحق اور بلند حوصلہ باوقار تجربہ کار مربی ومنتظم ہیں۔

وہ اپنے اوصاف حمیدہ، خدمات جلیلہ کی بنا پر ہند وبیرون ہند مقبول ومعتبر اور مشہور

شخصیت ہیں، وہ اپنے قائم کردہ عظیم ادارہ کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ ان کا ادارہ دارالعلوم دیوبند سے بڑا ادارہ ہے جس کے تحت سیکڑوں مدارس مولانا وستانوی کی نگرانی وسرپرستی میں تعلیمی، تبلیغی اور اصلاحی بیش بہا خدمات انجام دے رہے ہیں، ان کے قائم کردہ میڈیکل کالجز اور اسکول بھی امت کی خدمات میں مصروف ہیں، انہوں نے ہزاروں مساجد تعمیر کرا کر اپنے لئے صدقات جاریہ کے دریا بہادئے ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ مدارس ومکاتب، مساجد اور دینوی اداروں کا ایک وسیع وعریض نظام ان کی سرپرستی ونگرانی میں صحیح نہج پر شاہراہ ترقی پر گامزن ہے اور امت مسلمہ ان کے گوناگوں فیوض سے فیضیاب ہو رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ دارالعلوم کے اہتمام کے محتاج نہیں بلکہ دارالعلوم کو ان کی ضرورت ہے اور دارالعلوم کیونکہ اکابر ومشائخ کی ایک عظیم امانت ہے اس لئے وہ اس کی خدمت کو اپنی سعادت سمجھتے ہیں اور اس کی ہمہ نوع ترقیات کے خواہش مند بھی ہیں۔ مولانا وستانوی صلاح وصلاحیت، انتظام وانصرام کی قابلیت اور اپنی قوت فعالیت میں اپنی مثال آپ ہیں ہی اس کے علاوہ چار زبانوں اردو، گجراتی، انگلش اور عربی میں پوری مہارت رکھتے ہیں اور چاروں زبانوں میں تقریر وتحریر کے ذریعہ اپنے مافی الضمیر کو مؤثر طریقہ پر ادا کر سکتے ہیں اس انفرادیت میں بھی کوئی دوسرا ان کا شریک وسہیم نہیں ہے۔

اہتمام دارالعلوم دیوبند کے اس عظیم عہدہ کے لئے موصوف کا انتخاب ارباب شوریٰ کی ہوشمندی ودانائی اور دارالعلوم سے والہانہ تعلق وخیرخواہی کی دلیل ہے، تمام بہی خواہان وہمدردان دارالعلوم اور ملت اسلامیہ کا ہوشمند طبقہ اس صحیح انتخاب پر مسرور ومطمئن ہے اور سبھی حضرات اس سے دارالعلوم کے تابناک مستقبل کی توقع رکھتے ہیں۔

خود غرض حاسدین کی ناگواری:

مگر کچھ خود غرض اہل سیاست اور جاہ طلب لوگ شوریٰ کے اس عمدہ فیصلے پر راضی نہیں ہوئے حالانکہ یہ لوگ جو شوریٰ کو ''ہیئت حاکمہ'' مانتے ہیں اور اس کے فیصلوں کو واجب

العمل تسلیم کرتے ہیں، ظاہر بات ہے کہ ان کے نزدیک امیر کا مقام شوریٰ کو حاصل ہے اور امیر کی اطاعت رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ہے اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے اور امیر کی نافرمانی اللہ کے رسول کی نافرمانی ہے اور پیغمبر اعظم ﷺ کی نافرمانی اللہ جل شانہ کی نافرمانی ہے۔ جیسا کہ حدیث صحیح میں وارد ہے، لیکن جب جاہ نے سب کچھ بھلا دیا یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے ماضی میں علماء حق اور مسلک حق کو بدنام ورسوا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی ایسے جاہ پرستوں کو یہ انتخاب اور شوریٰ کو یہ مؤمنانہ فیصلہ گوارا نہ ہوا اس لئے انہوں نے گوریلا انداز میں اپنی نازیبا تدبیروں اور ناروا سازشوں کا جال ملک بھر میں پھیلا دیا اس طرح نومنتخب کو ہی نہیں بلکہ دارالعلوم اور اس کے مسلک حق اور ارباب شوریٰ کے لئے ذلت ورسوائی کا سامان مہیا کردیا نیز بدخواہوں، دشمنوں اور حاسدوں کے لئے بھی اہل حق کی اہانت وتحقیر کا موقع فراہم کردیا، چنانچہ ایسے لوگوں نے اس مسئلہ میں خوب خوب دلچسپی لی اور عداوت کا حق ادا کردیا، ابتداء میں نامعقول اور فرضی اعتراضات کے رکیک حملے کرائے گئے اور پھر بھولے بھالے ناعاقبت اندیش طلبا کو اکسا کر اور لالچ دے کر ان کے دل ودماغ میں زہریلے اور سیاسی اثرات بھر کر ان کو اپنے ناجائز مقصد کے لئے تیار کرلیا گیا۔ ان کو اربابِ شوریٰ منتظمین اور اساتذہ کرام کی توہین وتذلیل کے لئے استعمال کرکے ان کے روشن مستقبل کو تاریک بنادیا گیا ان رکیک اور بیہودہ اعتراضات میں سے تین اعتراضات کو خوب خوب اچھال کر عومی سطح پر دارالعلوم اور علماء دارالعلوم کو رسوا اور ذلیل وبدنام کرنے پر پورا زور خرچ کیا گیا۔ ذیل میں ہم ان اعتراضات کا صحیح جائزہ پیش کرتے ہیں:

(۱) مظاہریت کا داغِ نازیبا:

اولاً تو کچھ متعصب مزاج کچھ طبع نادانوں نے کہا کہ وہ مظاہری ہیں گویا مظاہریت کو داغ نازیبا قرار دے کر ان کو نااہلیت کا سٹیفکیٹ دینے کی نامسعود کوشش کی گئی گویا وہ ایسے

اچھوت ہیں کہ دارالعلوم کی مقدس سرزمین کے لائق نہیں ہیں۔ یہ نادان اور مسکین دارالعلوم ومظاہر علوم کی عظمت اور بلند حیثیت سے نابلد ہیں ان بیوقوفوں کو ان دونوں درسگاہوں کی تاریخی حیثیت بھی معلوم نہیں۔ یاد رکھئے کہ دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔ یہ دونوں ادارے آسمان علم وعرفاں کے آفتاب ومہتاب ہیں، ملت اسلامیہ کی سر کی دو آنکھیں ہیں اور مسلک برحق کے دل ودماغ ہیں، ایک کا وجود دوسرے کے بغیر نامکمل وناتمام ہے، یہ دونوں ادارے اپنے آغاز سے آج تک ہم رنگ وہم آہنگ رہے ہیں، ہمیشہ یہ دونوں ایک دوسرے کے معین ومددگار اور ہمدرد وبہی خواہ رہے ہیں ان دونوں کے نظریات میں کبھی کوئی فرق نہیں رہا۔

دیوبند، سہارنپور، گنگوہ، تھانہ بھون وغیرہ نے مشائخ واساطین، علماء ربانیین اور صلحاء متقین دونوں اداروں کے سرپرست ونگراں شریک کار اور اراکین شوریٰ رہے ہیں۔ ان سب بزرگانِ دین اور اقطاب واغواث واولیاء کے فیوض وبرکات سے یہ دونوں ادارے ترقیات کے بام عروج پر پہنچے اور بارانِ رحمت بن کر پورے عالم پر برسے ہیں، حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ بیک وقت دارالعلوم ومظاہر علوم کے سرپرست تھے، گو اخیر میں سیاسی دخل اندازی سے ناخوش ہوکر دارالعلوم کی ظاہری سرپرستی سے دست بردار ہوگئے تھے مگر تادم واپسی دارالعلوم کے بہی خواہ رہے اور مظاہر علوم کے باقاعدہ سرپرست رہے۔ قطب الارشاد حضرت گنگوہی بھی تاحیات دونوں اداروں کے سرپرست رہے، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب دارالعلوم کے بہترین استاد رہے۔ گنگوہیؒ کے حکم سے مظاہر علوم کے مدارالمہام مہتمم اور محدث بنے، حضرت شیخ الہند محدث دارالعلوم کے والد محترم حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب مظاہر علوم کے سرپرست وشریک اہتمام رہے۔ قطب العالم شارح حدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب محدث مظاہر علوم دارالعلوم کے رکن شوریٰ رہے اور اب حضرت علیہ الرحمہ کے صاحبزادہ حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب دارالعلوم کی

شوریٰ کے رکن ہیں۔ دوسرے رکن مولانا منظور احمد صاحب کانپوری مظاہری ہیں اور خود مولانا وستانوی صاحب بھی مظاہری ہیں اور رکن شوریٰ بھی ہیں اور آگے دیکھئے صدر دارالافتاء دارالعلوم بھی مظاہری ہیں بلکہ صدر المدرسین دارالعلوم نے زیادہ تر مظاہر علوم میں پڑھا اور ناظم اعلیٰ مظاہر علوم حضرت مفتی مظفر حسین صاحب المظاہری کے وہ خلیفہ ومجاز بیعت ہیں، شعبۂ قرأت کے صدر القراء حضرت مولانا ابرارالحق صاحب مظاہری کے مجاز بیعت وخلیفہ ہیں، علامہ قمرالدین صاحب دارالعلوم کے اہم استاذ بھی اوران ہی کے مجاز وخلیفہ ہیں۔ اگر مظاہری ہونا داغ نازیبا اور نااہلیت کی علامت ہے تو ان سب کو دارالعلوم کے اہم عہدوں پر فائز کرنا اور شوریٰ کے اراکین میں شامل کرنا بھی، تو ان کا تقرر کرنے والوں کی نااہلیت کی کھلی دلیل ہے اور اگر ان کے تقررات درست ہیں تو عہدۂ اہتمام کے لئے انتخاب کیوں باعث اشکال ووجہِ اعتراض ہے کیا یہاں یہ مثل صادق نہیں آتی کہ ’’گڑ کھاؤ اور گلگلوں سے پرہیز‘‘۔

مظاہریت شجر طوبیٰ ہے جہاں جہاں یہ نسبت ہے وہاں وہاں جنت ہے:

آیئے ہم آپ کو دارالعلوم ومظاہر علوم کی ابتدائی تاریخ کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں، اعتراض کرنے والے مسکینوں کو اپنی تاریخ کا بھی پتہ نہیں، خدارا تعصب کے تاریک ومنحوس گھروندہ سے باہر نکل کر دارالعلوم ومظاہر علوم کے ابتدائی ریکارڈوں، رودادوں اور رجسٹروں کا معائنہ کیجئے تو آپ کی رسائی ایک حیرت انگیز حقیقت تک ہوگی، مظاہر علوم کے بانی اول حضرت سید احمد شہید بریلویؒ کے رفیق ’’فقیہ سہارنپور‘‘ حضرت مولانا مفتی سعادت علیؒ ہیں۔ ان کے تلامذہ کے تلامذہ تمام اکابر ہیں۔ حضرت حجۃ الاسلام قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانیٔ دارالعلوم دیوبند، محدث اعظم حضرت مولانا احمد علیؒ محشی بخاری وبانیٔ ثانی مظاہر علوم کے شاگرد رشید ہیں۔ حضرت محدث اعظم کی وفات کے بعد حاشیہ

بخاری کی تکمیل بھی حضرت نانوتوی بانیٔ ثالث مظاہر علوم سہارنپور بھی آپ کے اساتذہ میں ہیں، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ محدث اول وصدر مدرس اول دارالعلوم دیوبند بھی انہیں کے شاگرد رشید ہیں، اسی طرح حضرت مولانا محمد علی صاحب مونگیریؒ بانی ندوۃ العلماء لکھنؤ بھی انہیں بانیان مظاہر علوم کے شاگرد ہیں۔ امام الصوفیاء سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ بھی بانی مظاہر علوم حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نانوتویؒ کے شاگرد ہیں جو حضرت گنگوہیؒ، حضرت نانوتویؒ اور حضرت تھانویؒ کے پیر ومرشد ہیں۔ اس طرح مسلک دیوبند کے مدارس دارالعلوم اور ندوہ وغیرہ کے سبھی حضرات علم وعرفان، تصوف وسلوک میں ’’فقیہ سہارنپور‘‘ اور ان کے تلامذہ اور دیگر بانیان مظاہر علوم کے فیوض علمیہ وعرفانیہ سے مستفیض ہیں۔ کوئی قاسمی یا ندوی مظاہر علوم کے فیض سے محروم نہیں اور جو مظاہر علوم سے چڑھتا ہے وہ صحیح معنی میں قاسمی اور ندوی ہو ہی نہیں سکتا۔ جب دارالعلوم کے نودرہ کی الہامی تعمیر کی بنیاد رکھی گئی تو حضرت نانوتوی نے بنیاد کی پہلی اینٹ اپنے استاذ گرامی حضرت مولانا احمد علیؒ محدث وبانی مظاہر علوم سے رکھوائی اور تیسری اینٹ حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نانوتویؒ محدث وبانیٔ مظاہر علوم سے رکھوائی۔

عربی مدرسہ سہارنپور حضرت فقیہ سہارنپور وقاضی شہر حضرت قاضی فضل الرحمٰن صاحب رفقاء حضرت سید احمد شہید بریلویؒ کی نگرانی وسرپرستی میں محلّہ قاضی کی مسجد میں چلتا رہا۔ تقریباً ۸ سال کے بعد ۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد کے ۶ ماہ بعد مدرسہ قدیم نامی عمارت میں منتقل ہوا اور حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نانوتویؒ کے نام نامی سے استبراک ونسبت کرکے اس کا تاریخی نام ’’مظاہر علوم‘‘ رکھا گیا اور اسی سال مدرسہ قدیم کی تعمیر اور مسجد کی تکمیل ہوئی تو حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوریؒ کی فرمائش پر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے تین گھنٹہ وعظ فرما کر مدرسہ قدیم اور اس کی مسجد کا افتتاح فرمایا یہ سب اکابر آپس میں شیر وشکر تھے۔ غیریت واجنبیت بالکل نہ تھی یہ سبھی اساطین امت حضرت

حاجی امداد اللہ صاحب کی امارت میں جہاد شاملی میں انگریزی فوجوں سے نبرد آزما ہوئے جس میں حضرت حافظ محمد ضامنؒ شہید ہوئے اور حضرت نانوتویؒ کی کنپٹی پر گولی لگی اور بچ گئے۔ حضرت مولانا محمد مظہر صاحب کی ران میں انگریز کی گولی لگی تو بیہوش ہوکر گر پڑے اسی حالت میں ان کو جنتی حور نے جنتی شربت پلا دیا جس کا مزہ پوری زندگی باقی رہا۔ حاصل یہ ہے کہ ہر قاسمی اور ندوی علم وسلوک میں مظاہر علوم کے فیوض سے ضرور مالا مال ہے۔ جب صورت حال یہ ہے کہ تو کیا ان اکابر میں تفریق یہودیت نہیں ہم سمجھتے ہیں کہ کوئی یہودی المزاج ہی ان علماء ربانین میں اور دار العلوم اور مظاہر علوم میں تفریق کا قائل ہوگا لا نفرق بین احد من رسله کے قائلین وارثین انبیاء میں بھی تفریق نہیں کریں گے۔ ہاں یہودی المزاج لوگ نومن ببعض و نکفر ببعض کے ضرور عادی وقائل رہیں گے۔

فیضان علم حدیث کا سمندر:

یہ حقیقت بھی اظہر من الشّمس ہے کہ مظاہر علوم سہارنپور علم حدیث کا وہ سمندر ہے جس سے نکلنے والے دریا پورے عالم کو سیراب کر رہے ہیں اور یہ اس کی اپنی انفرادی شان ہے۔ بانی مظاہر علوم محدث اعظم حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ نے دہلی میں اپنا احمدی پریس جاری کیا جس سے کتب حدیث خصوصاً صحاح ستہ ہندوستان میں پہلی بار تصحیح وتحشیہ سے مزین کر کے شائع ہوئیں جن سے تمام مدارس عربیہ اسلامیہ اور ان کے علماء وطلبا فیضیاب ہیں۔ خواہ وہ مدارس اور کسی بھی فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں۔ اس فیضان مظاہر سے سبھی مالا مال ہیں پھر محدثین مظاہر علوم نے تمام کتب حدیث پر تشریح وتوضیح تراجم واسماء رجال وغیرہ پر وہ کار ہائے نمایاں انجام دئے ہیں جن کی نظیر پورے عالم میں ناپید ہے، کسی بھی فرقہ کے علماء طلبا ہوں سبھی ان کی خدمات سے مستفیض ومستفید ہوتے ہیں۔ ہرگز ان کی مؤلفات سے مستغنی وبے نیاز نہیں ہو سکتے۔ ماضی قریب میں قطب عالم حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر

مدنیؒ نے تن تنہا حدیث کی وہ عظیم خدمات انجام دی ہیں جو ایک بڑی جماعت محدثین انجام دے سکتی تھی جس سے دنیا کے تمام علماء وطلبا فائدہ اٹھاتے رہے ہیں، ہم ان امور کے اظہار پر بجا طور پر فخر کرتے ہیں اور ان تنگ نظر متعصبین کی آنکھیں کھول دینا چاہتے ہیں جو اندھے نسبت مظاہریت کو ایک داغ نازیبا سمجھتے ہیں وہ یقیناً اپنے محسنین کے احسانات کا کفران اور ناقدری کر رہے ہیں، اسی کو ہندوستان میں نمک حرامی سے تعبیر کرتے ہیں۔

بہرحال مولانا وستانوی کے لئے بھی یہ نسبت شریفہ اسی طرح تاج عزت اور سرمایۂ افتخار ہے جس طرح بانی دار العلوم اور ان کے جانشین بیٹے اور ان کے پوتے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے لئے (کہ وہ بھی حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ محدث مظاہر علوم کے شاگرد رشید تھے) سرمایۂ افتخار تھی اس لئے مولانا وستانوی پر اعتراض کہ وہ مظاہری ہیں انتہائی نامعقول اور معترضین کی نادانی وجہالت اور تعصب اور حسد کا ثبوت ہے۔

دوسرا اعتراض:

دوسرا اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ انہوں نے مودی ظالم کی تعریف کردی یہ اعتراض بھی انتہائی مہمل ہے اس کا سر پیر نہیں۔ ہوا یہ تھا کہ مولانا وستانوی سے گجرات کے حالات اور مودی کے رویہ کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمادیا کہ اب حالات ٹھیک ہیں اور مودی کی پارٹی اب صحیح کام کر رہی ہے اور یہ بات اپنی جگہ پر ایک حقیقت ثابتہ ہے۔ اس کے برعکس صریح جھوٹ تھا، جس کا وستانوی صاحب نے ارتکاب نہیں کیا، یاد رہے کہ اس بیان میں نہ انہوں نے مودی کی تعریف کی نہ اس سے ظلم کے دن دھوئے، صرف موجودہ صورت حال کا بیان کیا تھا جس کو میڈیا نے اپنی روش کے مطابق توڑ مروڑ کر بیان کردیا تو یہ قصور وستانوی صاحب کا نہیں میڈیا کا ہے۔ ایک مسلمان اور عالم دین ہونے کی حیثیت

سے وستانوی صاحب کو وہی سچی بات کہنی ضروری تھی جو انہوں نے کہی ہے۔ اگر کسی مریض کی حالت بہت نازک ہوگئی اور وہ موت کے منھ میں پہنچ گیا پھر اس کو افاقہ ہوگیا تو کیا افاقہ کی حالت میں بھی اس کی حالت کو نازک ہی قرار دیا جائے گا؟ بس اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا۔ اخبارات نے، بدخواہوں نے، جاہ طلب حاسدوں نے اس کو خوب اڑایا اور عوام کو بھڑکا کر ان سے بدظن کرنے کی نامسعود کوششیں کیں اور وضاحت اور معذرت کے باوجود ان کا یہ جرم معاف نہیں کیا گیا۔ دوسری طرف بنظر انصاف دیکھیں تو لوگ نصف صدی سے اس ظالم کانگریس کی حمایت واعانت کرتے نظر آتے ہیں جس نے ہزاروں فسادات کرائے، مسلمانوں کی املاک تباہ وبرباد کر دیا، مگر بھولی قوم مسلم نے ان ظالموں کے مددگاروں کا دامن نہیں چھوڑا، اگر ایک لیڈر ایک کافر کو تاجدار دو عالم ﷺ کے برابر قرار دیتا ہے، قبر پر چادر چڑھا کر مسلک دیوبند کا منھ کالا کرتا ہے، الیکشن کے موقع پر ملت کی کثیر رقم کی شراب پلاتا ہے، تو دوسرا کافر کے لئے تعظیمی نعرے لگاتا ہے، کوئی تلک کا قشقہ لگا کر کفر کی تائید کرتا ہے، ترنگے کے سامنے دست بستہ کھڑا ہو کر اس کی ڈنڈوت کرتا نظر آتا ہے، تو کوئی کفار کی ارتھیوں پر قرآن مقدس کی تلاوت کراتا ہے، سنیما کا افتتاح قرآن خوانی سے کراتا ہے اور کوئی طلبا دارالعلوم دیوبند کو رائفل کی گولیوں سے بھون ڈالتا ہے اور ان کے خون کی ہولی کھیلتا ہے، حکیم الاسلام کے قتل کی سازش تیار کی جاتی ہے، مفتی محمد ساجد کو صرف اس لئے قتل کر دینے کا پروگرام بنایا جاتا ہے کہ اس نے دیوبندی فتویٰ پیش کر دیا تھا، علماء ربانی پر بے جا الزامات لگا کر ان کو خون کے آنسو رلایا جاتا ہے، بے محابہ ان کی توہین کی جاتی ہے، کیا ان سب جرائم پر کسی کے تقدس پر آنچ آئی یا کسی کی ناجائز عقیدت میں بال آگیا، ہاں وستانوی صاحب پر غلط الزام ہی کی بنیاد پر اپنوں اور بیگانوں کی دماغی ہنڈیوں میں ابال آگیا۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہیں غدار وطن
وہ ظلم بھی ڈھائیں تو کوئی نام نہیں

کیا اسی کا نام ایمانداری وانصاف ہے؟ کیا آخرت کا دھیان اللہ کی بارگاہ میں جواب دہی کی فکر اور حساب وکتاب کا یقین دلوں سے محو ہوگیا۔

جیسی کرنی ویسی بھرنی نہ مانے تو کر کے دیکھ
جنت بھی ہے دوزخ بھی ہے نہ مانے تو مر کے دیکھ

تیسرا الزام گنیش کی تصویر کا:

تیسرا اعتراض یہ بھی ہے کہ وستانوی صاحب نے گنیش جی کا فوٹو کسی کو پیش کر دیا۔ اوّل یہ الزام بھی ہوائی، بے بنیاد اور فرضی ہے اور یہ مولانا کے تدین اور اعتماد کے خلاف ہے، پھر جب کہ مولانا وستانوی خود اس کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں اس موقع پر موجود ضرور تھا مگر میں نے یہ کام نہیں کیا مگر چونکہ وہ وہاں موجود تھے تو دوسروں کے ساتھ ان کا بھی فوٹو آ گیا ہے، لیکن اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ انہوں نے وہ تصویر کسی کو دیدی تو دل میں کیا نیت تھی؟ کسی کو اس کا علم ہے؟ غلاظت کو نجس مقام پر ڈال دینا کیا کوئی جرم ہے؟ اگر قصداً یہ کام ہوگا تو شرعاً اس کو گناہ سے تعبیر کر سکتے ہیں اور گناہ صغیرہ ہو یا کبیرہ توبہ اور معذرت سے معاف ہو جاتا ہے۔ الزام دینے والے اسلامی اصول کو فراموش نہ کریں اور خود اپنے اور اپنوں کے متعلق سوچیں۔ کیا وہ بے گناہ اور معصوم ہیں؟ انہوں نے اس گناہ سے زیادہ سخت جرائم کا ارتکاب نہیں کیا؟ اور ابھی توبہ کی توفیق بھی نہیں ہوئی، جرائم کا تسلسل اس کی کھلی ہوئی دلیل ہے، ہاں مولانا وستانوی نے اگر اس گناہ مذکورہ کا ارتکاب کیا ہے تو توبہ ومعذرت کا اعلان بھی کر دیا ہے، لہٰذا اب تو شرعاً اس کا تذکرہ کرنا اس پر عار دلانا اس کو الزام واعتراض کی شکل میں پیش کرنا بھی جرم عظیم وگناہ کبیرہ ہے۔ ایسے لوگ خود اپنے ہی پیر میں کلہاڑی مار رہے ہیں، خود مجرم ہو کر اپنا اعتبار کھو رہے ہیں، کم از کم اپنے اوپر تو رحم کیا جائے۔ سوچئے کہ ایک مومن خادم اسلام وعالم دین کی آبرو سے کھلواڑ کرنا کتنا اجر وثواب

رکھتا ہے؟ سوچئے اور اللہ سے ڈریئے۔

افسوس ہے کہ دوسروں پر بے جا الزام لگاتے ہوئے شرم نہیں آتی اور ''نوسو چوہے کھا کر حج کو چلی بلی'' کا مصداق خود ان کی ذات گرامی ہے۔ سوچئے کہ جمعیۃ کا کوئی جلسہ کوئی کانفرنس ایسی ہے جس کو قصداً ملت کی ایک کثیر رقم خرچ کر کے فلمایا نہ جاتا ہو، نام نہاد اصلاح معاشرہ کے جلسوں کی باقاعدہ ویڈیو فلم تیار ہوتی ہے اور مفتیان اسلام و محدثین کرام بلاضرورت شرعیہ برضا و رغبت اپنی تصویر کشی کراتے ہیں تاکہ اخبار میں فوٹو سمیت نام آکر شہرت حاصل ہو جائے کہ یہ حضرات معاشرہ کی اصلاح کر رہے ہیں جس سے عوام کو بے وقوف بنایا جاتا ہے اور جب اپنی تقریبات کا موقع آتا ہے تو یہ حضرات بھی کھل کر کھیلتے ہیں۔ نہ اسراف کی پرواہ نہ رسوم کی اور نہ ہی کھلانے پلانے میں سنت طریقہ کی پابندی بلکہ کئی اصلاح معاشرہ کے دیوانوں کی تقریبات میں جہیز کی کثرت اور اسٹینڈنگ کھانا ہوا جس کو دیکھ کر عوام علماء سے بدظن ہوئے اور کرسیوں پر بیٹھ کر کھانے اور کھلانے میں تو ترک سنت کا احساس ہی ختم ہو گیا۔ **انا للہ وانا الیہ راجعون.**

ان میں سے بعض حضرات کی تقریبات میں ویڈیو فلم بھی تیار ہوئی۔ حد تو یہ ہے کہ پاکستانی مولانا فضل الرحمٰن کی آمد پر جامع مسجد کے اندر جلسہ کو فلمایا گیا جس میں مفتیان کرام، محدثین عظام اور علماء اسلام ہی زیادہ موجود تھے مگر کسی نے نہ لب کو ہلایا اور نہ ہی جلسے کو چھوڑا۔ اس طرح بالاتفاق مسجد کی بھی توہین کی گئی۔ یاد رہے کہ مذکورہ جلسوں میں فوٹو گرافروں کو قصداً بلایا جاتا ہے اور اس کے لئے قوم کا سرمایہ خرچ ہوتا ہے اور وارثین انبیاء ومہمانان رسول ﷺ ہی ان میں زیادہ شریک ہوتے ہیں۔ اب سوچئے کہ اگر کسی کا فوٹو کسی کے حوالہ کر دیا جائے وہ بڑا جرم ہے یا تصویر کشی؟ قصداً اور قوم کا سرمایہ اس حرام کام پر خرچ کرنا بڑا جرم ہے اہل بصیرت انصاف کریں، نجاست کو اس کے مقام پر پھینک دینا جرم ہے یا اپنے جسم پر اس کو مل لینا جرم ہے؟ دونوں میں جو فرق نہ کرے وہ بھی احمق ہے۔ رسول اللہ

ﷺ کا ارشاد ہے ''**ان اشد الناس عذاباً یوم القیامة المصورون**'' (بیشک سب سے سخت عذاب قیامت کے دن جانداروں کی تصویر بنانے والوں کو ہوگا) اور شرح حدیث کی تشریح و توضیح کے مطابق تصویر بنوانے والا بھی جرم میں تصویر بنانے والے کی برابر ہوگا، کیونکہ وہ فلم ساز اور مصور کا معین و مددگار ہے اس لئے وہ اس شدید گناہ میں اور آخرت کے سخت ترین عذاب میں اس کے برابر ہوگا اور اگر کوئی حرام کو حلال سمجھتا اور کہتا ہے تو اسلامی قانون کے اعتبار سے وہ کافر ہو جائے گا۔ اسی کو کہتے ہیں اپنا شہتیر نظر نہیں آتا اور دوسرے کی آنکھ کا تنکا بھی نظر آجاتا ہے۔ انصاف کیجئے اگر مولانا وستانوی صاحب فوٹو کسی کے حوالہ کر دینے کی پاداش میں دارالعلوم کے اہتمام سے ہٹا دئے جانے کے مستحق ہیں تو کیا ان سے بڑے مجرم علماء و مفتیان و محدثین اپنی مسندوں سے ہٹا دئے جانے کے مستحق نہیں۔ وہ اپنے جلیل القدر عہدوں سے معزول اور برخاست کئے جانے کے لائق و سزاوار نہیں ہیں؟ ان سب کو معزول کر دینا ضروری ہے، عدل و انصاف اور ایمانداری کا تقاضہ بھی یہی ہے کیونکہ ان کے جرائم مولانا وستانوی کے جرم سے زیادہ شدید ہیں۔ یہ لوگ اور مذکورہ بالا جرائم کے مرتکب کسی عہدہ کسی مسند اور کسی اعزاز کے ہرگز لائق نہیں، خصوصاً مذکورہ بالا جرائم کے مرتکب لوگوں کے لئے دارالعلوم کی مقدس سرزمین پر قدم رکھنا بھی جائز نہیں، لہٰذا اعلان کم از کم کر ہی دیا جائے، اخبارات میں دے ہی دیا جائے کہ ایسے مجرمین کا مدارس، مراکز، خانقاہوں اور اسلامی تحریکات سے اخراج کیا جائے، ان کو ان کے عہدوں سے ہٹا دیا جائے، ایسے محدثین کی تحدیث غیر مقبول، ایسے مفتیوں کے فتوے غیر معتبر ہیں، خصوصاً دارالعلوم کو ایسے مجرمین سے پاک کیجئے، ورنہ ایک وستانوی کے پیچھے ہاتھ دھو کر نہ پڑیے ناجائز مقاصد کے تحت دارالعلوم کو مزید رسوا اور اپنی عاقبت کو خراب نہ کیجئے! اراکین شوریٰ عزم و ہمت کے ساتھ ایمان و انصاف کے تقاضوں پر ثابت قدم رہیں اگر اس کی جرأت نہیں ہے تو رکنیت سے مستعفی ہو کر اپنے گھروں میں آرام فرمائیں۔

اصل مجرم کون ہے؟:

یہ بھی سوچئے کہ اعتراض کرنے والوں کے نزدیک اصل مجرم کون ہے؟ اس انتخاب نو کا سہرہ بلاشبہ شوریٰ کے سر ہے اگر یہ انتخاب غلط اور نادرست ہے تو اربابِ شوریٰ اصل مجرم ہیں کہ انہوں نے کیوں سوجھ بوجھ، ایمانداری اور انصاف سے کام نہیں لیا۔ دارالعلوم کے جلیل القدر عہدہ اہتمام کے لئے دماغ دار اور نااہل شخص کا انتخاب کیوں کیا؟ یہ شوریٰ کی نااہلیت یا بے انصافی کی دلیل ہے کہ وہ اس جرم عظیم کے مرتکب ہوئے اس لئے سب سے پہلے دارالعلوم کی نااہل و بے انصاف شوریٰ کو مستعفی ہونا چاہئے یا ان کو برخاست کردینا چاہئے، ایمانداری وانصاف کا تقاضا یہی ہے ایسے لوگوں کو دارالعلوم کے احاطہ میں گھسنے کی اجازت بھی نہ دی جائے کہ وہ دارالعلوم کے سب سے بڑے بدخواہ اور خطرناک دشمن ہیں اور اگر ارباب شوریٰ نے انتخابی فیصلہ درست کیا ہے تو ان کے فیصلہ کو چیلنج کرنا اور غلط قرار دینا ارباب شوریٰ کی توہین ہے۔ شوریٰ کے فیصلوں کو ماننا ضروری ہے، خصوصاً ادھم مچوانے والوں کے نزدیک تو شوریٰ ''ہیئت حاکمہ'' ہے لہٰذا وستانوی صاحب کا انتخاب برحق ہے جو ان میں کیڑے نکال رہے ہیں، شور بپا کررہے ہیں، ان سے اہل شوریٰ اور ارباب دارالعلوم اور عامۃ المسلمین کو متاثر نہیں ہونا چاہئے، بلکہ اس انتخاب کی تائید کرنی چاہئے۔ اسی میں دارالعلوم کا تعلیمی، تعمیری، روحانی مفاد ہے۔ اس فیصلہ کو رد کرنا دارالعلوم کے لئے ہر اعتبار سے مضر ہے۔ لہٰذا عرض ہے کہ اہل شوریٰ کو متعصب ضدی یا شخصیت پرستی کے شریک میں مبتلا نااہلوں اور دارالعلوم کے بدخواہوں کی سازشوں کی پرواہ کئے بغیر اپنے فیصلہ پر اٹل اور ثابت قدم رہنا چاہئے۔

حضرات اراکین شوریٰ:

ارباب شوریٰ تو بڑی ہستیاں ہیں ان سے خطاب چھوٹا منھ بڑی بات ہے، تاہم یہ

بات یاد رہے کہ دارالعلوم اللہ کی امانت، امت کا اثاثہ، اکابر کی میراث اور ایک عظیم دینی سرمایہ آپ کے حوالہ کیا گیا ہے۔ حقیقت تو یہی ہے کہ دارالعلوم اللہ کی ملک ہے، ملی اور مذہبی ادارہ ہے گو کچھ بندگان نفس اس حقیقت کا انکار کردیں اور ان قومی اثاثوں کو اپنی ملک گردان لیں، لیکن حقیقت تو اپنی جگہ پر حقیقت ہی رہے گی۔ اس لئے اس کو کسی شخصیت، خاندان یا پارٹی کی ملک سمجھنا اور ان کی مصلحتوں اور منافقانہ اشاروں پر ان کی طرف داری میں کوئی فیصلہ کرنا اور دارالعلوم کے مفاد و مصلحت سے روگردانی کرنا بدترین خیانت ہوگی اور اغیار و بدخواہ جو اس کو تباہ و برباد کرنا چاہتے ہیں۔ آپ حضرات ان کے منشاء کو پورا کرکے تمام ناانصافیوں اور ان کے نتائج کے ذمہ دار ہوں گے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ حضرات **خسر الدینا والآخرۃ** کے مصداق بن جائیں۔

سوچئے کہ جب آپ کی شوریٰ آپ کے نزدیک ''ہیئت حاکمہ'' ہے تو آپ کے فیصلوں کو چیلنج کرنے والا اور ان میں ناجائز وناحق تبدیلی کا خواہشمند یقیناً گمراہ وخطا کار ہے ایسے لوگوں کی اطاعت اور ان کے منشاء پر کسی فیصلے میں تبدیلی آپ کو بے بس بلکہ مرم وکم ہمت اور بزدل بلکہ بے وقوف ونااہل ثابت کرنے کے لئے بہت کافی ہوگا اور فیصلے کی تبدیلی اس بات کی دلیل ہوگی کہ ایسے بے حوصلہ وبے ضمیر بزدلوں کو اس عظیم ادارہ کی شوریٰ کا ممبر رہنا ہرگز جائز نہیں جو ایک اچھا فیصلہ ہو چکا ہے اس میں تبدیلی مؤقر ومعتبر اراکین کی شان کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ دارالعلوم کا ظاہری، باطنی اور مادی زبردست نقصان ہے اور ایسے فتنوں کا دروازہ ہے کہ اس کو کوئی طاقت بند نہیں کرسکتی نیز کسی سیاسی فتنہ پرور اور سخت گیر ہستی کو عہدۂ اہتمام پر مسلط کردینا سم قاتل اور ظلم کامل سے کم نہ ہوگا، بلاخوف تردید عرض ہے کہ حضرت حکیم الاسلام جیسا مہتمم تو دارالعلوم کو قیامت تک نصیب نہیں ہوسکتا ان کا وجود اور اہتمام ایسی نعمت عظمیٰ تھی جس کی مسلسل مخلصانہ مساعی نے مدرسہ عربی دیوبند کو ایک عالمگیر دارالعلوم بنادیا تھا مگر اس نعمت خداداد کی عمداً حسداً ناقدری کی گئی اور وہ نعمت چھن گئی

وہ دوبارہ میسر نہ ہوگی پھر بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے حضرت مولانا مرغوب الرحمٰنؒ کی صورت میں ایک معمر، تجربہ کار، امانت دار اور صاحب الرائے مہتمم دارالعلوم کو عطا فرما دیا تھا گو وہ صاحب علم وقلم اور اہل بیان ولسان نہ تھے، تاہم ان کا وجود بسا غنیمت تھا ان کے بعد اربابِ شوریٰ نے بفضلہٖ تعالیٰ ایسے شخص کو اس عہدۂ جلیلہ کے لئے منتخب فرمایا جو اپنی خصوصیات وصفات (مذکورہ) میں اپنے ماسوا سے ممتاز ومنفرد اور دارالعلوم کے مستقبل کو تابناک بنانے کے لئے نہایت موزوں ہیں ان کی اگر کچھ کوتاہیاں بھی ہوں تو وہ بشری لازمہ ہے وہ فرشتے نہیں ہیں نہ وہ اور ہم دودھ میں دھلے ہوئے، نہ آپ حضرات **کلکم خطاؤن وخیر الخطائین التوابون** ہم اہل شوریٰ کو اس عمدہ اور الہامی فیصلہ پر مبارکباد دیتے ہیں اور اگر وہ لوگ ناجائز دباؤ کی بنیاد پر اس فیصلہ کو بدلتے ہیں تو ہم **انا للّٰہ وانا الیہ راجعون** پڑھ کر دارالعلوم اور ایسے بے ضمیر ارباب شوریٰ کو اللہ کے حوالے کردیں گے۔

شوریٰ کے فیصلے واجب التعمیل یا واجب التردید؟:

مولانا وستانوی کے حریف دارالعلوم کے بدخواہ اور اقتدار کی ناجائز ہوس میں مبتلا اس کے عمدہ نظام، صاف ستھرے اور پاکیزہ ماحول کو درہم برہم کررہے ہیں۔ انہوں نے ماضی قریب میں اکابر کے پاکیزہ دامن کو داغدار کرنے اور مسلک حق کی توہین وتذلیل میں کوئی کمی نہیں کی وہی لوگ آج بھی بچھو کی طرح اپنے ستم کا ڈنک اٹھائے پھر رہے ہیں، لطف یہ ہے کہ یہ اس بات کے مدعی بھی ہیں کہ شوریٰ ''ہیئت حاکمہ'' اور ''حاکم اعلیٰ'' ہے۔ اس کے فیصلے ''واجب التسلیم'' اور ''واجب التعمیل'' ہیں اور عمل سے بتاتے ہیں کہ شوریٰ کے فیصلے ''واجب التردید'' ہیں اب سوچئے کہ مسلم ومطیع کون ہے اور مجرم اور باغی کون ہے؟

انگشت حیرت درد ہاں نیچے دروں نیچے بروں
یہ ضد، ہٹ دھرمی، غرور کبر کی نحوست ہے

تکبر عزازیل را خوار کرو
بزندان لعنت گرفتار کرو

مہمانانِ رسول ﷺ پر رحم کریں:

فسادی عناصر اور عنادی اکابر سے اتمام حجت کے طور پر عرض ہے کہ وہ اپنے اوپر رحم کریں ایک دینی ادارہ مسلک حق اور ان اکابر ومشائخ کو جن کی مخلصانہ مسلسل کاوشوں سے مدرسہ عربی دیوبند قائم ہوکر پروان چڑھا اور عالم گیر دارالعلوم بن گیا۔ ان سب کو عالم میں رسوا وذلیل اور بدنام کرنے کی مزید کوشش نہ کریں۔ اللہ کے قہر وجبروت کو فراموش نہ کریں اس کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے، نیز جو طلبہ اپنا گھر بار چھوڑ کر علم دین حاصل کرنے کے لئے اس دینی ادارہ میں آئے ہیں ارباب دارالعلوم کے پاس وہ ان کے عزیز واوقات امانت ہیں۔ ان کی ذمہ داری ہے کہ ان کی عمر عزیز کا یہ حصہ اور ان کے قیمتی لمحات کو ضائع نہ کیا جائے۔ ان کا فرض منصبی ہے کہ ان امانتوں کا حق ادا کیا جائے، تعلیم وتربیت علم وعمل اور کمالات علمیہ کی تحصیل میں ان کے اوقات کو صرف کیا جائے اپنی خواہشات اور ناجائز مقاصد کے بت پر انکو بھینٹ نہ چڑھایا جائے۔ ان کو کتاب اور سنت کی اشاعت دین کی تبلیغ اور امت کے عقائد واعمال کے تحفظ کے لئے تیار کیا جائے ان کو خدمت خلق کے لئے بہترین انسان بنایا جائے۔ یہی اس ادارہ کے قیام کے مقاصد حسنہ ہیں اور اہل انتظام اور انصرام کا فرض منصبی ہے کہ ان مقاصد کی تکمیل وتحصیل کے لئے اپنی مساعی جمیلہ بروئے کار لائیں ان کو سرکشی وشرارت کا خوگر بنانا مادر علمی کا باغی اور آبائے علوم اساتذہ کرام کے سامنے ان کو بے ادبیوں، گستاخیوں اور بدتمیزیوں پر ابھارنا ان طلبہ کے لئے اور امت مسلمہ کے لئے اعلیٰ درجہ کی بدخواہی ودشمنی اور بدترین ظلم وزیادتی ہے جس کا خمیازہ دنیا میں بھی بھگتنا پڑے گا اور آخرت کی دائمی ذلت اور رسوائی اس کے علاوہ ہوگی اگر یقین بالکل

مردہ نہیں ہوا اور ایمان کا کوئی ذرہ قلب میں موجود اور نفسانیت نے نور بصیرت سے محروم نہیں کیا ہے تو ان سیاسی نجاستوں اور ناپاک خواہشات کی تکمیل کی کوششوں کو چھوڑ کر دارالعلوم کی سرزمین کو ان گندگیوں سے ملوث نہ کیجئے ورنہ

جیسی کرنی ویسی بھرنی نہ مانے تو کر کے دیکھ
جنت بھی ہے دوزخ بھی ہے نہ مانے تو مر کے دیکھ

گو سب لوگ ان باتوں کو خوب جانتے ہیں مگر نصیحت اور خیر خواہی اور تذکرہ اور تذکیر کا ہر مسلمان کو حق ہے بلکہ حسب استطاعت ان کی شرعی ذمہ داری بھی ہے اس لئے یہ معروضات پیش کر دی گئیں۔ ع

کاش کسی دل میں اتر جائے میری بات

مہمانِ رسول ﷺ سے صاف صاف باتیں:

آپ حضرات طلبہ علوم دین ہیں۔ قرآن وحدیث اور شریعت وسنت کی تعلیم وتعمیل آپ کا مقصود ہے، اساتذہ کرام آپ کے علمی اور روحانی باپ ہیں اور مدرسہ آپ کی علمی ماں ہے جس کی آغوش رحمت میں آپ نشو ونما پا رہے ہیں اور کمالات انسانیت سے مالا مال ہو رہے ہیں۔ ان سبھی حقوق وآداب کو ملحوظ رکھنا آپ کا فرض منصبی ہے اور ان کی شان میں بے ادبی وگستاخی کرنے والا کبھی اپنے مستقبل کو تابناک نہیں بنا سکتا، حقیقی عالم بن سکتا ہے اور نہ ہی اپنے علوم سے امت کو نفع پہنچا سکتا ہے

از خدا خواہم توفیق ادب
بے ادب محروم گشت از فضل رب

علماء ربانی مشائخ حقانی اور حکماء اسلام وہی لوگ بنے ہیں جنہوں نے ادب کی راہ اپنا کر علم وعمل کا سفر طے کیا ہے۔ کمال ہے کہ جن اساتذہ کرام کی آغوش شفقت میں علم وعمل

اور تہذیب وتربیت کی غذا حاصل کر رہے ہیں انہیں کو بچھو کی طرح ستا رہے ہیں، بچھو نے وقت پیدائش اپنی ماں کا پیٹ پھاڑ کر اس کے ساتھ بدسلوکی کی جس کا خمیازہ اس کو ذلت ورسوائی کی شکل میں بھگتنا پڑتا ہے، وہ ظلم کا خوگر بھی ہے اور ذلیل وخوار بھی جہاں نکلا جوتوں اور چپلوں سے اس کا استقبال ہوا، اگر آپ نے بھی اپنے علمی مادر وپدر کے ساتھ بے ادبی وبدسلوکی کی راہ اختیار کی، شکر ووفا، احسان وسلوک چھوڑ کر بے ادبی وگستاخی وناشکری وغداری کا راستہ اپنایا تو آپ بدترین مجرم قرار پائیں گے، اپنی دنیا وآخرت کو تباہ کر لیں گے اور دنیا وآخرت میں ذلت ورسوائی آپ کا استقبال کرے گی، کس قدر افسوس کی بات ہے۔ بیت اللہ (مسجد) اور بیت الرسول (مدرسہ) کے آداب کو بالائے طاق رکھ کر وہاں شور شرابہ کیا جائے، سیاسی انداز کے نعرے لگائے جائیں، اساتذہ کا دل دکھایا جائے، ان کو ذلیل کیا جائے یہ سب مقامات **لا ترفعو اصواتکم فوق صوت النبی** کے عموم میں داخل ہیں، جیسا کہ مفسرین وائمہ مجتہدین نے اس کی وضاحت فرمائی ہے۔ مساجد کی طرح مدارس کے آداب بھی ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ ان کا عظمت ومحبت کے ساتھ دل کی گہرائی اور والہانہ جذبہ کے ساتھ ادب کیا جائے۔ ان میں کسی معصیت وگستاخی کا ارتکاب نہ کیا جائے، بلکہ ان بیوت میں سنت کے خلاف کوئی کام نہ کیا جائے۔ آپ نے جو طلب علم، علم دین کا مبارک راستہ اپنایا ہے اس راہ میں آپ کا ہر قدم ادب سے مزین ہونا ضروری ہے، درسگاہوں کا ادب، کمروں کا ادب، کتابوں کا ادب، اساتذہ اور ان کی مجلس کا ادب ساتھیوں کا ادب، ارباب اہتمام وانتظام کا ادب اور اپنی بساط کے مطابق ان سب کے ساتھ احسان وحسن سلوک، دعاء خیر دراصل یہ راہ علم ومحبت کی راہ ہے۔ محبوب اعظم کی بارگاہ عالی تک رسائی منزل ومقصود ہے جہاں ہر قدم پر ادب لازم ہے ورنہ محرومی کے سوا کچھ بھی حاصل نہ ہوگا

طرق العشق کلها آداب
ادبوا النفس ایها الاصحاب

مجموعه القاسم: جلد پنجم　مسلم مسائل اور اس کا حل

آپ حضرات اپنے مقصد پر نظر رکھ کر اپنے کام میں لگے رہیں۔ ارباب شوریٰ، منتظمین اور اساتذہ کرام اپنا کام کریں گے۔ آپ دوسروں کے کام میں داخل اندازی نہ کریں کہ یہ اعلیٰ درجہ کی حماقت و بیوقوفی ہے آپ کسی کے معاملہ میں ٹانگ نہ اڑائیں، اپنے کام سے فارغ ہوں تو آرام، اگر کوئی شخص لالچ کے راستہ سے یا سبز باغ دکھا کر آپ کے مقصد کے خلاف اکسا کر آپ کے کام سے ہٹانا چاہتا ہے تو یقین کر لیجئے کہ یہ انسانی شکل میں ابلیس لعین ہے یا اس کا کوئی خلیفہ و جانشین ہے آپ لاحول پڑھئے اور اس پر لعنت بھیج کر اس سے بری ہو جایئے۔ع

اے بسا ابلیس دررو آدم است

اور اس کو یاد رکھئے کہ **عیسیٰ ان تکرھو اشیاء وھو خیرلکم وعسیٰ ان تحبوا شیئا وھو شرلکم واللہ یعلم وانتم لا تعلمون** (ہوسکتا ہے کہ کوئی چیز تم کو ناپسند ہو اور وہ تمہارے لئے بہتر ہو اور ہوسکتا ہے کہ کوئی شئی تم کو پسند ہو اور تمہارے لئے بری ہو اللہ تعالیٰ جانتے ہیں تم نہیں جانتے۔)

حق تعالیٰ شانہٗ تمام مدارس اسلامیہ کو خصوصاً دارالعلوم دیوبند کو اور پوری امت مسلمہ کو جملہ شرور وفتن سے ہمیشہ محفوظ رکھے آمین۔

وصلی اللہ علیہ سیدنا ومولانا محمد وآلہ واتباعہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین.

(مضمون نگار دارالعلوم جامع الہدیٰ گل شہید مراد آباد کے شیخ الحدیث ہیں)

- مجمع الامام محمد بن اسماعیل البخاریؒ للدراسات الاسلامیہ
- ایوان امام الہند شاہ ولی اللہ محدث الدہلویؒ
- جامع الامام محمد قاسم النانوتویؒ
- مرکز التوحیدی الاسلامی للدعوہ والارشاد

چھ ہزار طلباء وطالبات کی تعلیم وتربیت اور قیام وطعام کے لئے جامعہ کے تعمیری وترقیاتی منصوبے اور ''القاسم اسلامک یونیورسٹی'' کا تخمینی بجٹ تقریبا 1,50,20,93,768.00 ڈیڑھ سو کروڑ روپے سے زائد ہے۔ جو ہی خواہان ملت اسلامیہ، صاحب جود وسخا اور باتوفیق اہل خیر کے تعاون سے اللہ رب العزت ہی پورا کرانے والا ہے۔ حق جل مجدہ کا پاک ارشاد ہے:

''جس نے اچھے کام کئے ہوں، ہم کبھی اس کا اجر ضائع نہیں کرتے'' (الکہف: ۳۰، ترجمہ: امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ ''ترجمان القرآن'')

اللہ ہی ہمارا اور آپ کا حامی وناصر ہے۔

Published by:

Jamiatul Qasim Darul Uloom-il-Islamia

At & Po. Madhubani, G.P.O. Partap Ganj, Distt: Supaul - 852125 Bihar (India)
Ph: +91-9811125434, 9931906068, 9931515312
www.jamiatulqasim.com / E-mail: jamiatulqasim@yahoo.com
www.facebook.com/muftimahfoozurrahman.usmani
youtube.com/jamiatulqasim

Delhi Office:

K-79, 2nd Floor, Street No.5, Abul Fazal Enclave-I,
Jamia Nagar, New Delhi-110025 (India)
Ph: +91-11- 26981876, 26982907 Mob: +91-9899766786
Printed at : M.R. Printers, 2818, Gali Garaiya, Darya Ganj, New Delhi-110002